

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تفسیر طہری

جلد، مشتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجتہد پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین، بھیر شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور-کراچی-پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تفسیر مظہری (جلد ہشتم)	نام کتاب
حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ	تالیف
ضیاء الامت حضرت سید محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ	ترجمہ مترجم
الاستاذ مولانا ملک محمد یوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ	مترجمین
مولانا محمد انور مگھالوی	
فضلاً ودارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف	
ایک ہزار	تعداد
دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)	اشاعت
1Z348	کمپیوٹر کوڈ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلسٹی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ انگریز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

ٹیکس:- 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:- 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

- 26 ایک شخص کا تو مہربان کے متعلق سوالات (حدیث)
- 27 نیل ارم کے واقعہ کی تفصیل
- 32 اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے لیکن معلوم کے ساتھ اس کا تعلق حادث ہے۔
- 35 حدیث: جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی امر کا حکم دیتا ہے تو فرشتے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں
- 36 حضرت عیسیٰ اور حضور سید عالم ﷺ کے درمیان کتنی مدت تھی؟
- 39 حدیث: مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔
- 49 حدیث: حضور ﷺ نے فرمایا اے معاذ کیا تمہیں معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟
- 49 حدیث: رونے زمین پر کوئی مٹی کا مکان یا اون کا ڈیرہ ایسا نہ بنے گا جس کے اندر اللہ کلمہ اسلام داخل نہ کر دے۔ انا
- 49 سورۃ فاطر
- 54 حدیث: رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الملک والرحمن الخ فرماتے
- 59 حدیث: دونوں مرتبہ سورہ بقرہ کی کئی کئی درمیان مدت؟
- 60 حدیث: حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو شخص یہ پانچ کلمات کہے الخ
- 60 حدیث: فقط دعاء قضا کو پڑھا جاسکتی ہے
- 65 حدیث: کچھ مسلمان پہاڑوں جیسے گناہ لے کر آئیں گے۔ الخ
- 9 سورۃ سبأ
- تمام زمانے اور ساری کائنات زبانی اللہ کے سامنے حاضر ہے اور اللہ زمانے کے دائرہ سے خارج ہے۔
- 11 (فائدہ) بعض اکابرین پر ایسی حالت بعض اوقات آجاتی ہے کہ وہ دائرہ زمان سے نکل جاتے ہیں اور ماضی اور مستقبل کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔
- 12 لو با حضرت داؤد کے ہاتھوں میں موم اور گوندھے ہوئے آنے کی طرح ہوتا ہے
- 18 حدیث: اپنے ہاتھ کی کمانی سے بہتر اور کوئی کمانی نہیں اور حضرت داؤد اپنے ہاتھ کی کمانی کھاتے تھے۔
- 20 جنات کے ہاتھوں بیت المقدس کی تعمیر کی کیفیت
- 20 حدیث: جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اپنے رب سے تین باتوں کی دعا کی
- 21 مسئلہ: کیا سونے اور چاندی سے مساجد کو مزین کرنا جائز ہے؟
- 21 حدیث: ہر مصور جہنم میں جائے گا جو صورت اس نے بنائی ہوگی اللہ اس میں جان ڈال دے گا اور وہی صورت جہنم میں اس کو عذاب دے گی۔
- 23 حضرت سلیمان نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میری موت کو جنوں سے پوشیدہ رکھنا تاکہ لوگ جان جائیں کہ جنات غیب نہیں جانتے۔
- 24 حدیث: حضرت فروہ بن سلیک نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر کیا عرض کیا

- حضرت شیخ شہاب الدین سروردی کا قول: جو ڈرتا
 نہیں وہ عالم نہیں 69
- اللہ نے فرمایا میرا اور جن وانس کا معاملہ عجیب ہے پیدا
 میں کرتا ہوں اور عبادت و دوسروں کی جاتی ہے رزق
 میں دیتا ہوں اور شکر دوسروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ 119
- مسئلہ: مردار کی ہڈی پاک ہے 121
- سورہ یس کی فضیلت احادیث کی روشنی میں۔ 125
- سورہ صافات 127
- حدیث: تم صفیں اس طرح کیوں نہیں بناتے جس
 طرح ملائکہ رب کے حضور بناتے ہیں 127
- تمام ستارے آسمان دنیا میں ہیں 129
- حدیث: شہاب اور رحم شیاطین کی حقیقت 131
- قیامت کے دن بندوں سے سوال 137
- زقوم کے بارے میں احادیث 145
- علم نجوم کی تعلیم اور تعلم کے بارے میں احادیث 150
- انبیاء کے خواب وہی ہوتے ہیں 160
- حضرت الیاس اور حضرت خضر بیت المقدس میں
 رمضان کے روزے رکھتے تھے اور زمانہ حج میں اکٹھے
 ہو جاتے تھے۔ 173
- مسئلہ: انبیاء کرام کی اغوشوں کا ذکر کرنا جائز نہیں 178
- مسئلہ: انبیاء کرام پر اعتراض کرنا کفر ہے 178
- انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے اور ان میں فرق
 کرنے کا بیان 178
- موسیٰ علیہ السلام اور حضور سید عالم ﷺ کے فضائل
 (احادیث) 178
- آسمانوں میں ملائکہ کی کثرت ہے اور ان میں سے ہر
 ایک کیلئے تعین مقام ہے جس سے وہ تمنا و آرزو نہیں کرتا۔ 184
- حضرت علی کا قول: جو چاہتا ہے کہ اس کے اجر کو پورا
 حضرت شیخ شہاب الدین سروردی کا قول: جو ڈرتا
 نہیں وہ عالم نہیں 69
- حدیث: حضور علیہ السلام نے فرمایا "قسم ہے اس کی
 جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو کچھ میں
 جانتا ہوں اگر تم جانتے تو زیادہ روٹے اور کم ہستے۔ 70
- حدیث: حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ حضور نبی کریم
 ﷺ نے فرمایا اللہ ان کو پورا پورا اجر دے گا۔۔۔ الخ 70
- حدیث: ہم میں جو پیش رو ہے وہ پیش رو ہوگا اور
 درمیانی لوگ نجات یافتہ ہوں گے۔۔۔ الخ 73
- حدیث: اللہ قیامت کے دن لوگوں کو دوبارہ اٹھائے گا
 پھر علماء کو طبعاً کر کے خطاب فرمائے گا انہیں کہ وہ علماء
 ۔۔۔ الخ 74
- حدیث: مومن کا زیور اس جگہ تک پہنچے گا جہاں تک
 وضو کا پانی پہنچے گا۔ 75
- سورہ یس 85
- مساجد کو جانے میں کثرت اقدام کی فضیلت 90
- سورج کے استقرار اور عرش کے نیچے سجدہ کرنے کا
 بیان 102
- کواکب اور افلاک کی حرکات کی تحقیق 104
- ویل: جہنم کی ایک وادی ہے 109
- جنت میں اہل جنت کا شغل 111
- اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام 112
- حدیث: ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے دوزخیوں کو
 لوہے کے صندوق میں الگ الگ بند کر کے دوزخ میں
 پھینک دیا جائے گا 113
- اعضاء کی گواہی کے بارے میں احادیث طیبہ 115
- رسول کریم ﷺ بطور تمثیل شعر پڑھتے تھے؟ (عمدہ

- پورا سے دیا جائے تو مجلس سے اٹھتے وقت آخری کلام
- 188 سبحان رب العزۃ عما یصفون کہے۔
- 189 سورہ ص
- 197 اللہ کو روزوں اور نمازوں میں حضرت داؤد کا روزہ اور نماز سے زیادہ محبوب ہے (حدیث)
- 197 صلوة الصبحی (حدیث)
- 205 مسئلہ: رکوع میں سجدہ تلاوت کی ادائیگی
- 206 مسئلہ: سورہ ص کے سجدہ میں اختلاف
- 208 سجدہ تلاوت کرتے ہوئے دعا کا پڑھنا (حدیث)
- 211 جو خواہشات کی پیروی کرے گا اس کی رائے میں خرابی واقع ہوگی اور وہ اپنے اجتہاد میں گمراہ ہوگا
- 214 گھوڑوں کی پیشانی سے خیر وارستہ ہوتی ہے (حدیث)
- 283 حدیث: ایک شیر جن آج رات تھوک اڑاتا ہو میری نماز تو روانے آیا خدا نے اس کو مجھ پر قابو نہ پانے دیا۔
- 283 اللہ تعالیٰ سے شکایت، دعا اور زاری، صبر کے منافی نہیں
- 289 مذہب جبریت کے بطلان کا بیان
- 224 مقام صبر سے مقام رضا کی طرف ترقی
- 224 حدیث: میں تم کو دو زخ میں گرنے سے روکتا ہوں
- 229 آئے تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے اور جس کسی نے مرتد ہونے سے قبل حج کیا ہوا ہو اس پر اس کا اعادہ واجب ہوتا ہے
- 232 حدیث: میں نے 30 سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے کہ سب سے پہلے رہنا تک الحمد صبرا کثیراً لکھ لیں۔
- 233 سورہ زمر
- 239 حالین عرش اور مومنین کیلئے ان کی دعا کا بیان
- 249 ایمان میں مشارکت نصیحت اور شفقت کو ثابت کرتی ہے
- 255 جنت کے محلات کا بیان
- 256 شرح صدر کا بیان
- 260 علامہ ابنوی کی جانب سے سماع قرآن کے وقت شبی طاری ہونے کا انکار اور سماع کے وقت حال کی تفسیر کا بیان
- 264 قرآن کریم عربی زبان میں کلام لفظی ہے نہ یہ خالق ہے نہ مخلوق
- 266 قیامت کے دن لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنے کا بیان
- 278 سونے کے وقت کی دعا کا بیان
- 283 دعا کا آغاز اللهم رب جبریل الخ سے کرنے کا بیان
- 283 اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت اور گناہوں کی مغفرت کے بارے واروہونے والی احادیث کا بیان
- 283 اس کا بیان کہ شرک کے بغیر کچھ قدریہ کے مذہب کے خلاف ہے
- 283 مذہب جبریت کے بطلان کا بیان
- 289 ارتداد پہلے سے موجود تمام نیک اعمال کو ضائع کر دیتا ہے اگر کوئی مرتد ہونے کے بعد اسی وقت اسلام لے آئے تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوتا ہے اور جس کسی نے مرتد ہونے سے قبل حج کیا ہوا ہو اس پر اس کا اعادہ واجب ہوتا ہے
- 305 حدیث حضور نبی کریم ﷺ ہر رات بنی اسرائیل اور سورہ زمر کی تلاوت فرماتے تھے
- 307 سورہ المؤمنین
- 312 حالین عرش اور مومنین کیلئے ان کی دعا کا بیان
- 312 ایمان میں مشارکت نصیحت اور شفقت کو ثابت کرتی ہے
- 314 جنت کے محلات کا بیان

- صالحین کے والدین، اولاد اور بیویوں کو درج میں ان کے ساتھ ملا دینے کا بیان
- 405 حدیث طیبہ: اطم السماہ ان ملائکہ کے کثرت نمود کے سبب آسمان میں خاص نوع کی آواز پیدا ہوتی ہے
- 407 حدیث طیبہ: رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے آپ کے پاس دو کتابیں تھیں
- 410 حدیث طیبہ: رسول اللہ ﷺ نے خط کھینچا اور فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے پھر اس کے دائیں بائیں بہت سے خط کھینچے
- 411 جماعت کے ساتھ رہنے اور افتراق سے نبی کے احکام سننے دعا کا بیان
- 417 حدیث طیبہ: انما الاعمال بالنیات
- 417 حدیث طیبہ: اس کا بیان جس نے آخرت کا عمل دنیا کیلئے کیا۔
- 420 حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کی آل پاک کی محبت واجب ہونے کا بیان
- 420 حضرات ابو بکر و عمر و صحابہ کرام، انصار عظام، قریش اور اہل عرب کے محبت کرنے کا بیان
- 425 توبہ اور گناہوں سے معافی مانگنے کا بیان
- 427 حدیث طیبہ: افضل دعا الحمد للہ ہے
- 430 اس کا بیان کہ مرض اور تکلیف بندہ مومن کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں
- 431 حدیث طیبہ: ایمان کے دو نصف ہیں ایک نصف صبر میں ہے اور ایک نصف شکر میں ہے
- 433 حدیث طیبہ: جس سے مشورہ لیا جائے وہ اس میں امین ہوتا ہے
- 435 مستتین کا بیان
- 441 کیفیت دمی کا بیان
- 445 سورہ زخرف
- 315 حدیث طیبہ: لوان رصاصۃ مثل هذه (واشار الی جثمتہ) ارسلت من السماء الحدیث کا بیان
- 319 حدیث طیبہ: انبیاء و رسول علیہم السلام کی تعداد کا بیان
- 329 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 347 سورہ فصلت
- 351 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 351 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 357 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 361 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 365 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 365 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 378 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 382 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 386 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 386 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 387 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 390 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان
- 403 علم نافع اور علم غیر نافع کا بیان

- قبروں سے اٹھانے کے بارے میں جو روایات وارد ہوئیں کہ آسمان سے بارش ہوگی تو لوگ سبزہ کی طرح اگ پڑیں گے
- 472 میری وجہ سے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں میں انہیں اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں
- 448 اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے باہم محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جمع فرمائے گا۔
- 449 جانور پر سوار ہوتے وقت کیا پڑھنا چاہئے
- 472 حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میرا ٹھکڑا ہے (اللہ بیٹ)
- 473 جنت کے گھوڑے اور اس کا پھل
- 474 جنہی مالک کو پکاریں گے
- 475 دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیر اور ناپسندیدہ ہے
- 479 سورۃ المدخان
- 479 نصف شعبان کی فضیلت کا بیان
- 458 قیامت کی نشانیوں دھواں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا
- 481 ہر بندے کے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے اس کا عمل ادا ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نچنے آتا ہے جو آدمی فوت ہے اور دروازے سے نہیں پاتے تو وہ اس آدمی پر روکتے ہیں۔
- 485 دنیاوی مال کی طلب اچھے طریقے سے کرو
- 489 رزق حلال کی تلاش اہم ترین فرض ہے
- 490 جو آدمی حلال روزی لکھتا ہے
- 489 خلافت کا معاملہ قریش میں ہے
- 490 جھگڑا کرنے سے ہی لوگ ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئے
- 491 حوریں اور جنت کے پھل
- 492 قیامت کی نشانیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر اترنا
- 493 سورۃ الجاثیہ
- 492 سب سے زیادہ کمالی نردود
- 502 گویا میں جنہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہنم سے دور دوڑنا تو بیٹھے ہوئے ہو۔
- 504 تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں جب حساب و کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو ان اعمال ناموں کو لوگوں سے دائیں بائیں ہاتھوں تک لے جائیں گی۔
- 472 دنیا آخرت کے تقاضوں پر حرام ہے اور آخرت دنیا سے محبت کرنے والوں پر حرام ہے دنیا اور آخرت اللہ والوں پر حرام ہے
- 458 جو دنیا سے محبت کرتا ہے وہ اپنی آخرت کا نقصان کرتا ہے اور جو اپنی آخرت سے پیارا کرتا ہے اسے دنیا میں تکلیف دی جاتی ہے
- 459 رزق حلال کی تلاش اہم ترین فرض ہے
- 459 جو آدمی حلال روزی لکھتا ہے
- 459 دنیاوی مال کی طلب اچھے طریقے سے کرو
- 463 خلافت کا معاملہ قریش میں ہے
- 468 جھگڑا کرنے سے ہی لوگ ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئے
- 468 قیامت کی نشانیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر اترنا
- 469 سورۃ الجاثیہ
- 471 سب سے زیادہ کمالی نردود
- 471 گویا میں جنہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہنم سے دور دوڑنا تو بیٹھے ہوئے ہو۔
- 471 تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں جب حساب و کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو ان اعمال ناموں کو لوگوں سے دائیں بائیں ہاتھوں تک لے جائیں گی۔
- 472 دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیر اور ناپسندیدہ ہے
- 479 سورۃ المدخان
- 479 نصف شعبان کی فضیلت کا بیان
- 458 قیامت کی نشانیوں دھواں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا
- 481 ہر بندے کے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے اس کا عمل ادا ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نچنے آتا ہے جو آدمی فوت ہے اور دروازے سے نہیں پاتے تو وہ اس آدمی پر روکتے ہیں۔
- 485 دنیاوی مال کی طلب اچھے طریقے سے کرو
- 489 رزق حلال کی تلاش اہم ترین فرض ہے
- 490 جو آدمی حلال روزی لکھتا ہے
- 489 خلافت کا معاملہ قریش میں ہے
- 490 جھگڑا کرنے سے ہی لوگ ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئے
- 491 حوریں اور جنت کے پھل
- 492 قیامت کی نشانیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر اترنا
- 493 سورۃ الجاثیہ
- 492 سب سے زیادہ کمالی نردود
- 502 گویا میں جنہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہنم سے دور دوڑنا تو بیٹھے ہوئے ہو۔
- 504 تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں جب حساب و کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو ان اعمال ناموں کو لوگوں سے دائیں بائیں ہاتھوں تک لے جائیں گی۔
- 472 دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیر اور ناپسندیدہ ہے
- 479 سورۃ المدخان
- 479 نصف شعبان کی فضیلت کا بیان
- 458 قیامت کی نشانیوں دھواں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا
- 481 ہر بندے کے آسمان میں دو دروازے ہیں ایک دروازے سے اس کا عمل ادا ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نچنے آتا ہے جو آدمی فوت ہے اور دروازے سے نہیں پاتے تو وہ اس آدمی پر روکتے ہیں۔
- 485 دنیاوی مال کی طلب اچھے طریقے سے کرو
- 489 رزق حلال کی تلاش اہم ترین فرض ہے
- 490 جو آدمی حلال روزی لکھتا ہے
- 489 خلافت کا معاملہ قریش میں ہے
- 490 جھگڑا کرنے سے ہی لوگ ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئے
- 491 حوریں اور جنت کے پھل
- 492 قیامت کی نشانیوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر اترنا
- 493 سورۃ الجاثیہ
- 492 سب سے زیادہ کمالی نردود
- 502 گویا میں جنہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہنم سے دور دوڑنا تو بیٹھے ہوئے ہو۔
- 504 تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں جب حساب و کتاب ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو ان اعمال ناموں کو لوگوں سے دائیں بائیں ہاتھوں تک لے جائیں گی۔

- 542 قیامت کے روز کن کا قرض ادا کیا جائے گا
- 506 موت کے بعد اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی ذریعہ نہیں
- 507 تم اپنے گھر والوں اور گھروں کے ذریعے دنیا میں اتنے
- 509 متعارف نہیں ہوں گے جتنے جنت میں
- 515 حضرت عبداللہ بن سلام کے اسلام لانے کا واقعہ
- 521 اپنی ماں سے صلہ رحمی کرو
- 521 حمل کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت
- 522 حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل
- 526 حضور ﷺ اور صحابہ کی زندگی
- 531 حضور ﷺ تبسم فرماتے تھے کھلا کرتے ہوتے
- 531 واردات قلبی پر ان میں سو وفد استغفار
- 531 حضرت محمد کا فرمان جو اپنے آپ کو کافر سے گناہگار نہ
- 550 جانے اس پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حرام ہے
- 553 یزید پر لعنت کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا قول
- 557 نفل نماز اور روزے کو شروع کرنے اس کو توڑنے اور
- اس پر قضا کا حکم
- 538 اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور نکل کی
- 564 مذمت
- 540 دین اگر ثریا میں ہوا جب بھی فارس کے لوگ اسے
- 541 حاصل کر لیں گے۔
- 541 قیدیوں کے بارے میں احسان کرنے اور فدیہ لینے
- 540 کے بارے میں علماء کا اختلاف
- 541 میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ جہاد کرتی رہے گی
- 541 شہداء کے مراتب اور ان کی فضیلت

سورہ سبأ

﴿سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴﴾ ﴿سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴﴾ ﴿سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴﴾ ﴿سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴﴾

سورہ سبأ کی ہے، اس میں چون آیات اور چھ رکوع ہیں

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد العالمين و خاتم النبيين

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهٗ الْاُخْرٰةُ ۗ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۱﴾

”سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور ہر اس چیز کا جو زمین میں ہے۔ اور اسی کے لئے ساری تعریفیں ہیں آخرت میں۔ اور وہی بڑا ہر بات سے باخبر ہے۔“

یعنی سب حمد و ستائش اس ذات اقدس کے لئے ہے جو ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر چیز کا خالق بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ سزا اور جہر آتو صیغہ و تعریف کا صرف وہی مستحق ہے اس کے علاوہ جس کسی کی بھی تعریف کی جاتی ہے وہ مجازی ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس نے غیر کو کوئی ظاہری نعمت پہنچائی ہے ورنہ حقیقت میں ہر کمال و بلندی، جمال و جلال اس ذات ہے مثل کا پرتو ہے۔

یعنی آخرت کی نعمتیں بھی اس کی ملکیت اور تخلیق ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کے جملہ کا لہ الحمد کے جملہ پر عطف، مطلق پر مقید کا عطف نہیں ہے بلکہ مقید کا عطف مقید پر ہے معطوف علیہ اس بات سے مقید ہے۔ گدا اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتوں کی وجہ سے محمود ہے کیونکہ

اسم موصول اور صلہ کے ساتھ صفت بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نبوی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے کمال قدرت اور اتمام نعمت کی وجہ سے دنیا میں بھی وہی حمد و تعریف کا مستحق ہے اور اسی طرح آخرت میں بھی وہی ستائش کے لائق ہے کیونکہ آخرت کی نعمتیں بھی

اس کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کی ملکیت ہیں دوسرے جملہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ) میں ظرف کو اس لئے مقدم فرمایا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی حمد بالواسطہ ہوتی ہے کہ اس شخص کی تعریف کی جاتی ہے جس کے ذریعے نعمت الہیہ میسر آتی ہے تو اس کے واسطہ

سے اللہ تعالیٰ کی دنیا میں حمد ہوتی ہے لیکن آخرت میں چونکہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس کے سوانہ کوئی حقیقت میں کسی چیز کا مالک ہوگا اور نہ مجاز اس لئے وہاں صرف اسی کی حمد ہوگی (اسی حصر کے لئے خبر کو مقدم فرمایا اور مبتدا کو مؤخر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴ وَوَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴ وَوَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ سَبَّحْتَ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۝۵۴ وَوَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا لَكُنَّا مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۱﴾

ستا شئیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (وادمودہ)

۱۔ اس کی شان یہ ہے کہ امور دین کو پختہ فرماتا ہے اور اشیاء کے ظاہر باطن کو بخوبی جانتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَدْخُلُ فِي الْأَمْْرِضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ الرَّحِيمُ الْعَفُورُ ۝

”وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے۔ اور جو اس سے نکلتا ہے نیز وہ جانتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا اور جو آسمان

کی طرف عروج کرتا ہے۔ اور وہی ہمیشہ فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے۔“

۱۔ یہ تعقل کے مقام میں حال یا استیغاف ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے مثلاً بارش کے قطرے جو زمین کے مسام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ ان مردوں اور خزانوں کو بھی جانتا ہے جو زمین کی تہ میں دفن کیے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ زمین سے نکلتا ہے اس سے بھی واقف ہے مثلاً نباتات، کھوپڑیوں اور چشموں کے پانی اور وہ ان مردوں کو جانتا ہے جو قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے اور وہ ان چیزوں سے بھی آشنا ہے جو آسمان سے نیچے اترتی ہیں مثلاً بارشیں، بجلیاں ملائکہ صحیفے، نقاد برزق، قسم قسم کی برکات اور مختلف قسم کے مصائب و آلام وغیرہ۔ اور اسے ان چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے جو آسمان میں عروج کرتی ہیں مثلاً فرشتے اور بندوں کے اعمال اور ان کی بجز و نیاز میں ذوقی ہوئی دعائیں وغیرہ۔

۲۔ وہ رحیم ہے، بندوں کی ہر ضرورت کو اتارتا ہے اور وہ غفور ہے نعمتوں پر ناشکری میں کوتاہی کرنے والوں کو بھی معاف فرمادیتا ہے۔ یہ جملہ تعلم پر معطوف ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ كُلُّ بَلِيٍّ وَرَسُولٍ لَنَا نَبِيًّا عَلِيمٍ
الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْعُرًا
مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرًا إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝

”اور کفار کہتے ہیں ہم پر قیامت نہیں آئے گی، آپ فرمائیے ضرور آئے گی مجھے اپنے رب کی قسم جو عالم الغیب ہے تم پر قیامت ضرور آئے گی۔ انہیں سمجھی ہوئی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں ہے اور نہ کوئی چھوٹی چیز ذرہ سے اور نہ کوئی بڑی چیز مگر وہ کتاب مبین میں (درج) ہے۔“

۱۔ کفار جو قیامت کے وقوع کے منکر تھے۔ یہاں ان کے انکار کا ذکر ہے۔ اور یہ جملہ ایک متعدد جملہ پر معطوف ہے جو لہ الحمد فی الاخرة و هو الرحيم الغفور کے ارشاد سے مفہوم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنی حمد کرنے والوں کی مغفرت فرمائے گا اور ان پر اپنی رحمت فرمائے گا۔

۲۔ ہلکی کے کلمہ سے ان کے کلام کا اور جس چیز کی انہوں نے نفی کی تھی اس کا اثبات فرمایا ہے۔ اور وہی قسم ہے ہلکی کے کلمہ سے جو ایجاب فرمایا تھا تَنْتَبِئْتُمْ اس ایجاب کی تکریر کے لئے ہے اور پھر اس ایجاب کو قسم کے ساتھ مؤکد فرمایا ہے اور قسم یہ ”رَبِّي“ کا غلبہ الغیب سے وصف بیان فرمایا ہے کیونکہ قسم یہ کی عظمت، مقسم کی حالت کی قوت کا شعور دیتی ہے۔ اس صفت (عالم الغیب) میں اشارہ

ہے کہ قیامت کا وقوع غیب ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے اثبات کے لئے شہادت الہیہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے غیب کی کسی چیز کا (حاکمیت کرنا) اور نفی کرنا جائز نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ماننے سے اور تعظیم دینے سے کوئی دوسرا غیب کی خبر دے سکتا ہے۔

حزہ اور کسائی نے فعال کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ علام پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فاعل کے وزن پر پڑھا ہے، ناش اور ابن عامر نے عالم الغیب کو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اس کا مبالغہ خبر ہے۔ باقی قراء نے اسے محذوف پڑھا ہے کیونکہ یہ رب کی صفت ہے۔ جس طرح انکار شدید تھا اسی طرح ان کا رد بھی بڑے زوردار انداز میں فرمایا ہے۔ انکے انکار کی بنیاد ان کی جہالت اور حماقت پر تھی اور وہ دوسری ممکنات کی طرح وقوع قیامت کے امکان کو بھی بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس قیامت کو ثابت کرنے والا عالم الغیب ہے جو ہر ذرہ اور ہر قطرہ کو جانتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے قیامت کا لامناہن ہے۔

اس کسائی نے بعض ذل کو زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان دونوں قراء توں کا معنی ایک ہے یعنی آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو یا مستقبل سے ہو یا حال سے ہو۔ یہ قول درست نہیں ہے کئی احوال جو چیز آسمانوں اور زمین میں سے وہ اس سے مخفی نہیں ہے کیونکہ یہ جملہ عالم الغیب کی تاکید کے طور پر واقع ہوا ہے اور اس مفہوم کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ رب کریم کا علم کائنات کی ہر چیز کو شامل ہے خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہے یا مستقبل سے ہے۔ فی الحال تمام ایشیا بعض مخلوق کے لئے بھی حاضر ہوتی ہیں جیسے ہم نے سورۃ الانعام میں آیت کریمہ تو فہدہ سلسلنا فی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ بارگاہ رسالت آب ﷺ میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ملک الموت ایک ہے جبکہ مشرق و مغرب میں دو لشکر آپس میں لڑتے ہیں۔ درمیان میں کچھ بچے پیٹوں سے گرتے ہیں اور ہلاکتیں ہوتی ہیں (ان سب کی رو میں بیک وقت دو کیسے قبض کرتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا ملک الموت ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ اس طرح ہے جیسے میرے سامنے تھاں ہے کیا اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ اس آیت کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زمانے اور جو کچھ ماضی حال مستقبل میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہیں اور وہ خود زمانہ سے خارج ہے جیسا کہ تمام امکان اور مکانات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہیں اور وہ خود مکان سے خارج ہے نہ اس پر زمانہ جاری ہوتا ہے اور نہ کوئی مکان اسے گھیرتا ہے۔ پس زمانہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حادث ہے اور اس کا حدوث بھی ذاتی ہے، اسی طرح مکان بھی اس کی مخلوق ہے۔ چنانچہ ماضی اور مستقبل اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہیں جیسا کہ تمام مکان اس کی نسبت سے برابر ہیں۔ اس نظریہ پر بعض اکابر علماء نے تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت حلال دوانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ انزواء میں فرماتے ہیں جب تو امتداد زمانی کو حوادثات کوینہ کے ساتھ یکبارگی دیکھے گا جو امتداد زمانی تغیر و تبدل کا مکمل اور حوادث کوینہ کا عرض ہے تو تو اسے علت اولیٰ کی شانوں میں سے ایک شان پائے گا جو شان تمام شیون متناقصہ کو محیط ہے پھر جب تو مزید عمیق نظر سے دیکھے گا تو تجھے اس امتداد کی حدود کا حضور اور ضمیمہ بت زمانیات کی نسبت سے اس شان کے احاطہ میں نظر آئے گا اور مراتب عالیہ کی نسبت سے حوادث متعاقبہ میں کوئی تعاقب نہیں ہے بلکہ مراتب عالیہ کی نسبت سے تمام حوادث حضور میں برابر ہیں پس جو بلند یوں کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہیں ان کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے کوئی صبح اور شام نہیں ہے۔ سمیہ۔ اگر تم کلوی کے رنگ میں مختلف اجزاء کو دیکھو تو اس کے اجزاء میں رنگ مختلف ہوگا پھر اگر اسے تم ذرہ کے برابر ذرہ

حتیٰ کہ آنکھ اس کے تمام اجزاء کے احاطہ سے عاجز آجائے تو وہ مختلف رنگ حدتہ کی لٹکی کی وجہ سے حضور میں متعاقب نہ ہوں گے بلکہ تیرے احاطہ کی قوت کی وجہ سے حضور میں متقارب ہوں گے۔ فَاعْتَبِرُوا يٰۤاُولِيَ الْاَبْصَارِ۔

فائدہ: کبھی بھی اللہ کے کسی نیک بندے پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی قید سے نکل جاتا ہے اور وہ ماضی اور مستقبل کو اپنے ہاں برابر دیکھتا ہے۔ اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی وہ روایت ہے جو عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں سورج گرہن لگا تو رسول اللہ ﷺ اور لوگوں نے نماز کسوف پڑھی آپ ﷺ نے اس نماز میں بہت طویل قیام فرمایا آگے طویل حدیث ہے آخر میں ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم دیکھ رہے تھے کہ آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کسی چیز کو پکڑ رہے ہیں پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس سے آگوشہ کا ایک گچھا بکڑا۔ اگر میں وہ گچھا تو ڈین تو تم اس سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے اور میں نے آگ دیکھی جس آج کے دن کی طرح میں نے کبھی بھی بھیا تک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ دوزخ میں زیادہ عورتیں ہیں (اللہ رب العالمین) یہ ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کا آگ میں دخول قیامت کے بعد ہوگا حالانکہ نبی کریم ﷺ نے وہ منظر اس وقت دیکھا تھا۔ یہ نہیں کہا جاسکے گا کہ شاید نبی کریم ﷺ نے دوزخ اور جنت کی صورت عالم مثال میں دیکھی ہو جیسے خواب میں سونے والا دیکھتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”اگر میں تو ڈین تو تم رہتی دنیا تک کھاتے رہتے“ بالکل صریح ہے کہ آپ ﷺ نے جنت اور دوزخ کو حقیقہ دیکھا تھا ان کی مثالیں نہیں دیکھی تھیں۔ اسی طرح امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور میں نے ابو طلحہ کی بیوی کو دیکھا اور میں نے اپنے سامنے چلنے کی آواز سنی تو وہ حضرت بلال کے چلنے کی آواز تھی (2)۔ اسی طرح امام احمد ابو داؤد اور انبیاء نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میرے رب عزوجل نے مجھے معراج عطا فرمائی تو میں ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہاتھ تانبے کے تھے۔ وہ اپنے چہروں اور سینوں کو خود نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا اسے جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتیں لوٹتے تھے (3)۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر آگ پیش کی گئی میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت دیکھی جسے ایک ٹہنی کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا جس کو اس نے باندھ دیا تھا۔ نہ اسے کھانا کھلاتی اور نہ اسے چھوڑتی کہ وہ مشرقات ارض کھائے (4)۔ حتیٰ کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گئی۔ میں نے عمر بن عامر الخزامی کو دیکھا کہ وہ اپنی استریاں آگ میں چھیت کر رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے ساڑھ چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔

یہ اکثر مفسرین فرماتے ہیں لا یعزب عنہ کا معنی یہ ہے کہ اس کے علم سے ذرہ برابر کوئی چیز چھٹی نہیں ہے اور نہ ذرہ سے کوئی چھوٹی اور نہ ذرہ سے کوئی بڑی چیز چھٹی ہے۔ یہ جملہ عذوب (چھپنے) کی لٹکی کی تاکید کے لئے ہوگا۔ اگر عذوب سے مراد اس کے علم سے عذوب (چھپنا) ہو۔ یا کتاب مبین سے مراد اللہ کا علم ہو یا لوح محفوظ جو اس کے علوم غیر متناہیہ کا بعض ہے۔ اگر لا یعزب عنہ کا مطلب یہ ہو کہ اس کی ذات سے کوئی چیز چھٹی نہیں ہے تو یہ جملہ تائیس ہوگا، تاکید نہ ہوگا۔ اصغر اور اکبر مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہیں اور اس کی تائید بالفح کی قرأت کرتی ہے جس میں لافحی جملہ عمل کرایا گیا ہے۔ اصغر اور اکبر کا متغال پر مرفوع کی حیثیت سے اور ذرہ پر جملہ تر

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 144 (ذرات تعلیم)
2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 292 (قدیمی)
3- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 313 (ذرات تعلیم)
4- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 297 (قدیمی)

میں متفوح کی حیثیت سے عطف جائز نہیں ہے، (کل جر کی صورت میں فتح اس لئے ہوگا کیونکہ یہ دونوں غیر منصرف ہیں) (مستقال اور ذرہ پر عطف اس لئے جائز نہیں ہے کیونکہ استثناء کی وجہ سے معنی میں فساد واقع ہوتا ہے اور الّا حرف استثناء کو لکن کے معنی میں کر کے مستثنیٰ منقطع بنانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ استمداد اور استثناء منقطع نفی کے بعد اثبات ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ذرہ برابر کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور نہ کوئی چھوٹی بڑی چیز اس سے پوشیدہ ہے لیکن جو کتاب میں ہے وہ پوشیدہ ہے یہ معنی فاسد ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ایک صورت میں معنی صحیح ہو سکتا ہے کہ ”عنا“ کی ضمیر کا مرع غیب کو بنایا جائے اور لوح محفوظ میں جو ثبات ہے اس کو غیب سے خارج کیا جائے کیونکہ وہ دیکھنے والوں (فرشتوں) پر ظاہر ہوتا ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ غیب سے کوئی چیز جدا نہیں ہے مگر وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے (۱) یہ تو جہد ضعیف ہے جیسا کہ امام بیضاوی کے انداز کلام سے ظاہر ہے کیونکہ لوح محفوظ میں ہونا اس کو غیب سے خارج نہیں کرتا اور مسلسل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ اور اس تو جہد کا مدعی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور سورہ یونس میں یہ آیت کریمہ اس طرح ہے لَا يُدْرِكُهُ الْبَصَرُ وَلَا يَشْفَعُ لَدَيْهِ شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ وَهُوَ يُدْرِكُ الْوَعْدَ الَّذِي فِي الْأَنْفُسِ لَا يُدْرِكُهُ الْبَصَرُ وَلَا يَشْفَعُ لَدَيْهِ شَيْءٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ (ترجمہ) اور نہیں پھنچا ہوا آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔ وہاں امام بیضاوی کی اس تو جہد کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ کلام مدح بما یشبه اللہ (۱) کے طریق پر ہے جیسا کہ اس ارشاد میں وَصَلَتْكُمْ وَأَوْسَلْتُمْ إِلَىٰ أَنْ تَكُونُوا بِمِثْلِهِمْ (ترجمہ) اور نہیں ناپسند کیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر۔ اسی طرح عرب بولتے ہیں وَنُذِرُ لَا غَيْبَ فِيهِ إِلَّا أَنَّهُ غَالِمٌ (زید میں کوئی غیب نہیں ہے مگر وہ عالم ہے) یعنی اس میں کوئی غیب نہیں ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ذرہ برابر چیز پوشیدہ نہیں ہے مگر کتاب میں اس کا حکم موجود ہے پھر وہ اس سے غائب و پوشیدہ کیسے ہو سکتی ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿۱۰﴾

” (قیامت آئے گی) تاکہ اللہ تعالیٰ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، یہی وہ نیک (نیک بخت)

لوگ ہیں جن کے لئے بخشش اور رزق کریم ہے۔“

۱۔ یہ قیامت کے آنے کی حکمت بیان ہو رہی ہے۔ اور یہ لعنتیہ کم کے قول کی علت ہے۔

۲۔ عودیت کے وہ حقوق جن کی ادائیگی ممکن نہ تھی ان کی ادائیگی میں تصور کو معاف کرنے کا یہ مزد ہے۔ اور جو انہوں نے نیکیاں اور اچھے اعمال کئے ان کی جزاء کے طور پر جنت میں عمدہ رزق عطا کیا جائے گا، جس پر نہ کوئی مشقت برداشت کرنی پڑے گی اور نہ اس پر احسان جتلیا جائے گا۔

وَالَّذِينَ سَعَوْا لِأَيْتَامَاهُمْ كَسِبَتْ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۱﴾

” اور جو (بد بخت) کوشش کرتے رہے ہیں کہ ہماری آیتوں کو جھٹلا کر ہمیں ہرادیں یہی جن کے لئے بدترین قسم کا درد

ناک عذاب ہے۔“

۱۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا رزونی، جلد 4، صفحہ 391 (الغزلی)

(۱) ایسی تعریف جو خدمت کے مشابہ ہو، منصف والا یہ سمجھے کہ تعریف کے بعد منظم عیب بیان کرنے والا ہے لیکن منظم پھر اپنے محدود کی تعریف کرے۔

۱۔ اس کا عطف الذین امنوا پر ہے اور یہ لیجزی کا مفعول ہے۔ یعنی قیامت برپا کی جائے گی تاکہ جو لوگ اپنی ساری توانائیاں ہماری آیتوں کو جھٹلانے اور ان سے لوگوں کو متغیر کرنے میں کوشاں ہیں ان کو سزا دی جائے۔ معجزین کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے معجزین باب تفعیل سے جنم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی جو ایمان لانے کا ارادہ کرے اسے اس سے روکیں) باقی قراء نے باب مفاعل سے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز کرنا چاہتے ہیں اور قدرت خداوندی کو مغلوب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ ہم سے آگے ٹھکانا چاہتے ہیں اس گمان سے کہ ہماری ان لہجہ باتوں سے شاید قیامت برپا کرنے کا ارادہ بدل جائے گا اور عقاب و سزا کو قبول تبدیل ہو جائے گا۔

قماہ فرماتے ہیں رجز سے مراد سخت عذاب ہے اور رکن بیانیہ ہے۔ (۱) الیم سے مراد ذوالیم ہے۔ یعنی درد ناک عذاب۔ ابن کثیر، حفص اور بیضاوی نے یہاں بھی اور سورۃ العنکبوت میں الیم کو مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ عذاب کی صفت ہے۔ باقی قراء نے رجز کی صفت ہونے کی بناء پر مفعول پڑھا ہے۔

وَيَسَىٰ الذِّبْنَ اَوْ تَوَالِعِمْ اَلَّذِي اُنزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَ يَهْدِي
اِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ①

”اور جانتے ہیں وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہی (یعنی) حق ہے اور عزت والے سب خوبیوں پر ہے (خدا) کا راستہ دکھاتا ہے“

۱۔ یہاں یسی یعنی معلوم ہے۔ اور یہ بلی لتائین کے مضمون پر معطوف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لیجزی پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اوتوالعیم سے مراد اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے علماء ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور آپ کے دوسرے ساتھی۔ حضرت قماہ فرماتے ہیں اس سے مراد صحابہ کرام (2) اور ان کے بعد آنے والے مومنین ہیں۔ یعنی جس طرح صاحب علم لوگ اب دلائل کے ذریعے یقین رکھتے ہیں کہ قیامت ضرور برپا ہوگی اسی طرح قیامت کے برپا ہونے کے وقت وہ اس کے حق ہونے کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے۔

ع۔ اَلَّذِي اُنزِلَ اِلَيْكَ سے مراد قرآن حکیم ہے اور یہ یسی کا مفعول اول ہے اور الحق مفعول ثانی ہے اور ضمیر فصل ہے اور جنہوں نے الحق کو مرفوع پڑھا ہے ان کے نزدیک مومبتدا اور الحق خبر ہے پھر پورا جملہ یسی کا مفعول ثانی ہے۔ اور یسی کا جملہ مستأنف ہے، اس کا ما قبل کلام سے تعلق نہیں ہے (اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ صاحب علم لوگوں کے متعلق خبر دے رہے ہیں کہ وہ قرآن کو حق تسلیم کرتے ہیں اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن حکیم صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور وہ ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت واقع ہوگی اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ جبکہ جاہل لوگ آیات کی تکذیب میں کوشاں ہیں) تو اس جملہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ جاہل اور آیات کو جھٹلانے والوں پر صاحب علم لوگوں کے ذریعے استہزا فرما رہے ہیں۔

ع۔ یسیدی کا فاعل یا اللہ تعالیٰ ہے یا اَلَّذِي اُنزِلَ اِلَيْكَ ہے صراطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ سے مراد اسلام ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نُنَدِّكُمْ عَلٰى رَاجُلٍ يَّبِيْنَكُمْ اِذَا مَرَّ قَتْمٌ كُلُّ مَسْرُوْقٍ ۙ

سے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آنے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور پتھر سے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت مبارک تھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے والی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آکر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خورد بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ نگار کا کوئی ایسا سبب پیدا فرما دے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زرہ سازی کا ہنر سکھایا۔ جب سے پہلے زرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء و مساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زرہ بنا لیتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غرباء و مساکین پر صدقہ کرتے تھے (1)۔

حضرت مقدم بن معد کعب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے (2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت کہی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے (3)۔

أَنْ اَعْمَلَ سِعْيَةً وَقَدَّرَ فِي السَّرِّ دَوَّاعِمَهُ اَصَالِحًا ۝ اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

”اور (کلمہ دیا) کہ کشادہ زرہ ہیں بناؤ اور (انگے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں!“

۱۔ اعمل سے پہلے ان مصدر یہ یا مفرہ ہے۔ سِعْيَةً سے مراد مکمل اور کشادہ زرہ ہیں جنہیں پہننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بننا ہے۔ یعنی زرہ ہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے مکمل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہ ہیں تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود انکھسی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحاً مفقویت یا مصدریت کی بناء پر منسوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزا دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ صَالِحًا (الحدیث 4)۔

2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (ادارے تعلیم)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (انتہاریہ)

4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (تذیبی)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (انتہاریہ)

اور ہماری بادشاہی سے خردج پر قادر نہیں ہیں، یعنی جب اپنی مجبوری اور اپنا نرنے میں ہوتا دیکھ چکے ہیں تو اب انہیں ذرا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کیسے انہیں زمین میں دھنسا نہ دے جیسا کہ اس نے قارون کے ساتھ کیا تھا۔ یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا مراد سے جیسے اس نے قوم لوط پر آسمان سے پتھر برسا کے تھے جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول اور آیات کی تکذیب اور انکار کیا تھا۔

یہ آسمان اور زمین جس کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت امرنے کے بعد اٹھنے اور منکرین خدا کو عذاب دینے کے جواز پر کھلی دہل ہیں لیکن اس شخص کے لئے جو تہ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ کیونکہ ایسا شخص ہی قدرت کی نشانیوں میں کثرت سے غور و فکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَمُوسَىٰ قُوَّةً وَإِسْحَاقَ إِسْحَاقًا وَأَيُّوبَ إِسْحَاقًا ۗ وَإِسْحَاقًا إِسْحَاقًا ۗ وَإِسْحَاقًا إِسْحَاقًا ۗ وَإِسْحَاقًا إِسْحَاقًا ۗ

”بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جناب سے بڑی فضیلت بخشی۔ (ہم نے حکم دیا) اسے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مل کر اُترنے اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا۔ نیز ہم نے لوط کو اس کے لئے نرم کر دیا۔“

یعنی حضرت داؤد کو ہم نے بہت سے اپنے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اس کی دہل یا ارشاد ہے جہاں بندوں پر فضیلت دینے کا ذکر ہے الحمد للہ الذی فضلنا علی کثیر من عبادہ المومنین۔

ان کرم نوازیوں اور کرم گستری میں نبوت کتاب بادشاہی حسن صوت اور لوہے کا نرم ہونا سب شامل ہیں۔ فضلاً آتینا کامفعول ہے اور ”منا“ اس کا حال ہے۔

یہ فضلاً سے بدل ہے یا قول کی تفسیر کے ساتھ آتینا سے بدل ہے، نقد بریوں ہوں گی قلنا یا جبال اوبی معہ۔ یعنی اسے پہاڑوں! اس کے ساتھ تسبیح بیان کرو۔ ایاب کا معنی لوٹنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام تسبیح کریں تو تم بھی تسبیح کرو۔ یا ایاب کا معنی تسبیح کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اؤب۔ جب کوئی تسبیح بیان کرے کیونکہ تسبیح کرنے والا ہرگز نہیں سے منہ موزر کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قہمی کہتے ہیں یہ النواویب فی السیر سے مشتق ہے، جس کا معنی پورا دن چلنا ہے اور رات کو نوزل کرنا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا جب دن چڑھے تو تم اس کے ساتھ تسبیح کرتے ہوئے چلو۔ وہ سب فرماتے ہیں اوبی معہ کا معنی نوحی معہ ہے یعنی اس کے ساتھ نوحہ کرو۔

سے الطیر۔ الجبال پر معطوف ہے یعقوب نے لفظ پر محمول کرتے ہوئے الطیر کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور فضلہ پر معطوف کے اعتبار سے یا اوبی کے مفعول معہ کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اوبی کی ضمیر پر معطوف ہو۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اصل عبارت اس طرح تھی ولقد آتینا داؤد منا فضلاً وہی تاویب الجبال و الطیر۔ لیکن عظمت الہیہ اور شان کبریائی کے اظہار پر دلالت کرنے کے لئے اسلوب بیان کو تہذیب فرما دیا گویا پہاڑ اور پرندے بھی عقلاء کی طرح اس کے حکم کے سامنے سر اٹگندہ ہیں اور ہر چیز میں اس کی مشیت کا فرما ہے (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کرتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے تو وہ بھی آپ کی طرح تسبیح کرتے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام کو کزوری لاحق ہوتی تو آپ کو چوکانا اور آپ کے جذبات کو برا بھلا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں کی تسبیح سنا تے۔

جسے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آنے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور تھوڑے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت سارا کرتھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے وانی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آکر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ روزگار کوئی ایسا سبب پیدا فرمادے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زہرہ سازی کا ہنر سکھا دیا۔ جس سے پہلے زہرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زہرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء و مساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زہرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غربا و مساکین پر صدقہ کرتے تھے (1)۔

حضرت مقدم بن معد کعبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے (2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت لکھی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے (3)۔

أَنِ اعْمَلْ سِعْيَةً وَاكْفُرْ فِي السَّرِّ وَاَعْمَلُوا صَالِحًا ۗ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۰﴾

”اور (کھم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (انکے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں۔“

۱۔ اعمل سے پہلے ان صدر یہ یا مفسرہ ہے۔ سِعْيَتَہ سے مراد مکمل اور کشادہ زرہ ہیں جنہیں سیننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بنانا ہے۔ یعنی زرہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے کیل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہیں تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود اکٹھی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحا مفوعولیت یا مصدریت کی بناء پر منسوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزا دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ كُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (الحديث 4)۔

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)

1- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (انجاریہ)

4- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (قدیمی)

3- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (انجاریہ)

وَأَسْأَلُكَ عَيْنَ الْقَطْرِ وَمِنْ
الْعَجْرِ مَنْ يَعْبُدُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يُوَعِّدْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا لِنُقِضَهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝

”اور ہم نے سخر کردی سلیمان کے لئے ہوا۔ اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی ہے اور ہم نے جاری کر دیا ان کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ اور کئی جن (ان کے تابع کردئے) جو کام میں جتے رہتے ان کے سامنے ان کے رب کے اذن سے ہے اور جو مرتابی کرتا ان میں سے ہمارے عہد (کی تعمیل) سے تو ہم اسے چکھاتے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب ہے“

۱۔ البکر نے عام کی روایت سے الویع کو مرفوع پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ اس کی خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے ولسلیمان الویع مسخورة۔ جملہ اسمیہ ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ حضرت سلیمان کے لئے ہوا کا مسخر ہونا عوام الناس میں ثابت شدہ امر تھا اور زبان زد عام تھا۔ یا الویع اس بناء پر مرفوع ہے کہ یہ مسخوف فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے مسخو سلیمان الویع۔ باقی قراء نے الویع کو منصوب پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف مسخونا کا مفعول ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے مسخونا لسلیمان الویع۔ پھر یہ جملہ یا جبال ابوی معہ والطیر کے کلام سے منہوم انہ مسخونا مع داود الجبال بسبحن والطیر پر معطوف ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ سورۃ الانبیاء میں ذکر بھی ہے۔

۲۔ یہ جملہ مستانہ ہے، یعنی صبح سے زوال تک ایک ماہ کی منزل طے کرتی اور زوال سے شام تک بھی ایک ماہ کی منزل طے کرتی۔ حضرت اہسن فرماتے ہیں حضرت سلیمان صبح دمشق سے چلے تو قیلوہ اسطخر میں فرماتے اور ان دونوں شہروں کے درمیان ایک ماہ کی مسافت ہے۔ پھر اسطخر سے چلے اور رات باہل میں گزارتے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان بھی ایک تیز رفتار سوار کے لئے ایک ماہ کی مسافت ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ صبح کا کھانا یہ میں تناول فرماتے اور شام کا کھانا سمرقند میں کھاتے (۱)۔

۳۔ القطر کا معنی پگھلا ہوا تانبا ہے۔ واسلنا الخ کا عطف مسخونا لسلیمان الویع کے جملہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری فرمایا ہے۔ چونکہ وہ تانبا پانی کی طرح کان سے نکلتا تھا اس لئے اسے ”عینا“ (چشمہ) فرمایا ہے امام بغوی لکھتے ہیں کہ اہل تفسیر فرماتے ہیں تانبے کا چشمہ آپ کے لئے یمن کی طرف پانی کی طرح جاری کیا گیا تھا۔ اب بھی یمن کے باشندے اس سے منفعت حاصل کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جاری فرمایا تھا (۲)۔

۴۔ الویع کی مرفوع تقدیر کی صورت میں من موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہوگا اور خبر مسخورة محذوف ہوگی اور من العجن۔ بعمل کی ضمیر مستتر سے حال ہوگا اور اس جملہ اسمیہ کا عطف ”الویع مسخورة“ جملہ اسمیہ پر ہوگا۔ اور الویع کی منصوب تقدیر کی صورت میں اسم موصول الویع پر معطوف ہوگا اور من العجن اسم موصول سے حال مقدم ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مسخونا لہ من يعمل بین یدیه من العجن۔ باذن ربہ، بعمل کے متعلق ہے۔ اور اس کا معنی ہامرہ و حکمہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم سے) یا بار اذتہ و تسخیرہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی تسخیر سے) ہے۔

۵۔ اور جنوں میں سے جو حضرت سلیمان کی فرمانبرداری اور تابعداری میں کوتاہی کا مظاہرہ کرتا، ہم اسے آگ کے عذاب کا مزہ چکھاتے۔ بعض علمائے زمانے ہیں عذاب سے مراد عذابِ آخرت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد وہ نیاں آگ سے جلا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ان اور امر سے مراد امرِ تکفیلی ہو تو پھر عذاب کی تفسیر عذابِ آخرت سے مناسب ہے کیونکہ آخرت ہی دارِ جزاء ہے اور اگر ان سے مراد ارادہ اور تفسیر ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر عذاب سے مراد عذابِ دنیا ہوگا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جنوں پر ایک فرشتہ مسلط فرمایا تھا جس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا تھا، جو جن حضرت سلیمان کے حکم سے مرتبائی کرتا تو وہ فرشتہ اسے آگ کا کوڑا مارتا جو اسے جلا دیتا (۱)۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے جنوں سے کام کا ارادہ کیا تھا تو پھر جنوں سے عدول اور نافرمانی کیسے ممکن تھی کیونکہ ان کی مرتبائی اور عدول تسلیم کیا جائے تو ارادہ الہیہ سے مراد کتخت ہونا لازم آتا حالانکہ ارادہ الہیہ سے مراد کتخت محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ من الجن میں من بمعنی یہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ بعض جن حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں آئیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر فرمایا تھا جو اس جن کو عذاب دیتا تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اعراض کرتا۔ ظاہر میں اکثر جنوں کا حضرت سلیمان کی خدمت کرنے کا یہی سبب ہے۔ یا یہ معنی ہوگا کہ جو ان میں سے عدول اور نافرمانی کا ارادہ کرتا تو فرشتہ اسے مزاد دیتا تھی کہ وہ انحراف چھوڑ دیتا اور مطیع و فرمانبردار بن جاتا۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَسَائِبٍ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُومٍ
شَرِيسٍ ۗ اُعْمُوا آلَ دَاوُدَ سُكُورًا ۗ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِينَ ﴿۵﴾

”وہ بناتے آپ کے لئے جو آپ چاہتے ہیں مہارتوں اور لہجوں سے بڑے بڑے لگن جیسے حوض ہوں اور بھاری دھلیں جو چاہوں پرچی رہتیں۔ اے داؤد کے خاندان والو! (ان نعمتوں پر) شکر ادا کرو۔ جو ابہر ت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں۔“

۱۔ يَعْمَلُونَ لَهُ۔ یا تو سابقہ آیت میں یعمل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ متانفہ ہے۔ محارِب سے مراد مضبوط قلعے اور اونچی اور بلند وبالا مساجد اور خوشنما محلات ہیں۔ ان کو محارِب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پر آسانی سے قبضہ نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا دفاع کیا جاتا ہے اور ان کی خاطر جنگ کی جاتی ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ جنوں نے جو عبادت گاہیں حضرت سلیمان کے حکم سے بنائی تھیں ان میں بیت المقدس بھی تھا۔ اس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی تھی اور آدمی کے قدم کے برابر دیواریں کھڑی بھی کی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے اس گھر کی تعمیر تیرے ہاتھوں مکمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا لیکن تیرے بعد تیرے بیٹے کو اقتدار عطا کروں گا اور اس کے ہاتھوں اس کی تکمیل کروں گا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا وصال ہوا اور حضرت سلیمان ان کی مسند پر آئے تو انہوں نے بیت المقدس کی تکمیل کا پروگرام بنایا۔ آپ نے جنوں اور شیطانوں کو جمع کیا اور ان میں کام اور ذیوائی کو تقسیم فرمایا۔ ہر گروہ کو وہ کام سونپا گیا جو وہ کر سکتا تھا۔ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں اور شیطانوں کو بھیجا کہ سفید رنگ مرمر لے آؤ۔ پھر آپ نے سنگ مرمر اور چٹانوں سے شہر کی بنیادیں بنانے کا حکم دیا۔ آپ نے بارہ محلے بنائے اور ہر محلے میں ایک ایک قبیلہ کو بسایا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ جب آپ شہر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو مسجد بنانے کا پروگرام بنایا۔ شیطانوں کے گروہوں کو مختلف چیزیں لانے کے لئے حکم فرمایا۔ بعض کو حکم دیا کہ وہ سونا

چاندی اور یاقوت معادن سے اور سچے موتی سمندر سے ڈھونڈ کر لے آئیں۔ ایک گروہ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ جواہر اور پتھر لے آئیں۔ ایک گروہ کو کستوری، عنبر اور دوسری پاکیزہ خوشبوئیں لانے پر مقرر فرمایا۔ پس آپ کے حکم سے اتنا خام مال اکٹھا ہو گیا کہ اس کی مقدار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم تھی۔ اس کا شمار انسانی عقل سے وراہ تھا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے معماروں کو بلایا اور انہیں بلند اور بڑے بڑے پتھروں کے گھرنے اور تراشنے کا حکم دیا۔ اور ان کی تختیاں اور پلیٹیں بنانے کا ارشاد فرمایا۔ پھر جواہر کی اصلاح اور موتیوں کے سوراخ نکالنے کا کام شروع فرمایا۔ مسجد کی تعمیر اس طرح ہوئی کہ اس میں سفید زرد و سبز پتھر استعمال ہوا اور اس کے ستونوں پر صاف شفاف پتھری پلیٹیں لگائی گئیں اور چھت پر قیمتی جواہر کی تختیاں لگائی گئیں۔ چھت اور دیواروں پر موتی اور یاقوت اور یاقوت اور دوسرے جواہر لگائے گئے۔ فرش پر فیروز کی تختیاں بچھائی گئیں۔ اس زمانہ میں بیت المقدس سے زیادہ منور اور خوش منظر کوئی دوسری عمارت نہ تھی۔ وہ اس طرح چمکتی تھی جیسے چودھویں کی رات چاند چمکتا ہے۔ جب تعمیر وترتیب کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو آپ نے بنی اسرائیل کے علماء کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ گھر خاصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بنایا گیا ہے اور اس میں ہر چیز خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس دن آپ اس عظیم کام سے فارغ ہوئے تو اس دن کو بطور عید منا (۱۷)۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمادیں اور اسی گھر امید ہے کہ تیسری چیز بھی اس کو عطا فرمادی ہوگی۔ پہلی درخواست یہ تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو پر از حکمت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا پوری فرمادی۔ دوسری گزارش یہ کی کہ انہیں ایسی بادشاہی عطا کی جائے جو کسی فخر کو پھر کبھی میسر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خواہش بھی قبول فرمائی۔ تیسری عرض یہ کہ جو اس مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے جیسے بچہ اس دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے جس دن والدہ اسے جنم دیتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بھی عطا کر دی ہوگی۔ علامہ بخاری نے اس حدیث کو روایت کیا ہے (۲)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا انسان کی اپنے گھر میں نماز ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد قیام میں کبھی نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور جامع مسجد میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور مسجد انصاری کی ایک نماز ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور میری مسجد کی ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ثواب کی کثرت کی نیت سے سفر نہ کرو مگر تین مساجد کی طرف ثواب کی زیادتی کی نیت سے سفر کرو۔ مسجد حرام، مسجد انصاری اور میری یہ مسجد۔ (بخاری مسلم)

مسئلہ: کیا سونے اور چاندی یا اس جیسی دوسری چیزوں سے مساجد کی آرائش اور ترتیب جائز ہے یا نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مسجد کی آرائش اور ترتیب نہ کرو ہے کیونکہ اس میں مال کا ضیاع ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مساجد کو پختہ کرنا کتنا برا ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مساجد کی ضرورت آرائش ہوگی جیسا کہ یہود نے اپنے عبادت خانوں کی آرائش کی تھی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کی نشانیوں میں سے مساجد کی ترتیب اور آرائش بھی ہے۔ اور بعض

علماء فرماتے ہیں تزئین و آرائش کرنا قربت ہے کیونکہ اس میں مسجد کی تعظیم ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیت المقدس کی مسجد کی تزئین کرنا اس قول کی تائید کرتا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مسجد کی تزئین اور آرائش اس وقت جائز ہے جب کوئی اپنے مال سے خرچ کر کے ایسا کرے۔ مسجد کے متولی کے لئے صرف اتنا جائز ہے کہ وہ مسجد کی مضبوطی کے لئے وقف مال سے خرچ کرے۔ تزئین و آرائش اور زیب و زینت کے لئے خرچ نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو ضامن ہوگا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد کی آرائش پر خرچ کرنے کی نسبت فقیر کو مال دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک مسجد میں پگڑ ساج اور سونا کے پانی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علماء کا لایا جس (کوئی حرج نہیں) فرمانا اشارہ ہے کہ مسجد کی تزئین پر خرچ کرنے سے اجرت نہیں لے گا لیکن خرچ کرنے سے گنہگار بھی نہ ہوگا، ہاں یہی اسی طرح لکھا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ رات باریک باریک نقش و نگار بنانے میں بے خصوصاً محراب میں دقیق نقش بنانا مکروہ ہے یا کراہت اس صورت میں ہے کہ تزئین تو کی جائے لیکن نماز ترک کی جائے۔ یا تزئین تو ہو لیکن حقوق مسجد ادا نہ کئے جائیں مثلاً لوگ مسجد میں دنیا کی باتیں کرتے ہوں اور آوازوں کو بلند کرتے ہوں۔ جیسا کہ سرکار کی حدیث میں اشارہ ہے "کسا کس دل ایمان سے خالی ہیں" نہیں کہتا ہوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کو تزئین مسجد کے لئے دلیل بنانے سے نبی کریم ﷺ کی حدیث کی اتباع بہتر ہے کیونکہ سابقہ شریعتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن جب ہماری شریعت میں سابقہ کسی شریعت کے حکم کے مخالف کوئی قول نہ ہو پھر سابقہ شریعت کے حکم پر عمل کرنا جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد کی تزئین کرنا ایک خاص غرض پر مبنی تھا اور وہ غرض یہ تھی کہ شیطان اس کام میں مصروف رہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ ملے۔ واللہ اعلم۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں مؤمنین فرماتے ہیں کہ بیت المقدس حضرت سلیمان کی فیادوں پر قائم رہا اور اس میں کوئی تعمیر و تہذیب نہ ہو تھی کہ بیت لصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور شہر کو تڑپھوڑ دیا اور مسجد کے نقش و نگار کو بھی اکھیر دیا اور جو کچھ اس کی چھت اور دیواروں پر قیمتی جوہر ہو مونی اور سونا چاندی لگا تھا وہ سب اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ اس وقت اس کا دار الخلافہ عراق تھا۔

یمن میں جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بڑے عظیم الشان پتھروں سے قطعے تیار کئے تھے (۱)۔

۲۔ جنوں کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ تانبے، پتیل، شیشے اور سنگ مرمر سے بت اور مجسمے بناتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ درندوں اور پرندوں کے مجسمے بناتے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ مساجد میں ملائکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور جنگ لوگوں کی تصویریں اور مجسمے بناتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھیں اور ان کے شوق عبادت میں اضافہ ہو۔ مصوری ان کی شریعت میں مباح تھی۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید تمنا شیل سے مراد غیر ذی روح کی تصاویر ہوں (جو ہماری شریعت میں بھی جائز ہیں) کیونکہ انسان کے بت اور مجسمے کی عبادت تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی کی جاتی تھی مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا **مَا هِيَ وَاللَّاتُ الْبَعْلٰتُ اَلْبَدِیُّنَ اَلَّذِیْنَ اٰتٰنَّھُمْ مَّا عَلَمُوْنَ**۔

صمیمین میں ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا کہ ہوائے سنا کہ ہر مصور آگ میں ہوگا (۲)۔

ابن عباس نے ایک شخص سے فرمایا اگر مصوری تیرا پیشہ ہے تو تو درختوں اور غیر ذی روح چیزوں کی تصویر بنایا کر (۳)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث عام ہے، ہر مصور کو شامل ہے، اس امت کے مصوروں کے ساتھ ظاہر نہیں ہے۔ یہ خبر ہے اس لئے

سُخ اور تہ کی کا احتمال نہیں رکھتی۔ حضرت ابن عباس سے مرفوع روایت ہے کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے گا سے عذاب دیا جائے گا اور اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح چھوکنے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ اس میں روح نہیں چھوٹے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہونگی جو دکھ رہی ہوں گی۔ دوکان ہوں گے جو بن رہے ہوں گے۔ اور زبان ہونگی جو بول رہی ہوگی وہ کہے گی، مجھے تمہیں قسم کے آدمیوں پر مسلط کیا گیا ہے۔ (1) غلام جاہر۔ (2) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو الہ پکارتا ہے۔ (3) مصورین (2)۔

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے اس سے زیادہ غلام کون ہے جو میری تخلیق کی مثل تخلیق کرنے کی (نا کام) کوشش کرتا ہے وہ خود بیخود پیدا کریں دانہ پیدا کریں جو پیدا کریں (3) (وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان احادیث کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تصویر کی حرمت اس امت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ حرمت سب امتوں کیلئے ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ مسیحی علیہ السلام بھی تو مٹی سے جسے بناتے تھے کیونکہ آپ کا صورتیں بنانا باذن الہی تھا کان بخلق من الطین کھینٹا الطیر فیفسخ فیہ طیراً یاذن اللہ۔

تصویر بنانا اس کے لئے حرام ہے جو اس میں روح چھوکنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح چھوکنے پر مجبور کیا جائے گا لیکن وہ اس میں چھوٹک نہیں سکے گا۔

جس جفٹے کی جمع جھفنا ہے اور اس کا معنی بڑے بڑے پیالے ہیں۔ جواب جبابیۃ کی جمع ہے۔ جس کا معنی بڑا حوض ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے، یہ جسی الجواہر ج سے مشتق ہے۔ بڑے حوض کو جبابیہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ صفات غالب میں سے ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ پیالے اتنے بڑے تھے کہ ایک پیالہ سے ہزار آدمی بیک وقت کھاتے تھے (4)۔ ابن کثیر نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں یاہ کے اثبات کے ساتھ الجواہری پڑھا ہے ورنہ اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاہ کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے فقہور و اصیبات سے مراد بڑی بڑی بھاری بھرم دیکھیں ہیں جو جسامت اور بڑائی کی وجہ سے اپنی جگہ سے اٹھ اور نہیں جاسکتی تھیں اور بیڑھیوں کے ذریعے ان کے اوپر چڑھا جاتا تھا اور یہ سب چیزیں یمن میں تھیں۔

ہم نے داؤد اور آل داؤد کو حکم دیا کہ ہماری ان بے شمار نعمتوں پر شکر ادا کرو۔ شکر اہم ترین نعمت بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ کثرت سے شکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں کم ہے اور تمام نعمتوں کا شکر بشری طاقت سے ورا ہے۔ بلکہ ساری مخلوق بھی شکر کی صحیح ادائیگی سے قاصر ہے۔ شکر آیا تو مفعل لہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی میری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے میری اطاعت میں اعمال کرو۔ یا مفعل مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ طاعت کا فعل بھی شکر ہے۔ یا مصدر کی صفت کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی اعملوا عملاً شکراً۔ یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی شکر کرتے ہوئے نیک اعمال کرو۔ یا مفعل بہ کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اعملوا عملاً شکراً (شکر ادا کرو) جعفر بن سلیمان کہتے ہیں میں نے ثابت کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے رات دن کے اوقات کو اپنے خاندان پر اس طرح تقسیم کیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرتا تھا کہ جس میں آل

2- مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 386 (وزارت تعلیم)

1- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 881 (وزارت تعلیم)

4- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 234 (التحاریہ)

3- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 880 (وزارت تعلیم)

داؤد کا کوئی فرد عبادت میں مصروف نہ ہو (۱)۔

ہے۔ حزمہ نے عبادی کو یاد کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ شگور وہ شخص ہوتا ہے جو زبان اور جوارح کے ساتھ اکثر اوقات شکر کرتا ہے اور دل کے ساتھ ہمیشہ شکر میں مصروف رہتا ہے۔ اور یہ کیفیت دل کے فنا ہونے اور دوام حضوری کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس کیفیت اور استغراقیت کے باوجود شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ شکر کی توفیق بھی ایک نعمت ہے اس کے لئے پھر شکر کا ضروری ہے۔ گویا یہ سلسلہ الہی تھا یہ تک چلا جاتا ہے اسی لئے علماء فرماتے ہیں شگور وہ ہے جو اپنے آپ کو شکر کی ادائیگی سے عاجز سمجھے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهِمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَن لَوْ كَانَ لُوَاعِلُونَ الْعِيبَ مَا لِي بِشَوَانِي الْعَذَابِ الْمُجِيزِينَ ﴿٢١﴾

”پس جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا۔ نہ یہ بتایا جاتا کہ آپ کی موت کا ٹکڑ زمین کے دیکھنے کو کھاتا رہا آپ کے عصا کو نہیں جب آپ زمین پر آ رہے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی لگے وہ غیب کو جانتے ہوتے تو (اتنا مرصہ) نہ رہتے اس رسوا کن عذاب میں سے۔“

۱۔ قَضَيْنَا کا معنی حکمنا ہے، یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ علیہ کی ضمیر سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ اہل علم فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں ایک سال یا دو سال یا ایک ماہ یا دو ماہ یا اس سے کم مدتی عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے تھے، آپ کے لئے کھانا اور پانی بھی وہاں پہنچایا جاتا تھا۔ پس ایک دفعہ آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور باہر نہ آئے، اندر ہی آپ کا وصال ہو گیا۔ اس سلسلہ کا آغاز اس طرح ہوا کہ صبح بیت المقدس میں جہاں آپ عبادت میں مصروف رہتے تھے ایک بوٹی پیدا ہو جاتی۔ آپ اس بوٹی سے اس کا نام پوچھتے اور اس کا فائدہ پوچھتے تو وہ اپنا نام اور اپنی خاصیات بتا دیتی۔ پھر اگر وہ لگانے والی بوٹی ہوتی تو آپ اسے زمین میں لگوا دیتے۔ اور اگر وہ دوا کیلئے استعمال ہونے والی ہوتی تو آپ لکھ لیتے۔ حتیٰ کہ شروہ کا درخت اگا۔ آپ نے پوچھا تو کون سا درخت ہے؟ اس نے کہا شروہ (الملاس) پھر آپ نے پوچھا تو کس لئے پیدا ہوا ہے؟ اس نے کہا آپ کی مسجد کو خراب کرنے کے لئے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ کریم کی یہ شان نہیں کہ میری زندگی میں اس مسجد کو بے آباد کر دے۔ تو وہ وہ جس کی وجہ سے میری ہلاکت ہوگی اور بیت المقدس کی خرابی ہوگی۔ آپ نے اسے اکبیر اور اپنے باغ میں لگا دیا۔ اور پھر دعا فرمائی اسے اللہ جنوں پر میری موت کو پوشیدہ رکھ تاکہ انسانوں کو مظلوم ہو جائے کہ جن شب نہیں جانتے۔ جن یہ لافیں مارتے تھے کہ ہم غیب کا علم رکھتے ہیں یا جو کچھ کل ہونا ہے اسے بھی جانتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور عصا پر سہارا لے کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا کھڑے کھڑے انتقال ہو گیا۔ آپ کی عبادت گاہ کے آگے پیچھے روشندان تھے۔ کھنن اور مشقت طلب کاموں میں جو جن آپ کی زندگی میں مصروف تھے روشندانوں سے دیکھتے تو یہ گمان کرتے کہ آپ زندہ ہیں۔ انہوں نے آپ کی نماز کی طوالت اور لوگوں کی طرف باہر نہ آنے کو عجیب نہ سمجھا اور آپ کے وصال کے بعد بھی اپنے اپنے کاموں میں جتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کے عصا کو دیکھ گھاٹی اور آپ زمین پر گر پڑے۔ جب آپ گرے تو جنوں کو آپ کے وصال کا پتہ چلا (۲)۔ ابن عباس فرماتے ہیں

جنوں نے دیمک کا شکر یہ ادا کیا۔ اور وہ اب بھی لکڑی کے خول میں دیمک کے لئے پانی اور مٹی لاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن یزید سے روایت کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ جب تجھے میری روح قبض کرنے کا حکم ملے تو مجھ کو عرصہ پہلے مجھے آگاہ کرنا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کہا اسے سلیمان مجھے تیری روح قبض کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ اب تم خود عرصہ باقی ہے۔ حضرت سلیمان نے تمام جنوں کو اکٹھا کیا اور انہیں حکم دیا کہ ان پر شیشے کا کمرہ بنا دو جس کا دروازہ نہ ہو۔ آپ اس کے اندر اعصاب پر ٹیک لگا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اسی حالت میں آپ کی روح قبض ہو گئی (1)۔ لیکن آپ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ دیمک عرصاً کوکھا گئی اور آپ گر پڑے۔ انہوں نے وہ شیشے کا کمرہ کھولا اور آپ کی موت کا وقت جاننے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے عصاب پر دیمک کو رکھا اور ایک دن اور ایک رات میں جتنا اس نے عصاب کو کھلایا۔ اس سے انہوں نے حساب لگایا اس انداز سے پتہ چلا کہ آپ ایک سال سے وصال فرمائے تھے۔

3. دلہم میں حم خمیر سے مراد جن یا سلیمان علیہ السلام کی آل ہے دابۃ الارض کو فارسی میں دیوک کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا کبوتر ہے جو لکڑی کوکھا جاتا ہے۔ اور الارض سے مراد گیلی مٹی ہے۔ دابۃ کھو الارض کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الارض ارضت الخشبۃ کا مصدر ہے یعنی لکڑی کو دیمک کھا گئی۔ یہ کسی شے کو اپنے فعل کی طرف مضاف کرنے کے قبیل سے ہے جیسے بقرہ الحوت اور رجل الحرب میں اسم کو فعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ فاکل دابۃ الارض سے حال ہے۔ منسأة کا معنی عصاب ہے اور یہ نسات الغنم سے مشتق ہے جس کا معنی بکریوں کو بانگ کر لیتا ہے۔ اسی سے نساء اللہ فی اجلہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر میں تاخیر فرمائی۔ نافع اور ابو عمرو نے منسأة میں حمزہ کی جگہ الف ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن ذکوان نے حمزہ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اصل پر حمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ فاکل کا مفعول ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو اسے بین بین پڑھتے ہیں۔ خو کا معنی گرنا ہے۔ یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر گر پڑے تو جنوں پر ظاہر ہوا۔ ان مختلفہ من مسئلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محمد وقف ہے۔ عذاب مہین سے مراد مشقت طلب کام ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو چکا تھا لیکن وہ آپ کو زندہ گمان کر رہے تھے۔ اُن اپنے صلہ کے ساتھ مل کر الجن سے بدلہ ایشمال ہے۔ یعنی لوگوں پر ظاہر ہو گیا کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے انسانوں پر مسائل کو مشتبہ کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کا پل کھول دیا۔ اور اس طرح لوگوں کو آنگی ڈیگوں کا علم ہو گیا۔ اسی مضمون کی تائید حضرت ابن مسعود اور ابن عباس کی قراءت کرتی ہے نسبت الانس۔ یعنی انسانوں کو پتہ چل گیا کہ اگر جن غیب جانتے ہوتے تو اس تکلیف میں مبتلا نہ رہتے۔ بعض علماء نے آیت کا یہ معنی لکھا ہے کہ جنوں نے جان لیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے اُن نے تاویل انتہائی فریب اور بعید سے کیونکہ جن اپنی جہالت کو جانتے تھے لیکن انسانوں کے سامنے وہ اپنی طلیت کا جوئی کرتے تھے۔ علامہ ابنوی فرماتے ہیں اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی عمر تریس سال تھی اور بادشاہی کی مدت چالیس سال تھی۔ آپ جب بادشاہ بنے تو آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ اور بادشاہ بننے کے چار سال بعد بیت المقدس کی تعمیر کا آغاز فرمایا تھا (2)۔

ابن ابی حاتم نے علی بن رباح سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے ایک شخص نے بتایا کہ فروہ بن مسیک الخطفانی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے اللہ کے نبی تو تم سب کو زائد ماہیت میں عزت حاصل تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے مرمد نہ ہو

جائیں کیا وہ انکار کریں تو میں ان سے جنگ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی تک مجھے انکے متعلق کوئی حکم نہیں ملا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَاءَتْهُمْ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُنُوزٌ مِّنْ تَحْتِ
رِجَالِهِمْ وَأَسْكُرُوا لَهُ ۖ بَدْدًا ۖ طَبِيبَةً وَأَسْرَابًا ۖ عَفْوَراً ۝

”قوم سبا کے لئے ان کے مسکن میں ہی نشانی موجود تھی (وہاں) دو باغ تھے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف۔ اٹھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو۔ اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور! (اہل سبا! تمہاری خوش بختی کا کیا کہنا)“

یعنی قوم سبا کے مسکن میں ایک ایسی نشانی تھی جو ہماری قدرت کے کمال اور ہمارے شکر کے وجوب کی دلیل تھی۔ انہی اور ابو عمرو نے سبا کو بغیر تنوین کے فقرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اور ضم منصرف ہے اور اس میں دو سب تانیث اور ولایت ہیں۔ قبیل نے وقف کی نیت سے حمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تنوین کے ساتھ مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ آدمی کا نام ہے۔ حفص حمزہ اور کسائی نے مسکنہم کو سین کے سکون اور بغیر الف کے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے لیکن حمزہ اور حفص قیاس کے مطابق کاف کو فتح دیتے ہیں اور کسائی کسرہ دیتے ہیں ان الفاظ پر محمول کرتے ہوئے جو خلاف قیاس آتے ہیں جیسے مسجد مطلق وغیرہ۔ باقی قراء نے سین کے فقرہ اور الف کے ساتھ جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمودہ بن مسیک الغنطی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! سبا کے متعلق ارشاد فرما یہ وہ مرد تھا یا عورت تھی یا کسی جگہ کا نام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ عربوں میں سے ایک مرد تھا جس کے دس بیٹے تھے، ان میں سے چھ یمن میں سکونت پذیر تھے اور چار شام میں آباد تھے۔ جو یمن میں تھے ان کے نام یہ ہیں 1۔ کندہ 2۔ اشعریوں 3۔ اذودہ 4۔ مذحج 5۔ انمار 6۔ حمیر۔ ایک شخص نے پوچھا انمار کون تھے؟ فرمایا یمن میں سے شعم اور خیلہ ہیں۔ اور وہ چار جو شام میں آباد تھے ان کے نام یہ ہیں 1۔ عاملہ 2۔ جذام 3۔ لخم 4۔ غسان۔ اسی طرح احمد وغیرہ نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ سبا کا نسب اس طرح ہے سہاب بن شیبہ بن مغربہ بن قحطان (1)۔ جنتان۔ آیت سے بدل ہے یا منبہد محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر مہارت اس طرح ہے آلایہ جنتان۔ اور جنتان سے بہت سے باغات مراد ہیں۔ یعنی شہر کی دائیں جانب بھی باغات تھے اور بائیں جانب بھی باغات تھے یا معنی کہ ہر شخص کا اپنے مسکن اور رہائش کے دائیں بائیں ایک ایک باغ تھا۔

ع ان کو نبی کے ذریعے یہ کہا گیا کہ ان باغات کے پھلوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے کھاؤ اور جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں ان پر اس نعمت متیقی کا شکر ادا کرو۔ یا دلالت حال تقاضا کر رہی تھی کہ انہیں شکر کرنے اور ان باغات سے پھل کھانے کو کہا گیا ہے۔

ع یا تو یہ مستقل کلام ہے اور شکر کے موجب پر دلالت کرتی ہے، یعنی تمہارا یہ شہر بہت پاکیزہ ہے انہیں ان گنت پھل ہیں اور اس کی زمین شورو زور نہیں ہے۔ سدی اور متاعل فرماتے ہیں کہ ایک عورت ٹوکرا سر پر رکھ کر باغات کے اندر سے گزرتی تو وہ ٹوکرا خود بخود مختلف پھلوں سے بھر جاتا تھا۔ ہاتھ سے توڑنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی تھی (2)۔ ابن زبیر فرماتے ہیں ان کے شہر میں چھتر، کھکی، پسو، پھجو اور سانپ وغیرہ بالکل نہ تھے۔ اگر کوئی شخص ان کے شہر سے گزرتا اور اس کے کپڑوں پر جو کچھ ہوتی تو شہر کی پاکیزہ ہوا کی وجہ سے وہ

جو کس خود بخود مر جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بملحدہ طیبہ سے مراد انشاء اور ہوا کی پاکیزگی ہے (۱)۔ رب غفور کے متعلق مقال فرماتے ہیں وہ رب گناہوں پر قلم بخیر عطا کرنے والا ہے۔ اگر تم اس کی ادا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرو (۲)۔ وہ رب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سبھی کی طرف تیرہ انبیاء کرام مبعوث فرمائے تھے۔ ہر ایک نے انہیں دعوت تو حیددی اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں انہیں یاد دلائی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہیں ڈرایا (۳) (لیکن)

فَاعْرَضُوا فَاغْرَبْنَا آلَهُمْ سَبِيلَ الْعَرَبِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِحَسَنَتِهِمْ جَسَدًا ذَوَاتًا
أَكْبَلَ حَمَلًا وَآثَلًا وَشَقِيًّا قَلِيلًا ۝

”پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۔ اور ہم نے بدل دیا ان کے دو باغوں کو یاد دو باغوں کے جن کے پھل ترش اور تڑوے تھے اور ان میں جھاؤ کے بولے اور چند پیری کے درخت تھے۔“

۱۔ اس ناشکری قوم نے انبیاء کرام کی روشن تعلیمات سے اعراض کیا اور انہیں جھٹلایا اور کہنے لگے ہمارے پاس جو کچھ سامان وادو پیش موجود ہے یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نکلیں ہے بلکہ ہماری اپنی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ انبیاء کرام کو کہنے لگے اگر یہ تمہارے رب کی عطا ہے تو اسے کوکوک طاقت ہے تو ہم سے یہ نعمتیں روک لے۔ اس گستاخانہ رویہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۔ العرم کا معنی مشکل ہے اور یہ عوم الرجل سے مشتق ہے جس کا معنی یہ کہ اس کا خلق برا ہے اور سخت ہے یا عرم سے مراد شدہ یا بارش ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر سرخ پانی کا سیلاب بھیج دیا تھا۔ بعض فرماتے ہیں العرم کا معنی وادی ہے۔ اس کی اصل العرام ہے جس کا معنی شدت اور قوت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی پانی کو روکنے کا بند ہے، بعض فرماتے ہیں اس کا معنی جنگلی چوہا ہے اور سیل کو اس کی طرف مضاف اس لئے کیا گیا کیونکہ چوہے نے اس بند میں سوراخ کیا تھا جو بلیقوں نے لوگوں کی صلاح کے لئے تعمیر کیا تھا۔ قاسوس میں ہے عرم فرخہ کے ذون پر ہے اور اس سے مراد وہ بند ہے جو وادی کے سامنے بنایا جاتا ہے اور اس کا جمع عرم ہے یا یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے یا اس سے مراد پانی کے وہ ذخیرے ہیں جو وادی کے اندر مختلف مقامات پر بنائے جاتے ہیں یا اس کا معنی جنگلی چوہا ہے۔ یا تیز بارش ہے یا وادی ہے۔ یہاں ہر معنی مراد ہو سکتا ہے۔

علامہ ابنوی لکھتے ہیں ابن عباس اور ابن وہب وغیرہا نے فرمایا عرم سے مراد وہ بند ہے جو بلیقوں نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ لوگ وادی کے پانی پر جنگ و جدل کرتے تھے۔ تو بلیقوں نے فدا کوڈو کر کرنے کے لئے ایک ڈیم (بند) تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بڑی بڑی چٹانوں اور تارکول کے ذریعے بند بنایا گیا تھا۔ اوپر نیچے اس کے تین دروازے تھے، اس کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تھا جس سے بارہ نہریں نکالی گئیں تھیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کے گیٹ کھولتے اور بند کرتے تھے جب بارش ہوتی تو یمن کی ساری وادی کا پانی اس ڈیم میں جمع ہو جاتا تھا اور پہلے ضرورت کے مطابق اوپر والا گیٹ کھولا جاتا جس سے ڈیم کا پانی نیچے والے تالاب میں پہنچتا اور وہاں سے حسب ضرورت نہروں میں پانی چھوڑا جاتا پھر جب پانی کی سطح کم ہوتی تو دوسرا گیٹ کھولا جاتا پھر جب پانی مزید کم ہوتا تو نیچے والا گیٹ کھولا جاتا۔ پانی اتنا جمع ہوتا تھا کہ پورے سال کی ضروریات کے لئے کافی ہوتا تھا۔ کچھ مدت تو لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایات سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن بعد میں سرکشی اور ناشکری کے راستوں

پر چلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر راہروی اور کفرانِ نعت کی پاداش میں ان کو تباہ کرنے کے لئے ان پر ایک جنگلی چوہا مسلط کر دیا۔ اس نے نیچے سے اس ڈھیم میں سوراخ کر دیا جس کی وجہ سے پانی باغات اور فصلوں میں سیلاب کی طرح بکھر گیا اور ساری زمین کی زرخیزی اور بہتری کو ضائع کر دیا (۱)۔

وہب فرماتے ہیں ان کے اپنے کانوں نے بتایا تھا کہ ان کے بند کو ایک چوہا توڑ دے گا تو انہوں نے ہر دو پتھروں کے درمیان ایک بلی باندھ دی تھی تاکہ چوہے کوئی سوراخ نہ کر سکیں۔ جب قدرت خداوندی نے ان کو غرق کرنے کا فیصلہ فرمایا اور ان کے غرق ہونے کا وقت پہنچ گیا تو ایک بڑا سرخ رنگ کا چوہا آیا اور اس نے بلیوں پر حملہ کر دیا بلیاں ڈر کے مارے پتھروں کے اندر چھپ گئیں اور اس طرح وہ چوہا ایک سوراخ کے اندر داخل ہوا اور اس بند کو اندر سے کھودنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ بند کمزور ہو گیا، جبکہ انہیں اس خفیہ تدبیر کا علم نہ تھا۔ جب بارشوں کا پانی آیا تو وہ اس سوراخ میں داخل ہو گیا حتیٰ کہ اس بارشی پانی کی کثرت کی وجہ سے بند ٹوٹ گیا اور چرچہ کو نیکوں کی طرح بہا کر لے گیا اور ان کے گھروں اور محلوں کو ریت میں دفن کر دیا۔ وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ اور ان کی جمیعت مختلف علاقوں میں تشریح ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ عرب میں ضربِ اہل بن گئے۔ عرب کہتے صاغر ہو فلاں ابدی سبا او ایدادی سبا۔ یعنی فلاں قبیلہ اس طرح بکھر گیا جس طرح قوم سبا کو راستوں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ فلاز سلنا علیہم سیل العرم کا یہی مفہوم ہے۔ حمیر کی لغت میں بند کو عرم کہتے ہیں (۲)۔

۱۔ نافع اور ابن کثیر نے کاف کے سکون کے ساتھ ”اکل“ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے ضمہ کے ساتھ ”اکھل“ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قاموس میں ہے الاکل بالضم وبالضمین النعم والرزق۔ یعنی صرف ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہو یا ہمزہ اور کاف دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہو دونوں کا معنی پھل اور رزق ہے۔ ہمزہ نے اکھل پڑھا ہے اور ابو عمر نے اس کو حمصط کی طرف مضاف کیا ہے۔ جمہور کی قرأت پر حمصط، اکل کی صفت ہے۔ اور اس کا معنی تڑپنا اور بے اختیار ہونا ہے یا عطف بیان یا بدل ہے اور اس کا معنی پیلو کا پھل ہے اور ابو عمر کی قرأت پر ہر وہ بوٹی مراد ہوگی جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ یا پیلو کا درخت اور اس جیسا کوئی اور درخت مراد ہے اور یہ لفظ مشترک ہے۔ قاموس میں الخط کے معانی لکھے ہیں چرچہ کا کڑوا یا تڑپنا حصہ اور ہر بوٹی جس کا ذائقہ کڑوا ہو (۳)۔ ایسا درخت جس کی بویری کی طرح ہو ایک قاسم درخت۔ ہر ایسا درخت جس کے کانٹے نہ ہوں۔ پیلو کا پھل۔ بعض نے اس کا معنی پیلو کا درخت لکھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں تقدیر کلام اس طرح ہے اکل اکل حمصط، مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیک بویدل یا عطف بیان ہونے میں مضاف کے قائم مقام رکھا گیا (۴)۔ یہ ترکیب اس وقت ہوگی جب جمہور کی قرأت کا اعتبار کیا جائے اور خط سے درخت مراد لیا جائے۔ امام بغوی نے اکل کا معنی پھل اور حمصط کا معنی پیلو اور اس کا پھل لکھا ہے جسے ہر ایک کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ میرد کہتے ہیں خط سے ہر وہ بوٹی مراد ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ ابن الاعرابی فرماتے ہیں اس درخت کا پھل مراد ہے جسے فسوف الصبغ کہا جاتا ہے، یہ شخاش کی شکل میں ہوتا ہے اور خود بخود جھڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جاتا (۵)۔ اکل کا معنی جھاڑ کا درخت ہے اور یہ اکل پر معطوف ہے۔ حمصط پر معطوف نہیں کیونکہ اس کا پھل نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 235 (التجاری)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 236 (التجاری)

4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کارزونی، جلد 4، صفحہ 397 (القر)

3۔ قاموس الخط، جلد 1، صفحہ 899 (الترت العربی)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 237 (التجاری)

ہیں اٹل ایک درخت ہے جو جماد کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ صدر کی صفت قلیل ذکر فرمائی کیونکہ یہ بیری کا عمدہ درخت ہے اور اس کا پھل بھی اچھا ہے اسی وجہ سے باغات میں اسے لگایا جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں صدر سے مراد وہ عمدہ بیری کا درخت نہیں ہے جو باغات میں لگایا جاتا ہے بلکہ یہ جنگلی بیر ہے جو کسی کام میں مفید نہیں ہوتی اور نہ اس کے پتے کسی ضرورت میں کام آتے ہیں (۱)۔ پھلدار باغوں کے مقابلہ میں ترش درختوں اور چند بیری کے درختوں کو بھی جھینن فرمایا ہے تو یہ مشاکلت کے طور پر ہے (مشاکلت بلاغت کا ایک قاعدہ ہے کہ جس میں ایک کام کی سزا کو بھی اس کام کے الفاظ میں تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے ارشاد ہے جزاء سببہ سببہ نیز یہ ان سے استہزاء کرنے کے لئے کہا ہے۔

ذٰلِكَ جَزَاءُ الَّذِي كَفَرَ وَاُوْهُلُّ جَزَاؤِ الْاِنْكِفٰوٰتِ ﴿۵۰﴾

”یہ بدلہ دینے کے لئے انہیں بوجہ ان کی احسان فراموشی کے اور بجز احسان فراموشی کے ہم کے ایسی سزا دیتے ہیں۔“
 ذالک مفعول مطلق کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یا مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور ما بعد کلام اس کی خبر ہے۔ اور ذالک سے مراد عقاب اور بدلہ دینا ہے۔ ان کے کفر سے مراد یا تو کفرانِ نعمت ہے یا رسولوں کی تکذیب ہے۔ حفصٰ مزہر اور کسایی نے نجازی کو کون اور زاء کے کسرہ کے ساتھ منکر معروف پڑھا ہے اور کفوف پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے، جبکہ باقی قراء نے یہ نجازی یعنی یا اور زاء کے فتح کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور انکفور کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے۔ یعنی مناقض صرف ایسے ناشکرے شخص سے ہوگا۔ منکر کے صیغہ کی صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہم مناقض صرف ایسے ناشکرے اور احسان فراموش سے کریں گے۔

وَجَعَلْنَا سَبَّوْۤا فِيْهَا لِيَالِيْ وَاَيَّامًا مِّنِيْنَ ﴿۵۱﴾

”اور ہم نے بسا دی تھیں ان کے درمیان اور ان شہروں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی اور کئی بستیاں سرراہ اور ہم نے منزلیں مقرر کر دی تھیں ان میں آنے جانے کی راہ۔ سیر و سیاحت کروان میں (جب چاہو) رات یا دن کے وقت امن و امان سے۔“

لہ جَعَلْنَا کا عطف بدلنا پر ہے۔ اگرچہ عیش و نشاط کا سلسلہ اور زمانہ تہلیل سے پہلے کا ہے لیکن یہاں تہلیل کے بعد ان کے عیش و آرام کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں واو مطلق جمع کے لئے ہے، ترتیب کے لئے نہیں ہے اس لئے اس اسلوب میں کوئی چیز قابل امتزاج نہیں ہے، بیہم ہم صریحاً کمرج اہل سیاہیں۔ باد کسا فیہا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان بستیوں میں نہریں جاری کی تھیں اور پھل دار درخت لگائے تھے۔ ان بستیوں کے کینوں کو خوشحال بودو باش عطا فرمائی تھی، ان بستیوں سے مراد شام کی بستیاں ہیں۔ قروی ظاہرہ سے مراد یہ ہے کہ ہر بستی دوسری کے قریب ہونے کی وجہ سے آسنے سامنے تھی۔ ان بستیوں میں سفر کی منزلیں مقرر تھیں۔ جب وہ چلنے تو رات ایک بستی میں گزارتے تو قبولہ دوسری بستی میں کرتے۔ انہیں سفر میں زارہ ساتھ لے جانے کی بھی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی (ہر بستی میں آرام و سکون اور خورد و نوش کے لئے سراہیں اور شاندار ہوٹل اور ریسٹورنٹ موجود تھے) بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ چار ہزار رات سو بستیاں تھیں جو سب سے شام تک متصل اور قریب قریب تھیں۔ قاعدہ فرماتے ہیں ایک عورت

بدردج اتم موجود ہو۔ مقابل فرماتے ہیں صبار شکور سے مراد اس امت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایماندار لوگ ہیں جو مصیبتوں پر شکوہ اور آہ و نغان نہیں کرتے بلکہ صبر کا دامن پکڑے رہتے ہیں اور نعمتوں کے ملنے پر کم تر فوں اور دون بہت لوگوں کی طرح اپنے منہ حقیقی کج بول نہیں جاتے بلکہ ہر لہجہ زبان اور دل سے شکر ادا کرتے رہتے ہیں (1)۔ مطرف نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں صبار اور شکور سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ صبر و شکر کا مظاہرہ کرنے والا ہو کیونکہ دنیا دار اٹکن اور دار البلاء ہے حتیٰ کہ اس میں نعمتیں بھی آزمائش ہیں۔ بندے کو نعمت کے ذریعے آزمایا جاتا ہے کہ شکر کرتا ہے یا نہیں اس میں موت و حیات دونوں امتحان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شَاقِ الْمَوْتِ وَالْحَيٰوةِ لَيَبۡتَلُوۡنَکُمْ اَیۡمٰنَکُمْ اَحْسَنَ عَمَلًا جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کوتاہی کہ وہ تمہیں آزمائے تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔ پس صبار سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ گناہوں سے اپنے نفس کو روکے رکھتا ہے مصائب پر صبر کرتا ہے اور طاعات پر قائم رہتا ہے۔ ہر مصیبت اور آزمائش گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہر آزمائش جس طرح صبر کا موجب ہوتی ہے اسی طرح شکر کی بھی تقاضی ہوتی ہے پھر صبر کی تو نعمت بھی اللہ کی نعمت ہے جو پھر شکر کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اِنۡلَامَ الْمَغۡضُوۡبِ الْغَمۡبِ اِنۡغَامِبِهٖ فَبۡهُوۡ اَوْ لَمۡیۡ بِالشُّکْرِ یعنی محبوب کی طرف سے تکلیف اس کے انعام سے زیادہ لہذہ ہوتی ہے۔ پس وہ شکر کا زیادہ تقاضا کرتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

فَلَا تَبۡیۡ فِی الْوَصَالِ عَیۡنِہٖ نَفْسِیۡ وَفِی الْهَجْرَانِ مَوٰلِی الْمَوٰلِی

(وصال کی حالت میں میں اپنے نفس کا ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر و فراق کی حالت میں سرداروں کا بھی سردار ہوتا ہوں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ صبر ہے اور دوسرا حصہ شکر ہے (2)۔ اس حدیث کو تیسری نے شعب الایمان میں روایت فرمایا ہے میں کہتا ہوں مومن عمل ایمان والا ہوتا ہے اور ہمیشہ ان دونوں صفات سے متصف ہوتا ہے، کسی ایک صفت سے محروم نہیں ہوتا۔

وَكَذٰلِكَ صَدَقَ عَلَيْهِمُ اِبۡلِیۡسَ ظَنۡہٗ فَاتَّبَعُوۡا اِلَّا فَرِیۡقًا مِّنَ الْمَوۡمِنِیۡنَ ﴿۝۱۰﴾

”اور جیسا کہ صحیح ہے کہ ان کے لیے شیطان نے اپنا گمان لے سوا وہ اس کی تابعداری کرنے لگے بجز مومنوں کے ایک گروہ کے (جو حق پر ڈٹا رہا)۔“

لے علیہم کی ضمیر کا مرجع بقول مجاہد تمام لوگ ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع تو مہربان کے کافر ہیں۔ یعنی ابلیس نے ان پر اپنا گمان لگا کر دکھایا۔ شیطان نے مہلت ملنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ ذبک ماری تھی کہ تیری عزت کی قسم! میں تمام کو گمراہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اس وقت اسے یہ یقین نہ تھا لیکن جب اس نے ان نا شکروں کو اپنے دام ہر گنگ ز میں پھنسا لیا اور وہ اس کے تابع اور بندہ کار بن گئے تو اس نے اپنے گمان کو بچ کر دکھایا یا اپنے گمان کو چھپا لیا۔ یہ معنی اہل کوفہ کی قرأت پر ہے جنہوں نے صدق کو باب تفعیل سے دال کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی پہلے تو اس نے ان کے متعلق گمان کیا تھا لیکن پھر ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہونے کے ساتھ اپنے گمان کی تصدیق کر دی۔

دوسرے قراء نے صدق کو دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے گمان میں سچا نکا اور اس فعل کو

مفعول کی طرف بغیر صلہ کے متحدی کرنا جائز ہے جیسا کہ صدق وعدہ ہے کیونکہ یہ قول کی ایک قسم ہے۔ تفسیر کہتے ہیں جب اہلسن نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت عطا فرمادی، اس وقت اس نے کہا لا ضلھنھم ولا غویبھم (میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور راہ راست سے بھڑکاؤں گا) یہ بات کرتے وقت اس کو یقین نہ تھا کہ وہ اس دعویٰ کو پورا کر بھی سکے گا۔ اس نے یہ گمان کے ساتھ کہا تھا لیکن جب اہل سبائ کے پتھر میں پھنسن گئے اور انہوں نے اس کی اتباع شروع کر دی تو اس کا گمان درست ہو گیا (1)۔

اہل سبائ سے یا تمام لوگوں میں کچھ ایسے خوش نصیب تھے جو اس کی گمراہی سے بچ گئے تھے۔ سدی نے حضرت ابن عباس سے نقل فرمایا ہے کہ من المؤمنین سے مراد تمام مؤمنین ہیں (اس صورت میں من بیان یہ ہوگا) یعنی کسی مومن نے اصل دین میں شیطان کی اتباع نہیں کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّ جِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (ترجمہ) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔ (یعنی اس آیت میں عبادی سے مراد مؤمنین ہیں (2) اور مؤمنین پر شیطان کو تسلط نہیں ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ مؤمنین میں سے کسی نے اصل دین میں اس کی پیروی نہیں کی) بعض علماء فرماتے ہیں "من" بھضیہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بعض مؤمنین اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِيُعَلِّمَنَّ مِنْ يٰؤْمِنٍ بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ هُوَ مِنْهَا
فِي شَكٍّ ۗ وَسَرَابٌ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿۱﴾

"اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں)۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم دکھانا چاہتے تھے کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے۔ اور (اے حبیب!) آپ کا رب برہنہ پر تمہارا بیان ہے۔"

۱۔ کائنات فعل ناقص ہے اور من زائدہ اور سلطان اس کا اسم ہے۔ لہٰذا طرف مشفقہ کائن کی خبر ہے علیہم ظرف کے متعلق ہے۔ یعنی شیطان کو ان کے دلوں میں وسوسہ انداز کی کرنے اور جھوٹی امیدیں اور آرزوئیں دلانے کی قدرت نہ تھی مگر ہم نے جب اسے ان پر مسلط کر دیا اور اسے کہا وَاسْتَفْزِزْ مِنْهُنَّ مَنِ اسْتَفْزِزْ مِنْهُنَّ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَبْرِكَ وَاسْرِجْ اِلَيْهِمْ فِي الْاَذْوَالِ وَاَلْاَفْوَالِ وَاَلْاَفْوَالِ وَاَلْاَفْوَالِ (ترجمہ) اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی آواز) کی آواز (کی آواز) سے اور دھوا بول دے ان پر اپنے گھوڑے سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہو جانے والوں میں اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ۔ تو اس میں یہ وسوسہ ڈالنے اور بھگانے کی قدرت پیدا ہوئی۔

۲۔ لعلم کا معنی تمہیں ہے، یعنی ہم تمہیں کہیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے تاکہ ہم ہر کسی کو اپنے عمل اور کردار کے مطابق جزا و سزا دیں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اہلسن نے نہ تو بندوں پر تلوار سونپی، نہ ان کو کوڑا لگا یا بلکہ اس نے تو صرف جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوئیں دلائی اور لوگ بھاری سے اس کے مکر و فریب کے جال میں پھنسن گئے (3)۔ اس آیت پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت کا مفہوم تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کو علم نہیں تھا۔ شیطان کے لوگوں کو انوار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو علم ہوا کہ کون مومن ہے اور کون کافر ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ کا علم ازلی قدیم اور سرمدی ہے، حادث نہیں ہے لیکن معلوم چیز کے ساتھ علم کا تعلق حادث ہے اور یہاں حصول علم سے مراد تعلق علم ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے علم جب تک معلوم کے متعلق نہ ہو تو معلوم عالم پر منکشف نہیں ہوتا کیونکہ علم معلوم سے تعلق سے پہلے علم بالقہ ہوتا ہے، علم بالفعل نہیں ہوتا۔ پس تعلق علم کا حادث ہونا وجودی سے پہلے جہالت کے پائے جانے کا منتقنی ہے اعتراض پھر باقی رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کا علم حادث کے وجود سے پہلے بھی اس کے ساتھ متعلق تھا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا موجود ہونا بھی منکشف تھا۔ یہ چیز پہلے سے علمی کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کے معدوم ہونے کے وقت جس طرح اس کے متعلق تھا اسی طرح اب اس کے وجود کے متعلق ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ موجود کے ساتھ ہمارا علم متعلق ہو جائے جس طرح اس کے معدوم ہونے کے ساتھ ہمارا علم متعلق تھا۔ اس پر پھر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر کو قبول کرتی ہے (پہلے اس کے علم کا تعلق معدوم ہے تھا، اب اس کے علم کا تعلق وجود سے ہو گیا) بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ زمانہ اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اور جو کچھ زمانہ میں موجود ہے سب کا سب اللہ کی بارگاہ قدس میں حاضر ہے، اس کا علم زمانہ اور زمانیات کے متعلق قدیم اور سرمدی ہے۔ تقدیم و تاخیر کا تعلق زمانہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً زید جو ایک وقت میں موجود ہے اور ایک وقت میں غائب ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں حالتوں میں حاضر ہے۔ اسی طرح اس کا پہلے ایک جگہ ہونا اور دوسری جگہ نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر مقام پر حاضر موجود ہے اس کے مکان کی تبدیلی سے اللہ کی ذات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہے تاکہ ہم اپنے علم قدیم سے جان لیں کہ کون مومن ہے اور کون کفر میں مبتلا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے علم کی مسبوقیت کی منتقنی نہیں اور یہ بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ سابقیت اور مسبوقیت تو وہاں متصور ہوتی ہیں جہاں زمانہ کا اجراء ہوا اسی طرح فوق و تحت اس چیز میں ہوتا ہے جس کو کوئی مکان گنیرے ہوئے ہو۔ وہ ذات جو زمان و مکان کی خالق ہے وہ ان صفات (سابقیت مسبوقیت فوق و تحت) سے منزہ اور میرا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے اور معلوم کا حادث ہونا علم کے حادث ہونے کا منتقنی نہیں ہے کیونکہ معلوم زمانہ کے ساتھ گھرا ہوا ہوتا ہے اور علم اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ پس ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ زمانہ اور زمانیات مومن و کافر ہر چیز کو تازے والا ہے اور ہمیشہ اس کی محافظت کرنے والا ہے، وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں ہے اس لئے ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دے گا۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ دَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ اَلَا يَمْلِكُونَ مَقْعَالَ ذَرِّبٍ فِي السَّمٰوٰتِ

وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ فِيْهِمَا مِنْ شَيْءٍ وَّمَا لَكُمْ مِنْهُم مِّنْ تَحْفٰظٍ ۝۱۱

”آپ فرمائیے (اے مشرکوں) تم پر کار کچھ نہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود خیال کرتے ہو۔ یہ تو ذرہ برابر کے بھی مالک نہیں ہیں۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا زمین و آسمان میں کچھ حصہ ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے۔“

۱۔ دَعَمْتُمْ کے دونوں مفعول ہم اور اللہ معذوف ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے زعموہم اللہ۔ پہلے مفعول ”ہم“ کو تحفیف کے لئے حذف کیا گیا کیونکہ موصول اور صلہ کے ساتھ کلام طویل ہو جاتی ہے اور دوسرے مفعول الہ کو مفعول ثانی بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ ہم ضمیر مفعول اول کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ (ہم من دون اللہ صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب

موسوف کو مقدر مانا جائے) اسی طرح لامعلکون بھی مفعول ثانی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا جن کو تم گمان کرتے ہو کہ وہ مالک نہیں ہیں۔ حالانکہ ان کا گمان نہیں تھا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو جو جہنم میں آتا ہے ان سے منفعت کا حصول یا دفع مصیبت طلب کرو شاید وہ تمہاری بات قبول کر لیں۔ گویا یہ کلام قیاس استثنائی سے شرطیہ پر دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے، یعنی اگر تمہارا دعویٰ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ خدا ہیں تو پھر جبر تم پکارو گے تو وہ تمہاری پکار کا جواب دیں گے۔ لیکن وہ بے بس صورتیں تو کسی چیز کی مالک ہی نہیں۔ لامعلکون کا جملہ مستند ہے جو استثناء پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی وہ خیر و شر کسی کے بھی مالک نہیں ہیں، وہ تمہیں جواب نہیں دیتے تو ثابت ہو گیا کہ تمہارا ان کے متعلق الہ (خدا) ہونے کا خیال باطل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان میں وہ بت کسی ذرہ برابر کے مالک نہیں ہیں۔ تو ان کا یہ ذکر عرف کی حیثیت سے ہے ورنہ وہ تو کسی امر کے کہیں بھی مالک نہیں ہیں۔ یا اس لئے زمین و آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان کے بعض الہ سادی تھے جیسے ملائکہ اور ستارے اور بعض زمینی تھے جیسے بت۔ یا اس لئے ان کا ذکر فرمایا کیونکہ خیر و شر کے ظاہری اسباب آسمانی اور ارضی ہیں۔ شرک سے پہلے من زائدہ ہے اور شرک بمعنی شرکت (محمد) ہے۔ ماہم فیہا من شرک کا جملہ لامعلکون کے جملہ پر معطوف ہے۔ و ماہم منہم میں لڑکی نمبر کا مرجم اللہ تعالیٰ ہے اور مذم کی نمبر کا مرجم شرکاء ہیں۔ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور تدبیر میں تمہارے ان بتوں میں سے اللہ تعالیٰ کا کوئی معاون و مددگار نہیں ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا الشَّفَاعَةَ عِنْدَآءِ اِلٰہِ لَمَنْ اٰذِنَ لَہٗ حَتّٰی اِذٰ قَدْ عَن قُلُوْبِہُمْ قَالُوْا
مَاذٰ اَقَالَ رَبُّکُمْ ط قَالُوْا الْحَقُّ ط وَہُوَ الْعِلْمُ الْکَبِیْرُ ﴿۱۰﴾

”اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو۔ یہاں تک کہ جب دور کردی جاتی ہے گھبراہٹ ان کے دلوں سے تو پوچھتے ہیں کیا ارشاد فرمایا تمہارے رب نے یہ کہہ دیا ہے کہ تمہارے رب نے حق فرمایا ہے اور وہی بڑی شان والا سب سے بڑا ہے۔“

یعنی وہی شفاعت کرنے گا جسے شفاعت کرنے کا اذن ملے گا۔ اس صورت میں من سے مراد شافع (شفاعت کرنے والا) ہوگا اور اس پر لام ایسے ہوگا جیسے اکرم مزید میں ہے یا معنی یہ ہے کہ شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کے لئے سفارش کرنے کا اذن ہوگا۔ اس صورت میں ”من“ کا کلمہ مشغول اجلہ سے عبارت ہوگا اور اس پر لام لام اجل ہوگا جیسے اس جملہ میں ہے جنت تک لویڈ۔ ابو عمرو حمزہ اور کسائی نے اذن کو جہول کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ جب کفار نے علی سبیل النزل کہا کہ ہم مان لیتے ہیں کہ ملائکہ اور بتوں کو زمین و آسمان کی کسی چیز پر ملکیت نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز میں حصہ دار بھی نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دُعا میں باطل کو رد کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ کسی کو کسی کی شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کو شفاعت کا اذن ملے گا صرف وہی سفارش کرے گا اور اس کے لئے سفارش ہوگی جن کے لئے سفارش کا حق عطا کیا جائے گا تمہارے یہ بت تو شفاعت کے اہل ہی نہیں ہیں کہ انہیں اذن۔ سفارش ملے کیونکہ ان کا مرتبہ تو اتنا ہی گھٹیا ہے اور کفار اپنی سرکشی اور فخر کی وجہ سے یہ استحقاق ہی نہیں رکھتے کہ کسی کو ان کی سفارش کی اجازت ملے۔ انبیاء کرام اور ملائکہ کو صرف مومنین کی شفاعت کا اذن ملے گا۔

ع. ابن عامر اور یعقوب نے فوج کو قاء اور زاء کے نغمہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مخرج اللہ تعالیٰ کو بتایا ہے۔ باقی قراء نے قاء کے ضمیر اور زاء کے کسرہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور عن قلوبہم جار مجرور کو نائب الفاعل بنایا ہے۔ تخریج کا معنی خوف اور گھبراہٹ کو دور کرنا ہے جیسا کہ تخریض کا معنی ازالہ المرض ہے اور قلوبہم میں ضمیر کا مخرج شافعیین اور مشغوع لہم میں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اور حتی سابق کلام لا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له سے مقدر جملہ کی غایت بیان کر رہا ہے۔ کیونکہ سابق کلام سے یہ مفہوم مترشح ہو رہا ہے کہ شفاعت کرنے والے اور مشغوع لہم (جن کی سفارش کی جاتی ہے) سب اذن شفاعت کے منتظر ہوں گے اور گھبراہٹ و خوف طاری ہوگا کہ ہو سکتا ہے اذن شفاعت نہ ملے۔ یا جب شفاعت کا اذن ملے گا تو کلام الہی کو سننے کے وقت ہیبت الہی اور جلال الہی کی وجہ سے ان پر سراپتنگی طاری ہوگی۔ میں کہتا ہوں اسی طرح جب بھی اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کا فیصلہ فرمائے گا تو انسانوں پر غشی طاری ہوگی۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پر مارتے ہیں گویا چٹان پر کوئی فرخیز لگ رہی ہے۔ پھر جب ان کی گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا فرمایا تمہارا رب نے؟ کہتے ہیں حق فرمایا، وہی بلند و بالا ہے اس کو چوری چھپے سننے والوں (جنوں) نے سنا اور چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ سفیان نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے ترتیب اور انگلیوں کو الٹ کر کے بتایا کہ ہر ایک کلمہ مستنا ہے اور پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے حتیٰ کہ سب سے نیچے والا وہ کلمہ جا دو گریا کہ بن کی زبان پڑا لتا ہے۔ بسا اوقات دوسرے کی طرف وہ کلمات پہنچانے سے پہلے شہاب سے جا لگتا ہے اور کبھی شہاب کے لگنے سے پہلے وہ دوسروں کو القاء کر دیتا ہے اور وہ اس کلام کے ساتھ سو (100) جھوٹ ملاتا ہے پھر کہا جاتا ہے کیا فلاں دن اس جا دو گریا کا بن نے نہیں ایسا ایسا بتایا نہیں تھا۔ پس اس کلمہ کی وجہ سے جو آسمان سے بن گیا تھا اس کا بن کی تقدیر ہی کی جاتی ہے (1)۔

مسلم نے ابن عباس سے اور انہوں نے ایک انصاری سے روایات کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا۔ ہمارا رب جس کا نام بزرگتر والا ہے جب وہ کوئی فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش (فرشتے) تسبیح بیان کرتے ہیں پھر اس آسمان کے مکین تسبیح کرتے ہیں جو ان عرش اٹھانے والوں کے قریب ہوتے ہیں (پھر ان کے قریب والے) اسی طرح سلسلہ چلتا جاتا ہے حتیٰ کہ آسمان دنیا کے مکین فرشتوں تک تسبیح پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش فرشتوں سے قریب والے فرشتے پوچھتے ہیں تمہارا رب نے کیا فرمایا؟ تو حاملین عرش (فرشتے) انہیں وہ سب کچھ بتاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح ہر نیچے والے آسمان کے فرشتے اوپر والوں سے پوچھتے ہیں حتیٰ کہ وہ بات پہلے آسمان والوں تک پہنچ جاتی ہے وہاں سے جن چھوی چھپے سن لیتے ہیں اور پھر وہ اپنے دوستوں کو وہ بات بتاتے ہیں اور جنوں کو شہاب مارے جاتے ہیں۔ پس آسمان کی جو بات وہ صحیح پہنچاتا ہے ہیں وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ بہت زیادہ جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں (2)۔

بخاری نے نو اس بن سحمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کی وحی کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے، آسمان اس کلام الہی کی ہیبت سے لرز جاتے ہیں۔ جب آسمان کے مکین (فرشتے) اس کلام کو سنتے ہیں تو تیبوش ہو جاتے ہیں اور فرور اللہ تعالیٰ کے حضور مجھ رہ پڑ ہو جاتے ہیں پھر سب سے پہلے جبریل مجھ سے سر اٹھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس سے اپنی وحی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے۔ پھر جبریل وہ وحی لے کر ملائکہ کے پاس سے گزرتے ہیں۔ جب بھی کسی آسمان سے گزرتے ہیں تو اس آسمان کے ملائکہ پوچھتے ہیں ہمارے رب نے کیا فرمایا؟ تو جبریل بتاتے ہیں اس نے حق فرمایا اور وہ بلند عظمت اور شان فریخ کا مالک ہے۔ یہ سن کر سب فرشتے وہی کہتے ہیں جو جبریل کہتے ہیں۔ پھر جبریل وہ وحی وہاں پہنچا دیتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے پہنچانے کا حکم فرمایا ہوتا ہے (1)۔

إِذَا قُضِيَ عَمَلُ يَوْمٍ فَاذْكُرُونَهُ مَا بَعَدَ قَالُوا كَيْ مَتَعَلِّقٌ بِهِ، یعنی جب لاحق گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے اذن شفاعت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ شفاعت کے متعلق تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ دوسرے جواب دیتے ہیں ہمارے رب نے حق فرمایا ہے۔ یعنی مہینوں کے متعلق جو اس نے شفاعت کا اذن فرمایا ہے وہ حق ہے۔

سج اللہ تعالیٰ کی شان بہت بلند اور ارفع ہے اور وہ بہت بڑا ہے۔ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی اس کی اجازت کے بغیر لب کشائی نہیں کر سکتا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ قیام قیامت کے خوف سے فرشتے گھبرا جائیں گے۔ مقالہ کلیبی اور سدنی نے کہا ہے کہ یہ کسی علیہ السلام اور محمد ﷺ کے درمیان 550 سال کا زمانہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں چھ سو سال کا زمانہ ہے۔ ملائکہ نے اس درمیانی عرصہ میں وحی کی آواز نہ سنی۔ پھر جب محمد ﷺ کو رسالت کے تاج زرنگار کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو ملائکہ نے وحی کی آواز سنی اور انہوں نے اس کو قیامت تصور کیا کیونکہ آسمان والوں کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت و آمد کا قیامت کی علامات میں سے ہونا مسلم تھا۔ پس وہ وحی کی آواز سنتے ہی قیام قیامت کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔ پھر جب وحی لے کر جبریل بیٹھے اترے تو جس آسمان سے گزرتے تو ان کی غشی دور ہو رہی اور وہ اپنے سرو پر اٹھا کر ایک دوسرے سے پوچھتے تمہارے رب نے کیا کہا؟ تو دوسرے جواب دیتے کہ اس نے حق فرمایا ہے۔ حق سے ان کی مراد وحی تھی (2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ مقالہ اور دوسرے علماء نے اس آیت کی جو جو جہہ فرمائی ہے اس کے لحاظ سے حقیقی إِذَا قُضِيَ عَمَلُ يَوْمٍ فَاذْكُرُونَهُ کا سابقہ کلام سے ربط اور تعلق کیسے ہوگا۔ تو میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقی

إِذَا قُضِيَ عَمَلُ يَوْمٍ فَاذْكُرُونَهُ ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک هو الحق و یهدی الی صراط العزیز الحمید سے متعلق ہے اور الذین اوتوا العلم سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور درمیان میں کلام مستتر ہے۔ معنی یہ ہے کہ ملائکہ جانتے ہیں کہ جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے قرآن نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔ اسی وجہ سے اس قرآن کے نزول کے وقت وہ قیام قیامت کے خوف سے گھبرا گئے کیونکہ ان کے نزدیک اس کا نزول علامات قیامت میں سے تھا۔ حتیٰ کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوئی تو کہنے لگے کیا فرمایا تمہارے رب نے؟ تو دوسرے نے کہا حق فرمایا، وہی بلند عظمت اور بڑی شان والا ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ مشرک ہیں۔ لیکن اور ابن زید فرماتے ہیں مشرکوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کی موت کے وقت ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کی جاتی ہے اور فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے اپنے رسولوں کی زبانی دنیا میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ تو مشرک کہتے ہیں کہ اللہ نے حق ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت وہ اقرار کرتے ہیں، جبکہ ان کا اقرار ان کے لئے نفع مند نہیں ہوتا (3) میں کہتا ہوں اس تاویل پر اس آیت کا تعلق ہو منہا فی شک کے ساتھ ہوگا، یعنی وہ مشرک موت کے آنے تک شک کی اندھیری وادی میں بھٹک رہے ہوتے ہیں حتیٰ کہ مرنے کے بعد جب گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو اس وقت نور حق کو دیکھ

کر اقرار کرتے ہیں لیکن اس وقت اقرار بے سود ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ يُبَدِّلُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لِقَوْلِ اللَّهِ وَإِنَّا لَأَوْيَاتِكُمْ لَعَلَّ
هُدًى آؤ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٧﴾

”آپ فرمائیے کون روزی دیتا ہے تمہیں آسمانوں اور زمین سے خود ہی فرمائیے اللہ! اور ہم یا تم (دونوں میں سے ایک) ہدایت پر ہے اور (دوسرا) کھلی گمراہی میں ہے۔“

آئیے صبیح ان مشرکوں سے پوچھئے کہ بارش کے قطرات اور زمینی فصلوں کے ذریعے تمہیں رزق کے انبار کون پہنچاتا ہے۔ یہاں استفہام تقریبی ہے، یعنی مخاطب کو برا بھینٹ کیا جا رہا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا رازق نہیں ہے۔ یہ جملہ لا بملکون کی تاکید ہے اور قیل ادعوا کے ساتھ متصل ہے۔ اللہ فعل محذوف کا فاعل ہے، یعنی اسے محبوب خود ہی فرمائیے کہ تمہیں رزق اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے کیونکہ ان کے پاس بھی اس جواب کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ مشرک الزام اور سفید بھوٹ کے خوف سے جواب میں توقف اختیار کرتے ہیں لیکن دلوں میں اسی بات کے اقرار ہی ہیں۔

۱۔ ہم توحید کے پرستار ہیں اور تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو یقیناً ہم میں سے ایک گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا گمراہی کی دلدل میں گمرا ہوا ہے۔ کیونکہ توحید اور شرک ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف نظریات ہیں ہدایت اور گمراہی ایک دوسرے کی نقیض ہیں، ارتفاع تقیضین بھی محال ہے اور اجتماع تقیضین بھی محال ہے۔ پس یہ قیہ منفصلہ عناد یہ ہے اور سابق کلام سے یہی مفہوم ہے کہ رزق صرف اللہ تعالیٰ ہی باہم پہنچاتا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اہل توحید ہدایت کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور مشرک کھلی گمراہی میں ہیں قیاس استثنائی کی یہ مثال ہے کہ موحدین (توحید کے داعی) ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔ لیکن وہ ہدایت پر ہیں کیونکہ رزق عطا کرنے والا صرف اللہ ہے پس ثابت ہوا کہ گمراہی میں نہیں ہیں۔ یا اس طرح کہ وہ گمراہی میں نہیں ہیں پس وہ ہدایت پر ہیں یا اس طرح کہا جائے کہ مشرک یا توحید پر ہیں یا گمراہی میں ہیں لیکن چونکہ وہ ہدایت پر نہیں ہیں گمراہی میں ہیں یا وہ گمراہی میں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رازق نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مشرک ہدایت پر نہیں ہیں۔ یہ کلام شک پر مبنی نہیں ہے بلکہ مختلف احتمالات کے حصر اور ایک نقیض کے ابطال اور دوسری کے اثبات یا ایک کے اثبات اور دوسرے کے ابطال کے لئے اس طرح ذکر کی گئی ہے جیسا کہ مناظرہ کا اصول ہوتا ہے۔ ہدی سے پہلے علی حرف جر اور ضلال سے پہلے ننی حرف جر ذکر فرمایا ہے۔ اس اختلاف حرف جارہ کی وجہ یہ ہے کہ گویا ہدایت یا توحید ہدایت پر اس طرح سوار ہے جس طرح سوار اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اسے اپنی مرضی سے دوڑاتا ہے اور گمراہ شخص گویا تار کیوں اور تیرگیوں میں غوطہ زن ہے، اسے پتہ ہی نہیں چٹا کہ کدھر جائے۔

قُلْ لَا تَسْأَلُونَ عَمَّا أَجْرْنَا وَلَا نَسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٣٨﴾

”فرمائیے تم سے باز پرس نہیں ہوگی ان جرموں کی جو ہم نے کئے اور نہ ہم سے باز پرس ہوگی تمہارے کرتوتوں کی۔“

۱۔ یعنی تمہیں جو توحید کی بیروی اور شرک کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہ فقط تمہاری خیر خواہی کے لئے ہے۔ ورنہ اگر تم شرک سے بچنے رہو تو دوسروں کو اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا کیونکہ جو جو برائی کرتا ہے سزا بھی اس کو ملتی ہے۔ اس کلام میں توحید پر برا بھینٹ کیا گیا ہے اور یہاں جرم کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اور عمل کی نسبت مخاطب کی طرف کی ہے۔ اس کی وجہ حسن ادب کی رعایت ہے اور نصیحت اور

خیر خواہی کا اظہار ہے اور اس میں تعصب و اعدت (ہٹ دھری) کا شائبہ تک نہیں ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبَّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۗ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿۱۱﴾

”فرمائیے ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر وہ فیصلہ کرے گا ہمارے درمیان حق (و انصاف) کے ساتھ وہی بہترین

فیصلہ کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

۱۔ یَفْتَحُ: بمعنی بحکم و بفصل ہے۔ یعنی قیامت کے روز ہمارا رب فیصلہ فرمائے گا اور اس کا فیصلہ عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ حق کے پرستاروں کو جنت میں داخل کرے گا اور باطل کے طرف داروں کو آگ میں ڈالے گا۔ الفتاح کا معنی فیصلہ فرمانے والا ہے۔ اور لا ٹیل مسائل کا حل عطا فرمانے والا ہے العلیم جو مناسب فیصلہ کرنا ہوتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ سابقہ آیت میں منازعہ کے طریقہ پر گفتار کو انرا مزہ دیا گیا اور اس کے بعد نصیحت کا انداز تھا اور اس آیت میں تنبیہ کا اسلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا فیصلہ فرمائے گا۔

قُلْ أَمْرٌ فِي الَّذِينَ اتَّخَذْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ ۗ كَلَّا ۗ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲﴾

”فرمائیے مجھے بھی دکھاؤ تو وہ شریک نہیں تم نے اللہ کے ساتھ ملا دیا ہے ہرگز ایسا نہیں بلکہ فقط وہی اللہ ہے جو زبردست

بڑا دانتا ہے۔“

۱۔ اَمْرٌ فِي: کا پسما مفعول ضمیر متکلم منصوب متصل ہے دوسرا مفعول اسم موصول مع صلہ ہے اور تیسرا مفعول شُرَكَاءَ ہے، یعنی جن بتوں کو تم نے عبادت کے استحقاق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا دیا ہے مجھے بتاؤ کس صفت کی وجہ سے تم نے انہیں اللہ کا شریک بنایا ہے؟ کیا انہوں نے کسی چیز کو پیدا فرمایا ہے یا کسی کو زوق دیتے ہیں یا کسی کو کوئی نفع پہنچاتے ہیں یا کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں یعنی ان کو خدا کا شریک کہنے کی کوئی بھی وجہ جو اذ نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مدعا ہے کہ اللہ کو لا جواب کرنے میں زیادتی کرنے کے لئے برہان کی اقامت اور جنت کے التزام کے بعد اس کے شہ کے بارے استفسار کیا جا رہا ہے۔ کلا حرف رد ہے، یعنی جب وہ کسی صفت میں بھی خدا کے شریک نہیں ہیں تو پھر اتنی بڑی واضح دلیل کے بعد تم انہیں خدا کا شریک کیوں کہتے ہو۔ (خدا اور ہٹ دھری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے) مستحق عبادت تو صرف وہی ذات ہے جو زبردست توت والا ہے اور حکمت بالغہ کا مالک ہے۔ اس کی صفات کمال اور صفات جلال میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے تو ان پتھروں کو کیسے اس کا شریک ٹھہراتے ہو جو ساری ممکنات سے ادنیٰ ترین ہیں اور علم و قدرت کو کلی طور پر قبول ہی نہیں کرتے۔ جو ضمیر مبتدا ہے جس کا مرجع اسحق للعبادہ ہے اور اسم جلال اللہ خبر ہے حصری ترکیب سے مستفاد ہے۔ العزیز اور الحکیم اسم جلال اللہ کی صفات ہیں یا سوچی دوسری دو خبریں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو ضمیر نشان ہو اسم جلال مبتدا العزیز اس کی صفت اول اور الحکیم صفت ثانی ہو اور متو حد لاستحقاق العبادۃ خبر مضاف ہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشیر اور نذیر بنا کر۔ لیکن (اس حقیقت کو) اکثر لوگ نہیں

جانتے۔“

۱۔ کافۃ مصدر مضاف کی صفت ہے۔ تقدیر عمارت اس طرح ہوگی و ما ارسالناک الا رسالۃ کافۃ یعنی عاملۃ شاملۃ۔ یعنی آپ کی رسالت تمام لوگوں کو شامل ہے اور کوئی فرد آپ کی رسالت سے خارج نہیں ہے۔ اس تقدیر پر للناس، کافۃ کے متعلق ہوگا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافہ خطاب کی حکمیر سے حال ہوا اور تاء مبالغہ کے لئے ہو۔ اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وجہ اسلسناک الاجامعا لہم فی الابلاغ یعنی ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ آپ لوگوں کو تبلیغ کرنے والے ہیں۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَعْطَيْتُ حَضْرًا لَمْ يُعْطَهُمْ اَحَدٌ قَبْلِي نَصْرًا بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَ جَعَلْتُ لِي الْاَرْضَ كُلَّهَا مَسْجِدًا وَ طَهَّرْتُ رَجُلًا مِنْ اَعْيُنِي اَذْرَكْتُهُ الصَّلَاةَ فَلْيُصَلِّ وَ اِحْلَتْ لِي الْعَنَانُ وَ لَمْ يَحُلْ لِاحِدٍ قَبْلِي وَ اَعْطَيْتُ الشَّفَاعَةَ وَ كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلَى قَوْمِهِ عَاصَةً وَ يُبْعَثُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری و مسلم) (۱) یعنی اللہ نے مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی و رسول کو عطا نہیں کی گئیں۔ اس نے رعب سے میری، فرمائی ایک مہینہ کی مسافت پر دشمن میری ہیبت سے لرزہ برانداز ہوتا ہے۔ میرے لئے تمام روئے زمین کو مسجد اور روزیہ طہارت بنایا۔ میرے آسمانی کوہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے وہ وہاں نماز پڑھ لے اور میرے لئے مال نسیبت کو حلال فرمایا حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا منصب عطا فرمایا۔ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء پر چھ باتوں میں نصیبت دی ہے۔ مجھے اس نے جو امم الکلم عطا فرمائے (یعنی قبل الفاظ میں کثیر معانی کو بیان کرنا) اس نے رعب سے میری مدد کی، میرے لئے مال نسیبت کو حلال فرمایا۔ میرے لئے تمام روئے زمین مسجد قرار دی اور طہارت کا ذریعہ بنایا اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور مجھ پر سلسلہ نبوت مستقر فرمایا (۲)۔

آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو دنیا میں تکفرو عصیان سے روکیں اور آخرت میں دوزخ کی آگ میں گرنے سے روکیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور پھر جب اس کا ارد گرد روشن ہو گیا تو کیڑے بیٹھے اس میں گرنے لگے۔ وہ انہیں آگ میں گرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ غالب آجاتے ہیں اور آگ میں گھس جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں تمہیں آگ میں گرنے سے بچانے کے لئے پکڑتا ہوں لیکن تم اس میں گھس جاتے ہو (۳)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں للناس لو سلسناک کے متعلق ہے اور کافہ، الناس سے حال ہے انتہام کی وجہ سے حال کو مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو سرخ و سیاہ تمام لوگوں کی راہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ اکثر نحوی مجرور پر حال کو مقدم کرنا درست نہیں سمجھتے۔ اور ما اسلسناک کا جملہ قل اور نی کے فاعل سے علمی سبب النزاع حال ہے، یعنی آپ کفار پر جھٹ کے انزام اور ان کو ہدایت کرنے کیلئے یہ ارشادات فرمائے جبکہ آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے یا ان کو روکنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ آپ مومنین کو جنت کی خوشخبری دینے والے ہیں اور کافروں کو آگ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ بشر اؤنڈیر اؤنڈوں کو کاف خطاب سے حال ہیں کیونکہ یہ کافہ کے مترادف ہیں۔ اس تقدیر پر کہ یہ دونوں حال ہوں ایک حرف کے تحت استثناء کے تحت داخل ہوں جیسا کہ اس مثال میں ہے ماضی بتک الا ضرباً شہیداً قائماً۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشر اؤنڈیر اؤنڈیر کافہ کی ضمیر سے حال ہوں جبکہ وہ کہ ضمیر سے حال ہو۔ لیکن اکثر لوگ یعنی کفار حقیقت کا عرفان نہیں رکھتے اور وہ آپ کی رسالت عامہ اور آپ کی بشارت و نذارت پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ آپ کی رہنمائی اور شفقت بھر سے اعزاز میں ہدایت انہیں مزید عناد اور مخالفت پر برا بھلا کہتی ہے (حیف ہے ان کی عقل اور آرف

1- مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 512 (دزارت تعلیم)
2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 188 (دزارت تعلیم)
3- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 248 (قدیمی)

ہے ان کی سوچی پرا

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٠﴾

”اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم بڑے سچے ہو۔“

۱۰ کفار پر جب انہیں وحی کی وجہ سے قیامت کے نظریہ پر مزاح کرتے تھے۔ اور اس کو عقلاً بھید سمجھتے تھے اس لئے پوچھتے تھے کہ جس جنت کی تم بشارت دیتے ہو اور جس دوزخ سے ڈراتے ہو وہ کب ملے گی یا یہ معنی کتم جو صبح و شام ہمیں سناتے رہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جمع فرمائے گا اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ وعدہ کب پورا ہوگا۔ کفار کا یہ خطاب رسول اکرم ﷺ اور مومنین سے تھا۔ اِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ شرط ہے اور اس کی جزاء مٹدوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے، یعنی ان کتم صادقین فی الوعدہ فانسوتنی عن وفد (اگر تم اپنے اس وعدہ میں سچے ہو تو اس کا تاؤ)

قُلْ لَكُمْ مِيعَادٌ يَوْمَ لَا تَسْتَأْذِنُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿١١﴾

”فرمائیے (اے منکر و!) تمہارے لئے وعدہ کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ (ایک لمحہ) آگے بڑھ سکو گے۔“

۱۱ یہ ان کے سوال کا جواب ہے اور ميعاد سے مراد وعدہ کا زمانہ یا وعدہ کا مکان ہے لیکن یہاں وعدہ کے زمانہ کے لئے استعمال ہوا۔ یا ميعاد مصدر ہے اور اپنے زمانہ کی طرف مضاف ہوا ہے اور یوم کی طرف ميعاد کی اضافت بیان ہے (کیونکہ یہ عام کی خاص کی طرف اضافت ہے جیسا کہ ثوب خیر میں ہے) اور وعدہ کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں موت کا وقت مراد ہے، یعنی تمہاری عمر میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ کمی ہوگی، تمہارے لئے وقت مقرر ہے (۱)۔ انہوں نے جو اپنے سوال کے ذریعے قیامت کے نظریہ کا مذاق اڑایا تھا اور انکار کیا تھا اس کے جواب میں یہ دھمکی اور وعید ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا نُو

تَرَى اِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْجَعُ بَعْضُهُمْ اِلَى بَعْضِ الْقَوْلِ

يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا الذِّكْرَ لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا نُو

”کفار (اب تو) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل ہوئیں۔ کاش! تم (وہ منکر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے روبرو اس وقت تک کہ ایک دوسرے پر الزام دہریں گے کہیں گے وہ لوگ جو (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے ان سے جو بڑے بنا کرتے تھے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایماندار ہوتے۔“

۱۱ الذی بین یدہ سے مراد تورات اور انجیل ہے جب کفار نے اہل کتاب سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کی تمام صفات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ کفار اہل کتاب کا یہ جواب سن کر غصہ سے لال پلے ہو گئے اور یہ کہا کہ ہم نہ قرآن کو ماننے ہیں اور نہ پہلی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ الذی بین یدہ سے مراد محمد ﷺ بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں

ندامت کو چھپائے ہوئے ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں عار دلانے اور شرمندہ ہونے کا غدر تھا یا **اَسْرُوا لَئِنْ اَمَدْنَا** کا معنی شرمندگی کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ **اَسْرًا** میں ہمزہ اثبات اور سلب دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے جیسا کہ اشکینہ کا معنی شکایت ثابت کرنا بھی ہے اور شکایت دور کرنا بھی ہے۔ جعلنا کا عطف **رَأَوْا الْعَذَابَ** پر ہے۔ کفار کی مذمت کے اظہار اور ذنجیروں میں پکڑے جانے کے موجب کو بیان کرنے کے لئے **الَّذِينَ كَفَرُوا** اسم ظاہر ذکر فرمایا ہے۔ اسم ضمیر ذکر نہیں فرمایا۔ یحزون کو دو متعدی مفعولوں کی طرف فرمایا حالانکہ یہ بغیر واسطہ کے متعدی بد مفعول نہیں ہوتا۔ 1۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں حرف جر کو مفعول سے پہلے حذف کیا گیا ہے۔ 2۔ **اَسْرُوا** افعلی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔

ابن المنذر اور ابن حاتم نے سفیان عن عامر بن ابی رزین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ دو شخص آپس میں شریک تھے۔ ایک ان سے شام چلا گیا اور دوسرا (کہ میں) ہی مقیم رہا۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو مقیم شخص نے اپنے ساتھی کو خط میں آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے متعلق لکھا پھر مسافر ساتھی نے خط لکھ کر پوچھا کہ آپ ﷺ کی دعوت کا کیا حال ہے مقیم نے جواباً لکھا کہ چند نادار اور مساکین لوگوں نے اس کی اتباع کی ہے۔ مسافر ساتھی نے اپنی تمہارت اور کاروبار چھوڑا اور اپنے ساتھی کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا مجھے اس شخص سے متعلق بتائیے۔ یہ مسافر شخص کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ وہ شخص حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور پوچھا حضور! آپ کا پیغام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے احکام شریعت بتائے تو وہ شخص فوراً کہنے لگا اشهد انک رسول اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تجھے میری صداقت کا کیسے علم ہوا؟ اس نے عرض کی کوئی نبی معوث نہیں ہوتا مگر اس کے پیچ و کار مساکین اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی (1)۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ
كٰفِرُونَ ﴿١٠﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے کسی ہستی میں کوئی ڈرانے والا نذیر کہ بر ملا کہہ دیا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے ہم اس (دین) کا جو دے کر تم بھیجے گئے ہوا انکار کرتے ہیں۔“

1۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کی طرف پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق فرمادی ہے قین **نَذِيرٍ** میں من زائدہ ہے اور نذیر مفعولیت کی بناء پر محل نصب میں ہے الاقوال متروفا، قد کی تقدیر کے ساتھ قین نذیر سے حال ہے۔ یعنی جب کوئی انجام بد سے ڈرانے والا تشریف لاتا ہے تو اس شہر کے امراء اور خوشحال لوگ اس خبر کے داعی کی تکذیب کرتے ہیں یہاں آسودہ حال اور طبقہ امراء کا تکذیب کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے کیونکہ عام طور پر تکذیب اور انکار کرنے والے اسباب تکبر اور مفاخرت ہوتے ہیں اور دنیا دار دنیا کی چمک دک اور پیسے کی ریل چیل پر اترتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں ہر وقت مگن رہتے ہیں اور غریب لوگوں کی تذلیل اور باہانت ان کا طریقہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں جو تم پیغام ہدایت اور دینِ طہارت و نظافت لائے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا آلَٰهَآ وَآلَآؤُا۟ وَآلَٰهَآ مَعَدَّ بَيْنَٰٓہُمْ

”اور کہتے (تم کون ہو، ہمیں ڈرانے والے) ہمارا مال بھی (تم سے) زیادہ ہے اور اولاد بھی اور ہمیں عذاب نہیں دیا جا سکتا۔“

یہ نیز وہ امراء کہتے ہیں ہم تم سے ہزار درجے بہتر ہیں ذرا چشم ہوش کھول کر تو دیکھو مکمل و مازیاں ہماری ہیں زرق برق لباس ہمارے ہیں اولاد کی کثرت ہماری ہے۔ اگر ہم غلط راستے پر ہوتے تو ہمیں یہ سب نعمتیں قطعاً نہ عطا کی جاتیں ان سب نعمتوں کا ہمارے پاس ہونا واضح دلیل ہے کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ اور ہمیں کوئی عذاب وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عذاب ہوگا ہی نہیں۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق قیامت برپا ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا اور ذلیل نہیں کرے گا بلکہ وہاں بھی ہمیں عزت و عظمت سے نوازے گا کیونکہ وہاں نہیں وہ ہمیں احترام و اکرام عطا فرما چکا ہے۔

قُلْ إِنْ مَرَىٰ يَبِيسُ الرَّزْقُ لَسَنَ يَيْسَأُ وَيَقْدِرُ وَلَكِن أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٠﴾

”آپ فرمائیے بے شک میرا رب کاشاد کرتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) لیکن اکثر لوگ (ان نعمتوں کو) نہیں جانتے۔“

اللہ تعالیٰ اس آیت میں کفار کے اس زعمِ باطل کو رد فرما رہے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد میں اضافہ ہدایت کی علامت ہے فرمایا اسے محبوب ان دولت کی کثرت پر گھمنڈ کرنے والوں کو بتا دو کہ دولت اس عظیم و حکیم رب کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ اپنی مکت سے دنیا میں بطور آزمائش کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم دیتا ہے۔ رزق کی کشادگی اور کثرت تو تین اور حکیم کا معیار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دنیا آزمائش کا دور ہے۔ دار جزا نہیں ہے اس وجہ سے دنیا میں خاص اخص و صفات میں ہم مثل افراد کے احوال مختلف ہوتے ہیں لیکن کفار اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی باعث عزت و کرامت ہے۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُكُمْ عَلَيْنَا لِيُزَكِّيَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الصَّغْفِرِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ﴿٦١﴾

”اور (یاد رکھو) نہ تمہارے اموال اور نہ ہی تمہاری اولاد ایسی چیزیں ہیں جو تمہیں ہمارا قرب بخش دین مگر جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا (اسے ہی ہمارا قرب نصیب ہوگا)۔ پس یہی لوگ ہیں جن کے لئے دو گناہ صلہ ہے ان کے عملوں کا اور وہ بالا خانوں میں امن و امان سے رہیں گے۔“

لے زلفی اسم مصدر ہے گویا عبادت اس طرح ہے بقربکم عندنا تقریباً (۱)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی سے پہلے باز آمد ہو اور اتنی اموال کی جماعت کے ارادے سے اموال پر محمول ہو۔ الامن عمل مستثنیٰ منقطع ہے۔ یعنی لیکن جو ایمان لایا اور نیک اعمال کرتا رہا اس کو اس کا ایمان اور نیک عمل ہمارا قرب بخشے گا مال و اولاد ہمارے قرب کا باعث نہیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بقربکم کے مفعول سے مستثنیٰ متصل ہو۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اموال اور اولاد کسی کو اللہ کا قرب نہیں بخشنے مگر مومن نیک صالح شخص جو ایمان مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اور اپنی اولاد کو خیر کی تعلیم دیتا ہے اور نیکی اور صلاح پر اس کی تربیت کرتا ہے تو اسے یہ چیزیں قرب الہی عطا فرمائیں گی۔ یا اموالکم اور اولادکم سے مستثنیٰ ہے اور اس سے پہلے

مضاف مخدوف ہے، یعنی مال و نفع بخش نہ ہوں گے مگر اس کے اموال و اولاد نفع بخش ہوں گے جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا۔
 مع یعقوب نے جزاء کو تمیز یا مصدر کی حیثیت سے منسوب پڑھا ہے مصدر کی صورت میں یہ اس فعل کا مصدر ہوگا جس پر یہ خود دلالت
 کر رہا ہے۔ اور الضعف کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور لہم اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اولک کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح
 ہوگی کہ اولنک لہم الضعف۔ یعنی جزاء یعقوب سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ الضعف اور جزاء دونوں کو انہوں
 نے مرفوع پڑھا ہے الجزاء کو مبتدا اور الضعف کو بدل بنایا ہے اور لہم کو خبر بنایا ہے۔ جس بقراء نے جزاء کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع اور
 الضعف کو مضاف الیہ کے اعتبار سے مجرور پڑھا ہے۔ یعنی مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کو
 اللہ تعالیٰ اعمال جنت کا کئی گناہ زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے سات سو تک اجر عطا فرمائے گا۔ کئی لوگوں کو ان
 کی اخلاص کے انتہائی مقام کی وجہ سے بے شمار بے انتہا نیکیاں عطا فرمائے گا۔ اور فردوس بریں کے بالا خانوں میں انہیں امن و آرام
 عطا فرمائے گا جہاں ان کی زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور پریشانی کا کاٹنا اور کوئی چھین نہ ہوگی۔ جزہ نے غوفات کو العرفہ پڑھا ہے
 اور جنس کا ارادہ کیا ہے اور باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ العرف کا معنی کسی چیز کا بلند کرنا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنت کے بلند
 و بالا محلات ہیں۔ ہم نے اس آیت کی تفسیر اولنک یعجزون العرفہ بما صبروا کے تحت سورۃ فرقان میں ذکر کر دی ہے۔

وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ ۗ أُولَٰئِكَ فِي أَعْدَابٍ مُّحْضَرُونَ ﴿۳۱﴾

”اور جو لوگ کوشاں ہیں ہماری آیتوں کی تکذیب میں تاکہ انہیں ہر اویں وہی لوگ عذاب میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے۔“

قُلْ إِنَّ سَعْيَكُمْ يَبُيِّضُ الْوَرْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادٍ ۗ وَ يَقْدِرُ لَهُ ۗ وَمَا أُنْفِقْتُمْ
 مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۗ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۳۱﴾

”آپ فرمائیے بے شک میرا پروردگار کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا
 ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے۔ اور وہ بہترین رزق دینے
 والا ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو کبھی کشادگی اور خوشحالی عطا فرماتا ہے اور کبھی اسی شخص کو تنگی اور غربت میں مبتلا کر دیتا ہے اس آیت اور سابقہ
 آیت میں نگرانیوں سے کیونکہ یہ ایک شخص کے متعلق ہے جبکہ پہلی آیت دو شخصوں کے متعلق ہے۔ صاحب البحر الموانع فرماتے ہیں پہلی
 آیت کریمہ ان کے فقر و غرور کے رد کے لئے ہے اور یہ آیت ان کے بخل کے رد کے لئے ہے۔

۲۔ وَمَا أُنْفِقْتُمْ میں ما شرطیہ محل نصب میں ہے اور سن شیء ما کا بیان ہے اور جواب شرط قهوه يَخْلِفُهُ ہے۔ یعنی جو تم اللہ تعالیٰ کے راستہ
 میں خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اسکی جگہ یا تو دینا میں اور عطا فرمائے گا یا آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائے گا جب اللہ تعالیٰ کی طرف
 سے اتنا فیاض اور قدر دانی کا مظاہرہ ہے تو تم اپنے اموال کو اللہ کے راستے میں خرچ کیوں نہیں کرتے اور کجی و بخل کیوں کرتے ہو۔
 مسند الیہ کو مسند فعلی پر تخصیص اور تاکید کیلئے مقدم فرمایا ہے۔

۳۔ صرف اللہ ہی بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے کیونکہ دوسرے لوگ رزق پہنچانے کا واسطہ ہوتے ہیں۔ حقیقت رزق کی عطا اللہ
 تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں پر رازق کا اطلاق مجازی ہوتا ہے اور رازق حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ

الزَّوْفَيْنِ میں حقیقت و مجاز دونوں جمع ہیں، ہم کہیں گے یہاں مجاز کا عموم مراد ہے۔

وَيَوْمَ يَحْضُرُهُمْ جَبِينَعَالِمٌ يَقُولُ لِمَ كُنْتُمْ كَافِرًا إِنَّا كُنَّا لَمَعْبُدُونَ ①

”اور جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہاری پوجا کیا کرتے تھے۔“

۱۔ ہم ضمیر کا مرجع کفار ہیں، یعنی تکبریں اور ضعیف لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ يَقُولُ کا عطف یَحْضُرُ پر ہے۔ یعقوب ابو جعفر اور مفسر نے یَحْضُرُ اور يَقُولُ کو یاد کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کو کون کے ساتھ پڑھا ہے۔ کفار فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے کہ (نعوذ باللہ) یہ اللہ کی بنیادیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ مشرکین کو شرمندہ کرنے کے لئے ملائکہ سے پوچھیں گے کہ یہ لوگ تمہاری پوجا کرتے تھے۔ تو یہ سوال کفار کو رسوا کرنے اور ان کی شفاعت سے انہیں مایوس کرنے کے لئے کیا جائے گا۔ یہاں ملائکہ کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ جن ذوات کی یہ کفار پوجا کرتے تھے اور جن کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ان میں سب سے معزز یہ ہیں۔ اور ان تمام میں خطاب کے اہل بھی یہ ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شرک کی ابتداء ان کی عبادت سے ہوئی تھی۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيْنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۗ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۗ اَكْثَرَهُمْ بِهِمْ مَّبْهُوْتُوْنَ ②

”فرشتے عرض کریں گے تو پاک ہے ہر شرک سے۔ ہمارا مالک تو ہے ہمارا ان سے کیا واسطہ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا

کرتے تھے ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے۔“

۱۔ فرشتے عرض کریں گے ہم تجھے ہر شرک سے پاک سمجھتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق اور دوستی فقط تیرے ساتھ ہے ان بد بختوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مراسم نہیں ہیں۔ گویا فرشتے براءت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم ان کی عبادت سے خوش نہ تھے۔ یہ شیطانوں کی عبادت کرتے تھے جنہوں نے ان کے سامنے فرشتوں کی عبادت کو مزین کر کے پیش کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ شیطان ان کے سامنے ایسی شکلوں میں آئے تھے کہ وہ انہیں فرشتے سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اکثر ہم سے مراد یا کفار ہیں یا اکثر سے مراد کل ہے اور ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں۔ ہمہ کی ضمیر کا مرجع جن ہیں۔

قَالِيَوْمَ لَا يَمِيْلُكَ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ تَفْعًا وَلَا صِرًا ۗ وَ نَقُولُ لِنَدِيْنٍ ظَلَمُوْا ۗ دُوْنُوْا عَذَابِ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكْفِرُوْنَ ③

”پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نقصان کی اور ہم کہیں گے جنہوں نے

ظلم کیا تھا کہ کچھو کچھ (جہنم) کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

۱۔ چونکہ قیامت کے روز حکم صرف اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوگا اس لئے جن اُس اور فرشتے ایک دوسرے کو بذات خود نفع یا نقصان ٹوٹا یا شفاعت اور عذاب نہ پہنچا سکیں گے۔ اور مشرکوں نے ان کی عبادت کر کے جو لائق عبادت نہیں تھے اپنے اوپر ظلم کیا اس لئے انہیں عذاب نار میں جھونک دیا جائے گا اور کہا جائے گا تم جس عذاب کو جھٹلاتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

وَ اِذَا تُنْفِثُ عَلَيْهِمْ اٰیٰتُنَا يٰٓهٰٓنَا هٰٓذٰلِكَ اَلَّا سَجَلٌ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّصِدَّكُمْ ۗ عَمَّا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ اٰبَاؤَكُمْ ۗ وَ قَالُوْا مَا هٰٓذٰلِكَ اِلَّا اَفْكٌ مِّمَّنْ سَبَّوْا ۗ وَقَالَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۗ اِنْ هَذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٣٠﴾

”اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں انہیں ہماری آیتیں درآں حالیکہ وہ بالکل واضح ہیں کہتے ہیں نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جس نے ارادہ کر لیا ہے کہ روک دے تمہیں ان (مجموعوں) سے جن کی تمہارے باپ دادا جو کیا کرتے تھے نیز کہتے ہیں نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ گھڑا ہوا اور کفار کہتے ہیں حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا کھلا۔“

۱۔ عَلَیْہِمُ کی ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ اِلَیْنَا بِنَبِیْنِکُمْ سے مراد قرآن کی آیات ہیں جو محمد ﷺ کی زبان پر واضح ہیں۔ افک سے مراد ایسی بات جو واقعے کے مطابق نہ ہو۔ الحق سے مراد نبوت یا اسلام یا قرآن ہے۔ یعنی کفار بلا سوچے سمجھے حق کو کھلا جادو کہہ دیتے ہیں۔ معنی کے اعتبار سے حق کا معنی نبوت اور اسلام ہوگا اور لفظ اور اعجاز کے اعتبار سے قرآن مراد ہے۔ قالوا کے فعل کو مکرر اور صراحت کفار کا دوبارہ ذکر کرنا اور اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا میں اسم موصول کلام اور الحق پر لام تعریف ان تمام چیزوں میں اشارہ ہے کہ یہ باتیں کہنے والے کافر تھے اور ان کے کفر نے انہیں اس بات پر پہنچتے کیا کہ وہ اس کے نبی مکرم ﷺ اور اس کی کتاب تبیین اور اس کے دین حنیف کے متعلق ایسی بے نکی اور لافنی باتیں منسوب کر دیں جو حوزی سی عقل والا بھی نہیں کہہ سکتا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کے متعلق ایسی بات انہوں نے کہی ہے وہ حق تبیین ہے اس پر صرف معاند اور مکار برظن کرتا ہے۔ سلیم الفطرت سے ایسی بات کا ہونا ناممکن ہے اور یقیناً ان کی یہ بات انتہائی قبیح ہے اس اسلوب بیان میں اس بات پر اگلی کرنا مقصود ہے کہ ان کی یہ بات انتہائی ناروا اور انتہائی تعجب خیز ہے۔

وَمَا آتٰیہُمْ مِنْ کُتُبٍ یَدْرُسُوْنَہَا وَمَا اُرْسِلْنَا اِلَیْہِم مِّن نَّبِیٍّ ﴿٣١﴾

”اور نہ ہی ہم نے انہیں کوئی کتابیں دیں جن کا یہ مطالعہ کرتے ہوں اور نہ ہی ہم نے بھیجا ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔“

۱۔ ہم ضمیر کا مرجع کفار مکہ ہیں یعنی ہم نے کفار مکہ کو کوئی ایسی کتاب نہیں دی جس میں شرک کی سختی کی کوئی دلیل ہو۔ اور نہ ہم نے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا ہے جو انہیں شرک کی طرف بلاتا ہو اور شرک کے ترک پر انہیں ڈرانے والے ہیں یہ کس بنا پر شرک کا دعویٰ کرتے ہیں اور کس بنیاد پر قرآن پر بھی جھوٹ کا کبھی تحریک الزام لگاتے ہیں اور کوئی ان کے پاس حجت ہے جس کے سہارے یہ نبی کریم ﷺ کو جھٹلاتے ہیں اس ارشاد میں ان کی جہالت اور سخاوت کو آشکارا کیا گیا ہے اور انہیں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے حال ہے۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَمَا يَلْبَعُوْا مِمَّا آتٰیہُمْ مِّنْ کُتُبٍ ۗ وَكَيْفَ كَانَ نَكِیْرٍ ﴿٣٢﴾

”اور (انبیاء کی) تکذیب کی جو ان سے پہلے گزرے اور یہ (کفار مکہ) انہیں پہنچنے والے دوسو حصہ کو بھی جو (توت ڈبہ) ہم نے ان کو دیا تھا جس جب انہوں نے جھٹلایا میرے رسولوں کو تو کتنا ہولناک تھا میرا عذاب۔“

۱۔ پہلی قوموں سے مراد قوم عاد و ثمود و قوم ابراہیم قوم لوط اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ہیں۔ یہ جملہ بھی ترکیبی لحاظ سے قد کی تقدیر

کے ساتھ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے یا قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر معطوف ہے۔ یعنی کفار کلمہ کے پاس تو ان نعمتوں کا دوسواں حصہ بھی نہیں ہے جو ہم نے پہلی قوموں کو عطا کی تھیں مثلاً تعداد ان کی ان سے کئی گنا زیادہ تھی، معیشت ان کی ان سے ہزار درجہ بہتر تھی، عمریں بھی ان کی ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے میرے رسولوں سے بدتمیزی کی اور ان کی تکذیب کی تو میرا ان پر ایسا عذاب آیا جس نے ان کی ساری خوبیوں اور غرور خاک میں ملا دیا۔ ان کو جو سزا ملی اس کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اس پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بالکل اپنے مقام پر واقع ہوئی تھی اور جو اس سزا کے مستحق تھے بالکل ان پر ہی مسلط ہوئی تھی۔ یہ استغناء تو حج کے لئے ہے۔ پس جو ان کی شس اب میرے نبی الانبیاء کی تکذیب کر رہے ہیں انہیں ایسی حرکات سے باز آ جانا چاہئے۔ کذب کے فعل میں تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلا کذب تکذیب کے لئے ہے اور دوسرا فعل تکذیب کے لئے ہے یا پہلا فعل مطلق ہے، مفعول کے ساتھ متقید نہیں ہے، یعنی اس کے لئے مفعول لا مقدر نہیں ہے بلکہ لازم فعل کے قائم مقام ہے اور دوسرا کذب مفعول کے ساتھ متقید ہے اور اجمال کے بعد تفصیل ہے، اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف فاء ذکر کیا گیا ہے۔ صاحب البحر الموانج کہتے ہیں فکذبوا راسلی کی ضمیر کا مرجع کفار کلمہ ہیں اور اس کا عطف ما بلغو پر ہے۔ پس اس صورت میں تکرار ہو گا ہی نہیں۔ ورش نے نکبوی کو صرف وصل کی صورت میں یاہ کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور علماء نے وصل و وقف دونوں حالتوں میں یاہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَعْطٰكُمْ بِوَاحِدٍ قَوْلٍ اَنْ تَقُوْا مَوٰلِيْهِ مَشِيْ وَاَقْرٰبِيْ ثُمَّ تَتَّقُوْا مَا
بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جُنْتٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَبِيٌّ لِّكُمْ بَيِّنٌ يَدِيْ عَذٰبِ سَعِيْدٍ ﴿١٠﴾

”(اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمائیے میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں (یہ تو ان لوگوں) تم اللہ کے لئے کفر ہے جو جاؤ دو دیا کیلئے پھر خوب سوچو (تمہیں ماننا پڑے گا) تمہارے اس رفیق میں جنوں کا شائبہ تک نہیں ہے۔ نہیں ہے وہ مگر بد وقت خردار کرنے والا تمہیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے۔“

۱۔ اس آیت کریمہ میں قیام سے مراد وہ قیام نہیں جو بیٹھے اور سونے کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ یہاں قیام سے مراد کسی کام کے لئے تیار ہونا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے اَنْ تَقُوْا مَوٰلِيْهِ مَشِيْ وَالْقَطِيْطُ۔ یعنی تم تعصب کی نینک اٹا کر اور اللہ کی تقلید سے ہمت کرنا الہی کے لئے کبھی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر یا اپنے کسی دوست اور ساتھی سے مل بیٹھ کر انصاف کی نظر سے محمد ﷺ کے متعلق سوچو تو تم پر حق کا روئے تاباں بالکل عیاں ہو جائے حقیقت اپنا نقاب خود بخود الٹ دے گی اور تم پر واضح ہو جائے گا کہ تمہارا بچپن کا ساتھی جسے کائنات ارضی محمد ﷺ کے اسم مبارک سے یاد کرتی ہے اس میں آسب و جنون کی کوئی علامت نہیں ہے بلکہ وہ صاحب عقل اور صاحب دانش ہے، اس کی فکر صاحب ہے اس کے اقوال و افعال کو دیکھ کر کوئی بھی سلیم الفطرت اور شعور رکھنے والا اس کی رسالت اور اس کے جذبات خیر کا منکر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کا منکر اور اس کو جنون کہنے والا وہی ہو سکتا ہے جس کی اپنی عقل میں خلل ہو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں یہ کتنا عام فہم معاملہ ہے کہ کیا کوئی شخص تنہا اور بغیر کسی ظاہری طاقت و ثروت کے بغیر کسی دلیل اور وثوق کے ایسا کام شروع کر سکتا ہے یا کوئی ایسا نظریہ پیش کر سکتا ہے جس کی وجہ سے اپنے بیگانے سب دشمن ہو جائیں۔ اور کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جس میں نہ کوئی نفع ہو اور نہ دفع ضرر ہو۔ ذرا چشم ہوش کھولو دل کی آنکھ سے دیکھو، اس کی تبلیغ اور اس کے پیغام روح افزا میں نہ تو کوئی دنیوی نفع مقصود ہے اور نہ مخلوق کی دشمنی کے ضرر کو دور کرنے کا مفاد موجود ہے اس نے خود ہی ارشاد فرمایا اِنَّمَا اَسْتَأْتِيْكُمْ بِقَوْلٍ

میرے رب سے اجر عظیم نہ ملتا ہوتا تو میں یقیناً ایسی اذیتیں اور مشقتیں کبھی نہ اٹھاتا۔ پس تمہارے لئے ضروری ہے کہ میری اتباع کرو اور ایسے اعمال حسنہ کرو جو تمہارے لئے جناب الہی میں اجر کو کثرت کردیں اور ایک اعمال کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے تم اسکی مہربانی سے مستحق قرار پاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے معاذ تجھے علم ہے کہ اللہ کا بندوں پر حق کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟ حضرت معاذ فرماتے ہیں میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اسے وہ مذنب نہ دے (۱)۔ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے پس وہ ہر شخص کو اس کے اعمال اور اعتقاد کے مطابق اجر و عطا فرمائے گا۔

قُلْ إِنْ مَرَىٰ يَاقُوتَ بِالْحَقِّ ۖ عَلَٰمُ الْغُيُوبِ ۝

”فرمائیے بیشک میرا رب (باطل پر) حق سے ضرب لگاتا ہے۔ وہ سب غیبوں کو جانتے والا ہے۔“

۱۔ یعنی آپ اعلان فرمادیں کہ میرا رب وہ ہے جو اپنے بندوں میں سے جس پر جانتا ہے حق کا نزول فرماتا ہے۔ یا یہ معنی کہ حق کے ساتھ باطل طاغوتی قوتوں پر حق کے ساتھ ضرب لگاتا ہے اور انہیں پاش پاش کر دیتا ہے یا یہ معنی کہ آفاق عالم حق کو پہنچانے کا اور غلبہ اسلام کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سطح زمین پر کوئی شی کا گھر اور کوئی اون کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ عزیز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ اس میں کھرا اسلام کو اطل فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ جن کو عزت دے گا ان کو عزت والوں سے بنا دے گا اور جن کو ذلیل کرے گا وہ ذلیل ہو کر دین کی اطاعت کریں گے (2)۔

۲۔ عَلَٰمُ الْغُيُوبِ صفت ہے جو ان کے اس عمل پر محمول ہونے یا بقصد کی ضمیر سے بدل یا ان کی دوسری خبر یا مبتدا منذوف کی ضمیر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے، یعنی وہ سب غیب کو جانتا ہے اور وہ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ وہی کی اہمیت کس میں ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ دین اسلام کا اچھا انجام کیسے ہوگا؟ وہ دین اسلام کے ساتھ کفر کو دفع کرے گا اور اس کا پرچم شرق و غرب میں لہرائے گا۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَصَٰئِبِيُّ الْبَٰطِلِ ۚ وَصَٰئِبِيُّ ۝

”(اے محبوب!) اعلان کر دیتے ہیں حق آگیا اور باطل کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔“

۱۔ اسے پیار سے محمد ﷺ اپنی زبان حق ترجمان سے اعلان فرمائیے کہ قرآن اسلام اور تو حید کو غلبہ نصیب ہوگا اور شرک و باطل ختم ہو جائے گا۔ نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا کہ وہ کوئی نیا کام شروع کر سکے اور کسی کام کا مادہ کر سکے گا۔ ارشاد فرمایا۔ بَلَىٰ لَنُقَدِّفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَٰطِلِ قَدَيْدًا مَّثَّةً فَاذْهَبْ هَٰذَا هَٰذَا الْحَقُّ ۗ (ترجمہ) بلکہ ہم تو چوت لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے چکل دیتا ہے اور وہ یکا یک نابود ہو جاتا ہے۔ قنادہ فرماتے ہیں باطل سے مراد اہلسی ہے (3)۔ یعنی اہلسی نہ کسی کو پیچھا کر سکے گا اور نہ کسی کو قیامت کے روز اٹھائے گا۔ گیلی کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد بت ہیں (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں کفار کہ

1- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 44 (تقریباً)

2- مشکوٰۃ، الصحاح، صفحہ 16 (وزارت تعلیم)

3- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (انجاریہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (انجاریہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (انجاریہ)

جائے گا یا روزِ محشر موقف سے دوڑ میں ڈالے جانے تک پکڑ لیا جائے گا اور ضحاک فرماتے ہیں یہ بدر کے دن کفار سے سلوک ہو چکا ہے، انہیں قریب کے مکان سے عذاب دینے کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ لیکن بعد والاول اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔

وَقَالُوا الْمَثَلُ لَآءِ آتَىٰ لَهُمُ الشَّوْشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۱﴾

”اس وقت کہیں ہم نے ایمان لے آئے ان پر لہٰذا لیکن اب کیونکر وہ پاسکتے ہیں ایمان کو بل اتنی دور جگہ سے ہے۔“

لہٰذا یہ کہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں، آپ کا ذکر پہلے مابصاحب حکم کے ارشاد میں ہو چکا ہے انہوں نے بدر کے دن تو یہ نہیں کہا تھا کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں بلکہ ابو جہل کو جب قتل کیا جا رہا تھا اور اس کی زندگی میں دیکھ رہی تھی حضرت ابن مسعود نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَخْرَجْنَاكَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ سَبَّ قَرْبَيْهِمْ اِسْ ذَاتِ كَيْ لَمْ يَسْ جَسَّ رَسُوْلًا كَمَا۔ ابو جہل نے کہا اس نے مجھے کیسے رسوا کیا ہے۔ جس کو اپنی قوم ہی قتل کر دے اس کی رسوائی کیسے ہوتی ہے۔ کفار موت کے وقت (جب آنکھیں کھلی ہوگی اور عروا نکل علیہ السلام سختی سے آنگ انگ سے روح نکال رہے ہوں گے) کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے اور جب قبور سے نکل کر عذاب کا مشاہدہ کریں گے اور عذاب سامنے نظر آ رہا ہوں گا تو کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے۔ (اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ سابق آیت کی تفسیر کے جو تاویل بیان کی ہے وہ درست نہیں ہے)

یعنی نافع ابن کثیر، ابن عامر اور حفص نے الفتاوش کو واؤ کے ضمہ اور بغیر مد کے پڑھا ہے اور اس کا معنی کسی چیز کو لے لینا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس وقت ایمان اور توبہ کا پانچا نا ان کے لئے کہاں سے ہوگا۔ باقی قرآن نے واؤ کی جگہ مزہز اور مد کے ساتھ پڑھا ہے اور مزہز جب وقف کرتے ہیں تو اسے تین تین کرتے ہیں کیونکہ یہ النش (باہرہ) سے مشتق ہے اور اس کا معنی آجستہ حرکت کرنا ہے۔ یعنی ان کے لئے حرکت کرنا اور ایمان توبہ کو طلب کرنا کیسے ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ النش سے مشتق ہو جس کا معنی الفتاوش ہو۔ اور اس کی اصل واؤ ہو۔ پھر واؤ کے ضمہ کے لڑوم کی وجہ سے واؤ مزہز سے بدل گئی ہو، اسی وجہ سے مزہز واؤ کے ضمہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔ اور یہ اپنی اصل پر وارد ہے الدانی نے التیسیر میں اسی طرح لکھا ہے۔ قاموس میں الناش (باہرہ) کا معنی لینا، پکڑنا، اضمنا، تاخیر کرنا لکھا ہے (1)۔ اور یہاں تاخیر کرنے والا معنی درست نہیں ہے لیکن باقی سب معانی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ النش (بالواؤ) کا معنی کسی چیز کو لینا، طلب کرنا، چننا اور امانت سے جلدی کرنا ہے۔

یعنی ایمان کا قبول کرنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان مکلف ہو۔ اب تکلیف کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو جزا و سزا کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ ایمان قبول کرنے اور توبہ کرنے کا وقت فوت ہو جانے کے بعد کفار کے خلاص طلب کرنے کو محال ہونے میں اس شخص کی حالت سے تشبیہ ہو گئی ہے جو درواری کی چیز کو اس طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے وہ ایک ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں کفار قیامت کے روز دنیا کی طرف لوٹنے کا سوال کریں گے تو انہیں کہا جائے گا آخرت سے دنیا کی طرف لوٹنا کیسے ہو سکتا ہے (2)۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَيَقْدُوْنَ بِالْعَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

”حالانکہ وہ کفر کرتے رہے ان سے اس سے پہلے۔ اور دور سے بن دیکھے یا وہ گویاں کرتے رہے۔“

۱۔ پہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے یا محمد ﷺ ہے جن کا ذکر مابصاحمکم میں ہو چکا ہے یا قرآن ہے جس کا ذکر جاء الحق کے ضمن میں ہوا ہے یا عذاب ہے جو احدنوا سے مفہوم ہے۔ یہ جملہ فالوا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی اس سے پہلے جبکہ توجیز رسالت اور قرآن کو قبول کرنے اور ماننے کا وقت تھا اس وقت تو ان کے شب و روز اسی مشغولیت میں سر ہوئے کہ کبھی توحید باری تعالیٰ کا انکار کبھی میرے نبی پر لائینی الزامات و اعتراضات کبھی قرآن کی روشن آیات پر اور عقیدہ قیامت پر پھبتیاں۔

۲۔ بغیر کسی دلیل کے بن دیکھے نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں بڈیان کہتے تھے اور آخرت کے تصور اور نظریہ کے متعلق مختلف شبہات بیان کرتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ شاید ان کی حالت کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اندھیرے میں تیر مار رہا ہے اور دور دراز جگہ سے اسے نشانہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے کیا ایسے شخص کا تیر اپنے نشانہ پر پہنچ سکتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بد بخت محمد ﷺ کے متعلق ایسی لائینی باتیں کہتے جن کا انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا تھا (۱) کبھی کہتے سارے کبھی کہتے جنتوں ہے۔ ان ہرزہ مریاویں پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہ تھی۔ لائینی باتیں اور ہرزہ سرائی کرنے کے لئے عرب کہتے ہیں بقذف بالعباب۔ قنَادہ فرماتے ہیں وہ اپنے گمان سے کہتے کہ قیامت قائم ہوگی، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ ہے (۲)۔ بقذف بالعباب کا یہی معنی ہے۔ وبقذفون الخ کا عطف کثرت ذابہہ پر ماضی کی حالت کی حکایت کی بناء پر ہے۔ یا اس کا عطف فالوا پر ہے۔ اس عطف کی صورت میں ان کی حالت کی تشبیہ ایسے شخص سے ہوگی جو لائینی باتیں کہتا ہے دنیا میں ایمان ضائع کرنے کے بعد اب اس کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وَجِيئَ لِيَهُنُّمْ وَبَيَّنَّ مَا يَشْكُرُونَ كَمَا فَعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِمَّنْ قَبْلُ ۗ إِنَّهُمْ
كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴿۵﴾

”اور رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جو وہ دل سے چاہتے ہوں گے جیسے ان کے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ پہلے کیا گیا تھا وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو دوسروں کو بھی شک میں ڈالنے والا تھا۔“

۱۔ یعنی ایمان کے نفع اور دوزخ سے نجات یا دنیا کی طرف لوٹنے یا دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کریں گے لیکن ان کے درمیان اور ان کی امیدوں کے درمیان ایسا دیر پردہ حائل ہوگا ایسی مضبوط اور بلند دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کا کراس کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ بیٹئینہ طرف جبل کے نائب فاعل کے قائم مقام ہے یا جبل اپنے مصدر کی طرف منسوب ہے یعنی جبل الحیلولة۔ ابن عامر اور کسائی نے جاء وضمہ کے اشام کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے اشلام کے ساتھ پڑھا ہے۔ اشیاء سے مراد گذشتہ منکر قومیں ہیں۔ یعنی اس سے پہلے وہ قیامت اور عذاب میں مبتلا کیے جانے کے بارے میں شک کرتے تھے۔ مرایب: یا تو اہم فاعل ہے یا ذی ریبہ کے معنی میں ہے اور یہ مشک یا شاگ سے منقول ہے۔ اور ممالک کے لئے شک کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على شفيع المذنبين۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آج مورخہ 16 دسمبر 2000ء، بوقت 9:25 پر سورہ سہا کی تفسیر کا ترجمہ مکمل ہوا۔ اور سورہ ملائکہ کی تفسیر کے ترجمہ کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے و صلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

سورۃ فاطر

ایاتھا ۲۵ ﴿۲۵﴾ سورۃ فاطر ﴿۲۵﴾ رکوعاھا ۵ ﴿۲۵﴾

سورۃ فاطر کی ہے اس میں پینتالیس آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرماتے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اُجْنَیۡتۡ مَشۡیٰی
وَوَثَّقَ وَاَمۡرًا یَزِیۡدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۵﴾

”سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ جس نے بنایا ہے فرشتوں کو پیغام رساں جو پر در باز و قائل ہیں کسی کے دو کسی کے تین اور کسی کے چار وہ زیادہ کرتا ہے بناوٹ میں جو چاہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لائے والا ہے۔ فاطر الفطرہ سے مشتق ہے جس کا معنی نیست سے ہست کرنا ہے۔ فاطر السَّمٰوٰتِ وَاَرْضِ میں اضافت معنوی ہے کیونکہ فاطر اسم فاعل بمعنی ماضی ہے اور یہ اسم جالت کی صفت ہے۔

یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور نیک لوگوں کے درمیان پیغام رسائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے وحی لے کر انبیاء کرام اور رسولوں تک پہنچاتے ہیں اور الہام والقاء یا سچے خوابوں کے ذریعے اولیاء کرام کو مشرف فرماتے ہیں یا یہ فرشتے اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان قدرت الہیہ کے کرشمے ظاہر کرنے پر مامور ہیں۔ جاعل کی ملامت کے طرف اضافت لفظی ہے کیونکہ جاعل رسل میں عمل کر رہا ہے اور یہ دوسرے مفعول میں عامل ہوئی نہیں سکتا جب تک کہ پہلے مفعول میں عامل نہ ہو کیونکہ یہ افعال قلوب کے ملحقات سے ہے اور ان میں ایک مفعول پر اقتصار جائز نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حال یا استقبال میں محمد ﷺ اور آپ کی امت کے خواص تک کے لئے پیغام رساں بنایا ہے۔ جاعل اسم جالت سے بدل ہے صفت نہیں ہے۔ اُولٰٓئِیْ اُجْنَیۡتۡ وَاَمۡرًا سے بدل ہے مَشۡیٰی وَوَثَّقَ وَاَمۡرًا کی صفت ہیں۔ تمنا دہ اور متقابل فرماتے ہیں فرشتوں میں سے کسی کے دو کسی اپنی مخلوق میں سے جس کے لئے چاہتا ہے اس میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ امام مسلم نے ابن مسعود سے نقل دیا من آیاتہ الکبریٰ کی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا اس کے چہرے پر تھے (۱۷)۔

ابن مہبان نے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جبریل کو سدرة المنتہیٰ پر دیکھا۔ اس کے سات سو پر

تھے اور اس کے پروں سے موتی اور یا قوت چھڑ رہے تھے۔ یہ جملہ (عَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ) مستانہ ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مخلوق میں تفاوتِ شہیت الہی اور حکمت الہی کا منقضی ہے۔ مخلوق کے اجسام بذاتِ خود اس تفاوت کا تقاضا نہیں کرتے۔ یہ آیت کریمہ جسامت اور معانی جیسے چہرہ کی ملاحظہ، حسن صوت، ساحت نفس، عقل و دانش وغیرہ کوشاں ہے، یعنی جس کے لئے چاہتا ہے ان چیزوں میں زیادتی پیدا فرماتا ہے۔ ابن شہاب فرماتے ہیں اس اضافہ سے مراد حسن الصوت ہے (1) قادر فرماتے ہیں آنکھوں کی ملاحظہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں عقل و دانش مراد ہے (2)۔ یہ تمام چیزیں بطور تمثیل ہیں۔

مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

”جو عطا فرمائے اللہ تعالیٰ لوگوں کو (اپنی) رحمت سے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اسے کوئی دینے والا نہیں اس کے روکنے کے بعد اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے۔“

یہ آیت کا اصل معنی کسی بند چیز کو کھول دینا ہے لیکن یہاں بطور مجاز معنی (عطا کرنا) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ سبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے۔ رحمت سے مراد نعمتِ دینیہ ہے جیسے ایمان، علم نبوت اور نیکیوں کی توفیق وغیرہ یا نعمتِ دنیویہ مراد ہے جیسے بارش، رزق، امن و سکون، صحت، جاہ و شہرت، مال اور اولاد وغیرہ۔ پہلے (فَلَا مُمْسِكَ لَهَا) یعنی ضمیر مومنٹ ذکر فرمائی اور فلا مومسل لہ میں ضمیر مذکر ذکر فرمائی۔ ضمیروں کا یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ پہلے اسم موصول کی تفسیر رحمت سے کی گئی ہے اس لئے وہاں اس کے معنی کی رعایت کی گئی ہے اور دوسری جگہ اسم موصول مطلق ہے جو رحمت اور غضب دونوں کوشاں ہے، اس لئے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر مذکر ذکر فرمادی۔ اس آیت میں رحمت کے پہلے ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ علم و عزیز ہے، یعنی جو اس کا ارادہ اور شہیت ہوتی ہے اس کے کرگزرنے پر غالب ہوتا ہے، کوئی اس سے اس کے ارادہ میں جھک نہیں سکتا۔ وہ حکیم ہے، اس کا ہر کام علم اور اتقان کے ساتھ ہوتا ہے۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں صفیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ کلمہ پڑھتے تھے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُغْطِي لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَنَّةِ مِنْكَ الْجَنَّةُ (3)۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے جیسے چاہتا ہے اپنی مخلوق میں تصرف فرماتا ہے اس لئے تمام لوگوں کو اپنے سے پاپاں انعامات پر شکر کرنے کا حکم فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۖ هَلْ مِنْ خَلْقٍ غَيْرِ اللَّهِ يُرْزِقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَالَّذِينَ نُوْكَفِرُونَ ۝

”اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی (بھلا یہ تو بتاؤ) کیا اللہ کے بغیر کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں رزق دیتا ہے آسمان اور زمین سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے سو (اس سے) منہ چھیر کر کدھر جا رہے ہو۔“

یہ آیت سے مراد اہل مکہ ہیں اور اس کے عموم میں دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ یعنی اے لوگو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو کہ اس نے انہیں بخاری، جلد 5، صفحہ 243 (انجاریہ) 2 تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 243 (انجاریہ) 3 صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 218 (قدیمی) 1 تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 243 (انجاریہ)

تمہیں حرم میں رہائش اور سکونت عطا فرمائی۔ تمہیں ہر قسم کے حملوں سے محفوظ فرمادیا زمین کو تمہارے لئے بچھوتا فرمایا۔ آسمان کو تمہارے سروں پر بلیغی ستون کے بلند فرمایا۔ نیز تمہاری تخلیق فرمائی۔ اور وہ اپنی مخلوق سے جو زیادتی چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ اس نے رزق کے دروازے کھول دیئے جنہیں کوئی بند کرنے والا نہیں ہے، کسی غیر کو ان نعمتوں کے عطا کرنے میں کچھ دخل نہیں ہے۔ تاکہ اسے خدا کا شریک بنایا جائے۔ اور شاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایسا خالق ہے جو تم پر آسمان سے بارش برساتا ہو اور زمین سے گونا گوں پودے اور اناج اگاتا ہو۔ خالق سے پہلے من زائدہ ہے کیونکہ استنبہام نفی کے معنی میں انکار کے لئے ہے۔ اور خالق مبتدا ہے۔ غیر اللہ رفع کی قرأت کے مطابق خالق کا فاعل ہے۔ یا خالق مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی **هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ**۔ یا خالق کی خبر **غَيْرِ اللَّهِ** ہے اور **غَيْرِ اللَّهِ** خالق کی صفت ہے یا بدل ہے۔ حمزہ اور کسائی کے **غَيْرِ اللَّهِ** کو لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے اور باقی قراء نے محل پر محمول کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے یا خالق فعل محذوف کا فاعل ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی **هَلْ يُوْزِقُكُمْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ** اور **يُوْزِقُكُمْ** خالق کی صفت کے اعتبار سے محل جریارفع میں ہوگا۔ یا حال کی حیثیت سے محل نصب میں ہوگا یا **يُوْزِقُكُمْ** مضر فعل یوزق کی تفسیر ہے یا یوزق فکم علیحدہ ہی مستقل کلام ہے اور ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب اس کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے تو تم کس وجہ سے منہ موڑ کر شرک کی گہری وادی بھی سرکش گھوڑوے کی طرح سر پٹ دوز سے جا رہے ہو جبکہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ صرف وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی تخلیق کرنے والا ہے اور نہ سامان رزق مہیا فرمانے والا ہے۔

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ سُرْسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۱۰﴾

”اور (اے صبیح!) اگر یہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو کوئی نئی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے اور (آخرا کر) اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جاتے ہیں۔“

۱۰۔ اگر انہوں نے تیری دعوت تو حید اور نظریہ قیامت اور ثواب و عقاب کو جھٹلایا تو ان میں کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے انبیاء کرام کے ساتھ بھی یہ سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس لئے آپ ان کی لُخْراش باتوں پر صبر کیجئے اور رنجیدہ خاطر نہ رہا کریں۔ وَإِنْ يُكْذِّبُوكَ کی جڑ او کھذف کر کے اس کے قائم مقام **قَدْ كَذَّبَتْ سُرْسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ** کو رکھا گیا ہے۔ یعنی مسبب کی جگہ سبب کو رکھا گیا ہے۔ سُرْسُلٌ پرتوین تعظیم کے لئے ہے جو تامل اور صبر پر برا بھجنے کرنے پر دلالت کرنے کا تھا فاش کرتی ہے۔ یعنی اے صبیح کرم! ان کے انکار پر دگھی نہ ہو کہیں کیونکہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام اپنی اپنی قوموں کے پاس تشریف لائے جن کے پاس اپنی صداقت کے کئی معجزات اور نشانیاں تھیں اور وہ اپنی طویل عمروں میں پوری دلسوزی کے ساتھ لوگوں کی شاہراہ حق کی طرف راہنمائی کرتے رہے۔ وہ بھی بڑے مضبوط ارادہ اور بلند عزائم کے مالک تھے لیکن ازلی بد بختوں نے ان کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیا اور گمراہی کے گھپ اندھیروں میں پھینکتے رہے۔

۱۱۔ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ وہ تمہیں تمہارے صبر پر اپنی نصرت کے ساتھ جزا دے گا۔ نیکیوں پر ثواب عطا فرمائے گا۔ اور انبیاء کی تکذیب پر دنیا و آخرت میں عذاب دے گا۔ حمزہ کسائی خلف اور یاقوتب نے توجع کو تاء کے فتح اور جم کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ضم اور جم کے فتح کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّكُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۗ وَلَا يَعْزَّتْكُمْ
بِاللَّهِ الْعُزْوَمُ ۝

”اے لوگو! یاد رکھو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے پس دھوکہ میں نہ ڈالو۔ تمہیں دنیوی زندگی اور نہ فریب میں جتنا کر دے
تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریب لے۔“

۱۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جو توقع قیامت کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ یقیناً پورا ہوگا، اس میں خلف کا قطعاً احتمال نہیں ہے۔ پس تمہیں
دنیا کی رنگینیاں اور لذتیں اس طرح مشغول نہ کرو، یہ کہ تمہیں آخرت کا تصور ہی بھول جائے اور آخرت کو سنوارنے کی کوشش سے
غافل ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ کہیں شیطان مردود تمہیں آخرت کا مذاق بھلا نہ دے یا تمہیں بخشش اور مغفرت کی امیدیں دلا کر مصیبت پر
اصرار کی روش پر نہ چلا دے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے اور ممکن بھی ہے کہ اس رب کریم کی رحمت بڑے بڑے مجرموں کو معاف کر دیتی ہے لیکن
بخشش کے احتمال اور مغفرت کی امید پر بھی گناہ کا ارتکاب اس چیز کے مشابہ ہو جاتا ہے جو تریاق کے احتمال پر نہ ہر کو کھاتا ہے۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۗ إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السُّعُورِ ۝
”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو۔ وہ فقط اس لئے (سرسختی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو
تاکہ وہ تمہیں بن جائیں۔“

۱۔ شیطان تمہارا ازلی اور قدیمی دشمن ہے کیونکہ اس نے دربار الہی سے نکلنے کے وقت قسم اٹھا کر کہا تھا قَبِعِدْوِيَّتَكَ لَأَكْفُرَنَّ بِكُمْ ۖ أَتَسْتَبِينَ
(تیری عزت کی قسم میں ان تمام گروہ راست سے بھٹکاؤں گا) جب وہ تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو اس کی عداوت اور
دشمنی پر یقین رکھو کس وقت بھی اس کی وسوسہ اندازی سے غافل نہ رہو ہر حال میں چونکہ ہر دو اور اس ظالم کی اتباع و اطاعت نہ کرو اس کو
ذلیل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر وہ کام کرے جو محبوب کو پسند ہو اور اس سے خوش ہو۔
اور دشمنی کا متفقہ یہ ہے کہ انسان وہ کام کرے جو دشمن کو ناپسند ہو اور اس کو غصہ دلاتا ہو۔ یہ حملہ عاقبت نبی کی علت کر رہا ہے۔
۲۔ وہ بد بخت اپنے گروہ کو گناہوں خواہشات نفس اور دنیا کی طرف میلان و اشتغال کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ دوزخی بن جائیں۔
لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السُّعُورِ کے متعلق ہے اور یہ اس کی عداوت کا ثبوت اور اس کے مقصود کا بیان ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

”جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے
مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔“

۱۔ آیت میں شیطان سے موافقت اور مخالفت رکھنے والوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور شیطان کی
پیروی کی ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا، نیک عمل کئے اور شیطان کی مخالفت کی ان کے لئے
مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

اَقَمْنَ ذُرِّيَّتَ لَهٗ سُوْءًا عَلِيْمَةً فَرَا دَ حَسَنًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُعِيْلُ مَنْ يَّشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ ۗ فَلَا تَدْحَبْ نَفْسَكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْعَوْنَ ۝

”پس کیا وہ شخص جس کے لئے مزين کر دیا گیا ہے اس کا برائى اور وہ اس کو خوبصورت نظر آتا ہے (اس کے لئے آپ آرزو کیوں ہوں)۔ لیکن اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے پس نہ گھٹے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے لیکن اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ جو (کرتوت) کو دیکھ کر تے ہیں۔“

۱۔ راہ حسنہ کا عطف ذین پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل فرمانا چاہتا ہے تو اس کی خواہش نفس اس کی عقل پر غالب آجاتی ہے اور شیطان اس کے دل میں وسوسہ انداز کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھتا ہے اور باطل کا قبیح چہرہ اسے حق کا رخ زیا نظر آتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ جس کی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور شیطان اپنے تمام فریب اور فسوس استعمال کرنے کے باوجود اسے پچھا نہیں سکتا ہے حتیٰ کہ وہ حق و باطل میں تیز کرتا ہے، اچھے اعمال کو مستحسن اور برے اعمال کو قبیح جانتا ہے چونکہ قَوْلُ اللّٰهِ يُفِيضُ كَا اِشْرَا دِ جَوَابِ شَرْطِ اِذْ دَالَّتْ كُرْهًا جَابِ اس لئے جواب شرط کو حذف کیا گیا ہے۔ اَقَمْنَ ذُرِّيَّتَ جَابِ مَزْرُو اِنكَارِ كے لئے ہے اور فَا مَعْذُوفِ کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے اطعم ان تهندي كل رجل فيكون المخذول من الله والمهدى سواء لا تطعم ذلك فان الله يضل من يشاء ويهدي من يشاء۔ یعنی کیا آپ برہمن کو ہدایت دینے کی خواہش رکھتے ہیں پھر تو اللہ کی طرف سے ہدایت سے محروم شخص اور ہدایت یافتہ برابر ہوں گے آپ ایسی خواہش نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

۲۔ آپ ان کی گمراہی اور نوابت پر انہوں اور حسرت کرتے ہوئے اپنے نفس کو نہ گھلائیں (یا اس درد مندی اور ہمدردی کے مظاہرہ کے مستحق ہی نہیں ہیں) حسرات علیت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسرة کا معنی اہم چیز پر انتہائی غم اور حزن کا اظہار کرنا جو مضبوط ہوگئی ہو اور حسرة کی جمع حسرات ہے۔ حسرات یعنی جمع کا لفظ ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ محبوب کریم ﷺ ان کے حالات پر بہت زیادہ غم کھاتے تھے۔ یا ان کے ان برے اعمال پر افسردہ خاطر ہوتے تھے جو انہوں نے کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ علیہم، حسرات کے متعلق نہیں ہے کیونکہ مصدر کا صلہ مصدر سے مقدم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تذبذب کا صلہ ہے یا تحمیر علیہ (جس پر حسرت کا اظہار کیا جائے) کا بیان ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے انعمت بکفر ہم فمن ذین له سوء عملہ فاضلہ اللہ تذبذب نفسک علیہم حسرة۔ یعنی آپ ان کے کفر سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں اور ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں۔ فلا تذبذب معذوف جواب پر دلالت کر رہا ہے اور قَوْلُ اللّٰهِ يُفِيضُ مَنْ يَّشَاءُ وَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ تَعْلِيلِ كے طور پر جملہ معترضہ ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے۔ اقمن ذین له سوء عملہ فراه حسناً فلا تذبذب نفسک علیہم حسرات فان اللہ یضل من یشاء ویهدی من یشاء۔ یعنی جس کے لئے اس کا برائى مزين کر دیا گیا ہے اور وہ اس کو خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ پس آپ ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (۱)۔ علامہ ابنوبی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ آیت کریمہ ابوہنبل اور شریکین مکہ کے ہاں نازل ہوئی

ہے (۱)۔ جو میرے من الضحاک عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی اللّٰهُمَّ اَعِدْ دِيْنَكَ بِعَمْرٍو بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِابْنِ جَهْلٍ بْنِ هَشَامٍ (اے اللہ عمر بن خطاب یا ابو جہل کے ذریعے اپنے دین کو تقویٰ عطا فرما۔ پس آپ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کو ہدایت عطا فرمائی اور ابو جہل کو گمراہ کر دیا تو یہ آیت کریمہ ان دونوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ بدعتی اور خواہش نفس کے پیچاریوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ ان خوارج کے متعلق نازل ہوئی ہے جو مسلمانوں کا خون بہانا حلال سمجھتے تھے اور ان کے مال لینا بھی جائز سمجھتے تھے۔ لیکن گناہ کبیرہ کے مرتکب ان میں سے نہیں ہیں کیونکہ وہ گناہ کبیرہ حلال نہیں سمجھتے (۲) بلکہ باطل کو باطل تسلیم کرتے ہیں اگرچہ اس کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے پس وہ اس پر انہیں جزاء و سزا دے گا۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَةَ فَتَشْرِئُ سَحَابًا قَسْفَةً اِذْ يَبْكُوْا مَيِّتًا فَاَحْيٰىنَا بِهٖ
الْاَمْرَ ضَّ بَعْدَ مَوْتِنَا ۗ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ①

”اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف پھر ہم زندہ کر دیتے ہیں اس بادل (کے سینے) سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ یونہی (انہیں) قبروں سے اٹھایا جائے گا۔“

لَا وَاللّٰهُ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَةَ كَاَعْفَانٍ وَعَدَّ اللّٰهُ حَقًّا بِرَبِّهٖ۔ ابن کثیر حمزہ اور کسائی نے جنس کے ارادہ سے الویج (مفرد) پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الریاح (جمع) پڑھا ہے۔ پہلے اور اسل ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا آگے فَتَشْرِئُ مضارع کا صیغہ ہے۔ اس اختلاف افعال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت پر اس صورت بدیہ کو ذہن میں حاضر کیا جائے کیونکہ مقصود ہوا کو اس خصوصیت کے ساتھ پیدا کرنے کو بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے فعل کی نسبت ہوا کی طرف فرمادی کہ وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ اختلاف افعال کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ استمرار امر پر دلالت مقصود ہو۔ فسقناہ میں غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے کیونکہ لکھ کے صیغہ میں کرشمہ سازی میں جوشان کمال ہے اس کا زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ ہیبت کو مانع حمزہ کسائی اور مخض نے یاہ کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاحیینا بہ۔ یعنی ہم بارش کے قطرات سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ بادل کا ذکر بارش کے ذکر کی طرح ہے یا بادل چونکہ زمین کے اعیاء کے سبب کا سبب ہے اس لئے اس کو ذکر فرمایا۔ یعنی وہ زمین جو خشک سالی کے باعث اجاز اور زری غبار بنی پڑی تھی اس کی سرسبزی نام کی بھی باقی تھی ہمارے ان حیات بخش قطرات کے برسانے سے سرسبز و شاداب ہوگئی زمین کے پودوں اور سبزی کی موت و حیات کی نسبت زمین کی طرف مجازی ہے۔

یعنی جس طرح ہماری قدرت کی کاریگری سے خشک اور اجاز زمین میں آثار حیات نمودار ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح تھوڑے تھپسے زندہ کرنا ہماری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں کام ہماری قدرت کے تحت داخل ہیں۔ صرف تمقیس اور تمقیس علیہ کے مادہ میں اختلاف ہے، لیکن اختلاف مادہ کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ زندہ کرنے کی کیفیت کے تشبیل سے کیونکہ عبد اللہ بن عمر سے امام مسلم نے دوبارہ اٹھنے کی کیفیت اس طرح روایت کی ہے کہ ”پھر اللہ تعالیٰ بارش کے قطرات برسائے گا وہ شہنم

کے قطرات کی طرح ہوں گے پس اس کی وجہ سے لوگوں کے اجسام اگ جائیں گے۔ ابوالبخیر نے اعظمیہ میں حضرت دھب سے روایت کیا ہے کہ بخر مجبور (آگ کا سمندر) اس کی ابتداء اللہ کے علم سے ہوگی اور اس کا آخر اللہ کے ارادہ سے ہوگا اس میں مردہ کے مادہ منویہ کے مشابہ گڑھا پانی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سمندر سے مخلوق پر چالیس روز راہد اور ارادہ (زلزلے) کے درمیان بارش برسائے گا۔ جنت کے پودے سیلابی زمین کے سبزہ کی طرح اگیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی جنٹوں سے مؤمنین کی روجوں کو اور دوزخ سے کافروں کی روجوں کو جمع فرمائے گا تاکہ ان کے جسموں میں ڈالے پھر وہ اسراقل کو صورت پھونکنے کا حکم فرمائے گا۔ (پس اس کے صورت پھونکنے سے) ہر روح اپنے جسم میں داخل ہو جائے گی (اللہ بیٹ) بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دونوں صورتوں کے درمیان چالیس (کا فاصلہ) ہے۔ حاضرین مجلس نے پوچھا چالیس دن مراد ہیں فرمایا میں یہ نہیں کہتا پھر انہوں نے پوچھا چالیس مہینے مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا پھر انہوں نے پوچھا چالیس سال مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اگ پڑیں گے جیسے سبزیاں اگتی ہیں اور انسان کا سوائے ریزہ کی ہڈی کے سب کچھ بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ قیامت کے روز اسی سے انسان کی تخلیق کو مکمل کیا جائے گا (1)۔ ابن المبارک نے سلیمان سے روایت کیا ہے کہ دو بارہ اٹھائے جانے سے چالیس دن پہلے گارے پانی کی بارش نازل ہوگی۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عرش کے نیچے سے دونوں صورتوں کے درمیان پانی کی ایک واوی ہے گی اور ان دونوں صورتوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے اس پانی سے انسان پرندہ اور ہر چوپائے کا جسم پیدا ہو جائے گا اگر اس سے پہلے ان کا کوئی شناسا ان کے جسموں کے اوپر سے گزرے گا تو وہ ان کو سٹخ زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر فریاد کیاں لے گا پس وہ سب جسم پیدا ہو جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی روجوں کو آزاد فرمائے گا تو وہ اپنے اپنے جسم کے اندر داخل ہو جائیں گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۗ اِلَيْهِ يُعْضَدُ اَنْكُمُ الظَّيْبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ
يَرْفَعُهُ ۗ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَصَكْرٌ اُولَئِكَ هُوَ يَوْمُئِذٍ ﴿٥٠﴾

”جو عزت کا طلبکار ہو (دو جان لے) کہ ہر جسم کی عزت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے۔ اور جو لوگ فریب کاریاں کرتے ہیں برے کاموں کیلئے ان کیلئے شدید عذاب ہے۔ اور انکا کمر (دفریب) تباہ ہو کر رہے گا۔“

یعنی جو دنیا اور آخرت میں عزت کا خواستگار ہے تو اسے جانتا چاہئے کہ عزت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ فرما نے اس ارشاد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے جو یہ جانتا چاہتا ہے کہ عزت کس لئے ہے تو اسے جان لینا چاہئے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے (2) آیت کا ظاہر اس مفہوم کا منتہی ہے کہ جو عزت کا متلاشی ہے تو اسے عزت کا تاج زر نکالنا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے طلب کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی پیروی کے ذریعے عزت حاصل کرے۔ کیونکہ ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر جسم کی عزت اللہ کے لئے ہے جسے جانتا ہے عزت عطا فرماتا ہے۔ اس آیت میں کفار کے اوہام باطلہ کا رد ہے کہ وہ بتوں کی عبادت کر کے عزت کے متلاشی تھے۔ ارشاد فرمایا وَذُنُوبُهُمْ عَلَيْهِمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ (ترجمہ) اور انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور خدا

کہ وہ ان کے لئے مددگار نہیں۔ اور یہ منافقین کے زعم فاسد کا بھی رد ہے جو کفار سے عزت کے طالب تھے۔ ان کی اسی کیفیت کو اسی ارشاد میں بیان فرمایا **يَتَّبِعُونَ عَشْرَةَ الْعِبْرَةَ فَإِنَّ الْعِبْرَةَ لَبُذٌّ جَبِيحٌ** پھر فرمایا جس عمل اور عقیدہ سے عزت ملتی ہے وہ عقیدہ تو حیر اور عمل صالح ہے۔

عَنِ الْكَلِمَةِ الْفَاطِيحَةِ سے مراد سبحان الله والحمد لله واللہ اکبر ولا اله الا الله وتبارک الله وغیرہا کے کلمات ہیں۔ صعود کلام (کلام کے بلند ہونے) سے مراد مجازاً اس کی مقبولیت ہے۔ قنادر سے بھی یہی مفہوم مروی ہے۔ یا صعود کلام سے مراد ان فرشتوں کا چڑھنا ہے جو کلمات خیر کو عرش الہی کی طرف لے کر چڑھتے ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ جو شخص ان پانچ کلمات کا ورد کرتا ہے سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله واللہ اکبر وتبارک الله۔ تو ایک فرشتہ ان کلمات کو اپنے پروں کے نیچے رکھ لیتا ہے۔ اور پھر اوپر بلند ہوتا ہے۔ فرشتوں کے جس مجمع سے گزرتا ہے تو وہ فرشتے ان کلمات کے کہنے والے کے لئے استغفار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد عبد اللہ بن مسعود نے قرآن کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا **لَبُذٌّ يَصْعَدُ إِلَيْهِمُ الْفَاطِيحَةُ** (۱) اس حدیث کو بغوی اور حاکم وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ نقلی اور ابن مردود نے ابو ہریرہ سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے۔

اسے بھی کہتے ہیں **مرفوع** یعنی ضمیر مستکن کا مرفوع الکلم ہے اور ضمیر مفعول کا مرفوع العمل الصالح ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا جب تک عقیدہ تو حید کی موجودگی میں صادر نہ ہو۔ سنیان بن عبیدہ کہتے ہیں کہ مستکن ضمیر کا مرفوع اللہ ہے۔ یعنی صرف وہ عمل مقبول ہوتا ہے جس میں ریا کاری نہ ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ اسے عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے کیونکہ خالص اعمال اور اقوال کی قبولیت کا سبب ہے۔ کلام کا ظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ ضمیر مستکن کا مرفوع عمل صالح ہے۔ کیونکہ یہی قریب ترین ہے۔ اور ضمیر منصوب کا مرفوع الکلم ہے۔ الکلم مفرد ہے جمع نہیں ہے اور اس سے مراد جنس ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفت لطیب ذکر فرمائی ہے یا یہ کہا جائے گا کہ تقدیر کلام اس طرح ہے **الہیہ بصعد بعض الکلمۃ الفاطیحة والعمل الصالح** اور یہ وہ اقوال ہوں گے جو خالص پر مبنی ہوں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، نکرہ اور اکثر مفسرین نے ضمیر کو اس آخری قول کے مطابق لونا یا ہے۔ حسن اور قنادر فرماتے ہیں الکلم الطیب سے مراد ذکر الہی ہے اور عمل صالح سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے پس جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے لیکن فرائض ادا نہیں کرتا ہے تو اس کے کلام کو اس کے عمل کی طرف لونا یا جاتا ہے۔ ایمان صرف تمنا اور آرزو کا نام نہیں، اسی طرح عمل کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پانے پر ہوا اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہوں جو شخص باتیں جو اچھی کرتا ہے لیکن اعمال اچھے نہیں کرتا (یعنی اس کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے) تو اس کی اچھی باتوں کو بھی رد کر دیا جاتا ہے اور جو شخص باتیں بھی اچھی کرتا نیک اعمال بھی کرتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ اس کی اچھی باتوں کو بلندی اور سر فرازی عطا کرنے کا موجب بنتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يَصْعَدُ إِلَيْهِمُ الْفَاطِيحَةُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ**۔ حدیث شریف میں ہے اللہ تعالیٰ کسی قول کو عمل کے بغیر قبول نہیں فرماتا اور کسی قول اور عمل کو بغیر نیت کے قبول نہیں فرماتا (۲)۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ ایمان بغیر عمل کے قبول نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے یہ گواہی دی لا اله الا الله وحده لا شریک له وان محمداً عبده ورسوله وان عیسیٰ عند الله ورسوله وان اہتہ

وَكَلِمَتُهُ الْقَاهَا إِلَىٰ مُؤَيِّمٍ وَرُوحٌ مِنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں یعنی علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کی بندگی کے بیٹے ہیں اللہ کے اس حکم کا اثر جو مہریم کی طرف اس نے لایا تھا اور اللہ کی طرف سے روح تھی۔ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے (تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا خواہ اس کا عمل کچھ بھی ہو) (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے۔ بلکہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ پاکیزہ کلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف پارائی حاصل کرتا ہے پھر اگر اس کے ساتھ عمل صالح بھی ہو تو وہ عمل صالح اس کی شان کو اور چارچاند لگا دیتا ہے اور اس کے ثواب میں کمی گناز یادتی کا باعث بنتا ہے۔ اور حضور ﷺ کے ارشاد لا یقبل اللہ قولاً الا بعمل (اللہ تعالیٰ بغیر عمل کے کوئی قول قبول نہیں فرماتا) کا مطلب یہ ہے کہ منافق کا قول جو دل اور جوارح کے عمل سے خالی ہوتا ہے اس کا سچا اعتبار نہیں ہوتا اسی طرح "وہ قول جو عمل سے متصل ہو بغیر نیت کے قبول نہیں ہوتا۔ اس ارشاد کا معنی یہ ہے کہ جو قول و عمل دل کے اخلاص سے محروم ہوتا ہے وہ قابل ذکر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ عمل صالح کا عمل کے درجہ کو بلند کرتا ہے۔

۱۔ وَالَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ شِقَاقَاتِ الْمَنَاسِكِ صِدْقٌ مَعْرُوفٌ كِي صِفَتِ بِهٖ، بِمَكْرُونٍ كَمَا مَقْبُولٍ بِهٖ نَعْمٍ بِهٖ كَيْونَكَ بِهٖ فَعَلٌ لَّازِمٌ بِهٖ۔ یعنی بِمَكْرُونِ الْمَكْرَاتِ السِّنَاتِ۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں مکررات سے مراد اور اللہ وہ میں قریش کا نبی کریم ﷺ کے خلاف سازشی منصوبے بنانا ہے جیسا کہ سورہ انفال میں لڑ چکا ہے ﴿وَالَّذِينَ يَكْفُرُوا بِاللَّهِ يُكْفِّرُونَ عَنْ يَدَيْهِمْ جُزْءًا﴾ (ترجمہ) اور یاد کرو جب خلیفہ تمہاری کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلا وطن کر دیں (2)۔ کبھی کہتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے الذین يعملون السنات (جو برائیاں کرتے ہیں) مجاہد اور شہر بن حوشب کہتے ہیں اس سے مراد یار لوگ ہیں (3)۔

یہ بیور کا معنی بطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿يَسْتَكْبِرُونَ وَيَسْتَكْبِرُ اللَّهُ﴾ وَاللَّهُ خَلِيفَةُ الْمَكْرُونِ ﴿﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی فریب کاریوں اور سازشوں کو باطل فرمائے گا۔ یا آیت کریمہ کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ رباہ کاروں کے اعمال کو رائیگاں کر دے گا۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۗ وَهَاتِحِبِلٍ مِنْ
أُنْثَىٰ وَلَا تَنْصَرُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۗ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقِصُ مِنْ عُمُرٍ إِلَّا فِي
كِتَابٍ ۗ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۱﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تمہیں مٹی سے پھر پانی کی بوند سے پھر تمہیں بنا دیا جوڑے جوڑے اور انہیں حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ بنتی ہے مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی زندگی دی جاتی ہے کسی طویل العمر کو اور نہ کم رکھی جاتی ہے کسی کی عمر (مگر اس کی تفصیل) کتاب میں درج ہے بیشک یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔"

۱۔ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ كَمَا عَطَفَ وَاللَّهُ اَوْسَلُ بِهٖ۔ یہ ارشاد دو بار اٹھائے جانے پر قدرت کی دلیل ہے کیونکہ مشکل کو تو وہ اخلق سے اعادہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ انسان کی بعید اصل مٹی ہے کیونکہ آدم کی تخلیق مٹی سے فرمائی تھی۔ اور قریب کی اصل لطف ہے۔ یعنی تمہاری تخلیق

کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحات تک تمہارے حالات و واقعات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور عمر کی زیادتی اور کمی کو محفوظ رکھنا کرنا کامتین کے محفوظوں میں درج ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر کسی کی عمر کو محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کہ اس نے اتنے سال زندہ رہنا ہے پھر اس کے نیچے لکھا جاتا ہے ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، تین دن گزر گئے حتیٰ کہ اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے (1) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی عمر میں اضافہ یا کمی نہیں ہوتی مگر وہ لوگ محفوظ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنے سال ہے پھر بعض نیکوں کی وجہ سے اس کی عمر میں اضافہ کیا جائے گا یا بعض گناہوں کی وجہ سے کسی کی جائے گی۔ یہ سب چیزیں لوگ محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد "لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یرید فی العمر الا البر۔" (قضا کو کوئی چیز دوڑ نہیں کرتی مگر دعا اور عمر میں اضافہ نہیں کرتی مگر نیکی) اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس حدیث کو سلمان فارسی سے امام ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ لمبی عمر والے کی عمر میں طوالت اور کم عمر والے کی عمر میں کمی اس طرح نہیں ہوتی کہ ناقص عمر والے کی عمر کا کچھ حصہ لمبی عمر والے کو عطا کیا جائے اور ناقص عمر والے کی عمر میں کمی کر کے کم کیا جائے۔ من عمرہ میں ہنیر کا مرجع منقوص عمرہ ہے۔ اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے مقابلے ذکر کی وجہ سے اس پر دلالت موجود ہے۔ اس نے ہنیر کو لوٹانا جائز ہے اور لہ کی ہنیر کا مرجع معمر کو لوٹانا بھی جائز ہے۔ اور مطلب یہ ہو کہ جس کو لمبی عمر عطا کی گئی اور اس میں سامع کے فہم پر اعتماد کیا گیا ہے کیونکہ اس بات میں کوئی التباس نہیں ہے کہ معمر ثانی سے مراد دوسرا معمر ہے جیسا کہ اس مثال میں ہے کہ لا یُنْبئُ اللہُ عِبَادًا وَلَا یُعَاقِبُهُ إِلَّا بِحَقِّهِ (اس مثال میں اللہ تعالیٰ کے جس بندے کو ثواب دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے اور جس کو سزا دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے) ان ذالک علی اللہ سیر میں ذالک کا مشارعہ عمروں اور اعمال کا لکھنا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۗ هَذَا عَذَابٌ فَرَاتٍ مَّا يَأْتِيَنَّ سَرَابَهُ وَهَذَا مِلْءُ أَعْيُنٍ وَمِنْ كُلِّ تَاكُومٍ لِحَمَاطٍ رِيًّا ۚ وَتَسْتَجِرُّونَ حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا وَتَسْرِ الْفُلُكُ فِيهَا مَوَاجِدًا تَمْبَعُونَ مِنْ قُضُلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٣١﴾

”اور یکساں نہیں ہو سکتے پانی کے دو ذخیرے یہ (ایک) بیٹھا ہے بہت شیریں اس کا پینا بڑا خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) سخت نمکین، کھاری تلخ، اور دونوں میں سے تم کھاتے ہوڑ و تازہ گوشت ہے اور نکالتے ہوڑ زیت کا سامان جسے تم پینتے ہو ہے اور تو دیکھتے ہے کشتیوں کو پانی میں کہ اسے چیرتی شور مچاتی چلی جا رہی ہیں تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل کو ہے اور یہ سب نوازشات اس لئے) تاکہ تم شکر ادا کرو۔“

۱۔ فورات کا معنی انتہائی میٹھا اور شیریں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو بیاس کو بھجوادے۔ مسافغ جس کا پینا خوشگوار ہو، خود ہی گلے سے نیچے اترتا چلا جائے۔ هَذَا عَذَابٌ فَرَاتٍ اپنے معطوفات سے مل کر البحرین کی صفت ہے جیسے امر علی اللہم یسبنی میں جملہ اللہیم کی صفت ہے۔ اجاج از حد کھاری بعض فرماتے ہیں جو اپنے کھارے پن کی وجہ سے جلا ڈالے۔ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے اور اللہ تعالیٰ کے مال قدرت کا بیان ہو رہا ہے کہ ایک جنس سے دو چیزیں پیدا فرمائیں جن کے خواص آپس میں مختلف ہیں۔

۲۔ یہ جملہ سمندر کی صفت اور اس کے اندر جو جہتیں ہیں ان کو ضدنا ذکر کیا گیا ہے۔ (کیونکہ قشیل میں اس جملہ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ اور

دونوں سمندروں کے برابر نہ ہونے کے بیان میں بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ ہذا عذبت فرات اور ہذا ملح اجاج کا تہ ہے۔ جب ثابت ہو گیا کہ آیت جس مقصود کے لئے ذکر کی گئی اس میں اس جملہ کا کوئی دخل نہیں ہے تو واضح ہو گیا کہ یہ جملہ اسطر ادا ذکر کیا گیا ہے۔ اسطر ادا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام اس انداز میں ذکر کی جائے کہ اس سے ایک دوسری کلام لازم آئے اور مراد بھی دوسری کلام لی جائے (یا یہ بطور اسطر اداؤں بلکہ تھیل کی تشکیل کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ یہ دونوں سمندر جس طرح بعض فوائد میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان میں مقصود بالذات ہے، یعنی پانی یا اس میں مساوی نہیں ہیں اسی طرح مومن اور کافر بھی بعض خواص انسانی میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان کی تخلیق میں مقصود بالذات ہے، یعنی معرفت الہی اور عبادت الہی اس میں برابر نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ مَا خَلَقْتُ الْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْبُدَنِ ۝ (ترجمہ) اور انہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں یا یہ جملہ اس لئے ذکر فرمایا کہ کافر پر کھاری پانی کو بھی فضیلت حاصل ہے کیونکہ کھاری پانی تو منافع میں بیٹھے پانی کے ساتھ شریک ہے لیکن کافر میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس تم کھاری پانی سے موتی اور مرجان نکالنے ہو جنہیں تم پینتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں موتیوں کے نکالنے کی نسبت دونوں قسم کے سمندروں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ موتی اور جواہر صرف کھاری سمندر میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھاری سمندر میں بیٹھے چٹھے بھی ہوتے ہیں جو نیک پانی کے ساتھ مل جاتے ہیں اور بعض اوقات بیٹھے چٹھوں کا پانی کھاری پانی پر غالب آ جاتا ہے۔ پس اتفاق سے وہاں سے کوئی موتی مل جاتا ہے تو وہ موتی حقیقت میں کھاری پانی کی جگہ سے ہوتا ہے۔

بے کسی الفلک کا عطف من کل فاکلون پر ہے۔ فیہ کی تفسیر کا مرجع ہر سمندر ہے۔ مواخو جمع ہے ماخرۃ کی اور یہ البحر سے مشتق ہے جس کا معنی چیرنا ہے۔ لِيَسْتَعْمُوا مِنْ فَضْلِهِ میں فضل سے مراد تجارت ہے۔ لِيَسْتَعْمُوا کا لام مواخر کے متعلق ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لام اس فعل کے متعلق ہو جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس طرح بنا دیا ہے تاکہ تم تجارت کرو۔

یہ سب انعامات تم پر اس لئے فرمائے تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ لعلکم کا عطف لِيَسْتَعْمُوا پر ہے کیونکہ حرف ترمیمی (عل) استعارۃ لام کے معنی میں ہے اور حرف ترمیمی کا ذکر کرنا اس کے ظاہر حال کے تقاضا کے مطابق ہے۔

يُؤَلِّجُ الْبَيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي الْبَيْلِ ۚ وَسَخَّرَ الشَّسَّ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجْلِ مُسَمًّى ۚ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۗ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَسْمَعُونَ مِنْ قَوْلِهِ ۗ

”وہ داخل کرتا ہے (کبھی) رات (کے ایک حصہ) کودن میں اور (کبھی) داخل کرتا ہے دن (کے ایک حصہ) کودن میں اور اس نے پابند حکم کر دیا سورج اور چاند کو ہر ایک رداں ہے مقرر میعاد تک ۱۔ یہ ہے اللہ جو تمہارا رب ہے اسی کی ساری بادشاہی ہے ۲۔ اور وہ (بت) جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا وہ تو غلطی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہے ۳۔“

۱۔ گرمیوں میں رات کودن میں اور سردیوں میں دن کودن میں داخل کرتا ہے اس طرح کہ گرمیوں میں دن بڑا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ہے جبکہ سردیوں میں اس کا برعکس ہوتا ہے۔ اس آیت کا تعلق واللہ خلقکم من تراب کے ساتھ ہے اور درمیان میں ما

بھی اس کی نوازشات و عنایات عام ہیں۔ مخلوق کے ہر فرد کو شامل ہیں۔ وہ اس بات کا بذات خود مستحق ہے کہ مخلوق اس کی حمد و نعت میں ہر وقت مرطب اللسان رہے۔

انعم مبتدا ہے اور الفقراء خبر ہے خبر کو معرفہ ذکر فرمانے کا مقصود کمال فقر کو انسان کے ساتھ خاص کرنا ہے یعنی کائنات کی ہر چیز اپنی بقا و اور نشوونما میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن انسان کا امتیاز باقی چیزوں سے زیادہ ہے کیونکہ انسان مکلف ہے اسے امور تکلیفہ کی سرانجام دہی کے لئے اصلاح احوال کی زیادہ احتیاج ہے۔ اس نے ضعیف غلام اور بھول ہونے کے باوجود امانت خاص (وقی الہی) کو اٹھالیا تھا۔ پس اپنی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برابھونے کے لئے اسے نظر رحمت کی ہر لمحہ زیادہ ضرورت ہے۔

إِنِّي أَنبَأُكُمْ بِحَقِّكُمْ وَيَأْتِ بِحَقِّ جَدِيدٍ ۖ وَمَا ذَلِكُ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ۝

”اگر اس کی مرضی ہو تو سب کو نیا پیدا کر دے اور لے آئے ایک نئی مخلوق اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعاً دشوار نہیں ہے۔“

لے یہ اللہ تعالیٰ کے تم سے بے نیاز ہونے کی دلیل ہے اگر وہ چاہے تو چشم زدن میں تمہیں نیست و نابود کر دے اور ایسی قوم لے آئے جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو یا یہ کہ وہ ایسا عالم اور جہاں پیدا فرمادے جس سے تم ناواقف ہو۔ اس کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جِلْهَا لَا يَقْضِيَنَّ سَهْيًا ۗ وَكُلٌّ مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَىٰ طَمَعٍ مَّعْبُودٍ ۗ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جِلْهَا لَا يَقْضِيَنَّ سَهْيًا ۗ وَكُلٌّ مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَىٰ طَمَعٍ مَّعْبُودٍ ۗ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ جِلْهَا لَا يَقْضِيَنَّ سَهْيًا ۗ وَكُلٌّ مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَىٰ طَمَعٍ مَّعْبُودٍ ۗ

”اور بوجھ نہیں اٹھائے گا کوئی گنہگار کسی دوسرے کا بوجھ لے اور اگر بلائے گا پشت پر بوجھ اٹھانے والا (کسی کو) اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے تو نہ اٹھائی جاسکے گی اس کے بوجھ سے کوئی شے اگرچہ کوئی قریبی رشتہ دار ہی ہو۔ آپ صرف ان کو ذرا سکتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور صحیح ادا کرتے ہیں نماز میں اور جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے سو وہ اپنی بھلائی کے لئے ہی اختیار کرتا ہے اور (یاد رکھو آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے۔“

لے وازرہ ثقلتہ صفت ہے اور اس کا موصوف نفس معذوف ہے۔ اسی طرح اخروی بھی صفت ہے اور اس کا موصوف نفس معذوف ہے وازر کا معنی بوجھ ہے یعنی کوئی گنہگار نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ لیکن سورہ مٹکبوت کی آیت میں ہے وَكُلٌّ مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَكَ إِلَىٰ طَمَعٍ مَّعْبُودٍ ۗ یعنی وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے علاوہ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ تو اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے تو ان کی پشتوں پر دوسروں کو گمراہ کرنے خود گمراہ ہونے کا بوجھ ہوگا۔ گمراہ ہونا جس طرح ان کا فعل تھا اسی طرح دوسروں کا گمراہ کرنا بھی ان کا کروت تھا۔ اس لئے ان پر حقیقت کسی دوسرے کا بوجھ نہ ہوگا۔ اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے، ان کو بخش دیا جائے گا اور ان گناہوں کو یہودیوں اور نصرانیوں پر ڈالا جائے گا (1)۔ ایک دوسرے طریق سے یہی حدیث اسی طرح ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی طرف سے ایک یہودی یا نصرانی کو اٹھائے گا اور فرمائے گا یہ تیری طرف سے آگ میں فدیہ ہے

طبرانی اور حاکم نے اس حدیث کو ابوموسیٰ سے پہلی روایت کی طرح روایت کیا ہے جبکہ ابن ماجہ اور طبرانی نے دوسری روایت کی طرح روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے حضرت انس سے اس طرح روایت کی ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو مسلمانوں کے ہر شخص کی طرف ایک مشرک کو بلائے گا یا جائے گا اور کہا جائے گا یہ تیری طرف سے آگ کے عذاب سے فدا ہے (1)۔ میرے نزدیک ان احادیث کی تاویل یہ ہے کہ ان گناہوں سے مراد جو کفار پر ڈالے جائیں گے وہ ہیں جو انہوں نے امت محمد ﷺ میں داخل ہونے سے پہلے کئے تھے اور غلط کاریوں کا آغاز کیا تھا۔ پھر مخالفین ان برائیوں میں ان کے نقش پر چلے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کرم نوازی سے مؤمنین کے گناہ تو معاف فرمادیئے تھے لیکن ان لوگوں کے گناہ باقی رہے جنہوں نے ان گناہوں کا آغاز کیا تھا۔ اور ان کو وہ گناہ ملے گا کیونکہ ایک تو انہوں نے خود ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور دوسرا انہوں نے اس برائی کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے عمل کرتے رہے۔ حدیث میں وضع کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ کافر نے جس برائی کو ایجاد کیا اس کو خود کرنے کا گناہ بھی اس پر باقی رہے گا اور جن مسلمانوں نے ان کی پیروی میں گناہ کیا ان کا گناہ بھی اس کافر پر لا دیا جائے گا۔

ع اگر گناہوں سے جوصل کسی کسی دوسرے کو اپنا گناہ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس سے کچھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نئی فرمادی کہ کسی دوسرے کا گناہ کسی پر نہیں لا دیا جائے گا۔ اگرچہ جس کو پکارا جائے گا وہ پکارنے والے کا رشتہ دار بھی ہوگا، اس کے باوجود وہ اس کے بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ امام بخاری نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا ماں باپ اپنے بیٹے سے کہیں گے بیٹا ہمارے کچھ گناہ تو اٹھالے (ہم بھی تو دنیا میں تیرے لئے سب کچھ کرتے رہے) بیٹا کہے گا میرا اپنا بوجھ زیادہ ہے، میں تمہارے بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا (2)۔

یہ افشش نے انما تنذر کا معنی یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنے ڈرانے کے ساتھ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں (جو ان اوصاف مذکورہ کے حامل ہیں) بالعبیہ یا تو یخشون کے قائل سے حال ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو عذاب سے غائب ہونے کی حالت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں یا لوگوں سے چھپ کر غلوت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یا بالعبیہ مفولہ مذکورہ العذاب سے حال ہے۔ پہلے یخشون مضارع اور پھر اقاموا فعل ماضی ذکر فرمایا۔ اختلاف افعال استمرار پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یعنی آپ کے انداز سے فقط وہی نفع حاصل کرتے ہیں جو ہر زمانہ میں عذاب الہی کے خوف سے کاہتے رہتے ہیں اور نیکیوں پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ جو پاکیزگی اور طہارت کو اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کا اپنا بھلا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے تزکیہ پر بہتر جزاء عطا فرمائے گا۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور مؤمنین کی خشیت کی تاکید کے لئے ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٣﴾

”اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا اور نہ (یکساں ہیں) اندھیرے اور نور اور نہ (یکساں ہے) سایہ اور تیز دھوپ۔“

1۔ اعمی سے مراد کافر اور جاہل ہے البصیر سے مراد مؤمن اور عالم ہے۔ الظلمات سے مراد کفر ہے النور سے مراد ایمان ظل سے مراد جنت اور ثواب ہے۔ اور الحرور سے مراد آگ اور عقاب ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ﴿٤﴾ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ﴿٥﴾ وَمَا أَنتَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝۱۱

”نہ ایک جیسے ہیں زندگی اور مردے ل۔ بیٹک اللہ تعالیٰ سنا ہے بل جس کو چاہتا ہے اور آپ نہیں سنانے والے جو قبروں میں ہیں۔“

ل۔ یہ بھی مومنین اور کافرین کی ایک دوسری مثال ہے جو پہلی مثال سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے فصل کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ علماء اور جہلاء کی مثال ہے۔

ل۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے آیات کی سمجھ اور فصاحت حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

س۔ کفر پر اصرار کرنے والوں کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان سے بالکل مایوس کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ جس طرح قبور والوں کو تم نہیں سنا سکتے اسی طرح آپ ان کفار کو ہدایت کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے (کیونکہ ان کے قوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے)

إِنَّ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۝۱۲

”نہیں ہیں آپ مگر بروقت ڈرانے والے ل۔“

ل۔ اسے پیارے محمد ﷺ آپ انہیں دوزخ کی آگ سے ڈراتے ہیں (اور آپ کے ذمہ ہے بھی صرف یہی فریضہ) آپ ان کو ہدایت کی منزل پر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔

إِنَّا أَمْرًا سَلَّمْنَا بِالْحَقِّ يَبْسُورًا وَنَذِيرًا ۝۱۳ وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝۱۴

”ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔“

ل۔ بِالْحَقِّ یا تو ضمیر مرفوع ہے یا ضمیر منصوب ک سے حال ہے یا محذوف کی صفت ہے، یعنی ارسالا ملتبساً بالحق۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کے متعلق ہو یا نذر کے متعلق ہو لیکن ان کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا، یعنی جس کے یہ متعلق ہوگا دوسرے کے لئے مقدر مانا پڑے گا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے درآں حالیکہ آپ مومنین کو دوسرے حق کی خوشخبری سنانے والے ہیں اور کافروں کو دوسرے حق سنانے والے ہیں اور سابقہ قوموں اور گروہوں میں سے کوئی ایسا گروہ نہیں گزرا مگر اس میں نبی یا اس کا نائب کوئی عالم دین آیا ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو عذاب الہی سے ڈراتا تھا۔ یہاں صرف نذر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ نذارت اور بشارت ہر جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کئی مقامات پر اس سے پہلے بشارت اور نذارت کو متصل ذکر کیا گیا ہے۔ یا صرف نذر کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ ڈرانے بشارت سنانے کی نسبت زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ تکلیف کا دور کرنا چلب لطف سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وَإِنْ يُكْفِرُوا بِكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۝۱۵ جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَ
بِالنُّذُرِ ۝۱۶ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝۱۷

”اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب نہیں) بیشک جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے۔ تحریف لائے تھے

ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں آسانی صحیفے اور نورانی کتاب لے کر لے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو تسلیم اور اطمینان قلبی عطا کرنے کے لئے فرما رہے ہیں اسے پیارے اگر یہ ناجائز اور بدبذراں آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کوئی انہونی بات نہیں۔ ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام کو جھٹلاتے رہے پس آپ ان کی جگر پاش پاش کرنے والی باتوں پر افسردہ خاطر نہ ہوا کریں بلکہ اپنے پیشرو انبیاء کرام کی طرح ان کی اذقیوں پر صبر کریں۔ جہاں تھم، قد کی تقدیر کے ساتھ کذب کے قائل سے حال ہے۔ بیعت سے مراد مجزوات ہیں جو انبیاء کرام نبوت کی صداقت کے شاہد عادل تھے۔ الزہر سے مراد جھٹھے ہیں جیسے صحف ابراہیم۔ اور الکتاب العنبر سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور اس سے تفصیل کا ارادہ کرتے ہوئے الکتاب العنبر فرمایا یعنی بعض ان میں سے نبوت اور زہر لائے اور بعض دوسرے بیعت اور کتاب عنبر لائے۔ (یہ مفہوم اس صورت میں ہوگا جب الزہر اور الکتاب میں فرق تسلیم کیا جائے) یا الزہر اور الکتاب سے ایک ہی چیز مراد ہے اور ان کے درمیان عطف صفات کے تغایر کے اعتبار سے ہے۔

ثُمَّ أَحَدَّتْ آلَ بَنِي كَفْرٍ وَ أَكْفَيْفَ كَانَتْ كَيْدِي ۝۱۱

”پھر (جب ان کی سرکشی کی حد ہو گئی) تو میں نے پکڑ لیا کفار کو جس (ساری دنیا جاتی ہے) میرا عذاب کیا تھا۔“

۱۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کفار پر حد درجہ انکار فرمایا تھا اس لئے تسلی کے مقام پر استہتام کا انداز بہت بہتر ہے۔ نکو سے مراد عقوبت ہے۔ نکو کو دوش نے صرف وصل میں یاہ کے ثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے وصل ووقف دونوں صورتوں میں یاہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَخَرَجْنَا بِهِ شَجَرَاتٍ مُتَخَلِّفًا أَلْوَانُهَا

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۝۱۲

”کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اتارتا ہے آسمان سے پانی جس ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں سے بھی رنگ رنگ نکلتے ہیں۔ کوئی سفید، کوئی سرخ، مختلف رنگوں میں (کوئی سرخ، کوئی زرد) اور بعض حصے سخت سیاہ۔“

۱۔ کلام میں نیت سے تلک کی طرف التفات ہے، یعنی پہلے عاقب کا صیغہ انزل فرمایا پھر فاخو جہاں تکلم کا صیغہ ذکر فرمایا۔ قدرت کی صفت گرمی اور کرشمہ سازی میں غور و خوض کی دعوت دی جارہی ہے کہ دیکھو پانی ایک ہے لیکن ہماری قدرت سے مختلف اجناس یا مختلف اصناف کے پھل پیدا ہوتے ہیں، ہر صنف ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یا ہیئت میں مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی زرد، کوئی سبز اور کوئی سرخ ہوتا ہے۔ اور پہاڑ ہیں ان کا چٹانگ ہے اور ان میں راستے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔ یہ جملہ اسباب، اخو جہاں کے قائل سے حال ہے۔ جس طرح اس مثال میں ہے ایتیک و الشمس طلعة۔

۲۔ کچھ سفید ہیں اور کچھ سرخ ہیں پھر ان کی سفیدی کی شدت اور ضعف میں بڑا فرق ہے۔ غرابیب سود کا عطف بیض پر ہے۔ غرابیب، سود مضر کی تاکید ہے جس کی تفسیر ابا بعد سود کر رہا ہے کیونکہ غرابیب تاکید ہے اور تاکید ہمیشہ مؤکد کے بعد ہوتی ہے۔ اس کی مثال (تایف) ہے۔ اس جملہ میں ہے۔ المؤمن عائدات الطیر۔ اس جملہ میں عائدات الطیر مضر کی صفت ہے جس کی تفسیر

الطیر مذکور کر رہا ہے اس طرح کا اسلوب اس لئے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ تاکید میں زیادتی ہو جائے۔ کیونکہ اس طرح ایک چیز پر اہتمام اور اظہار دونوں طریقوں سے دلالت ہوتی ہے۔ امام بیضاوی نے یہی توجیہ لکھی ہے (۱)۔

الجبال الکنی فرماتے ہیں اکثر مسود غرابیب کہا جاتا ہے اور بہت کم غرابیب مسود کہا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں قلیل طور پر مزید تاکید کے لئے ایسے کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غرابیب کا عطف جدد پر ہو۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں میں سے بھی کچھ رنگ برنگے ہیں اور کچھ سیاہ ہیں جن کا رنگ ایک جیسا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالذِّوَابِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ ۗ إِنَّمَا يَحْشَى اللَّهَ
مِنَ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿۵۱﴾

”اور انسانوں چرایوں اور جانوروں کے رنگ بھی اسی طرح جدا جدا ہیں اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب بہت بخشنے والا ہے۔“

ل۔ مِنَ النَّاسِ وَالذِّوَابِ وَالْأَنْعَامِ ما هو مختلف الالوان۔ کذا لک مصدر محذوف اختلافاً کی صفت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی گونا گوں مخلوق کا ذکر فرمایا جو اپنے صالح کی ذات اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد فرمایا صرف وہی اللہ سے ڈرتے ہیں جو اس کی مخلوق میں غور و فکر کرتے ہیں لیکن مکہ کے کنار جہاں کی کیفیت مختلف ہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر جاہل بنے رہے اور اپنے علوم کو اپنے دلوں اور نفسوں میں راسخ کر لیا جیسے یہود و نصاریٰ کے علماء۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ جس کے دل میں خشیت الہی نہیں وہ عالم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اسکی صفات کمالیہ کی معرفت خشیت کو مستلزم ہے۔ اور جہاں خشیت نہیں ہے تو وہاں علم بھی نہیں ہے کیونکہ لازم کی نفی ملزم کی نفی کو مستلزم ہے۔

امام بخاری نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس آیت کا مفہوم و مراد یہ ہے کہ جو ہم سے فقہ عزت اور سلطنت کو جانتا ہے وہی مجھ سے ڈرتا ہے (۲) جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی زیادہ معرفت رکھتا ہے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کو بھی اس کے کرنے کی رخصت عطا فرمائی، بعض لوگ اس کام سے پرہیز کرنے لگے جب رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی (کہ بعض لوگ اس کام سے اجتناب کر رہے ہیں جو آپ ﷺ نے کیا ہے) تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا جس میں آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا تو میں کام کیا حال ہوگا جو اس کام سے پرہیز کرتے ہیں جس کو میں خود کرتا ہوں۔ قسم بخدا میں ان سے اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت رکھتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (۳)۔ داری نے کھول سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے ایک ادنیٰ فرد پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت

۱۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی جلد 4، صفحہ 418 (اعلیٰ)

2۔ تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 247 (انجلی)

3۔ صحیح بخاری، حدیث: 5750 (ابن کثیر)

فرمائی اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۱)۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم (۲)۔ سب سے زیادہ خشیت انبیاء کرام کو ہوتی ہے پھر اولیاء کو (اور یہی لوگ علماء حقیقت ہیں) اور پھر جو ان سے مرتبہ میں کم لوگ ہوتے ہیں۔ مسروق کہتے ہیں اللہ کا خوف پیدا ہوا جائے تو انسان کے لئے اتنا علم کافی ہے اور یہی جہالت کافی ہے کہ انسان خدا سے غرور کرنے لگے۔ شعی فرماتے ہیں علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

علم اللہ تعالیٰ عزیز اور غفور ہے۔ یہ جملہ خشیت کے وجوب کی تعلیل ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ غالب ہے اس پر جو سرکشی اور گمراہی میں اصرار کرتا ہے، وہ اسے سزا دینے پر قادر ہے اور جو گناہوں سے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی بخشش فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورًا ﴿۱۱﴾

”بیٹک جو (غور و تدبیر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو تم نے ان کو دیا ہے راز داری سے اور علانیہ طور پر اور ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں لے۔“

یعنی جو خوش نصیب ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس کے احکام کی اتباع کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی بیچان بن جاتی ہے۔ کتاب اللہ سے مراد یا تو قرآن ہے یا اللہ کی کتب کی جنس مراد ہے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ آیت سابقہ امتوں کے علماء و قراء کی تعریف ہوگی۔ اَقَامُوا الصَّلَاةَ یعنی نماز کو اپنے ظاہری و باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سِرًّا اور علانیہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اتفاق ہو وہ خرچ کرتے ہیں، علانیہ یا سِرًّا کا وہ ارادہ نہیں کرتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نفل صدقات سِرًّا اور فرضی واجب صدقات علانیہ دینا بہتر ہے۔ یہ رجوع بتعاویض یعنی طاعت کے ذریعے ثواب طلب کرتے ہیں۔ لَنْ تَبُورَ، تجارہ کی صفت ہے یعنی ایسی تجارت جس میں خسارہ نہ ہو۔

لِيُوقِبَهُمْ أَجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ﴿۱۲﴾ إِنَّهُ عَفُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۳﴾

”تا کہ اللہ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے لے اور مزید اضافہ کرے ان کے اجر میں اپنے فضل سے لے بیٹک وہ بہت بخشنے والا بڑا قدردان ہے لے۔“

لِيُوقِبَهُمْ يَتَوَلَّى تَبُورَ کے معنی کے متعلق ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسی نفع بخش تجارت کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں پورا پورا اجر ملے۔ یا فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں، یعنی انہوں نے یہ اعمال کئے تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے پورا پورا اجر عطا فرمائے۔ یا یہ رجوع کے متعلق ہے۔ اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا معنی یہ ہوگا، کہ وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں کبھی خسارہ اور گھٹانا نہ ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمادے۔

علم ایسے خوش سیرت لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مقابلہ میں اجر زیادہ عطا فرمائے گا۔ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے حضرت ابن مسعود سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوقبہم کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی جنت میں داخل کرے گا و يَزِيدُهُمْ

کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس شخص کی سفارش کا اذن دیا جائے گا جس نے کبھی دنیا میں ان تک میرت لوگوں سے کوئی بھلائی کی ہوگی اگرچہ اس کے دوسرے کرتوتوں کی وجہ سے اس پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔

اسے وہ بہت بخشنے والا اور قدر دان ہے۔ یہ جملہ پورا اجر عطا کرنے اور مزید بخشش فرمانے کی علت ہے اور یہ جو ن، ان کی خبر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ ان کی خبر ہو اور ضمیر عامہ مقدر ہو تقدیر کلام اس طرح ہو انہ غفور لفرطہم شکور لظاہمہم۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ رب کریم اپنے پارسا بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف فرماتا ہے اور چھوٹے چھوٹے نیک اعمال پر قدر دانی فرماتے ہوئے اجر عظیم عطا فرماتا ہے (۱) جب إِنَّهُ عَفُوٌّ غَفُورٌ کی خبر بنایا جائے گا تو یہ جو ن، انفقوا کے قائل سے حال ہوگا۔ عبد الغنی نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ صہبن بن الحارث بن عبد المطلب بن عبد مناف کے بارے نازل ہوئی ہے۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿۱﴾

”اور جو کتاب بذریعہ وحی تم نے آپ کی طرف بھیجی ہے وہی سراسر حق ہے وہ تصدیق کرتی ہے پہلی کتابوں کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سارے احوال سے باخبر ہے (اور) دیکھنے والا ہے۔“

۱۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور اس سے پہلے کن بیان یا انہیں کے لئے ہے یا من بعضیہ ہے اور کتاب کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ پہلی کتب سادہ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصداقاً حال مکہ کوہ ہے کیونکہ قرآن کی حقیقت سابقہ کتب کی حقاہد احکام کے اصول اور اخبار میں موافقت کا مستزہم ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اشیاء کے ظاہر و باطن کو جانتے والا ہے۔ پس وہ جانتا ہے کہ آپ عظمت وحی کے لائق ہیں کیونکہ آپ کی طرف ایسی کتاب وحی فرمائی ہے جو پھر سے اور تمام کتب کی صداقت کا معیار ہے۔

لَمْ أَوْسَأُ الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِكَ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ إِذِنَ اللَّهُ لِذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۱﴾

”پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے چن لیا تھا اپنے بندوں سے۔ لیکن بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں۔ اور بعض درمیانہ رو ہیں۔ اور بعض سبقت لے جانے والے ہیں نیکیوں میں اللہ کی توفیق سے۔ لیکن (اللہ تعالیٰ کا) بہت بڑا فضل (و کرم) ہے۔“

۱۔ اذت کا معنی ہے کسی شے کا ایک شخص سے منتقل ہو کر دوسرے کے پاس جانا اور بعض علماء فرماتے ہیں اور شکا معنی اخرونا ہے۔ اسی سے میراث ہے کیونکہ وہ بھی جیسے شخص کو لٹی ہے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے سابقہ امتوں سے قرآن کو مؤخر کیا اور ہم نے انہیں عطا فرمایا جو ہمارے بندوں میں سے چنے ہوئے تھے۔ من عبادنا میں من بعضیہ ہے اور اصطفینا کے متعلق ہے یا ام موصول کا بیان ہے اور ضمیر منصوب محذوف سے حال ہے جو ضمیر ام موصول کی طرف راجع ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِكَ۔ عباد کی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اضافت فرمائی تو یہ شرف و عظمت عطا کرنے کے لئے ہے۔ الَّذِينَ ام موصول سے مراد محمد ﷺ کی امت

الْمَعْرُوفُونَ ۝ (ترجمہ) اور (تیسرا گروہ ہر کار خیر میں) آگے رہنے والوں کا وہ (اس روز بھی) آگے آگے ہوں گے وہی مقرب بارگاہ ہیں۔ پہلی دونوں قسمیں اصحاب المیمنہ (دائیں طرف والے) ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقتصد وہ ہوتا ہے جو غالب اور اکثر اوقات میں قرآن کے احکام پر عمل کرتا ہے اور اسباق وہ ہوتا ہے جو عمل کے ساتھ دوسروں کو تعلیم اور ارشاد کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو عثمان النہدی سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے عمر بن خطاب کو سنا کہ انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم میں سے سبقت لے جانے والا تو سابق ہی ہے اور ہم میں سے جو درمیانہ رہے وہ بھی نجات پانے والے ہیں اور جو ہم میں سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کی بخشش ہو جائے گی (۱) ابوقلابہ فرماتے ہیں میں نے یہ حدیث سنی بنی بن مہین کے سامنے بیان کی تو وہ متعجب ہوئے۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے مرفوع روایت کہا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت عمر پر موقوف روایت کی ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے ابوثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص سعید میں داخل ہوا تو یہ دعا مانگی اے اللہ میری فریب الوطنی پر رحم فرما اور میری وحشت کو اس سے بدل دے اور کسی نیک دوست کو میرے پاس پہنچا دے۔ حضرت ابو درداء نے فرمایا اگر تو سچا ہے تو میں تیری ملاقات کی وجہ سے تجھ سے زیادہ سعادت مند ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔ مقتصد کا آسان حساب ہوگا۔ اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے کو اپنی جگہ روک لیا جائے گا حتیٰ کہ اسے ثم الاحق ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (2)۔

اس حدیث کو احمد ابن جریر طبرانی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور ان کی روایت میں اس طرح ہے کہ خالموں کو محشر کی مدت روک لیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی کوتاہیوں کی عطا فرمائے گا۔ اس وقت وہ کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اٰذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (ترجمہ) سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دو کر دیا ہم سے غم (داعودہ) یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں یہ حدیث حضرت ابو درداء سے کسی طرق سے مروی ہے۔ اور جب کسی حدیث کے طرق کثیر ہوں تو یقیناً اس حدیث کی اصل ہوتی ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اسامہ بن زید سے اس آیت کے متعلق مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تمام (تینوں گروہ) اس امت سے ہوں گے (3)۔ بیہقی نے اسامہ بن زید سے اسی طرح نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت کعب اور عطاء سے

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 248 (التجاریہ) 2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 248 (التجاریہ) 3- تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 248 (التجاریہ)

بلند کریں گے اور یوں عرض کریں گے اے اللہ ہمارے پروردگار ہمارا بھی حساب ہوگا، جبکہ ہم نے تیری رضا کے لئے نکلے، مال اور اولاد چھوڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بازو سنے کے لگا دے گا اور ان پر زبرد اور یا قوت جزا ہوا ہوگا۔ وہ ان بازوؤں سے پرواز کر کے جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد و قالوا الحمد لله الذي اذهب عنا الحزن ولا يمسننا فيها لغوب كما يكنى مطلب به رسول الله ﷺ نے فرمایا۔ وہ اپنی جنت کی منازل اور باتش کو دنیا کے گھروں سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کو پڑھا تو فرمایا خبردار ہمارے ساتھیوں ہمارے پہلے ہیں اور ہمارے مقتصد ہمارے شہری ہیں اور ہمارے ظالم بد ہیں۔

(الاضر اللہ تعالیٰ ان کی آرام گاہ کو بخش دے)

روایت کیا ہے کہ یہ تینوں گروہ جنت میں ہوں گے ابن ابی الندین اور سبیتی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ امت محمد ﷺ کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر اس کتاب کا وارث بنایا جو اس نے نازل کی ہے۔ پس اس امت کے وہ لوگ جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کو بخش دیا جائے گا اور جو درمیانہ دو ہیں ان کا آسان طریقہ پر حساب لیا جائے گا اور اس امت کے سابقین کو اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے جنت میں داخل فرما دے گا (1)۔ امام احمد ترمذی اور سبیتی نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کے متعلق ارشاد فرمایا یہ تمام لوگ ایک جماعت کے قائم مقام ہوں گے اور سب جنت میں ہوں گے (2)۔ الفریابی نے براء بن عازب سے فقہم ظالم لنفسہ کے متعلق روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں کوئی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں داخل فرمائے گا (3)۔ ابن ابی عامر اور الامہانی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندوں کو دوبارہ اٹھائے گا پھر علماء کو علیحدہ فرما کر ارشاد فرمائے گا اے علماء گروہ میں نے تم میں اپنا علم نہیں رکھا مگر تمہارے متعلق علم تھا۔ اور نہ میں نے تمہیں اس لئے علم عطا فرمایا کہ میں تمہیں عذاب دوں جاؤ میں نے تمہاری بخشش فرمادی ہے۔ طبری نے اللہ راویوں کے حوالہ سے حضرت ثعلبہ بن النعمان سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بندوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی شان کے لائق اپنی کرسی پر بیٹھے گا تو علماء سے فرمائے گا میں نے اپنا علم اور حکمت تم میں نہیں رکھا مگر اس لئے کہ میں تمہاری بخشش کا ارادہ رکھتا تھا خواہ تم سے کوئی بھی اعمال صادر ہوئے۔ اور مجھے کوئی پروا نہیں (اگرچہ میں نے تمہارے سب گناہوں کو معاف فرما دیا) (4) ابن عباس نے ابو عمر الصعانی (مفصل بن یسرہ) سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو علماء کو الگ کیا جائے گا پھر جب اللہ تعالیٰ کو دوسرے لوگوں کے حساب سے فراغت ہو جائے گی تو ارشاد ہوگا میں نے تمہارے اندر اپنی حکمت صرف ایک بھلائی کی خاطر رکھی تھی جو آج میں تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں تم سے جو کچھ بھی ہوا اس کے باوجود جنت میں داخل ہو جاؤ۔

عقیدہ بن صہبان فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت (اور لھذا الکتاب الخ) کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہ نے فرمایا یہ سب لوگ جنتی ہیں۔ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے وہ ہیں جو عہد نبوی میں تھے۔ ان کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے اور جو میانہ دو ہیں انہوں نے آپ ﷺ کی اتباع کی اور آپ کے ساتھ لاحق ہو گئے اور جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا وہ جیسے اور تم جیسے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے (کس نفسی کرتے ہوئے) اپنے آپ کو ہمارے ساتھ ملا دیا (5)۔ میں کہتا ہوں ان تینوں گروہوں کو اس امت کے نیک اور چیدہ لوگوں پر جموں کرنا بھی ممکن ہے۔ یعنی کچھ اولیاء کرام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی روک دیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے روک دیا جیسے رافضیوں اور مجاہدہ کرنے والے لوگ۔ یہ رہبانیت ہے جس کو انہوں نے ایجاد کیا۔ بعض ایسے اولیاء کرام ہیں جو اپنے نفس کو لہو لہو سے تو روک رکھتے ہیں اور افراط بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں سوتے بھی ہیں نکاح بھی کرتے ہیں اور کھاتے پیتے بھی ہیں جو شرعاً مباح ہوتا ہے۔ ایسے گروہ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی پیروی کی اور آپ کے ساتھ لاحق ہو گئے اور ان میں کچھ اولیاء کرام ایسے ہوتے ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں اور وہ کمالات نبوت میں

1- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 472 (اعلیٰ) 2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 472 (اعلیٰ) 3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 273 (اعلیٰ) 4- نجم کبیر، جلد 2، صفحہ 84 (علوم و احکام) 5- تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 248 (انصاریہ)

مستغرق ہوتے ہیں اور یہ لوگ صحابہ کرام اور صدیقین ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ نے اپنے نفس کو روکنے کے لئے اپنے آپ کو ظالموں میں شمار فرمایا اور مخاطبین کو اس لئے اس گروہ میں شامل فرمایا کیونکہ وہ سخت ریاضت کرتے تھے۔ یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ تینوں گروہ موئین سے ہیں یا علماء سے ہیں۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ظالم لفظ سے مراد کافر یا منافق ہیں۔ ان کا یہ قول مردود ہے۔ حضرت امام ابو یوسف سے اس آیت کے حعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ تینوں گروہ مؤمن ہیں۔ اور کفار کی صفت اس کے بعد بیان ہو رہی ہے وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ (کافروں کے لئے جہنم کی آگ ہے) اور ان تینوں طبقات کے موئین میں سے ہونے کا قرینہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک گروہ کے لئے فرمایا محم اور ہم ضمیر کا مرجع المذین اصطی من عبادہ (یعنی وہی چیز بندے ہیں) اور وہ اہل ایمان ہیں۔ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ وہ زیادہ ہوتے ہیں اور نیکیوں پر سبقت کرنے والے کم ہوتے ہیں ان کا ذکر آخر میں فرمایا۔ درمیانہ در متوسطہ تعداد میں ہوتے ہیں اس لئے ان کا ذکر درمیان میں فرمایا۔ یا یہ وجہ ہے کہ ظلم معنی میلان نفس ہے اور میلان نفس ہر ایک میں پایا جاتا ہے۔ اقتصاد (میاندری) اور سبقت لاحق ہونے والی کیفیتیں ہیں لیکن اقتصاد دونوں طرفوں کے درمیان ہے۔

یہ یہ تو ریٹ یا الاصطفاء بہت بڑا افضل ہے۔

جَنَّتٍ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلِّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا وَ
لِيَأْسَئَهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝۱۱

”سدا بہار باغات! یہ ان میں داخل ہوں گے پہنائے جائیں گے انہیں وہاں سونے کے نگین اور موتیوں کے ہار ل اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہوگی۔“

۱۔ جَنَّتٍ عَدْنٍ، مبتدا محذوف ہو کر خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لہم محذوف ہے۔ يَدْخُلُونَهَا، جنت کی صفت ہے یا جنت مبتدا ہے اور يَدْخُلُونَهَا خبر ہے۔ ابو عمرو نے يدخولون کو ياء کے ضمہ اور خاء کے فتح کے ساتھ باب افعال سے جمہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے بجز فعل سے ياء کے فتح اور خاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ يدخولون میں ضمیر مرفوع تینوں اصناف کی طرف راجع ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے۔

يُحَلِّوْنَ، يدخولون کے فاعل سے حال مقدر ہے یا بدل اشتغال ہے۔ يدخولون سے یا یہ جملہ متاثر ہے یا جَنَّتٍ عَدْنٍ کی دوسری خبر ہے یا دوسری صفت ہے۔ لُؤْلُؤًا، اساور کے کل پر عطف ہے۔

۲۔ ان کا لباس وہاں ریشمی ہوگا۔ یہ يُحَلِّوْنَ پر معطوف ہے یا جَنَّتٍ عَدْنٍ پر معطوف ہے یا يُحَلِّوْنَ کے فاعل سے حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جَنَّتٍ عَدْنٍ کی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا جنتیوں کے سروں پر ایسے تاج ہوں گے جن کا وہی موتی مشرق و مغرب کو روشن کر دے گا (۱)۔ اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ مفسرین فرماتے ہیں ہر ضحیٰ کے ہاتھ میں تین نگین ہوں گے ایک سونے کا دوسرا چاندی کا اور تیسرا موتیوں کا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا

زبور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کیا جاتا ہے (1)۔ (بخاری و مسلم) حضرت حذیفہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ریشم اور دیبا نہ پہنو اور سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نسونے چاندی کی رکابوں میں کھانا کھاؤ کیونکہ کافروں کے لئے یہ دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں (بخاری و مسلم) (2) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا میں حریر (ریشم) پہنے گا آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا (بخاری و مسلم) (3)

غیاثی نے صحیح سند کے ساتھ اور اسی طرح ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت فرمایا ہے لیکن ان کی روایت میں یہ زائد ہے کہ اگر چہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا پھر بھی وہ ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔ ابن ابی حاتم امین ابی الدنیا نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا آج پہن لیا جائے تو اسے دیکھنے والا بے ہوش ہو جائے اور لوگوں کی آنکھیں اسے دیکھنے کی تحمل نہ ہوں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ ۗ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٥٠﴾

” (شکر نعت کے طور پر) کہیں گے سب تائیں اللہ کے لئے ہیں جس نے درد کو دیا ہم سے غم (واندوہ) لے لیتا ہمارا

رب بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔“

۱۔ قالوا، ماضی کا صیغہ ہے لیکن مراد مستقبل ہے، یعنی قیامت کے روز یہ کہیں گے جیسا کہ گزشتہ احادیث اور آئندہ آیت الہدیٰ احسن دار المقامہ دلائل کر رہی ہے۔ اسی طرح وہ کہیں کلمات اپنی قبور سے اٹھنے کے وقت کہیں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر نہ موت میں وحشت ہے نہ قبور میں اور نہ نشوونما میں۔ گویا میں صور پھونکنے کے وقت انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مٹی سے سر جھارتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (4)۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الْحَزْنَ سے مراد آگ کا غم ہے۔ قہارہ فرماتے ہیں موت کا حزن ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں ان کو غم اس لئے ہوگا کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ مگر فرماتے ہیں حزن سے مراد گناہوں اور خطاؤں کا ڈر اور عبادتوں کے مسترد ہونے کا خوف ہے کلمی فرماتے ہیں حزن سے مراد وہ غم ہے جو دنیا میں انہیں قیامت کے روز کے متعلق تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں دنیا میں روٹی کا غم مراد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں معاش اور عبادت کا غم مراد ہے (5)۔ حق یہ ہے کہ جس حزن مراد ہے۔

۲۔ وہ کہیں گے ہمارا رب واقعی اپنے بندوں کی سیاہ کاریوں اور عسایاں طرازیوں کو بخشنے والا ہے اور مینا زرد اور ساقین کی شب خیز بویں اور جہدہ ریز بویں کی قدر دانی فرمانے والا ہے۔

الَّذِي أَحْسَنَ دَارَ الْمَقَامَةِ مِن قَبْلِهِ ۗ لَا يَسْتَأْذِنُ فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَسْتَأْذِنُ فِيهَا خُوبٌ ﴿٥١﴾

”جس نے ہمیں بسایا ہے ابدی عمارت کے پر اپنے فضل (واحسان) سے نہ چھوئے گی ہمیں یہاں کوئی تکلیف اور نہ چھوئے

گی ہمیں کوئی تمسک نہ۔“

۱۔ اَلْاِتْمَاةُ مَصْدَرٌ سَمِيٌّ هُوَ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات کتنی کریم ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں یہ راحت و سکون کا دائمی ٹھکانا مرحمت فرمایا۔ ورنہ اس پر یہ واجب تو نہ تھا۔ یہ لفظ اس کی بندہ نوازی ہے۔ امام بخاری نے البعث میں اور ابن ابی حاتم نے تفسیر میں الحارث بن عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے طریق سے روایت فرمایا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دنیا میں نیند کے مزے سے اللہ تعالیٰ ہماری آنکھوں کو خشک عطا فرماتا ہے، کیا جنت میں بھی نیند ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ کیونکہ نیند موت کی شریک ہے (موت کے مشابہ اور موت کا ایک حصہ ہے) جنت میں موت نہیں ہے اس شخص نے عرض کی حضور! پھر راحت کیسے ملے گی حضور ﷺ کو ان کی یہ بات اچھی نہ لگی اور فرمایا وہاں کوئی شخص نہ ہوگی وہاں تو راحت ہی راحت ہوگی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جنت میں کوئی شخص، اشغال اور پروردگی کوئی شخص نہ ہوگی (۱)۔ نصب کے بعد لغوب کا ذکر اس لئے فرمایا تاکہ ہر قسم کی درماندگی اور سختی کی صراحت نفی ہو جائے اور مزید تاکید پیدا ہو۔ لا یمننا کا جملہ احسن کے مفعول سے حال ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْبَضُ عَنْهُمْ فِي مَوْتِهِمْ اَوْ لَا يَخْفَفُ عَنْهُمْ
وَقِنْ عَذَابِهَا كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ

”اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے دوزخ کی آگ (تیار) ہے۔ نہ ان کی قضاء آئے گی کہ وہ مرجائیں۔ اور نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے دوزخ کا عذاب۔ اسی طرح ہم بدل دیتے ہیں ہر ناشکر گزار کو سزا“

۱۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا اِذَا عَفِيفٌ لَمْ يَدْرُوا شَايَءًا۔ لا يُقْبَضُ عَنْهُمْ کا معنی لا یحکم علیہم الموت ہے، یعنی ان پر موت کا فیصلہ نہیں ہو گا تاکہ مگر اس عذاب سے نجات و راحت حاصل کر لیں۔ قَبِضُوا میں فاء کے بعد ان مقدر ہے کیونکہ یہ نفی کے جواب میں ہے۔ تقدیر کا ام اس طرح ہے لا یكون علیہم قضاء بالموت فی موتہم۔ شیخین نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان لا کر ذبح کر دیا جائے گا پھر اعلان ہوگا ان کے جنت کے کیونکہ اب کوئی موت باقی نہیں ہے۔ اے دوزخیو! آئندہ کوئی موت نہ ہوگی۔ اس اعلان سے اہل جنت کو مزید فرحت و انیساط نصیب ہوگا اور دوزخیوں کے غم میں اضافہ ہوگا (2) بخاری اور مسلم نے ابوسعید سے یہی حدیث نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ موت کو قیامت کے روز لایا جائے گا اور وہ چنکبرے سے مینڈھے کی طرح ہوگی۔

۲۔ پلک جھپکنے کی مقدار بھی عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیا جائے گا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کڑے عذاب میں مبتلا رہیں اور دوزخ جہنم کے لئے تو اسے پھر بھڑکا دیا جائے گا۔ ۳۔ کذا لک صدقہ رحمہ کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر ناشکرے اور منکر کو یہی سزا دیں گے۔ لَقْوِیَا ماباذ کا صیغہ ہے۔ کیونکہ اللہ کے منکر کو کفر اس سے زیادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے شتم کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔ ابو عمرو نے نجزی کو واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو رفع دیا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع منکر معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرُخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ

أَوْلَمْ نُعَذِّبْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ الْمَذْيَبُ قَدْ دُفِنُوا أَهْلًا
لِيُظْلِمِينَ مِنْ نَصِيحَةٍ ⑤

”اور وہ اس میں چیخنے چلائے ہوں گے (فریاد کریں گے) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ (جواب ملے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بہسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا ہے اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی)۔ اس میں اب (اپنے کئے کا مزہ چکھو غافلوں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے۔“

۱۔ فیصحا میں ضمیر کا مرجع (آگ) ہے، اس جملہ کا عطف لہم غار جہنم پر ہے یا لہم کی ضمیر مجبور سے حال ہے۔ بصطر خون باب افتعال سے ہے اور یہ صراغ سے مشتق ہے جس کا معنی چیخنا چلانا ہے۔ دہنا الخ کا جملہ بقولون محذوف کا مقلوب ہے اور بصطر خون کا بیان ہے۔ عمل صراغ کو مفت مذکور سے متید کیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے کرتوتوں پر اظہار افسوس کریں گے یا اس کا اعتراف کریں گے۔ اور اس قید میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب دنیا میں ہم جو عمل کرتے رہے پہلے ہم انہیں ایچھے اور نیک اعمال سمجھتے تھے اب حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ وہ اعمال تو برے تھے اس لئے ہماری گزارش ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ دنیا میں بھیجا جائے ہم ان خطاؤں کی تلافی کریں گے۔ جواب ملے گا۔

۲۔ کیا ہم نے تمہیں اتنی مہلت نہیں دی تھی جس میں نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کر سکتا تھا۔ مزہ انکار کے لئے ہے اور اواد محذوف کام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی الم فتو ککم فی دار التکلیف ولم نعوذکم ما یصلو ک۔ یعنی کیا ہم نے دنیا میں تمہیں عرصہ دراز تک مہلت نہیں دی تھی اور طویل عمر عطا نہیں کی تھی جس میں توجہ سوجھ سکتے تھے۔ اتنی عمر میں ایک مومن تو نصیحت حاصل کر لیتا ہے (لیکن اس وقت تو تم دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں گمن تھے کہ ہمارے احکام کی طرف کان بھی نہیں لگاتے تھے) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ عطاء اور بکبی فرماتے ہیں آیت میں مذکور عمر سے مراد اسی سال ہے۔ الحسن فرماتے ہیں چالیس سال ہے ابن عباس فرماتے ہیں ساٹھ سال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی عمر تک انسان کو عذر پیش کرنے کا موقع عطا فرماتے ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہ نے نبی کریم سے روایت فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو عذر پیش کرنے کی مہلت عطا فرمائے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی عمر چالیس سال ہو جاتی ہے (2) اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابو اراحمہ محمد ابن حید نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے بطبرانی اور ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا ساتھ سال کی عمر والے کہاں ہیں۔ یہی وہ عمر ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا أَوْلَمْ نُعَذِّبْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمْ الْمَذْيَبُ قَدْ دُفِنُوا أَهْلًا (3)۔ میں کہتا ہوں ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جس میں انسان غور و فکر کر سکتا ہے۔ شاید حدیث کا یہ مطلب ہو کہ جب انسان کی عمر چالیس سال ہو جاتی ہے تو اس سے ہر عذر سلب کر لیا جاتا ہے، یعنی اس کے بعد اسے معذرت کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ ساتھ سال کے بعد اس کی طبیعت عمر کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا

1- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 250 (انتھارپ) 2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 477 (انگریزی) 3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 477 (انگریزی)

میری امت کی عمریں ساتھ اور ستر (سال) کے درمیان ہیں۔ اس سے زیادہ عمر والے بہت کم ہوں گے (1)۔ ورنہ بلوغت کے بعد انسان کے لئے نماز کو چھوڑنے اور دوسرے فرائض کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہو سکتا خصوصاً اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لانے کا تو کوئی بہانہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میری تاویل نہ مانی جائے کہ ماہیت کو کارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جس میں خور و فکر کرنا ممکن ہے تو پھر قیامت کے روز اس ارشاد کے مخالف طبقہ تمام کافرانہ ہوں گے بلکہ صرف وہی ہوں گے جنہوں نے ساتھ سال یا اس سے زائد عمر پائی ہوگی (حالانکہ یہ حکم تمام کافروں کو ہوگا)

اس تمہارے پاس ڈرانے والا آیا مگر تم نے اس کی تبلیغ کو تسلیم نہ کیا۔ نذیر سے مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے زید سے یہی قول روایت کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے کہ نذیر سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں نذیر سے مراد قرآن ہے۔ علماء کی مختلف تفاسیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نذیر محمد ﷺ اور قرآن ہیں اور دوسرے انبیاء کرام اور دوسری کتب دوسری امتوں کے لئے نذیر ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انذیر سے مراد عقل ہے۔ یہ قول ان علماء کی رائے ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ ایمان باللہ کے لئے صرف عقل کافی ہے۔ حتیٰ کہ ان علماء کے نزدیک ہر بالغ شخص کافر ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے گا اگرچہ وہ تمہا پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہو اور اسے کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ یہ جملہ (جاء کم التعلیو) سابقہ کلام کے مفہوم پر مطلق ہے۔ یہ عطف دلالت کرتا ہے کہ آیت میں نذیر سے مراد عقل نہیں ہے کیونکہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ لمبی عمر لئے جس میں انسان خور و فکر کر سکتا ہے اور عقل آنے کے درمیان کوئی مغایرت نہیں ہے۔ کیونکہ عقل مند ہونا ایسی عمر کی وجہ سے ہے اور جو بے عقل ہوا ہے تو گویا نصیحت کی عمر لمبی ہی نہیں (2)۔

نکرہ مضیان من عینہ اور کج فرماتے ہیں نذیر سے مراد بڑھاپے کے سفید بال ہیں۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے یہ قول نکرہ سے نقل کیا ہے۔ ابن مردودہ اور ترمذی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سفید بال موت کے قاصد ہیں۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب ایک بال سفید ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو کہتا ہے تم بھی تیار ہو جاؤ صیوت کا وقت قریب آ گیا ہے (3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں نذیر سے مراد رشتہ داروں اور دوستوں کی موت ہے۔

اس حکم ہوگا بد بختو اپنے کفر اور نافرمانی کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس وقت ان ظالموں سے کوئی بھی عذاب کو دور کرنے والا بدگار نہ ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٢٠﴾

”جینک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین میں ہر چھپی ہوئی چیز کو یقیناً وہ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو۔“

یعنی اس پر کسی انسان کا حال غمی نہیں ہے کیونکہ وہ قول کے نہاں خانہ میں اٹھنے والی آرزوں اور رازوں کو بھی جانتا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ پہلے جملہ کی علت ہے یعنی جو دلوں کے ضمیرات کو جانتا ہے جو انتہائی غمی ہیں اور دوسری چیزوں کو بدرجہ اولیٰ جانتا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلْقًا فِي الْأَرْضِ قَوْمًا كَفَرًا تَعْلَمُونَهُ كُفْرًا وَلَا يُزِيدُ الْكَافِرِينَ

كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتَلًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ اِلَّا حَسْرًا ﴿٢١﴾

”وہی ہے جس نے تمہیں (گزشتہ قوموں کا) جانئین بنایا زمین میں۔ پس جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال بھی اس پر ہوگا اور نہیں اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر اللہ کی جناب میں بجز ناراضگی کے اور نہ اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر بجز گمانے (اور خسران) کے ل۔“

ل جَعَلْتُمْ حَبْلِيكَ كَابِلًا مَفْرُومًا تَوْبَانِ كَمَا يَأْتِي فِي كِتَابِ كُفْرِهِمْ اِلَّا حَسْرًا ﴿٢١﴾ اس معنی کے اعتبار سے خطاب تمام افراد انسانی کو ہوگا۔ بعض مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس نے تمہیں تمام امتوں سے بعد میں بھیجا ہے اور ان کی عبرت ناک داستانیں تمہیں دکھائی اور سنائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں خلیفہ یعنی المستخلف ہے، یعنی اس نے تمہیں ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا ہے اور تمہیں کائنات میں تصرف کا اختیار بخشا ہے اور زمین کے اندر اور پر جو کچھ خزانے اور معدنیات موجود ہیں سب پر تمہیں تسلط اور غلبہ عطا کیا ہے۔ خلافت خلیفہ کی جمع ہے اور اٹخافا، غلبہ کی جمع ہے۔

وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ اِلَّا حَسْرًا ﴿٢١﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ کفر خسارہ اور ناراضگی میں سے ہر کے لئے مستقل ہے۔ پس یہ چیز کفر کی قہارت اور اس سے بھتاک کے وجوب کا ثبوت کرتی ہے۔

قُلْ اَسْرَأْتُمْ شُرَكَاءَ كُفْرِكُمْ اَلَمْ يَكُنْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَسْرَؤُكُمْ مَادَا حَلَقُوا
مِنْ الْاَمْراضِ اَمْ لَكُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اَمْ اَنْتُمْ لَكُمْ كُتُبٌ مِّنْ سَمٰوٰتٍ
يُنزَّلُ عَلَيْهَا الْاَنْزَارُ ﴿٢٢﴾

”اے تمہارے کیا تم نے دیکھے ہیں اپنے شریک جنہیں تم تیکارتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے یا ان کی کوئی شراکت ہو آسمانوں (کی تخلیق) میں لے یا تم نے انہیں کوئی کتاب دی ہو اور وہ اس کے روشن دلائل پر عمل پیرا ہوں (کچھ بھی نہیں) لے بلکہ یہ ظالم محض ایک دوسرے کے ساتھ جموں (دلفریب) وعدے کرتے رہتے ہیں ل۔“

لے مِنْ دُونِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ ان کو شراکاء اس لئے کہا ہے کہ کفار مکہ انہیں اللہ کا شریک سمجھتے تھے یا اس لئے کہ وہ اپنے مال میں انہیں شریک کرتے تھے۔ ارضی، اربابیت کی تاکید یا بدل اشتغال ہے کیونکہ اربابیت کا معنی اخیر و منی ہے۔ مَادَا حَلَقُوا اربابیت کا مفعول ثانی ہے اور شراکاء کم پر محمول ہے۔ مِنْ الْاَمْراضِ سے مراد زمین کا کوئی جز ہے اور شرک، بمعنی شرکت ہے۔ یعنی مجھے ان شراکاء کے متعلق بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کے کسی گوشہ میں کوئی تخلیق کی ہے یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی آسمان کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے جس کی وجہ سے یہ الوہیت ذاتیہ میں شرکت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اَمْ مَقْطَعَةٌ بمعنی بل ہے۔ اور حمزہ کسی زمین کے گوشہ کی تخلیق سے اضراب ہے اور آسمانوں کی تخلیق میں شرکت سے استقہام ہے۔

لے (اگر یہ زمین و آسمان کی تخلیق میں حصہ دار نہیں جس کو تم خود تسلیم کر چکے ہو) تو پھر بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں کوئی کتاب ایسی دی ہے جو تمہارے ان شریک عقائد کا ثبوت یا ہم بنیاتی ہے۔ فہم پر فاجواب شرط محذوف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان کان الامر کذلک فہم علیٰ بینة مہد۔ ان کثیر ابو عمر و حفص اور حمزہ نے بینہ کو مفرہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے بینات

(یعنی جمع) پڑھا ہے۔ منہ کی ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔ بل سابق ترویج سے اضراب اور باقی تمام کا اثبات ہے۔
 لہ ان ظالموں کے پاس بے جان صورتوں کے شریک ہونے پر کوئی علمی دستاویز نہیں ہے کہ اس سے استدلال کر سکیں۔ بلکہ ان کے
 باپ دادا اپنی اپنی نسل کو بلا سند اور بلا دلیل گمراہ کرنے کے لئے جھوٹے وعدے دیتے رہے کہ یہ بت اللہ کی جناب میں ہمارے سفارتی
 ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بقولون هؤلاء شعفاءنا عند اللہ۔

إِنَّ اللَّهَ يُبْسِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِن زَالَتْمَا
 مِنْ أَحَدٍ قَرَعٌ بِعَدِيٍّ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا عَفُوفًا ۝

”بیشک اللہ تعالیٰ روکے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو تا کہ وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور اگر وہ سرکے گئیں تو کوئی
 نہیں روک سکتا انہیں اللہ تعالیٰ کے بعد۔ بیشک وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے۔“

لہ اَنْ تَزُولَا یا تو مفعول کہ ہے یا مفعول کہ ہے۔ (ممکن جس طرح اپنے حدوث میں محدث کا محتاج ہوتا ہے) اسی طرح اس کی بقا
 کے لئے بھی اور محافظ کا ہونا بھی ضروری اور لازمی ہے۔ لکن پر لام قسم کے لئے ہے۔ من بعدہ کی ضمیر کا مرجع ام جلالت ہے، یعنی اللہ
 کے سوا ایسا سوال ہے اور اِنَّ اللّٰهَ يُبْسِكُ اَنْج کا جملہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے اور جواب شرط پر دلالت کر رہا
 ہے۔ من احصی میں من زائدہ ہے اور قبض یعنی قبض میں من ابتداء کے لئے ہے۔

۵۔ دو ملیم ہے کہ اس نے کفار کو مہلت عطا فرمائی اور فوراً انہیں نہیں دیا۔ وہ غفور ہے کہ مومنوں کی غلطیوں اور خطاؤں کو بخش دیتا ہے۔
 اگر اس کا علم اور مغفران نہ ہوتا تو وہ آسمانوں اور زمین کو گرنے سے نذر کرتا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے یہ آسمان ان پر گر پڑتے اور
 زمین ان کے ساتھ دھنس جاتی۔

ابن ابی حاتم نے ابن ابی ہمال سے روایت کیا ہے کہ قریش کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم میں نبی مبعوث فرماتا تو کوئی امت ہم
 سے زیادہ اپنے خالق کی اطاعت گزار نہ ہوتی اور کوئی امت ہم سے زیادہ اپنے نبی کے ارشاد کو سننے والی نہ ہوتی اور اپنی کتاب پر عمل پیرا
 ہونے میں ہم سے زیادہ متشدد نہ ہوتی۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (۱)۔

وَ اَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ اَهْدٰى مِنْ
 اِحْدٰى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا اَدَّاهُمْ اِلَّا نُفُورًا ۝۱۰

”اور (کفار کہہ) اللہ تعالیٰ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ زیادہ ہدایت قبول
 کریں گے پہلی امتوں سے۔ پس جب آگیا ان کے پاس ڈرانے والا تو ان کی (حق سے) نفرت اور بڑھتی گئی۔“

لہ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، اَقْسَمُوا کے مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ ایمان بمعنی اقسام ہے یعنی دو بڑی بیعتیں اور مو کو قسمیں
 اٹھاتے تھے یا فعل محذوف کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اقسما باللہ جہدوا جہد
 ایمانہم۔ یا اقسموا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جاہدین فی ایمانہم۔ اس کی مثال یہ ہے مردت بہ و وحدہ۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بیعت نبوی ﷺ سے پہلے جب قریش کو علم ہوا کہ اہل کتاب نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا ہے اور ان کی تافرمائی کی

ہے تو قریش یہود و نصاریٰ پر لعن طعن کرتے کہ وہ لوگ کہتے بد بخت تھے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور خود قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہمارے پاس اگر کوئی رسول تشریف لایا تو ہم سابقہ تمام ایماندار قوموں سے زیادہ بدایت یافتہ ہوں گے (1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قریش نے یہ لمبے چوڑے دعوے اس وقت کیے تھے جب انہوں نے یہود و نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دین پر نہیں ہیں، یہود کہتے نصاریٰ کسی دین پر نہیں۔ نصاریٰ کہتے یہود کا کوئی دین و مذہب نہیں ہے۔ لیکن نون لفظاً جواب قسم ہے اور معنی جواب شرط ہے۔

ع جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ان کی حق سے نفرت اور بڑھ گئی (ذکوئی اخلاقی قدر کا پاس رہا اور نہ کسی عہد و پیمانہ کی یاد رہی) ازادھم کی نسبت مذہب کی طرف یا اس کے آنے کی طرف مجازی ہے (یعنی حکم کو سب کی طرف منسوب کیا گیا ہے) کیونکہ کس نذر یا اس کی آمد نے حق سے ان کی نفرت میں اضافہ نہیں کیا تھا بلکہ حق سے ان کی نفرت اس نذر کے سبب یا اس کی آمد کے سبب بڑھی تھی (2)۔

اسْتَبْطِئُوا فِي الْاَمْحُرِّ وَمَكَّتِ السَّيِّئُ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهِ
 قَهْلٌ يَنْظُرُونَ اِلَّا سُنَّتِ الْاَوْلِيَيْنِ فَلَئِنْ تَجَدَّ لَسُنَّتِ اللّٰهُ تَبْدِيْلًا وَلَنْ
 تَجَدَّ لِسُنَّتِ اللّٰهُ تَحْوِيْلًا

”وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے زمین میں ل اور گھنٹائی سازشیں کرنے لگے اور نہیں گھبراتی گھنٹاؤنی سازش۔ بجز سازشیوں کے
 ع پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو پہلے (افرانوں) کے ساتھ کیا گیا تھا (اگر یہ
 بات ہے) تو آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی اور آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تغیر سے“

ع استبطنوا یا تو نفوراً سے بدل ہے۔ یا نفوراً کا مفعول لہ ہے یا ازادھم کے مفعول اول سے حال ہے۔ مکتا السیئ سے مراد برائے عمل ہے۔ کبھی فرماتے ہیں اس سے مراد ان کا شرک پر جمع ہونا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے متعلق سازشیں کرنا ہے
 یا آپ کو قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ اصل میں وان مکروا المکر السیئ تھا۔ صفت کی وجہ سے موصوف کو حذف کر دیا اور
 پھر ان مع الفعل کو مصدر سے بدلا گیا تو مکتا السیئ جمع ہوا گیا۔ یہ مصدر اپنی صفت کی طرف مضاف ہے (جیسا کہ صلوٰۃ الاولیٰ میں ہے) حمزہ
 نے السیئ کے حمزہ کو اجتماع حرکات کے نقل کی وجہ سے وصل کی حالت میں تخفیفاً ساکن کر کے پڑھا ہے جیسا کہ ابو عمرو نے ہاز نکم
 کے حمزہ کو ساکن کر کے پڑھا ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو حمزہ ساکن کو یا ء سے بدل دیتے ہیں۔ اعمش کی قراءت بھی یہی
 ہے، جبکہ باقی قراء نے حمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وقف کی حالت میں حمزہ کو روم اور اسکان کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔
 ع جو اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت میں حلیہ سازی کرتا ہے اس کی مکاریوں اور سازشوں کا وبال ان پر پڑتا ہے۔ بدر کے روز کفار کو
 ان کی اپنی سازشوں نے مصیبت میں گرفتار کیا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شرک کا برا انجام اسی شخص کو گھیرتا ہے جو
 شرک کرتا ہے۔ یعنی شرک کا وبال مشرکوں پر ہی پڑتا ہے (2)۔

ع يَنْظُرُونَ یعنی بیظنوں سے یعنی انتظار کر رہے ہیں۔ سُنَّتِ الْاَوْلِيَيْنِ، یعنی گذشتہ سرکش قوموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہی سنت

رہی ہے جب انہوں نے کفر پر اصرار کیا تو انہیں نیت دنا بود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصل مکہ میں لکار کا نام و نشان مٹ گیا اور صرف مؤمنین باقی رہ گئے۔ اللہ کے عذاب کو مکہ میں سے دوسرے لوگوں کی طرف پھیرنے والا کوئی طاقت ور تمہیں نہیں ملے گا بلکہ اس کے عذاب کا کوڑا جھٹلانے والوں پر ہی برے گا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَ
كَانُوا أَشْدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي
الْأَرْضِ ۗ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٣١﴾

”کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھ لیتے کہ کتنا (دردناک) انجام ہوا ان (مشرکوں) کا جو ان سے پہلے نذر چکے حالانکہ وہ قوت (طاقت) میں ان سے (کئی گنا) زیادہ تھے اور (سنو!) اللہ تعالیٰ ایسا (کمزور) نہیں ہے کہ اسے آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز نچا دکھائے۔ وہ ہر بات جانتے والا بڑی قدرت والا ہے۔“

اَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ سے استفہام انکاری ہے۔ اور اَوَلَمْ يَسِيرُوا کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے الم بشاہدوا آثار الماصہین ولہم یسروا۔ فیظروا! یسروا پر معطوف ہے اور لم کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یا لئی کے بعد ان مقدرہ کے ساتھ منصوب ہے۔ اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد شاہدین اور عراق کی گزشتہ قومیں ہیں۔ یعنی ان شہروں میں وہ گزشتہ نافرمان قوموں کے عبرت آموز نشان دیکھ چکے ہیں۔ کانوا، قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔ اشد منہم میں ہم ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ یعنی پہلی قومیں قوت و سطوت میں ان سے کئی گنا زیادہ تھیں لیکن جب ان کی سرکشی حد سے بڑھی تو عذاب الہی کا بگولہ آیا اور انہیں تیس تیس کر دیا، انہیں کوئی طاقت اس عذاب الہی سے بچا نہ سکی۔ تو اسے مکہ کے مشرکوں! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ان کے نشانات سے عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے۔ شئی سے پہلے من زائدہ ہے اور شئی مع بعجز کے فاعل کی حیثیت سے کل رفع میں ہے۔ فی السموات فی الارض ظرف متفرع ہے اور شئی کی صفت ہے یا بعجزہ کے متعلق ہے اور ظرف انو ہے۔

۳۱۔ وہ تمام چیزوں کے حقائق کو بھی جانتا ہے۔ جو چیز جس کی مستحق ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَوْ يَدْرُؤُونَ اللَّهَ النَّاسُ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَ لٰكِن
يُؤْخَذُ مِنْهَا أَلْجَافُ غَسَّاقٍ ۖ فَاذْجَأَ آجَالَهُمْ قَانَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ لَبَصِيرًا ﴿٣٢﴾

”اگر اللہ تعالیٰ (فورا) پکڑ لیا کرتا تو لوگوں کو ان کے کرتوتوں کے باعث تو نہ (زندہ) چھوڑتا زمین کی پشت پر کسی جاندار کو (لیکن) اس کی سنت یہ ہے) وہ ڈھیل دینا رہتا ہے انہیں ایک مقررہ ميعاد تک۔ پس جب ان کی ميعاد آجائے گی تو پینک اللہ کے سب بندے اسکی نگاہ میں ہیں۔“

۳۲۔ جیسا کہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے کہ کفار کا کفر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان پر عذاب کی بجلی گرا کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے اور انہیں خاک میں ملا دیا جائے جیسا کہ گزشتہ قوموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ حالانکہ وہ ان سے بہت زیادہ طاقت ور اور جلد ساز تھے لیکن اگر اللہ تعالیٰ لگتا ہوں کے باعث دنیا میں فوراً عذاب دیتا تو سطح ارض پر کوئی نافرمان باقی نہ رہتا یا کوئی

زمین پر چلنے والی روح باقی نہ رہتی لیکن وہ کریم ذات لوگوں کے مؤاخذہ کو ایک خاص مدت تک مؤخر فرماتی ہے۔ آجلی مُسْمی سے مراد موت کے بعد کا وقت ہے یا روز قیامت ہے۔

یعنی جب وقت مقرر پہنچ جائے گا تو سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، سب کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سزا جزا دے گا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں عباد سے مراد اہل طاعت اور اہل معصیت سب مراد ہیں۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام مھلی سيد المرسلين

اے عظیم و بے پیر! میری کوتاہیوں اور سیاہ کاریوں پر قلم غلو پھیر دے اور روز قیامت اپنے محبوب کریم ﷺ کے لوامہ حمد کے نیچے جگہ عطا فرماتا اور قیامت کی ہولناکیوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھنا۔ تو کریم ہے تو جواد ہے تو رحمن ہے۔

محمد اقبال شاہ گیلانی

23-12-2000

برطانیہ 26 رمضان المبارک 1421 ہجری بروز ہفتہ بعد نماز صبح 7:15

www.muhammadiah.com

ہے کہ باقی قرآنی دونوں سورتوں میں نون کے اظہار کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

نہیں یعنی اور اعراب میں دوسرے مقطعات کی طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغۃ طی میں اس کا معنی یا انسان ہے اور اس سے مراد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس ہلچلے ہوگا کہ اس کی اصل اسی میں ہے پھر کثرت نداء کی وجہ سے اس کا ایک حصہ یعنی سین حذف کیا گیا ہے جیسا کہ ابن کثیر نے مفسر میں لکھا (ایم اللہ ام اللہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ابن عباس سے مروی ہے۔ حسن سعید بن جبیر اور علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں اس کا معنی یا رجل ہے۔ ابو بکر الوراق فرماتے ہیں اس کا معنی یا سید البشر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ قسم ہے۔

وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ ﴿۱﴾

”قسم ہے قرآن حکیم کی۔“

۱۔ یہ قرآن مدیح معانی اور نظم و نثر کے اعتبار سے محکم اور مضبوط ہے۔ واقعہ یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کو قسم تسلیم کیا جائے تو وہ عاقل و عاقل ہوگی۔

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِینَ ﴿۲﴾

”بی شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔“

۱۔ یہ جملہ جو قسم ہے اس جملہ پر اگر یہ کہا جائے کہ کئی بات کی خبر دینے کی دو غرض ہوتی ہیں۔ ۱۔ مخاطب کو حکم سے آگاہ کرنا۔ ۲۔ یہ بتانا کہ شک کو بھی بات کا علم ہے۔ یہاں کوئی معنی بھی مشور نہیں ہو سکتا پھر یہاں خبر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کفار کو آگاہ کرنا مقصود ہے اور ان کی اسی بات کا رد کرنے کے لئے ہے جس پر وہ ہر وقت مصرحتے کہ ”لست مومناً“ کہ آپ رسول نہیں ہیں۔

عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳﴾

”(یقیناً) آپ راہِ راست پر ہیں۔“

۱۔ یہ مومنین کے متعلق ہے اور اس صراطِ مستقیم سے مراد توحید اور امور اسلام پر استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ ہے معنی یہ ہوگا بی شک آپ ان رسولوں میں سے ہیں جو صراطِ مُسْتَقِیْمٍ پر بھیجے گئے تھے۔ یا علی صراطِ مستقیم طرف مستقر ہے اور ان کی دوسری خبر ہے یا حال ہے اس ضمیر سے جو من المومنین میں ہے۔ اور اس کا فائدہ صرح ہے اور جو شریعت آپ لے کر آئے ہیں اس کے مستقیم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ لمن المومنین سے اسی بات پر التزاماً دلالت ہو رہی ہے۔

تَنْزِیْلِ الْعَزِیزِ الرَّحِیْمِ ﴿۴﴾

”نازل فرمایا ہے (قرآن حکیم کو) عزیز (اور) رحیم نے۔“

۱۔ حفص ابن عاصم، حمزہ اور کسایی نے اسی کے اظہار کے ساتھ منصوب پڑھا ہے یا مصدر کے فعل کے اظہار کے ساتھ منصوب پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی نزل (القرآن) تنزیل العزیز فی ملکہ الوحیم بخلق یعنی یہ قرآن اس ہستی نے نازل کیا ہے جو اپنی ملک میں غالب ہے اور اپنی مخلوق پر ہمیشہ مہربانیاں فرمانے والا ہے۔ اس کتاب کو نازل فرمایا اور اپنا کرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا۔ (یہ اس کی کئی رحمت اور کرم نوازی ہے) فعل کو حذف کیا گیا اور مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ باقی

قراء نے تزیل کو مرفوع پر چاہا ہے اس بناء پر کہ یہ ہند امجدوف القرآن کی خبر ہے۔ یہ جملہ صراط کا بیان ہے۔

لِئَلَّيْئَلِيكُمْ مَّا مَأْسَاً اُنْدُرَا اَبَا وَهُمْ فَهُمْ غَفْلُونَ ﴿١﴾

”تا کہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا اس لئے وہ غافل ہیں۔“

ل۔ لِيَلَّيْئَلِيكُمْ مَّا مَأْسَاً اُنْدُرَا اَبَا وَهُمْ فَهُمْ غَفْلُونَ کے متعلق ہے بِالْوَعْدِ الْاُنْتِزَاعِيَّةِ کے معنی کے متعلق ہے۔ ما اندر میں ما تانیہ ہے۔ اور یہ جملہ قوم کی صفت ہے۔ یعنی تا کہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو ایک عرصہ سے نہیں ڈرایا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد مکہ میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تھا۔ جس وہ دوسرے لوگوں کی نسبت رسالت کے زیادہ ضرورت مند تھے۔ چونکہ اس عرصہ سے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ غافل ہو چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما اندر میں ما موصولہ یا موصوفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ آپ انہیں اس چیز کے ساتھ ڈرائیں جس کے ساتھ ان کے آباء و اجداد کو ڈرایا گیا تھا۔ اس تقدیر پر ما اندر کا مفعول ہوگا۔ یا ما اندر میں ما مصدر یہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جس طرح اس کے آباء کو ڈرایا گیا۔ ان تمام صورتوں میں فَهُمْ غَفْلُونَ، اِنَّكَ لَوْنِ الْاُنْتِزَاعِيَّةِ کے متعلق ہوگا، یعنی ہم تے ان کی طرف سے آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا تا کہ آپ انہیں ڈرائیں کیونکہ وہ غافل ہو چکے ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢﴾

”جینک (ان کے) حکیم کفر و عناد کے باعث (یہ بات لازم ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

ل۔ قول سے مراد یہ ارشاد ہے۔ لَا مَلَئَكَ مِنْ جَهَنَّمَ يَنْسِفُونَ الْاَرْضَ وَالنَّاسِ اَجْمَعِينَ ﴿٢﴾۔

(ترجمہ) کہ میں ضرور بھروسہ کروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ میں ہم ضمیر کا مرجع اسکو ہے۔ ابن جریر نے کفر سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو ایسا کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی دو آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْ اَعْنَاقِهِمْ اَعْلَاقًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ﴿٣﴾

”ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق ل۔ پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پچھتے ہوئے ہیں اس لئے ان کے سروا پر کواٹھے ہوئے ہیں۔“

ل۔ ابوجہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے آیا تو قدرت نے اسے اندھا کر دیا۔ لوگ اسے بتاتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کھڑے ہیں (اپنی قوم پوری کر اور انہیں مار) لیکن وہ کہتا وہ کہاں ہے کہاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نظر ہی نہ آتے (۱)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ ابوجہل اور اس کے مخزومی ساتھی کے متعلق نازل ہوئی۔ ایک دفعہ ابوجہل (لعنۃ اللہ علیہ) نے قسم اٹھائی کہ اگر اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اسے چور چور کر دے گا۔ ایک مرتبہ اسی نے آپ ﷺ کو حالت نماز میں دیکھا وہ پتھر اٹھا کر لایا تا کہ آپ کے سر پر مارے۔ لیکن جو نبی مارنے کے لئے پتھر اوپر کیا تو ہاتھ گردن کے ساتھ لپٹ گیا اور پتھر ہاتھ سے چٹ گیا۔ جب لوٹ کر اپنے دوستوں کے پاس واپس آیا تو انہیں سارا مارا جراثیا اور پتھر زمین پر گرا۔ اس کا دوسرا ساتھی

مخزومی اٹھا کر میں حملی اللہ علیہ وسلم کو ای پتھر سے قتل کر کے آؤں گا۔ وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی نماز ادا فرما رہے تھے۔ اس نے پتھر مارنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بیانی سب کر لی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تو سنتا تھا۔ لیکن اسے دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ وہ بھی اپنا منہ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا لیکن اندھا ہونے کی وجہ سے ان کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے آواز دی کہ تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر ہی نہیں آئے، مجھے ان کی آواز سنانی دہی تھی لیکن نظر نہیں آتے تھے، میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا تیل مائل ہو گیا جو دم بلارہا تھا۔ اگر میں تھوڑا سا قریب جاتا تو وہ مجھے کھا جاتا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّا جَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ اَنۡعَامًا ۙ لَّا يَفۡتٰنُوۡنَ (1)

یعنی اغلال یعنی ان کے حلق تھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ سر جھکا نہیں سکتے۔ علامہ بنوری فرماتے ہیں اغلال ہاتھوں سے کٹا ہے یا اگر چنانچہ وہ کڑھ کر پیلے نہیں ہے کیونکہ العلل کا معنی ہاتھ کا گردن سے منع کر دینا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہاتھوں میں زنجیریں اور گولوں میں حلق ڈال کر جکڑ دیا ہے (2)۔ فہم پر فاسیہ ہے۔ کیونکہ اغلال اقام کا سبب ہے۔ یعنی وہ اپنے سروں کو ادا پر اٹھائے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند رکھے ہوئے ہیں، کسی چیز کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہی تھی نے دلائل میں سدی الصغیر عن بکری عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا نبی مخزوم کے کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ ان میں ابو بکر اور ولید بن مغیرہ بھی تھے۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور وہ بد بخت آپ کی قرأت سن رہے تھے۔ انہوں نے اپنا مشورہ کے مطابق ولید بن مغیرہ کو بھیجا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دے۔ وہ چل پڑا حتیٰ کہ جہاں آپ نماز پڑھ رہے تھے وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز تو سن رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دکھائی نہ دیتے۔ واپس آ کر اس نے انہیں حقیقت حال بتائی۔ وہ سب آپ کی طرف آئے۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے تو انہیں آواز سنانی دہی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم دکھائی نہیں آتے تھے۔ وہ آواز کی طرف جاتے تو آواز تھوڑی دور پیچھے سے سنانی دہی، وہ پیچھے آواز کی طرف آتے تو آواز دوسری طرف پیچھے سے سنانی دہی۔ اس طرح وہ مارا ہوا کر واپس پلٹے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کا کوئی راستہ نہ پاسکے۔ آئندہ آیت سے یہی مراد ہے (3)۔

وَجَعَلْنَا لِقُلُوبِہُمْ بَیِّنٰتًا ۙ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ ۙ

”اور ہم نے ہر نبی کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔“

۱۔ سداً کو مزہ، کسائی اور حفص نے سین کے فصح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراہنے جمعہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں دو لٹین ہیں۔ فاعشينا ہم کا معنی یہ ہے۔ کہ ہم نے انہیں اندھا کر دیا، یہ تعشیہ سے ہے جس کا معنی ڈھانپ دینا ہے۔ فہم لا یبصرون پر فاسیہ ہے۔ علامہ معانی فرماتے ہیں یہ ارشاد بطور تشبہ ہے۔ وہاں نہ کوئی طوق تھا نہ دیوار تھی۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ ہم نے موانع کے ساتھ ایمان سے روک دیا۔ اغلال اور سداً کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کفر میں بہت گہرے ہیں اور ان کے دلوں پر ہمہرہ لگی ہوئی ہیں اس لئے نہ تو انہیں آیات سے فائدہ ہوتا ہے اور نہ رسولوں کی چند نصائح سے۔ وہ ان لوگوں

کی مثل ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہیں۔ جو طوق یوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور وہ منہ اوپر اٹھانے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کی مثل ہیں جن کے مقصود مرد اور ان کے درمیان دیوار حائل ہے۔ اسی وجہ سے شدہ حق کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور نہ اپنی گردنیں حق کی طرف پھیر سکتے ہیں اور نہ حق کے لئے اپنے سروں کو جھکا سکتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ سر کو جھکا بھی لیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار ہے جس کی وجہ سے انہیں ہدایت کی شاہراہ نظر نہیں آتی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے اپنے نبی کی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی اس وجہ سے ہم نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت سے باز رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ جعلنا یعنی جعل ہو اور ماضی کا صیغہ بیان فرمایا کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے، یعنی ہم انہیں گردنوں میں طوق ڈال کر جہنم میں پھینکیں گے اور اس کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آگ کے تابوت بنا دے گا۔

وَسَوْءَ مَا عَلَيْهِمْ عَرَأْنُكُمْ مَا تَنْتَهُمُ أَمْ لَمْ تُنْتَهُمُ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾

”اور کیسا ہے ان کے لئے جا ہے آپ انہیں ڈرا کیسے یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

۱۔ اس آیت کی تفسیر پہلے سورہ بقرہ میں مذکور ہو چکی ہے۔

إِنَّمَا تُنْتَهُمُ مِنَ اللَّهِ مَا يُرِيدُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۲﴾

”آپ تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو اتنا جاگرتا ہے قرآن کا اور ڈرتا ہے (خداوند) رحمان سے بن دیکھے ۱۔ پس مژدہ

منانے اپنے شخص کو مغفرت کا اور بہترین اجر کا۔“

۱۔ یعنی اسے پیارے نبی آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف اس پر مرتب ہو سکتا ہے جو قرآن میں غور و فکر کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے رحمن رب کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ آپ کا ڈرانا اس کے لئے نفع بخش ہوگا جو قرآن کی اتباع کی صلاحیت رکھتا ہو اور خشیتِ الہی کی استعداد کا حامل ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء مجاہد اور منقطع کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ الرحمن فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کی صفت کو ملاحظہ کرتے ہوئے خشیت و خوف کا ہونا کمال خشیت ہے اور میں ایمان ہے کیونکہ ایمان خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔ باغیبِ حشری کے قائل سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ عذاب سے ڈرتا ہے حالانکہ اس نے اس عذاب کا ابھی تک محسوس نہیں کیا۔ یا یہ معنی کہ وہ غلطی میں بھی اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے۔

۲۔ یعنی شری تقاضوں کے باعث جو ان سے کوتاہیاں اور گناہ ہوئے ہیں ان کی مغفرت و بخشش کا مژدہ جاننے والا خداوند نیز جنت میں انہیں اعلیٰ اور عمدہ رزق دیکھانے کے لیے کوئی یہ بھی سنا دو۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ أَحْسَنِ عِلْمٍ ﴿۱۳﴾

﴿۱۳﴾

”بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں (ان اعمال کو) جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے ان آثار کو جو وہ

بھیجتے چھوڑ جاتے ہیں اور اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں۔“

۱۔ یعنی ہم قیامت کے روز مردوں کو زندہ کریں گے۔ یا معنی یہ کہ ہم جہالت اور گمراہی کے بعد علم اور ہدایت عطا کرتے ہیں۔ آثار سے مراد اچھے اعمال اور آثار ہیں شلاقی کو تعظیم دی مال وقف کرو یا کسی نیکی کا آغاز کیا جس پر لوگ عمل کرنے لگیں وغیرہ اور برے

اعمال بھی ہیں جیسے برائی اور بے حیائی کی اشاعت کرنا، ظلم کی بنیاد رکھنا، کفر کی تائید کرنا کسی بدعت کا آغاز کرنا وغیرہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوئے تو اس شخص کو اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس ایک نیک کام پر عمل پیرا ہوئے ان سب کا اجر بھی اسے ملے گا۔ دوسرے جو اس کی اقتداء میں عمل کرنے والے ہیں ان کے اجر میں بھی کچھ کمی نہ کی جائے گی۔ جس نے اسلام میں کسی برے طریقے کا آغاز کیا تو جو لوگ اس پر عمل کریں گے سب کے گناہوں کا بوجھ اس پر پڑے گا لیکن برائیاں کرنے والوں کے گناہ اور بوجھ میں بھی کمی نہ ہوگی (۱)۔ اس حدیث کو مسلم نے حدیث جریر سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آثار ہم سے مراد مساجد کی طرف چل کر جانے والے قدموں کے نشان ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ نماز کا ثواب اس شخص کو ہو گا جو دور سے چل کر آیا جو گا پھر اس کا جو اس سے تھوڑے کم اور دوسرے سے زیادہ قدم چل کر آیا ہو گا۔ اور جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے منتظر رہتا ہے اس کا اجر اس سے زیادہ ہو گا جو نماز اکیلے پڑھ کر سوجاتا ہے (بخاری و مسلم) (۲)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں مسجد نبوی کے ارد گرد زمین کے کچھ پلاٹ خالی پڑے تھے۔ نبی سلمہ نے پروگرام بنایا کہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں۔ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پروگرام اور ارادہ کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم مسجد کے قریب آنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ! ہمارا ارادہ کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے نبی سلمہ! اپنے گھروں میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں (یعنی مسجد کی طرف جتنے قدم چل کر آتے ہو وہ سب لکھے جاتے ہیں ان کا تمہیں اجر و ثواب ملے گا) (۳) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے بھی اس کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے اور حاکم نے ابوسعید الخدری سے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

عن کلّ شیء مضر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر احصینا بیان کر رہا ہے (انما وہ مُبْتَدِئٌ سے مراد اولیٰ محفوظ ہے۔

وَأَضْرِبَ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۰﴾

”اور بیان فرمائیے ان کے (سجھانے کے) لئے مثال اس گاؤں کے باشندوں کی جب آئے وہاں (ہمارے)

رسول۔“

۱۔ اے صحیبِ کرم صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کے لئے مثال بیان فرمائیے۔ عرب کہتے ہیں ہذہ الاشیاء علی ضرب واحد یہ تمام اشیاء ایک جیسی ہیں۔ یہاں اضرب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے کیونکہ اس کے ضمن میں جعل کا فعل موجود ہے گویا یوں ارشاد ہے جعل لهم مثلاً اصحاب القرية۔ مثلاً مفعول اول ہے اور اصحاب القرية مفعول ثانی ہے۔ الفریابی ابن عباس سے، ابن ابی حاتم نے حضرت بریدہ سے، عبد بن حمید ابن جریر ابن المنذر نے مکرمہ سے روایت کیا ہے کہ قریہ سے مراد اظنا کیا ہے، یعنی اہل اظنا کیا کہ حال اہل مکہ کے سامنے بیان فرمائیے۔ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ، اصحاب القرية سے بدل ایشمال ہے۔ المرسلون سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں۔ علامہ بخاری نے لکھا ہے کہ مؤرخین فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو حواری اظنا کیا شہر کی طرف بھیجے۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھے شخص سے ملے جو بکر بن جابر ہاتھ اس کا نام حبیب تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی تھا جب ان دونوں

حواریوں نے اس شخص پر سلام کیا تو اس نے پوچھا تم دونوں کون ہو؟ حواری نے کہا اللہ کا رسول تمہیں بتوں کی عبادت چھوڑ کر رحمان کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ یوزھے نے پوچھا تمہارے پاس کوئی نشانی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارے پاس بڑی واضح نشانی ہے ہم اللہ کے اذن سے مرلیش کو شفا یاب کرتے ہیں، باروز ادا نہ سے کو بیٹا کرتے ہیں اور کوڑھی کے مرلیش کو درست کر دیتے ہیں۔ یوزھے نے کہا میرا ایک بیٹا کئی سال سے مرلیش ہے۔ قاصدوں نے کہا ہمیں ساتھ لے چل ہم اس کی حالت دیکھتے ہیں۔ یوزھا انہیں گھرنے آیا یا انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ اسی وقت اللہ کے اذن سے صحت یاب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی، اس کے علاوہ کئی مرلیشوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں شفا بخشی۔ اس شہر کا ایک بادشاہ تھا، وہب نے اس کا نام اٹطس لکھا ہے۔ وہ روم کے بادشاہوں سے تھا اور بتوں کا پجاری تھا۔ جب اس کو یہ خبریں پہنچیں تو بادشاہ نے ان دونوں قاصدوں کو بلایا اور پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا تم کیسے آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم تجھے یہ دعوت دینے آئے ہیں کہ ان بتوں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور اس ذات کی عبادت کرو جو سنتی بھی ہے اور دیکھتی بھی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا تمہارا ہمارے خدا کے علاوہ کوئی اور خدا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارا خدا وہ ہے جس نے تجھے اور تیرے خداؤں کو پیدا کیا۔ بادشاہ نے کہا تم دونوں چلے جاؤ میں تمہارے معاملہ میں غور و فکر کرتا ہوں۔ پس لوگ ان قاصدوں کے پیچھے لگ گئے پھر انہیں پلڑ کر بازار مارا چٹا۔

وہب لکھتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے ان دو آدمیوں کو انظار کیہ بھیجا۔ وہ انظار کیہ پہنچے لیکن بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ طویل مدت ظہر رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر نکلا تو انہوں نے تکبیر کہی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا۔ بادشاہ کو ان پر غصہ آ گیا، اس نے دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا نیز ہر ایک کو سوسو کوڑے لگانے کا بھی فیصلہ سنایا۔ جب ان قاصدوں کو جھٹلا گیا تو انہیں مارا پینا گیا تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے سردار شمعون الصفا کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ ان کی معاونت کریں۔ شمعون غیر معروف طریقہ پر شہر میں داخل ہوا اور بادشاہ کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات استوار کرنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گئے۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور بڑا احسن سلوک کا مظاہرہ کیا اور عزت و احترام کیا۔ ایک دن شمعون نے بادشاہ سے کہا اے بادشاہ سلامت! امین نے سنا کہ آپ نے دو آدمیوں کو قید کر رکھا ہے اور جب انہوں نے تیرے دین کے علاوہ کسی دین کی تجھے دعوت دی تو تو نے انہیں مارا بھی ہے لیکن کیا تو نے ان سے کوئی بات بھی کی تھی اور تو نے ان کی کوئی بات سنی تھی؟ بادشاہ نے کہا مجھے انتہائی غصہ تھا اس لئے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شمعون نے کہا بادشاہ سلامت! پسند فرمائیں تو انہیں بلا بھیجیں تاکہ ہم ان کے حالات اور دین پر آگاہی حاصل کریں۔ بادشاہ نے ان دونوں کو بلایا تو شمعون نے ان سے پوچھا تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اس کا حکم فرماتا ہے۔ شمعون نے کہا تمہارے پاس اپنے حق ہونے اور قاصد ہونے کی نشانی کیا ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے شمعون نے انہیں کہا آپ اللہ کی صفات بیان کرو۔ انہوں نے کہا وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا جو تم چاہو ہم دکھا سکتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک لڑکا بلایا جس کی آنکھیں بالکل ختم ہو چکی تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ بھی پیدائشی کی طرح برابر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی شفا کی دعا مانگتے رہے حتیٰ کہ آکھ کی جگہ کھل گئی۔ ان دونوں نے منیٰ کے دو ڈھیلے لے کر اس کی آنکھوں میں رکھ دیئے۔ پس وہ دونوں آکھ کے دو ڈھیلے کی طرح ہو گئے اور وہ لڑکا دیکھنے لگ گیا۔ بادشاہ کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ شمعون نے بادشاہ سے کہا اگر تو اپنے خدا سے ایسی قدرت دکھانے کا سوال کرے اور وہ اس طرح اپنی کرشمہ سازی دکھا دے تو تیرا شرف بڑھ جائے

گا۔ بادشاہ سے کہا جناب! ہم سے کچھ غلطی نہیں کہ ہمارا خدا جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ نفع نقصان پر قادر نہیں ہے، نہ وہ سنا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ شمعون کی یہ عادت تھی کہ بادشاہ جب بتوں کے پاس جاتا تو شمعون کثرت سے نماز پڑھتا اور خوب آواز کرتا کرتا حتیٰ کہ لوگ سمجھتے کہ وہ ہمارے دین پر ہے۔ بادشاہ نے ان پیغام رسالوں کو کہا اگر تمہارا خدا مردہ کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ انہوں نے کہا ہمارا خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ بادشاہ نے کہا یہاں ایک میت ہے جو سات دنوں سے دفن ہے، وہ ایک کسان کا بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دفن نہیں کر دیا تھا تا کہ اس کا باپ جو غائب تھا وہ وہاں آ جائے۔ لوگ وہ میت اٹھا کر لائے تو اس کی بوبدل پتلی تھی۔ ان دنوں نے بلند آواز سے دعا مانگی شروع کی اور شمعون آہستہ آہستہ اپنے پروردگار کو پکار رہا تھا۔ پس وہ میت کھڑا ہو گیا اور کہا کہ میں سات دن سے شہر کی حالت میں مرا تھا مجھے آگ کی سات وادیوں میں داخل کیا گیا۔ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس عقیدہ کے برے انجام سے جس پر تم قائم ہو۔ پس تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ پھر اس نے کہا آسمان کے دروازے کھل گئے میں نے ایک جوان دیکھا جو بڑا خوش شکل تھا وہ ان تین افراد کی سفارش کر رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا وہ تین کون ہیں۔ اس نے کہا شمعون اور یہ دو شخص۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا جب شمعون نے دیکھا کہ اس کی بات بادشاہ پر موثر ہو گئی ہے تو اس نے بادشاہ کو حقیقت حال سے باخبر کیا۔ پھر بادشاہ بھی ایمان لایا اور کچھ لوگ بھی ایمان لے آئے اور کچھ لوگ منکر ہی رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کی بیٹی فوت ہو چکی تھی۔ اور دفن بھی ہو چکی تھی شمعون نے بادشاہ کو کہا ان دو آدمیوں سے مطالبہ کر کہ تیری بیٹی کو زندہ کر دیں۔ بادشاہ نے بیٹی کے زندہ کرنے کا مطالبہ کیا تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھنے لگے اور دعا کرنی شروع کر دی۔ شمعون بھی ان کے ساتھ آہستہ آہستہ دعا مانگ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو زندہ کر دیا۔ قبر بھٹ گی اور وہ باہر نکل آئی۔ اس عورت نے کہا یہ دونوں سچے ہیں لیکن مجھے تو خیال نہیں آتا کہ تم ایمان لے آؤ گے۔ پھر اس لڑکی نے ان دو شخصوں سے کہا کہ مجھے اپنی جگہ واپس لوٹا دیں۔ انہوں نے اس کے سر پر مٹی ڈالی اور وہ اپنی قبر کی طرف لوٹ گئی جیسا کہ پہلے تھی۔

ابن اسحاق نے کعب اور وہب سے روایت کیا ہے کہ بادشاہ نے انکار کیا تھا اور بادشاہ اور اس کی قوم نے ان کا صدقہ نہ قبول کرنے پر اتفاق کر لیا۔ جب حبیب نجار کو یہ خبر پہنچی جو شہر کے کنارے پر ہوتا تھا۔ دوڑتا ہوا آیا اور انہیں نصیحت کی اور انہیں ان کا صدقہ کی اطاعت کی طرف بلایا۔ اللہ تعالیٰ آئندہ ارشاد میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں (1)۔

إِذْ أَسْرَسْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ يَبُوءُ لَهُمْ عَهْدًا بِرَبِّكَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي هَذَا قَرْيَةً مِّنْ مَّن سَلَوْنَ ﴿١٠﴾

”جب (پہلے) ہم نے عیسیٰ ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے تقویت دی (انہیں) ایک تیسرے رسول سے، تو ان تینوں نے (انہیں) کہا کہ ہمیں تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔“

لِإِذْ أَسْرَسْنَا، سابقہ آیت سے بدل ہے۔ پہلے دو قاصدوں کا نام وہب نے بچھی اور یونس لکھا ہے (2) فعززنا کو ابو بکر نے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے تید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان دونوں قراتوں کا معنی ایک ہے۔ ثالث سے مراد شمعون ہے۔ ابن کثیر نے سعید بن جبیر سے اسی طرح کا قول روایت کیا ہے۔ فعززنا کا مفعول بڑھ کر نہیں فرمایا کیونکہ کلام سے مقصود معزز ہے (شمعون) کا ذکر تھا۔ اس لطیف تہذیب کا بیان مطلوب تھا۔ جس سے حق کو تقویت ملی اور باطل مٹ گیا۔ جب کلام کسی مخصوص غرض کے لئے ذکر کی گئی ہو تو

اسی مخصوص غرض کو ہی ذکر کیا جاتا ہے اور زائد چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عبدالرزاق اعبد بن عبد ایں جریر ابن اعمش اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اہل قریہ کی طرف اپنے دو حواریوں کو بھیجا تھا (1)۔ کعب فرماتے ہیں وہ قاصد صادق اور مصدق تھے اور تیسرا شلوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھیجے کی نسبت اپنی طرف کی ہے فرمایا ہم نے بھیجے حالانکہ انہیں عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھیجا تھا (2)۔

ع۔ قالوا کا فاعل تینوں مبلغ ہیں۔ یعنی ان رسولوں نے قسم اٹھا کر اہل اطلا کیہ گویا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

قَالُوا مَا آتَيْتُمُ الْاَبْسَرَةَ مِنْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ سَمٰوٰتِہٖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا كٰذِبُوْنَ ﴿۲۰﴾

”ہستی والوں نے کہا تمہیں ہوتم مگر انسان ہماری مانند اور نہیں اتاری رحمن نے کوئی چیز نہیں ہوتم مگر جھوٹ بول رہے ہو۔“

ع۔ اطلا کیہ والوں نے کہا تمہارے اندر کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رسالت کے لئے خاص فرمایا ہو۔ رحمن نے تو کوئی وہی نازل نہیں فرمائی ہے، تم دعوائے رسالت میں جھوٹ بول رہے ہو۔

قَالُوا اَمْ اَرْبَابًا يَعْلَمُونَ اَنْ اِلٰہِہٖمْ لَمْ یَسْئَلُوْنَ ﴿۲۱﴾

”رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔“

ع۔ رسولوں نے اللہ کے علم سے استہزاء کیا جو تم کے قائم مقام ہے۔ اسی وجہ سے جو کہتا ہے کہ اللہ جانتا ہے میں نے ایسا کام کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات میں جھوٹا تھا تو یہ یقین غوس ہوئی یعنی جھوٹی قسم ہوگی۔ چونکہ لوگوں نے ان کی رسالت کا انکار کیا تھا اس لئے لام تھا کیہ اور قسم کے ساتھ مذکور جواب دیا۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۲۲﴾

”اور ہمیں ہم پر کوئی ذمہ داری جبراً اس کے (کہ پیغام سن) کھول کر پہنچادیں۔“

ع۔ ہمارا فرض تو صرف اتنا تھا کہ ایسی نشانوں کے ساتھ پیغام پہنچادیں جو ہمارے پیغام کی صحت کی واضح دلیل ہوں۔ مثلاً ماوراز انعموں کو زندہ کرنا کوڑھی کے مریش کو شفا دینا اور مردوں کا زندہ کرنا۔ یعنی تم جو ہمارے پیغام کا انکار کر رہے ہو اس سے ہمیں تو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ ہمارے ذمہ جو تبلیغ کا فریضہ تھا وہ ہم نے بحسن و بخوبی ادا کر دیا ہے۔ اب اس انکار اور رد کا وبال تم پر ہی لوٹے گا۔ جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کا سلسلہ روک لیا۔

قَالُوْا اِنَّا لَطٰغِيْرُوْنَ ﴿۲۳﴾ لٰكِن لَّمْ يَنْهٰہِمْ اَنْ يَّعْبُدُوْا مَا يَشٰہُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّسْئَلُوْا مَا اَلٰہِہُمْ ﴿۲۴﴾

”وہ کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کردیں گے اور پہنچے گا تمہیں

ہماری طرف سے دردناک عذاب۔“

ع۔ کہنے لگے عرصہ دراز سے اگر ہم پر بارش نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ تمہاری نعمت ہے۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی کہ ان بزرگوں نے جو انہیں دعوت تھی اس کو انہوں نے بعید از عقل سمجھا تھا اور انتہائی قبیح جانا تھا اور حد درجہ اس سے نفرت کی تھی۔ جاہل

لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے کہ ہر اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جس کی طرف ان کی طبعی مائل ہوتی ہیں اور اس کو منحوس سمجھتے ہیں جس کو ناپسند کرتے ہیں۔

قَالُوا طَائِفًا مِّنْكُمْ مَّعَكُمْ أَئِن ذُكِّرْتُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿١٠﴾

”رسولوں نے فرمایا تمہاری بددعائی تمہیں نصیب ہو (حیرت ہے) اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے (تو تم دھمکیاں دینے لگتے ہو) بلکہ تم لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہو۔“

۱۔ ان رسولوں نے کہا تمہاری بددعائی اور نحوست کا سبب تو تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارا کفر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں خیر و شر کا حصہ تمہارے ساتھ ہے (۱) وہ تم سے جدا نہ ہوگا۔ آئین ذُکِّرْتُمْ شرط ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے اور ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے تو تم ہمارے ساتھ بددعائی پکڑتے ہو اور ہمیں ہم کی دھمکیاں دیتے ہو۔ تمہیں مناسب تو نہیں لگتا بلکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم نصیحت قبول کرتے اور احسان سمجھتے۔ ابو جعفر نے دوسرے ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور ذکر تم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (۲) تقدیر کلام اس طرح ہوگی التطیر تم و تو اعدتم لان ذکر تم۔ یعنی کیا تم بددعائی پکڑتے ہو اور دھمکیاں دیتے ہو کیونکہ تمہیں وضاحت کی گئی ہے۔

۲۔ تم تو تم ہی ایسی ہو تم عصیان میں حد سے بڑھ گئے ہو اور اللہ کے برگزیدہ رسولوں سے بددعائی پکڑتے ہو حالانکہ ان سے تو برکت حاصل کرنا چاہئے تھا۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدْيَنَةِ رَجُلٌ يُسْبَعِي قَالَ لِيَقْوُوا السُّعُوَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١١﴾

”دریں اثنا یا شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا اس نے کہا اے میری قوم پیروی کرو رسولوں کی۔“

۱۔ یہ آنے والا شخص حبیب نجار بڑھتی تھا۔ عبدالرزاق ابن ابی حاتم نے قناد سے یہی قول نقل کیا ہے۔ سدی فرماتے ہیں وہ دھوئی تھا۔ وہب فرماتے ہیں حبیب ریشم کا کام کرتا تھا اور وہ پینار تھا اور اس کو جذام کا مرض تھا اور اس کا گھر شہر کے دروازوں میں سے آخری دروازہ کے قریب تھا۔ وہ موسیٰ اور صدقہ دینے والا شخص تھا۔ دن کو مزدوری کرتا اور شام کو اپنی کمائی دو حصوں میں تقسیم کرتا، نصف اپنے اہل و عیال کو کھانا اور نصف صدقہ کر دیتا۔ جب اسے یہ خبر پہنچی کہ اس کی بد بخت قوم نے آئے ہوئے رسولوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ بیچارہ دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے میری قوم رسولوں کی اتباع کرو (۳)۔

السُّعُوَا صِنْ لَّا يَسْتَلِكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿١١﴾

”پیروی کرو ان (یا کباروں) کی جو تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے اور وہ سیدھی راہ پر ہیں۔“

۱۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے یا بدل ہے۔ ایک زائد فائدہ پر مشتمل ہے، یعنی یہ اللہ کے بندے اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور مشقتوں پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے اور یہ لوگ دنیا و آخرت میں ہدایت یافتہ ہیں۔

وَمَا لِي لَا أَعْبُدُ إِلَهِي فَلَئِنِّي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١٢﴾

”اور مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اس کی جس نے مجھے پیدا فرمایا۔ اور اسی کی طرف تم (سب) نے

لوٹ کر جانا ہے۔“

ما استغفایہ مبتدا ہے۔ اور ظرف اس کی خبر ہے ولا عید یعنی ضمیر شکم سے حال ہے پھر یہ جملہ یا قوم اتبعوا المرسلین پر معطوف ہے۔ اس میں غائب سے شکم کی طرف التفات ہے، اس کلام میں ایک لطیف انداز تبلیغ ہے۔ اپنے نفس اور اپنے ضمیر کو خالص نصیحت کی جارہی ہے اور مضمن قوم کو بھی نصیحت کی جارہی ہے کہ تاجر جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہے تو اس کلام سے مراد قوم کو چھڑکنا اور تنبیہ کرنا ہے اور اس بات پر کہ اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے غیروں کے سامنے اپنی جبین نیاز جھکاتے ہیں۔

۱۰۔ وَإِنِّي لَشَرُّ مَنُجِّنٍ جملہ تہدید اور زجر و توبیخ میں مبالغہ کرنے کے لئے ہے کہ تم اس خالق کی عبادت کرنے اور اسے معبود تسلیم کرنے سے روگردانی کر رہے ہو، جب کہ ایک دن تم سب کی اس معبود حقیقی کی بارگاہ میں پیشی ہونی ہے۔

عَاتِجِدْ مِنْ دُونِ الْإِلهِ إِن يُرِدْنَ الرِّحْمَنُ يَصْرِفْ لَاتُغْنِي عَنْكَ شِيعَتُكُمْ سِيَّئًا
لَا يُنْقِذُونَ ﴿۱۰﴾

”کیا (میرے لئے جائز ہے کہ) میں بناؤں اسے چھوڑ کر کوئی اور خدا؟ (ہرگز نہیں) اگر رحمن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے ذرا فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ وہ مجھے چھڑائیں گے۔“

۱۱۔ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حبیب ایک غار میں اللہ کی عبادت کرتا تھا (۱) جب اسے رسولوں کی خبر پہنچی تو وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا لَقَدْ رَأَيْتُمْ أَهْلَ الْاَرْضِ اذْ هُمْ يُعْبُدُونَ ﴿۱۱﴾ اَلَيْسَ لَكُمْ اَحْبَرٌ اذْ هُمْ يُعْبُدُونَ ﴿۱۲﴾ اس کی یہ نصیحت سن کر وہ بولے تو ہمارے دین کا مخالف ہے اور ان رسولوں کے مذہب کا پیروکار بن گیا ہے۔ حبیب تجار نے کہا وَصَالِحِي اذْ اَعْبَدُوا اَلَّذِي فُكِّرْتِي وَ اَلَّذِي شَرُّ جَعَلُونَ۔ مزہ اور لہو تعجب نے عالمی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس شخص نے ”لفظی“ میں تخلیق کی اضافت اپنی طرف کی ہے، جب کہ وَ اَلَّذِي شَرُّ جَعَلُونَ میں روج کی نسبت قوم کی طرف کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق (پیدا کرنا) نعمت کا اثر ہے اس لئے اس پر اس کا اظہار لازم تھا اور روج میں زجر و توبیخ ہے۔ اس لئے اس کی نسبت قوم کی طرف کرنا مناسب تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب اس نے یہ کہا اتبعوا المرسلین (رسولوں کی اتباع کرو) تو لوگوں نے اسے بکڑ لیا اور بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کیا تو ان لوگوں کا پیروکار ہے؟ تو اس نے جواباً کہا وَصَالِحِي اذْ اَعْبَدُوا اَلَّذِي فُكِّرْتِي وَ اَلَّذِي شَرُّ جَعَلُونَ۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جو میرا خالق ہے۔ اور تم سب نے قیامت کے روز حاضر ہوتا ہے۔ وہ تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دے گا (۲) اتخذ میں استفہام انکاری ہے۔ من دونہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے علاوہ جنہوں نے من گھڑت خدا ہیں۔ ولا یبقذون کوورش نے وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے تو یہ بت اور مورتیاں مجھے اللہ سے نہیں بچا سکتیں۔ نقصان کو دور کرنے میں اور عذاب سے بچانے میں ان کی شفاعت کی نفی کرنے میں، نفع میں ان کی شفاعت کی نفی میں مبالغہ ہے۔ یعنی جو نقصان اور عذاب سے بچاؤ کی سفارش نہیں کر سکتے وہ نفع پہنچانے کی سفارش کیسے

کر سکتے ہیں؟ کیونکہ رحمت کے حصول کے لئے سفارش کی قبولیت تو بہت بلند مرتبہ ہے جب دفع ضرر کے لئے ان کی سفارش قبول نہیں ہے تو حصول مراتب اور حصول رحمت کیلئے کیسے قبول ہوگی۔ جملہ شرطیہ الہیۃ کی صفت ہے۔

إِنِّي إِذَا نَفَى صَلَّى مُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾

” (اگر میں شرک کروں) تو میں بھی اس وقت کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“

۱۔ اِنِّي کو نافع اور ابومعرو نے باہ کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے باہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں اس خدا کو چھوڑ کر جس نے مجھے پیدا کیا ان صورتوں کو خدا تسلیم کروں جو نہ نفع کا باعث ہیں اور نہ نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ یہ گمراہی اتنی واضح ہوگی کہ معمولی سمجھ رکھنے والا بھی کہے گا کہ یہ گمراہی ہے۔ یہ جملہ بتوں کو خدا بنانے کے انکار کی علت بیان کر رہا ہے۔

إِنِّي إِصْنَبُ بِرَبِّكُمْ قَائِسُونَ ﴿٥٨﴾

” میں ایمان لے آیا ہوں تمہارے رب پر پس (کان کھول کر) میرا اعلان سن لو۔“

۱۔ اِنِّي کو نافع اور ابن کثیر نے باہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے باہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اسے میری قوم یا اسے بادشاہ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں جس نے تمہیں پیدا فرمایا پس تم میرے دعویٰ ایمان کو باگ دہل سن لو۔ یہ آیت سابقہ نصیحت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب قوم سے کہا گیا اقبوا المرسلین تو گویا انہوں نے کہا کیا تو ان پر ایمان لایا ہے؟ اس نے کہا اِنِّي اصْنَبُ بِرَبِّكُمْ میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں۔ میں یہ اعلان بھرے مجمع میں کر رہا ہوں تم سب سن لو۔ اگر یہ چیز بہتر نہ ہوتی تو میں اپنی ذات کے لئے اسے قطعاً پسند نہ کرتا۔ رب کی اضافت مخالفین کی طرف کی ہے، امانت ہو یہی نہیں کہا کیونکہ یہ اسلوب ان کو ایمان کی طرف زیادہ دعوت دینے والا ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اس کے اس اعلان پر قوم اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے قتل کر ڈالا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں لوگوں نے اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روندنا حتیٰ کہ اس کی انتڑیاں اور معدہ اس کی دیر کے راستے باہر نکل آیا۔ سعدی نے کہا ہے کہ قوم اسے پتھروں سے مار رہی تھی اور وہ یہ کہہ رہا تھا اَللّٰهُمَّ اغْيِبْ قَوْمِي (اے اللہ میری قوم کو راہ راست عطا فرما) آخر کار وہ انہوں نے اس تابع اور مخلص شخص کو گلے بکڑے کر کے قتل کر دیا۔ حسن فرماتے ہیں انہوں نے اس کے حلق کو چیر کر شہر کی دیوار سے لٹکا دیا اس شخص کی قبر اٹھا کیہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل فرما دیا تھا۔ وہ وہاں زندہ ہے اور اسے رزق پہنچایا جاتا ہے (۱)۔ یعنی وہ شہداء کی زندگی گزار رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بنو نجرار کی خطاب رسولوں کو تھا۔ جب حبیب نے دیکھا کہ لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں تو اس نے اپنے ایمان پر رسولوں کو گواہ بنایا۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ اس نے رسولوں کو کہا میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ نے بندہ نوازی کرتے ہوئے اور اپنے بندے کی عزت افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا (آ جا میری جنت کی بہاریں تیری منتظر ہیں اور تیرے قدم ہمہنست ترم کے لئے اس کی زمین مشتاق ہے)

قَبِيلٌ اَدْخُلَ الْجَنَّةَ قَالَ لَيْلِيَّتَ قَوْمِي يَعْمُونَ ﴿٥٩﴾

”حکم ہوا (جا) جنت میں داخل ہو جاوہ بولا کاش! میری قوم بھی جان لیتی۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مژدہ جہان فرمایا اس وقت سنایا، جب کہ ابھی اس نے جام شہادت نوش نہیں کیا تھا، یعنی ارشاد فرمایا تو پہنی اس قبر میں داخل ہو جاوہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قبیل لہ نہیں فرمایا کیونکہ کلام سے مقصود مقبول (جو بات کہی گئی ہے) ہے نہ کہ مقبول لہ (جس کو بات کہی جائے) کیونکہ وہ تو پہلے ہی معلوم ہے اور سلسلہ کلام اسی کے متعلق ہو رہا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور مقدر سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ جب اس نے اپنے دین پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت اس کی کیفیت کیا تھی؟ جب حبیب جنت کی -حطرو ہمزاد یوں میں پہنچ گیا تو کہنے لگا کاش میری قوم بھی اس حقیقت کو جان لیتی۔

بِسَاغْفَرِي رَاتِي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمَكْرُومِينَ ۝۱

”کہ بخش دیا ہے مجھے میرے رب نے اور شامل کر دیا ہے مجھے باعزت لوگوں میں۔“

۱۔ ماموصولہ یا مصدر یہ ہے اور باء یعلومون کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش میری قوم اس چیز کو جان لیتی جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف فرمایا ہے۔ یا یہ معنی کہ کاش میری قوم میری مغفرت کو جان لیتی یا ما استفہامیہ ہے اور باء غفَر کے متعلق ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف کر دیا۔ اس کی مراد ایمان تھا۔ اور کفار کی اذیتوں پر صبر کرنا تھا (یعنی اس نے کہا میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ جے دل سے ایمان لانے اور کفار کی مہر آ زما تکالیف کو برداشت کرنے کی وجہ سے میرے رب نے میری بشری کمزوریوں کو معاف فرمایا ہے اور مجھے ان لوگوں میں داخل کر دیا ہے جنہیں ابدی اور سرمدی عزت سے نوازا گیا ہے) نیک اور صالح اپنے غصہ اور جذبات پر کتنا ضبط رکھتے ہیں کہ قوم جان لینے پر پختہ ارادہ کر چکی ہے اور یہ درویش ان کے لئے یہ خواہش کر رہا ہے کہ کاش میری قوم ایمان و طاعت کی شیرینی اور شفا کو جان لے۔ اللہ کے نیک بندوں کی یہی صفت ہوتی ہے، وہ دشمنوں پر دم کرتے ہیں اور جاہلوں سے الجھتے نہیں، حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اللہ کے اس بندے کی اس تمنا کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو ایمان اور طاعت کے حصول پر براہینتہ کر لے۔ یا یہ وہ تھی کہ قوم کو علم ہو جائے کہ وہ اس کو قتل کر کے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں کیونکہ وہ حق کا علمبردار ہے۔

علامہ بخاری فرماتے ہیں جب حبیب کو قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر غضب فرمایا اور فوری انتقام لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا کہ خوفناک کڑک کے ذریعے سب کو بلاک کر دے۔ تو کفار سب کے سب اس بجلی کی کڑک سے موت کے منہ میں چلے گئے (۱)۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ۝۱

”اور نازل ہوا ہم نے اس کی قوم پر اس (کی شہادت) کے بعد کوئی لشکر آسمان سے، اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی۔“

۱۔ قَوْمِہ سے مراد حبیب کی قوم ہے۔ مِنْ بَعْدِہ میں من زائدہ ہے۔ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ میں پہلا من زائدہ ہے، ثانی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اور دوسرا من ابتداء کے لئے ہے۔ یعنی ہم نے ان کو بلاک کرنے کے لئے آسمان سے لشکر نہیں اتارا جیسا کہ ہم نے بردار و خندق کے روز و لشکر اتارے تھے۔ بلکہ فرشتے کی ایک بیچ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ اس جملہ میں ان کی بلاکت کی حقارت کا بیان ہے نیز اس میں رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کا اظہار ہے۔

۱۱۔ ما نافیہ ہے یعنی ہمیں ضرورت ہی نہیں کہ ہم قوم کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کے لشکر کو نازل کریں کیونکہ یہ معاملہ ہمارے لئے بڑا آسان ہے اگر ہم نے آپ کی نصرت اور تائید کے لئے فرشتے نازل کئے ہیں تو اس سے مقصود آپ کو کامیابی کی بشارت دینا اور آپ کو عزت و شرف عطا کرنا تھا نیز آپ کے قلب اطہر کو سکون اور اطمینان بخشنا تھا۔ ارشاد ہے **عَا جَعَلَهُ اللَّهُ الْإِمَامَ فِيكُمْ وَبَنَظْمَتِي قُلُوْبِي كَمَا بَنَى اللَّهُ الْأَمْوَءَ عِنْدَ اللَّهِ** اور انہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ماموصول ہے اور جنت پر معظوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے پہلی نافرمان قوموں پر کبھی پتھر کبھی آندھی اور کبھی تیز بارشوں کا عذاب نازل کیا، ہم نے حبیب کی قوم پر ایسی کوئی چیز نازل نہیں کی بلکہ ایک کڑک نے چشم زدن میں ان کا نام و نشان مٹا دیا۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَبِيحَةً وَاحِدَةً لَقَدْ أَهَمُّ حَمِيدُونَ ﴿٥١﴾

”نہ تھی مگر ایک گرج پہاڑ جو بھیجے ہوئے کو کئے بن گئے۔“

۱۔ صَبِيحَةً کو جمہور قراء نے کان کی خبر کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کان کو تادم بنایا ہے اور صبحہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ جبریل نے شہر کے دروازے کے دونوں کواڑ پکڑ کر زور دار چیخ ماری تو وہ بھیجے ہوئے کو کئے کی طرح ہو گئے (۱) کفار کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ زندگی حرارت غریزہ (فطری) سے قائم ہوتی ہے۔ جب فطری حرارت ختم ہو جاتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ ما انزلنا کے ہلکا کا عطف و جاء من افقنا المدینہ راجل یسعی پر ہے۔ وما کنا منزلین کا جملہ محذوف ہے۔ ان کانت الا صبحہ واحده کا جملہ علت بیان کر رہا ہے۔ اذا پرفاء مسبیہ ہے۔

يُحَسِّرُكَ عَلَى الْعِبَادِ مَا يُأْتِيهِمْ مِنْ رَبِّكَ سُبُلًا إِلَّا كَالْوَابِئِ يُسَازِرُ عُرُونَ ﴿٥٢﴾

”صدافسوس ان بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول نہ سمجھو وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگ گئے۔“

۱۔ عَلَى الْعِبَادِ، حسرة کی صفت ہے۔ اور حسرة کو منادی بنانے سے مقصود عاظمین کو تنبیہ کرنا ہے کہ ان لوگوں پر حسرت و افسوس کرنا واجب ہے۔ حسرة پر بتوین تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی حسرت کی بڑائی بیان کر رہی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اے حسرت تو آ جا یہ ایسی حالت ہے جس میں تیرا حاضر ہونا حق ہے اور وہ حالت یہ ہے جس پر مٹا یا تہیتم من رسولی إِلَّا كَالْوَابِئِ يُسَازِرُ عُرُونَ وادلات کر رہا ہے۔ یعنی اللہ کے نبیوں سے مذاق کرنا ایسی حالت ہے جو افسوس اور حسرت کے اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔

۲۔ استثناء مفرغ ہے اور یاتیہم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا رسول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے استثناء بشرط و اجزاء کے معنی میں ہے، یعنی کلمتا یاتیہم رسول یستہزء ون۔ یہ جملہ حسرت کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ جو لوگ اپنے مخلصوں اور نصیحت گذاروں سے مزاح کرتے ہیں حالانکہ ان سے نسبت اور وابستگی دینا و آخرت کی خیر کا موجب ہے۔ تو ایسے لوگ واقعی حسرت کے مستحق ہیں اور اس لائق ہیں کہ حسرت کرنے والے ان پر حسرت کا اظہار کریں۔ ایسے بد بختوں کی حالت زار پر فرشتے اور جن و انس میں سے مؤمنین حسرت کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حسرت ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو لیکن ان کے جرم کی بڑائی کے اظہار کے لئے بطور استعارہ یہ اسلوب اختیار فرمایا گیا ہو۔ اس قول کی تائید ”یا حسرتا“ کی قرأت کرتی ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں منادی محذوف ہے اور

حسروہ پر نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی یا ایہا المخاطبون تحسروا وحسروہ علی العباد حسروہ انتہائی غم اور ندامت کو کہتے ہیں۔ علامہ بنوری فرماتے ہیں اس کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بے ایمان لوگوں کے لئے فرمائے گا کہ بندوں پر حسرت ندامت اور غم ہو دوسرا قول یہ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کا قول ہے۔ ابو العالیٰ فرماتے ہیں جب انہوں نے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کہا یہا حسروہ علی العباد، العباد پر الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد اظہار کیے کے لوگ ہیں یا ہر وہ شخص ہے جو بھی رسولوں پر ایمان نہ لایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ یا اہل مکہ کو عید سنائی جا رہی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمَا أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٦٠﴾

”کیا انہیں ظن نہیں کہ کتنی امتوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا۔ (اور) وہ (آج تک) ان کی طرف لوٹ کر نہ آئے۔“

لے اَلَمْ يَرَوْا کا معنی الم معلوموا ہے۔ اور یہ کم اہلکنا سے متعلق ہے۔ کیونکہ کم میں اس کا ماقبل فعل عامل نہیں ہوتا اگرچہ وہ کم خبر یہی ہے کیونکہ کم استفہامیہ اصل ہے اور وہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ کَمَا أَهْلَكْنَا کی ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔ یہ جملہ معنی کے اعتبار سے کم سے بدل استعمال ہے۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ وہ ان کی طرف لوٹ کر آئے والے نہیں۔ جب أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ مردے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے تو اس وہم اور شبہ کو زائل کرنے کے لئے قرآن کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَإِنْ كُلُّ لُطْمَآئِجٍ لَّدُنَّا مَحْضُورٌ ﴿٦١﴾

”اور ان سب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔“

ل لَمَّا کو عام اور مزمور نے اس سورت میں سورہ زخرف اور سورہ الطارق میں تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت میں سورہ زخرف کے علاوہ ہر جگہ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے الطارق میں تشدید کی موافقت کی ہے، جب کہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جنہوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان نایہ ہے اور لما بمعنی إلا ہے۔ اور جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان مخففہ من مطلقہ ہے۔ اور لام قارنہ ہے اور ما تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ جِئِبُّمُ بروزن فعلیل بمعنی مفعول ہے۔ اور لَدُنَّا جمیع کی طرف ہے یا محضرون کی طرف ہے۔

وَأَيُّ لُحْمٍ أَلْمِئِصَّةٍ أَوْ حَبِيبَةٍ أَوْ حَرَجًا مِّنْهَا حَبًا قَبِيصَةً يَأْكُلُونَ ﴿٦٢﴾

”اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کر دیا۔ اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتا ہے۔“

ل نافع نے المئصۃ کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ أَحَبِبْتُمَا، الأراض کی خبر ہے۔ آیۃ موصوف لہم صفت ہے۔ پھر یہ موصوف صفت مل کر مبتدا ہے۔ الأراض المئصۃ پھر مبتدا ہے، أَحَبِبْتُمَا اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اس میں پہلے مبتدا ہے لہم کی خبر ہے۔ یا أَحَبِبْتُمَا صفت ہے الأراض کی۔ (اس ترکیب پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ جملہ خبریہ معرف کی صفت کیسے واقع ہو سکتا ہے، جب کہ جملہ مکرہ ہوتا ہے)

مصنف اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ الارض سے کوئی معین زمین مراد نہیں ہے۔ اس لئے یہ نکرہ کے حکم میں ہے (یعنی اس پر الف لام عہد ذہنی ہے جس کا مدخول نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے اس کے ساتھ نکرہ ام جیسے معاملات کے جاتے ہیں) اس کی مثال یہ ہے ولقد امر علی اللہم یسینی (اس مثال میں یسینی اللہم کی صفت واقع ہو رہا ہے کیونکہ اللہم پر الف لام عہد ذہنی ہے۔ یا جو مدخول معرفت میں ہوتا اس لئے یسینی جملہ اس کی صفت ہے) آیت کی یا یہ ترکیب ہے کہ الا درض مبتدا ہے اور ایۃ خبر ہے یا الارض خبر ہے اور ایۃ مبتدا ہے۔ یہ جملہ وان کل لسا پر موقوف ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آجیبیٰ تھا جملہ مستانفہ ہو۔ اور زمین کے نشانی ہونے کو بیان کر رہا ہو (یعنی کوئی سوال کرتا ہے کہ زمین کیسے نشانی ہے تو اس کے جواب میں فرمایا آجیبیٰ تھا) مع حیۃ سے مراد جنس خب (دانہ) ہے مثلاً گندم جو وغیرہ کے دانے۔ منہ کی ضمیر کا مرجع حب ہے، ہا کلون کے صلا (مت) کو مقدم فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ سب سے بڑی چیز جس کو کھا یا جاتا ہے اور جس کے ذریعے زندگی بسر ہوتی ہے وہ اناج اور نلہ ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّنْ نَّجِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجْرًا فِيهَا مِنَ الْعِیُونِ ﴿۱۰﴾

”اور ہم نے اگے اس میں باغات سمجھو اور انگوڑوں کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے۔“

۱۔ سمجھو اور انگوڑوں کے مختلف اقسام کے پھل ہوتے ہیں اس لئے ان کو جمع ذکر فرمایا لیکن حب (دانہ) کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ جنس خود مختلف اقسام پر دلالت کرتی ہے، جب کہ نوع ایسی نہیں ہوتی۔ نوع ایک حقیقت کے افراد پر دلالت کرتی ہے۔ نجیل (سمجھو کا درخت) کا ذکر فرمایا بتر (سمجھو کا پھل) ذکر نہیں فرمایا۔ چاہئے یہ تھا کہ تر ہوتا تاکہ پھلوں کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سمجھو کا درخت مزید منافع اور صنعت البیہ کے آثار پر دلالت کرنے ساتھ خاص ہے اس لئے سمجھو کے درخت کا ذکر فرمایا۔ فجورنا فیہا میں ہا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ من العیون میں من بیان ہے۔ شیاء من العیون کے معنی میں ہے۔ موصوف کو حذف کیا گیا ہے اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ انفس کے نزدیک من زائدہ ہے (لیکن یہ مرجوع قول ہے)

لِیَا کُلُّوْا مِنْ شَجَرٍ ۙ وَمَا عَمِلْتُمْ اٰیٰتِیْہُمْ اَفَلَا یَسْتَدْرِیْنَ ﴿۱۱﴾

”تاکہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے، اور نہیں بتایا ہے اس کو ان کے ہاتھوں نے، کیا وہ (ان نعمتوں پر) شکر ادا

نہیں کرتے۔“

۱۔ لیا کُلُّوْا، فجورنا کے متعلق ہے۔ من شجر کی ضمیر کا مرجع (مذکور کے اعتبار سے) جنات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شجر کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ بطریق التفات ہے (یعنی پہلے منکلم کے صیغے استعمال کے لئے پھر غائب کی ضمیر ذکر فرمادی) معنی یہ ہوگا کہ تاکہ وہ کھائیں جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں میں سے پیدا فرمائے۔ حزرہ اور کسائی نے شجر کو ثناء اور ہم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک نکت یا شمار کی جمع ہے۔

۲۔ حزرہ کسائی اور ابو بکر نے عملت، یعنی بغیر ضمیر کے پڑھا ہے۔ ماصولہ ہے اور اس کا عطف ثمرہ پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ وہ کھائیں جو وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ یعنی جو وہ پھلوں سے مختلف انداز کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں مثلاً عرق شیرہ وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مانا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ سب پھل اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظہر ہیں، تمہارا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پہلے معنی کی تائید کوئیوں کی قرأت کرتی ہے جو عملت ہے، یعنی ضمیر ساتھ نہیں ہے کیونکہ صلہ سے ضمیر کا حذف کرنا دوسری کلام سے حذف کی

نسبت زیادہ بہتر ہے۔

اس ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ایسکرون انعام اللہ فلا بیشکرون۔ یعنی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے انعام کا انکار کرتے ہیں۔ اور شکر ادا نہیں کرتے شکر کے ترک پر انکار شکر کے حکم کی دلیل ہے، یعنی شکر کرنا چاہئے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَاجْمَعَهَا وَمَا تُحِیْتُ الْاَرْضَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمَا لَا
یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾

”ہر چیز کے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفوس کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جنہیں وہ (ابھی) نہیں جانتے۔“

لِ الْاَرْضِ وَابِیْہ سے مراد مختلف انواع و اصناف ہیں۔ ما نسبت الارض نباتات اور درخت وغیرہ میں سے جو زمین اگاتی ہے۔ مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی مذکر مونث وَمَا لَا یَعْلَمُوْنَ وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بحر و بر میں پیدا فرمایا ہے اور ابھی تک جن پر کوئی شخص مطلع نہیں ہے۔

وَ اٰیۃ لِّہُمُ الْبَیِّنٰتُ ۙ نَسْلَخُ مِنْۢہَا لَیْلًا فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۷۱﴾

”اور دوسری نشانی ان کے لئے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو تو کھلتا تھا وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔“

لِ یعنی ہماری قدرت کاملہ کی ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو اتار لیتے ہیں۔ یعنی اصل تاریکی ہے اور سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ اس تاریکی پر دن کا اجالا چڑھ جاتا ہے پھر جب سورج غروب ہوتا ہے۔ دن کو رات سے اتار لیتے ہیں اور تاریکی ظاہر ہو جاتی ہے۔ انسلخ یہاں نسلخ الجلد سے مستعار ہے۔ جس کا معنی کبریٰ کی کھال اتارنا ہے۔ ترکیب میں یہ آیت سابقہ آیت کی طرح ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ کا عطف نَسْلَخُ مِنْۢہَا لَیْلًا ہے۔ یعنی جب رات آتی ہے تو فوراً تاریکی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دن جاتا ہے اور رات آتی ہے۔

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِسَبْعِیْنَ نَجْمًا ۗ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۷۲﴾

” (یہ) آفتاب ہے جو چتر ہوتا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف یہ لہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اس (خدا کا) جبروت (اور) علم ہے۔“

لِ مستقر مصدر تسمی یا اسم مکان ہے۔ یعنی سورج کے چلنے پر ایک مخصوص نبع پر اس کا استقرار مرتب ہوتا ہے (اس طرح کہ ہر برج میں ایک مہینہ اس کا استقرار ہوتا ہے) اور گرہوں میں اپنے ارتفاع کی انتہا کو پہنچتا ہے اور سردیوں میں اپنے انخفاص کی نہایت کو پہنچتا ہے۔ یعنی سورج چلتا ہے کہ اس کا ارتفاع و انخفاص ایک حد تک میں ہو۔ اس صورت میں مستقر سے پہلے لام عاقبت کے لئے ہوگا) اسم مکان کی صورت میں مسمیٰ یہ ہوگا یہ اپنے استقرار کی جگہ کی طرف چلتا ہے۔ اس کو مسافر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ مسافر جب سفر کرتا ہے تو اپنی منزل سے تیار نہیں کرتا، اسی طرح سورج بھی اپنے مدار اور منازل سے تیار نہیں کرتا۔ یا اس مستقر سے مراد آسمان کا وسط ہے۔ چونکہ اس مقام پر سورج کی حرکت انتہائی سست ہو جاتی ہے اور اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ٹھہرا ہوا ہے یا مستقر سے مراد

گرمیوں میں آسمان کے اندر اس کی بلندی کی نہایت ہے اور سردیوں میں اس کے نزول کی انتہا ہے۔ یا مستقر سے مراد ہر روز کا مشرق و مغرب میں مقدر مٹھنی ہے۔ کیونکہ سورج کے سال میں تین سو پینسٹھ مشرق و مغرب ہیں۔ ہر روز نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے اور نئے مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ آنے والے سال تک پہلے جس مطلع سے طلوع ہوتا ہے پھر کبھی وہاں سے طلوع نہیں ہوتا۔ یا مستقر سے مراد دنیا کی تباہی کے وقت اس کے طلعے کا اختتام ہے۔ یہ سب تاویلات اس بات پر مبنی ہیں کہ ظاہر اسی وقت سورج کو قمر انہیں ہے اور عبداللہ کی قرأت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ سورج کو قمر انہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو علامہ بغوی نے عمر بن دینار بن عباس کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ آپ والشمس لا مستقر لہا پڑھتے تھے (1)۔ لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت فرمایا ہے (2)۔

علامہ بغوی نے حضرت ابوذر کے حوالہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوذر جب سورج غروب ہوتا ہے تو تجھے معلوم ہے یہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا یہ جاتا ہے تا کہ عرش کے نیچے سجدہ کرے پھر اجازت طلب کرتا ہے تو اسے مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے۔ عنقریب یہ سجدہ کرے گا لیکن اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا یہ اجازت طلب کرے گا اور اس کو اجازت نہیں ہوگی۔ حکم ہوگا جہاں سے آیا ہے وہاں لوٹ جا پس سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَالشَّمْسُ شَجُورٌ يُنتَقِلُ لَهَا كَمَا يُبْتَغَى الْمَطْلَبُ ہے (3)۔ فرمایا اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے (بخاری و مسلم) حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد اور طلوع ہونے سے پہلے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن ملتا ہے تو طلوع ہو جاتا ہے۔ عنقریب اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن نہیں ملے گا تو وہ اس وقت مغرب سے طلوع ہو جائے گا اور یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ اعتراض نہ لیا جائے کہ سورج کے غروب ہونے کے وقت سے طلوع ہونے تک رات کی مقدار مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے حتیٰ کہ قطب شمالی کے بلغار کے چھپے جب راس سرطان کے پاس ہوتا ہے رات کا وقت بالکل مختصر ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہاں عشاء کی نماز کا وقت پایا ہی نہیں جاتا بلکہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ایک طرف شفق غروب ہوتا ہے تو دوسری جانب صبح طلوع ہو جاتی ہے تو ایسی صورت حال میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرنے کے لئے جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سورج کے غروب ہونے سے لے کر طلوع ہونے تک سورج کا سجدہ کرنا مراد نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت رات کی تاریکی تمام ممالک پر چھائی ہوئی ہو اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب سورج اپنے نصف سبز ہوتا ہے۔ اس وقت فرشتے سورج کو عرش کے نیچے لے جاتے ہوں اور وہ وہاں سجدہ کرتا ہو پھر اس کو طلوع ہونے کا اذن مل جاتا ہو۔ مختلف ممالک میں رات کی مقدار مختلف ہونا رات کے مبداء اور منتہی کے اختلاف سے متعلق ہے اور یہ کبار دست نہیں ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے یا سجدہ سے مراد صرف اطاعت و اعتقاد ہے۔ کیونکہ سیاق حدیث اس کی تائید نہیں کرتا۔

یہ اس انداز میں سورج کا چلنا جس میں بے شمار ایسی حکمتیں مضمحل ہیں جن کا اور اک عقل انسانی سے وراہ ہے۔ اس انداز کا چلانا اس ذات کی طرف ہے جو ہر مقدر پر قادر ہے۔ ہر معلوم کا اپنے علم سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

وَالْقَمَرَ فَقَدْ رَأٰهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْوَةِ الْقَدِيمِ ﴿۳﴾

”اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لئے منزل میں آخر کار ہو جاتا ہے کھجور کی بوسیدہ شاخ کی مانند۔“
 لہذا القمروا بن کثیر تابع ابو عمرو نے القمیس پر معطوف ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، یعنی تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ایہ لہم الشمس و ایہ لہم القمر اور القمور کے بعد والا جملہ ترکیب میں اسی طرح ہے جس طرح القمیس کے بعد والا جملہ ہے۔ باقی قراء نے القمروا فضل ضمیر کی بناء پر منصوب پڑھا ہے جس کی تفسیر بعد والا فضل کر رہا ہے۔ یعنی القمر سے پہلے قدرنا مزدوف ہے۔ چاند کی انھما کش منازل ہیں، ہر رات ایک منزل میں اترتا ہے، نواہر اور سمر کرتا ہے اور ناپے مقررہ وقت پر پہنچنے میں تاخیر کرتا ہے۔ پھر جب آخری منازل میں ہوتا ہے تو انتہائی باریک قوس نما ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بوسیدہ میزھی منی کی طرح ہو جاتا ہے اور زمینے کی آخری راتوں میں سورج کی شعاعوں کے نیچے چلا جاتا ہے۔ القدمیم سے مراد پرانی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد ایسی ٹہنی ہے جس پر سال یا سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہو۔

لَا الشَّمْسُ يَمِينِي كَمَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْبَيْلُ سَائِبِي النَّهَابِي ط وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ
 يَبْسُطُونَ ⑤

”نہ سورج کی یہ چال کہ (پچھے سے) چاند کو آ پکڑے اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ دن سے آگے نکل جائے۔ اور سب (سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں۔“

۱۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں چلنے کی تیزی میں سورج چاند کو نہیں پہنچ سکتا (۱)۔ امام بیضاوی کا یہ قول فلاسفہ کے قول پر مبنی ہے کیونکہ انکا نظریہ یہ ہے کہ چاند سورج سے انتہائی تیز رفتار ہے۔ چاند کا دورہ ایک مہینہ میں مکمل ہوتا ہے، جب کہ سورج کا دورہ اپنے سال میں مکمل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک معاملہ اس کے جیسا کہ آئندہ بیان کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ بہتر یہ ہے کہ ادراک کو تیز رفتاری کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کی مخصوص رفتار میں نہیں پہنچے گا حتیٰ کہ دونوں کا چلنا ایک جیسا ہو جائے۔ کیونکہ چلنے میں ان کا متحد ہونا نباتات و حیوانات کی نشوونما اور زندگی میں خلل کا باعث بنے گا۔ یا یہ کہا جائے کہ سورج منافع اور آزار میں چاند کو نہیں پہنچ سکتا یا یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کے مکان میں نہیں پاسکتا (یعنی سورج اس کی منازل میں اتر آئے اور جہاں چاند چلے سورج بھی وہاں چلے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر ایک کا فلک مقرر ہے۔ چاند آسمان دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان پر ہے) یا یہ کہا جائے کہ سورج کے لئے ممکن نہیں کہ چاند کی سلطنت اور اس کے نوری شعاعوں میں جمع ہو جائے اور اس کے نور کو ختم کر دے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ القمیس سے مراد دن ہو اور رات ہو۔ یعنی دن کے لئے صحیح نہیں کہ رات سے سہقت لے جائے۔ اور یہ رات کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دن سے سہقت لے جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے وقت پر آگے پیچھے آتا ہے۔ کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں آتا۔ علامہ بغوی کے کلام سے یہی مستفاد ہے۔

۲۔ کئی پر توین مضاف الیہ کے عوض میں ہے یعنی کل واحد منھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی تقدیر کلہم ہے اور ضمیر کا مرجع سورج اور چاند ہیں۔ کیونکہ احوال کا اختلاف ذات میں متعدد ہونے کا موجب ہے اگرچہ بالاعتبار ہی ہو۔ یا ضمیر کا مرجع ستارے ہیں کیونکہ چاند اور سورج کے ذکر سے انکا بھی شعور ملتا ہے (۲)۔ یعنی سب ستارے آسمان دنیا میں تیر رہے ہیں جس طرح چھٹی پانی میں

تیری ہے اور ستاروں کے آسمان دنیا میں ہونے کی دلیل پر ارشاد ہے۔ **رُؤْيَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَا يُرَىٰ**۔

یہ آیت کریمہ صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ سورج، چاند اور ستارے سب فرشتوں کے ذریعے یا بلا ارادہ چل رہے ہیں، کیوں کی طرح ایک جگہ آسمان میں سرکھڑکتی ہیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ سب سیارے آسمان میں ایک جگہ جڑے ہوئے ہیں اور آسمان کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ فلاسفر اپنے نظریہ پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ تیرنا فلک کے پھینکنے اور جڑنے کو مستزم ہے اور ان کے نزدیک آسمانوں کا پھینکا اور جڑنا محال ہے۔ فلاسفر سیاروں کی حرکات کے تعدد سے آسمانوں کے تعدد پر استدلال کرتے ہیں یعنی کو ایک کی حرکات کے برابر افلاک ہیں۔ وہ کہتے ہیں آسمان سات ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے بیاز کے پھینکنے جڑے ہوئے ہیں اور انہیں آسمان کو تمام کی حد قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک منقطع اور قطبوں پر حرکت کر رہا ہے اس حیثیت سے اس کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل ہوتا ہے۔ باقی آسمان اس کی حرکت سے چلتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی طبعی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف دوسرے منقطع اور دوسرے قطبوں پر ہے۔ اس طرح فلک الثوابت کے دو قطبوں اور فلک الافلاک (نواں آسمان) کے دو قطبوں کے درمیان تقاطع حاصل ہوتا ہے۔ سورج فلک الثوابت کے منقطع کو لازم ہوتا ہے اور فلک الثوابت کا منقطع بارہ حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں سے ہر حصہ کو برج کہا جاتا ہے، اس فلک کو فلک البروج بھی کہتے ہیں۔ یہ انہوں نے اس لئے کہا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ کوکب اپنی چال کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل کرتے ہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ سات سیاروں کے علاوہ تمام سیارے ایک دوسرے سے نسبت میں مختلف نہیں ہیں، ان کی رفتار ایک دن اور ایک رات سے تھوڑی کم ہوتی ہے اور وہ کئی انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ تمام کے ساتھ سیارے ایک آسمان یعنی آسمان آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور اسی آسمان کا نام فلک البروج بھی ہے اور ان کا چلنا نہ چلنے کی مانند ہے اسی لئے اس کو ثوابت کہتے ہیں اور ان ستاروں کے فلک کو فلک الثوابت کہتے ہیں پھر جب انہوں نے دیکھا کہ سات ستارے جن کی چال ایک دن اور رات سے کم ہوتی ہے کیونکہ چاند تیس یا تیس دنوں میں دائرہ مکمل کرتا ہے اور سورج تین سو چھتیس دن یا تین سو چونسٹھ دن میں اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے اور اسی طرح دوسرے سیارے ہیں اور سات سیارے تمام کے تمام مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی چال کو ایک دن اور ایک رات سے ناقص دیکھا جاتا ہے۔ جب انہوں نے ان کی چال کو دائرہ سے کم یا زیادہ دیکھا تو ان کی چال کے تیز ہونے کا قول کیا اور کہا کہ چاند فلک تیز ہے کیونکہ چاند ایک مہینہ میں دائرہ کو قطع کرتا ہے اور سورج تین سو چھتیس دن میں لگتا ہے، اسی طرح وہ تمام ستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔ اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ پانچ سیارے عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، اور زحل ان کی چال کبھی دائرہ سے زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی دائرہ کے برابر ہوتی ہے تو ان کو خسہ متحیرہ کہتے ہیں اور ان کے لئے میر کی تدبیرات ثابت کرتے ہیں اور پرانی دلیریک ہیریجے دالی سیر کے مخالف ہے۔ ان سب چیزوں کو علم ہیئت میں بیان کیا گیا ہے۔

جب نصوص قطعیہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان کی تعداد سات ہے، اس سے زائد نہیں ہے (اسی وجہ سے اس تعداد کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے) نیز نصوص قطعیہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ افلاک میں خرق و التیام بھی جائز ہے، اس کے منکر کو بھی کافر کہا جاتا ہے۔ آسمان کے پھینکنے کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے **إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۖ وَإِذَا السَّمَاءُ كُفِّرَتْ ۖ وَإِذَا السَّمَاءُ كُفِّرَتْ ۖ** اور اسی طرح کی دوسری آیات اور احادیث طیبہ بھی دلالت کرتی ہیں کہ آسمان ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے

درمیان فاصلہ ہے۔ جو ان کا فاصلہ تسلیم نہ کرے وہ فاسق ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت بیان فرمائی ہے (1)۔ ترمذی اور ابو داؤد نے عباس بن عبدالمطلب سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان مسافت اکہتر ہجرت سال بیان فرمائی (2) (شاید یہ اختلاف چلنے والوں کی چال کے اعتبار سے ہو، کیست اور کئی تیز چلتے ہیں) ان احادیث کی بناء پر علم ہیئت کے بطلان کا قول ثابت ہو جاتا ہے۔ جو علم ہیئت پر اعتقاد اور یقین رکھے اس پر کتاب و سنت کے انکار کی وجہ سے کفر کا اندیشہ ہے۔ جب آسمانوں میں خرق و التعمیر کا جواز ظاہر ہو گیا تو کوئی حرج نہیں کہ یہ کہا جائے کہ تمام سیارے آسمان دنیا میں ہیں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے **وَرَبُّنَا اللَّهُمَّا لَهُ يَخْصَىٰ**۔

اور سب سیارے اپنے فاصلے میں تیز ہے ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر کی یہ تقریباً دائرہ و دائرہ تامہ ہے اور یہ مقدار ایک سے اور سات ستاروں کی سر مختلف مقدار پر ہے جیسا کہ ملاحظہ کیا گیا ہے اور یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ پانچ ستاروں کی چال کبھی تیز اور کبھی ناقص ہوتی ہے جیسا اللہ تعالیٰ اراد فرماتا ہے پانچ ستاروں کو انفس الجواری لکنس کہا گیا ہے، حقیقت حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَاٰیةٌ لَّهُمْ اَنَّا خَلَقْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِّ الْمُسْحُوٰنِ ﴿۱۰﴾

”اور ایک نشانی ان کے لئے یہ بھی ہے کہ ہم نے سوار کیا ان کی اولاد کو ایک کشتی میں جو مری ہوئی تھی۔“

۱۰ اہل مدینہ اہل شام اور یعقوب نے ذریاتہم (یعنی بیع) اور قناء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد اور قناء کے فخر کے ساتھ پڑھا ہے۔ المسحون وہ جو مری ہوئی ہو۔ ذریت سے مراد ان کی اولاد ہے جو تجارت میں ان کی اجماع کرتے تھے۔ یا اپنے اور ان کی عورتیں مراد ہیں جو ان کے ساتھ رہتے تھے۔ عورتوں پر بھی ذریت کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ ذریت کی پرورش کرتی ہیں اور حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ عورت کو بیٹا نو فرمایا یہ تو جنگ اور قتال کے اہل ہی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نالد کی طرف پیغام بھیجا کہ عورتوں اور مردوں کو قتل نہ کرو۔ اس حدیث میں ذریت سے مراد عورت ہے اور یہ ارشاد آپ ﷺ نے مقتولہ عورت کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذریت کا استعمال عورت کے لئے کیا ہے فرمایا **سَخَّوْا بِالذَّرِيَّةِ لَا تَأْكُلُوْا اَرْزَاقَهَا وَ قَدْ وُؤَا اَرْزَاقَهَا فِيْ اَعْنَاقِهَا** یعنی عورتوں کے ساتھ جرم کرو۔ کذا فی تھامیہ۔ اور الفلک سے مراد چھوٹی بڑی کشتیاں ہیں۔ ذریت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ ان کا کشتیوں میں بیٹھنا مشکل ہوتا ہے اور کشتیوں میں ان کا جانا ہرنا عجیب ہوتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں فلک سے مراد سفینہ نوح ہے (3) اور ذریت سے مراد آباء ہیں اور ذریت کا اطلاق آباء پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اطلاق اولاد پر ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فلک سے سفینہ نوح مراد لینے کی صورت میں (4) آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آباء کو سوار کیا اور موجود لوگوں اور ان کی اولاد کو ان آباء کی پشتوں میں اٹھایا اور خصوصیت کے ساتھ ذریت کا ذکر احسان جملانے میں زیادہ بلیغ ہے اور بجا زوا اختصار کے ساتھ ساتھ توجہ انگیزی میں اس کا زیادہ دخل ہے۔

وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۱۱﴾

1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (فاروقی)
2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 167 (فاروقی)
3- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 8 (انجاریہ)
4- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کاررونی، جلد 4، صفحہ 435 (المنکر)

”اور ہم نے پیدا کیں ان کے لئے اس کشتی کی مانند اور چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ل۔“
 ل۔ منغلہ کی غیر کارآمد مطلق کشتی ہے یا کشتی نوح ہے۔ یعنی کشتیوں کی مانند یا نوح کی کشتی کے مثل ہم نے ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں مثلاً اونٹ وغیرہ۔ کشتی پانی کے لئے ہوتی ہے اور اونٹ صحرا کے جہاز ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ نوح کی کشتی کی مثل دوسری چھوٹی بڑی کشتیاں پیدا کی ہیں۔

وَإِنْ تَسْأَلُهُمْ فَلَا صَرِيحَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٠﴾

”اور اگرچہ ہم نے ان کے لئے کشتیاں پیدا فرمائی ہیں۔ لیکن اگر ہم انہیں ڈبونا چاہیں تو کوئی ان کو فراتاب ہونے سے بچانے نہ سکے گا۔ فلا صریح محذوف شرطی جزاء ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان لغو فہم فلا صریح یا یہ معنی کہ ہم ڈبویں گے تو آواز بھی نہ نکال سکیں گے۔ لَا يَتَّقُونَ کا عطف لَا صَرِيحَ لَهُمْ پر ہے۔ یعنی فرق ہونے سے بچانے نہ جا سکیں گے ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔“

إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٦١﴾

”بجز اس کے کہ ہم ان پر رحمت فرمائیں اور انہیں کچھ وقت تک لطف اندوز ہونے دیں ل۔“
 ل۔ استثناء مفرغ ہے اور علت کی بناء پر منسوب ہے۔ حین سے مراد وہ مدت ہے جو ان کی عمروں کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٢﴾

”اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ڈرو (اس عذاب سے) جو تمہارے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تاکہ تم پر رحم کیا جائے ل۔“

ل۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ما بین ایدیکم سے مراد آخرت ہے۔ یعنی آخرت کے لئے عمل کرو اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد دنیا ہے۔ پس اس سے محتاط رہو اور اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ سے مراد وہ حادثات ہیں جو گذشتہ قوموں کو پیش آئے اور ما خالفکم سے مراد عذاب آخرت ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آسمان اور زمین کے عذاب مراد ہیں جیسے ارشاد ہے۔ أَلَمْ نَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ قَبْلَ السَّاعَةِ إِلَّا رِجْسٌ لِّ

بعض علماء فرماتے ہیں عذاب دنیا اور عذاب آخرت مراد ہے۔ بعض اس کا برعکس فرماتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں پہلے اور پچھلے گناہ مراد ہیں۔ اذکا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے واذقا قبل لهم اتقوا اعرضوا یعنی جب انہیں تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے یا عذاب الہی سے ڈرنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ جواب محذوف کا قرینہ آئندہ آتے ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِنَا إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٦٣﴾

”اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانہوں سے مگر وہ اس سے ردگردانی کرنے لگتے ہیں ل۔“

ل۔ پہلا میں نئی کی تاکید کے لئے زائد ہے۔ اور دوسرا تعبیضیہ ہے۔ استثناء مفرغ ہے جیسا کہ الاکانوا بہ یستہزنون استثناء مفرغ تھا۔ یہ آیت کریمہ۔ واذقا قبل لهم اتقوا کی علت بیان کر رہی ہے۔ جملہ شرطیہ یعنی واذقا قبل لهم اپنے معطوف علیہ یعنی

وامانتاہم من آية سئل كرمياتہم من رسول پر معطوف ہے۔

وَإِذْ أَقْبَلْتُمْ آلَ مُوسَىٰ وَأَمَّا رَبٌّ فَأَقْبَمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا
أَنْظِعْهُم مِّنْ لَّوَيْسَاءِ اللَّهِ آصْحَابَةَ إِنَّكُمْ إِلاَّ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

”اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے تو کافر کہتے ہیں اہل ایمان کو کیا ہم انہیں کھانا کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔ (اے نا اچھا!) تم تو بالکل بیک گئے ہو۔“

ل۔ وَإِذْ أَقْبَلْتُمْ كاعطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ یعنی مومنین کفار مکہ کو مساکین پر خرچ کرنے کو کہتے تو وہ یہ جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت کے باوجود انہیں مال نہیں دیا تو ہم بھی مشیت الہی کی موافقت کرتے ہیں، ہم بھی ان کو عطا نہیں کرتے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب قریش کے مشرکوں سے مومنین فقراء کو کھانا کھلانے کی اپیل کی گئی تو انہوں نے یہ کہا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت انس سے اور عبد بن حمید اور ابن المنذر نے اسماہیل بن خالد سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کفار کا یہ قول باطل اور مردود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بطور امتحان بعض لوگوں کو رزق کی فراوانی عطا فرمائی اور بعض کو تنگدستی اور معاشی بد حالی سے دوچار کیا۔ فقیر کو اللہ تعالیٰ کا مال و دولت نہ عطا کرنا بخل کی وجہ سے نہیں اور غمی کو غربا اور خشت حال لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم دینا مالی احتیاج کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مخلوق کی آزمائش ہے اور اس میں اس کی کئی حکمتیں کافر باہمیں۔ اس کے افعال کی ہر حرکت کو عقل انسانی اور کافر نہیں کر سکتی۔

۷۔ کفار نے کہا تم ہمیں مشیت الہی کی مخالفت کا حکم دیتے ہو تو تم کھلی گمراہی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفار کو جواب ہو۔ یا مومنین نے کفار کو جو جواب دیا اس کی حکایت ہو۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

”اور کافر کہتے ہیں یہ وعدہ کب آئے گا اگر تم سچے ہو (تو اس کا مقررہ وقت بتا دو)۔“

ل۔ الْوَعْدُ سے مراد قیامت اور دوبارہ اٹھنا ہے۔ اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے اور استفہام استبطاء (یعنی تاخیر کا سبب پوچھا جا رہا ہے) کے لئے ہے۔

۷۔ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ قیامت ضرور آئے گی تو ہمیں اس کے آنے کا وقت بتاؤ۔ ان شرطیہ سے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ فابنوبنوا ناعن وقت ایجابہ بیان کا سوال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین سے ہوتا تھا۔

مَا يَنْظُرُونَ إِلاَّ الصَّيْحَةَ وَآجِدًا تَاتًا حُدُّهُمْ وَهُم يَخْشَوْنَ ۝

”یہ (نا اچھا) نہیں انتظار کر رہے مگر آگرنے کا جو (اچانک) آئیں دیوچے لگی جب وہ بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے۔“

ل۔ مَا يَنْظُرُونَ، بقولون کے قائل سے حال ہے۔ الاصححة واحده، استثناء مفرغ ہے۔ اور مقولت کی بناء پر منصوب ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس صیغہ سے مراد تجھ اولیٰ ہے (۱)۔ اگر یہ کہا جائے کہ کفار تو تجھ (صورت پھونکنا) پر ایمان ہی نہیں رکھتے تو وہ اس کا انتظار کیسے کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ مرتے دم تک گناہوں کو ترک نہیں کریں گے۔

تاتہیم الساعة بغنة وهم لا يشعرون (ترجمہ) آجائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ جب وہ ان باتوں سے نہ رکے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا تو گویا گناہوں کے چھوڑنے کے لئے اس دل ہلا دینے والی کرک کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاخذہم صبیحةً واحدة کی صفت ہے۔ اور ہم ضمیر کا مریخ لوگ ہیں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اسی طرح وہم بخصمون کی ضمیر کا مریخ بھی لوگ ہیں اور ہم بخصمون، تاخذہم کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی قیامت اس طرح اچانک آجائے گی کہ وہ نذیوں میں خرید و فروخت اور بازاروں میں معاملات زندگی میں بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے، انہیں ان کی آمد کا تصور بھی نہ ہو گا کہ اچانک آجائے گی۔ بخصمون اصل میں بخصمون تھا۔ خاء کو ساکن کر کے ص میں ادغام کیا گیا۔ اور پھر عام ابن ذکوان کسائی کی قرأت پر القاعے ساکنین کی وجہ سے خاء کو کسرہ کر دیا گیا۔ ابن کثیر، ورش، ہشام اور یعقوب نے خاء کی حرکت نقل کر کے خاء کو دینے کی وجہ سے بقتحة خاء اور ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمرو نے خاء کے فتح کے اختلاس اور صا کی شدت کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے اسی طرح بھی پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے خاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا ابو جعفر اور قالون نے القاعے ساکنین جائز قرار دیا ہے، جب کہ وہ اس حرف مدغم ہو۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اس حال میں قائم ہوگی کہ وہ آدمی کپڑے کی خرید و فروخت کے لئے اس کو پھیلانے ہوئے ہوں گے۔ ابھی سودا نہ ہوا ہوگا اور اس کپڑے کو لپٹا نہ ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دودھ کر لائے گا، اس کو استعمال کرنے سے پہلے قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک شخص اپنے من میں لقمہ ڈالنے کے لئے اٹھائے گا، اس کے کھانے سے پیشتر قیامت واقع ہو جائے گی۔ فریابی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے اور کپڑوں کی پیمائش کر رہے ہوں گے، اپنی اونٹنیوں کا دودھ دودھ رہے ہوں گے اور اپنی حواج میں مصروف ہوں گے کہ قیامت برپا ہو جائے گی (1)۔

فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿٥٠﴾

”پس نہ وہ (اس وقت) کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر آسکیں گے۔“

۱۔ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ کا عطف تاخذہم پر ہے۔ اور رابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فلا يستعجلون بعدھا۔ فاء سببہ ہے۔ عبد اللہ بن احمد نے زوائد میں زبیر بن عوام سے روایت کیا ہے فرمایا قیامت برپا ہو جائے گی، جب کہ ایک شخص کپڑے کی پیمائش کر رہا ہوگا ایک شخص اونٹنی کا دودھ دودھ رہا ہوگا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لا يستعجلون تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ۔ یعنی لوگ کسی کام کی وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور اپنے گھر والوں کا حال دیکھنے کے لئے گھر والوں کے پاس پہنچ ہی نہ سکیں گے بلکہ جو نبی جج کی آواز میں گھر جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ مَا يَهُمُّ بِهَا سُلُوكٌ ﴿٥١﴾

”اور (دوبارہ جب) صور چوکا جائے گا تو غوراوہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جائے

گیں گے۔“

وقت اٹھ کر قیامت کا منظر دیکھیں گے تو ہلاکت کو پکاریں گے۔ حضرت ابن عباس کا یہ قول معتزلہ کے عقیدہ کو باطل کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آیت عذاب قبر کی لٹی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آیت تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ سونے والوں کی طرح تھے اور علماء معانی فرماتے ہیں کفار جب جہنم کے مختلف عذاب دیکھیں گے تو ان کے مقابلہ میں قبر کا عذاب انہیں نیند کی طرح محسوس ہوگا۔ اس وقت وہ کہیں گے ہمیں کسی نے ہماری خواہگاہیوں سے بیدار کر دیا

ہذا مبتدا ہے اور ما وعد الرحمن خبر ہے۔ ما مصدریہ بمعنی مفعول ہے یا موصولہ ہے اور ابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی هذا ما وعد به الرحمن صدق فیہ المرسلون۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ صدق المرسلون بملہ متاخذ ہو اور یہ سابقہ جملہ پر مطوف ہو۔ یہ انکار اقرار ہے، جب کہ اس وقت اقرار و تسلیم کا کوئی قاعدہ نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ ملائکہ کا قول ہے جو کفار کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے۔ جہاد فرماتے ہیں یہ کفار کے جواب میں مومنین کا قول ہے۔ لیکن جواب کے انداز میں ذکر نہیں کیا گیا (چاہئے تو یہ تھا کہ اس طرح ہوتا یعنی المرحمون) اس کی وجہ ان کا انکار یا دلدانا ہے اور انہیں اس کفر کے اختیار پر جھجھکنا اور زجر کرنا ہے اور اس بات پر بھیہ کرنے کے لئے ہے کہ بعنکم الرحمن و عدمک بالبعث و ارسال الیکم المرسل فصد قومک یعنی تمہیں رضی نے اٹھایا ہے جس نے تم سے دوبارہ اٹھنے کا وعدہ کیا تھا اور جس نے وہ رسول بھیجے تھے جنہوں نے تمہیں سچی باتیں بتائی تھیں۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے جس طرح تمہارا خیال ہے کہ اس نے سونے والے کو اٹھا دیا نہیں تمہیں اٹھانے والے کے متعلق نہیں پوچھنا چاہئے بلکہ تمہیں بعث کے متعلق پوچھنا چاہئے جو بعث اکبر ہے، بڑا ہونا ک منظر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہذہ مرقندا کی صفت ہو اور ما وعد الرحمن مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ یا ما وعد مبتدا اور خبر محذوف ہو، یعنی اس طرح ہو ما وعد الرحمن حق (جو زمین نے وعدہ فرمایا وہ حق ہے) اس تاویل کی صورت میں مرقندا پر سکتے یا وقف مناسب نہ ہوگا)

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً لَقَدْ أَهْمُ جَبِيَّةٌ لَدَيْنَا مَحْضَرُونَ ﴿٥٦﴾

”نہیں ہوگی مگر ایک زوردار کڑک بھر وہ فوراً سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔“

۱۔ آخری لفظ کے وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔ ان کے قبروں سے اٹھانے اور میدان حشر میں جمع کرنے پر وقت اور اسباب درکار نہ ہوں گے۔ ایک زوردار کڑک آنے کی اور سب بارگاہ الوہیت میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم ظہیر کی طرح جَبِيَّةٌ لَدَيْنَا پہلی خبر ہے اور مَحْضَرُونَ دوسری خبر ہے۔ اس جملہ میں بعث اور حشر کی ہولناکی کو بیان کیا جا رہا ہے نیز یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعث اور حشر ان اسباب پر منحصر نہ ہوگا جن اسباب کا وہ مختلف امور میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

قَالِيَوْمَ مَرَأَتْكُمْ أَنْفُسٌ سَيِّئَةً وَلَا تَجْرُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٧﴾

”پس آج نہیں ظلم کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور نہ ہی بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے۔“

۱۔ معاملہ کی تصویق اور نفوس میں راسخ کرنے کے لئے اس بات کو بیان کیا گیا ہے جو انہیں قیامت کے روز بھی جائے گی۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكُهُونَ ﴿٥٨﴾

”بیشک اہل بہشت آج (حسب مراتب) اپنے اپنے شغل سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔“

۱۔ ابن کثیر نافع اور ابو عمرو نے شغل کو زمین کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے زمین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں

ہیں جیسے السخمت اور السخمت۔

شعل کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عباس فرماتے ہیں باکرہ (کنواری) عورت سے محبت مراد ہے۔ وکعب بن الجراح فرماتے ہیں ساع مراد ہے۔ کلبی کہتے ہیں شغل سے مراد یہ ہے کہ وہ دوزخیوں سے بالکل غافل ہوں گے اور جس معیبت میں دوزخی مبتلا ہوں گے اس کا انہیں کوئی خیال تک نہ ہوگا اور نہ وہ دوزخیوں کو یاد کریں گے۔ الحسن فرماتے ہیں وہ جنت کی نعمتوں میں اس طرح گمن ہوں گے کہ دوزخیوں کے عذاب سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ ابن کیمان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زیارت کرنے والے اور اللہ کی مہمان نوازی میں مصروف ہوں گے (۱)۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ جس چیز کو پسند کریں گے اس میں مشغول ہوں گے۔ بلند مرتبہ صوفیاء اگر احسن کا مقصود صرف اور صرف اللہ ہوتا ہے وہ اپنے اپنے مدارج کے تجلیات میں مستغرق و منہمک ہوں گے اور دوسرے لوگ اپنے اپنے ذوق اور رغبت کے مطابق ساع خوشبو کھانا پینا اور جماع میں مشغول ہوں گے۔ ابو نعیم نے ہمارے شیخ طریقت ابو یزید بسطامی کا قول نقل فرمایا ہے کہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص بندے ہیں اگر انہیں دیدار جمال الہی سے روک دیا جائے گا تو وہ جنت میں اس طرح آہ و فغاں کرنا شروع کر دیں گے جس طرح جنینی آگ سے نکلنے کے لئے چیخ و پکار کریں گے۔ شغل کی تنگی اور اس کے ابہام میں اس مقام سرور اور تلذذ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے، جس میں اللہ کے نیک بندے فائز ہوں گے اور اس بات پر حسیہ ہے کہ یہ شغل اتنا فریج اور بلند ہے کہ عقل انسانی اس کا ادراک اور تصور بھی نہیں کر سکتی اور اس کی حقیقت الفاظ کے دائرہ سے ورا ہے۔ فاکھون، ان کی دوسری خبر ہے۔ ابو جعفر نے ہر جگہ الف کے بغیر فکھون پڑھا ہے۔ اور حفص نے سورۃ المطففین میں ابو جعفر کی موافقت کی ہے، بغیر الف کے ہو تو اس میں مالد ہوگا۔ باقی قراء نے الف کے ساتھ فاکھون پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الخاذا را اور الخذر ہے۔ اور یہ الفکاهۃ سے مشتق ہے اس کا معنی لطف اندوز ہونا ہے، یعنی جنتی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ نجاہ اور شحاک نے فاکھون کا ترجمہ مجموعاً کیا ہے۔ یعنی جہاں وہ ہوں گے بڑے خوش و خرم ہوں گے۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی فرخون کیا ہے یعنی وہ خوش ہوں گے (۲)۔

هُم وَاَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلِّهِ عَلَى الْأَعْرَابِ لَنْ مَسْكُونٍ ۝۳

”وہ اور ان کی بیویاں سایہ میں (مرح) تختوں پر ٹکی لگائے بیٹھے ہوں گے۔“

۱۔ حمزہ اور کسائی نے ظلال کو بغیر الف کے ظلی پڑھا ہے۔ یہ ظلی کی جمع ہے۔ باقی قراء نے الف اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ظلی کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دھوپ نہ پڑتی ہو جیسے قبة چھتری وغیرہ۔ اور انک جمع ہے اور یکہ کی، اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے میں ہو۔ لغوی نے ثلث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اور یکہ اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے کے اندر ہو (۳)۔ بتیغی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اور یکہ نہ تو صرف مسند کو کہتے ہیں اور نہ صرف پردے کو کہتے ہیں بلکہ دونوں کے مجموعے کو اور یکہ کہتے ہیں۔ بتیغی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ وہ مسند متوں اور یا قوت کی ہوں گی علی الْأَعْرَابِ جابر بن محمد و مَسْكُونٍ کے متعلق ہے۔ ہم مبتدا ہے اور فی ظلی خبر ہے۔ علی الْأَعْرَابِ جملہ متناہ ہے یا مبتدا کی دوسری خبر ہے یا متکون ہم کی خبر ہے فی ظلی اور علی الْأَعْرَابِ خبر کے متعلق ہیں یا ہم ضمیر شعلی میں جو ضمیر ہے، اس کی تاکید کے لئے ہے۔ اور علی الْأَعْرَابِ لَنْ مَسْكُونٍ ان کی دوسری خبر

1۔ تفسیر لغوی، جلد 6، صفحہ 10 (اتحاریہ) 2۔ تفسیر لغوی، جلد 6، صفحہ 10 (اتحاریہ) 3۔ تفسیر لغوی، جلد 6، صفحہ 10 (اتحاریہ)

ہے۔ ازواجہم انکام میں شراکت کی وجہ سے ہم ضمیر پر معطوف ہے یاغی ظلل معطوف اور معطوف علیہ سے حال ہے۔

لَهُمْ فِيهَا كَمَا كَانُوا فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِيهَا مَائِدَةٌ مَعُونَةٌ ﴿٥٦﴾

”ان کے لئے وہاں (طرح طرح کے لذیذ) پھل ہوں گے اور انہیں ملے گا جو وہ طلب کریں گے۔“

یٰۤاَيُّهَا عٰوْنُ دَعَا سے باب استعمال ہے۔ یعنی جو وہ اپنے لئے طلب کریں گے یا یہ عربوں کے قول اذع غلّیٰ عاشت سے شق ہے جس کا معنی ہے جو چاہے تو مجھ سے تمنا کر، یعنی ان کو وہ ملے گا جس کی وہ تمنا کریں گے یا یہ معنی کہ وہ دنیا میں جو کچھ جنت اور اس کے درجات طلب کریں گے وہ ان کو ملیں گے۔ ماموصولہ یا موصولہ ہے اور یہ ترکیبی لحاظ سے مبتدا ہے اور اس کی خبر لہم ہے۔

سَلَّمَ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَجِيمٍ ﴿٥٧﴾

”تم سلامت رہو! (انہیں) یہ کہا جائے گا اپنے رحیم رب کی طرف سے۔“

سَلَّمَ، ما سے بدل ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مایدعون کی خبر یا مبتدا محذوف ہو کی خبر ہو اور اس کی خبر محذوف ہو۔ قولنا مصدر مؤن کد ہے فعل محذوف کا اور من رب، قولنا کی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا یا اس کی طرف سے کہا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر ملائکہ کے واسطے سے یا بغیر واسطہ کے سلام فرمائے گا اور یہ ان کی تعظیم کے لئے ہوگا اور یہی ان کا مطلوب دل ہوگا اور ان کی خواہش ہوگی یا قولنا پر نصب اختصاص کی بناء پر ہے، یعنی بطور مدح اس کو نصب دی گئی ہو۔ ابن ماجہ ابن ابی الندیاء و قطنی اور الازجری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جنتی کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے چائیک اور پے سے نور چمکے گا۔ جب وہ سزا دیا کروئیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کا رب ان پر جھانک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے جنتیو! السلام علیکم اسلام قولنا من رب رحیم سے یہی مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے جب تک وہ دیکھتے رہیں گے جنت کی کسی نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے حتیٰ کہ طوہر شقی پر وہ ناکان اذ طول سے منزہ ہے (یعنی جھانکا اس کی اپنی شان کے لائق ہوگا) علامہ بغوی فرماتے ہیں فرشتے جنتیوں پر ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچائیں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں ملائکہ جنت کے ہر دروازے سے سلام علیکم بنا اهل الجنة من ربکم الرحمن یعطیہم السلّٰتۃ اِلسْلٰتۃ اِلَّا بِدَبِيۡبَةٍ (اے اہل جنت تم پر تمہارے رب رحیم کی طرف سے سلام ہو۔ وہ تمہیں سلامتی عطا فرمائے اور ابدی سلامتی عنایت فرمائے)۔

وَاَمَّا ذٰلِ الْيَوْمِہَا الْمَجْرُمُوْنَ ﴿٥٨﴾

”اور (تکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ۔“

سَلَّمَ، مقاتل سدی اور زجاج فرماتے ہیں مجرم اور انفرمان بندوں کو تکم ہوگا کہ میرے نیکوکار بندوں سے جدا ہو جاؤ، یعنی موئین کو عزت و احترام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور مجرموں کو دوزخ کی طرف لٹکانا جائے گا۔ اس آیت کا عطف سابقہ آیت کے مضمون پر ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں ہر کافر کے لئے دوزخ میں ایک کمرہ ہوگا جس میں وہ داخل ہوگا تو اس کا دروازہ آگ کے ساتھ بند

کر دیا جائے گا پھر وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، نہ وہ کسی کو دکھ سکے گا اور نہ اسے کوئی دوسرا دیکھے گا (۱)۔ ابن جریر ابن ابی حاتم ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت مسور رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتا ہے: دوزخ میں جب اس شخص کو ڈالا جائے گا جس نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے تو ان کے لئے لوہے کے تابوت بنائے جائیں گے جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں بند کیا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نچلے طبقہ میں پھینکا جائے گا۔ ان میں کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ میرے علاوہ بھی کسی کو عذاب ہو رہا ہے۔ ایوب ایم اور بیہقی نے سوید بن غفلہ سے اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

اَلَمْ اَعْبُدْ اِلَيْكُمْ بَيْنِي اَدَمَ اَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۗ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۰﴾

”کیا میں نے تمہیں یہ بتا کر نہیں دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا دشمن ہے۔“

یہ استہمام نکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے یعنی میں نے اپنے رسولوں کے ذریعے تمہیں بتا کر نہیں دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں شیطان کی فرمائندہ داری نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے یہ آیت کریمہ کفار کو مومنین سے جدا کرنے کی علت بیان کر رہی ہے ان مفسرہ ہے آخر میں اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ فرما کر اس کی اطاعت نہ کرنے کی علت بھی بیان کر دی ہے۔

وَ اَنْ اَعْبُدُوْنِي ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۱۱﴾

”اور میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے۔“

اے اَنْ اَعْبُدُوْنِي کا عطف لا تعبدوا پر ہے۔ ہذا کا اشارہ الہی شیطان کی عبادت سے روکنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے یہ جملہ مستانہ ہے جو عہد کی مذکورہ دونوں شقوں (شیطان کی عبادت نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا) کے متخصی کے بیان کے لئے ہے یا دوسری شق (اللہ کی عبادت کرنا) کے متخصی کے بیان کے لئے ہے اور صراط پر تئوں یعنی تکرہ ذکر کرنا مبالغہ اور تعظیم کے لئے ہے یا تحقیر بحضیت کے لئے ہے کیونکہ تو حید صراط مستقیم کا بعض ہے۔

وَلَقَدْ اٰخَصَّلْ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۗ اَقْلَمَ تَلُوْنُوْا نَعْقَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

”(ہاں میں) مگر اہل تزدیا شیطان نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو اہل کیا تم عقل (و خرد) نہیں رکھتے تھے۔“

اے اَخَصَّلْ کا فاعل شیطان ہے۔ جبکہ اوائل مذکورہ اور عاصم نے جیم اور باء کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور لیتقوب نے جیم اور باء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور ابو عمرو نے جیم کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے جیم اور باء کے ضمہ اور بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ یہ تمام اخفات ہیں اور تمام کا معنی مخلوق اور جماعت ہے۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یہاں سے پھر شیطان کی انسان کے ساتھ دشمنی اور اس کی عدوات کے ظہور اور اس کے بھٹکانے کے واضح ہونے کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کے پاس تھوڑی سی بھی عقل موجود ہے اور جو انی سی فراست رکھتا ہے اس کے لئے شیطان کی کارستانی اور دشمنی واضح ہے۔ کیونکہ وہ ازلے بد بخت انسان کو بے حیائی اور برائی پر برا بھینتہ کرتا ہے، خالق رازق نفع نقصان کے مالک کی عبادت کو چھوڑ کر بے جان، بے نفع اور غیر مغز مورتیوں کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کرنے اور خواہش نفس کی پیروی کا حکم دیتا ہے۔

لے یہ استنبہام تو بخ کے لئے ہے، یعنی اس کی اتنی واضح دشمنی کے باوجود تم اس کی عداوت کو نہیں سمجھتے ولقد اضلّ کا جملہ تو بخ کے لئے مقرر شدہ ہے۔

هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿١٧﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٨﴾

”یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا آج اس کی آگ بنا پو اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۔“

ل جب دوزخی آگ کے قریب پہنچیں گے تو انہیں یہ کہا جائے گا۔

الْيَوْمَ نَجِمْ لِيْ اَقْوَامًا مِّنْكُمْ كَمَا اٰيٰتِيْهِمْ وَتَشٰهَدُوْنَ اَنْ جٰلَهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٩﴾

”آج ہم ہر گاہوں کے کفار کے منہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں

(ان بدکاروں پر) جو وہ کیا کرتے تھے۔“

ل اس جملہ میں خطاب سے محبت کی طرف التفات ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ مسکرانے لگے پھر پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس وجہ سے مسکرایا؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا (قیامت کے روز) بندہ اپنے رب سے کہے گا اے میرے رب کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں۔ بندہ کہے گا میں اپنی ذات کے علاوہ اپنے خلاف کسی کی گواہی نہ مانوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کھنیٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيَّكَ شَهِيدًا وَبِالْكَرَامِ الْكَاتِبِيْنَ شٰهُدًا اَ ج تیرے خلاف تیرا نفس اور کرنا کاتبین فرشتے گواہی دینے کے لئے کافی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا پھر اس کے جسم کے اعضاء سے ارشاد ہو گا کہ تم بولو! جن انسان کے اپنے اعضاء اس کے کرتوتوں کے متعلق بول پڑیں گے پھر بندے کو بولنے کی اجازت ہوگی تو وہ اپنے اعضاء سے مخاطب ہو کر کہے گا تمہارا ستیا ناس ہو جائے تم ملیا میٹ ہو جاؤ میں تمہاری طرف سے گھڑ رہا تھا! (اور تم میرے خلاف گواہی دے رہے ہو)

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کا دیدار کریں گے فرمایا کیا دو پہر کے وقت جب کہ کوئی بادل نہ ہو تمہیں سورج کے دیکھنے میں کوئی دقت ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا چودھویں کی رات جب کہ بادل نہ ہو تو تمہیں چاند کو دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا تم سے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اپنے رب کا دیدار کرنے میں تکلیف محسوس نہ کرو گے مگر جتنی کہ سورج اور چاند کو دیکھنے میں محسوس کرتے ہو پھر بندہ پیش ہو گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے فلاں کیا میں نے تجھے عزت کا تاج نہیں عطا فرمایا تھا؟ کیا میں نے تجھے سردار نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تجھے بیوی نہیں عطا کی تھی؟ کیا میں نے تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کر دیئے تھے؟ میں نے تجھے قوم کا رئیس بنایا تھا، تجھے مال نیست کا چوتھائی ملتا تھا۔ بندہ عرض کرے گا مولانا کیوں نہیں یہ سب میری عنایات تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تیرا گمان تھا کہ تو مجھ سے ملے گا بندہ عرض کرے گا میرا تو یہ گمان نہیں تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس طرح تو نے دنیا میں مجھے بھلا دیا اسی طرح آج میں نے تجھے فراموش کر دیا ہے پھر دوسرے بندے سے ملاقات ہوگی اس سے بھی اسی طرح سوال و

جواب ہوگا۔ پھر تیسرے سے ملاقات ہوگی اس سے بھی اسی طرح کارشاد ہوگا۔ تو وہ عرض کرے گا۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ تیری کتاب پر، تیرے رسول پر ایمان لایا، میں نے نماز پڑھی روزہ رکھا صدقہ کیا اور حسب استطاعت اپنی تعریف و توصیف کرے گا۔ ارشاد ہوگا ہم تیرے خلاف کوئی گواہ پیش کریں؟ وہ وول میں سوچے گا کہ میرے خلاف کون گواہی دے گا اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور اس کی ران کارشاد ہوگا بول! پس اس کی ران اس کا گوشت اور اس کی ہڈی اس کے اعمال بد کے متعلق سب کچھ بتادیں گے۔ فرمایا یہ منافق ہوگا اور اپنے حق میں عذر پیش کرے گا اور اسی (بد بخت) پر اللہ کا غضب ہوگا (1)۔

امام احمد اور طبرانی نے عقبہ بن عامر سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ جس روز موتیوں پر مہر لگا دی جائے گی سب سے پہلے انسان کی جو ہڈی بولے گی وہ اس کی بانسوں کی ہڈی ہوگی (2)۔

امام احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن جیدہ کی حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے روز تم اس حال میں آؤ گے کہ تمہارے منہوں پر غلاف چڑھا ہوگا اور سب سے پہلے انسان کا جو عضو بات کرے گا وہ اس کی ران اور پتھلی ہوگی۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کیلئے بلایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر علیحدگی میں اس کے اعمال پیش فرمائے گا۔ مومن ان سب کا اعتراف کرے گا اور عرض کرے گا اسے میرے پروردگار میں نے واقعی یہ کوتاہی بھی کی، میں نے یہ بھی کیا تھا، کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ سب جرائم محاف فرما دے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ فرمایا سطح زمین پر کوئی مخلوق اس کے گناہوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لیکن اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ تمام لوگ ان نیکیوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اور کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ اس کے اعمال پیش فرمائے گا وہ ان اعمال بد کا انکار کرے گا اور کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے میرے نامہ اعمال میں وہ اعمال بھی لکھ دیئے ہیں جو میں نے نہیں کئے۔ ارشاد ہوگا تو نے فلاں برائی فلاں جگہ فلاں دن کی تھی۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم میں نے یہ برائی نہیں کی۔ جب وہ اس طرح جھوٹ کہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا (3)۔ ابو موسیٰ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) سب سے پہلے جو عضو بات کرے گا وہ انیس ران ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلَّذِي نَفَخَ فِيْهِم مِّنْ رُّوْحِنَا عَلٰى اَنْفُوْهِمْ تَلٰوَدَتْ فَرْمٰنٰی۔

ابو یعلیٰ اور حاکم نے ابوسعید خدری کے واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز کافر کو اس کے اعمال بد پر شرم دلائی جائے گی تو وہ انکار کرے گا اور جھگڑے گا۔ پس اسے کہا جائے گا کہ یہ تیرے پڑوسی تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ وہ کہے گا یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں پھر ارشاد ہوگا کہ تیرے خلاف تیرے گھر والے اور تیرا خاندان گواہی دیتا ہے۔ وہ کہے گا یہ بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ پھر ارشاد ہوگا (تم سچے ہو) تو حلف اٹھاؤ وہ (بد بخت) قسم بھی اٹھا دیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کو خاموش کر دے گا اور ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں ڈال دے گا (4)۔

وَلَوْ تَسَاءَلْتُمْ سِاَءَ لِكُمْ سِاَءَ اَعْيَبِيْهِمْ فَاَسْتَبِقُوا الصِّرَاطَ فَاَنْتُمْ بِمُصْرُوْنَ ۝۱۱

”اور اگر تم چاہتے تو ہم ان کی آنکھوں کا نشان تک جو کر دیتے پھر وہ راستہ کی طرف دوڑ کر آتے بھی تو ان (انہوں) کو راستہ کیسے نظر آتا۔“

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (اعلیٰ)

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدیمی)

4۔ تفسیر بخاری، جلد 6، صفحہ 12 (انجاری)

3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (اعلیٰ)

یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کی یہ ظاہری آنکھیں یوں مٹادیں کہ نہ آنکھ کا گڑھا ہونے لگیں۔ طمس کا یہی معنی ہے کہ کسی چیز کا بالکل اثر اور نشان ہی مٹا دینا۔ استسقا کا عطف طمسنا پر ہے۔ یعنی جس راستہ پر ہر وقت ان کی آمد و رفت رہتی ہے اس راستہ کی طرف دوزخ کو آنکھیں لگوانا وہ اندھا ہونے کی وجہ سے اسے دیکھ سکیں گے۔ الصراط پر نصب یا تو اس اعتبار سے ہے کہ حرف ج حذف کیا گیا ہے یا استباق کے ضمن میں ابتداء کا معنی پایا جاتا ہے یا مسبق الیہ کو مجازاً مسبق بنایا گیا ہے یا ظرف کی بناء پر منصوب ہے۔ فانی پر فاعلیت کے لئے اور استفہام انکاری ہے، یعنی آنکھوں کے مٹ جانے کے سبب وہ نہیں دیکھ سکیں گے علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ قول حسن اور سعیدی کا ہے۔ ابن عباس قنادرہ مقاتل اور عطاء فرماتے ہیں اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کی گمراہی کی آنکھیں پھوڑ دیں اور انہیں گمراہی اور ضلالت سے اندھا کر دیں اور ان کی آنکھیں گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیں جس سے یہ اپنی شاہراہ ہدایت دیکھ لیں (۱)۔ یعنی ہم نے جب یہ جاہلی نہیں تو یہ اپنی ہدایت کا راستہ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَوْ تَشَاءُ لَنُصِّفَهُمْ عَلَىٰ مَكَاتِحِهِمْ فَمَا اسْتَضَاعُوا مِصْبًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۰﴾

”اور اگر ہم چاہتے تو ہم انہیں سب کے سب دکھ دیتے ان کی جگہوں پر پھر وہ نہ آگے جاسکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے۔“

ابو بکر نے مَكَاتِحِهِمْ کو مَكَانَاتِهِمْ یعنی جمع کا صیغہ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو انہیں اپنی جگہوں پر ہی بندر اور خنازیر بنا دیتے۔ بعض علامہ فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انہیں پتھر بنا دیتے جو اپنی جگہ پر پڑے رہتے اور ان میں کوئی روح اور جان نہ ہوتی۔ مصیبا کا معنی ڈھابا (جانا) ہے۔ رجوع کی جگہ ولا یوجعون فعل ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ تو اصل کی رعایت ہے۔ بعض علامہ فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ بکندہ بے قصد ترقی کی طرف نہ لوٹ سکتے۔ حضرت حسن کی تاویل کے مطابق اس آیت اور سابقہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے گمراہ اور عہد شکنی کے باعث اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جانا چاہئے لیکن دنیا میں ہماری رحمت سب کو شامل ہے اس لئے ہم ایسا نہیں کرتے نیز ان کے متعلق ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ڈھیل دی جائے۔

وَمَنْ يُعْبِدْ لَدُنِّي فَلَا يَتَّبِعُونَ ﴿۱۱﴾

”اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں تو کمزور کر دیتے ہیں اس کی طبیعتوں کو لہ بھر کیا یہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔“

یعنی اللہ کو عبادت کرنے والے اور عمر دینے والے کو کمزور کر دیتے، کاف کے کسر اور تکرید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے پہلی نون کے فتح، دوسری کے سکون، کاف کے ضم اور تخفیف کے ساتھ مجرد سے پڑھا ہے۔ تنگیس زیادہ بلند ہے اور انکس زیادہ مشہور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں یعنی پہلے بچپن میں بے چارگی کی کیفیت میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ قوت و طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور عقول ان شباب پر پہنچتا ہے تو پھر قوتوں میں ضعف اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ مر جاتا ہے۔

اس کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ کے مضمون پر ہے اور استفہام انکاری ہے، یعنی ان کو سوچنا چاہئے تھا کہ جو بچپن سے جوانی اور پھر جوانی بڑھا ہے میں تبدیلی کرنے پر قادر ہے کیونکہ انسانی زندگی میں قوت و ضعف کا یہ سلسلہ طمس اور مسح دونوں باتوں پر مشتمل ہے لیکن

اس میں تدریج (آہستہ آہستہ کسی کام کو پائے تکمیل تک پہنچانا) کا عمل ہے۔ نافع اور ابن ذکوان نے يعقلون (فاء) کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس سے پہلے نفاہ کا ذکر ہے جیسے الم اعهد اليكم جب کہ باقی قراء نے ياء کے ساتھ يعقلون کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کی وجہ ولو نشاء لمسخناهم کا ارشاد ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں انکھی نے فرمایا کفار مکہ نے کہا (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں یہ شعر ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴿۱۰﴾

”اور نہیں سکھایا ہم نے اپنے نبی کو شعر اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے۔ ۱۔ نہیں ہے یہ مگر نصیحت اور قرآن جو بالکل واضح ہے۔“

۱۔ اس کا عطف انک لمن المسلمین پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے، یعنی ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ اسے شعر نہیں سکھایا کیونکہ قرآن ان اشعار کی طرح نہ ہم قافیہ ہے اور نہ موزون ہے، نہ اس میں اشعار کے باطل معانی کی طرح کوئی معنی اور مفہوم ہے، نہ اس میں بلا و درجت والے والے واہے تخیلات کا تذکرہ ہے اور نہ نغزات کا تیز خیالات کا ذکر ہے اور نہ خیالی اور جھوٹے تصورات کی آمیزش ہے اور میرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ اپنے وقت کی حقیقی دولت کو اشعار کہنے اور وزن و قافیہ کی رعایت میں ضائع کرتا رہے۔ اور امام بخاری اور مسلم نے براء بن عازب کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول نقل کیا ہے انا النبی لا کذاب انا ابن عبد المطلب (میں نبی ہوں اور اس میں جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں) (2)۔

اسی طرح حضرت جناب بن ابی سفیان کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ هل أنت الا اصبغ ذمیت و فی سبیل اللہ فالقیبت (تو انکھی ہے جو زخمی ہوئی ہے اور جو کچھ تمہیں تکلیف پہنچتی ہے اللہ کے راستہ میں پہنچتی ہے) تو یہ دونوں اشعار بغیر کسی تکلیف اور تصنع کے صادر ہوئے تھے اور ان سے آپ کا قصد اشعار کہنا نہیں تھا اور جس شخص سے بلا ارادہ مقصی، کتب اور موزون کلام صادر ہو جائے اسے شاعر نہیں کہا جاتا۔ اس قسم کا کلام اکثر تشریحی عبارات میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ظیل رجز یہ اشعار کو اشعار شمار ہی نہیں کرتا اور بھی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کذب اور عبدالمطلب دونوں کی بقاء کو حرکت دی تھی اور ذمیت کی فاء کو بغیر اشباع کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور لقیبت کی فاء کو ساکن کر کے پڑھا (۱)۔ ثابت ہو تو پھر شعر کی صورت ہی نہ رہے گی (علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعر کا ایک مصرع بھی شاعری کے انداز میں نہیں پڑھ سکتے تھے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مصرع پڑھنے لگتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر روانی کے ساتھ جاری نہ ہوتا (3)۔

علامہ بغوی نے حضرت اہن سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مصرع پڑھا۔

كُفِّي بِالْأَسْلَامِ وَالشُّبَيْبِ لِبَعْرِ نَاهِيَا ۖ وَإِسْلَامُ بَالُونَ كِ سَفِيْدِي ۖ إِنْسَانٌ كُوْغَانَا ۖ هُوْنَ سِرْدَكْنَ كْنَ كَافِي ۖ (شاعر نے تو اس طرح کہا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا نبی اللہ! كُفِّي الشُّبَيْبِ وَالْأَسْلَامُ بِالْمَعْرُءِ نَاهِيَا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پڑھا تو پھر بھی پہلے کی طرح پڑھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: شہد انک رسول اللہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ۔

مقدام بن شریح اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال شعر پڑھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن رواحہ کے اشعار پڑھتے تھے۔ فرمائی ہیں کبھی کبھی آپ یہ مصرعہ پڑھتے تھے۔

يَا نَيْبِكَ الْاِخْتِيَارُ مَنْ لَمْ تُوَدِّدِي (زمانہ تیرے پاس ایسی نصیحت آموز واقعات لائے گا جو پہلے تیرے پاس نہیں ہیں) (۱)۔

معمری نے قنادہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال اشعار پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر انتہائی ناپسند تھے۔ فرمائی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شعر نہیں پڑھا مگر کبھی کبھی قبیلہ بنی قیس بن طرف کے شاعر کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

سُبَيْدِي لَكَ الْاَلَامُ مَا كُنْتُ جَاهِلًا وَيَا نَيْبِكَ بِالْاِخْتِيَارِ مَنْ لَمْ تُوَدِّدِي

زمانہ تیرے لئے وہ سب کچھ کھول دے گا جس سے تو نا آشنا ہے اور جو تیرے پاس نہیں ہے وہ بھی تیرے پاس لے آئے گا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مصرعہ کا اس طرح پڑھتے ہیں ویا تک من لم توودد بالاخبار۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ شعر کا مصرعہ اس طرح نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ میں شاعر ہوں اور نہ میرے لئے شعر کہنا مناسب ہے (۲)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل بیت میں لہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی قرآن کے لئے شعر ہونا مناسب نہیں۔

یہ قرآن تو سراپا نصیحت اور ارشاد الہی ہے۔ فرائض احکام صمد اور ماضی مستقبل کے حالات واقعات بیان کرنے والے ہیں، جب کہ شاعر کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

لَيْسَ ذَا مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحْيَى الْقَوْلَ عَلَى الْكُفْرَيْنِ ۝

”تا کہ وہ بروقت خبردار کرے اسے جو زندہ ہے اور تا کہ حجت تمام کر دے کفار پر۔“

۱۔ نافع ابن عامر اور یعقوب نے نساء خطاب کے ساتھ لَيْسَ ذَا مَنْ كَانَ حَيًّا اور سورة الاحقاف میں بھی خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے احقاف میں ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ سابقہ کلام کے متعلق ہے، یعنی ہم نے قرآن نازل کیا اور محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تا کہ قرآن یا رسول بروقت متنبہ کرے مومن کو جس کا دل ابھی زندہ ہے اور حقائق اشیاء کو سمجھتا ہے اور حیات ابدی ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ اہدیت کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ مومن شخص ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے نہ کہ کافر کیونکہ وہ مردہ کی طرح ہوتا ہے، حسن و قبح کی تمیز سے بھی محروم ہوتا ہے، پتھروں کی پوچھ پچاٹ کو اچھا سمجھتا ہے اور شیطان کی اتباع کو خیر سمجھتا ہے اور خالق کی عبادت اور رسول کی اتباع کو قبیح جانتا ہے پس ایسا شخص آخرت میں ایسی حالت میں ہوگا کہ نہ مرے گا اور نہ زندہ

ہوگا۔ کافرین کا ذکر حیناً کے مقابلہ میں کیا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کافر حقیقت میں مردہ ہیں۔ القول سے مراد کلمہ عذاب ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِيهِمْ أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَلَائِكُونَ ﴿١٠﴾

”کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے پیدا فرمائے ان کے لئے اس مخلوق سے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی موسیٰ پھر (اب) یہ ان کے مالک ہیں۔“

لہ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور او عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اینکرون البعث او اینکرون خلق اللہ ولم یروا یعنی کیا یہ بعثت کا انکار کرتے ہیں یا اللہ کی تخلیق کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے پیدا کی ہیں وہ اشیاء جو ہماری دست کاری کا کرشمہ ہیں۔ عمل کی نسبت ایدینا کی طرف فرمائی اختصاص اور تفرّد میں مبالغہ کرنے کے لئے استعارہ یہ اسلوب اختیار فرمایا۔ یعنی سب مخلوق کو عدم سے وجود میں لانے والے ہم ہیں۔ الععام (موسیٰ) کا ذکر خصوص طور پر کیا کیونکہ ان میں فطرت کے انوکھے انداز ہیں اور ان میں منافع کی کثرت ہے۔ آخر میں فرمایا ہم نے انہیں مالک بنایا تو وہ مالک ہیں یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے لئے مقرر فرمایا تو وہ ان میں تصرف کر سکتے ہیں۔

وَدَلَّلْنَاهُمْ قِيمَتَهَا لِكُلِّ بَشَرٍ وَهُمْ فِيهَا كَالْبَدِئِ كَلْبُونَ ﴿١١﴾

”اور ہم نے ان کے لئے تاجدار بنا دیا انہیں ان کا ہیں ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض (کا) کھاتے ہیں۔“

لہ دللنا کا معنی سخرنا ہے۔

وَأَنزَلْنَا فِيهَا مَنَاقِبَ وَمَشَارِبًا أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾

”اور ان کے لئے ان موسیوں میں اور بھی کئی منفعیتیں ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے۔“

لہ دوسرے منافع سے مراد ان کی کھالوں اور اون کا استعمال ہے۔ ان کو زمین میں نل چلانے کے لئے استعمال کرتا وغیرہ ہے۔ مشارب جمع ہے مشربۃ کی۔ یہ اسم ظرف ہے۔ یا مصدر ہے، اس سے مراد جانوروں کا دودھ پینا ہے۔ أَفَلَا يَشْكُرُونَ میں ہمزہ انکار کے لئے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اینکرون فلا یشکرون یعنی کیا وہ انکار کرتے ہیں اور شکر نہیں کرتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں اور ناشکری کرتے ہیں جیسا کہ آنے والا ارشاد دلالت کر رہا ہے۔

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يَبْصُرُونَ ﴿١٣﴾

”اور ان (خالقوں) نے بنائے ہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور خدا کہ شاید وہ ان کی مدد کریں۔“

لہ یعنی ان بد بختوں نے باوجود اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور عظیم نعمتوں کو دیکھ لیا اور یہ خوب جان چکے ہیں کہ وہ نفع و ضرر کا مالک ہے کائنات کی ہر چیز کا مقرر و خالق ہے لیکن کافروں کے بتوں کو عبادت میں اس کا شریک بنا لیا ہے۔ اس جملہ کا عطف خلقنا لہم پر ہے۔ یعنی انعامات کی بارش ان پر ہم نے برسائی اور انہوں نے ہمارے علاوہ کو خدا بنا لیا۔

امام بیہقی اور انجم نے حضرت ابو ذر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا اور جن و

اُس کا معاملہ ایک عجیب و غریب صورت میں ہے پیدا میں کرتا ہوں اور عبادتِ نمبر کی کی جاتی ہے۔ رزق میں دیتا ہوں اور شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔ لعلہم بصرون۔ اتخذوا کے فاعل ہے حال ہے، یعنی وہ اس امید پر انہیں خدا بناتے ہیں کہ وہ ان کی مشکل حالات میں امداد کریں گے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

لَا يَسْتِطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَلَا هُمْ لِنَصْرِهِمْ جِدًّا مَحْصُرُونَ ﴿٢٠﴾

”یہ جو نے خدا نہیں مدد کر سکتے ان کی اور یہ کفار ان معبودوں کے لئے تیار شدہ لشکر ہیں۔“

۱۔ ہم خمیر کا مربع مشرکین ہیں اور لہم کا مربع ان کے معبودان باطلہ ہیں، یعنی ان خداؤں کی حفاظت اور ان کو شکست دینے سے بچانے کے لئے لشکر تیار کر رکھے ہیں حالانکہ یہ بے جان مورتیاں نہ ان کو کوئی خیر پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان سے کسی شر کو دور کر سکتی ہیں۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز ہر باطل معبود کو لایا جائے گا اور پھر ان کے ساتھ ان کے پرستار بھی ہوں گے گویا وہ آگ میں ڈالے جانے کے لئے ایک لشکر ہے، یہ جملہ لا یستطیعون کے فاعل سے حال ہے۔

فَلَا يَحِزُّكَ قَوْلُهُمْ ۗ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٢١﴾

”پس نہ رنجیدہ کرے آپ کو (اے حبیب!) ان کا قول ہم خوب جانتے ہیں جس بات کو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔“

۱۔ فاء سمیت کے لئے ہے۔ یعنی جب آپ نے کافروں کے حلق عذاب کی وعید سن لی تو یہ کافر جو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اللہ کرتے ہیں اور جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں آپ اس پر کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ہم ان کی عداوت اور عقائد باطلہ کو جانتے ہیں جو یہ اپنے نہیں خانہ دل میں چھپاتے ہوئے ہیں اور جو یہ اعمال بد کرتے ہیں اور اقوال شنیعہ کہتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ اور ہم ان سب کو توں اور کجواہات پر ان کو سزا دیں گے، آپ کی تسلی کے لئے یہی کافی ہے۔ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ سے نبی کی علت ہے۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسی حدیث کو صحیح بھی کہا ہے فرماتے ہیں عاص بن وائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بوسیدہ بڈی لے کر آیا اور کہنے لگا یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اس حالت کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا۔ وہ تجھے مارے گا اور پھر تجھے زندہ کرے گا پھر تجھے جہنم میں داخل کرے گا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (۱)۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانَ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ قَادًا هُوَ حَصِيمٌ مُمِينٌ ﴿٢٢﴾

”کیا انسان (اس حقیقت کو) نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ پس اب وہ (ہمارا) نکلاد دشمن بن بیٹھا ہے۔“

۱۔ الانسان سے مراد عاص بن وائل ہے۔ ابن ابی حاتم نے متعدد طرق سے مجاہد، بکر، اور ابن زبیر سے اور سدی، بیہقی (شعبیہ الایمان میں) نے ابو مالک سے اور لغوی نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ یہ آیت ابی بن خلف النجفی کے بارے میں نازل ہوئی تھیں یہی بد بخت دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو تھا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پرانی بڈی لے کر

آیا اور اپنے ہاتھ سے اسے مسل کر کہنے لگا کیا اس کے اتنا بوسیدہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ کرنے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ اٹھانے گا اور پھر تجھے دوزخ میں داخل فرمائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1)۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واو محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی ایکنو الانسان قدرتنا علی الاعادة ولم یر۔ یعنی کیا انسان دوبارہ زندہ کرنے کی ہماری قدرت کا انکار کرتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

۱۔ فاذا یر فاعطف کے لئے ہے۔ اور اذا مفاعتہ ہے، یعنی ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر ہمارا اٹھلا دشمن بن بیٹھا اور ہمارے ساتھ باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے لگا۔ اس کو اب تحقیق حق سے غرض نہیں کیونکہ وہ تو ظاہر باہر ہے یہ جانتا ہے اور اور اپنی ابتدائی تخلیق کا معترف بھی ہے پھر یہ اس بات کا انکار کرتا ہے جو اس کی پہلی تخلیق سے زیادہ آسان ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی دے رہے ہیں کہ آپ کے متعلق جو کچھ یہ بک بک کر رہے ہیں یہ تو انکے نزدیک آسان ہے یہ تو ایسے گستاخ ہو چکے ہیں کہ شرا اور قیامت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اس جملہ میں ان کی انتہائی مذمت اور قہاحت بیان ہو رہی ہے کہ چاہئے تو یہ تھا کہ انسان نعمتوں اور بخششوں کے مقابلہ میں جسدہ شکر ادا کرتا لیکن یہ ناشکری کرتا ہے حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے پانی کی ایک ناپاک بوند سے پیدا فرمایا اور پھر عزت و دسوری کے اس مقام پر پہنچایا کہ شرافت اور کرامت کو اس پہ نخر ہے۔ بعض علماء نے فاذا هو خصیم، حسین کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ حقیر پانی ہونے کے بعد آسان عقل و شعور اور قادر الکلام ہو گیا، اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت رکھنے والا ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں عزت و شرف پانے کے بعد اپنی ذلیل اور گھٹیا اصل پر ہو گیا، اپنے رب سے جھگڑنے لگا اور مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کا منکر ہو گیا۔ اَوْلَمْ یَرَ الْاِنْسَانَ اِذْ کَانَ جُلُودًا مِّنْ مَّعْیَہُ اَوَّلَمْ یَرُوْا اِنَّا جَلَقْنٰہُمْ اِنۡحَ کَادِلٌ ہُو۔

وَصَرَ بَلٰنَا مَسْئَلًا وَّلَیْسَی حَافِلَہٗ ۙ قَالَ مِّنْ یَّحٰی الْعِظَامَ وَہٰی سَمِیْمٌ ﴿۱۰﴾

”اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لئے (عجیب و غریب) مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا ہے اپنی پیدا آئش کو (گستاخ)

کہتا ہے اجی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔“

۱۔ انسان ہمارے لئے عجیب و غریب مثالیں بیان کرتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی ہماری قدرت کی نفی کرتا ہے اور اپنے خالق کو ایک عاجز بندے سے تشبیہ دیتا ہے اور اپنی پیدا آئش اور تخلیق کو فراموش کر دیا ہے کہ اسے ایک مٹی کی بوند سے پیدا کیا گیا ہے۔ حالانکہ مٹی سے تخلیق کرنا ہڈی سے پیدا کرنے کی نسبت زیادہ عجیب و غریب ہے۔

وہی دھیم کا جملہ العظام سے حال ہے۔ اور یہ جملہ مثل کے بیان کے لئے علیحدہ مستقل کلام ہے۔ دھیم پرانی اور بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ یہ فعل کا وزن بمعنی فاعل ہے اور یہ دم الٹی سے مشتق ہے پھر غلبہ کی وجہ سے اسم بن گیا، اس وجہ سے اس کا مونث کا سینہ استعمال نہیں ہوتا یا یہ فعل بمعنی مفعول ہے اور دھیمہ سے مشتق ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ ہڈی میں زندگی ہوتی ہے اور اس میں موت بھی مؤثر ہوتی ہے (2)۔ امام بیضاوی کی مراد یہ ہے کہ مرد اور ہڈی کی نجس (پلید) ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ ابن الجوزی نے التحقیق میں امام احمد کا بھی یہی

مذہب ذکر کیا ہے لیکن صاحب رحمۃ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد کا صحیح مذہب یہ ہے کہ دانت پر اور ہڈی پاک ہے۔ جو علماء مردار کی ہڈی کی نجاست کا قول کرتے ہیں انہوں نے اس آیت کریمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا تَنْفَعُوا مِنَ الْعَيْتَةِ بِشَيْءٍ (مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھایا جائے گا) سے حجت پکڑی ہے۔ ابو بکر الثانی نے اپنی سند کے ساتھ ابن ابی الزبیر کے سلسلہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ صاحب المغنی اور صاحب تنقیح التتبع نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند حسن ہے اور ابن وہب نے اپنی سند میں زعم بن صالح عن ابن الزبیر عن جابر کی سند سے روایت کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں لَا تَنْفَعُوا مِنَ الْعَيْتَةِ بِشَيْءٍ وَلَا تَنْفَعُوا بِالْمَيْتَةِ۔ صاحب التلخیص فرماتے ہیں زعم کے بارے میں کلام ہے اور حدیث میں علت ہے جسے ابن معور وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مردار کے بالوں اور ہڈی میں زندگی نہیں ہوتی، یعنی ان میں زندگی نہیں ہوتی تو ان پر موت بھی طاری نہیں ہوتی، پس مردار سے اشفاق کی سببی والی حدیث ان دونوں (ہڈی اور بال) کو شامل نہیں ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ کے قول پر یہ آیت کریمہ حجت ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ ہڈی میں حیات کے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ دلیل دی جائے کہ کسی چیز کی پلیدی کا باعث بننے والا خون ہے اور ہڈی اور بالوں میں بننے والا خون نہیں ہوتا اگرچہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔ اس لئے بال اور ہڈیاں ناپاک نہیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں میں بننے والا خون نہیں ہوتا۔ ان کے پانی میں گرنے سے پانی پلید نہیں ہوتا حضرت سلمان سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر کھانے اور پینے والی چیز میں اگر کوئی ایسا جانور مر جائے جس کا خون نہ ہو تو اس چیز کا کھانا اور پینا حلال ہے اور اس سے ذکوہ کا بھی جائز ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے (1)۔ دارقطنی فرماتے ہیں اس حدیث کو بقیہ کے علاوہ کسی دوسرے راوی نے سعید بن سعید الزبیدی سے روایت نہیں کیا ہے اور سعید ضعیف راوی ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں سعید جہول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کبھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر باہر پھینک دو کیونکہ اس کے ایک بر میں شفا ہے اور دوسرے میں داء (بیماری) ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ ہماری دلیل حضرت ابن عباس کی حدیث بھی ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے پاس سے گزرے تو فرمایا تم لوگ اس کی جلد سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ یہ مردہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردار کا صرف کھانا حرام ہے (3) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار جانور میں سے صرف اس کا گوشت حرام کیا ہے۔ لیکن اس کی کھال اس کے بال اور اس کی اون میں کوئی حرج نہیں ہے (4)۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد الجبار بن مسلم ہے دارقطنی فرماتے ہیں وہ ضعیف ہے لیکن ابن حبان نے اسے ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ حدیث حسن کے مرتبہ سے کم نہیں ہے۔ حیرت ہے علامہ ابن جوزی پر کہ انہوں نے اسی حدیث سے مردار کی اون اور اس کے بالوں کی طہارت پر حجت پکڑی ہے لیکن ہڈی کی طہارت پر اس حدیث کو حجت نہیں بنایا۔ ہڈی کی نجاست پر اس نے لَا تَنْفَعُوا مِنَ الْعَيْتَةِ بِشَيْءٍ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے اور صوف اور بالوں کی نجاست پر اس حدیث سے حجت نہیں پکڑی۔ حق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا تَنْفَعُوا مِنَ الْعَيْتَةِ بِشَيْءٍ سے مراد یہ ہے کہ میت (مردار) سے وہ چیز نہ کھاؤ جو کھائی جاتی ہے کیونکہ بسنے والے خون کے اختلاط کی وجہ سے ناپاک ہوگئی

2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 860 (ذرات نعیم)

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 37 (الحائس)

4۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 48 (الحائس)

3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 830 (ذرات نعیم)

ہے لیکن بال اور ہڈیاں اور اون جن میں خون کا اختلاط نہیں ہوتا ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دباغت کے بعد اور رطوبت کے ازالہ کے بعد جلد (کھال) کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے متعلق اور بھی احادیث ہیں۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ خرد در مدار کی ہر چیز حلال ہے لیکن جو چیزیں کھائی جاتی ہیں وہ حلال نہیں ہیں اور کھال بال اُون اور ہڈیاں یہ سب چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذبح کر کے پاکیزگی حاصل نہیں کی جاتی (1) (بلکہ وہ پہلے ہی پاک ہوتی ہیں اور ان میں موت مؤثر نہیں ہوتی) اس حدیث کی سند میں ابوبکر الہذلی ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں یہ متروک ہے۔ غندر فرماتے ہیں یہ کذاب ہے۔ یحییٰ فرماتے ہیں یہ روایت حدیث میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

دارقطنی نے ام مسلمہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مردار کی کھال کی دباغت کر لی جائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی اون، بالوں اور تیلوں کو جب پانی سے دھویا جائے تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے (2) دارقطنی فرماتے ہیں یہ حدیث صرف یوسف بن اسطر نے روایت کی ہے۔ اور وہ متروک ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ابو زرعہ اور سانی فرماتے ہیں وہ متروک ہے۔ رحیم کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ قابل حجت نہیں ہے۔

ابن الجوزی نے ابویعلیٰ بن حماد الشافعی بن سلیمان بن ثوبان کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے ہاتھی کے دانتوں سے بنے ہوئے دو نکلن اور تانت سے بنا ہوا ایک ہار خریدا۔ ابن الجوزی کہتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں حمید اور سلیمان دونوں مجہول راوی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں میں حمید کو نہیں پہچانتا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں میں سلیمان کو نہیں جانتا اور عالج سے مراد بھی ذیل ہے (یعنی چھوے کی کھال) ابن قتیبہ کہتے ہیں یہاں عالج سے وہ عالج مراد نہیں جو عوام میں معروف ہے جو ہڈی اور دانت سے تراش کر بناتے ہیں کیونکہ یہ تو مردار ہے اور اس کے متعلق نجی وارد ہے۔ پھر اس سے حضرت فاطمہ کے لئے کیے نکلن بنائے گئے تھے عالج سے مراد چھوے کی کھال ہے۔ اصمعی نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اصمعی کا یہ کہنا کہ ”عالج سے مراد وہ نہیں جسے عوام جانتے ہیں“ یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید لغت میں بھی اس کا یہ معنی نہیں ہے لیکن حقیقت اس طرح نہیں ہے۔ انکم میں سے عالج ہاتھی کے دانت کو کہتے ہیں، دانت کے علاوہ کو عالج نہیں کہا جاتا۔ جو ہری کہتے ہیں عالج ہاتھی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس کا وہ عالج ہے۔ اصمعی نے یہ تاویل اس لئے کی ہے کیونکہ اس کے اعتقاد میں ہاتھی کی ہڈی ناپاک ہے۔ قاموس کی عبارت سے بھی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ عالج کا لفظ چھوے کی کھال اور ہاتھی کی ہڈی سے مشترک ہے۔ جزری کی نہایت سے بھی یہی مفہوم ملتا ہے۔ اثر بل سمندری یا خشکی کے چھوے کی کھال کو کہتے ہیں یا سمندری جانور کی بیچنی ہڈیوں کو کہتے ہیں جس سے نکلن بنائے جاتے ہیں۔ بیہقی نے عن یقین عمرو بن خالد عن قتادہ عن انس کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھی کے دانتوں سے بنی ہوئی کٹھنی استعمال فرماتے تھے۔ بیہقی فرماتے ہیں بقیہ کی اپنے مجہول شیوخ سے روایت ضعیف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ایسی بہت سی احادیث اگرچہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور متن کے اعتبار سے حسن ہیں اور بعض حسن سے کم مرتبہ نہیں اور اس حدیث کی شاہد صحیحین کی جہلی حدیث بھی ہے تو کیسے قابل حجت نہ ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿١٠٠﴾

”آپ فرمائیے (اے گستاخ سن!) زندہ فرمائے گا انہیں وہی جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو خوب

جاننا ہے۔“

یعنی اس کی قدرت پہلے کی طرح باقی ہے کیونکہ اس کی قدرت میں تغیر اور تبدیلی معتنع ہے اور مادہ بھی اسی حالت میں باقی ہے اس کی بالذات قابلیت موجود ہے۔ (تو وہی ذات جس نے ابتدا میں تخلیق فرمایا دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا اور زندہ کرے گا) یہ جملہ مستلزم ہے اور وَهُوَ بِخَلْقِهِ عَلِيمٌ کا جملہ بخنی کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ اپنی مخلوقات کی تفصیل اور ان کی تخلیق کی کیفیت جانتا ہے، وہ اشخاص کے بکھرے ہوئے ذرات کا خوب علم رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس جگہ ہیں اور کس راستہ پر ہیں، وہ ان ذرات کو ایک دوسرے سے جدا کرنے پھر ان کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا بھی علم رکھتا ہے جو ان افراد میں اعراض اور قوتیں تھیں ان کے اعادہ کو بھی جانتا ہے یا ان کی پہلی قوتوں اور اعراض کی مثل پیدا کرنے کو بھی جانتا ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا إِذْ أَنْتُمْ مِنْهُ تَشْكُرُونَ ﴿۱۰﴾

”جس نے (اپنی نکت سے) لکھو کی تمہارے لئے ہزر درختوں میں آگ لے پھر تم اس سے اور آگ لگاتے ہو۔“

الْأَخْضَرِ، اسم موصول الذی انشاہا سے بدل ہے یا مبتدا مخذوف، خو کی خبر ہے یا مدح کے طور پر بھجدر یعنی منسوب ہے ان عباد فرماتے ہیں دوزخ پیدا ہوتے ہیں ایک کو اور دوسرے کو العفار کتے ہیں۔ جو شخص ان کی تروتازہ ٹہنیاں سواک کی مثل کالے جن سے پانی بہرہ باہور پھر مرخ کو عفار پر رگڑے تو ان سے آگ نکلتی ہے۔ عرب کہتے ہیں ہر درخت میں آگ ہے اور مرخ و عفار اس صفت میں ممتاز ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں سوائے عتاب کے ہر درخت میں آگ ہے۔

یعنی آگ لگانے کے وقت تمہیں ذرا بھر شک نہیں ہوتا کہ ہر درخت کی ٹہنیوں سے آگ نکل رہی ہے پس جو ہستی ہر درخت سے آگ لگائے پر قادر ہے حالانکہ ہر درخت میں پانی ہوتا ہے جو آگ کی طبعاً ضد ہے وہ ہستی یقیناً بوسیدہ ہڈی کو پھیلنے کی طرح تروتازہ کرنے پر بدو جاوٹی قادر ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِنْهُمْ نَسَبًا ﴿۱۱﴾

وَهُوَ الْخَلْقُ الْعَلِيمُ ﴿۱۰﴾

”کیا وہ (قادر مطلق) جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو قدرت نہیں رکھتا کہ پیدا کر سکے ان جیسی (چھوٹی سی)

مخلوق چنگ! (دو ایسا کر سکتا ہے) اور وہی پیدا فرمانے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

لے استفہام انکاری ہے اور او مخذوف پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اخلق السموات والارض كما تعرفون بہ و لیس الذی خلقهما مع کبر جرمها وعظم شانها بقادر الخ یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے جیسا کہ تم اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہو تو وہ ذات جو اتنے وسیع و عریض آسمان و زمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان جیسی حقیر اور صغیر چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے یا ذات کے اصول اور ذات کی صفات میں ان کی مثل پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ وہ تو وہ ہے کہ ایک تخلیق کے بعد دوسری تخلیق فرماتا ہے۔ کائنات کی سب ممکنات کو بخوبی جانتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے جس چیز کی وہ نئی کرتے تھے پہلی کے ساتھ اس کا اثبات فرمایا، یعنی وہ ذات یقیناً ان کی مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿١٠﴾

”اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جاوے وہ ہو جاتی ہے۔“

لے بیگون کواہن عامر اور کسائی نے بقول پر عطف کی بنا پر منسوب پڑھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ایک تمثیل ہے کہ قدرت الہیہ اپنے مراد میں اس طرح مؤثر ہوتی ہے جیسے اطاعت گزار اپنے مطاع کی بغیر کسی توقف و انکار کے اطاعت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امر کسی آلہ اور عمل کا محتاج نہیں بلکہ اس کا ارشاد ٹھنی ہوتا ہے اور چیز وجود میں آ جاتی ہے اس شے کو ہی ختم فرمادیا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوق کی طرح مادہ اور عمل کی ضرورت پڑتی ہوگی (1)۔

فَسُبُّوا الَّذِينَ يَدِينُونَ بِمَا كَفَرُوا وَكَانُوا مُشْرِكِينَ ﴿١١﴾

”پس وہ (ہر جیب سے) پاپا کے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹنا پانا جائے گا۔“

لے سبحان فعل مخذوف کا مصدر ہے اور فاء سمیت کے لئے ہے۔ یعنی جب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا ہے وہ بذریعہ کونزادہ کرنے پر بھی قادر ہے جب کسی چیز کو تخلیق فرمانے کا ارادہ فرمایا ہے تو وہ فرماتا ہے ہو جاوے وہ ہو جاتی ہے تو پھر تم اس سے عیب ذات کی پائیزگی بیان کرو جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی قدرت ہے مخلوقات سے مراد الملک بمعنی قدرت ہے۔ مبالغہ کے لئے واو اور تاء کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کفار جو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں بیان کرتے تھے یہ آیت ان تمام بے نکی اور لاشعنی باتوں سے اس کی پائیزگی اور تنزیہ بیان کر رہی ہے جو کچھ انہوں نے بک بک کی تھی اس پر تعجب کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ ذات تو ہر چیز پر قادر ہے اس کے لئے عبادہ کوئی مشکل بات ہے۔ والیہ تو جمعوں میں قیامت کا اقرار کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے اور منکرین قیامت کے لئے وعید ہے والیہ تو جمعوں کا عطف بیدہ پر ہے۔ معقل بن یسار سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مردوں پر سورہ یٰسین پڑھو۔ اس حدیث کو امام احمد ابوداؤد ابن ماجہ ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ (سورہ) یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو شخص رضا اپنی اور آخرت کی سہولتی کے لئے تلاوت کرتا ہے اس کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ اس کو اپنے مردوں پر پڑھو (2) جزری نے یہی حدیث الحسن اصحیٰ میں اسی طرح روایت کی ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسین ہے۔ جو شخص سورہ یٰسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں دس مرتبہ پورے قرآن کی تلاوت کا ثواب لکھ دیتے ہیں (3)۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہر رات کو سورہ یٰسین پڑھے گا اس کی بخشش ہو جائے گی۔ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو سورہ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح کرے تو مغفور (بخش دیا گیا) ہوگا اس حدیث کو ابو نعیم نے ائحلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورہ یٰسین پڑھی گویا اس نے دو مرتبہ پورا قرآن پڑھا۔

2۔ الحسن اصحیٰ صفحہ 300 (اسلامیہ لاہور)

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کا زرونی جلد 4، صفحہ 443 (المنکر)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 112 (فاروقی)

اس حدیث کو پہنچنے نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورہ یٰسین پڑھی گو یا اس نے دس مرتبہ قرآن پڑھا۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت فرمایا ہے حضرت معقل بن یسار سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رضا الہی کے لئے سورہ یٰسین پڑھی اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے، تم اس کو اپنے مردوں پر چھو۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ جو ہمیشہ رات کو سورہ یٰسین پڑھے گا وہ مرے گا تو شہید ہو کر مرے گا۔ داری اور طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث روایت کی ہے کہ جو رضا الہی کے لئے سورہ یٰسین تلاوت کرے گا اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ ویسوی اور ابوالشیخ ابن حبان نے فضائل میں حضرت ابو ذر کی حدیث روایت کی ہے جس میں دالے پر سورہ یٰسین پڑھی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماتا ہے۔ محالی نے امالی میں عبد اللہ بن زبیر کی حدیث روایت فرمائی ہے کہ جو شخص اپنی کسی حاجت کے لئے سورہ یٰسین پڑھے گا اس کی وہ حاجت پوری کر دی جائے گی۔ اس حدیث کی شاہد مرسل حدیث داری نے ذکر کی ہے۔ المستدرک میں ابوجعفر محمد بن علی سے مروی ہے فرماتے ہیں جس کا دل سخت ہوا اسے ایک پیالہ میں زعفران سے سورہ یٰسین لکھ کر پینی چاہئے۔ ابن ضریس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک پاگل شخص کے اوپر سورہ یٰسین پڑھی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے بھی روایت کی ہے کہ جس نے سورہ یٰسین صبح کے وقت تلاوت کی وہ شام تک خوش رہے گا اور جو شام کے وقت سورہ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح تک شاد رہے گا۔ جن لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہوں نے بھی ایسا ہی بتایا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين

تفسیر مظہری سورہ یٰسین کا ترجمہ و تفسیر 2 جنوری 2001ء بروز منگل بعد از نماز عشاء بوقت 45-9 (برطانیق چھ شوال 1421) مکمل ہوا۔
مالک الملک کی بارگاہ میں استخاء ہے کہ وہ سورہ یٰسین کے ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے طفیل میری کوتاہیوں پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے اور ہر نیک خواہش کو پورا فرمائے آمین۔

بجاء النبى الكريم صلى الله عليه وآله وصحبه وسلم

والصافات

﴿سَبَّحَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۲۷﴾ ﴿سُبْحٰنَكَ رَبَّنَا ۵﴾

سورۃ الصافات کی ہے، اس میں ایک سو بیالیس آیات اور پانچ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالصّٰفٰتِ صَفًا

”قسم ہے (مقام نیاز میں) پرے باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی لے“

لے اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے ان فرشتوں کی جو نمازیوں کی طرہوں کی طرح مقام عبودیت میں صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صفیں بنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بستہ ہیں؟ فرمایا وہ صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف کو ملا کر رکھتے ہیں (۱)۔ اسی طرح ابن عباس حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان فرشتوں کی قسم اٹھائی جا رہی ہے جو ہمیشہ پر پھیلائے حکم الہی میں منتظر کھڑے ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ پرندوں کی قسم اٹھائی جا رہی ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَالظّٰیْمِۃَ صَفٰتِ۔

فَالَّذِیۡرَاتِ زَجْرًا

”پھر خوب جھڑکنے والوں کی لے“

لے زاجرات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادل کو جھڑکتے ہیں اور اسے ہانکتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے وہ فرشتے مراد ہیں جو بھلائی کے الہام کے ذریعے لوگوں کو گناہوں سے روکتے ہیں یا وہ شیطانوں کو روکتے ہیں جو انسانوں کو گمراہ کرنے کے ذریعے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے زواجرات قرآن فرشتے مراد ہیں جو قرآن کی ہر قیامت سے حفاظت کرتے ہیں (۲)۔

فَاللّٰیۡلِیۡتِ ذِکْرًا

”پھر قرآن کی تلاوت کرنے والوں کی لے“

لے اس سے مراد بھی وہ فرشتے ہیں جو ذکر الہی میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ فرشتے مراد ہیں جو کتب سماویہ سے آیات کو انبیاء پر پڑھنے والے ہیں۔ ذکو امفعول کی حیثیت سے منصوب ہے یا التالیات کے معنی سے مصدر کی بنا پر منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ یا مذکورہ بالا تینوں قسمیں علماء کی اٹھائی جا رہی ہیں جو نماز میں صفیں باندھے کھڑے ہوتے ہیں، اپنے چند نصح اور دلائل وبراہین کے ذریعے کئے نظر اور برائیوں سے روکنے والے ہوتے ہیں اور اپنے بلند مرتبہ کی آیات کی تلاوت کرنے والے ہوتے ہیں۔ یا یہ نمازیوں کی قسمیں ہیں جو

اللہ کے راستہ میں عیض یا ندر سے کھڑے ہوتے ہیں گھوڑوں اور دشمن کو بھڑکنے، روکنے اور ہانکنے والے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں، ذکر الہی سے دشمن کی مبارزت بھی انہیں غافل نہیں کرتی اور ان کا عطف ذات یا صفات کے اختلاف کی بنا پر ہے۔

فا ترتیب وجودی کیلئے ہے کیونکہ صرف رب ہونا کمال ہے اور جزیرائی سے روکنے کی وجہ سے تکمیل ہے یا خبر کی طرف لے جانے کی وجہ سے تکمیل ہے اور تلاوت فیضان ہے یا فا ترتیب رتبہ کے لئے ہے جیسا کہ لَمْ يَكُنْ مِنْ آلِ بْنِ عَبْدِ مَنْوَالِہِمْ ہے۔ حمزہ نے فناء ات کو قرعی لفظ میں قریب الحرج ہونے کی وجہ سے اوغام کیا ہے کیونکہ فناء زبان کی طرف اور اصول ثانیات ادا ہوتی ہے۔ ابو عمرو نے اپنی اصل پر اوغام کیا ہے (ابو عمرو قریب الحرج حروف کو اوغام کرتے ہیں، جب کہ حمزہ کے نزدیک اصلاً قریب الحرج حروف کا اوغام نہیں ہے)

إِنَّ إِلَهُكُمْ لَوَاحِدٌ ۝

”کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔“

یہ جملہ کفار کا رد ہے جو یہ کہتے تھے أَجْعَلُ الْإِلٰهَآءَ اٰجِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ مُّجْتَبَاٌ ۝ (ترجمہ) کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بے شک یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا رَبُّ الْمَسٰرِقِ ۝

”جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا جو کچھ ان کے درمیان ہے اور مالک ہے مشرقوں کا۔“

یہ سابقہ آیت میں ان کی دوسری خبر ہے یا مبتدا محذوف ہو کی خبر ہے۔ اور مشارق سے مراد تمام ستاروں کے طلوع ہونے کی جگہیں اور اوقات ہیں یا مشارق سے مراد سورج کے طلوع ہونے کے مقامات اور اوقات ہیں کیونکہ سال میں ہر روز وہ نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، اسی طرح اس کی تین سو بیسٹھ مشرقیں ہیں گی۔ جس طرح سورج کے مشارق مختلف ہیں تو مغارب بھی اسی طرح مختلف ہوں گے۔ اسی وجہ سے ایک کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ دوسری وجہ صرف مشرق کے ذکر کی یہ ہو سکتی ہے کہ طلوع ہونے میں قدرت الہی کا ظہور زیادہ نمایاں ہے اور یہ اظہارِ نعمت میں زیادہ بلیغ ہے۔

اِنَّا زَيْنٰ السَّمٰوٰتِ الدُّنْيَا زَيْنَةً لِّكُلِّ اٰمٍ ۝

”بلاشبہ ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کے سنگھار سے۔۔۔“

یہ دنیا کا معنی قریب ترین ہے۔ اس آیت میں شیوبت سے تکریم کی طرف التفات ہے۔ جمہور قراء نے بزینۃ الکواکب کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضافت بیان ہے، یعنی ہم نے آسمان دنیا کو سنگھار دیا۔ اور وہ سنگھار ستارے ہیں یا یہ مصدر کی مفعول کی طرف اضافت ہے، یعنی ہم نے ستاروں کو مزین کیا کیونکہ جس طرح زینۃ اللیقہ کی طرح بطور اسم آتا ہے۔ اسی طرح نسبہ کی طرح مصدر آتا ہے یا زینۃ مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ستارے اپنی تزئین کے ساتھ اور اپنی مختلف اشکال کے ساتھ آسمان کو مزین کرتے ہیں۔

حمزہ یقوت اور نضس نے زینۃ کو توتون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور کواکب کو جڑاس سے بدل کی حیثیت سے دی ہے، یعنی زینت سے مراد ستارے ہیں یا ستاروں کی زینت ہے جیسے ستاروں کی روشنی اور چمک ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد کواکب کی روشنی

ہے (۱) یہ قرأت جمہور کی قرأت میں اضافت کے بیان ہے ہونے کی تائید کرتی ہے۔ ابو بکر نے زینۃ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور کواکب کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔ یہ قرأت صدر کی مفعول کی طرف اضافت کی تائید کرتی ہے۔ یا کواکب، اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا زینۃ کے مثل سے بدل کی بناء پر منصوب ہے۔

وَحَفَظْنَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝

”اور (اسے) محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے لے۔“

لے حَفَظْنَا مفعول کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی حفظنا ہا حفظاً یا معنی کے اعتبار سے زینۃ پر عطف کی بناء پر منصوب ہے گویا یوں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ستاروں کو آسمان کے لئے زینت اور شیطانوں سے حفاظت کے لئے تحقیق فرمایا۔ مارِدُ سرکش کہتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ تمام ستارے آسمان دنیا میں ہیں۔ امام بیضاوی کا یہ قول کہ ثواب آٹھویں کہ میں مرکوز ہیں اور باقی سیارے سوائے چاند کے چھ کروں میں ہیں۔ آسمان دنیا اور ان کروں کے درمیان واسطہ ہے (جب کہ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ سب ستارے پہلے آسمان پر ہیں) تو پھر اس آیت اور علماء ہیئت کے قول میں تطبیق کیسے ہوگی (امام بیضاوی فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ علماء ہیئت کی بات مستحق ہی نہیں ہے اگر تسلیم کر بھی لی جائے تو پھر بھی علماء کی بات اور اس آیت میں تضاد نہیں ہے کیونکہ زمین پر رہنے والے لوگ جب آسمان دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو انہیں آسمان کی نیلی چھت پر تمام جواہر مختلف شکلوں میں جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ پس لوگوں کی نسبت سے یہی آسمان حزن ہے (۱) علامہ شاہِ اللہ پانی پتی فرماتے ہیں امام بیضاوی کی یہ تمام بحث فلاسفہ کی نظر کے جواز پر مبنی ہے۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فلاسفہ کا یہ نظریہ کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہے اور باطل ہے کیونکہ آسمانوں کا سات ہونا کتاب اللہ سے منصوص ہے۔ پس آٹھویں کہہ (آسمان) کا قول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ آٹھویں کہہ کا کوئی اور نام رکھنا کچھ مفید نہیں جیسا کہ فخر کا کوئی دوسرا نام رکھا جائے تو وہ حلال نہیں ہوتا۔ آسمان دنیا پر تمام ستاروں کے ہونے کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ دنیا کا لفظ آیت اسماء کی صفت ہے اور صفت کا قاضیہ ہے کہ زینت آسمان دنیا کے ساتھ خاص ہے اگر یہ جھرت ہو تو آسمان کو دنیا کی صفت سے مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ وَحَفَظْنَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ کا قول بھی اس بات کی تردید کرتا ہے کہ آسمان دنیا کے علاوہ کسی دوسرے آسمان میں بھی سیارے ہیں کیونکہ شیطانوں پر شہاب ثاقب آسمان دنیا سے ہی برستے ہیں شیطانوں کے لئے آسمان دنیا سے اوپر جانے کی کوئی راہ ہی نہیں ہے اور یہ کہنا کہ شہاب آٹھویں آسمان سے نکل کر ساتویں آسمان کو چیرتے ہوئے چوری چھپے باتیں سننے والے شیطان گولگتا ہے۔ عکس اس قول کو تسلیم نہیں کرتی اور نقل اس کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔

لَا يَسْمَعُونَ إِلَىٰ الْمَلَأِ الْأَعْلَىٰ وَيُذْفَقُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝

”نہیں سن سکتے ان کا کہ عالم بالا کی باتوں کو اور پتھر اڑا کیا جاتا ہے ان پر ہر طرف سے لے۔“

لے حفص حمزہ اور کسائی نے سین اور میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی اصل یسمعون ہے، تاء کو سین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سنا چاہتے ہیں، اس میں سماع کی نفی میں مبالغہ ہے۔ باقی قرآن نے سین کے سکون اور میم کی تخفیف سے پڑھا ہے۔ یہ مستقل کلام ہے جو آسمان کو محفوظ کرنے کے بعد شیطانوں کی حالت بیان کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے اس کو لکل شیطان

ہارڈ کی صفت بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ پھر یہ مفہوم ہو جائے گا کہ جو شیطان نہیں سنتے ان سے حفاظت کے لئے ستاروں کو پیدا فرمایا ہے۔ اس طرح اس جملہ کو لام کے حذف کی بناء پر حفظ کی علت بنانا بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ جفتک ان تکرر منی میں ہے۔ یعنی اصل میں لٹلا یسمعون تھا۔ پہلے لام حذف کیا پھر ان کو بھی حذف کیا گیا اور اس کے عمل کو بھی ختم کیا گیا کیونکہ ان دونوں حذفوں کا اجتماع ناپسندیدہ ہے۔ الی الملاء الا علی جار مجرور لا یسمعون کے متعلق ہے۔ اسماع کی نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اس میں اصفا کا معنی متضمن فرمایا ہے نیز جس چیز سے آپس روکا گیا ہے اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ملاء اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں۔ یا وہ بلند مرتبہ فرشتے ہیں جن کے سپرد عالم بالا کے تمام امور اور معاملات ہیں۔ یقذفون کا عطف لا یسمعون پر ہے۔ یعنی جب وہ شیطان عالم بالا میں ٹھہرنے یا وہاں کی باتوں کو سننے کا قصد کرتے ہیں تو ان پر آسمان دنیا کی آفتوں سے شہاب ثاقب برستے ہیں۔

دُحُورًا وَآلِهِمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ﴿۱﴾

”ان کو بھگانے کے لئے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔“

۱۔ دُحُورًا مصدر ہے۔ اور یقذفون کے مصدر مود کی حیثیت سے منسوب ہے کیونکہ قدف اور دحور سے مراد جو قریب المعنی ہیں یا دحورین کے معنی میں حال کی بناء پر منسوب ہے یا حرف جر کے حذف کے ساتھ منسوب ہے اور دحور سے مراد وہ شی ہے جس کے ساتھ کسی کو بھگا یا جائے۔ عَذَابٌ وَاصِبٌ سے مراد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ مقابل فرماتے ہیں دنیا میں ان کے لئے دائمی عذاب یہ ہے کہ وہ ٹھہر اولى تک آگ میں جلتے رہیں گے۔

إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۲﴾

”مگر جو شیطان کچھ چھپت لینا چاہتا ہے تو تاقب کرتا ہے اس کا تیز شعلہ۔“

۲۔ لا یسمعون کے فاعل سے استثناء ہے۔ اور مَنْ اس سے بدل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استثناء منقطع ہے۔ الخطفہ کا معنی سرعت سے کسی چیز کا چک لینا ہے۔ یعنی جو لام تک کی کلام سے چوری چھپے کچھ لینا چاہتا ہے چونکہ کلام کا ذکر سماع کی نفی میں ضمتا ہو چکا ہے اسی وجہ سے الخطفہ پر الف لام عہد خارجی ذکر فرمایا۔ اتبع بمعنی نفع ہے۔ شہاب سے مراد وہ شعلہ ہے جو ٹوٹا ہوا ستارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعلہ ستارہ سے نکلتا ہے جو چوری چھپے سننے والے شیطانوں پر مارا جاتا ہے۔

حقیقت اس طرح نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ شہاب ایک تیز ہوا ہے جو طبقات ہوا میں سے طبقہ علیا کی طرف سے بلند ہوتا ہے جو کہ تار کے ساتھ ملا سکتا ہے تو وہ تیز شعلہ (روشن) ہو جاتا ہے یہ قول طرن و تخبین پر مبنی ہے اور یہ باطل ہے وَإِنَّ الْقَنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (ترجمہ) اور ظن حق کے مقابلہ میں کسی کام نہیں آ سکتا۔

یہ فلاسفہ اس نظر ہی کی طرح ہے جو وہ بارش کے متعلق تجویز کرتے ہیں کہ زمین سے بخارات اٹھتے ہیں پھر وہ ہوا کے کہ زہریر میں پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے اور بادل بن جاتا ہے پھر جب انہیں سورج کی حرارت پہنچتی ہے تو پھیل کر بارش کے قطرات کی صورت میں برسا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ فلاسفہ کے سن گھڑت اور باطل اقوال اور نظریات ہیں جن پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ بخارات اکثر شدت گرمی کی وجہ سے اوپر بلند ہوتے ہیں لیکن کئی کئی سال تک بارش نہیں برتی، کبھی کبھی موسم سرما میں متواتر کئی کئی دن

بارشیں برتی رزقی ہیں، جب کہ اس موسم میں بخارات کا چڑھنا نہیں پایا جاتا۔ اگر بات اس طرح ہوتی تو کبھی بادل سارے کا سارا پگھل جاتا اور پھر کبھی دکھائی نہ دیتا۔ اسی طرح بخارات تو ہر وقت بلند ہوتے رہتے ہیں لیکن شہاب کسی وقت دکھائی دیتے ہیں۔ اگر بخارات سے شہاب بنتے تو ہمیشہ دکھائی دیتے چاہئیں۔ فلاسفہ کے یہ تمام اقوال اور نظریات کتاب دست کے مخالف ہیں اور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (ترجمہ) اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی۔ ایک اور مقام پر فرمایا: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا (ترجمہ) اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ وَنَزَّلْنَا السَّمَاءَ الذَّلِيَّةَ يُسْقِطُ عَلَيْهَا مِثْقَالَ الذَّرَّةِ (الی قول) شہاب ثاقب۔**

امام بخاری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تاروں کو تین وجود کے لئے پیدا فرمایا ہے (1) آسمان کی تزیین کے لئے (2) شیطانوں کو مارنے کے لئے (3) راہنمائی حاصل کرنے کے لئے بطور علامت بنانے کے لئے۔ جس نے ان کے علاوہ کوئی اور تاویل بیان کی ہے اس نے خطا اور غلطی کی ہے اور اس نے بغیر علم کے گفتگو کی ہے (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی کام کا آسمان میں فیصلہ فرماتا ہے تو ملائکہ اس کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں یوں لگتا ہے گویا کسی چٹان پر زنجیر لگ رہی ہے پھر جب ملائکہ کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کیا کہا تمہارے رب نے۔ دوسرے کہتے ہیں اس کا فرمان حق ہے وہی بلند وبالا اور عظمت والا ہے فرشتوں کی اس گفتگو کو چوری چھپے سننے والے (جن) سن لیتے ہیں پھر ان سے اسی طرح دوسرے چوری چھپے سننے والے (جن) سنتے ہیں۔ یہ جن ایک دوسرے کے اوپر نیچے قطار میں ہیں (2) سفیان نے اپنا ہاتھ ترچھا کر کے انگلیوں کو کشادہ کر کے اشارہ فرمایا کہ شیطان اس طرح اوپر نیچے میں جیسے انگلیاں اوپر نیچے ہیں) اور والے سن کے نیچے والوں کو بتاتے ہیں پھر وہ اپنے سے نیچے والوں کو بتاتے ہیں حتیٰ کہ یہ بات جا دو گریا کا من کی زبان پر پہنچ جاتی ہے۔ اکثر شیطانوں کی بات کو آگے پیچھے سے پہلے شہاب ثاقب پہنچ جاتا ہے اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ بعض اوقات شیطان شہاب کے پہنچنے سے پہلے بات نیچے والوں کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ سنتے والا اس بات کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے پھر لوگ کہتے ہیں فلاں کا بن اور جا دو گریا نہیں فلاں دن ایسا ایسا کہا نہیں تھا؟ پس اس ایک بات کی وجہ سے جو اس نے آسمان کی طرف سے سنی تھی اس کی تصدیق کی جاتی ہے یعنی اسے سچا سمجھا جاتا ہے (3)۔

مسلم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہمارا پروردگار جس کا نام بڑا بابرکت ہے جب کوئی حکم فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں پھر ان کے قریب آسمان دنیادے تسبیح بیان کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ تسبیح آسمان دنیا کے فرشتے کرتے ہیں پھر حاملین عرش کے قریب والے فرشتے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم سناتے ہیں پھر ہر آسمان والے اپنے اپنے اور والے آسمان کے فرشتوں سے پوچھتے ہیں حتیٰ کہ یہ سلسلہ آسمان دنیا کے فرشتوں تک پہنچتا ہے۔ پس جن چوری چھپے اس بات کو سن لیتے ہیں پھر وہ اپنے دوستوں (کاہنوں) کو پہنچاتے ہیں۔ پس وہ جو کچھ سن کر لائے ہیں وہ تو حق ہے لیکن وہ اس میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں اور بات میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا

2۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1804 (ابن کثیر)

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 69-1168 (ابن کثیر)

3۔ جامع ترمذی، جلد 5، صفحہ 338 (ابن کثیر)

ہے کہ ملائکہ عنان میں اترتے ہیں۔ عنان سے مراد بادل ہے اور اس بات کا ذکر کرتے ہیں جو آسمان میں ہو چکی ہوتی ہے۔ شیطان وہ بات چوری چھپے سنتے ہیں اور کابنوں کو پہنچاتے ہیں۔ وہ اس بات کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ ملاتے ہیں (1)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ جس شیطان کو شہاب لگتا ہے وہ اذیت اٹھا کر واپس آ جاتا ہے یا مل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ لیکن اوپر جانے والے شیطان کو بھی شہاب لگ جاتا ہے لیکن کبھی (و فرشتوں کی جگہ بھاگ جاتا ہے جس کی وجہ سے) شہاب اسے نہیں لگتا جیسا کہ کشتی پر سوار کی طرف موجیں بلند ہوتی ہیں کبھی اسے غرق کر دیتی ہیں اور کبھی موجیں کشتی سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ اسی لئے لوگ کشتیوں میں سفر کرنے سے بالکل اجتناب نہیں کرتے۔ اسی طرح جن بعض اوقات شہاب کی چوٹ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس لئے انکی حرکتوں سے باز نہیں آتے (2)۔

فَأَسْتَفْتِيهِمْ هُمْ أَشَدُّ حَلْقًا أَمْ مَنْ حَلَقَنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ ①

”پس آپ ان سے پوچھئے آیا وہ زیادہ مضبوط ہیں خلقت کے اعتبار سے یا (دوسری چیزیں) جنہیں ہم نے پیدا فرمایا۔ بے شک ہم نے پیدا کیا ہے انکی لیسہ اور کچھڑ سے۔“

اس استفہام میں ضمیر منسوب کا مراد متحرکین کہ ہیں اور من خلقتنا سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مثلاً آسمان زمین اور ان کے درمیان موجود مخلوق مشرق مغرب ستارے اور شہاب ثاقب۔ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے من ذکر فرمایا۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ام من خلقتنا سے مراد گذشتہ قومیں ہیں مثلاً قوم عاد ثمود، یعنی ان کے علاوہ جو ہم نے گذشتہ قومیں پیدا کیں جنہیں ہم نے ان کے کړوتوں کے باعث ہلاک کر دیا۔ وہ از روئے خلقت مضبوط تھے یا تم مضبوط اور طاقتور ہو۔ ہم نے انہیں جب شہمت و شہوت رعب و دہد بے باوجود نہیں کر دیا (تو تم کسی باغ کی مولیٰ ہو) تم کو ہمارے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہو۔ پہلی تاویل انهم اشد حلقاً ام السماء کے قول کے مطابق ہے۔ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ کا ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ام من خلقتنا سے مراد کوئی مخصوص قوم اور چیز نہیں بلکہ تمام مخلوق ہے۔

عَنْ طِينٍ لَّازِبٍ ہاتھ سے چمٹ جانے والی مٹی، مچا ہوا دھماکہ نے لازب کا معنی بدیواریا کیا ہے (3) انسانوں کی تخلیق اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں یہی چیز تفریق کرنے والی ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بغیر کسی سابق مادہ کے ہوئی ہے، جب کہ حضرت انسان کی تخلیق سے پہلے اس کا مادہ مٹی اور پانی موجود تھا، اس سے اس کا جسم تیار کیا گیا۔ اس جملہ میں ایک سوال موجود ہے جو ہم بتساء لون کے بعد عن النبأ العظيم کے ذکر کے طریقہ پر ہے۔ اس کلام سے مقصود دیگرین قیامت کا درجہ کیونکہ انسان کی تخلیق کا لیسہ ارٹھی سے ہونا اس کے ضعف پر بہت بڑی گواہی ہے کیونکہ جس کی تخلیق مٹی سے ہو اس میں اتنی صلابت اور قوت نہیں ہو سکتی جس جو ذرات آسمانوں اور دوسری بڑی تخلیقات پر قادر ہے وہ یقیناً اس چیز پر بھی قادر ہوگی جو آسمانوں اور دوسری بڑی اشیاء کے مقابلہ میں حقیر اور بے وقعت ہے۔ اس آیت سے کفار کے قول إِذَا كُنَّا تُرَابًا أَوْ آخِلًا فَنُحْيِيهِمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ ۱ (کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائیگا) کا رد فرمایا ہے کہ پہلے جب ان کی تخلیق لیسہ ارٹھی سے ہوئی ہے تو پھر یہ دوبارہ مٹی سے تخلیق کرنے کا انکار کیسے کرتے ہیں۔ لیسہ ارٹھی پانی کے اجزاء کو مٹی کے اجزاء سے ملانے سے بنتی ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 62 (اعلیٰ)

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1175 (ابن کثیر)

3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 512 (اعلیٰ)

مٹی اور پانی دونوں باقی بھی ہوں گے اور ان میں آپس میں ملنے کی قابلیت بھی ہوگی اور جو اس سے انسان کو تخلیق فرمانے والا ہے اس کو قدرت میں کوئی تغیر و تبدیلی بھی جائز نہیں تو پھر دوبارہ زندہ کرنا کیسے محال اور یہ (عقل کے دشمن) کیسے قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ﴿٦٠﴾

”آپ تو اظہارِ تعجب کرتے ہیں (قدرت کے کرشمے دیکھ کر) اور وہ تمسخر اڑاتے ہیں۔“

بل اضرب کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف منتقل ہونے کے لئے ابتدا یہ ہے۔ جب اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو انہوئی چیز دیکھنے کے وقت لائق ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو عجبیت کے فعل کے ساتھ اور تعجب کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عجب ربکم من قوم یسألون الہی الخبیۃ فی السائل (۱) اسی طرح سبحانہ ما اعظم شأنہ کا ارشاد ہے۔ اسی طرح جب کا اطلاق اس شے پر بھی ہوتا ہے جس کی مثال معبود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحٰنَا اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ (ترجمہ) کیا (یہ بات) لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے۔ اور تعجب کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو انتہائی حسین اور خوبصورت دیکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے اعجبنی کذا اس مفہوم میں یہ ارشاد الہی بھی ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُ قَوْلَهُ (ترجمہ) اور اسے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے عجب ربکم من شایب نیست لہ صلوٰۃ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عجب ربکم من الکرم و فنون حکم۔

کبھی انتہائی بری چیز دیکھنے کے وقت بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً عرب کہتے ہیں عجبک من بخیلک و شرہک مجھے تیرا بخل اور لالچ انتہائی برا لگا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

شَہَنَانِ عَجَبَانِ ھَمَا اَبْرَدُ مِنْ نِیْحِ شَیْخٍ یَبْضِیْ یَبْضِیْخُ

دو چیزیں بہت بری لگی ہیں دونوں برف سے زیادہ ٹھنڈی ہیں بوڑھے کا بچہ بیٹا اور بچے کا یاز بھانجا۔

تعجب کا صیغہ اس وقت بھی استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو بہت زیادہ دیکھتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے ما اکرہہ و ما اطفاہ و ما اشد استخراجه و ما اجهله و ما اشد بیاضہ، یعنی وہ کتنا کریم ہے وہ کتنا تیز رفتار ہے۔ اس کا ناکار کتنا سخت ہے وہ کتنا جاہل ہے اس کی سفیدی کتنی زیادہ ہے، بعض علماء فرماتے ہیں جب ایسی حالت ہے جو انسان کو اس وقت لائق ہوتی ہے، جب کہ وہ کسی شے کے سبب سے ناواقف ہو، اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر تعجب کا اطلاق درست نہیں کیونکہ اس کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے (وہ سب کو جانتا ہے) بعض علماء فرماتے ہیں جب وہ حالت ہے جو انسان کو اس وقت لائق ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو بہت بڑا اور عظیم سمجھتا ہے۔ صحیح ہے کہ ان دونوں تفسیروں کا مال بھی وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کیونکہ انسان اسی چیز کو عظیم سمجھتا ہے جس کی شکل پہلے نہ دیکھی ہو اور انسان غیر معبود چیز کے سبب سے نا آشنا ہوتا ہے۔ پس حمزہ اور کسائی کی قرأت میں ظاہر سے پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عجبیت شکم کا صیغہ ہوتا نام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب علی سبیل فرض اور تکمیل ہوگا یا علی الاستعظام الا لازم لہ ہوگا (۲) (یعنی اگر میرے لئے تعجب کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قدرت پر تعجب کرتا یا اس پر تعجب کرتا جو قیامت کا انکار کرتا ہے۔

جس کا سب انسان کو معلوم نہ ہو اس کو دیکھ کر جو انسان کو کیفیت لاحق ہوتی ہے اسے عجب کہتے ہیں۔ پس انسان اس چیز کو بڑا سمجھتا ہے جو حد قیاس سے خارج ہوتی ہے (بعض علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے قولی مقدر ہے، یعنی نقلی یا محمد عجبث (اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیے میں عجب کرتا ہوں) علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب کا مطلب اس کا انکار کرنا اور کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار اور مذمت کے لئے ہوتا ہے جیسے اس آیت کریمہ میں ہے۔ کبھی استحسان کے معنی میں ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے عَجِبْتُ رَبُّكُمْ مِنْ شَأْبٍ لَيْسَتْ لَهُ صِبْوَةٌ۔

حضرت جنید (بغدادی) سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز سے تعجب نہیں فرماتا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت فرماتا ہے فرمایا وَإِنْ لَعَجِبْتَ فَصَبِّحْ قَوْلَهُمْ یعنی واقعی اس طرح ہے جیسا آپ کہتے ہیں۔ جمہور قراء نے عسجت مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ آپ کو کجھلاتے ہیں حالانکہ یہ آپ کے اہلین اور صادق ہونے کے معترف بھی ہیں اور معجزات آپ کی صداقت کے گواہ بھی ہیں قرآن کے معجزہ ہونے کے بھی اقرار ہی ہیں یا یہ بھی کہا آپ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی دوبارہ اٹھانے کی قدرت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس کی قدرت ہر چیز میں نمایاں ہے کیونکہ آپ کے لئے یہ امر معهود نہیں تھا اس لئے آپ تعجب کرتے تھے۔ قوادہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر تعجب کرتے کہ قرآن نازل ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی انسان گمراہ ہو رہے ہیں۔ اس تعجب کی وجہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال یہ تھا کہ جو قرآن سنے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ مشرکین نے جب قرآن کی آیات سنیں تو وہ مذاق اڑانے لگے اور اس پر ایمان نہ لائے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا اے محبوب آپ تعجب کرتے ہیں اور یہ گستاخ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یسبحون ہم بمحمد المقدر کے ساتھ عسجت کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ آپ کے تعجب کرنے کا مذاق کرتے ہیں اور آپ دوبارہ اٹھنے کو تابت کرتے ہیں اس کا تسخر اڑاتے ہیں۔

وَإِذَا كُفِرُوا بِالْآيَاتِ كُفِرُوا ۝

”اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے۔“

۱۔ جب ان کے سامنے حشر کی صحت پر دلالت کرنے والے دلائل بیان کئے جاتے ہیں تو اپنی کندھنی اور قلت تدبر کے باعث ان دلائل سے نفع حاصل نہیں کرتے۔

وَإِذَا سَأَدُوا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ۝

”اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے لگتے ہیں۔“

۱۔ یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے میں انتہا کر دیتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ ایک دوسرے کو بلا تے ہیں کہ اس معجزہ کا تسخر اڑائیں۔ ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں آية (معجزہ) سے مراد انشقاق القصور (چاند کا ٹکڑے ہونا) ہے۔

وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

”اور کہتے ہیں ہمیں ہے یہ مگر کھلا جادو۔“

۱۔ یعنی جو وہ حمزہ دیکھتے اسے کھلا جاو کہہ کر رو دیتے۔

عَرَادًا وِشْتَاوْ كَثَّ اَثْرَابًا وَّ عَظَامًا ۙ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٦٠﴾

”کیا جب ہم مر جائیں گے اور (مر کر) مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے (تو) کیا ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔“
۱۔ معنا کو نافع حمزہ اور کسائی نے ہم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اصل میں اِنْبَعُثْ اِدْبَعْنَا تھا۔ پھر کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے جملہ فعلیہ کو اس میں سے بدل دیا گیا اور ظرف کو مقدم کیا گیا اور حمزہ کو کمر لایا گیا نیز اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ رو بارہ اٹھنا ویسے بھی عجیب ہے لیکن مٹی اور ہڈیاں ہو جانے کے بعد زندہ ہونا تو مزید عجیب تر اور محال ہے۔ یہ قرأت ابن عامر کی قرأت سے زیادہ بیخ ہے جس میں پہلے حمزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نافع، کسائی اور یعقوب کی قرأت سے بھی زیادہ بیخ ہے جس میں دوسرے حمزہ کو سا قاطر کیا گیا ہے۔

اَوْ اَبَا وَاَوْ كَا وَاَوْ لَوْنٌ ﴿٦١﴾

”اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی۔“

۱۔ اس کا عطف اِنْ کے اسم کے گل پر ہے۔ یا مبعوثون کی ضمیر پر ہے۔ کیونکہ اَوْ اَبَا وَاَوْ كَا وَاَوْ لَوْنٌ کی وجہ سے مبعوثون سے جدا ہے۔ (اگر درمیان میں حمزہ ہو تا تو ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف کرنا جائز نہ ہوتا) اور استفہام اس بات کے انکار کے لئے ہے کہ ان کو اور ان کے اگلے باپ دادا کو اٹھنا دوبارہ اٹھایا جائے گا اتنا زمانہ گزرنے کے بعد تو مزید عجیب اور محال ہے۔ نافع اور ابن عامر نے (او) کی او کو تردید کے معنی پر ساکن کر کے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر عطف جائز نہیں ہے۔

قُلْ نَعْمَ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿٦٢﴾

”فرمائیے ہاں (ضرور) اس حال میں کہ تم ذلیل و خوار ہو گے۔“

۱۔ یعنی تمہیں اور تمہارے آباء و اجداد کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کسائی نے نَعْمَ کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی اس میں ایک لغت ہے۔ و انتم داخرون، مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے داخور کا معنی انتہائی ذلیل و خوار ہونا ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرًا وَّ وَاٰجِدُكَ قَاذًا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿٦٣﴾

”پس قیامت تو فقط ایک جھڑکی ہوگی پس وہ (اٹھ کر ادھر ادھر) دیکھنے لگیں گے۔“

۱۔ فَاِنَّمَا هِيَ یہ مقدر شرط کا جواب ہے، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو یہ ایک جھڑکی ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہی ضمیر مبہم ہے۔ اور اس کی وضاحت اس کی خبر زَجْرًا وَّ وَاٰجِدُكَ کر رہی ہے۔ زَجْرًا وَّ وَاٰجِدُكَ سے مراد جھڑکانیہ ہے۔ زجر کا معنی دھتکارنا اور بخت آواز سے کسی کو منع کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں زجر الواعی غنمہ، یعنی چرواہے نے بکریوں کو واپس آنے کے لئے آواز دی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتدائی تخلیق کے وقت ٹھنکی کا مرفر مایا تقاضا ہی طرح دوبارہ زندہ کرنے کے لئے بھی کن کارشاد ہوگا اور سب اگلے پچھلے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس وجہ سے اس کے بعد قَاذًا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ذکر فرمایا کہ جب جھڑکانیہ ہوگا تو سب اپنی اپنی قبروں سے کھڑے ہو جائیں گے اور ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے یا بظنوں بمعنی بے نظروں ہے۔ یعنی منظر ہوں گے کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔

وَقَالُوا أَيُّ يَوْمِنَا هَذَا أَيُّومَ التَّيْنِ ۝

”اور کہیں گے ہم برباد ہو گئے! یہ تو یوم جزاء ہے۔“

۱۔ لفظ ”یا“ تنبیہ کیلئے ہے۔ دلیل مصدر ہے جس کا لفظ کوئی فعل نہیں ہے۔ قالوا کا عطف بنظرون پر ہے اور قالوا بقولون کے معنی میں ہے۔ یوم التین سے مراد یوم جزاء ہے، یعنی اس میں ہمارے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

هَذَا أَيُّومَ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكْفَرُونَ ۝

”(ہاں ہاں) یہی فیصلہ کا دن ہے جس (کی آمد) کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

۱۔ یعنی یہ وہ دن ہے جس میں نیکو کار اور مجرم کے درمیان فرق کیا جائے گا یا یہ فیصلہ کا دن ہے اس میں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مالٹکا کا یوم ہے۔ منکرین قیامت کی کلام یوم التین پر مکمل ہو چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام بھی منکرین کا ہے جو وہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

أَحْسَرُوا وَالَّذِينَ ظَلَمُوا أَوَّارُوا أَجْهَمُوا وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝

”(اے فرشتو) جمع کرو جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی یہ عبادت کیا کرتے تھے۔“

۱۔ ظلموا سے مراد انہیں کو ہے، یعنی جنہوں نے شرک کیا کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، یعنی فرشتوں کو حکم ہو گا کہ مشرکوں اور ان کے ہم مشرکوں اور ان کے پیروکاروں اور ان کے معبودوں یا بلا سب کو میدانِ حشر میں حساب و جزاء کے لئے جمع کرو۔ علامہ تہجدی نے نعمان بن بشیر کے طریق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو یہ فرماتے سنا ہے أَحْسَرُوا وَالَّذِينَ ظَلَمُوا أَوَّارُوا أَجْهَمُوا سے مراد یہ ہے کہ سو دو سو خوروں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے بدکار بدکاروں کے ساتھ ہوں گے اور شراب خور شرابیوں کے گروہ میں ہوں گے۔ جنت میں بھی ہم مشرب لوگ اکٹھے ہوں گے اور دوزخ میں بھی ایک جیسے کہ تو توں کے حامل لوگ جمع ہوں گے (۱)۔ تہجدی نے ابن عباس سے ازواجہم کا معنی اشیاء ہم نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب ان کے مشابہ لوگ ہیں۔ قادمہ اور کلیں فرماتے ہیں ازواجہم سے مراد یہ ہے کہ جو ان کی مشعل عمل کرتے تھے پس شرابی شرابیوں کے سو دو سو خوروں کے ساتھ ہوں گے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد شیطان دوست ہیں بکافر اپنے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہوگا۔ اسن فرماتے ہیں ازواجہم سے مراد ان کی شرک کرنے والی بیویاں ہیں (۲)۔

مِنْ دُونِ اللَّهِ قَاهُدُّوْهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝

”اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پائیں سیدھے چلو انہیں جہنم کی راہ کی طرف۔۔۔“

۱۔ یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن جن بتوں کی عبادت کرتے تھے، مقابل سے دُونِ اللَّهِ سے مراد شیطان لیا ہے۔ اور بطور دلیل یہ ارشاد پیش کیا ہے اَنْ لَا تَعْبُدُوا الْغُلُوبَانَ ۝ اور فرماتے ہیں (۳)۔ لفظ مخصوص ہے عام نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝ (ترجمہ) بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقرر ہو چکی ہے ہماری طرف سے جہلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ دُونِ اللَّهِ سے مراد وہ سب نہیں ہیں جن کی عبادت کی جاتی

تھی۔ (مثلاً عبادت تو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودی عزیر علیہ السلام کی کرتے تھے لیکن ان کے لئے یہ عہم نہیں ہے بلکہ من دون اللہ سے مراد شیطان ہے) ابن عباس فرماتے ہیں فَاذْكُرْهُمْ مَا مَطْلَبُ يَهِيءُ كَمَا نَشِئْتُمْ فِي دُورِخِ كِي طَرْفِ رَايْتُمَا كِي رُوَايْتِ كِي سَا ن فرماتے ہیں انہیں دوزخ کی طرف لے جاؤ۔ عرب سائق (بیچے سے ہانکنے والا) کو بھی ہادی کہتے ہیں (1)۔

وَقَفُّوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْنُوْنَ ﴿۱﴾

”اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی!“

۱۔ مفسرین فرماتے ہیں جب مشرکوں کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو پل صراط کے پاس انہیں روک لیا جائے گا، ارشاد ہوگا انہیں روک لو ان سے باز پرس کی جائے گی۔ اِنَّهُمْ مَسْئُوْنُوْنَ کا جملہ قفو اکی علت ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں مشرکوں سے ان سے افعال و اقوال سب کے متعلق باز پرس ہوگی۔ ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ ان سے لا اِلهَ اِلا اللّٰهُ کے متعلق سوال ہوگا (2)۔ مسلم نے ابو ہریرہ السلمی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے پاؤں پل صراط سے جدا نہ ہوں گے حتیٰ کہ چار چیزوں کے متعلق ان سے باز پرس کرنی جائے گی۔ 1۔ عمر کے متعلق سوال ہوگا کہ کن مشاغل میں بسر کی۔ 2۔ جسم کے متعلق سوال ہوگا کہ کس کام میں اسے کزور کیا۔ 3۔ علم کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر کتنا عمل کیا۔ 4۔ مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے مال کیا اور پھر کس مقصد میں اسے خرچ کیا (3)۔

ترمذی اور ابن مردویہ نے اسی کی مثل حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کی ہے۔ طبرانی نے حضرت معاذ بن جبل اور دراء اور ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ابن المبارک نے ابوالرعد میں ابوالدرء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھے سب سے زیادہ خوف ان بات کا ہے جب حساب ہوگا تو مجھ سے پوچھا جائے گا جو تیرے پاس علم تھا اس پر کتنا عمل کیا (4) امام احمد نے ابوالرعد میں ابوالدرء سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز جو سوال ہوگا وہ یہ ہوگا کہ جو تجھے علم تھا اس پر عمل کتنا کیا۔

ابن ابی حاتم نے ابی بن عبد اللہ الکلابی سے روایت کیا ہے کہ جنہم کے سات پل ہیں، ان پر پل صراط ہے، پہلے پل کے پاس لوگوں کو روکا جائے گا ارشاد ہوگا ان کو روک لو، ان سے باز پرس کی جائے گی پس پہلے نماز کے متعلق پوچھا جائے گا اور نماز کے متعلق پوچھا جائے گا پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا اور جو نجات پائے گا وہ نجات پائے گا۔ وہ نجات پائے گا جب دوسرے پل کے قریب پہنچیں گے تو امانت کے متعلق مجاہد ہوگا کہ کہیے اسے ادا کیا اور کہیے اس میں خیانت کی پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہوگا اور جو نجات پائے گا وہ نجات پائے گا۔ جب تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ داری کے متعلق سوال ہوگا کہ رشتہ داری کو کیسے قائم رکھا اور کہیے اسے توڑا پس ہلاک ہو گا جو ہلاک ہوگا اور نجات پائے گا۔ جو نجات پائے گا اس دن رحم (رشتہ قرابت) ہوگا اور نجات پائے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا (آج) تو بھی اسے ملا اور جس نے (دنیا میں) مجھے توڑا (آج) تو بھی اسے توڑے (

مَا لَكُمْ لَا تَنصَرُونَ ﴿۱﴾

”تمہیں کیا ہو گیا تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے!“

1۔ تفسیر بیہقی، جلد 4، صفحہ 59-55 (انگریزی)

2۔ تفسیر بیہقی، جلد 4، صفحہ 559 (انگریزی)

3۔ کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 170 (اعلیٰ)

3۔ جامع ترمذی، صفحہ 2417 (حدیث)

فَصَحَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا أَكْرَمًا ۚ إِنَّكَ إِتَّقُونَ ﴿٦١﴾

”پس لازم ہو گیا ہم سب پر اپنے رب کا حکم اب (خوٹا خواہ) ہم عذاب کو دیکھنے والے ہیں۔“

۱۔ اس کلام کا عطف محذوف کلام پر ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی كُنْتُمْ فَمَا طَاعْتُمْ كَمَا كُنْتُمْ طَاعَتِنَ فَحَقَّ عَلَيْنَا جَمِيعًا۔ یعنی تم مجھ پر اپنے رب کے نافرمان تھے جیسے ہم نافرمان اور سرکش تھے پس ہم سب پر ہمارے رب کا حکم واجب و لازم ہو چکا ہے۔ قول رہنا سے مراد یہ ارشاد ہے لَا تَمْلِكُ لَهُمْ مِنْ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اٰجْمَعِينَ ﴿٦٠﴾ (ترجمہ) کہ میں ضرور بھروسہ کا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔

فَاَعْوَيْتُمْ لَنَا كَمَا عَوَيْتُمْ ﴿٦٢﴾

”پس ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا ہم خود بھی گمراہ تھے۔“

۱۔ یعنی دونوں گمراہوں کا گمراہ ہونا اور عذاب میں مبتلا ہونا ایسا امر ہے جس کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے۔ ہم نے تو صرف یہی کیا کہ تمہیں بھی اس گمراہی کی طرف بلایا جس میں ہم خود گرفتار تھے ہماری تو یہی خواہش تھی کہ تم بھی ہماری طرح گمراہ ہو جاؤ۔

فَالْتَهُمُ بِيَوْمِئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٦٣﴾

”پس وہ (سب) اس روز عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔“

۱۔ فاء سمیت کیلئے ہے۔ یعنی جب رؤساء متبعین کفار اور ان کے ساتھی سب جب گمراہ تھے تو آج سب عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔

إِنَّا كُنَّا لَنَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٦٤﴾

”ہم اس طرح سلوک کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ۔“

۱۔ کئی لفظ مصدریت کی بنا پر عمل نصب میں ہے، یعنی نفع فعل کے مصدر کی صفت ہے اور ک مثل کے معنی میں ہے۔ مجرمین سے مراد ہر شرک۔ مجرم سے مراد شرک ہونے کی تائید آنے والا ارشاد بھی کرتا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٦٥﴾

”کفار کا یہ حال ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں۔“

وَيَقُولُونَ إِنَّا لَنَأْتِيَنَّكَ الرَّسُولُ بِالْبَيِّنَاتِ لِنُعْلِّمَهُنَّ ۚ وَلَٰكِن لَّا نَرَىٰ لَكَ قُوَّةً ۗ وَلَا نَبِيًّا ۗ ﴿٦٦﴾

”اور کہتے ہیں کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے خدا کو ایک شاعر اور دیوانے کے کہنے سے۔“

۱۔ شاعر اور مجنون سے ان کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہرزہ سرائی کا رد کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٧﴾

”دیوانے تو یہ خود ہیں (وہ تو دین حق لے کر آئے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں سارے رسولوں کی)۔“

۱۔ جَاءَ کا فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیغامِ توحید لے کر آئے ہیں جس پر دلائل و براہین قائم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ توحید اور نیکو اور نیا نہیں ہے بلکہ پہلے رسولوں کا دعویٰ بھی یہی تھا۔ یہ تو ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس کا

دعویٰ ان کے دعویٰ کے موافق ہے۔

إِنَّكُمْ لَذَاقُوا الْعَذَابَ الْآلِيمَ ﴿٦٦﴾

”(اے مجرمو) تم ضرور چکھو گے دردناک عذاب کو۔“

اس کلام میں شیعوں سے خطاب کی طرف التفات ہے، یعنی اسے مجرموں نے تم نے شرک کیا اور رسولوں کی تکذیب کی اس لئے تمہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔

وَمَا تَجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٧﴾

”اور نہیں بدل دیا جائے گا تمہیں عمر ای کا جو تم کیا کرتے تھے۔“

یعنی دنیا میں جو تم شرک و اعمال کرتے تھے اسی کا ہی تمہیں بدل ملے گا۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْخَاصِينَ ﴿٦٨﴾

”البتہ اللہ کے مخلص بندے (اس عذاب سے محفوظ رہیں گے)۔“

یہ استثناء منقطع ہے لیکن اگر تَعْمَلُونَ میں ضمیر کا مروج تمام مکلفین ہوں تو استثناء مماثلت کے اعتبار سے ہوگی کیونکہ مخلصین کا ثواب سات سو گنا تک بلکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا بڑھادے گا۔ استثناء منقطع بھی اسی اعتبار سے ہوگی (یعنی اگر استثناء منقطع ہو تو گویا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا تمہارے اعمال کی مقدار کے مطابق دی جائے گی لیکن موجدین اور مخلصین کے لئے ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ان کی جزا اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے کئی گنا بڑھادی جائے گی پس مشرکین سے مخلص کی استثناء اس اعتبار سے ہوگی کہ مشرکین کی جزا ان کے عمل کے مطابق ہوگی اور موجدین کی جزا کئی گنا زیادہ ہوگی)

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٦٩﴾ فَوَٰكِهِمْ ﴿٧٠﴾ وَهُمْ فَكْرٌ مُّؤَنٌ ﴿٧١﴾ فِي جَنَّتِ التَّعِيمِ ﴿٧٢﴾

عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفِينَ ﴿٧٣﴾

”وہی ہیں انہیں وہ رزق دیا جائے گا جس کی کیفیت معلوم ہے۔ لہذا یہ بچل اور ان کا بڑا احترام و اکرام کیا جائے گا۔“

(اور وہ) نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔ (زرنگار) پتنگوں پر آنے سے سانسے بیٹھے ہوں گے۔“

رزق معلوم سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا رزق ہے جس کی خصوصیات مثلاً ہمیشہ باقی رہنا اور لذیذ ہونا معلوم ہیں۔ اسی لئے رزق معلوم کی تعریف فواکہ سے کی گئی ہے فواکہ کھانے کی چیز ہے۔ یہ رزق کا بدل یا پیمانہ ہے۔ اور فواکہ سے مراد ہر وہ چیز ہے۔ جس سے تلذذ حاصل کیا جائے بطور خوراک استعمال نہ ہو اور قوت اسے کہتے ہیں جو بطور غذا استعمال ہو لذت مقصود نہ ہو۔ رزق کا لفظ تلذذ اور خوراک دونوں کو شامل ہے۔ اہل جنت کی تخلیق ہی ایسی ہوگی کہ ان کے اجسام ضائع اور ختم نہ ہوں گے اس لئے ان کا رزق خالص بچل ہوں گے (بطور غذا کوئی چیز انہیں استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی تا کہ ان کے اجسام باقی رہیں)

اس کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ انہیں ہر چیز بغیر کسی مشقت اور سوال کے ملے گی۔ دنیا کے رزق کے حصول میں جس طرح مشقت اور تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنت میں ایسا نہیں ہوگا اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ پر ہے یا یہ حال ہے یا اولنک کی خبر ہے۔

سے طرف مستقر کے متعلق ہے، یعنی ان کے لئے رزق ہے جو جنت میں معلوم ہے اور جنت میں سوائے نعمتوں کے اور کچھ نہیں ہے یا یہ مکرمون کے متعلق ہے یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہے یا اولئک کی دوسری خبر ہے۔

۲۔ علیٰ سرور، حال ہے یا خبر ہے۔ اس کے خبر ہونے کی صورت میں اس میں جو ضمیر ممکن ہے وہ ذوالحال ہوگی اور متقابلین اس سے حال ہوگا۔ یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے علیٰ سرور، متقابلین کے متعلق ہے۔ اس صورت میں متقابلین مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكُلِّ سَائِرٍ مِّنْ مَّوَدِّنٍ ﴿٥١﴾

”پھر آئے جائیں گے ان پر پھٹکتے جام (شرابِ مطہور کے) چشموں سے پر کر کے ل۔“

۱۔ کاس اس جام کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو اور کبھی اس کا اطلاق نفسِ شراب پر بھی ہوتا ہے جیسے اعمش شاعر کا قول ہے و کناہبِ شَرِبْتُ عَلِيَّ لَذَّةً مَعْنَى بَهْتِ شَرَابِيں میں نے لذت کیلئے استعمال کیں۔ انخس کہتا ہے قرآن میں کاس سے مراد شراب ہی ہے (۱)۔ یہ جملہ حال ہے یا خبر ہے۔ من معین یا تو عانہ بعینہ سے اسم مفعول ہے۔ جس کا معنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ سطحِ زمین پر وہ شراب جاری ہوئی اور آنکھوں کے لئے ظاہر ہوگی یا یہ عین الماء سے ماخوذ ہے جو پانی کا منبع اور مخرج ہوتا ہے اور الماء المعین سے مراد وہ پانی ہوگا جو چشم سے نکلتا ہے اور جاری ہوتا ہے۔ جنت کی شراب کی معین سے صفت بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ بھی پانی کی طرح نہروں میں حقیقتہً جاری ہوگا یا اس لئے کہ جنتیوں کو جو پینے کے لئے شراب ملے گی وہ کمال لذت کی وجہ سے مختلف قسموں کی شرابوں سے جو لذت مطلوب ہوتی ہے اس کی جامع ہوگی۔

بِيضَاءَ لَدُنِّ الْقَلْبِ بَيْنَ ﴿٥٢﴾

” (دودھ سے زیادہ) سفید بڑے لذیذ پینے والوں کے لئے ل۔“

۱۔ دنیا کی شراب پینے کے وقت انتہا بد شکل دکھائی دیتی ہے لیکن جنت کی شراب انتہائی سفید ہوگی اور لذت سے بھر پور ہوگی۔ بیضاء اور لذت دونوں کاس کی صفیتیں ہیں۔ حسن فرماتے ہیں جنت کی شراب دودھ سے نکلتی زیادہ سفید ہے (۲) اور مبالغہ کے لئے لذت کو بطور صفت استعمال فرمایا اللذت تا بیض ہے لذت کی جس کا معنی لذیذ ہے جیسے طیب اور اس کا وزن فعل ہے۔

لَا فِيهَا عُوقُولٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ﴿٥٣﴾

”نہ اس میں مضرت کوئی چیز ہے اور نہ وہ اس (کے پینے) سے مدہوش ہوں گے ل۔“

۱۔ عوقول غالہ، بغلو سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو خراب کر دینا ہے۔ لا عوقول کا مطلب یہ ہے کہ وہ شراب ایسی ہے کہ اس میں فساد نام کی کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ دنیا کی شراب میں مفاسد اور مضرات ہیں مثلاً دنیا کی شراب پینے سے عقل ضائع ہو جاتی ہے، پیٹ میں درد ہوتا ہے سر پکڑانے لگتا ہے، آتی ہے پیشاب آتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے بنو فزول کو بابِ افعال سے زراہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، حفص نے سورۃ واقعہ میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں جگہ زراہ کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یاء کے ضمہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، نونف الشارِبِ مجہول بھی بولا جاتا ہے۔ فہو نزیف و منزوف، جب انسان مدہوش و مخمور ہو جائے

اور انوف الشراب اس وقت بولا جاتا ہے جب عقل یا شراب ختم ہو جائے۔ نرف کا اصل معنی ختم ہوتا ہے نرف لازم اور مستعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ النرف الشی نرفہ سے زیادہ بلیغ ہے۔ نرف کوئی کے ساتھ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر عام پر اس کو مطلق فرمایا کیونکہ شراب کا بڑا نقصان اور خسارہ یہ ہوتا ہے کہ عقل ضائع ہو جائے اور شرابی کے لئے سب سے تکلیف دہ امر وہ ہوتا ہے جب اس کی شراب ختم ہو جائے یعنی جنت میں نہ شراب ختم ہوگی اور نہ اس سے ہوش و حواس مختل ہوں گے۔

وَعِنْدَهُمْ قُصْرَاتُ الظَّرْفِ عَيْنٍ ﴿۵﴾

”ان کے پاس ہوں گی چٹنی نگاہوں والی آہوشم (عورتیں)۔“

یعنی ان جنت کے کنبھوں کے پاس ایسی عورتیں ہوں گی جو اپنے خاندنوں پر اپنی نگاہوں کو لٹکائے ہوں گی، کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا انہیں گوارا نہ ہوگا کیونکہ ان کے خاندانی ان کے نزدیک حسین ترین ہوں گے۔ عین مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی ہن عین عرب کہتے ہیں۔ رجل عین، موئی موئی حسین آنکھوں والا مرد۔ امرؤ عیناء موئی موئی حسین آنکھوں والی عورت، رجال و نساء عین۔ یعنی جمع کے لئے عین استعمال ہوتا ہے۔

كَانَھُنَّ بَيْضَ مَكْنُونٍ ﴿۶﴾

”گویا وہ (شتر مرغ کے) انڈوں کے مانند گردو غبار سے محفوظ لے“

ابن جریر نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عین یعنی موئی موئی آنکھوں والیاں ان کی چٹکیں گدھ کے پروں کی طرح ان کی آنکھوں پر ہوں گی (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے كَانَھُنَّ بَيْضَ مَكْنُونٍ کے متعلق فرمایا ان کی جلد اتنی ملائم و نرم ہوگی جیسے انڈے کے اندر سفیدی کے اوپر باریک پردہ ہوتا ہے (2) بیض جمع ہے، بیضی کی (مکون مذکر لفظ ذکر فرمایا حالانکہ یہ جمع کی صفت ہے) موصوف کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے صفت کو مذکر فرمایا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں جنتی خوروں کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ شتر مرغ ان کو غبار اور ہوا سے اپنے پروں کے ساتھ چھپائے رکھتا ہے اور اس کے انڈوں میں سفیدی زردی میں ایک لطیف انداز میں ملی ہوئی ہوتی ہے (3) یہ زردی مائل سفیدی عورتوں کا خوبصورت ترین رنگ سمجھا جاتا ہے۔ عرب اسی وجہ سے عورتوں کو شتر مرغ کے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۷﴾

”پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے (اور) سوال جواب کریں گے لے“

یعنی جنتی آپس میں گفتگو کریں گے اور دنیا کا گذشتہ حال پوچھیں گے۔ یہ جملہ بطاف علیہم پر معطوف ہے، یعنی وہ شراب طلبور کے جام نوش فرمائیں گے اور شراب پر گفتگو کریں گے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

وَمَا بَقِيَتْ مِنَ اللَّذَاتِ إِلَّا أَخَادِيثُ الْكِرَامِ عَلَى الْمَدَامِ

یعنی اب کوئی لذت باقی نہیں ہے مگر شراب کے اوپر سرداروں کی گفتگو شراب نوشی کے وقت عربوں کی عادت تھی اور یہ گفتگو تمام لذتوں سے زیادہ لذت دہن ہوتی تھی۔ تاکہ ایک کے لئے ماضی کے صیغہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿١﴾

”کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا۔“

۱۔ یہ اہل جنت کی گفتگو کا بیان ہے کہ ایک کہے گا دنیا میں میرا ایک لنگوٹیا رہتا تھا جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتا تھا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس قرین سے مراد شیطان ہے۔ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں انسانوں میں سے ایک دوست کا ذکر ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہاں قرین سے مراد بھائی ہے۔ باقی مفسرین فرماتے ہیں یہ دونوں آپس میں شریک تھے، ایک کا فر تھا جس کا نام مطروس تھا اور دوسرا مومن تھا جس کا نام یہود تھا یا یہ ان آدمیوں کا ذکر ہے جن کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف میں ذکر فرمایا ہے وَاصْرَبْ لَهُمْ مَثَلًا مُّجْتَنِبِينَ (۱)۔

يَقُولُ إِنَّكَ لَمِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢﴾ عَزَّ ذٰلِجْنٰنَا وَاَعْلٰى عِزّٰنَا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ

”وہ (بھی) کہا کرتا تھا کہ کیا تو قیامت پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ کیا جب ہم مریں گے اور (مر کر) مٹی اور

(بوسیدہ) بڑیاں ہو جائیں گے کیا اس وقت ہمیں جزا دی جائے گی۔“

۱۔ آپٹنگ میں استہتمام تو بخ کے لئے ہے۔ اء ذہانتنا میں استہتمام انتہائی بعید جاننے اور انکار کے لئے ہے۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّظْمِئُونَ ﴿٣﴾

”ارشاد ہو گا کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟۔“

۱۔ یعنی کیا تم دوزخوں کو دیکھنا چاہتے ہو میں تمہیں وہ دوست دکھا دوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت میں قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ کہے گا کہ کیا تم دوزخوں پر مطلع ہونا چاہتے ہو۔ تو میں تمہیں وہ دوست دکھاؤں گا کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہارا مقام و مرتبہ ان سے کتنا بلند و بالا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جنت میں ایک روشندان ہو گا جس سے جتنی دوزخیوں کو دیکھیں گے (2)۔

قٰطَلَمْ فَرٰهُ فِيْ سَوَآءٍ الْجَحِيْمِ ﴿٤﴾

”پس جب اس نے جہنم کا تو دیکھا اپنے یا کو جہنم کے وسط میں۔“

۱۔ اطلاع کا فاعل مومن ہے، یعنی دوزخوں پر جھانکے گا تو اپنے دوست کو دوزخ میں دیکھے گا۔ کسی شے کے درمیان کو سوا اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہاں سے اس شے کی تمام جو اسے برابر ہوتی ہیں۔ بناد نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مومن نے جب دیکھا تو اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ میں نے تو م کی کھوپڑیاں ابلتی دیکھی ہیں۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَتَرُوْنِيْ ﴿٥﴾

”جنتی بول اٹھے گا بخدا تو تو مجھے بلا کر نہاں چاہتا تھا۔“

۱۔ یعقوب نے دونوں حالتوں میں لَتَرُوْنِيْ کو بقاء شکم کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے صرف وصل کی حالت میں بقاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہائی قراء نے دونوں حالتوں میں بقاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان مخففہ من منقلہ ہے۔ اور لَتَرُوْنِيْ پر لام فاروق ہے (یعنی ان ناقیہ اور مخففہ من منقلہ کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے)

وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُخْضَرِّينَ ⑤

”اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (آج) پیکڑ کرائے جانے والوں میں سے ہوتا۔“
 یعنی جنسی گنہگار اگر میرا رب مجھ پر ہدایت اور رحمت کی نعمت نہ فرماتا تو میں بھی تیرے ساتھ اس بھڑکتی آگ میں ہوتا۔

أَفَمَنْ حُنَّ بِسَبِّئِنَ ⑥ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَنْ حُنَّ بِمَعَدَّ بَيْنَ ⑦

” (جنسی کہیں گے) کیا اب تو ہمیں مرنا نہیں ہوگا بجز اپنی پہلی موت کے۔ اور نہ ہمیں (اب) عذاب دیا جائے گا۔“

یعنی اب ہمیں موت نہیں آئے گی موتنا الاولیٰ اسم فاعل (یعنی ہمیں) کی وجہ سے مصدریت کی بناء پر منصوب ہے اور یہ مستثنیٰ مفرغ ہے یا یہ معنی کہ ہم اب کبھی نہیں مرے مگر جو دنیا میں موت پانچکے، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ فاء تقدیر کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر جہاں اس طرح ہوگی انْحُنُّ مُخْلَدُونَ مُنْعَمُونَ فَمَا نَحْنُ بِمَبْتَلِينَ یعنی کیا اب ہم ہمیشہ رہیں گے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور ہم میں سے نہیں، استفہام تقریری ہے۔ یعنی مخاطب کو اس چیز کے اقرار پر ابھارا جا رہا ہے جس کا وہ دنیا میں اء نالمدنیوں کہہ کر انکار کیا کرتا تھا۔

یعنی یہ مومن کی کلام کا تہہ ہے جو وہ اپنے دوزخی دوست کو زبردستی کرنے کے لئے کر رہا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کے لئے اپنے جنسی ساتھیوں سے کہہ رہا ہو کہ اب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ ایک طرف یہ اپنے دوستوں سے کلام ہے اور دوسری طرف دوزخی دوست کو توجیح بھی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کر دیا جائے گا تو اہل جنت فرشتوں سے اظہار مسرت کے طور پر فرشتوں سے کہیں گے کیا اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا فرشتے کہیں گے نہیں تو اہل جنت یہ کہیں گے۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَوْمُ الْعَظِيمُ ⑧

”یہ ایک بڑی وہ عظیم الشان کامیابی ہے۔“

یعنی اہل جنت میں ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ اہل جنت کی کلام بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام ہو۔

لِيَسْئَلْ هَذَا قَلْبِي عَنِ الْعَمَلُونَ ⑨

”اے یہی عظیم الشان کامیابی کے لئے نکل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔“

یعنی اس منزل کے لئے یا ان نعمتوں کے لئے کوشش اور عمل صالح کرنے چاہئیں نہ کہ دنیاوی مال و متاع کے لئے شب و روز تھکان برداشت کرنی چاہئے۔ جس میں ذہنی اور قلبی پریشانی بھی ہے اور بہت جلد فناء ہونے والا بھی ہے۔

أَذَلِكْ حَيْرٌ تَزَلَا أَمْ سَجَرَةُ الرَّقْوِ ⑩

”بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔“

یعنی اہل جنت کے لئے جن نعمتوں اور مرفرازیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جس کے ساتھ دوزخیوں کی تواضع کی جائے گی۔ زقوم ایک بدنام اور بد صورت درخت ہے جس کا ذائقہ انتہائی کڑوا ہے۔ دوزخی اسے کھانا پسند نہیں کریں گے، مجبوراً انتہائی سرائت کے ساتھ کھائیں گے۔ عرب کہتے ہیں تَرْقَمُ الطَّعَامُ اس نے ناپسند کرتے ہوئے کھایا۔ نزلاً پر نصب تمبیور اور حال کی بناء پر

ہے اور اس لفظ کے ذکر میں دلیل ہے کہ اہل جنت کے لئے جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہیں ابتداءً پیش کی جائیں گی جس طرح آنے والے سہمان کو ابتداً بطور ضیافت کچھ چیزیں پیش کی جاتی ہیں لیکن ان کے علاوہ جو چیزیں کو تعین طیس میں ان تک ابھی عقل انسانی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح زقوم دوزخیوں کی خوراک ہوگی۔

ترمذی نسائی ابن ماجہ ابن ابی حاتم ابن حبان حاکم اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر زقوم سے پینے والے پانی کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں میں ڈالا جائے تو اہل زمین پر زندگی تلک ہو جائے (اب فیصلہ کر لو) جو اس کو کھائے گا اس کی بد حالی کا کیا عالم ہوگا (1)۔

عبد اللہ بن احمد نے زوائد اہد میں اور ابو نعیم نے ابی عمران الخولانی سے شجرۃ الزقوم کے بارے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے یہ بات سنی ہے کہ انسان زقوم کے درخت سے جتنا کھائے (لئے) چھیلے گا اتنی مقدار وہ درخت آردی کا جسم پھیل لے گا (2)۔

إِنَّا جَعَلْنَاهَا قُتْبًا لِّلظَّالِمِينَ ﴿۱۱﴾

”ہم نے بنا دیا ہے اسے آزمائشِ خالموں کے لئے۔“

۱۔ قنطہ سے مراد آخرت میں عذاب اور آزمائش ہے یا دنیا میں ابتلاء ہے۔ الظالمین سے مراد کفار ہیں۔ کافر کہتے ہیں کہ دوزخ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ آگ تو درختوں کو جلا دیتی ہے۔ ابن ابی بصری کو سردار اپنی قریش نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں زقوم سے ڈراتا ہے، حالانکہ ہر بزقوم کی زبان میں زقوم کھن اور کھجور کو کہتے ہیں پھر زبوری کو ابو جہل اپنے گھر لے گیا اور اپنی لوطی سے کہا ہجاریہ زقمینا اے لوطی ہمیں زقوم کھلا تو وہ کھن اور کھجور لے آئی۔ ابو جہل نے کہا یہ کھن اور کھجور کھاؤ۔ یہ ہے وہ جس کی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں دھمکیاں دیتا ہے (3)۔

ابن جریر نے قنطہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ابو جہل نے کہا تمہارا دوست (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ دوزخ میں ایک درخت ہے حالانکہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے۔ قسم بخدا ہم تو زقوم سے مراد صرف کھجور اور کھن ہی مانتے ہیں۔ جب انہوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا (4)۔

إِنَّمَا شَجَرَةُ زُقْمٍ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿۱۲﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ شَرَّ عَوْسِ الشَّيْطَانِ ﴿۱۳﴾

”یہ ایک درخت ہے جو آگ میں ہے جس کی تہ میں اس کے ٹکڑے گویا شیطانوں کے سر ہیں۔“

۱۲۔ اصل الجحیم سے مراد جہنم کی گہرائی ہے۔ حسن اور سدی کا یہی قول ہے اور اس درخت کی شاخیں جہنم کے درکات تک بلند ہیں (5)۔ کھل کو طلع کہا جاتا ہے اس کے طلوع و خروج کی وجہ سے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شیاطین سے مراد شیاطین ہی ہیں اور کسی چیز کی قباحت اور بد صورتی بیان کرنے کے لئے شیطانوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ لوگ جب کسی شی کی انتہائی بد صورتی بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہانہ شیطان اگرچہ شیطان کو کسی نے دیکھا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی بد صورتی کا تصور موجود ہے (6)۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد بد شکل بیبت ناک سانپ ہیں جن کی کانچیاں ہوتی ہیں ان کی عجیب شکل کی

1۔ جامع ترمذی، حدیث: 2585 (الحدیث) 2۔ الدر المنثور، جلد: 5، صفحہ: 522 (الحدیث) 3۔ تفسیر ابن کثیر، جلد: 4، صفحہ: 562 (الحدیث)

4۔ الدر المنثور، جلد: 5، صفحہ: 522 (الحدیث) 5۔ تفسیر ابن کثیر، جلد: 4، صفحہ: 563 (الحدیث) 6۔ تفسیر ابن کثیر، جلد: 4، صفحہ: 563 (الحدیث)

وہ سے انہیں شیاطین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک بد شکل کڑوا اور بد بودار درخت ہے جو درہکی علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اس کو عرب رُءُؤُسُ الشَّیْطَانِ کہتے ہیں۔

فَاتَّكُمُ اللَّكُّونُ وَمِنَهَا الْقَبْطُونَ ﴿٤٠﴾

”پس انہیں ضرور کھانا ہوگا اس سے اور بھریں گے اس سے اپنے پیٹ ل۔“

ل۔ منہا کی ضمیر کا مرجع شجرۃ (درخت) ہے یا طلع ہے۔ فاء سمیت کے لئے ہے۔ یہ اس درخت کے قندہ ہونے کی علت بیان ہو رہی ہے۔ بھوک کے غلبہ کی وجہ سے ضرور کھائیں گے یا انہیں اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ ملاء کا معنی برتن کو اس طرح بھرنا ہے کہ اس میں مزید گنجائش نہ ہو۔

ثُمَّ اِنْ لَبِثُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبَا قِنْ حَمِيمٍ ﴿٤١﴾

”پھر انہیں زقوم کھانے کے بعد کھولنا ہو پانی ملا کر دیا جائے گا۔“

ل۔ یعنی پیٹ بھر کر زقوم کھانے اور سخت پیاس لگنے کے بعد انہیں کھولنا ہو پانی ملا کر دیا جائے گا۔ خم کا لفظ انتہائی ناگواری کی حالت میں ان کے پینے کو بیان کرنے کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ شوبا کا معنی غلط ملط کرنا اور ملانا ہے۔ من حمیم شونا کے متعلق ہے۔ حمیم انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ کھولنا ہو پانی پینے کے لئے تو وہ ان کے پیٹوں میں زقوم سے مل جائے گا۔

ثُمَّ اِنْ مَرَجْتَهُمْ لَا اِلَى الْجَحِيمِ ﴿٤٢﴾

”پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جہیم کی طرف ل۔“

ل۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں وہ بد بخت یا اسے اونٹ کی طرح کھولتے ہوئے پانی کی طرف پلکیں گے۔ یہ جہیم یعنی کھولتے ہوئے پانی کا تالاب جہیم سے جدا ہوگا۔ وہ پانی پینے کے بعد پھر انہیں جہیم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس توجیہ کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے يَتَوَلَّوْنَ بَيْنَهُمَا وَبَيْنَ الْجَهَنَّمَ اِنْ ۙ (ترجمہ) وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جواز صدرم ہوگا (1) ابن مسعود نے اس آیت کو اِنْ مَقِيلَهُمْ لَا اِلَى الْجَحِيمِ پڑھا ہے۔

اِنَّهُمْ اَلْقَوْا اَبَاءَهُمْ صَالِحِينَ ﴿٤٣﴾ فَهُمْ عَلَىٰ اَشْرِهِمْ يَجْهَرُونَ ﴿٤٤﴾

”انہوں نے پایا تھا اپنے باپ دادا کو گمراہ۔ پس وہ (بے سوچے سمجھے) ان کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں ل۔“

ل۔ یعنی وہ اس سزا کے اس لئے متعجب ہیں کہ انہوں نے اپنے گمراہ آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی تھی۔ اپنی عقل اور اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا تھا۔ یہ جملہ مذکورہ بالا سزا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَقَدْ صَلَّتْ قَبْلَهُمْ اَكْثَرًا اَوْلَادًا ﴿٤٥﴾

”اور بھگ گئے تھے ان سے قبل بہت سے پہلے لوگ ل۔“

ل۔ اس کا عطف انہم الفوا پر ہے۔ قَبْلَهُمْ میں ضمیر کا مرجع مشرکین مکہ ہیں اور اولاد میں سے مراد گذشتہ قومیں ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُّذَمِّرِينَ ۝۱

”اور ہم نے بھیجے تھے ان میں ڈرانے والے۔“

یعنی ہم نے انبیاء کرام کو بھیجا تھا جو انہیں گمراہی کے برے انجام سے ڈراتے تھے۔

فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُؤْمِنِينَ ۝۲

”پس (اے مخاطب!) ذرا دیکھ کر اس انجام ہوا جنہیں ڈرایا گیا تھا۔“

۱۔ استنبہام توبہ اور استغماح کے لئے ہے۔ جملہ استنبہامیہ مفرد کی تاویل میں ہو کر انظر کا مفعول ہے۔ اس سے مقصود استنبہام نہیں مگر یعنی خبر دینا مقصود ہے کہ سکر اور نافرمان قوم کا انجام دینا و آخرت میں عذاب ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ۝۳

” (مگر وہ سخیلے) سوائے ان کے جو اللہ کے مخلص بندے تھے۔“

۱۔ سابقہ جملہ کے مضمون سے یہ استثناء ہے یعنی وہ نہ سمجھے مگر اللہ کے مخلص بندے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور سزیر سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انہوں نے خالص دین کو اللہ کے لئے اپنایا اور وہ عذاب سے نجات پا گئے۔ مخلصین کو لام کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے دین کو خاص فرمایا۔ یہ خطاب (انظر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد قوم ہے کیونکہ انہوں نے بھی پہلی قوموں کے واقعات سن رکھے تھے اور ان کی اجزی ہستیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا نُوحًا قَلْبًا مِّنَ الْجَبُورِ ۝۴

”اور (فریاد کرتے ہوئے) پکارا ہمیں نوح نے ہم بہترین فریادوں میں۔“

۱۔ یہاں سے اجمال کے بعد تفصیل کے ساتھ گزشتہ قوموں کے واقعات کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عطف ولقد از سلسلہ پر ہے۔ اور یہ عام کے بعد خاص کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے، یعنی اسے محبوب ان مشرکین تک کے پہلے قوم نوح بھی گمراہی کی دلدل میں گری تھی پھر ان میں ہم نے نوح علیہ السلام کو بطور نذیر (ڈرانے والا) بھیجا تھا۔ اس نے انہیں پوری دلسوزی اور شفقت بھرے انداز میں اسلام کی طرف دعوت دی تھی لیکن وہ ایمان نہ لائے تھے حتیٰ کہ نوح علیہ السلام ان کے اسلام قبول کرنے سے ناامید ہو گئے تھے۔ پھر نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا جو ان کے جو ایمان لائے تھے میں تو نوح علیہ السلام نے ہم سے دعا کی کہ اس بد بخت قوم کو ہلاک کر دے۔ ہم نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور ہم بہت بہتر اپنے بندوں کی فریادوں کو قبول کرنے والے ہیں۔ اس جملہ میں کلام مخدوف کر دی گئی ہے کیونکہ ما بعد کلام مخدوف کلام پر دلالت کر رہی ہے۔

وَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۝۵

”اور ہم نے نجات دے دی انہیں اور ان کے گھرانے کو ایسی مصیبت سے جو بڑی زبردست تھی۔“

۱۔ اس کلام کا عطف ماجبنا مقتدر پر ہے۔ اور الکراب العظیم سے مراد وہ تکلیف ہے جو آپ کی قوم آپ کو پہنچائی تھی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمُ الْيَقِينِ ۝۶

”اور ہم نے بناو یا منتظران کی نسل کو باقی رہنے والا۔“

یعنی نوح علیہ السلام کی قوم میں سے کسی کی اولاد باقی نہیں رہی تھی صرف نوح علیہ السلام کی اولاد باقی بچی تھی۔

ترذی وغیرہ نے سمرہ کے حوالہ سے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ (نوح علیہ السلام کے تین بیٹے) حام، سام اور یافث باقی رہے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سام ابو العرب (عربوں کے باپ) ہیں۔ حام ابو الحشیش (حشیشوں کے باپ) ہیں اور یافث ابو الروم (رومیوں کے باپ) ہیں (1) شخاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب نوح علیہ السلام کشتی سے اترے تو جتنے آپ کے ساتھ مرد اور عورتیں تھیں سب مر گئے، صرف آپ کی اولاد اور آپ کی ازواج باقی رہ گئیں تھیں (2)۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان میں روئے زمین پر رہنے والے تمام لوگ غرق ہو گئے تھے۔ صرف آپ کے بیروکار بچے تھے جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے پھر جب کشتی سے اترے تھے تو سوائے آپ کی اولاد کے اور کوئی دوسرا نہیں بچا تھا اور قیامت تک نسل در نسل تمام لوگ آپ کی نسل سے ہوں گے۔ حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث۔ سام عربوں، رومیوں اور فارسیوں کا جد اعلیٰ ہے۔ حام سوڈانیوں کا جد اعلیٰ ہے اور یافث ترکوں، خوز اور یاجوج ماجوج اور ہند کے مشرقی علاقوں کے لوگوں کا جد اعلیٰ ہے (3)۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک نوح علیہ السلام تمام لوگوں کی طرف مبعوث نہیں کئے گئے تھے کیونکہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہونا ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ حضرت نوح صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ جب آپ کی قوم ایمان نہ لائی تو آپ نے ان کی ہلاکت کے لئے دعا فرمائی پھر ان پر طوفان آیا اور سارے منکر غرق ہو گئے۔ آیت میں وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ میں الارض سے مراد مخصوص خطہ زمین ہے جس کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا تھا اور آیت میں حصراً اضافی ہے، یعنی ہم نے آپ کی قوم سے سوائے آپ کی اولاد کے کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

وَسَرَّ كُنَّا عَلَيْهِنَّ فِي الْآخِرِينَ ﴿٣١﴾ سَلَّمَ عَلَى نُوحٍ فِي الْعُلُوِّينَ ﴿٣٢﴾

”اور ہم نے چھوڑ ان کے ذکر خیر کو چھپے آنے والوں میں۔ نوح پر سلام ہو تمام جہانوں میں۔“

۱۔ آخرین سے مراد آنے والی قومیں اور تیسری ہیں یعنی آنے والی قومیں آپ پر سلام پیش کرتی رہیں گی اور وہ سَلَّمَ عَلَى نُوحٍ فِي الْعُلُوِّينَ کہتی رہیں گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہے اور تو حکما کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی نُوْحُنَا عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالْبَشَرُ الْجَمِيعُ۔ یعنی آپ کی تعریف اور ثنا خوانی کو تمام جہانوں میں چھوڑا۔ فِي الْعُلُوِّينَ ’علیہ‘ طرف مستقر کے متعلق ہے۔

إِنَّا كُنَّا لَنَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٣﴾

”ہم اسی طرح بدل دیتے ہیں محسنین کو۔“

۱۔ یعنی ہم ہر محسن کو اسی طرح بہتر جزا دیتے ہیں یا یہ معنی کہ جو جزا ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی شہرت اور نیک نامی کو باقی رکھ کر دی

اور اپنی طرف سے سلام بھیجی اسی طرح کی جزاء ہم ہر محسن کو دیتے ہیں۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱﴾

”بی شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔“

۱۔ یعنی ہم نے نوح کو یہ سرفرازی اور عزت ان کے ایمان اور احسان کی وجہ بخشی ہے۔ اس آیت میں امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے صالحین اور نیکو کار لوگوں کے لئے بشارت ہے۔

لَمْ نَعْرِفْنَا الْأَخْرِيْنَ ﴿۱۲﴾

”پھر ہم نے فرق کر دیا دوسرے لوگوں کو۔“

۱۲۔ یعنی جو نیک اور احسان کرنے والے نہیں تھے ان کو ہم نے فرق کر دیا۔ اس کا عطف نجیسا پر ہے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِمْ لَابْرَاهِيمَ ﴿۱۳﴾

”اور ان کی جماعت میں سے ابراہیم (علیہ السلام) بھی تھے۔“

۱۳۔ اس کا عطف انہ من عبادنا المؤمنین پر ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جو ایمان اور اصول دین میں یا تمام فروع میں یا اکثر فروع میں نوح علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کی مدت ہے۔ ان کے درمیان حضرت ہود اور صالح علیہما السلام بھی تشریف لائے تھے۔

إِذْ جَاءَ عَرْسَ رَبِّهِ وَقَلَّبَ سَلِيمٍ ﴿۱۴﴾

”جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ۔“

۱۴۔ ظرف یا توسیعتہ میں جو مشافعت کا معنی ہے اس کے متعلق ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آنے کے وقت حضرت نوح کی اتباع و پیروی کی یا طرف محذوف فعل اذ سکو کے متعلق ہے۔ قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر دوسری ذات سے محبت کرنے اور تعلق رکھنے سے محفوظ اور سلامت ہو اور آپ کے قلب سلیم کی شہادت آپ کا اپنے نخت جگر کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ذبح کرتا ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿۱۵﴾

”جب انہوں نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو۔“

۱۵۔ یہ ظرف یا توسیعتہ اذ سے بدل ہے یا جاء یا سلیم کی طرف ہے اور اس آیت میں استفہام پتھروں کی صورتوں کی عبادت کرنے پر توجیح کے لئے ہے (یعنی کچھ سوچنا چاہئے کہ تم کس کی عبادت کر رہے ہو)

أَفِيكَ الْهَيْهَةَ دُونَ اللَّهِ تُشْرِكُونَ ﴿۱۶﴾

”کیا جھوٹے گھڑے ہوئے خدا اللہ تعالیٰ کے علاوہ چاہتے ہو۔“

۱۶۔ یہ استفہام بھی توجیح کے لئے ہے الْهَيْهَةَ، تُوَيْدُونَ کا مفعول ہے اور دُونَ اللّٰهُ، الْهَيْهَةَ کی صفت ہے۔ اَفِيكَ مفعول لہ ہے۔ اس کی اہمیت

کی خاطر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مفعول یہ کو بھی اہمیت کے پیش نظر پہلے ذکر کیا گیا ہے، یعنی ان کا سارا عقیدہ جھوٹ اور باطل پر مبنی ہے (اس میں حقیقت نام کی کوئی چیز نہیں) یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ افکا مفعول پہ ہواور الہۃ اس کا بدل ہو، یعنی جو ان کو خدا بنا تا ہے اس کے جھوٹ میں مبالغہ بیان کرنے کے لئے الہہ تو ہی جھوٹ کہہ دیا۔ یہ ترکیب بھی ممکن ہے کہ افکا آفکین کے معنی میں حال ہو۔

فَمَا ظَنَّمُ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۷﴾

”پس تمہارا کیا خیال ہے سارے جہانوں کے پروردگار کے بارے میں اے۔“

۷ یعنی دو ذات جو واقعی تمام جہانوں کو آہستہ آہستہ کمال تک پہنچانے والی ہے تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے کہ تم نے اس کی عبادت ترک کر دی ہے یا تم نے غیروں کو اس کا شریک بنا لیا ہے۔ کیا تم اس کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہو، یعنی کوئی قطعی دلیل تو درکنار کوئی نسبی دلیل بھی تمہارے پاس ایسی نہیں جو تمہیں اس ذات کی عبادت سے روکے یا شریک کے جواز کا سہارا بنے یا اس کے عذاب سے بے خوف اور مومن ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ ان تینوں تقادیر پر اہرام حاصل ہوتا ہے اور کلام ختم ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور سفید جھوٹ ہے۔

فَقَضَرُ كُفْرًا فِي الشُّجُورِ ﴿۸﴾

”سو آپ نے ایک بار دیکھا ستاروں کی طرف اے۔“

۸ نظر کا عطف قال پر ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کے مقامات کو دیکھا اور ان کے ملنے کو دیکھا یا علم نجوم یا ستاروں کی کتاب کو دیکھا۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ علم نجوم اور اس کا سیکنا سکھانا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا لیکن ہماری شریعت میں اس کا سیکنا اور سکھانا منسوخ ہو گیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے جادو سے کوئی شعبہ لیا اس نے زانگہ کر لیا جو زانگہ کر لیا (۱)۔ اس حدیث کو امام احمد ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ زرین نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے نجومی کا بن سے زانگہ ہے اور کا بن جادوگر ہے اور جادوگر کا فر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں افراد کفر میں برابر ہیں اور یہ تو جو یہ کرنی بھی جائز ہے کہ ستاروں کے علم میں غور و خوض اس وقت حرام ہوتا ہے جب حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ کہا جائے کہ فلان ستارہ کی وجہ سے بارش ہوئی وغیرہ) لیکن جب تمام حادثات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا جائے اور ستاروں کے ادھر ادھر ہونے کو علامات سمجھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ظہرہ ہے کہ ان ستاروں کے اتصال پر بعض اشیاء کی تخلیق فرماتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ دواء پینے کے بعد شفا عطا فرمادیتا ہے۔ زہرا استعمال کرنے کے بعد موت دے دیتا ہے اور جب کوئی کسی کام کا زمزمہ مسموم کرتا ہے تو اس کام کو پیدا فرمادیتا ہے۔ اگر یہ نظریہ ہو تو پھر علم نجوم میں غور و فکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستاروں کے علم کے حصول سے اس لئے منع فرمایا ہوتا کہ لوگ حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب نہ کریں۔ زید بن خالد الجعفی سے مروی ہے فرماتے ہیں رات کے وقت بارش کے بعد صلح حدیبیہ کے مقام پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی نماز سے فراغت کے بعد لوگوں کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم توجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا رب کیا فرماتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے صبح کے وقت میرے بندوں میں سے کچھ مجھ پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں اور کچھ میرا انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم پر بارش اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں اور جنہو کہتے ہیں ہم پر بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہوئی وہ میرا انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان رکھنے والے ہیں (بخاری و مسلم) (۱) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ آسمان سے برکت (بارش) نازل نہیں فرماتا مگر صبح کے وقت کچھ لوگ اس بارش کی وجہ سے کافر ہوتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی۔ اس حدیث کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت امام محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب المنقذ من الضلال میں لکھا ہے کہ علم طب اور علم نجوم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی پراسارے پھر یہ دونوں علم کفار کے ہتھے چڑھ گئے۔ نجوم بھی علم طب کی طرح ظنی فائدہ دیتا ہے اور اس کی دلیل نجومیوں کا فرعون موسیٰ علیہما السلام کی ولادت کی خبر دینا اور ان کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت و اقتدار کے خاتمہ کا بتانا ہے۔

امام بخاری نے صبح میں اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ ابن الناطور شام کے نصرانیوں کا پادری تھا۔ اس نے بتایا کہ ہر قہل ایک دن صبح کے وقت ایسا آیا تو پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس سے کسی ہمارے نہ وجہ پوچھی جناب کی حالت کچھ غیر عیسیٰ نظر آ رہی؟ (ابن الناطور کہتا ہے کہ ہر قہل کا ابن تھا اور ستاروں سے امور کا اندازہ لگاتا تھا) ہر قہل نے بتایا کہ آج رات جب میں نے ستاروں کی کیفیت پر غور و فکر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے۔ مجھے بتاؤ اس امت میں ختنہ کون لوگ کرتے ہیں؟ اس نے اپنے حواریوں کو بتایا کہ صرف یہود ختنہ کرتے ہیں۔ ان سے تو آپ پریشان نہ ہوں اور تم اپنے ملک کے شہروں میں یہ حکم نامہ روانہ کر دو کہ ہر یہودی کو قتل کر دو۔ یہ پابندی مشورہ ہو رہا تھا کہ مشران کے گورنر کی طرف سے ایک شخص ہر قہل کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر سنے آیا جب ہر قہل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے کارداروں کو حکم دیا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا وہ ختنوں پیدا ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ تحقیق کر کے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آپ ختنوں پیدا ہوئے ہیں پھر اس نے عربوں کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں ہر قہل نے کہا اس امت کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے پھر ہر قہل نے اپنے ایک دوست کو مزید تحقیق کے لئے خط لکھا جو اس کی طرح علم نجوم کا ماہر تھا۔ خود ہر قہل حمص چلا گیا۔ کچھ وقت کے بعد دوست کا خط ہر قہل کو پہنچا، اس میں ہر قہل کی رائے کی موافقت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور نبی ہیں (۲)۔ شیخ ابن جریر فرماتے ہیں زہری کی یہ روایت ابن الناطور سے متصل ہے معتق نہیں ہے۔ ابو نعیم نے دلائل النبوة میں بیان کیا ہے کہ زہری نے بتایا کہ میں نے عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ابن الناطور سے دمشق میں ملاقات کی تھی اور میرا خیال ہے کہ زہری نے ان سے یہ حدیث ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ہی ہے۔ یہ حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم سے بھی کچھ نہ کچھ علم کا فائدہ ملتا ہے لیکن اس علم میں مشغولیت تھا کہ فساد کا موجب بنتی ہے اور وہ یہ کہ لوگ حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ دوسرا اس کی مشغولیت میں وقت کے قیمتی سرمایہ کا نقصان ہے کیونکہ اس علم میں کوئی دینی منفعت نہیں ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم میں مشغول ہونے سے منع فرمایا ہے۔ دین مسویٰ میں علم نجوم میں اشتغال جائز تھا اور نہ علماء نصاریٰ اس میں سر نہ کھپاتے۔ جو علماء فرماتے ہیں کہ علم نجوم باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ستاروں کی طرف دیکھنے کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور شبہ اور ابہام تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کا سہارا لیتی تھی تو آپ نے

ان کے انداز میں یہ معاملہ اختیار فرمایا تاکہ وہ میری بات کا رد اور انکار نہ کر سکیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کے خلاف ایک سازش کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تاکہ ان پر دلیل اور حجت قائم ہو جائے کہ یہ پتھر صورتیں عبادت کے لائق نہیں ہیں دوسرے دن آپ کی قوم کا اجتماع اور عید تھی اور ان کا معمول یہ تھا کہ وہ بتوں کے پاس جاتے اور ان کے لئے دسترخوان بچھاتے اور ان کے سامنے عید منانا سے پہلے رنگارنگ کھانے رکھ جاتے اور اس عمل کو وہ تبرک سمجھتے تھے پھر جب عید کا پروگرام مکمل کر کے واپس آتے تو وہ کھانے خود کھا جاتے۔ عید کے اس موقع پر انہوں نے حضرت ابراہیم کو کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کل عید کے پروگرام میں شامل ہوں تو حضرت ابراہیم نے ستاروں کی طرف دیکھا (۱)۔

فَقَالَ اِنِّي سَقِيمٌ ①

”پھر کہا میری طبیعت ناساز ہے۔“

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں آپ نے فرمایا میں طعون ہوں (یعنی مجھے طاعون کا مرض ہے) اور وہ لوگ طاعون کے مرض سے بہت دور بھاگتے تھے۔ حسن نے سقیم کا معنی مریض کیا ہے۔ مقاتل نے اس کا معنی درد کا ہے (۲) صحیحین میں حضرت ابراہیم سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مواقع پر تھریض اور توریہ فرمایا۔ دوسرے نبی اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق فرمایا اسی سقیم میں مریض ہوں بل فعلہ کبیر ہم (۳) اور تیسرا موقع وہ ہے جب آپ نے اپنی بیوی سارہ کو اپنی بہن کہا تھا۔ یہ حدیث تفصیل سے سورہ انبیاء میں گزر چکی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں ہے کہذبات جس کا معنی جھوٹ ہے لیکن یہاں جھوٹ مراد نہیں بلکہ توریہ اور تھریض مراد ہے (توریہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک کلام کے دو مفہوم ہوتے ہیں مخاطب ایک مفہوم سمجھ رہا ہوتا ہے، جب کہ شکم کی مراد دوسرا مفہوم ہوتا ہے)

شماک نے اسی سقیم کا معنی سقم (یعنی میں بیمار ہوں گا) لکھا ہے (۴) بعض علماء اس کی یہ تاویل فرماتے ہیں کہ جس شخص کی گردن میں موت کا طوق ہمیشہ موجود ہو وہ بیماری ہوتا ہے جیسا کہ ایک شخص اچانک مر گیا تھا تو لوگوں نے کہا وہ صحیح سلامت تھا اور مر گیا ایک اعرابی وہاں موجود تھا اس نے کہا جس کی گردن میں موت کا طوق ہو، کیا وہ صحیح سلامت ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لفر کی وجہ سے میری طبیعت ناساز ہے۔ بل فعلہ کبیر ہم کی تاویلات ہم نے سورہ انبیاء میں ذکر کر دی ہیں۔

فَتَوَلَّوْا عُنْهُ مُدْبِرِينَ ①

”چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے چھوڑ کر (میلہ دیکھنے) چلے گئے۔“

۱۔ جب وہ میلہ اور عید منانے چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بت خانہ میں داخل ہوئے اور ان کے بتوں کی خوب درگت بنائی جیسا کہ آئندہ آیات سے واضح ہوتا ہے۔

فَدَارَ إِلَىٰ يَهُودِيٍّ فَقَالَ اَلَا تَأْتُوْنَ ①

”پس آپ چپکے سے ان کے دیوتاؤں کی طرف گئے اور کہا کیا تم (یہ مٹھائیاں) نہیں کھاؤ گے۔“

2- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 565 (القر)

4- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 565 (القر)

1- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 565 (القر)

3- صحیح بخاری، حدیث 3179: (ابن اثیر)

۱۔ راغ یہ روغن الثعلب سے مشتق ہے جس کا معنی لومڑی کا چالاک کی مظاہرہ کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی تدبیر اور حیلہ کے ساتھ سیل کرنا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں راغ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی کا آنا جانا پوشیدہ اور مخفی ہو (۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استسقاء فرمایا یہ کھانا جو تھارے سامنے دھرا ہے اسے تم نہیں کھاؤ گے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنْطُقُونَ ﴿۱۱﴾

”تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بولتے بھی نہیں۔“

۱۔ یعنی ہماری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ جملہ حال ہے اور اس کا عامل مالک میں فعل کا معنی ہے۔

قِرَاءٌ عَلَيْهِمْ ضَرِبًا أَلَيْسَ لِي

”پھر پوری قوت سے یہ ضرب لگاؤ ان پر دابنے ہاتھ سے۔“

۱۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام چپکے سے ان کے بتوں کے پاس گئے۔ راغ کا صلہ علمی استعمال فرمایا تاکہ استسقاء اور غلبہ پر دلالت کرے، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں پر غالب آگئے یا اس چیز کے اظہار کے لئے ہے کہ مقبول ناپسند یہ تھا۔ حسباً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ راغ بمعنی ضرب ہے یا فعل محذوف ضرب کی وجہ سے منصوب ہے۔ الیسین سے مراد دایاں ہاتھ ہے کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الیسین سے مراد تم ہے جس کا ذکر پہلے آئے گا لَوْلَا كَيْدُكَ أَضَاعْنَاكَ بَعْدَ أَنْ تَكُونُوا مُدْجِرِينَ ﴿۱۲﴾ کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔

فَأَقْبَلُوا إِلَيْكَ يَرُونَ ﴿۱۲﴾

”(رنگ لریاں منانے کے بعد) آئے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے۔“

۱۔ جب ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنا جشن منانے کے بعد واپس آئی تو دیکھا کہ بتوں نے پڑے ہیں آپس میں بحث کرنے لگے کہ مَن فَصَّلَ هَٰذَا بَالِهَةً مِّنَّا إِنَّهُ لَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۲﴾ ہمارے ان خداؤں کا یہ قابل دید حشر کس نے کیا ہے بڑا ظالم ہے؟ جس نے ہمارے بتوں کی ایسی تذلیل کی ہے۔ سب نے یہی گمان کیا کہ سُبْحٰنَ الَّذِي يَسْتَعِذُّ بِكَ مِنْ كُفْرِهِمْ يُقَالُ لَكَ إِيمَانٌ ﴿۱۳﴾ کہ ایک نوجوان ابراہیم کے متعلق سنتے ہیں کہ وہی ان کا ویری اور دشمن ہے۔ اسی نے یہ سب کچھ کیا ہوگا، تیزی سے دوڑتے ہوئے آپ کے پاس پہنچے۔ اعمش اور حمزہ نے بزفون کو یاء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں آیتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں بزفون یاء کے ضمہ کے ساتھ۔ معنی ایک دوسرے کو جلدی دوڑنے پر براہِ حقینہ کرنا ہے۔

قَالَ اتَّبِعُونِ مَا تَدْعُونَ ﴿۱۳﴾

”آپ نے فرمایا کیا تم بوجے ہو انہیں جنہیں تم خودتراشتے ہو۔“

۱۔ قَالَ کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور استفہام انکار اور توخ کے لئے ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جنہیں تم خود پتھروں سے تراشتے اور گھرتے ہو۔ تمہیں ان بے جان صورتوں کے سامنے سر جھکانے اور ادب بندگی بجالاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۱﴾

”حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو۔“

یہ جملہ تعبدوں کے فاعل سے حال ہے۔ حال کے ساتھ تفسیر انکار کے بعد دوبارہ انکار کے اظہار کے لئے ہے۔ ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ما مصدر یہ ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا فرمایا پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے ان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو جن کو تمہاری ترش فراش کی احتیاج ہے۔ یہ آیت کریمہ ہمارے نظریہ کی بین دلیل ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں یہ ما موصولہ ہے اور وہ اس کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں پیدا فرمایا اور جو تم بت گھڑتے ہو ان کو بھی اس نے پیدا فرمایا اور بتوں کو پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ ان کے جوہر کی تخلیق اللہ کی طرف ہے اگرچہ مخصوص شکل ان مشرکوں کے ہاتھوں کی تیار کردہ ہے۔ اسی وجہ سے شکل کی نسبت ان کی طرف کی۔ لیکن اس طرح شکل بنانے پر قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے لہذا ان کا مواد اور اسباب بھی جن پر ان بتوں کی تخلیق موقوف ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے یا ما مصدر یہ ہے اور عمل بمعنی معمول ہے تا کہ ما متصحنوں کے ساتھ مطابقت کر جائے۔ ہمارے نزدیک پہلی تو جیہی بہتر ہے کیونکہ دوسری دو تا ویسے حذف اور مجاز کی مقتضی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کا معمول (کام) صرف شکل بنانا ہے، اعتنا م کا جو ہر تیار کرنا نہیں ہے اور آخری دو تا ویسوں کی صورت میں بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ شکل بھی اللہ کی مخلوق ہے بندہ صرف کا سب ہے (السنن (اشاعرہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ کا سب ہے، جب کہ معتزلہ کا نظریہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے)

قَالُوا اٰتَيْنَاكَ الْبَيِّنَاتِ اَلَا تَلْقَوْنَ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۱۲﴾

”انہوں نے (فیصلہ کن انداز میں) کہا بتاؤ اس کے لئے وسیع آٹھلکھ پھر جھینک دو اسے اس بھڑکتی آگ میں لے۔“

جب مشرک دلائل کے ساتھ بات کرنے اور آپ کی حقائق آئیز باتوں کا جواب لینے سے عاجز آ گئے تو کہنے لگے اسے بھڑکتی آگ میں جھینک دو۔ جحیم کا معنی بھڑکتی آگ ہے اور جحیم پر الف لام اضافت کا بدل ہے (یعنی جحیم ذالک البیان) یہ جملہ چند متوقف جملوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہوئی **اَلَا تَلْقَوْنَ فِي الْجَحِيْمِ** وَاَضْرِبُوْهُ بِالْحٰٓئِرِ فَاِذَا اَنْفَبْتُمْ اَلْفُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، یعنی پہلے اس چار دیواری کو کھڑیوں سے بھرو پھر اس میں آگ جلاؤ۔ جب آگ خوب بھڑک جائے تو پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو۔ مقال فرماتے ہیں انہوں نے پھروں سے ایک چار دیواری بنائی تھی جس کی بندی تیس ہاتھ اور چوڑائی تیس ہاتھ تھی۔ پہلے انہوں نے اسے کھڑیوں سے بھرا اور پھر اس میں آگ لگا دی (۱)۔

فَاَسْأَلُوْهُ بِآيٰهٖ كَيْدًاۙ اَوْ جَعَلْنٰهُمْ اَلَا سٰغِيْنٰ ﴿۱۳﴾

”انہوں نے تو چاہا کہ آپ کے ساتھ لڑ کریں لیکن ہم نے انہیں ذلیل کر دیا۔“

لہ بہ کی خمیر کا منبع ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ کھیدا کا معنی شر اور سازش ہے۔ انہوں نے آپ کو جلانے کا منصوبہ اس لئے تیار کیا تاکہ عوام الناس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنے خداؤں کا دفاع کرنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ انہوں نے آپ کے

ہاتھ اور پاؤں باندھ کر آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے ان کے اس مکروہ عمل کو باطل کر دیا اور ابراہیم کو اپنی شان علوی پر ایک واضح دلیل بنا دیا۔ آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ آگ نے آپ کا ہال بھی جلا لیا لیکن قدرت کا کرشمہ کہ جس ری سے آپ کو جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا وہ جل گئی۔ یہ واقعہ جابر دو ظالم نمرود کے زمانہ میں ہابل کی زمین پر ہوا تھا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيِّئِينَ ﴿١١﴾

”اور آپ نے کہا میں جار ہا ہوں اپنے رب کی طرف وہ میری راہنمائی فرمائے گا۔“

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے بچنے اور شرف لائے اور مشرک اتنا بڑا مجرّم و کچھ کر بھی ایمان نہ لائے تو آپ نے فرمایا میں تمہارے دارالکفر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اور میں ایسی جگہ جا رہا ہوں یہاں میں سکون اور دلچسپی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ اس آیت کا عطف **فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْقَلِينَ** کے مفہوم پر ہے۔ یعنی جب آپ آگ سے سلامتی کے ساتھ باہر تشریف لائے تو فرمایا میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ میری ایسی جگہ راہنمائی فرمائے گا جہاں میرے دین کی صلاح ہوگی یا یہ معنی کہ میں وہاں کا قصد کروں گا جہاں کا میرا رب مجھے حکم فرمائے گا تو آپ شام تشریف لے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے خوف سے ہابل کی زمین سے حضرت سارہ کو لے کر نکل پڑے اور حضرت سارہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے جمیل و تکمیل تھیں اور آپ مصر کی حدود سے گزرے، جب کہ مصر کا فرعون اس وقت صافد بن صافد تھا۔ ابن اللہقن نے شرح بخاری میں اس کا نام سان بن علوان ذکر کیا ہے جو ہاشمیا کا کنبہ تھا۔ بعض علماء نے اس کا نام عمرو بن امرء القیس ذکر کیا ہے۔ اس وقت کے فرعون (مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا) نے حضرت ابراہیم سے سارہ کو چھین لیا اور انہیں اپنے محل میں لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے دیواروں اور پردوں کو اٹھانے کے پردے کی طرح باریک بنا دیا تاکہ آپ حضرت سارہ کو دیکھتے رہیں اور آپ کا دل مطمئن رہے۔ آپ انتہائی غیر متند شخص تھے۔ جب فرعون نے حضرت سارہ کا ارادہ کیا تو محل میں زلزلہ آ گیا۔ فرعون کو معلوم نہ ہوا کہ یہ زلزلہ حضرت سارہ کی وجہ سے ہے وہ دوسرے محل میں منتقل ہو گیا تو وہ بھی لرزنے لگا۔ وہ تیسرے محل میں چلا گیا تو وہ بھی اسی طرح لرزنے لگا۔ حضرت سارہ نے کہا یہ سب کچھ ابراہیم کی وجہ سے لرز رہا ہے۔ فرعون نے حضرت ابراہیم کو اپنی زوجہ واپس کر دی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے حضرت سارہ سے فریاد کی اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت سارہ نے اس کی درگتگی کے لئے دعا فرمائی۔ اس کا ہاتھ پہلے کی طرح بالکل ٹھیک ہو گیا۔ فرعون نے دوبارہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر وہ مفلوج ہو گیا۔ اس نے دوبارہ آپ سے دعا کی درخواست کی اور وہ کہہ گیا کہ پھر اسی حرکت نہیں کرے گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو وہ ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ اس نے جیسا کہ تیسری مرتبہ پھر ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ بچر شل ہو گیا۔ اب اس نے قسم اٹھائی کہ اب اگر ہاتھ ٹھیک ہو گیا تو پھر ہرگز اسی حرکت نہیں کروں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اور ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔

امام احمد نے اپنی سند میں اور امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کی معیت میں ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزرے، جب کہ اس بادشاہ کو پہلے خبر دی گئی تھی کہ یہاں ایک آدمی آیا ہے جس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت ہے۔ بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پایا اور سارہ کے متعلق پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ آپ نے فرمایا وہ میری بہن ہے۔ حضرت ابراہیم یہ جواب دے کر جب سارہ کے پاس

تشریف لائے تو فرمایا اسے سارہ سلخ زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ اس ظالم بادشاہ نے تیرے متعلق مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا وہ میری بہن، تو میری تکذیب نہ کرنا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلایا۔ جب آپ بادشاہ کے دربار میں پہنچیں تو اس نے بدینتی سے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ پکڑا گیا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ سے دعا کی درخواست کی اور کہا میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ درست ہو گیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو پھیلنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ گرفت میں آ گیا اس نے دوبارہ دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ میں تجھے اب کچھ گزند نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اس کا ہاتھ درست ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے درباری کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے ایک لوٹھی ہاجرہ پیش کی۔ جب حضرت سارہ ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں تو آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے ہاتھ سے اشارہ سے فرمایا کیا ہوا؟ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فاجر کے کمر اور سازش کو اس کے سینے میں لوٹا دیا اور اس نے مجھے خدمت کے لئے ہاجرہ لوٹھی دی ہے (1)۔

المواہب اللدنیہ میں ایک روایت ہے کہ جب صادق بادشاہ نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ بندھ گیا تھا پھر اس نے ابراہیم علیہ السلام سے فریاد کی تھی۔ حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس بادشاہ نے حضرت ابراہیم کو ہاجرہ پیش کی تھی جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں اور کہا مجھے سارہ پر گرفت کا کوئی اختیار نہیں۔

ہاجرہ امانتدار خازن اور ہم مجلس تھیں اور بادشاہ نے جب وہ حصہ کی تھی تو حضرت ابراہیم یا حضرت سارہ کو مخاطب کر کے کہا اے اجروک یہ تمہارا اجر ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو ہاجرہ کہا جاتا ہے پھر حضرت ابراہیم نے سارہ کو خوش کرنے کے لئے خادمہ انہیں عطا فرمادی حضرت سارہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کی حضرت اسماعیل کی ولادت سے پہلے کوئی اولاد نہ تھی اور حضرت سارہ اپنے آپ کو عظیم (بانجھ) سمجھتی تھیں۔ حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا ہاجرہ ایک مرغوب عورت ہے میں تجھے حصہ کرتی ہوں شاید اس کے بطن سے تیری اولاد ہو جائے پس حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تھی۔ میں کہتا ہوں حضرت اسماعیل کی ولادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعد ہوئی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰﴾

”دعا مانگی) میرے رب! عطا فرما دے مجھے ایک نیک بچہ۔“

۱۔ مقاتل فرماتے ہیں جب ابراہیم علیہ السلام ارض مقدس (شام) پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے نیک بچہ کی دعا مانگا (2)۔

فَبَشِّرْهُ بِعَلِيمٍ حَلِيمٍ ﴿۱۱﴾

”پس ہم نے مردہ سنایا انہیں ایک حلیم فرزند کا۔“

۱۔ حلیم سے مراد افس مند اور عقل مند ہے۔ قاسم میں حلیم کا یہی معنی لکھا ہے (3) اور اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ ابن عمر کا بھی یہی قول ہے۔ سعید بن مسیب، شعبی، حسن بصری، مجاہد اور ربیع بن انس محمد بن کعب القرظی اور کلبی کا بھی

2۔ تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 566 (المکر)

1۔ صحیح بخاری، حدیث 3179 (دکن کثیر)

3۔ القاسم، احمیاء، جلد 2، صفحہ 1445 (اتراٹ العربی)

نبی قول ہے۔ عن عطاء بن ابی رباح و یوسف بن مالک عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جن کا فدیہ دیا گیا تھا وہ اسماعیل تھے۔ وادقی اور ابن عساکر نے عن بن سعید عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ سارہ حضرت ابراہیم کے عقد میں تھیں اور طویل عرصہ گزر گیا لیکن اولاد نہ ہوئی جب حضرت سارہ نے دیکھا کہ میرے بطن سے اولاد نہیں ہوتی تو انہوں نے اپنی قبطیہ باندی ہاجرہ حضرت ابراہیم کو بہہ کر دی۔ اسی سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے پس حضرت سارہ اسی وجہ سے ان سے غیرت کرنے لگیں۔ یہ واقعہ تفسیراً ہم نے سورۃ ابراہیم میں ذکر کر دیا ہے پھر ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو لے کر مکہ میں آئے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ ابھی حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو کعبہ کے پاس چھوڑ دیا (بخاری میں اسی طرح ہے) ہم نے بخاری کی یہ حدیث بھی سورۃ ابراہیم میں ذکر کی ہے۔ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں وہ بچہ جس کے ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا وہ حضرت اسحاق تھے لیکن یہ قول بھٹ اور باطل ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن کعب القرظی نے فرمایا کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص سے جو عطاء یہود میں سے تھا (بعد میں اسلام قبول کیا تھا) کہ حضرت ابراہیم کو کس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے فرمایا اسماعیل پھر اس شخص نے کہا اے امیر المؤمنین یہود یہ جانتے تھے لیکن اے معشر قریش! تم پر یہود حسد کرتے تھے کہ تمہارا باپ وہ ہو جس کو ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ کہتے تھے جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اسحاق بن ابراہیم ہے اور حضرت اسماعیل کے ذبح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بدلے میں ذبح ہونے والے مینڈھے کے سینک کعبہ میں لگے ہوئے تھے اور حضرت اسماعیل کی اولاد کے قبضہ میں تھے اور وہ کعبہ کے بدلے تک لگے رہے۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر اور قحاح کے زمانہ میں کعبہ کو آگ لگی تھی تو وہ سینک جل گئے تھے (۱) سعید بن منصور اور بیہقی نے اپنی سنن میں عن امراء من بنی سلیم عن عثمان بن طلحہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اس مینڈھے کے دونوں سینک کعبہ میں لگے ہوئے تھے (۲) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں میں نے وہ دونوں سینک کعبہ کے ساتھ لگے ہوئے دیکھے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ہم نے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اسلام کا بتدائی دور تھا اور مینڈھے کا سر سینکوں سمیت لٹکا ہوا تھا اور کعبہ کا پرنا لہلہ تھا۔ اسمعی کہتے ہیں میں نے ابو عمرو بن العلاء سے پوچھا ذبح اسماعیل تھے یا اسحاق؟ ابو عمرو نے فرمایا اسمعی تیری عقل کہاں چلی گئی مکہ میں اسحاق کب تھے؟ مکہ میں تو صرف اسماعیل تھے۔ انہوں نے ہی اپنے باپ کے ساتھ مل کر کعبہ کی تعمیر کی تھی (۳) علامہ بغوی فرماتے ہیں دونوں قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں (۴)۔ میں کہتا ہوں علامہ بغوی کا یہ قول اشارہ ہے کہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایک قول ثابت نہیں ہے کیونکہ ایک قول کو صحیح تسلیم کرنے سے دوسرے قول کا اختیار اٹھ جائے گا۔ علامہ بغوی نے جو قول ذکر کیا ہے وہ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور ابن مسعود اور ابن عباس کا قول ہے اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کعب الاحبار سعید بن جبیر قتادہ سروق عکرمہ عطاء مفضل زہری اور سدیی کا قول ہے۔ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی روایت میں ابن عباس کا بھی ایک قول یہی ہے کہ ذبح حضرت اسحاق ہیں سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کو شام میں حضرت اسحاق کو ذبح کرنے کا خواب دکھایا گیا۔ حضرت ابراہیم حضرت اسحاق کو لے کر چلے تو ایک ماہ کی مسافت صبح دو پہر تک طے کر لی تھی کہ آپ سنی میں قربانی کرنے کی جگہ پہنچ گئے پھر جب اللہ تعالیٰ نے مینڈھے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو آپ نے اسے ذبح کر دیا پھر آپ اسحاق علیہ السلام کو لے کر شام کی طرف واپس چلے۔

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (انکر)

2- الدار المنور، جلد 5، صفحہ 535 (احمدی)

4- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 567 (انکر)

3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (انکر)

کیا ہے کہ وہ جب جوان ہو گیا اور ابراہیم علیہ السلام کی کوشش کی طرح کوشش کرنے لگا (۱) بعض علماء فرماتے ہیں اس وقت حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ سال تھی۔ بعض فرماتے ہیں سترہ سال تھی۔ ظرف یعنی مسجد حذوف کے متعلق ہے جس پر اسی دلالت کر رہا ہے۔ اسی کے متعلق نہیں ہے کیونکہ اسی صدر ہے اور صدر کا صلہ اس سے مقدم نہیں ہوتا اور یہ بلغ کے متعلق بھی نہیں کیونکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی بلوغت اسٹھی نہیں ہے گویا یوں ارشاد ہے کہ فلما بلغ السعمی جب وہ دوڑھوپ کی عمر کو پہنچ گیا فقیل مع من؟ تو سوال ہوا اس کے ساتھ دوڑھوپ کرنے کو پہنچا؟ فقیل: معہ۔ تو فرمایا اپنے باپ کے ساتھ۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ معہ ظرف مستقر ہے اور اسی سے حال ہے۔ یا سنی کو خفض نے بقاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

حضرت ابراہیم نے خواب میں واقعی بیٹے کو ذبح کرتے دیکھا تھا یہ بھی احتمال ہے کہ کوئی ایسا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بیٹے کا ذبح کرنا تھا۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے ملاقات کا ارادہ کرتے تو براق پر سوار ہوتے۔ شام سے صبح کے وقت چلنے اور قبولہ مکہ میں کرتے پھر شام کے وقت مکہ سے چلے اور رات ملک شام میں بسر فرماتے حتی کہ حضرت اسماعیل آپ کے ساتھ چلنے کی عمر کو پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم کی یہ خواہش تھی کہ اسماعیل اپنے رب کی عبادت اور مرات الہیہ کی تعظیم بجالائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خواب میں حکم دیا کہ وہ اپنے لخت جگر اور نور نظر کو ذبح کریں۔ یہ خواب آپ نے آٹھویں رات کو دیکھا تھا گویا کوئی کہنے والا خبر با تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو آپ صبح سے شام تک منتظر رہے کہ یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی کوئی فریب کاری ہے۔ اسی وجہ سے آٹھویں دن کو یوم الترویہ (خور و فکر کا دن) کہا جاتا ہے۔ جب آٹھی رات ہوئی تو آپ نے پھر وہی خواب دیکھا جب صبح ہوئی تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے نویں ذی الحجہ کے دن کو یوم عرفہ (بیچان کا دن) کہا جاتا ہے (۲)۔ علامہ تہجدی نے بھی عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے شب الایمان میں اس طرح نقل کیا ہے: ابن اسحاق وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو آپ نے اپنے شیرازے سے فرمایا رسی اور چھری پکڑو اس وادی سے ہم نکلیں گا۔ جب شعب مہر میں پہنچے تو حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ مقابل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے متواتر تین راتیں یہ خواب دیکھا۔ پھر جب آپ کو یقین ہو گیا تو آپ نے اپنے بیٹے کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ سدی فرماتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کہ اب ہب لی من الصالحین تو آپ کو نیک صالح بچے کی خوشخبری سنائی گئی۔ آپ نے خوشخبری سننے کے بعد کہا اللہ تعالیٰ نے پچھدیا تو وہ اللہ کے لئے ذبح کیا جائے گا۔ جب بچہ پیدا ہوا اور اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑھوپ کر سکتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا اپنی نذر پوری کرو اور بیٹے کو ذبح کرنے کا جو حکم دیا گیا اس کا یہی نذر سبب تھی (۳) لیکن یہ قول آزمائش کے منافی ہے۔ علامہ بنوری فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل کو کہا یا بھو اللہ کے لئے قربانی دے آئیں۔ انہوں نے چھری اور رسی لی اور اپنے باپ کے ساتھ چل پڑے۔ جب پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اسماعیل نے کہا یا حضور! تمہاری قربانی کا جانور کہاں ہے؟ تو اس وقت آپ نے بتایا کہ بیٹا مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں (۴) نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے انہی کو بقاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی علماء نے انہی کو دوڑھوپ جگہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

2- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 568 (الفر)

1- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 567 (الفر)

4- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 568 (الفر)

3- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 568-69 (الفر)

صح نومی کو نذر اور کسائی نے تاء کے ضم اور اراء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور یہ راء سے مشتق ہے، روایت سے مشتق نہیں ہے، یعنی تیری کیا رائے؟ آپ نے اپنے بیٹے سے اس لئے رائے طلب کی تاکہ امر الہی پر آپ کے صبر اور طاعت الہی پر آپ کی عزیمت معلوم ہو جائے۔ باقی قراء نے تاء اور اراء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو داء کے فتح میں امالہ کرتے ہیں۔ حضرت اسماعیل نے خندہ پیشانی اور خوشی سے عرض کیا ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ وہ کریں۔ مانو مور اصل میں مانو مورہ تھا۔ یا تو ہار مجبور (پ) کو اکٹھا حذف کیا گیا ہے۔ پہلے حرف جر کو حذف کیا گیا اور فعل کو ضمیر کے ساتھ ملا دیا گیا (مانو مورہ) ہو گیا پھر ضمیر عائد کو بھی حذف کر دیا گیا یا امر بمعنی مامور ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے افعال امر کی مامورک مامور کو ضمیر کرنے کے لئے ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وہی الہی ہوتے ہیں اور واجب الاطاعت ہوتے ہیں۔ عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وہی ہوتے ہیں (1) بخاری نے اپنی صحیح میں ابو سعید الخدری سے اور مسلم نے ابن عمر اور ابو ہریرہ سے امام احمد اور ابن ماجہ نے ابی رزین سے اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ سچے خواب نبوت کا جیسا لیسواں جزء ہیں (2) اس میں ذرا شک نہیں کہ انبیاء کرام کے تمام خواب سچے ہوتے ہیں، فساد کا احتمال نہیں رکھتے لیکن دوسرے لوگوں کے خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی ہوتے ہیں۔ مستجدہنی کو نافع نے ہاء کے فتح کے ساتھ باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فَلَمَّا آسَلَمُوا تَكَلَّمُوا لِنَجِيۡنَ ﴿۱۰﴾

”پس جب دونوں نے سراطعت ختم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔“

۱۔ یعنی باپ جیسا حکم الہی کے سامنے جھک گئے اور ارشاد الہی کی اطاعت کی تقادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے بیٹے کو مطیع بنا دیا اور اسماعیل نے اپنے نفس کو مطیع کر دیا (3) ابن عباس فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو زمین پر لٹا دیا، جب کہ پیشانی دونوں پہلوؤں کے درمیان تھی (4) اور یہ واقعہ منیٰ میں صحرہ کے پاس ہوا تھا۔ اس قول کو عبد بن حمید، ابن المنذر، زاین ابی حاتم اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ بنوی نے عن عطاء بن السائب عن رجل من قریش من اہل یہ کے سلسلہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے حضرت اسماعیل کی ذبح کا معاملہ اسی جگہ ہوا تھا جو آج بھی قربانی کرنے کی جگہ ہے۔ علامہ بنوی فرماتے ہیں مفسرین نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل نے حضرت ابراہیم سے عرض کی اے میرے والد محترم میرے اعضاء کو تختی سے باندھ دو جس میں ذبح کے وقت میں حرکت نہ کروں اور اپنے کپڑوں کو اچھی طرح لپیٹ لٹا کہ میرے خون کا کوئی چھینٹا ان پر نہ لگ جائے اور میرے اجر میں کمی نہ ہو جائے اور میرے خون کو دیکھ کر میری والدہ پریشان نہ ہو جائے۔ مزید عرض کیا ابو الہی اپنی چھری اچھی طرح تیز کر لیں اور میرے حلق پر اسے تیزی سے چلاتا تاکہ مجھ پر آسانی رہے کیونکہ موت کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے اور جب آپ وہاں آئی جان کے پاس جائیں تو میرا انہیں سلام عرض کرنا اور اگر آپ میری قمیص ان کے پاس لے جانا چاہیں تو بھی لے جائیں

2- صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 19، حدیث 8: (اعلیٰ)

4- تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 569 (القر)

1- الدر المنکر، جلد 5، صفحہ 528 (اعلیٰ)

3- تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 569 (القر)

کیونکہ ہو سکتا ہے اس سے ان کو کچھ تسلی اور اطمینان ہو جائے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے نخت جگر کے بیٹھے بیٹھے کلمات سن کر اور آداب فرزندہ دیکھ کر ارشاد فرمایا: 'بھگت الہی کی اطاعت میں تو کتنا بہتر معاون ہے۔ جس طرح اسامیل نے کہا تھا حضرت ابراہیم نے اسی طرح کیا۔ پھر حضرت ابراہیم نے اپنے نخت جگر کو بوسہ دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی آنکھوں میں رحمت و شفقت کے آنسو اٹھیں اور کہہ رہے تھے۔ آپ نے انسانی میں اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی لیکن چھری سے اسامیل کے گلے پر کوئی خراش بھی نہ پڑی۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ گلے پر چھری چلائی لیکن چھری نے گلے کو نہ کاٹا۔ آپ نے چھری کو پتھر پر دو تین مرتبہ تیز کیا لیکن چھری کا دم نہیں کرتی تھی (1)۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ پوری توت سے چھری کو چلایا لیکن چھری نے کچھ اثر نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسامیل کے گلے پر تانہا پڑھا دیا تھا۔ علماء نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسامیل نے عرض کی ابا حضور! آپ مجھے پیشانی کے بل پہلو پر لٹا دیں کیونکہ آپ میرے چہرے کو دیکھیں گے تو آپ کو مجھ پر رحم آجائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امراہی کی اطاعت میں وقت و شفقت کا جذبہ حاکم نہ ہو جائے۔ اس طرح میں چھری کو کچھ جرع فزع بھی نہیں کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے اپنے نور نظر کے مشورہ پر مل گیا پھر آپ نے ان کی گدی پر چھری رکھی تو چھری اٹھی ہوئی۔

عبد بن حمید ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اور عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو منہ کے بل لٹایا تھا (2)۔

ابو ہریرہ نے حضرت کعب الاحبار سے اور ابن اسحاق نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو شیطان نے دل میں کہا اگر آج میں آل ابراہیم کو نہ بھینکا۔ کا تو پھر کبھی ان میں سے کسی کو نہیں بھینکا ہوگا۔ شیطان لعین انسانی شکل میں بچہ کی ماں کے پاس پہنچا اور کہا: 'مختصر! تجھے پتہ ہے تیرے نخت جگر کو ابراہیم کہاں لے گیا ہے؟ والدہ نے کہا وہ دونوں باپ بیٹا قریب کی وادی میں لکڑیاں کاٹنے گئے ہیں۔ شیطان نے کہا تم بھلا ایسا نہیں، ابراہیم تو اسے ذبح کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ ماں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا وہ تو اپنے بیٹے پر انتہائی شفیق ہے اور وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ شیطان نے کہا نہیں۔ ایسا نہیں ابراہیم کا خیال ہے کہ مجھے اللہ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اسی ارادہ اور خیال کو پورا کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ والدہ نے کہا اگر واقعی اس کے رب نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر اچھا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کریں۔ شیطان کا داؤد جب وہاں نہ لگا تو وہاں سے نامراد ہو کر دوڑتا ہوا بیٹے (اسامیل) کے پاس پہنچا۔ آپ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ شیطان کہنے لگا: 'اے عزیز تمہیں پتہ ہے تیرا باپ تجھے کس وادی میں لے جا رہا ہے؟ بیٹے نے کہا ہم اس وادی میں اپنے گھر والوں کے لئے لکڑیاں کاٹنے کے لئے جا رہے ہیں۔ شیطان نے کہا نہیں اللہ کی قسم ایسا نہیں۔ وہ تمہیں ذبح کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ بیٹے نے پوچھا کیوں؟ شیطان نے کہا ابراہیم کا خیال ہے۔ کہ اسے اس کے رب نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے بیٹے نے کہا اگر ان کے پروردگار نے انہیں حکم دیا ہے تو پھر انہیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔ جب بیٹے نے بھی شیطان کے دام ہمرنگ زمین کو تار تار کر دیا تو شیطان ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا۔ کہنے لگا: 'بزرگو کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا اس وادی میں ایک کام کی غرض سے جا رہا

ہوں۔ شیطان نے کہا نہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ شیطان نے تجھے خواب میں بیٹاؤں کرنے کا حکم دیا ہے اور تم اسی خیال کو پورا کرنے جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیم اپنی فرست سے پہچان گئے کہ یہ شیطان لعین ہے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اے اللہ کہ دشمن دور ہو جا مجھ سے۔ تم بخدا میں اپنے رب کے حکم کو بسر و چشم قبول کروں گا اور اس پر دل و جان سے عمل پیرا ہوں گا۔ ابلیس غصے کی آگ میں جل ہوا واپس چلنا اور ابراہیم اور آل ابراہیم کے متعلق جو امیدیں اور آرزوئیں لے کر گیا تھا وہ سب کی سب اس کے دل میں ہی رہ گئیں اور اپنا منہ لے کر رہ گیا۔ تا نینا لہی سے وہ سب شیطان کی فسوں کا ریوں اور سو سنا انداز یوں سے محفوظ رہے (۱)۔

ابو الطفیل نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ملا تو شیطان مشعر (مزدلف) کے پاس آپ کے سامنے آئی لیکن ابراہیم علیہ السلام اس سے آگے نکل گئے پھر جب آپ جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے تو پھر شیطان سامنے آیا آپ نے اس کو سات ننگریاں ماریں۔ آپ اپنی منزل کی طرف چلتے گئے۔ جب آپ جمرہ وسطیٰ کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات ننگریاں ماریں پھر آدھ روانہ ہو گئے حتیٰ کہ آپ جمرہ کبریٰ کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات ننگریاں ماریں اور اپنے مقصد کی طرف گامزن رہے حتیٰ کہ منیٰ میں قربانی کی جگہ پہنچ کر حکم الہی کی تعمیل میں اپنے لخت جگر کو زلف کوڑ مین پر لٹا دیا۔

وَكَاذِبَةٌ اَنْ يَّابْرٰهِيْمَ ۙ

”اور ہم نے آواز دی اسے ابراہیم (بس ہاتھ روک لو!) لے“

۱۔ امام بغوی فرماتے ہیں واو زائدہ ہے اور نادیدہ کا جواب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں لعا کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کا نام اس طرح ہوگی کہ جو ہو چکا سو ہو چکا ان دونوں کی مسرت اور خوشی ایسی تھی کہ نہ کوئی حال کو بیان کر سکتا ہے اور نہ کوئی کلام اس کا احاطہ کر سکتی ہے اور ان کا انعامات الہیہ پر شکر بھی قابل دید تھا کہ اس پروردگار عالم نے مصیبت کو دور کر دیا اور اطاعت و فرمانبرداری کی ایسی توفیق بخشی کہ ایسی کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائی اور پھر عظیم ثواب کے عطا کرنے کے بعد تمام جہاں پر فضیلت بھی عطا فرمائی (2) میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واو لعا کے محذوف جواب پر عطف کے لئے ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو فلما اٰسلمنا وقلنا للمجینين مَنَعْنَاهُمْ عَنْهُ الْمُنْبَغِ وَنَادَيْنَاهُ، یعنی جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اسے ذبح کرنے سے روک دیا اور ہم نے آواز دی اسے ابراہیم انی نادینا کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرَّعِيَا اِنَّكَ لَكُنَّ نَجْوَى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ

”بیٹک تو نے سچ کر دکھایا خواب کو، ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنوں کو۔“

۱۔ اے ابراہیم! آپ نے اپنی قدرت کے مطابق اطاعت حکم کو خوب نبھا دیا اور تکلیف و ابتلاء سے مقصود بندے کا اپنی قدرت کے مطابق عمل کر دکھاتا ہے، اس کے علاوہ تکلیف و ابتلاء سے کچھ مطلوب نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ خون بہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا وہ عالم بیداری میں بھی کر دکھایا اس تاویل پر چند صَدَّقْتَ الرَّعِيَا اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوگا اور پہلی تاویل پر مجازی معنی پر محمول ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آخری

تاویل کے مطابق حضرت ابراہیم پر ذبح کرنا واجب نہیں تھا ان پر صرف اسباب ذبح کا مہیا کرنا تھا تو پھر وہ دیناہ کا کیا معنی ہوگا کیونکہ فدیہ تو واجب کے بعد ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری تقدیر پر اگر ذبح کے اسباب مہیا کرنا اصلاً واجب تھا تو ذبح والا ذبح واجب ہو گیا کیونکہ عادتاً اسباب کے مہیا کرنے کے بعد چیز کا پایا جانا لازم ہوتا ہے اس لئے فدیہ کا اس پر اطلاق صحیح ہے (یعنی گلے پر چھری چلائی جائے تو عادتاً ذبح کا پایا جانا لازم ہوتا ہے تو جب آپ نے خواب میں چھری چلانا دیکھا تھا تو ذبح کرنا بھی الزماً ثابت تھا) یہ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کسی حکم پر عمل سے پہلے بھی اس حکم کا رخ ہو سکتا ہے۔

یہ جملہ ان کی احسان مندی کی وجہ سے تکلیف کے دور ہونے کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی نیکو کاروں اور اطاعت شعاروں کو ان کی فرمانبرداری کی ہم اسی طرح جزاء دیتے ہیں جیسی ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی تھی۔ ہم نے بچے کو ذبح کرنے کا حکم بھی اٹھا دیا اور اجر عظیم بھی عطا فرمایا اور تمام جہانوں پر فضیلت و برتری بھی عطا فرمادی۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۱۱﴾

”بی شک یہ بڑی کھلی آزمائش تھی۔“

۱۱۔ یعنی بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ایک ایسی آزمائش تھی جس سے مخلص اور غیر مخلص بالکل ٹکڑ کر سامنے آ جاتے ہیں یا یہ مطلب کہ یہ ایسی مشقت اور صعوبت تھی کہ اس سے بڑی اور کوئی مشکل نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بلاء سے مراد نعمت ہے، یعنی بیٹے کی جگہ دنیہ کا۔ فدیہ بہت بڑی نعمت ہے۔

وَقَدْ يَنْبَغُ بِذِي عَرْفِ عَظِيمٍ ﴿۱۲﴾

”اور ہم نے بچا لیا سے فدیہ میں لے ایک عظیم ذبیحہ دے کر۔“

۱۲۔ اس کا عطف دینا ہی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آواز سنی تو آسمان کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیل ایک سیاہ سنگوں والے دنبے کے ساتھ نظر آئے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا یہ تمہارے بیٹے کا فدیہ ہے، اسے چھوڑ دیتے اور اسے ذبح فرمائیے۔ حضرت جبرئیل نے تکبیر بلندی اور مینڈھنے سے بھی تکبیر بلندی۔ حضرت ابراہیم نے تکبیر کہی اور آپ کے بیٹے نے بھی تکبیر کہی۔ حضرت ابراہیم نے مینڈھ کو پکڑا اور منی میں مدح کے اندر لے گئے پھر وہاں اسے ذبح کر دیا۔ فدیہ دینے والے حقیقت میں ابراہیم تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے فدیہ کے طور پر ذبیحہ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ تھا اور اس کا حکم کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ تھا۔ یہ فدیہ میں مجازاً نسبت میں مجاز کے طور پر ہے۔

۱۳۔ عظیم سے مراد عظیم الجنت ہے۔ یعنی مونا تازہ بھاری بھر کم یا عظیم القدر، یعنی ثواب بہت عظیم تھا۔ حسین بن الفضل فرماتے ہیں وہ مینڈھ صاحب عظیم القدر اس لئے تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا حق تھا کہ وہ عظیم ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کو عظیم اس لئے فرمایا کیونکہ وہ مقبول تھا (۱۱)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ وہ مینڈھ حاجت میں چالیس سال رہا تھا۔ اس قول کو ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ سعید بن جبیر سے ابن عباس کا قول مروی

ہے کہ جو مینڈھا حضرت ابراہیم نے ذبح کیا تھا یہ وہ تھا جسے حضرت آدم کے بیٹے بائبل نے قربانی دیا تھا (۱) اسی آیت کریمہ سے علماء احناف نے دلیل بکڑی ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانے اس پر ایک بکری ذبح کرنا لازم ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے (۲)۔ ہم نے یہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ سورہ حج میں دیکھا ہے کہ حضرت آدم کے ذبح کر دیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسی نذر ماننے والے پر کوئی چیز لازم نہ ہو کیونکہ اس نے گناہ کی نذر مانی ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی یہی قول ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے استحساناً بکری کا لازم ہونا فرمایا ہے۔ کیونکہ جب شرعاً حقیقت مجبورہ ہو تو مجاز متعین ہو جاتا ہے پس جب کسی نے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو ہم نے اس کا بدل اس پر لازم کیا، یعنی اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بھی یہی تھا جیسا کہ ہم نے سورہ حج میں ذکر کیا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿٣٥﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿٣٦﴾

”اور ہم نے چھوڑا ان کا ذکر کرنے والوں میں سلام ہوا ابراہیم پر“

۱۔ علیہ کی ضمیر کا مرعہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اس جملہ کا عطف جہاں رہے بقلب سلیم پر ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدیناہ پر عطف ہو۔ آخرین سے مراد آنے والے لوگ اور آئیں ہیں۔ تو کتنا کے مفعول کو یاق کلام کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَلَّمَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ، تو کتنا کا مفعول ہو۔

كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٨﴾

”اسی طرح ہم بدل دیتے ہیں نیکوکاروں کو بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔“

۱۔ یہ جملہ سلام کی علت بیان کر رہا ہے۔ اس قصہ میں چونکہ ”انا“ کا پہلا ذکر ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔

وَبَشِّرْهُ بِأَسْحَابٍ طَيِّبَاتٍ ﴿٣٩﴾

”اور ہم نے بشارت دی آپ کو اسٹن کی (کہ) وہ نبی ہوگا (زمرہ) صالحین میں سے ہے۔“

۱۔ یعنی نبوت اور اصلاح میں سے ہر ایک کو متعین (جس کا فیصلہ کیا گیا ہو) اور مقدر بنانے کے اعتبار سے نسیا اور قبۃ الفضلین ائمتہ سے حال ہوں گے۔ اور مشورہ (ائمتہ) کا بشارت کے وقت موجود نہ ہونا بھی قدح کا باعث نہیں ہے کیونکہ ذوالحال کا موجود ہونا شرط نہیں ہے بلکہ ذوالحال کے ساتھ فعل کے تعلق کے وقت حال کے مضمون سے ذوالحال کا متصف ہونا شرط ہے پس یہاں مضاف مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جو حال اور ذوالحال کا عامل ہے۔ مثلاً یہ کہا جائے بشورناہ موجود اسحاق اور یہ قول فادخلوها خالدین کی مثل نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں داخل ہونے والوں کا خلود دخول کے وقت مقدر تھا۔ جب کہ اسحاق کے پائے جانے کے وقت ان کی نبوت و اصلاح مقدر نہیں تھی۔ نبوت کے بعد صلاح کا ذکر حضرت اسحاق علیہ السلام کی شانہ اور آپ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے ہے (تا کہ صراحتاً آپ کی تعریف و توصیف پر دلالت ہو جائے) اگرچہ نبوت کے ذکر میں التزماء آپ کی صلاح کا بھی ذکر ہو چکا تھا) اور نبوت کے بعد صلاح کا ذکر اشارہ ہے کہ نبوت کی غایت صلاح ہے کیونکہ نبوت کے ضمن میں بالفعل علی الاطلاق کمال (ذات) اور تکمیل (قوم) کا معنی پایا جاتا ہے۔

وَبَرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ اسْتِخْرَاجٍ وَمَنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِنَفْسِهِ مُبِينٌ ﴿٥٠﴾

”اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا۔“

یعنی دین و دنیا کی خیرات و برکات کا ہم نے ابراہیم پر فیضان فرمایا۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد میں برکت نازل کی اور اسٹخراہ پر بھی برکتیں نازل کیں۔ حضرت پر خاص برکت یہ تھی کہ آپ کی نسل سے ہزار نبی تشریف لائے۔ ان میں پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اور آخری عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ ان دونوں یعنی ابراہیم اور اسٹخراہ کی اولاد میں نیک سیرت ہوں گے یا ایمان و طاعت کے ساتھ اپنے نفس سے بھلائی کرنے والے ہوں گے۔ ”معبین“ یعنی ان کا ظلم ظاہر ہوگا۔ اس آیت میں تشبیہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی میں سب کا کوئی اثر نہیں ہے اور اولاد میں ظلم و معاصی کا پایا جانا بزرگوں کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٥١﴾

”ہم نے احسان فرمایا موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) پر۔“

یعنی نبوت اور دوسرے دینی اور دنیوی نعمات سے سرفراز فرمایا۔ اس آیت کا عطف و لقد نادانا نوح پر ہے۔ اور ان کے درمیان پہلے مقررہ ہیں۔

وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكُفْرِ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾

”اور ہم نے بچالیا ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑے کفر و اندوہ سے۔“

یعنی قوم سے مراد بنی اسرائیل ہے۔ الْكُفْرُ الْعَظِيمُ سے مراد فرعون کی اذیت ہے اور بعض مفسرین نے اس لئے فرق ہونے سے نجات مراد لی ہے۔

وَنَصَرْنَاهُمْ فَمَا نَوَّاهُمُ الْعُلَيْيْنَ ﴿٥٣﴾

”اور ہم نے ان کی مدد فرمائی پس ہو گئے وہی غلبہ پانے والے۔“

یعنی نصرانہم میں ضم نیر سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم ہے، یعنی وہ فرعون اور اس کی قوم پر غالب آگئے۔

وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿٥٤﴾

”اور ہم نے بخشی ان دونوں کو ایسی کتاب جو نہایت واضح ہے۔“

یعنی کتاب سے مراد تورات ہے۔ الْمُسْتَقِيمَ یعنی جو احکام الہی اور شرائع کے بیان میں کمال تھی۔

وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿٥٥﴾

”اور ہم نے ہدایت دی انہیں سیدھے راستہ کی۔“

یعنی ہم نے انہیں سیدھے راستہ کی ہدایت دی جو اپنے چلنے والوں کو حق اور صواب تک پہنچاتا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿٥٦﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٥٧﴾ إِنْكَارُكَ

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٠﴾ إِنَّهُمْ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦١﴾

”اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر ہم اسی طرح جزا دے دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں۔“

ان آیات کا مفہوم پیچھے گزر چکا ہے۔

وَإِنَّ الْيَأْسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٦٢﴾

”اور بیشک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں۔“

الیاس کو ابن زکوان نے بروایت القشاش عن الأفضی ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے تحقق کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا عطف ولقد مننا پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں الیاس سے مراد اور ایس پیغمبر ہیں اور عبداللہ بن مسعود کے صحیف میں ابن ادریس لمن المرسلین تھا۔ عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں الیاس بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ حضرت اسع علیہ السلام کے پچازاد بھائی تھے۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں حضرت الیاس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے الیاس بن بشر بن انعام بن عیزار بن ہارون بن عمران علیہ السلام نیز محمد بن اسحاق اور دوسرے مؤرخین علماء نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس سے پہلے نبی کی روح قبض کی تو بنی اسرائیل بدعتوں میں مبتلا ہو گئے، شرک کا غبار ہر طرف پھیل گیا اور لوگوں نے بڑے بڑے بت نصب کر دیئے جن کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے اس گھپ اندھیرے میں توحید و ہدایت کا چراغ روشن کرنے کے لئے حضرت الیاس کو نبی بنا کر بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوتا وہ ان احکام کی تجدید کے لئے آتا جو وہ تواریت میں سے بھلا چکے تھے۔ بنو اسرائیل شام کے علاقہ میں کھڑے ہوئے تھے اس وقت شام کا ایک قبیلہ کہ یوشع بن نون نے جب شام کو فتح کیا تو اس نے یہاں بنی اسرائیل کو سکونت دینی اور یہ علاقہ ان میں تقسیم کر دیا۔ بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ بعلبک اور اس کے گرد و اج میں قیام پزیر تھا۔ ان میں سے حضرت الیاس تھے اور ان کی طرف آپ کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت بعلبک کا بادشاہ یؤب نامی شخص تھا۔ وہ بادشاہ خود بھی بت پرست تھا اور وہ لوگوں کو بھی بتوں کی عبادت پر مجبور کیا کرتا تھا۔ بادشاہ جس بت کی عبادت کرتا تھا اس کا نام بعل تھا جس کا طول میں ہاتھ تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ حضرت الیاس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلاتے لیکن وہ اپنے بادشاہ کا حکم ماننے اور آپ کی کوئی بات نہ سننے اور بادشاہ اس بت کی تعظیم کرتا اور اسی کو تسلیم کرتا تھا۔ حضرت الیاس بادشاہ کی بھی راہنمائی کرتے اور اس کے اعمال بد کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ یؤب بادشاہ کی ایک بیوی تھی جس کا نام ازبتل تھا۔ بادشاہ جب کسی جنگی مہم یا کسی دوسری غرض سے ملک سے باہر جاتا تو اسے اپنا نائب بنا کر جاتا تھا اور وہ بے حجاب باہر نکلتی اور لوگوں کے مسائل کے فیصلے کرتی تھی وہ بہت سے انبیاء کرام کی قاتل تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو بھی اس بد بخت عورت نے قتل کیا تھا۔ اس عورت کا ایک کا تب تھا جو مومن اور آئینہ تھا، اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا، اس خوش نصیب شخص نے اس ظالم اور قاتل عورت کے ہاتھ سے تین سوانیاں کراہ کر کھولیں، جب کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو قتل کرنا چاہتی تھی جب کہ وہ اپنے فرانس نبوت کی ادا ہو گئی کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ ان تین سو کے علاوہ نئی انبیاء کرام کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ یہ ایک بدکار عورت تھی، اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ بادشاہوں سے نکاح کیا تھا اور ان کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ یہ طویل العرصہ تھی۔ روایت ہے کہ اس کے

بچے اور بچیاں سڑکی تعداد میں تھے اور اس اُنُجب بادشاہ کا ایک پڑوسی تھا جو ایک نیک سیرت انسان تھا، اس کا نام مزدکی تھا اور اس کا ایک باغ تھا جس پر اس کی معیشت کا داروہدا تھا۔ ہر وقت وہ اس کی آباد کاری اور کاشت چھانٹ میں مصروف رہتا تھا اور وہ باغ بادشاہ کے محل کے سامنے تھا۔ وہ میاں بیوی اس میں ہر وقت فرخ کے لئے آتے تھے، اس میں وہ کھاتے پیتے اور غسل کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے پڑوسی مزدکی سے حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور وہ بھی بادشاہ سے اچھا برتاؤ کرتا تھا لیکن بادشاہ کی بیوی ازبیل اس کے باغ کی وجہ سے اس سے حسد کرتی تھی اور ہمیشہ کسی ایسے حیلہ کی تلاش میں رہتی تھی جس کے ذریعہ وہ باغ اس سے منسوب کر لے کیونکہ وہ سنی تھی کہ لوگ اس باغ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی پر اُنہما رتوب کرتے ہیں۔ ازبیل اس شخص کو قتل کرنے کا حیلہ کرتی تھی لیکن بادشاہ اسے منع کرتا تھا۔ ازبیل کو اب اس کو قتل کرنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سو نے اتفاقاً کہ بادشاہ کہیں سفر پر دور چلا گیا اور کافی عرصہ اپنے ملک سے باہر رہا۔ ازبیل نے موقع کو غنیمت سمجھا اور چند آدمی مزدکی کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار کئے کہ اس نے بادشاہ اُنُجب کو گالیاں دی ہیں۔ گواہ گواہی دینے کے لئے تیار ہو گئے اور اس زمانہ میں قانون یہ تھا کہ جو بادشاہ کو گالیاں دے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مزدکی کے خلاف جھوٹی گواہی ہو گئی تو ازبیل نے مزدکی کو بلایا اور کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے بادشاہ کو گالیاں دی ہیں۔ مزدکی نے انکار کیا۔ اس نے گواہوں کو بلایا اور جھوٹی گواہی اس کے خلاف پیش کر دی۔ ازبیل نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا اور اس کے باغ پر خود قبضہ کر لیا اس نیک آدمی کو قتل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

جب بادشاہ واپس آیا تو اس کو ساری صورت حال بیوی نے بتائی۔ بادشاہ نے کہا تو نے اچھا نہیں کیا۔ اب ہم کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بڑے عرصہ سے وہ ہمارا پڑوسی رہا اور ہم نے اس کے پڑوس کو خوب نبھایا اور ہم نے اس سے ہر تکلیف کو روک رکھا کیونکہ ہم پر اس کے پڑوس کا حق تھا اور تو نے اس کے جوہر کو بڑے انداز میں ختم کیا ہے۔ بیوی نے کہا میں تو تیری وجہ سے اس پر غضبناک ہوئی تھی اور تیرے قانون کے مطابق میں نے فیصلہ کیا تھا۔ بادشاہ نے بیوی سے کہا تیرے لئے ممکن نہ تھا کہ تو اس کے پڑوس کی حفاظت کرتی بیوی نے کہا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الیاس کو اُنُجب بادشاہ اور اس کی قوم کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ انہیں بتاؤ کہ اللہ تم لوگوں پر ناراض ہے کیونکہ تم نے اس کے دوست کو قتل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس کرموت کی توبہ نہ کی اور باغ اس کے ورثہ کو نہ دیا تو انہیں بھی اُنُجب اور اس کی بیوی کو باغ میں ہلاک کر دے گا پھر ان کے جسم باغ میں مرداروں کی طرح پڑے رہیں گے حتیٰ کہ پڑیوں سے گوشت اتر جائے گا اور وہ اپنے جسموں سے بہت تھوڑا عرصہ جمع ہو گئے۔ حضرت الیاس بادشاہ کے پاس آئے اور جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اور اس کی بیوی کے متعلق باغ واپس کرنے کا ارشاد فرمایا تھا وہ سن و عن سنا دیا۔ بادشاہ نے جب یہ پیغام سنا تو غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور کہنے لگا الیاس جو کچھ کہہ رہے ہو سب باطل ہے۔ فلاں فلاں افراد جو بتوں کی عبادت کرتے بالکل ہماری مثل تھے، وہ کھاتے پیتے رہے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جس چیز کو تم باطل سمجھتے ہو اس کے ہوتے ہوئے ان کے کسی دنیوی معاملہ میں کوئی نقصان اور خسارہ نہ ہوا۔ ان پر ہمیں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بادشاہ نے حضرت الیاس کو سزا دینے اور قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب حضرت الیاس نے سمجھا کہ وہ مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے ہے تو آپ اس کو چھوڑ کر چلے گئے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے۔ بادشاہ نے دوبارہ اصل کی عبادت شروع کر دی حضرت الیاس ایک مشکل پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے اور پھر اس کی غار میں داخل ہو گئے۔ روایت ہے کہ آپ سات سات سال ڈرتے اور گھومتے رہے، گھاٹیوں اور غاروں میں بسر اوقات کرتے

رہے، زمین کی بونیوں کے پتے اور درختوں کے پھل کھاتے رہے۔ بادشاہ کے حواری حضرت الیاس کی تلاش میں رہے اور انہوں نے کچھ جاسوس چھوڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے الیاس کو ان ظالموں سے بچانے رکھا۔ پھر جب سات سال مکمل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو اپنے اہلبار اور اپنے غصہ کو بخشنا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے اُنجب کے بیٹے کو میرٹس کر دیا۔ اُنجب کو وہ بیٹا بہت پیارا تھا اور اس کی مشابہت رکھتا تھا اس کا بیٹا سخت مریض ہو گیا حتیٰ کہ بادشاہ اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے بت بعل سے دعا مانگی۔ اس وقت کے لوگ بعل کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا تھے وہ اس بت کا بہت احترام کرتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے چار سو خادم اس کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔ ان مجاوروں اور خادموں کو انبیاء کہتے تھے شیطان بت کے اندر داخل ہو جاتا اور باتیں کرتا تھا۔ یہ چار سو مجاور پورے انہماک سے شیطان کی باتیں سنتے اور شریعت کے متعلق ان کے دلوں میں جو سماندازی کرتا۔ شیطان سے سنی ہوئی باتیں مجاور لوگوں کے سامنے بیان کرتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں انبیاء کہتے تھے۔ جب لڑکے کا مرض شدت اختیار کر گیا تو بادشاہ نے ان مجاوروں سے درخواست کی کہ بعل کے سامنے سفارش کریں اور اس سے اس کے بیٹے کے لئے شفا طلب کریں۔ مجاوروں نے دعا مانگی لیکن اس بت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ شیطان کو بعل کے اندر داخل ہونے سے روک لیا حالانکہ مجاورین گمراہی پرورے شیطان کے حضور سے دعا مانگتے رہے۔ جب عرصہ دراز گزر گیا اور بت کے سامنے کچھ نشوونائی نہ ہوئی تو مجاوروں نے اُنجب سے کہا شام کے فلاں علاقہ میں چند اور خدا ہیں ان کی طرف ان مجاوروں کو بھیج دو شاید وہ تیرے خدا بعل سے سفارش کریں کیونکہ تیرا خدا بعل تیرا خدا بعل تیرا خدا ہے اگر وہ تجھ سے ناراض نہ ہوتا تو تیری گزارش ضرور قبول کرتا۔ بادشاہ نے کہا مجھ سے ناراض کیوں ہے؟ میں تو اس کی اطاعت کرتا ہوں۔ مجاوروں نے بتایا اس کی ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ تو نے الیاس کو قتل نہیں کیا اور تو نے اس کے معاملہ میں کوتاہی کی حتیٰ کہ وہ سلامتی کے ساتھ نکل گیا۔ حالانکہ وہ تیرے خدا کا منکر ہے۔ اُنجب نے کہا میں الیاس کو اب کیسے قتل کر سکتا ہوں میرا بیٹا بیمار ہے میں اس کو تلاش نہیں کر سکتا، نہ مجھے اس کے ٹھکانے اور جگہ کا علم ہے کہ میں اس کا قصد کروں۔ اگر میرے بیٹے کو عافیت ہوگی تو میں اس کو تلاش کر کے قتل کروں گا اور اپنے خدا کو راضی کروں گا پھر اس نے اپنے وہ چار سو انبیاء (مجاوروں) دوسرے شام کے خداؤں کی طرف بھیجے تاکہ وہ بادشاہ کے بت کے پاس سفارش کریں کہ اس کے بیٹے کو شفا ہو جائے۔ جب وہ چار سو کا جتھہ جا رہا تھا اس پہاڑ کے سامنے پہنچے جس میں حضرت الیاس پوشیدہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ پہاڑ سے اتر ڈالنے کے سامنے جا ڈال اور ان سے بات چیت کرو اور فرمایا ڈرو نہیں میں تجھ سے ان کے شر کو بھیر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ حضرت الیاس پہاڑ سے نیچے تشریف لائے۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہیں روک لیا۔ جب وہ پتھر سے تو فرمایا اللہ نے مجھے تمہاری طرف اور تمہارے پیچھے ساتھیوں کی طرف بھیجا ہے۔ اسے میری قوم اپنے رب کا پیغام غور سے سنو تاکہ تم اپنے بادشاہ کے پاس بھی یہ پیغام پہنچا دو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ اور کہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے اُنجب کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اللہ ہوں اور میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں ہی بنی اسرائیل کا خدا ہوں جس نے انہیں پیدا کیا رزق عطا فرمایا، انہیں زندہ کرتا ہوں۔ تیرے علم تک میں نے تجھے اس بات پر ابھارا ہے کہ تو میرا شریک ٹھیکرے اور میرے علاوہ دوسروں سے اپنے بیٹے کی شفا طلب کرتے ہو جن کے پاس اگر میں نہ چاہوں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے میں نے اپنے نام کی قسم اٹھائی ہے کہ میں ضرور تجھ پر تیرے بیٹے کے متعلق نضب تک ہوں گا اور فوراً سے اردوں گا حتیٰ تجھے پتہ چل جائے گا کہ میرے سوا کوئی دوسرا کسی چیز کا مالک

نہیں ہے۔ حضرت الیاس نے انہیں یہ فرمایا اور وہ واپس پلٹ گئے، جب کہ ان کے دل رعب سے بھرے ہوئے تھے۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ الیاس ہمارے سامنے پہاڑ سے اترے تھے۔ وہ ایک بلند قامت و بڑے پتلے جسم والے تھے، ہر کے بال گر چکے تھے، جلد سبزی ہوئی تھی اور انہوں نے بالوں کا بنا ہوا جب پہنا ہوا تھا اور کانوں سے اس کا گرگرنای ہی رکھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو ہمارے دل ہیبت اور خوف سے بھر گئے اور ہماری زبانیں گلگ ہو گئیں۔ ہم اتنی کثیر تعداد میں تھے لیکن نہ تو اس سے بات کر سکے اور نہ اسے پکار کر لاسکے۔ حتیٰ کہ ہم اپنا منہ لے کر تیرے پاس لوٹ آئے پھر انہوں نے الیاس کا پیغام بادشاہ کو سنایا۔ اُتب نے کہا جب تک الیاس زندہ ہے زندگی سے نفع بے سود ہے اور اس پر قبضہ پھر کسی مکر و فریب سے کیا جاسکتا ہے۔ پس اس نے ایک سازش کے تحت پچاس مرد اپنی قوم سے پنے جو بڑے طاقتور اور جنگ جوتھے۔ انہیں اس نے الیاس کی گرفتاری اور قتل کے لئے مقرر کیا۔ اس نے انہیں تاکید کی کہ انتہائی حیلہ اور منصوبہ بندی کر کے جانا اور اسے دھوکے سے قتل کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہم اور ہمارے پیچھے جتنے لوگ ہیں سب ایمان لا چکے ہیں تاکہ الیاس مانوس ہو جائے اور دھوکا میں آ جائے پھر اسے پکار کر بادشاہ کے پاس لایا جائے۔ وہ پچاس افراد بادشاہ کی نصیحت و مشورہ قبول کرتے ہوئے چل پڑے حتیٰ کہ جس پہاڑ میں حضرت الیاس رہتے تھے اس پر چڑھ گئے پھر اس کے اوپر جدا جدا ہو کر بانٹا واز سے حضرت الیاس کو پکارنے لگے اور کہنے لگے اے اللہ کے نبی ہماری طرف تشریف لا۔ ہم پر اپنی زیارت کا احسان فرمائیے، ہم سب تم پر ایمان رکھتے ہیں اور تیری تصدیق کرتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ اُتب اور تمام لوگ تجھ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ اپنے متعلق بے خوف ہو جائیے۔ تمام بھائی اور اہل آپ پر سلام بھیجئے ہیں اور دل و جان سے اقرار کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیری دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے اور ہم میں اپنے احکام نافذ فرمائیے۔ آپ جو حکم دیں ہم تعمیل کریں گے اور جس کام سے آپ منع کریں گے اس سے روک جائیں گے۔ اب تمہیں ہمارے ایمان قبول کرنے کے بعد چھپ کر رہنے کی اجازت نہیں۔ آپ ہماری طرف تشریف لائیے۔ یہ سب باتیں مکر و فریب جھوٹ اور دھوکا تھا۔ جب حضرت الیاس نے ان کی یہ باتیں سنی تو ان کے ایمان کی کچھ امید ذہن میں آئی اور سوچا کہ اگر اب ظاہر نہ ہوا تو شاہیہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں الہام فرمایا کہ ٹھہر جاؤ اور ان کے لئے دعا کرو تو حضرت الیاس نے یہ دعا کی اے اللہ! اگر یہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو مجھے ظاہر ہونے کی اجازت دے دے اور اگر یہ سب جھوٹے ہیں تو میری طرف سے تو ان کا کام تمام کر دے اور ان پر آگ کے گولے برسائو انہیں جلا کر رکھ کر دیں۔ ابھی تک الیاس کی کلام مکمل نہ ہوئی تھی کہ ان پر آگ برسے، جس کے ساتھ وہ سب جل گئے۔ جب یہ خبر اُتب کو پہنچی تو پھر بھی وہ اپنے برے ارادہ سے باز نہ آیا۔ اس نے دوبارہ سازش کرنے کا پروگرام بنایا اور پہلی تعداد کے برابر ایک گروہ تیار کیا جو پہلے لوگوں سے زیادہ طاقتور اور جلیلہ ساز تھا بادشاہ کے حکم سے وہ پہاڑوں کے اوپر چڑھ گئے اور پکارنے لگے اے اللہ کے نبی! ہم اللہ کے غضب اور اس کی پکار سے تیرے وسیلہ کی بناہ لیتے ہیں۔ ہم پہلے لوگوں کی طرح نہیں ہیں، وہ منافق تھے اور ہمارے مشورہ کے بغیر تیرے خلاف سازش کرنے آئے تھے۔ اگر ہمیں ان کا پتہ چل جاتا تو ہم انہیں تہ تیغ کر دیتے اور تیری حفاظت کرتے ہیں تیرے رب نے ان کا کام تمام کر دیا اور انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس پروردگار عالم نے ہماری طرف سے اور آپ کی طرف سے ان سے انتقام لے لیا۔ جب حضرت الیاس علیہ السلام نے ان کی یہ باتیں سنی تو پہلے کی طرح اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی پس ان پر بھی آگ برسی اور ان کو جلا دیا۔ اس دوران بادشاہ کے بیٹے کی مرض شدت اختیار کر گئی۔

جب بادشاہ نے دوسرے گروہ کی ہلاکت کی خبر سنی تو وہ انتہائی غضبناک ہوا اور اس نے خود الیاس کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا لیکن بیٹے کی مرضی اس کے اس ارادہ میں آڑے آگئی۔ اس کے لئے خود جانا ممکن نہ ہوا تو اس نے الیاس کی طرف عورت کے مومن کا تب کو بھیجے گا ارادہ کیا اس امید سے کہ الیاس اس سے مانوس ہوگا اور پہاڑوں سے نیچے اتر آئے گا۔ اس نے کا تب کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ اب وہ الیاس کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور بادشاہ نے کا تب کے سامنے یہ ارادہ اس لئے ظاہر کیا کیونکہ بادشاہ کو اس کے ایمان لانے کا علم تھا اور بادشاہ اس کے ایمان پر مطلع ہونے کے باوجود اس کی تعریف کیا کرتا تھا کیونکہ وہ انتہائی کفایت شعار امانتدار اور دانشمند آدمی تھا۔ جب اس کا تب کو بادشاہ نے حضرت الیاس کی طرف بھیجا تو اس کے ساتھ آدمیوں کا ایک جتھہ بھیجا۔ بادشاہ نے کا تب کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے سامنے اپنے بغض اور کینہ کا اظہار کیا۔ انہیں کہا کہ الیاس کو اعتماد میں لینا اور پھر اگر وہ تمہارے ساتھ نہ آتا چاہے تو باندھ کر لے آنا اور اگر کا تب کے ساتھ آجائے تو تم اسے خوف زدہ نہ کرنا۔ بادشاہ نے کا تب کے سامنے اپنی توبہ کا بھی ذکر کیا اور مزید کہا کہ اب مجھ پر حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ جتنی مجھے مصیبت پہنچی ہے مثلاً میرے ساتھیوں کا بل جانا اور میرے بچے کا شدید مرض میں مبتلا ہونا یہ سب الیاس کی بددعا کا وجہ سے ہے۔ اب مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے باقی ماندہ لوگوں کے لئے بھی وہ بددعا نہ کر دیں اور ہم سب ہلاک نہ ہو جائیں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ ہم سب نے توبہ کر لی ہے اور ہماری توبہ درست نہیں ہو سکتی اور ہم رضا الہی کو حاصل نہیں کر سکتے اور تون کو مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ الیاس ہمارے درمیان موجود نہ ہوں اور وہ ہمیں احکام کا حکم نہ دیں اور محرمات سے منع نہ کریں اور جب تک کہ الیاس ہمیں خود آ کر رب کی رضا کے افعال نہ بتائیں۔ بادشاہ نے اپنی توبہ کو حکم دیا کہ تم بت کی عبادت سے الگ ہو جاؤ۔ لوگوں نے بھی کہا کہ تم الیاس کو بتانا کہ ہم جن بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت ہم نے ترک کر دی ہے۔ الیاس خود آ کر انہیں جلائیں اور انہیں ہلاک کریں۔ یہ سب بادشاہ کی طرف سے دہل اور فریب تھا۔

کا تب اور مقررہ افراد الیاس کی تلاش میں چل پڑے حتیٰ کہ اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس میں حضرت الیاس رہتے تھے پھر اس مومن کا تب نے آپ کو آواز دی حضرت الیاس اس کی آواز کو پہچان گئے۔ آپ کے دل میں اس کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ تم اپنے نیک بھائی کے لئے ظاہر ہو جاؤ اور ان سے ملاقات کرو نیز اس کی بیعت کی تجدید کرو آپ ظاہر ہوئے، اس مومن پر سلام کیا اور مصافحہ فرمایا۔ آپ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ اس کا تب مومن نے بتایا کہ اس ظالم جابر نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے پھر اس نے وہ سب کچھ بیان کیا جو قوم نے کہا تھا۔ مزید اس مومن نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ شریف نہ لے گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ قتل کر دیں گے۔ آپ مجھے جو حکم فرمائیں میں تعمیل ارشاد کروں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں انہیں چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو جاؤں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی طرف سے ان کے ساتھ جہاد کروں اگر آپ چاہیں تو مجھے کوئی پیغام دیر میں انہیں پہنچاؤں اگر آپ چاہیں تو اپنے پروردگار سے دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ عطا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی یہ جو حکم تمہارے طرف سے پیغام لے آئے ہیں یہ سب دھوکا اور فریب ہے، یہ اس کذب بیانی کے ساتھ آپ پر قبضہ چاہتے ہیں۔ انہی کے بھیجے ہوئے لوگ جب اسے بتائیں گے کہ آپ کی اس مومن کا تب سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ آپ کو لے کر نہیں آیا ہے تو بادشاہ اس پر تہمت لگائے گا کہ اس نے آپ کو لانے میں کوتاہی کی ہے۔ خدشہ ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ آپ اس کے ساتھ چلے جائیں میں تم دونوں کو اس سے محفوظ رکھوں گا۔ میں اس کے بیٹے کی بیماری بڑھا دوں گا حتیٰ کہ وہ اس کے غم و علاج میں

مصرف رہے گا۔ پھر میں اس کو بری حالت میں موت دے دوں گا۔ جب لڑکانوت ہو جائے تو آپ واپس آ جانا۔ حضرت الیاس اس مؤمن کا تب کے ساتھ چل پڑے۔ حتیٰ کہ اُنکب کے پاس پہنچ گئے۔ ادھر وہ پہنچے ادھر اللہ تعالیٰ نے لڑکے کو شدید تکلیف میں مبتلا کر دیا حتیٰ کہ موت اس کے حلق میں اُنکب گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو لڑکے کی مصیبت کی وجہ سے الیاس سے غافل کر دیا۔ وہ اس کی پریشانی میں گرفتار تھے تو حضرت الیاس صحیح سلامت واپس آ گئے۔ جب اُنکب کا بیٹا مر گیا اور وہ اس کے معاملات سے فارغ ہو گئے، غم اور پریشانی کم ہو گئی تو وہ الیاس کے معاملہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بادشاہ نے کاتب سے حضرت الیاس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا مجھے تو ان کی کوئی خبر نہیں، مجھے تو تیرے بیٹے کی موت اور غم نے ہر چیز سے غافل کر دیا تھا، میرا تو خیال یہ تھا کہ آپ نے اس پر اعتماد کر لیا ہوگا۔ بادشاہ نے کاتب کی بات سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اسے بھی اس کے بیٹے کی موت پر پریشانی لاحق تھی۔ جب حضرت الیاس کو پہاڑوں پر رہتے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور اُنہیں لوگوں کے ساتھ رہنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو آپ پہاڑ سے نیچے اترے اور قافل پڑے حتیٰ کہ آپ بنی اسرائیل کی ایک عورت کے پاس پہنچ گئے اور یہ عورت یونس بن متی پھلی والے کی والدہ تھی، حضرت الیاس اس کے پاس چھ مہینے چھپے رہے اس زمانہ میں یونس بن متی معصوم بیٹے تھے اور دودھ پیتے تھے۔ حضرت یونس کی والدہ خود حضرت الیاس کی خدمت کرتی تھی اور اپنے مال سے ان کی معاش کرتی تھیں۔ چونکہ حضرت الیاس پہاڑوں کی کھلی فضا میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے آپ مکانوں کی تنگی سے اکتا گئے۔ آپ نے پہاڑوں میں رہنا پسند کیا۔ آپ شہر کی فضا سے نکل کر اپنی جگہ پہاڑ میں چلے گئے۔ حضرت یونس کی والدہ حضرت الیاس کی جدائی اور فراق کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے وحشت میں گھر گئی پھر کچھ عرصہ بعد اس کا بچہ یونس فوت ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب ان نے اس کا دودھ چھڑایا، اس کی مصیبت ان کے لئے بہت عظیم تھی۔

یونس کی والدہ حضرت الیاس کی تلاش میں نکل پڑی پہاڑوں پر چڑھتا اور ان میں چکر لگاتی رہی حتیٰ کہ اس نے الیاس کو تلاش کر لیا۔ اس نے حضرت الیاس کو کہا تیرے جانے کے بعد میں اپنے بیٹے کی موت کی وجہ سے انتہائی پریشان ہوئی اور اس کی مصیبت مجھ پر ناقابل برداشت ہو گئی کیونکہ اس ایک بچے کے سوا میری اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ مجھ پر رحم فرمائیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میرے بیٹے کو زندہ کر دے۔ میں نے اپنے بیٹے کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ اسے کپڑے میں لپیٹ آئی ہوں اور میں اس کو ایک خفیہ جگہ رکھ آئی ہوں۔ حضرت الیاس نے فرمایا مجھے ایسے امور کا حکم نہیں دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کا عبد مامور ہوں، وہی کرتا ہوں جس کا وہ مجھے حکم فرماتا ہے۔ عورت نے انتہائی آہ زاری کی اور گڑ گڑائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کے دل کو عورت کی طرف مائل فرمایا، حضرت الیاس نے فرمایا تیرا بیٹا کب مرا تھا؟ اس نے کہا اسے سات دن ہو گئے ہیں۔ حضرت الیاس اس عورت کے ساتھ چل پڑے اور سات دن چلے رہے جب بچے کے پاس پہنچے تو اسے مرے ہوئے چودہ دن گذر چکے تھے۔ آپ نے پہلے وضو فرمایا اور نماز ادا کی اور پھر دعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے یونس بن متی کو زندہ فرمایا۔ جب وہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا تو حضرت الیاس جلدی سے اُسے وہی چھو ڈر اپنی جگہ لوٹ آئے۔ جب حضرت الیاس کی قوم کی نافرمانی کا عرصہ طویل ہو گیا تو آپ بہت پریشان ہو گئے۔ اسی پریشانی کی کیفیت میں سات سال گزر گئے۔ سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور فرمایا اے الیاس پریشانی اور غم کیوں ہے؟ کیا تو میری وحی کا امین نہیں ہے۔ زمین میں تو میری جنت نہیں ہے اور میری مخلوق میں تو میرا برگزیدہ نہیں ہے تو مجھ سے مانگ میں تجھے عطا کروں گا۔ میری رحمت وسیع ہے اور میرا فضل عظیم ہے۔ حضرت الیاس نے عرض کی تو مجھے موت دے دے اور مجھے میرے آباء کے ساتھ ملا دے۔ میں بنو اسرائیل سے تنگ ہوں اور وہ مجھ سے تنگ

ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے الیاس آج وہ دن نہیں کہ میں زمین اور اہل زمین کو تجھ سے محروم کروں۔ یقیناً زمین کا قیام اور اس کی اصلاح تیرے اور تیرے جیسے دوسرے بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ بعد اود میں تم تھوڑے ہو لیکن تم مجھ سے کوئی اور سوال کرو میں عطا کروں گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اگر تو مجھے موت نہیں دیتا تو مجھے بنی اسرائیل سے بدلہ لینے کی قوت عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو کیا چاہتا ہے کہ میں تجھے عطا کروں۔ حضرت الیاس نے عرض کی تو مجھے سات سال کے لئے آسمان کی قوت عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ان پر میری دعا کے بغیر بادل نہ آئے اور میری سفارش کے بغیر بارش کا قطرہ برے۔ کیونکہ اس طریقہ سے وہ طبع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے الیاس میں اپنی مخلوق پر بہت رحم فرماتا ہوں اگرچہ وہ ظلم بھی کرتے رہیں۔ حضرت الیاس نے عرض کی پھر چھ سال کے لئے بارش کا سلسلہ میرے حکم کے تابع کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس سے زیادہ میں اپنی مخلوق پر رحم فرماتا ہوں۔ آپ نے عرض کی پھر پانچ سال بارش کا کنٹرول مجھے دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بھی میری رحمت سے بہت بعید ہے، میں تجھے تین سال تک ان سے انتقام لینے کی قدرت عطا فرماتا ہوں۔ تین سال تک بارش کا سلسلہ تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ حضرت الیاس نے عرض کی میں کیسے زندہ رہوں گا؟ فرمایا میں تیرے لئے پرندوں کا ایک لشکر سخر کر دوں گا جو سبز وادوں سے کھانے کا سامان لائے گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اب میں خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا فرمان قوم سے بارش روک لی حتیٰ کہ مال مویشی کیزر سے پٹختے درخت سب ہلاک ہو گئے، لوگ انتہائی پریشان اور مشقت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت الیاس اسی طرح اپنی قوم سے پوشیدہ رہے۔ آپ جہاں ہوتے آپ کا رزق وہاں پہنچا دیا جاتا۔ آپ کی قوم کو اس بات کا احساس ہو گیا انہیں جس گھر میں روٹی کی خوشبو محسوس ہوتی وہ کہتے اس مکان میں حضرت الیاس داخل ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو تلاش کرتے (لیکن آپ نہ ملتے) تو لوگ گھر والوں کو ازیتیں دیتے۔ ابن عباس فرماتے ہیں بنی اسرائیل تین سال قحط میں مبتلا رہے ایک دفعہ حضرت الیاس ایک بوڑھی کے پاس سے گذرے، آپ نے بوڑھی سے پوچھا کہ تیرے پاس کوئی کھانا ہے۔ بوڑھی نے کہا کچھ تھوڑا سا آنا تھوڑا سا زیتون ہے۔ آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوا کیں اور ان پر برکت کی دعا کی اور اپنے ہاتھ سے کھانے کو کس کس جاتی کہا آپ کی دعا اور ہاتھ کی برکت سے بوری آئے سے بھر گئی اور اور مکا زیتون سے بھر گیا۔ جب لوگوں نے اس بوڑھی کے پاس یہ سامان دیکھا تو پوچھا یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے بتایا میرے پاس سے ایک ایسے ایسے حلیہ کا آدمی گذرا ہے اس نے آپ کی میت و صفات بیان کیں۔ لوگ پہچان گئے اور کہنے لگے وہ الیاس تھا۔ وہ آپ کو تلاش کرنے لگے لوگوں نے آپ کو دیکھا یا نہیں آپ سے بھاگ گئے پھر آپ نے بنی اسرائیل کی ایک عورت کے گھر پناہ لی جس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام لمیع بن اخطوب تھا۔ وہ زکات و سنت تکلف میں مبتلا تھا اس عورت نے آپ کو اپنے ہاں پناہ دی اور آپ کو چھپا لے رکھا۔ حضرت الیاس نے اس کے سینے کے لئے دعا فرمائی تو وہ بھیک ہو گیا۔ لمیع نے الیاس کی بیروی شروع کر دی اور آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ساتھ ساتھ رہنے لگا جہاں آپ شریف لے جاتے وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ اس وقت حضرت الیاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور لمیع جوان تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی کہ تو نے بہت سی مخلوق کو ہلاک کر دیا ہے، بارش کے روکنے کی وجہ سے جانور کیزرے مکوڑے پرندے بے گناہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت الیاس نے عرض کی اے میرے پروردگار تو مجھے اجازت دے کہ میں ان کے لئے دعا کروں تاکہ جس مصیبت میں یہ گرفتار ہیں اس سے باہر نکل آئیں۔ شاید اب یہ لوٹ آئیں اور تیرے علاوہ جن صورتوں کی عبادت کرتے ہیں ان سے باز آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسے کرنے کی تجھے اجازت ہے۔ حضرت

الیاس بنی اسرائیل کے پاس آئے اور فرمایا تم بھوک سے مر چکے ہو اور مشقت میں مبتلا ہو چکے ہو تمہاری سیاہ کاریوں کی وجہ سے جو پائے پر نہ لے کھڑے کھڑے کوڑے اور درخت سب ہلاک ہو چکے ہیں اور تم غلط راستے پر ہو۔ اگر تم غلط روئی کو جاننا چاہتے ہو تو اپنے بتوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ اگر وہ تمہاری بارش کے متعلق درخواست قبول کرتے ہیں تو پھر جو تم کہتے ہو وہ سچ ہے اور اگر وہ تمہاری اس درخواست کو قبول نہیں کرتے تو تم جان لو کہ تم غلط عقیدہ پر ہو اور تم اس عقیدہ کو ترک کرو پھر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا وہ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے گا۔ لوگوں نے کہا یہ تو نے انصاف کی بات کی ہے۔ وہ اپنے بتوں کو نکال کر لے آئے اور ان سے دعائیں مانگیں لیکن بارش نہ ہوئی اور مصیبت سے نجات نہ ملی پھر انہوں نے حضرت الیاس سے کہا ہم ہلاک ہو چکے ہیں تم ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ آپ نے دعا کی اور حضرت الیسع بھی اس دعا میں شریک تھے فوراً بادل سمندر کے درمیان سے ڈھال کی طرح نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی طرف آ گیا پھر وہ پورے اقیانوس پر پھیل گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی اور بادل ان پر اتنا بھرا کہ مردہ زمینیں زندہ ہو گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرمادی تو انہوں نے عہد شکنی کا مظاہرہ کیا اور اپنے کفر سے باز نہ آئے اور اپنے برائے غلط اور باطل عقیدہ پر قائم رہے۔

جب حضرت الیاس نے ان کی یہ ناشکری اور نافرمانی دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس نافرمان قوم سے نجات اور راحت دے دے۔ علماء فرماتے ہیں آپ کو کہا گیا کہ تم فلاں دن کا انتظار کرو جب وہ دن آئے تو فلاں مقام کی طرف نکل جانا اور جو سواری تیرے پاس آئے اس پر سوار ہو جانا اور خوف نہ کرنا۔ حضرت الیاس نکلے تو حضرت الیسع بھی آپ کے ساتھ نکل پڑے حتیٰ کہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ آگ کا ایک گھوڑا آیا بعض علماء فرماتے ہیں اس گھوڑے کا رنگ آگ کے رنگ کی طرح تھا وہ گھوڑا آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حضرت الیاس چلا گیا لگا لگا کر اس پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا آپ کو لے کر چل پڑا۔ پیچھے سے حضرت الیسع نے آواز دی اے الیاس میرے لئے کیا حکم ہے؟ حضرت الیاس نے ان کی طرف اوبر سے اپنی چادر پھینک دی۔ یہ علامت تھی کہ آپ بنی اسرائیل پر میرے نائب اور ولیفہ ہیں۔ یہ آپ کا آخری عہد اور ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قوم سے اٹھایا اور آپ سے کھانے پینے کی خواہش ختم کر دی اور بڑے عطا فرمادیے پس آپ انسان بھی ہیں فرشتہ بھی ہیں، آسمانی بھی ہیں اور زمینی بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انجب بادشاہ اور اس کی قوم پر ایک دشمن مسلط کر دیا وہ ان پر وہاں سے حملہ کرتا جہاں سے انہیں علم ہی نہ ہوتا حتیٰ کہ وہ ان پر غالب آ گیا۔ اس نے انجب بادشاہ اور اس کی بیوی ازبتل کو جزوی کے باغ میں قتل کر دیا۔ پھر ان کے جسم مرداروں کی طرح اس باغ میں پڑے رہے حتیٰ کہ ان کے گوشت مڑ گئے اور ہڈیاں پرانی اور بوسیدہ ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیسع کو تاج نبوت عطا فرمایا اور انہیں رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمایا اور ان کی طرف وحی فرمائی۔ بنو اسرائیل حضرت الیسع پر ایمان لائے اور آپ کی تعظیم اور احترام کرتے رہے اور آپ کے وصال تک ان میں آپ کا حکم نافذ رہا۔

اسرائیلی بنی یحییٰ عن عبد العزیز کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت الیاس اور خضر علیہما السلام رمضان شریف کے روز سے بیت المقدس میں رکھتے ہیں اور ہر سال حج کرتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت الیاس بیابانوں پر مقرر ہیں۔ اور حضرت خضر سمندر پر مقرر ہیں علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ذرا (الیاس یوم النہدین) کے تحت اسی طرح لکھا ہے (۱)۔

إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ آلَا تَتَّقُونَ ﴿٣٠﴾

”یاد کرو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں؟“

۱۔ یعنی حضرت الیاس نے فرمایا کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿٣١﴾

”کیا تم عبادت کرتے ہو بھل کی اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو؟“

۱۔ تَدْعُونَ بمعنی تعبدون ہے۔ بعل بنی اسرائیل کا ایک بت تھا۔ جس کی وہ عبادت کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے شہر کا نام بعلبک تھا۔ مجاہد، نکرما اور قنادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں بعل رب کو کہتے ہیں یہ کلام سابقہ کلام کا بیان یا بدل ہے (۱)۔

اللَّهُ رَبُّكُمْ وَسَأَبِّأَبَاءَكُمْ الْأَوْلِيَّيْنَ ﴿٣٢﴾

”(یعنی) اللہ کو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے۔“

۱۔ اللہ کو حمزہ کسائی، یعقوب اور حفص نے احسن الخالقین سے بدل کی بناء پر منسوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے استیغاف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَنْهَاهُمْ لِمُحْضِرُونَ ﴿٣٣﴾

”پھر انہوں نے اسے انکار کیا اور انہیں (پکڑ کر) حاضر کیا جائے گا۔“

۱۔ حاضر کرنے سے مراد عذاب میں حاضر کرنا قرینہ کی وجہ سے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا یا اس لئے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مطلق اخصار عفاشر کے ساتھ خاص ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿٣٤﴾

”بجز اللہ کے بندوں کے جو مخلص ہیں۔“

۱۔ یہ استثناء فکذبہ کے فاعل سے ہے المحضین سے استثناء نہیں کیونکہ اس ترکیب سے معنی میں نساہت پیدا ہوگا بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے یا المحضین سے منقطع متصل ہے بشرطیکہ المحضین اس مفہوم میں ہو کہ بعض کے وصف کے ساتھ تمام کا وصف بیان کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّكُمْ لَسَوْفَ تَكُونُونَ ﴿۱﴾ (اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو) (اس جملہ میں سارے قافلہ کو چور کہا گیا ہے حالانکہ سب چور نہ تھے یا لہذا کسی ایک کی خورجی میں تھا)

وَتَسْرِعُنَا عَلَيْكُمْ فِي الْأَخْرَجِينَ ﴿٣٥﴾ سَلَّمَ عَلَىٰ آلِ يَاسِينَ ﴿٣٦﴾

”اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو الیاس پر۔“

۱۔ آل یاسین سے مراد الیاس ہی ہیں۔ یعنی الیاس میں ایک لغت ال یاسین ہے جیسے سیناء اور سینین اسماعیل اور سمعین میکائیل اور میکائین مختلف لغتیں ہیں۔ فرما کہتا ہے آل یاسین جمع ہے۔ اور اس سے مراد الیاس اور ان کے مومن پیروکار ہیں (۲)

اس تاویل پر یہ اس طرح ہوگا جیسے اشعریین (اشعری اور اس کے پیروکار) یحییٰ (حی لوگ) لیکن اس تاویل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب کسی علم کی جمع بنائی جائے تو اس پر الف لام تعریف کا داخل کرنا واجب ہوتا ہے۔ نافع اور عامر نے ال یا یسین کو مزہ کے فقرہ کے ساتھ اور لام کو سرہ کے ساتھ یا یسین سے جدا پڑھا ہے کیونکہ یہ لمصنف میں طمطہ طمطہ لکھے ہوئے تھے (یعنی ال مضاف اور یا یسین مضاف الیہ طمطہ طمطہ دو کلمے ہیں) اس قرأت پر یا یسین الیاں کا باپ ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یا یسین الیاں کا ہی اسم ہو اور الیا یسین سے مراد الیاں اور ان کے پیروکار ہوں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یا یسین سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن یا دوسری کتب سماوی ہیں لیکن یہ قول نظم قرآن کے مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ دوسرے انبیاء کے واقعات کا سلسلہ چل رہا ہے (یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے یہ مفہوم کوئی ملتا اور مناسبت نہیں رکھتا)

إِنَّا كُنَّا لِكَرْبَى الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝

”ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہیں۔“
 لہ افہ کی ضمیر کا مریخ الیاں ہیں۔ ان مسعودی قرأت میں سلام علی ادریسین ہے، یعنی اور یس اور آپ کے پیروکاروں پر سلام ہو کیونکہ ان مسعود نے بھی ان ادریسین یعنی المؤمن المؤمنین پڑھا ہے۔

وَإِن لُّوْكَآ لَيَمُنُّ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَآهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا مِّنَ الْعَجُوزِينَ ۝

”اور بیشک لو ط بھی پیغمبروں میں ہیں (یا درو) جب پچالیا ہم نے انہیں اور ان کے سارے اہل خانہ کو بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی۔“

لہ یعنی جب لو ط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا تو ہم نے ان کی بیوی کے سوا سب گھروالوں کو اس عذاب سے پچالیا اور ان کی بیوی عذاب میں باقی رہنے والوں میں رہی۔

ثُمَّ دَمَرْنَا الْآخَرِينَ ۝

”پھر ہم نے ہر یاد کرد یا دوسرے لوگوں کو۔“

لہ دَمَرْنَا کا معنی اہلکنا ہے، یعنی ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَإِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ عَلَيْهِمْ مُّصِيبًا ۝ وَيَأْتِيْلُ ۝ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

”اور تم گذرتے رہتے ہو ان (کے اجرے و یاروں) پر صبح کے وقت اور رات کے وقت لہ کیا تم (انتا بھی) نہیں سمجھتے۔“

لہ ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی اے مشرکین مکہ جب تم شام کی طرف سفر کرتے ہو تو سدوم کی ہستی تمہارے رات میں آتی ہے تم ان کے تباہ شدہ مکانوں کو کھنڈرات سے صبح و شام گذرتے ہو۔ یا یہ معنی کہ دن اور رات کے وقت ان اجزی بیستیوں سے گذرتے ہو۔ شاید سدوم کی ہستی مسافروں کی قیام گاہ کے قریب واقع ہو اور مسافر اپنی قیام گاہ سے کوچ کرتا ہو تو صبح ہی اس ہستی سے گذرتا ہو اور جو

مسافر قیام گاہ کا ارادہ رکھتا ہو وہ شام کے وقت اس ہستی سے گزرتا ہو۔ یہ اس صورت میں ہے اگر سفر دن کے وقت ہو اور اگر سفر رات کے وقت کا ہو تو معاملہ الٹ ہوگا۔

لے اَقْلَابًا تَعْلِقُونَ یعنی کیا تم صاحب عقل نہیں کہ تم ان ہستیوں سے عبرت حاصل کرو۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَاِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۰۱﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلِّ الْكَاسِيَةِ ﴿۱۰۲﴾

”اور یے نیک یونس بھی (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں جب وہ بھاگ کر گئے تھے بھری ہوئی کشتی کی طرف (سوار ہونے کے لئے) لے۔“

لے اَبَقَ کا معنی اصل میں آقا سے غلام کا بھاگ جانا ہے لیکن حضرت یونس علیہ السلام اپنے رب کی اجازت کے بغیر بھاگ گئے تھے اس لئے یہاں بھی اس کا اطلاق درست ہے۔

عبدالرزاق اور احمد نے ازجد میں عبد بن حمید اور ابن المنذر نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کو عذاب کی وعید سنائی اور پھر عذاب میں تاخیر ہو گئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ آپ سوار ہوئے تو کشتی رک گئی۔ ملاح کہنے لگے اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ یونس کے نام کا نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں، آپ نے پانی میں پھلانگ لگا دی۔ علامہ بخاری نے ابن عباس اور وہب کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی تھی اور ہر بار آپ کا نام نکلا تھا (۱)۔ علامہ بخاری لکھتے ہیں روایت ہے کہ جب آپ سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی بھی تھی اور آپ کے دو بیٹے بھی تھے۔ کشتی آئی تو آپ نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سوار ہونے کا ارادہ کیا لیکن جب آپ نے بیوی کو سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا یا تو کشتی اور اس کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی (جواسے بہا کر لے گئی) پھر ایک موج آئی جو ان کے بڑے بیٹے کو نکل گئی پھر ایک بھیڑیا آیا جو آپ کے چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر لے گیا۔ آپ تمہارے گئے پھر ایک دوسری کشتی آئی آپ اس پر سوار ہوئے اور آپ لوگوں سے جدا ایک کونڈ میں بیٹھ گئے۔ جب کشتی سمندر میں پہنچی تو ڈرک گئی۔ لوگوں نے قرعہ اندازی کی (۲) ہم نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورہ یونس میں ذکر کر دیا ہے۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿۱۰۳﴾

”پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے اور پھیلے ہوؤں میں سے ہو گئے لے۔“

لے سَاهَمَ المساهمہ سے مشتق ہے جس کا معنی قرعہ اندازی کے لئے تیر ڈالنا ہے کان بمعنی صار ہے یعنی آپ قرعہ کی وجہ سے مخلوق بین میں سے ہو گئے۔ دحض کا اصل معنی کامیابی کے مقام سے پھسلنا ہے لیکن یہاں مظلوم ہونا ہے۔

فَاتَّقِبَةَ السُّوحُوتِ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾

”پس نکل یا نہیں حوت نے دریاں حالانکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے لے۔“

لے التَّقِبَ کا معنی تقہ بنانا ہے۔ وَهُوَ مُلِيمٌ کا معنی یا تو یہ ہے کہ آپ ملامت میں داخل ہونے والے تھے (یعنی اس وقت ہوگا جب

(الآم) کا انزہ اس ہمزہ کی طرح ہو جو اصح اور آسانی میں ہوتا ہے (یا یہ معنی کہ آپ ایسا کام کرنے والے تھے جس پر امت کی جاتی ہے یا یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو امت کر رہے تھے۔ یہ بملہ (وَهُوَ مُلَيَّمٌ) النقمہ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

قَوْلًا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَجِّينَ ﴿٥٧﴾ لَكَيْتَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٥٨﴾

”پس اگر وہ اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں سے نہ ہوتے۔ تو پڑے رہتے مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک۔“

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں الْمُسَجِّينَ کا معنی المصلین ہے۔ یعنی اگر وہ نماز پڑھنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ حضرت وہب نے اس کا معنی العابدین کیا ہے، یعنی اگر وہ عبادت کرنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ الحسن فرماتے ہیں مچھلی کے پیٹ میں آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن اس سے پہلے کوئی نیک عمل کیا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی سابقہ عبادت کی قدر دانی فرمائی (۱) میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ آپ نے مچھلی کے پیٹ میں اشارہ سے نماز پڑھی ہو کیونکہ وہاں آپ زندہ تھے اور باوش تھے اور بہتر یہ قول ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں لا الہ الا انت سبحانک کے کلمات کے ساتھ تسبیح نہ فرماتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے جیسا کہ قرآن کی واضح نص موجود ہے۔

۲۔ یعنی مچھلی کے پیٹ میں مر جاتے اور وہی مچھلی ان کے لئے قبر ہوتی اور مچھلی کے اجزاء کے ساتھ ملے رہتے جیسے اللہ تعالیٰ کو علم تھا اور قیامت تک اسی کیفیت میں رہتے۔

فَتَبَيَّنَ لَهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَاقِيمٌ ﴿٥٩﴾

”پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے۔“

۱۔ یعنی ہم نے مچھلی کو ان کے نگل جانے کا حکم دیا۔ العراء ایسا مکان جو درختوں اور جھاڑیوں سے خالی ہو۔ وَهُوَ سَاقِيمٌ یعنی ایسے چوزے کی مانند تھے جس کے اوپر بال نہ ہوں۔ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ آپ کا گوشت بوسیدہ ہو گیا تھا اور بڑیاں نرم ہو گئی تھیں اور آپ کے اعضاء میں کوئی قوت و طاقت نہ تھی۔ علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کتنی مدت مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے۔ علامہ بنوئی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے تین دن کی مدت لکھی ہے (۲) اسی طرح ابن المنذر، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بنوئی فرماتے ہیں عطاء نے سات دن بیان فرمائے ہیں (۳) اسی طرح ابن المنذر، راور، ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے۔ علامہ بنوئی نے ضحاک کا قول میں دن نقل فرمایا ہے۔ سعدی بکلی اور مقاتل بن سلیمان نے چالیس دن لکھے ہیں (۴) ابن عباس سے حاکم نے اور ابن ابی شیبہ امام احمد (فی الزہد) عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، راور، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابو مالک سے عبد المرزاق ابن مردودہ نے ابن جریج سے عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عمر کے نام سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ عبد بن حمید نے زوائد المرشد میں دن کا کچھ حصہ بیان کیا ہے۔ ابن ابی حاتم، حاکم اور بنوئی نے بعضی سے نقل کیا ہے کہ مچھلی نے چاشت کے وقت آپ کو نگلا اور شام کے وقت اگل دیا تھا۔ (۵)۔

وَأَنْبَأْنَا عَلَيْهِمْ سَجْرًا مِّنْ يَّتَطَيَّنُ ﴿٦٠﴾

”اور (ان کی حفاظت کے لئے) ہم نے اگادی ان پر کدو کی بیل۔“

3- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (الفرق)

2- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (الفرق)

1- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (الفرق)

5- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (الفرق)

4- تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (الفرق)

۱۔ علامہ بنوئی لکھتے ہیں حسن اور مقاتل فرماتے ہیں انکی بوٹی جس کا تانہ ہو اور زمین پر پھیلتی اور کھلتی ہو اور سردیوں میں باقی نہ رہتی ہو جیسے کدو کلمزئی اور تربوز کی تیل اس کو بظن کہتے ہیں (۱) علامہ بنوئی فرماتے ہیں خلاف عادت اس تیل کا تانہ بھی تھا۔ بظن قطن بارکان سے شتن ہے جس کا معنی کسی جگہ ٹھہرنا ہے اور اس کا وزن بظن ہے۔ میں کہتا ہوں وہ کدو کی تیل تھی جس نے آپ کو اپنے پتوں کے ذریعے بکھیوں کے کانٹے سے محفوظ کر لیا تھا۔ ان پتوں کی وجہ سے وہ آپ کے جسم پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ علامہ بنوئی فرماتے ہیں یہ تمام مشرین کا قول ہے۔ اسی طرح عبد بن حمید اور ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ مقاتل بن حبان فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام ایک درخت (تیل) کے سایہ میں رہتے تھے اور ایک پہاڑی بکری آپ کے پاس آتی تھی جس کا صبح و شام آپ دودھ پیتے تھے حتیٰ کہ آپ کا گوشت مشبوہ ہو گیا۔ بال آگ آئے اور اعضاء میں قوت آ گئی پھر آپ سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو درخت (تیل) خشک ہو چکا تھا جب آپ کو عجب گئی تو آپ بے ہوش ہوئے اور رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا اور فرمایا تم ایک درخت کے سوکھ جانے پر فتنیں ہو اور اپنی امت کے ایک لاکھ افراد پر غم نہیں کرتے جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور تائب ہو چکے ہیں (۲)۔

مسئلہ: انبیاء کرام کی لغزشوں کو نہ کرنا چاہئے کیونکہ ان کی لغزش رجوع الی اللہ اور ان کے مراتب کی بلندی کا باعث ہوتی ہے۔ جس نے کسی نبی کی گستاخی کی وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شمارا ہے لا تُفَرِّقُوا بَيْنَ اَنْصَارِ يَسْرَسَلِمِهٖ (ترجمہ) (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے یہ کہنا مناسبت نہیں کہ میں یونس بن حتی سے بہتر ہوں (بخاری و مسلم (۳)۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن حتی سے افضل ہوں اس نے جھوٹ بولا (۴)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک مسلمان اور یہودی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، مسلمان نے کہا تم ہے اس کی جس نے جو حملی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے یہودی نے کہا تم ہے اس کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے۔ یہودی نے جب یہ کہا تو مسلمان نے ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ یہودی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس کے اور مسلمان کے درمیان معاملہ تھا وہ عرض کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو بلایا اور واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ مسلمان نے واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ کیا قیامت کے روز لوگ بے ہوش ہوں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام عرش کی ایک طرف کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور معلوم نہیں وہ بھی ان لوگوں سے ہوں گے جو بے ہوش تھے اور پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا ان لوگوں میں سے تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے بے ہوش ہونے والوں سے استثناء فرمائی ہے (۵) ایک روایت میں ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں طور کے دن کی بے ہوشی اس دن کی بے ہوشی کے عوض کر دی گئی ہے یا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے ہیں اور میں نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن حتی سے افضل ہے۔ ابو سعید کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو۔ بخاری و مسلم (۶) حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ہے فرمایا اللہ کے نبیوں کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو (۷)۔

- | | | |
|---------------------------------------|---------------------------------------|-------------------------------------|
| 1 تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (انظر) | 2 تفسیر بنوئی، جلد 4، صفحہ 581 (انظر) | 3 صحیح بخاری، حدیث: 3234 (ابن کثیر) |
| 4 صحیح بخاری، حدیث: 4328 (ابن کثیر) | 5 صحیح بخاری، حدیث: 2280 (ابن کثیر) | 6 صحیح بخاری، حدیث: 2281 (ابن کثیر) |
| 7 صحیح بخاری، حدیث: 3233 (ابن کثیر) | | |

اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت نہ کرنے کا ارشاد فرمایا ہے اس کا مفہوم کیا ہے، جب کہ آیت قرآنی اور اجماع سے انبیاء کرام کی فضیلت ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تِلْكَ الْاٰسْمَاءُ الَّتِي فَطَرَ اللّٰهُ لِنَبِيِّهِمْ عَلٰى نَفْسِهِ (یہ رسول کی جماعت ہے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَنَا سَيِّدٌ وَّلَدَ اٰدَمَ يَوْمَ الْاَلْقَابَةِ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشْفَعٍ (میں اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی) (1) اس حدیث کو امام مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا سَيِّدٌ وَّلَدَ اٰدَمَ يَوْمَ الْاَلْقَابَةِ وَلَا فَخْرٌ وَلَا فَعْوَجٌ وَ مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اَدَمَ فَصْنٌ سِوَاہِ الْاَنْحٰثِ لِي وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرٌ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشْفَعٍ وَلَا فَخْرٌ (2) (میں قیامت کے روز اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں بطور فخر نہیں کہہ رہا بلکہ اظہار حقیقت کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس دن ہر نبی یعنی آدم اور ان کے علاوہ سب انبیاء میرے جہنم کے کے پیچھے ہوں گے اور سب سے پہلے میری قبر کھلی گی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور میں خاتم النبیین ہوں اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی اور میں یہ فخر یہ نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو داری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے (3)۔

(سوال کا حاصل یہ ہے کہ جب فضیلت دینے اور فضیلت نہ دینے دونوں قسم کی روایات موجود ہیں تو تطبیق کیسے ہوگی)

مصنف فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ظن و تخمین کے ساتھ انبیاء کے درمیان فضیلت کا موازنہ نہ کرنا جب تک کہ وہی الہی کے ذریعے کسی کی فضیلت ظاہر نہ ہو جائے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کی دوسروں پر فضیلت بیان ہو تو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ نفس نبوت میں انبیاء کے درمیان فضیلت بیان نہ کرو، یعنی بعض پر تو تم ایمان لاؤ، ان کی تعظیم و توقیر بھی کرو اور بعض پر ایمان نہ لاؤ۔ اللہ اعلم

وَأَسْأَلُكَ اِلٰى مَا لَيْفَ اَوْ يَزِيدُونَ ﴿٦﴾

”اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف ل“

1۔ علامہ ربوئی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو اس نصیحت میں جہتا ہونے سے پہلے موصول کے علاقہ نینوا میں مبعوث کیا گیا تھا (4) عبد بن حمید ابن اسعد راوی ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے اور حسن سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے بھجلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد دوبارہ ہم نے اسے ان لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف پہلے بھیجا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں دوبارہ جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے وہ پہلی قوم سے مختلف تھی۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں او بمعنی بل ہے (5) ابن عباس فرماتے ہیں او بمعنی واو ہے۔ جیسا کہ عذر اور نذر میں او بمعنی واو ہے۔ زجاج کہتا ہے او یہاں اپنی اصل پر

1- صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 30، حدیث: 3 (دارالحدیث)
2- جامع ترمذی، حدیث: 3148 (دارالحدیث)
3- سنن دارمی، جلد 1، صفحہ 31، حدیث: 50 (الحامی)
4- تفسیر ربوئی، جلد 4، صفحہ 582 (المنکر)
5- تفسیر ربوئی، جلد 5، صفحہ 582 (المنکر)

ہے۔ یعنی تمہارے اندازے اور گمان پر یا لاکھ سے زائد تھے جیسے کوئی شخص کسی افراد کے جتھہ کو دیکھتا ہے اور کہتا یہ ہزار یا اس سے زائد ہیں پس یہاں تک مخلوق کے اعتبار سے ہے (1) (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تعداد میں کوئی شک نہیں) یہ زائد تعداد کتنی تھی؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں وہ بیس ہزار تھے (2) ترمذی نے ابی بن کعب سے یہی روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ زائد بیس ہزار تھے (3) حسن فرماتے ہیں تین ہزار سے کچھ زائد تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ ستر ہزار تھے (4)۔

فَأَمَّا أُمَّةٌ مِّنْهُمْ إِلَىٰ حَبِيبٍ ﴿٥٥﴾

”پس وہ ایمان لائے اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں کچھ وقت تک لے۔“

۱۔ یعنی جن لوگوں کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا وہ عذاب کو دیکھنے کے بعد یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ عین سے مراد متعین مدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کو سلام کے ساتھ ختم نہیں فرمایا جیسا کہ باقی انبیاء کرام کے واقعات کو سلام کے ساتھ ختم فرمایا (مثلاً فرمایا سلام علی ابو اہم سلام علی موسیٰ و ہارون سلام علی یاسین) شاید اس کی وجہ اسباب شرائع اور اولوالعزم رسولوں اور ان کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے سابقہ اسلوب اختیار نہیں فرمایا یا سورت کے آخر میں چونکہ سب رسولوں پر سلام فرمایا ہے اس لئے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کے لئے علیحدہ سلام کا ذکر نہیں فرمایا۔

فَأَسْتَفْتِيَهُمْ لَرِيْبِكَ الْبَيِّنَاتُ وَهُمْ الْمُنُورُونَ ﴿٥٦﴾

”ذرا پوچھئے ان (نادانوں) سے کیا آپ کے رب کے لئے تو بیئیاں ہیں اور ان کے لئے بیئے لے۔“

۱۔ اس کلام کا عطف فاستفتيہم اھم اشد خلقاً اور فرفن خلقاً پر ہے۔ سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا کہ ان منکرین قیامت سے جدا نکار دیانت کریں کہ کیا ان کی تخلیق مشکل ہے یا ان کے علاوہ زمین و آسمان اور ملائکہ کی تخلیق مشکل ہے۔ یا جو ان سے پہلے قومیں گذر چکی ہیں ان کی تخلیق مشکل تھی پھر جب وہ زبان سے یہ حال سے اقرار کر دیں کہ پہلے لوگوں کی تخلیق مشکل تھی تو پھر انہیں اس ذات سے ڈرانا جس نے ان طاقتور اور توانا لوگوں سے ان کی ذمہ داری کا انتظام لیا اور ان کو ان کے کفر کی وجہ سے جس جس کر دیا۔ جب وہ ذات ان سے طاقتور لوگوں پر قادر ہے اور ہر مخلوق پر وہ قادر ہے اور وہ قیامت کے قائم کرنے پر بھی قادر ہے اور تم جیسے حقیر و ناتواں لوگوں کو عذاب کی بھیجی میں دھکیلنے پر بھی قادر ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے مناسب واقعات ذکر فرمائے۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرما رہے ہیں کہ انہوں نے جو کلمہ تمہیں تعظیم بنا رکھی ہے اس کی ان سے وجہ دریافت کریں یہ کہتے ہیں اللہ کے لئے بیئیاں ہیں اور ان کے لئے بیئے ہیں۔ مشرکوں میں سے بعض کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیئیاں ہیں ان کے اس شرک پر کسی اور گمراہیاں بھی پائی جاتی تھیں مثلاً وہ اللہ کے لئے جم ثابت کرتے تھے اور اللہ کے لئے بیئیاں جائز قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ولادت اجسام کا خاصہ ہے جو تعویذ و تبدیل کو قبول کرتے ہیں (یعنی جب اللہ کے لئے بیئیاں مانتے ہیں تو گویا خدا کا

2۔ تفسیر ہادی، جلد 4، صفحہ 582 (القر)

4۔ تفسیر ہادی، جلد 4، صفحہ 528 (القر)

1۔ تفسیر ہادی، جلد 4، صفحہ 582 (القر)

3۔ جامع ترمذی، ص 3229 (دارالحدیث)

جسم مانتے ہیں کیونکہ ولادت (پیدا کرنا اور پیدا ہونا) اجسام کا خاصہ ہے) دوسری گمراہی یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنے آپ کو فضیلت دیتے تھے کیونکہ اللہ کے لئے کمزور ترین صنف اور اپنے لئے بہتر اور قوی صنف کا عقیدہ رکھتے تھے۔ تیسری گمراہی یہ کہ فرشتوں کی توہین کرتے تھے کیونکہ انہیں انوح کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کے ابطال اور انکار کو قرآن حکیم میں کئی مرتبہ ذکر فرمایا ہے اور ان کی اس بات کو اتنا قبیح فرمایا ہے کہ اس کی محسوس سے آسمان پھٹنا چاہتے ہیں، زمین پھٹتی ہے اور پہاڑ گرتے ہیں۔ یہاں انکار صرف آخری دو باتوں پر ہے کیونکہ ان میں سے ایک گروہ ان دو بد عقیدہ گروں میں ملوث تھا جہیہ اور بنی سلمہ بن عبد الدار قبائل یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری ان دونوں باتوں (اللہ کے لئے بیٹیاں ہونا اور ملائکہ کا مومنٹ ہونا) کے نفاذ کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں عقیدوں کا نفاذ ایسا ہے کہ عام لوگ اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے بھی جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود ان سے سوال کرنے کے متعلق فرمایا (یعنی تمہارے گھرا کر بچی پیدا ہو جائے تو لوگوں سے منہ چھپانے پھرتے ہو، جب کہ اس خالق کے لئے تم اولاد ثابت کرتے ہو اور وہ بھی لڑکیاں جو صنف انسانی میں کمزور اور عاجز صنف ہے تمہاری اس بے انصاف ذہنیت اور برصافت سوچ پر تکیہ ہے۔ تم خود ہی بتاؤ اس تفسیر کی دلیل کیا ہے؟)

أَمْ حَقْلْنَا السُّلْبَ كَمَا إِنَّا لَأَكْوَهِمُ شُهَدُونَ ﴿۵۷﴾

”آیا جب ہم نے فرشتوں کو مومنٹ بنایا تو کیا وہ موجود تھے؟“

۱۔ اس ارشاد میں ان سے استہزاء ہے اور یہ تصور ہے کہ وہ لوگ انتہائی جاہل تھے کہ وہ اسی بے گنی باتیں کرتے تھے اور ایسے من گھڑت فیصلے کرتے تھے گویا وہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت موجود تھے۔

إِلَّا أَنَّهُمْ مِنَ الْفٰكِهِمْ لِيَقُولُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

”نور سے سنو وہ جھوٹی تہمت لگاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بچے بنے اور وہ بلاشبہ جھوٹ کہتے ہیں۔“

۱۔ الفک ایسے جھوٹ کو کہتے ہیں جس کا ابطال ظاہر ہو اور دلیل جس کے سراسر مٹائی ہو۔
۲۔ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ یعنی یہ تمام عقلمندوں کے نزدیک یقیناً جھوٹے ہیں۔

أَصْطَفٰى الْبَنٰتَ عَلٰى الْبَنِيْنَ ﴿۶۰﴾

”کیا اس نے پسند کی ہیں (اپنے لئے) بیٹیاں بیٹوں کو چھوڑ کر؟“

۱۔ اصطفیٰ کا ابو جعفر نے ہمزہ مکسورہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے اور در میان کلام میں وہ اس کو ساکتہ کرتے ہیں اور نافع سے بھی یہی روایت ہے اور اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ہمزہ استنبہام لفظاً حذف ہے یا قالوا کی تقدیر کے ساتھ یہ خبر ہے۔ یعنی یہ جھوٹ کہتے ہیں جب یہ کہتے ہیں کہ اس نے بیٹیوں کو پسند فرمایا ہے۔ عام قرآن نے ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے جو ہمزہ وصل پر داخل ہے اور یہ استنبہام انکار کے لئے ہے یا بغافل لہم اصطفیٰ البنات علی البنین کی تقدیر پر استبعاد کے لئے ہے (یعنی ان سے پوچھا جائے گا کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی ہے)

صَالٰكُمۡ كَيْفَ حٰكِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

”تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو؟“

لے یہ تم سے نیٹا کر رہے ہو کہ اللہ کے لئے بنیاں ہیں اور تمہارے لئے بنیے ہیں۔ الاصطفاء کا معنی ہے اچھی چیز چننا، جب کہ لڑکیاں ٹھیکیا صنف ہے۔

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۳۰﴾

”کیا تم غور و فکر نہیں کیا کرتے؟“

۱۔ فلو محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے الا تنفکرون فلا تذکرون، یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ تذکرون اصل میں تذکرون تھا۔ ایک ناء کو حذف کیا گیا ہے۔

أَمَرَ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۳۱﴾

”کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟“

۱۔ یعنی تمہارے پاس کوئی ایسا واضح دلیل ہے جو مانگہ کے بنیاں ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہو، یعنی اسباب علم میں تین (1) عقل (2) حس (3) خبر حسادق۔ اور خبر علم کا فائدہ نہیں دیتی جب تک اس کا مدار حس پر نہ ہو یا وہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع پر مبنی نہ ہو۔ دلالت عقل کا انکار تو آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَلَيْسَ لَكَ الْبَنَاتُ وَكَانَ مِنَ الْبَنَاتِ ﴿۳۰﴾ چونکہ اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ہونے پر دلیل قائم ہے اور اس کے علاوہ مانگہ کے مومن ہونے کا اور ک عقل سے ممکن ہی نہیں اور کسی عقل مند کے لئے یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ خالق کے لئے تو ٹھیکیا چیز ثابت کرے اور مخلوق کے لئے اعلیٰ و اشرف کو تسلیم کرے۔

حس کی دلالت کا انکار آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَمَرَ حَقًّا اَلَيْسَ لَكَ الْبَنَاتُ اِنَّا لَنَّا وَهٰذَا شَهْدُؤُنَا ﴿۳۱﴾ یعنی ان کی بات کے مفید للعلم ہونے کے لئے دوسری چیز جس سے کہ انہوں نے فرشتوں کی پیدائش کو آنکھوں سے دیکھا ہو کہ انہیں مومن پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ اس وقت تو موجود ہی نہ تھے۔ تیسرا سبب علم کا خبر صادق ہے۔ اس کی نفی اس ارشاد سے فرمادی اَمَرَ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۳۱﴾ یعنی تمہاری بات کی صداقت کے لئے کوئی جنت ہے جو علم و خبر ذات کی طرف سے نازل ہونی ہو کیونکہ جس بات کی تائید اللہ تعالیٰ کی کوئی نازل کردہ جنت سے ہو وہ تمام باتوں سے زیادہ علم کا فائدہ دیتی ہے تمہارے پاس وہ بھی نہیں ہے لیکن جب ممکن تھا کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ دلیل اور جنت عطا کی ہے جیسا کہ وہ اپنی طرف کہہ دیتے ہیں مثلاً دوسری آیت میں اِنَّا لَنَعْلَمُوْا اَقْبَابَهُمْ اِنَّا لَنَعْلَمُوْا اَقْبَابَهُمْ اِنَّا لَنَعْلَمُوْا اَقْبَابَهُمْ عَالِمِيْنَ اَلَيْسَ لَكَ الْبَنَاتُ اِنَّ لَكَ الْبَنَاتُ وَكَانَ مِنَ الْبَنَاتِ ﴿۳۰﴾ (ترجمہ) اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں پاپا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔

فَاتُّوْا اِيْكُمْ لَكُمْ اِنْ لَنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

”تو اپنی وہ دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو۔“

۱۔ یعنی تم وہ کتاب پیش کرو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور جس میں یہ لکھا ہو کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بنیاں ہیں اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو۔

وَجَعَلُوْا اٰيٰتِيْهِمْ وَاٰيٰتِيْهِمْ اَلْحٰجَّةَ تَسْبِيًْٓٔا ۗ وَ لَقَدْ عَلِمْتِ الْاِحْسٰٓةَ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۳۳﴾

”اور تمہارا دیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ حالانکہ جن خود جانتے ہیں کہ انہیں (بچہ کر) پیش کیا

جائے گا۔“

یہ جملہ قد کی تقدیر کے ساتھ استفتہم کی منسوب ضمیر سے حال ہے۔ جو میر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ قریش کے قبائل سلیم جبہہ اور خزاعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی (1) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں الجنتہ سے مراد فرشتے ہیں۔ ان کو جنت اس لئے کہا کیونکہ یہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں (2) (جن کا معنی پوشیدہ ہونا ہے) میں کہتا ہوں فرشتوں کو جز کے نام سے تعبیر کیا تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہونے کے مرتبہ کے حامل نہیں ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ملائکہ کا ایک گروہ ہے جسے جن کہا جاتا ہے اور ان میں سے ایشیں ہے۔ عرب کے مذکورہ قبائل ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ کبھی فرماتے ہیں وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے ایک جنی سے نکاح کر لیا ہے اور اس سے فرشتے پیدا ہوئے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ بعض قریش نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت ابوبکر الصدیق نے فرمایا پھر ان کی مائیں کون ہیں؟ کہنے لگے جنوں کی سردار عورس (3) اسی طرح لیتھی نے شعب الایمان میں مجاہد سے نقل کیا ہے۔

وَأَنَّ عِلْمَ الْيَوْمِ الْقَائِمِ كَأَجْمَلِ مَحْضَرٍ هَبْ۔ انہم میں ضمیر کا مرجع یا تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنے والے لوگ ہیں یا مطلقاً انسان مراد ہیں یا جن مراد ہیں اور فرشتوں کو بھی شامل ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُصِفُوْنَ ﴿۵۷﴾

”پاک ہے اللہ تعالیٰ ان (تفویات) سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔“

یعنی اللہ تعالیٰ سب سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اور جملہ محترضہ ہے۔

إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُحَاصِنِينَ ﴿۵۸﴾

”مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے (ایسی ہرزہ سراہی نہیں کرتے)۔“

اگر انہم کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنے والے لوگ ہیں تو یہ اس سے مستثنیٰ منقطع ہے۔

فَأَنْتُمْ وَمَنْعَبِدُونَ ﴿۵۹﴾ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَعْتِينَ ﴿۶۰﴾ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيمِ ﴿۶۱﴾

”پس تم اور جن (جھوٹے خداؤں) کی پوجا کرتے ہو تم (سب ملکر) اللہ کے خلاف (کسی کو) نہیں ہو سکتے مگر اسے تاپنے والا ہے بھڑکتی آگ کو۔“

یہ ما سے مراد بت ہیں۔ علیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ فاعتین مگر اہ کرنے والے ہیں، یعنی تم اور تمہارے یہ باطل معبود خواہ کتنی ہی تک دو کریں کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے لیکن ان بد بختوں کو تم گمراہ کرو گے جن کا جنہی ہونا علم الہی میں پہلے ہی متعین ہے۔

وَمَا مِمَّنَّا إِلَّا أَلْهَاءٌ مِّمَّا مَعْلُومٌ ﴿۶۲﴾

”اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے۔“

یہ جملہ بتقدیر قول ولقد علمت الجنة پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قَالَتْ مَا مِمَّنَّا إِلَّا أَلْهَاءٌ مِّمَّا مَعْلُومٌ یہ فرشتوں کا قول ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا مرتبہ عبودیت میں متعین ہے یا آمالوں میں اللہ کی عبادت کرنے کے لئے جگہ متعین ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمان چرچرایا اور چرچرانا اس کا حق ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آسمان میں چار انگلیوں کے برابر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ اس حدیث کو بخونی نے روایت کیا ہے (1) یا مقام معلوم سے مراد مراتب قرب میں متعین مقام ہے جس سے کوئی فرشتہ تہجد نہیں کرتا سجدی فرماتے ہیں قرب اور مشاہدہ میں مقام متعین ہے۔ ابو بکر الوراق فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرشتہ کیلئے متعین مقام ہے جس پر رہ کر وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے جیسے خوف رجا، محبت اور رضا وغیرہ (2) میں کہتا ہوں فرشتوں کا مقام متعین ہے لیکن حضرت انسان قرب کی منازل کو تار تار طے کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (3) ملائکہ اپنے مقامات سے تہجد نہیں کرتے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے فرمایا اے جبرئیل تو نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے۔ جبرئیل نے یہ جملہ سن کر جبرجہری کی اطلاع دی اور عرض کی یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نور کے سرحجابات ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کے بھی قریب جاؤں تو میں جل جاؤں۔ مصابیح میں ذرا دہ بن اونی سے یہ حدیث اسی طرح روایت ہے (4) اسی حدیث کو ابو نعیم نے علیہ میں حضرت انس سے روایت کیا ہے لیکن اس میں جبرئیل کے جبرجہری لینے کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسرائیل کو جس دن سے پیدا فرمایا ہے وہ پاؤں ملا کر کھڑا ہے، اپنی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ستر نور ہیں اگر وہ ان نوروں میں سے کسی کے قریب جائے تو جل جائے (5) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے یہ آیت کریمہ ملائکہ کی عبادت کرنے والوں کی تردید کر رہی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے لَقَدْ نَفَخْنَا الذِّبْنَ قَالَتْ اِنَّ اللّٰهَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ وَقَالَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ اِنَّ سِرَّ اَعْيُنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبَّيْ وَرَبِّكُمْ اِنَّهٗ مِنْ يُّسُوفِ كَمَا بَالِهَةٌ فَقَدْ خُذَ عَالِدٌ عَلَيْهِ الْجَنَّةُ وَمَا لِهٖ اِلَّا الشُّرْ (ترجمہ) بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ بخ جس مریم ہی تو ہے حالانکہ کہا تھا خود مسیح نے اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے یقیناً جو بھی شریک بنائے گا اللہ کے ساتھ تو حرام کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔

وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ ﴿۶﴾

”اور ہم پرے ہاں سے (مقام نیاز میں) کھڑے ہیں۔“

۱۔ ابن ابی حاتم نے یزید بن مالک سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں لوگ متفرق اور منتشر ہو کر نماز پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو صفیں باندھنے کا حکم دیا (6) ابن کثیر نے ابن جریج سے اسی طرح روایت نقل کی ہے بلکہی فرماتے ہیں ملائکہ آسمان میں عبادت کے لئے اس طرح صفیں باندھتے ہیں جس طرح لوگ زمین میں (نماز کے لئے) صفیں باندھتے ہیں (7) امام مسلم نے جابر بن سمرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور صفیں باندھتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ فرشتے

3- صحیح بخاری حدیث: 6137 (ابن کثیر)

2- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 584 (القر)

1- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 584 (القر)

5- مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: 5731 (القر)

4- مصابیح السنۃ، حدیث: 2388 (العلمی)

7- تفسیر بخاری، جلد 4، صفحہ 584 (القر)

6- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 550 (العلمی)

اپنے رب کے حضور کس طرح صفیں باندھتے ہیں؟ فرمایا وہ پہلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صرف میں زیادہ فاصلہ نہیں رکھتے ہیں (۱) آیت کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کی ادائیگی میں قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

وَأَنَّكَ خَلْقُ الْمَسِيحُونَ ﴿۳۱﴾

”اور بیشک ہم اس کی پاکی بیان کرنے والے ہیں۔“

یعنی اس کی پاکی بیان کرتے ہیں ہر اس چیز سے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ مثلاً بیٹا بنا نا وغیرہ۔ پہلے انی طرف تاکید کر فرمایا پھر لام تاکید کر فرمایا پھر درمیان میں فعل ذکر فرمایا یہ تمام چیزیں تاکید اور اختصاص پر دلالت کرتی ہیں اور اس تاکید بالائے تاکید سے مقصود ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور یہ کفار کی نسبت سے حصر اضافی ہے، یعنی ہم کفار کی طرح تسبیح اور عبادت میں شریک کرنے والے اور ہم کفار کی طرح تسبیح و تہلیل کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔

وَأَنَّ كَلِمَ الْيَقُولُونَ ﴿۳۲﴾ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۳﴾ لَنَكْنَعُ عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿۳۴﴾

”اور وہ (بعث نبوی سے پہلے) کہا کرتے تھے اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے تو ہم اللہ کے مخلص بندے بن جاتے۔“

یعنی شریکین مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بڑے بڑے چوڑے دعوے کرتے کہ اگر پہلے لوگوں پر جو کتب نازل ہوئیں ان میں سے کوئی کتاب ان کی طرف سے ہمیں پہنچی تو ہم خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس کے حکام کی مخالفت نہ کرتے اور ان کا نوازش ان مخفف من مشغلہ ہے۔ اور لام فارقہ ہے، یعنی ان تافیر و مخفف میں فرق کرنے کے لئے ہے اور ان دونوں کے ذکر میں اشارہ ہے کہ وہ یہ بات تاکید کے ساتھ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے پہلے اور آخری امر کوتا کید کے ساتھ ذکر فرمایا۔

فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾

”پس (جب نصیحت آئی) تو اسے ماننے سے انکار کر دیا وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے۔“

یعنی یہ کہ تمہیں کفر مرجع ذکر ہے اور سرفہا سید ہے۔ کیونکہ کفر و عید کا سبب ہے، یعنی جب اشرف ترین کتاب ان کے پاس پہنچی تو اس کا انکار کر دیا پس عنقریب اپنے کفر کا انجام جان لیں گے اور اس کفر کی وجہ سے انتقام کا کوڑا ان پر بر سے گا تو ان کو کفر کی برائی پر آگاہی ہو جائے گی۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۶﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿۳۷﴾ وَإِنَّ

جُنْدَنَا لَهُمُ الْعَالِمُونَ ﴿۳۸﴾

”اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرورت مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر تائے۔“

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْمُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾ وَإِنْ جُدُنَا أَطْعَمُوا الْغُلَامَ مِنْ كَلِمَتِنَا كَابِيَانٍ هِيَ - اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا، یعنی ہمارا وعدہ ہے کہ ہمارے لشکر ہی کا مایاہ و کامران ہوں گے (یہ ہمارا قانون عام ہے) میں کہتا ہوں اگر کبھی مسلمانوں کے لشکروں کو بزیرت اور کسرت کا سامنا ہوتا ہے تو یہ انسان کے گناہوں کی نحوست کا نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَإِنَّمَا اسْتَوَىٰ لَهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ﴿١٠١﴾ (تو پھسلادیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے) ایک اور مقام پر فرمایا إِذْ أَخْبَجْتُمْ كَلِمَتَكُمْ فَنَامَ سُحُبُكُمْ غَلَامًا وَخَافَتْ عَلَيْهِمُ الْأَمْطَارُ بِمَا اسْتَحْتَسَبْتُمْ وَلَيْسَتْ لَكُمُ الْمَدِينُ ﴿١٠٢﴾ (ترجمہ) جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کسرت نے پس نہ دیا تمہیں (اس کسرت نے) بھی اور جگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿١٠٣﴾

”پس آپ رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر لے۔“

ل ابن عباس فرماتے ہیں جین سے مراد موت ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد وہ دن ہے جس دن دنیا میں ان پر عذاب آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد بدر کا دن ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ علامہ بنوی لکھتے ہیں سدی نے فرمایا جس دن اللہ تعالیٰ جنگ کرنے کا حکم دے گا (۱) مقاتل کے قول نَسَخْنَاهَا آيَةَ الْقِتَالِ (قتال کی آیت نے اس آیت کو منسوخ کر دیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَأَبْصَرَهُمْ فَسَوَّفَ بَبْصَرٍ ﴿١٠٤﴾

”اور ملاحظہ فرماتے رہے ان کے (حالات) کو وہ (خود بھی) اپنا انجام دیکھ لیں گے لے۔“

ل یعنی آپ ان کو متتول مفلوب اور عذاب میں مبتلا دیکھئے۔ آیت کے اسلوب میں اشارہ ہے کہ یہ کام عنقریب ہونے والا ہے گویا وہ آپ کے سامنے ہے اور جو دنیا میں ہم نے آپ کے لئے تائید و نصرت یا آخرت میں ثواب اور دنیا و آخرت میں ان کفار پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے وہ یقیناً یہی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ آیت میں سوف دودنی کو بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ وعید کے لئے ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب فَسَوَّفَ بَبْصَرٍ کا ارشاد ہوا تو مشرکین کہہ کئے گئے وہ عذاب کب آئے گا؟ جو میر نے ابن عباس سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

أَفْبَعْدَ آيَاتِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿١٠٥﴾

”کیا وہ ہمارے عذاب (کے اترنے) کے لئے جلدی چاہ رہے ہیں لے۔“

ل استہتام انکار اور توقع کے لئے ہے اور فاعل حذف کلام پر عطف کے لئے ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَيُّجْهِلُونَ فَشَانَنَا فَبَعْدَ آيَاتِنَا يَسْتَعْجِلُونَ یعنی کیا یہ ہماری شانِ علو سے ناواقف ہیں اور ہمارے عذاب کو اترنے کے لئے جلدی چاہ رہے ہیں۔

فَإِذَا أَنْزَلْ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذِرِينَ ﴿١٠٦﴾

”جس جب وہ اترے گا ان کے آنگن میں تو وہ صبح بڑی خوفناک ہوگی جنہیں ڈرایا جاتا تھا۔“

لے سُنَّالْ كَافِلِ عَذَابٍ ہے، یعنی جب عذاب ان کے صحن میں آئے گا۔ فرما کہتے ہیں عرب قوم کی جُدّ ساحہ کے لفظ پر اکتفا کرتے ہیں (۱) یا یہ معنی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے ساتھ کفار کے آنگن میں اتریں گے صبح کا لفظ عذاب کے نزول کے وقت کے لئے استعارۃ استعمال ہوا ہے۔ یہ صبح العیش المعبیت (صبح کے قریب حملہ کرنے والا لشکر) سے مستعار ہے عموماً حملہ اور عارت گری صبح سور سے کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے حملہ کو صبح کہتے ہیں اگرچہ وہ حملہ کسی دوسرے وقت بھی ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خبیر پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تو آپ اس قلعہ کے پاس رات کے وقت پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب کسی قوم کے پاس رات کے وقت پہنچتے تو اسی وقت حملہ نہ کرتے بلکہ صبح کا انتظار فرماتے حضرت انس فرماتے ہیں جب صبح ہوئی تو یہودی اپنے پھاڑے اور نوکرے لئے باہر نکلے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ کہنے لگے تم بخدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے ساتھ لشکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اکبر خبیر تباہ ہو گیا جب ہم صحن میں اترتے ہیں تو ان کی صبح بڑی خوفناک ہے جنہیں ڈرایا گیا تھا۔ اس حدیث کو علامہ بخاری نے روایت کیا ہے (۲) صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لے کر کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے جاتے تو صبح تک حملہ نہ فرماتے اور انتظار فرماتے اگر (اس ہفتی) سے اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ فرماتے اگر اذان کی آواز نہ سنتے تو صبح کے وقت ان پر حملہ کر دیتے۔ ہم خبیر کی طرف نکلے تو ہم خبیر کے پاس رات کے وقت پہنچے۔ جب صبح ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی آواز نہ سنی تو آپ سوار ہوئے اور میں ابو طلحہ کے پیچھے سوار ہوا اور میرا پاؤں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو مس کر رہا تھا۔ راوی فرماتے ہیں یہودی ہماری طرف اپنے نوکروں اور پھاڑوں کے ساتھ نکلے۔ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگے محمد احقر بخدا اور لشکر آیا ہے اور وہ قلعہ میں چاہہا گزریں ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ حَرْبَتْ خَبِيرٌ إِنْهَا إِذَا نَزَلْنَا بِمَسَاحَةِ قَوْمِ فِئَسَاءَ صَبَاحَ الْمُنْدَرِيِّينَ (۳)۔

وَتَوَلَّوْا عَنْهُمْ حَتَّىٰ حَبْرَيْنَ ۗ ﴿٤﴾ وَأَبْيَرُ قَسُوفٌ يَّبْصُرُونَ ﴿٥﴾

”اور رخ انور پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر کے لئے اور (قدرت الہی کا تماشا) دیکھتے رہیں اور بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے لے۔“

لے یہ ارشادات تاکید کے لئے دوبارہ ذکر فرمائے۔ پہلی آیت میں ابصر ہم فرمایا تھا، یعنی مفعول کے ساتھ متعین فرمایا تھا تو ولات کے مقام کی وجہ سے قَسُوفٌ يَّبْصُرُونَ بھی متعین ہوگا۔ لیکن اس آیت میں مفعول کے ساتھ متعین نہیں فرمایا بلکہ مطلق ذکر فرمایا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ آپ گونا گوں ایسی خوشیاں اور سرسبز دیکھیں گے جن کا احاطہ زبان ذکر کے لئے ممکن نہیں اور یہ کافر ایسی تکالیف دیکھیں گے جن کا تذکرہ ناممکن ہے یا پہلا ارشاد دینا کے عذاب کے لئے ہے اور دوسرا آخرت کے عذاب کے لئے ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّيَ اِنَّ سُبْحٰنَ رَبِّيَ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٦﴾

”پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان (نامز اباتوں سے) جو وہ کیا کرتے ہیں لے۔“

۱۔ عزت کا معنی غلبہ اور قوت ہے اور رب کی عزت کی طرف اضافت کا مقصود یہ ہے کہ وہی عزت کا مالک ہے۔ یہ عزت اس کے ساتھ خاص ہے کیونکہ لا عزة الا لله عزت فقط اس کے لئے ہے یا اس عزت سے مراد وہ عزت نہیں جو ازلی اور ذاتی ہوتی ہے اور صفات الہیہ میں سے ہے بلکہ اس عزت سے مراد وہ عزت ہے جس کی طرف رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین منسوب ہیں (اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عزت حادثہ) جو پہلے نہ ہو بعد میں پیدا ہو) بھی اسی کی مملوک ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے جہاں چاہتا ہے وہاں رکھتا ہے (اس آیت میں اشارہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ اس کی ذات کے لئے واجب ہیں اور اس کی ذات ان کی مقتضی ہے۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ اور شوخیہ کو داخل فرمایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں توحید کا شعور بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس بات سے منزہ ہے جو شرک کہتے ہیں جن کا ذکر سورت میں ہو چکا ہے۔

وَسَلَّمَ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝۱۱

”اور سلامتی ہو سب رسولوں پر۔“

۱۔ یعنی سلام ہو ان رسولوں پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفات بیان کیں۔ اس جملہ میں تمام رسولوں کے لئے سلامتی کا ذکر ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۱۲

”اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔“

۱۔ یعنی سب تعریفات کا وہی مستحق ہے کیونکہ رسولوں کو جب جوٹ فرما کر اور کتابوں کو نازل فرما کر اس نے مومنین کو اپنی ذات اور صفات کی معرفت عطا فرمائی، انبیاء کرام کو اپنی تائید کا مژدہ سنایا۔ داعیان اسلام کے دشمنوں کی تباہی اور بربادی کی خبر بیان فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں جسے یہ پسند ہو کہ قیامت کے روز اجر کا پورا پورا پیمانہ بھرے تو اس کی مجلس کا آخری کلام یہ ہونا چاہئے۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱) اس حدیث کو علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اور عبد بن رجبیہ نے الترمذی میں روایت کیا ہے۔

لئے ہوگی۔ اگر قسم ہوگی تو او عطف کے لئے ہوگی۔ افسوس کہ جس میں اس قسم کا جواب قسم ان کُلِّ اِلَّا كَذِبَ الرُّسُلُ فَحَقَّ عِقَابُ ہے۔ اور یہ قول انتہائی بعید ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس کا جواب محذوف ہے جس پر ص کی پہنچ کے معنی پر اولا ہے۔ امر کا صیغہ دلالت کر رہا ہے، یعنی یہ قرآن مجزوع ہے یا اس پر عمل واجب ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، حقیقت وہ نہیں جو کفار کہتے ہیں۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عَذَابٍ وَ شِقَاقٍ ۝

”لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔“

یعنی کفار حق سے تکبر اور زمانہ جاہلیت کی حیثیت و عصیبت کی دلیل میں پھنسے ہوئے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی میں حق کی روشنی دیکھنے سے اندھے ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو تسلیم نہیں کرتے یا یہ معنی کفعل اور نقل جس عقیدہ کے متعلق ہیں یہ کفار اس کی مخالفت میں اندھے ہو گئے ہیں۔ عَذَابٌ اور شِقَاقٌ پر توین ان کی مخالفت اور ان کے تکبر کی شدت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یہ کلام محذوف جواب قسم سے اضراب ہے۔ قنادر فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ بَلِ عَجِبُوا جَلِ یہاں ابتدائیہ ہے۔ قصص فرماتے ہیں ”بل“ کلام کے تکرار اور دوسری نئی کے لئے ہے۔ آیت کا مجاز اس طرح ہے اِنَّ اللّٰهَ اَفْسَمُ بَعْضِ وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ اِنَّ اللّٰدِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس اور قرآن سراپا عصیبت کی قسم اٹھائی ہے کہ کفار مکہ تکبر اور دشمنی میں اندھے ہو چکے ہیں۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَّا كَادُوا ذَوَاتٍ حِينِ مَنَاصِصٍ ۝

”بہت سی امتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے پس وہ فریاد کرنے لگے اور نہیں تھا یہ وقت بچ نکلنے کا۔“

یہ آیت کریمہ محض فرور و عتاد کی بنیاد پر کفر کرنے پر وعید ہے اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ان جیسی کئی نافرمان لوگوں کو ہم نے اپنے عذاب کی چکی میں پس کر رکھا ہے۔ جب ہمارا عذاب پہنچا تو وہ توبہ و استغفار کی آوازیں لگائے گئے لیکن ہم نے کہا اب بھانٹے اور فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ لات حین مناصص اصل میں لات الحین حین مناصص ہے۔ کم اهلکنا کا جملہ محترف ہے اور پہلے کفار کی حالت بیان کی، اب ان کے انجام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، یعنی ہم انہیں بھی ہلاک کر دیں گے جیسے ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو (نا فرمانی کی وجہ سے) ہلاک کیا تھا۔ لات میں لا مشابہ بلیس ہے۔ اور تاکید کے لئے تانیث کی تاء اس پر زائد کی گئی ہے۔ جس طرح زُب اور شَم پر زائد کی جاتی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے، اس کا ایک معمول حذف ہوتا ہے یا اسم یا خبر محذوف ہوتی ہے۔ یہاں اسم محذوف ہے، یہ ظیل اور سیویہ کا مذہب ہے۔ انش کہتا ہے یہ لا نافیہ للجنس ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ فعل کی نئی کے لئے ہے اور اس کے بعد والے اسم پر نصب فعل کے اضراب کی وجہ سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا ارضی حین مناصص حاصل لہم۔ زجاج کے نزدیک وقت لات کی تاء پر ہے۔ اور کسان کی کے نزدیک ہاء کے ساتھ وقت ہے۔ یعنی لاہ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حین میں زائد کی گئی ہے، لا پر وقت ہے۔ اور پھر حین سے آغاز ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا مختار مذہب ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت عثمان کے صحف میں اسی طرح پایا ہے، ایک شاعر کو بھی اسی طرح ہے

وَالْعَاطِفُونَ نَحِيْنُ مَنَابِصِ عَاطِفِ

وَالْمُطْعَمُونَ زَهَانُ مَا مِنْ مُطْعِمِ

(دو اس وقت مہربانی کرتے ہیں جب کوئی مہربانی کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس وقت کھلتے ہیں جب کوئی کھلانے والا نہیں ہوتا) مناص 'خاصہ بنو صہ سے مصدر مہمی ہے۔ کاموس میں النوص کا معنی التاحور اور المناص کا معنی ملجھا (پناہ گاہ) لکھا ہے (1)۔ ابن عباس فرماتے ہیں کفار مکہ جب لڑتے اور جنگ میں بھاگنے پر مجبور ہو جاتے تو ایک دوسرے کو کہتے مناص یعنی بھاگ جاؤ اور اپنا بچاؤ کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ پر بدر کی جنگ میں عذاب نازل فرمایا تو کہنے لگے مناص بھاگ کر جان بچاؤ تو اس وقت یہ کہا گیا لات حین مناص اب بھاگ جانے کا وقت نہیں ہے (2) یہ جملہ نادو اسکے فاعل سے حال ہے، یعنی انہوں نے آواز اری کی لیکن اس وقت آہ و فغان کا وقت گذر چکا تھا اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا اور کوئی پناہ گاہ موجود نہ تھی۔ کفار مکہ کو پہلے لوگوں کی بے بسی کا ذکر سنایا گیا لیکن ان کو کوئی درس عبرت نہ ملا۔

وَعَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكُفْرُونَ هَذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ ﴿١٠﴾

”اور وہ (اس پر حیران تھے کہ آیا ہے ان کے پاس ایک ڈرانے والا ان میں سے اور کفار کہنے لگے کہ یہ شخص ساحر ہے کذاب ہے۔“

عَجَبُوا کا عطف ظرف مستقر (یعنی نفی عذرة و شقاق) پر ہے۔ یا یہ قد کی تقدیر کے ساتھ ظرف میں جو ضمیر مشتر ہے اس سے حال ہے۔ کفار کا پہلے ذکر ہو چکا تھا پھر اسم ضمیر کا ذکر کافری تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اظہار غضب کے لئے اور ان کی مذمت کرنے کے لئے اسم ظاہر الکفارون ذکر فرمایا نیز اس چیز کا ظہور تصور تھا کہ محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کذاب اور ساحر کی جواہوں نے نسبت کی ہے اس کی وجہ محض ان کا کفر ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو جادو کی کرشمہ سازی کہتے اور آپ کی پر حکمت باتوں کو جھوٹ کہتے۔ العیاذ باللہ۔

أَجْعَلُ الْإِلَهَةَ الْهَاتَا أَحَدًا ۚ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ ﴿١٠﴾

”کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بیچنگ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔“

یہ کلام فالوا کے حذف پر محمول ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے دعوت تو حیددی تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا کیا انہوں نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے! یعنی کیسے ہو سکتا ہے کہ جو الوہیت ایک جماعت اور پورے گروہ کے لئے تھی وہ ایک کے لئے کیسے ہوگی؟ یہ بڑی عجیب بات ہے، آج تک جو کام ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو کرتے دیکھا ہے اور ان سے سیکھا ہے یا اس کے باہل خلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ایک ذات کا علم اور قدرت بہت سے امور اور اشیاء کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ علامہ ابن عربی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے جب اسلام قبول کیا تو قریش پر یہ انتہائی ناگوار ہوا لیکن مسلمان آپ کے اسلام سے خوب شادان و فرحان ہوئے۔ ولید بن مغیرہ نے قریش کے سردار لوگوں کو اکٹھا کیا تقریباً چھ سو سردار ان قریش جمع ہوئے جن میں سے ولید عمر میں سب سے بڑھا تھا۔ ولید نے مشورہ دیا کہ ہم ابوطالب کے پاس جائیں (اور انہیں کہیں کہ اپنے بیٹھے کو سمجھا کہیں کہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہے) ابوطالب کے پاس پہنچے تو کہنے لگے آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کو معلوم ہے ان بیوقوفوں نے ہمارے آباء و اجداد کے عقائد و اعمال پر کیسے تھکے شروع کر رکھی ہے۔ ہم جناب کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمارے اور اپنے بیٹھے کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ ابوطالب نے نبی کریم ﷺ کو بلا بھیجا اور کہا ہے بیٹھے! یہ تیری قوم ہے

تھ سے گذارش کرتے ہیں کہ آپ ان پر زیادتی نہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے آپ ہمارے خداؤں کا تذکرہ چھوڑ دیں اور ہم آپ کو اور آپ کے خدا کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے ایک بات کی ضمانت دے دو جس کے تسلیم کرنے پر تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور تم بھی تمہاری فرمانبرداری قبول کر لیں گے۔ ابو جہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ہم تیری ایک نہیں بلکہ دس بائیس ماننے کے لئے تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بولا لا الہ الا اللہ۔ پس آپ کی یہ بات سنتے ہی تخرق ہو گئے اور کہنے لگے کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے، ایک خدا ساری مخلوق کی دعائیں کیسے سنتے ہے؟ (1)۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اے عجیب اس عجیب بات کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال ہو اور عجب اس کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وَاطْلُقِ السَّلَامُ مِنْهُمْ اِنْ امْسُوا وَاَصِدُّوا عَلٰى اَيْتِهِمْ اِنَّ هَذَا الشَّيْءُ رِاٰدٌ ﴿۱﴾

”اور تیزی سے چل دیجئے قوم کے سردار (رسول کے پاس سے) اور (قوم سے کہا) یہاں سے نکلو اور جھے رہو اپنے بتوں پر۔ لیکن اس میں اس کا کوئی (ذائقہ) مدعا ہے۔“

۱۔ اطلق کا جملہ قائلوا اجعل لالیۃ الخ محطوف ہے۔ یعنی حضرت ابوطالب کی مجلس سے مناد یہ کفار اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اپنے مہبودوں کی عبادت پر ثابت قدم رہو۔ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ امشوا سے پہلے اُن مفسرہ سے کیونکہ اطلاق میں قول کا معنی موجود ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اطلاق سے مراد الا ندفاع بالقول ہے۔ یعنی باتوں سے دفاع کرنا۔ امشوا یہ مشیت المصرة سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کہ اس نے کثرت سے بچنے سے۔ اسی سے الماشیہ ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اسی بات پر جمع ہوئے ہیں۔

یہ جو تو حید کا پرچار کر رہے ہیں ان کا اس میں کوئی ذاتی نفع ہے۔ یہ جملہ امشوا کی علت بیان کر رہا ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر نے اسلام قبول کیا تو ان کی وجہ سے مسلمانوں کو تقویت مل گئی۔ کفار یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے ان هذا الشیء یراد کا انکا اس میں کوئی ذاتی مقصود و مدعا ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جو ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائوں میں صبح و شام اضافہ ہو رہا ہے یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے متعلق پچھرا دہہ رکھتے ہیں (2) جس کو ہم سے روکنے والا کوئی نہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق کوئی ارادہ فرمایا ہے بعض علماء نے لکھا ہے یہ معنی ہے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اوپر سرداری دینے کا ارادہ فرمایا ہے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو حید کا پیغام دیتے ہیں یا انکا ارادہ عرب و عجم پر اپنی حکومت کا قیام ہے یا ایسی چیز ہے جس کا ارادہ ہر شخص کرتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارا دین ایک ایسی چیز ہے جو مطلوب ہے تاکہ تم سے حاصل کیا جائے۔

مَا سِعَ مَا يَهْدٰۤ اِی الْبَلَدَةِ الْاُخْرٰۤی اِنَّ هٰذَا اِلَّا اٰخِیَاطٌ ﴿۲﴾

”ہم نے تو ایسی بات آخری ملت (نصرانیت) میں بھی نہیں سنی یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے۔“

۱۔ ہذا کا اشارہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تو حید کی طرف ہے اور یہ کلمہ بطور تحقیر انہوں نے استعمال کیا۔ ابن عباس ابھی اور مقال فرماتے ہیں ملت آخرہ سے مراد نصرانیت ہے کیونکہ یہ آخری ملت ہے اور یہ بھی موحدا اور تو حید پرست نہیں رہے تھے بلکہ یہ بھی خدا کو

تیسرا خدا مانتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں اس سے کفار کی مردانگی کی ملت اور ان کا وہ دین جس پر وہ قائم تھے (۱) یعنی ہم نے اپنے آباؤ کو جس عقیدہ پر پایا اس میں ہم نے یہ تو حید کا تصور نہیں سنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فی المثلثة الاخذۃ حال کے محل میں ظرف مستقر ہو، یعنی ہم نے اہل کتاب سے اور کاتبوں سے یہ تو حید کا عقیدہ نہیں سنا۔ انہوں نے تو ہمیں نہیں بتایا کہ آخری ملت (اسلامیہ) میں ایسا نظریہ ہوگا یہ تو من گھڑت جھوٹ ہے۔

عَاقِلٌ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا اَبْلُ هُمْ فِي شَكِّ مِنْ ذِكْرِي تَبْلُ لَمَّا اِيْدُوْهُ وَقَدْ اَعْدَابُ ۝۱

”کیا نازل کیا گیا ہے اس پر الذکر (قرآن) ہمارے درمیان میں سے لے بلکہ یہ کفار شک میں مبتلا ہیں میرے ذکر کے متعلق بلکہ انہوں نے ابھی نہیں دیکھا میرے عذاب کا سزا“

۱۔ الذکو سے مراد قرآن ہے اور استفہام بمعنی انکار ہے پس استفہام بمعنی نفی ہے اور یہ ان ہذا الاختلاف کے مضمون کی تاکید کے لئے ہے، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو ہم سے عمر میں بڑا ہے نہ مال و جاہ کے اعتبار سے زیادہ ہے تو پھر ان پر قرآن کیسے نازل ہوا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ان کی تکذیب کی وجہ صرف اور صرف حسد تھا۔ نیز ان کی نگاہوں میں عظمت کا تصور صرف دنیوی مال و متاع کی کثرت تھی۔

۲۔ مل کے ساتھ اضراب انکار اور شک کے اثبات کے لئے ہے کیونکہ ان کے پاس نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو سزا اور کذاب کہنے کی کوئی حجت اور دلیل نہیں تھی۔ اس وجہ سے تقلید کا سہارا لینے لگے اور دلیل سے اعراض کرنے لگے، قرآن کا انکار کرنے کے بجائے قرآن لانے والے کا انکار کیا۔ ابھی تک انہوں نے ہمارے عذاب کا سزا نہیں دیکھا اگر چہ کھاتا تو کبھی انکار کی جرأت نہ کرتے۔ یقیناً یہ عذاب کا سزا چکھیں گے اور اس وقت ان کا شک زائل ہو جائے گا لیکن اس وقت کا اعتراف نفع مند نہ ہوگا۔ دوسرا اہل شک سے اضراب کے لئے اور قرآن کی حقیقت کی نفی کا جو ان کا اعتقاد اور یقین تھا اس کے اثبات کے لئے ہے۔ پہلے شک کا اثبات فرمایا، ان کے پاس حجت نہ ہونے کے اعتبار سے پھر یقین کا اثبات فرمایا ان کی ہمت دھری اور جہل مرکب کے اعتبار سے بعض علماء فرماتے ہیں مل دونوں مقامات پر ابتدا ہے، اضراب کے لئے ہے۔ پہلا جملہ کفار کے کلام کا جواب ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔

اَمْ رَعَيْتُمْ حَزْرًا اٰیْنُ رَاْحِمَةً سَرِيْكَ الْعَزِيْزِ الْاَوْهَابِ ۝۲

”کیا ان کے قبضہ میں ہیں خزانے آپ کے رب کی رحمت کے جو عزت والا ہے بے حساب عطا کرنے والا ہے لے“

۱۔ یعنی کیا نبوت کی چابیاں ان کے پاس ہیں کہ جسے چاہیں دے دیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں، نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ غالب ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ ام مقطوعہ بمعنی مل ہے اور مزہ بعض علماء کے نزدیک ایک دعویٰ سے دوسرے دعویٰ کی طرف اضراب کے لئے ہے یا مزہ اس دعویٰ کے انکار کے لئے ہے۔

اَمْ رَلْتُمْ مَلٰٓئِكَ السَّلٰوٰتِ وَالْاَمْرٰضِ وَمَا يَبِيْنَهُمَا ۚ فَلْيَدْعُوْا نٰنِي الْاَسْبَابِ ۝۳

”کیا ان کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے لے (ہاں) چاہیے کہ چڑھ جائیں

(آسمانوں پر) اس کی راہوں سے لے۔“

پہلے کفار کا فرماتے ہوئے فرمایا ان کے پاس رحمت کے فزا ان نہیں ہیں پھر فرمایا ان کا اس عالم جسمانی میں کوئی دخل نہیں جو رحمت رب کے فزا ان کا ایک چھوٹا سا جز ہے تو پھر انہیں مقام نبوت جیسے بلند و بالا امر میں تصرف کرنے کا کیسے حق ہوگا۔
 لے یہ شرط محذوف کا جواب ہے، یعنی اگر انہیں آسمانوں اور زمین میں کچھ اقتدار اور سلطنت ہے تو نیز غمی لگا کر عرش پر چڑھ جائیں اور اس پر بیٹھ کر اس کا نکتہ کی تدبیر کریں اور جن کو اچھا سمجھتے ہیں ان پر وہی نازل کریں، ان سے استہزاء کے لئے فرمایا آسمان پر چڑھو۔ یہ امر زبرد تو بیچ اور ان کے بجز کے اظہار کے لئے ہے۔ قنادہ اور مجاہد فرماتے ہیں اسباب سے مراد آسمان کے دروازے ہیں اور وہ راستہ ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ ہو خواہ وہ دروازہ ہو یا راستہ ہو وہ اس کا سبب ہے (1)۔

جُنْدًا مَا هُنَّ لَكَ مَهْرٌ ذُو مِرِّينَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱

” (در حقیقت) کفار کے لشکروں میں سے یہ ایک چھوٹا سا لشکر ہے جسے وہاں (بدر میں) شکست دے دی جائے گی لے۔“

لے ما قلت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور جند متدا محذوف کی خبر ہے اور مہر ذو مِرِّينَ جند کی صفت ہے، یعنی کفار کا یہ چھوٹا سا لشکر جسے عقب رب بدر کے میدان میں شکست سے دوچار کیا جائے گا، یہ بھی ان کفار کے لشکروں میں سے ایک ہے جنہوں نے گذشتہ زمانے میں میرے رسولوں کے خلاف محاذ بنائے تھے لیکن ان کی ساری سختیوں اور فرسوسوں کے ساتھ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تھا تو پھر یہ (کس باغ کی مولیٰ ہیں) انہیں امور الہیہ میں کس نے تصرف اور تدبیر کا اختیار دیا ہے یا یہ معنی کراے پیارے حبیب! جو کچھ یہ ہرزہ سراہی کر رہے ہیں اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ حضرت قنادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی بتا دیا کہ مشرکین کا لشکر شکست اٹھائے گا لے (2) فرمایا سَمَاءُ مَرَاتُهَا لَمْ يَكُنْ لَهَا دُونُ النَّبِيِّ ۝۔

عقب رب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اس نوید کا اظہار بدر کی جنگ میں ہوا۔ ہنالک کا اشارہ بدر اور ان کی قتل گاہوں کی طرف ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اس جگہ کی طرف اشارہ ہے جہاں کفار موجود ہوں اور اس قسم کے محبوب کبریٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیکلمات کہیں اور پیارے حبیب کی تکذیب کریں۔

كَلَّا بَدَأْتُ قَبْلَهُمْ قَوْمًا مِّنْ نَّوْمٍ وَعَادُوا فِرْعَوْنَ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲

”جھٹلا یا تھا ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور سمنوں والے فرعون نے لے۔“

لے ابن عباس اور محمد بن کعب فرماتے ہیں ذُو الْاَوْتَادِ سے مراد مضبوط عمارتوں والا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی مضبوط اور طاقتور حکومت والا ہے۔ قسمیں کہتے ہیں عربوں کا قول ہے هُمْ فِي الْعَبْرِ الثَّابِتِ الْاَوْتَادِ اور اس سے ان کی مراد اونچی طاقتور شخص ہوتا ہے (3) ضحاک نے بھی اس کا معنی قوت والا اور سخت پکڑ والا کیا ہے۔ عطیہ فرماتے ہیں بہت زیادہ لشکروں والا، یعنی وہ لشکر اس کے اقتدار کی مضبوطی کا باعث تھے۔ جس طرح کیل کسی کو مضبوط کرتا ہے وہ لشکر اس کی سلطنت کو مضبوط کرتے تھے۔ لشکروں کو اوتاد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سفر میں کثرت سے خمیے لگاتے ہیں اور کیل لگاتے ہیں۔ ابن عباس سے عطیہ کی ایک

روایت میں اوتاد کا معنی بیان ہوا ہے (1) کلبی اور مقاتل کہتے ہیں اوتاد جمع ہے و تد کی۔ فرعون نے کیلوں کی طرح ستون بنا رکھے تھے، لوگوں کو ان پر عذاب دیتا تھا۔ جب کسی پر ناراض ہوتا ہوتا تو اسے ان چار ستون کے درمیان چت لٹا دیتا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے ان ستونوں کے ساتھ باندھ دیتا پھر اس زمین و آسمان کے درمیان معلق لٹکا ہوا چھوڑ دیتا حتیٰ کہ وہ آدمی تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ مجاہد اور مقاتل بن حبان کہتے ہیں تو وہ زمین پر کسی کو چت لٹا دیتا پھر اس کے ہاتھ اور پاؤں زمین پر کیلوں کے ساتھ باندھ دیتا۔ سدی لکھتے ہیں وہ ایک شخص کو لٹا دیتا اور رسیوں کے ساتھ کیلوں سے باندھ دیتا اور اس شخص پر پتھو اور سانپ چھوڑ دیتا۔ قتادہ کہتے ہیں فرعون کو ڈوا ڈتاکو کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ پارئیاں تھیں اور کھیل کے میدان تھے۔ وہ کھلاڑی اس کے سامنے ان میدانوں میں کرتب اور کھیل کے مظاہرے کرتے تھے (2)۔

وَمَا يَنْظُرُهُمْ إِلَّا صَيْحَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ ۗ وَ لَقَدْ كَرِهَ اللَّهُ لِيُنزَلَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۗ وَكَانَ الْقُرْآنُ نَزْلًا مِّنَ رَبِّكَ وَرُوحًا مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ ۗ وَكَانَ عِزُّكَ يُكَلِّمُ الْمَلَائِكَةَ ۗ وَكَانَ عِزُّكَ يُكَلِّمُ الْمَلَائِكَةَ ۗ وَكَانَ عِزُّكَ يُكَلِّمُ الْمَلَائِكَةَ ۗ

”اور وہ تو تم کو لوط اور اصحاب ایکہ نے یہی وہ گروہ ہیں (جن کا ذکر پہلے گذر چکا)۔“

۱۔ اَصْحَابُ السَّمَوَاتِ سے مراد حضرت شیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ اَلْاَصْحَابُ پُرالف لام عہدی ہے، یعنی یہی وہ گروہ ہیں جن کا ذکر کجند ماہنٹالک الخ کے ارشاد میں گذر چکا ہے۔ انہوں نے رسولوں کے خلاف گروہ تیار کئے تھے۔ مشرکین مکہ کا گروہ بھی انہی کا پنجاب قوموں میں سے ایک ہے۔

اِنْ كُنَّ اِلَّا كَذَّبَ الرَّسُلُ فَكُنَّ عِقَابًا ۗ

”ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو (ان پر) لازم ہو گیا میرا عذاب۔“

۱۔ یہ کلام اس تکذیب کا بیان ہے جو پہلے ان کی طرف مبہم طور پر منسوب کی گئی ہے اور یہ کلام تاکید کی مختلف انواع پر مشتمل ہے (مثلاً تکذیب نکر اراہام کے ایضاح، جملہ استثنایہ جس میں ان کی تکذیب کا اثبات ہے جو تخصیص و تاکید کے انداز میں ہے) اس کلام کو تاکید بالائے تاکید اس لئے فرمایا تاکہ ان کے سخت عذاب کے مستحق ہونے پر ہمہ لگ جائے۔ اسی وجہ سے اس جملہ پر فقہ حنفی عقاب کو مرتب فرمایا ہے، یعنی ان پر میرا عذاب واجب ہو گیا اور ان پر میرا وہی عذاب نازل ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ عقاب کو یعقوب نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں بیابا کے ساتھ، یعنی عقابی پڑھا ہے اور باقی قرآن نے بناء کے حذف کے ساتھ کسرہ پر اکتفا کرتے ہوئے پڑھا ہے۔

کلی کذب الرسل کے جملہ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ گزشتہ قوموں نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی تھی، کسی دوسرے رسول کی انہوں نے تکذیب نہیں کی تھی تو پھر اس طرح کیوں فرمایا کہ ان سب نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ مصنف فرماتے ہیں یا یہ جمع کے مقابلہ میں جمع کے اصول پر ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے رسول کی تکذیب کی (جیسے عرب کہتے ہیں القوم رکبوا دو ابھم اس کا مطلب نہیں کہ قوم کا ہر فرد ہر سواری پر سواری ہو بلکہ اس کا مضموم یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی سواری پر سواری ہوا) اس لئے کہ رسولوں میں سے ایک کی تکذیب سب رسولوں کی تکذیب ہے کیونکہ تمام رسولوں کی دعوت اور پیغام ایک تھا (لا اله الا الله)

وَمَا يَنْظُرُهُمْ إِلَّا صَيْحَةٌ مِّنَ السَّمَاءِ ۗ وَ لَقَدْ كَرِهَ اللَّهُ لِيُنزَلَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۗ وَكَانَ الْقُرْآنُ نَزْلًا مِّنَ رَبِّكَ وَرُوحًا مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ ۗ وَكَانَ عِزُّكَ يُكَلِّمُ الْمَلَائِكَةَ ۗ وَكَانَ عِزُّكَ يُكَلِّمُ الْمَلَائِكَةَ ۗ

طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔“

۱۔ اِسْمُ عَلٰی عَابِقُوْلُوْنَ کا جملہ مستانفہ ہے۔ اور واذا ذکر عبدنا اس پر معطوف ہے۔ فرمایا میرے بندے داؤد کو یاد کرو کیونکہ پہلے انبیاء کرام کے حالات واقعات کا ذکر پانپندہ باتوں پر مبر کرنے اور نفس کو طاعت پر رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ذالایدا کا معنی انتہائی طاقت ور اور طاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے والا ہے۔ آداب کا معنی ہے کائنات سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا یا یہ معنی کا معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی اطاعت گزار ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں جس کی اذیت میں اس کا معنی تسبیح کرنے والا ہے (۱) انہ او اب کا جملہ ”الایدا“ کی علت بیان کر رہا ہے اور یہ جملہ دلیل ہے کہ ذالایدا سے مراد وہ ہے جو دین میں مضبوط ہے۔ شیخین نے صحیحین میں امام احمد نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پند یہ تین روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن انظار کرتے تھے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے آپ آدھی رات سوتے پھر رات کا تیسرا حصہ قیام فرماتے اور رات کا آخری چھٹا حصہ پھر سوتے (۲)۔

اِنَّكَ سَخِرْنَا الْعِجَالَ مَعَهَا يَسِيْحَنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاَشْرَاقِ ۝

”ہم نے فرما دیا کہ عجل اور تیز رفتاریوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت۔“

۱۔ یہاں سے فصل الخطاب تک ان انعامات اور نوازشات کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر کئے تھے۔ یہ داؤد سے بدل اِستِثْمَال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داؤد علیہ السلام کی کرامت کو یاد کرو۔ چاہیے یہ تھا کہ یَسِيْحَنَ کی جگہ مسبحات ہوتا لیکن اسلوب میں یہ تبدیلی ماضی کی حالت کی حکایت اور سامع کی نظر میں اس حالت کو حاضر کرنے کے لئے ہے تاکہ سامع پہاڑوں کی تسبیح کے حدود اور توجہ کا مشاہدہ کرے اور قدرت ربانیہ پر تعجب کرے۔

کلمی کہتے ہیں عشی اور اشراق سے مراد صبح و شام ہے اور اشراق اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج انتہائی روشن ہو۔ ابن عباس نے اشراق سے مراد چاشت کی نماز ہی ہے (۳) علامہ بخوی نے اپنی سند سے اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل فرمایا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اس آیت پر ایمان رکھتا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے حتیٰ کہ حضرت ام ہانی بنت ابی طالب نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ام ہانی یہ چاشت یہ اشراق کی نماز ہے (۴) اس اثر کو طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردودہ نے نقل کیا ہے۔ ابن جریر اور حاکم نے عبد اللہ بن الحارث کے حوالے سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے چاشت کی نماز کا علم اس آیت سے ہوا۔ اس قول کو سعید بن منصور نے بھی روایت کیا ہے۔

وَالطَّيْرَ مَحْشُورًا ۝ كُلُّ لَهٗ اٰدَابٌ ۝

”اور پرندوں کو وہ بھی تسبیح کے وقت جمع ہو جاتے اور سب ان کے لئے فرمانبردار تھے۔“

۱۔ الطیر کا عطف العجبال پر ہے محشور کا معنی مجتمع ہے کئی سے مراد پہاڑ اور پرندے ہیں۔ پہلی آیت میں بھی فرمایا کہ

2- صحیح بخاری، حدیث: 3238 (ابن کثیر)

4- تفسیر ربوئی، جلد 4، صفحہ 591 (الکر)

1- تفسیر ربوئی، جلد 4، صفحہ 591 (الکر)

3- تفسیر ربوئی، جلد 4، صفحہ 591 (الکر)

پہاڑان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ یہاں پھر فرمایا **لَنْ أَذَابَ**۔ اس نگرار کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ (یسبحن معہ) صرف تسبیح میں موافقت کرنے پر دلالت کرتا ہے جب کہ یہاں جملہ اسمیہ ہے تسبیح کے دوام پر دلالت کرتا ہے یا اس آیت کا مفہوم ہے کہ داؤد علیہ السلام، پہاڑ اور پرندے سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس صورت میں ”لہ“ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا۔

وَسَدَنًا مَمْلُوكَةً وَأَتَيْنَهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ ۝

”اور ہم نے محکم کردیا ان کی حکومت کو اور ہم نے بخشیں انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ۔“

۱۔ ہیبت نصرت اور لشکر کی کفرت کے ذریعہ ہے ہم نے ان کے اقتدار کو محکم کیا، بنوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام زمینی بادشاہوں میں سب سے زیادہ اقتدار کے مالک تھے۔ آپ کی عبادت گاہ کے ہرات چھتیس ہزار افراد نگہبان اور محافظ ہوتے تھے (1) بنوی نے عمر کے حوالہ سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نبی اسرائیل کے ایک شخص نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ایک سردار کے خلاف مقدمہ پیش کیا کہ اس نے میری گائیں غصب کر لی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی علیہ سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا پھر آپ نے مدعی (دعویٰ کرنے والے) سے گواہی طلب کی تو اس کے پاس گواہی نہ تھی۔ حضرت داؤد نے ان دونوں کو فرمایا تم باہم جاؤ میں تمہارے معاملہ میں سوچ بیچار کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ مدعی علیہ (جس پر دعویٰ کیا گیا ہے) کو قتل کر دو حضرت داؤد علیہ السلام نے سوچا کہ یہ خواب ہے، میں غیبت سے کام نہیں لوں گا حتیٰ کہ کوئی واضح حکم مل جائے۔ دوسرے دن بھی خواب میں ایسا ہی اشارہ پایا لیکن آپ نے اس پر بھی عمل نہ کیا پھر تیسرے دن بھی اسی طرح خواب دیکھا کہ یا اسے قتل کر دو یا اس کو تخت سزا دو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی علیہ کو بلوایا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے قتل کرنے کا حکم بھیجا ہے۔ مدعی علیہ نے کہا (کیا) تم مجھے بغیر گواہی کے قتل کر دو گے؟ آپ نے فرمایا ہاں قسم بخدا میں تیرے اوپر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کروں گا۔ جب مدعی علیہ نے دیکھا کہ آپ اسے قتل کرنے والے ہیں تو اس شخص نے کہا بتاب آپ جلدی نہ فرمائیں میں آپ کو جاتا ہوں کہ قسم بخدا مجھے اس گناہ کی وجہ سے نہیں پکڑا گیا بلکہ میں نے اس کے باپ کو دھوکے سے قتل کیا تھا اس کی وجہ سے مجھے پکڑا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے قتل کرنے کا حکم فرما دیا۔ اس واقعہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی ہیبت نبی اسرائیل کے دلوں پر چھا گئی اور داؤد علیہ السلام کا اقتدار مضبوط ہو گیا (2) عہد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح کا واقعہ روایت کیا ہے۔ حکمت سے مراد نبوت کمال علم اور پختہ عمل ہے۔ علامہ بنوی فرماتے ہیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا فصل الخطاب سے مراد یہ قاعدہ ہے کہ ”گواہی مدعی پر ہوگی اور قسم منکر پر ہوگی“ (الْبَيْتَةُ عَلَى الْمُشْجَعِ وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْجَرَ) کیونکہ اس طرح فیصلہ کرنے سے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ بنوی نے یہ لکھا ہے کہ ابی بن کعب سے بھی یہ مروی ہے کہ فصل الخطاب سے مراد گواہ اور قسمیں ہیں۔ مجاہد عطاء بن رباح کا بھی یہی قول ہے فرماتے ہیں ابن مسعود حسن کلبی اور مقاتل فرماتے ہیں فصل الخطاب سے مراد فیصلہ کرنے کی بصیرت ہے (3) فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد بیان الکلام ہے، یعنی ایسی کلام جس کا مقصد بغیر کسی التباس کے مخاطب پر ظاہر ہو جائے اور اس میں فصل وصل و عطف استئناف اضمار اظہار حذف اور تکرار وغیر وہی پوری رعایت رکھی ہو اور اس میں نہ تو اتنا اختصار ہو کہ سمجھنے میں غلط واقع ہو اور نہ اس میں اتنی طوالت ہو کہ سننے والا اکتاہٹ

محموس کرے جیسا کہ امام عبد کی حدیث کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بالکل واضح ہوتا تھا۔ نہ اتنا تھوڑا اور مختصر ہوتا تھا کہ سمجھنے میں غلٹ ہو اور نہ اتنا زیادہ ہوتا کہ سننے والا اکتا جاتا۔ اس حدیث کو ہم نے سورج توبہ میں فَاذْكُرْنَ اَنْ لَّهُنَّ سَكِينَةٌ مِّنْ غَيْبِنَا لَعَلَّ كُنَّ هُنَّ يَسْمَعْنَ جبریت کے واقعہ میں ذکر کیا ہے۔ معنی سے مروی ہے کہ فصل الخطاب سے مراد حمد و ثناء کے بعد اَمَّا بَعْدُ کا قول ہے (1) امام بیضاوی فرماتے ہیں اما بعد کو فصل الخطاب اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے حمد و ثناء مقصود سے جدا ہو جاتی ہے (2)۔

وَهَلْ اَشْكَبُوا الْخَصِمِ اِنْ نَسُوا وَالْمَحْرَابِ ﴿٦﴾

”اور کیا آئی ہے آپ کے پاس اطلاع فریقان مقدمہ کی جب انہوں نے دیوار پیمانہ کی عبادت گاہ کی لہ۔“

لہ۔ یہ استفہام تہجیب کے لئے اور مخاطب کو واقعہ کے سننے کے لئے چونکا کرنے کے لئے ہے۔ یہ جملہ اذکور پر معطوف ہے۔ الخصم اصل میں مصدر ہے اسی وجہ سے اس کا اطلاق تشبیہ اور مجہاز پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں خصم سے مراد دو جھگڑنے والے ہیں اور تسوور اور شومج کا صیغہ مجازاً ذکر کیا گیا ہے جیسے مجازاً اس ارشاد صَدَقَتْ قَوْلُهُمْ لَمَّا میں تشبیہ کے لئے (قلوب) جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تسوور السور سے مشتق ہے جیسے تسنم ستام سے مشتق کیا گیا ہے۔ تسور کا معنی دیوار پر چڑھنا ہے۔ المحراب سے مراد قلعہ ہے، اس کو محراب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دیواروں پر چڑھ کر جنگ کی جاتی ہے یا محراب سے مراد مسجد ہے کیونکہ مسجد میں انسان شیطان سے جنگ کرتا ہے اس لئے اسے محراب کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار پیمانہ تک کر آنے والے زیادہ ہوں جیسا کہ حج کا صیغہ اور ضمیریں دلالت کر رہی ہیں۔ اذیاتو تعاکم محذوف کے متعلق ہے یا نبأ کے متعلق ہے اس بنا پر کہ اس واقعہ سے مراد داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ تعنی کی طرف دباہ کی نسبت مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے، یعنی اہل ایماک قصۃ نبأ الخصم یا طرف الخصم کے متعلق ہے کیونکہ اس میں فصل کا معنی پایا جاتا ہے۔ طرف بقی کے متعلق نہیں ہے کیونکہ یہاں فعل اور طرف کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ کیونکہ اس خبر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا اس وقت نہیں تھا یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان تھا۔ علامہ بیضاوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ اس امتحان کا سبب کیا تھا بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک خواہش کی کہ مجھے بھی ایسے آباء و اجداد حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا مقام مل جائے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کیا کہ اسے بھی امتحان میں مبتلا کیا جائے جس طرح ان کے بزرگوں کو امتحان میں مبتلا کیا گیا اور انہیں ایسی فضیلت عطا فرمائے جیسی ان بزرگوں کو عطا فرمائی (3)۔ سدی کلبی اور مقاتل نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو تقسیم کر رکھا تھا آپ ایک دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے، ایک دن اپنے رب کی عبادت کے لئے خلوت نشینی فرماتے اور ایک دن اپنی ازواج اور دوسرے مشاغل میں صرف فرما لیتے (4)۔ عبد بن حمید ابن جریر اور ابن المنذر نے حسن سے روایت کیا ہے کہ آپ نے چار حصوں میں اپنے وقت کو تقسیم کیا کہ ہوا (5) ایک دن وعظ فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی کتاب میں حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے فضائل پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی کہ میرے رب ساری خیر اور بھلائی تو میرے آباء و اجداد لے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں نے انہیں ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا تھا جس میں تمہیں مبتلا نہیں کیا اور انہوں نے ان مصائب پر صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کو نرود جیسے

2- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 137 (اعلیٰ)

4- تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفلک)

1- تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفلک)

3- تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفلک)

5- الدرر البکر، جلد 5، صفحہ 566 (اعلیٰ)

ظالم بادشاہ سے واسطہ پڑا، بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت اسحاق کو ذبح ہونے اور بیٹائی کے سلب ہونے میں مبتلا کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف کی جدائی کے غم میں مبتلا کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی میرے رب مجھے بھی تو ان جیسی تکالیف میں مبتلا کر، میں بھی صبر کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے وہی نتیجہ اے داؤد تجھے فلاں سینے فلاں دن آزمائش میں ڈالا جائے گا، محتاط رہنا، جب وہ دن آیا جس کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی عبادت گاہ میں تشریف لے گئے، نماز اور تورات کی تلاوت میں مصروف ہو گئے، آپ اسی ذکر و فکر میں مشغول تھے کہ شیطان ایک سونے کے کپوتر کی شکل میں سامنے آ گیا، اس کا ہر پر بڑا خوبصورت تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے پر موتیوں اور زبرجد کے تھے۔ وہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، وہ آپ کو بڑا حسین لگا، آپ نے پکڑنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ بنی اسرائیل کو وہ کپوتر دکھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کر سکیں۔ جب آپ نے اسے پکڑنے کا ارادہ فرمایا تو وہ اذکر قریب ہی بیٹھ گیا۔ آپ نے پھر اسے پکڑنا چاہا تو تھوڑا دور ہو گیا۔ آپ نے اس کا چچا کیا تو وہ اذکر رشتہ داروں میں جا بیٹھا پھر آپ اس کو پکڑنے کے لئے پیچھے گئے وہ رشتہ داروں میں سے بھی اڑ گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسے رشتہ داروں سے دیکھنے لگے کہ یہ کہاں جا کر بیٹھتا ہے تاکہ کسی کو پیچھے نہ بچھ کر شکار کر سکیں۔ اس نظارہ کے دوران اچانک آپ کی نظر ایک عورت پر پڑ گئی جو ایک تالاب کے کنارے غسل کر رہی تھی۔ یہ کبھی کا قول ہے اور سہی فرماتے ہیں آپ نے اس عورت کو ایک چھت پر غسل کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت ترین عورت تھی۔ حضرت داؤد کو وہ عورت پسند آئی عورت نے بھی دیکھ لیا اسے کوئی سایہ محسوس ہوا تو اس نے اپنے لیے لیے ہال کھول کر بدن کو ڈھانپ لیا اتنی لمبی رفتیں دیکھ کر آپ مزید متعجب ہوئے۔ حضرت داؤد نے اس عورت کے متعلق پوچھا۔ بتایا یہ شائع کی بیٹی تالاب ہے، اور یابن حتنا کی بیوی ہے اور اس کا خاندان ایوب بن صورت یا کے ساتھ بلقاہ کے غزوہ میں شریک ہے۔ ایوب بن صورتی حضرت داؤد علیہ السلام کا بھانجا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش تھی اور یا اس عورت کا خاندان شہید ہو جائے اور آپ اس عورت سے نکاح کر لیں۔ آپ کا گناہ صرف اسی قدر تھا کہ آپ نے یہ خواہش کی تھی۔ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے بھانجے ایوب کو لکھا کہ اور یا کو فلاں جگہ لڑنے کے لئے بھیجو اور انہیں تابوت سے آگے رکھو۔ اس وقت جس شخص کو تابوت سے آگے رکھا جاتا اس کے لئے پیچھے لوٹنا جائز نہ ہوتا تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے فتح عطا فرمائے یا وہ خود شہید ہو جائے۔ اس نے اسے آگے کیا فتح نصیب ہوئی ہے پھر داؤد علیہ السلام نے ایوب کو لکھا کہ اسے فلاں دشمن کے مقابلہ میں بھیجو جو بڑا جنگجو ہے (قدرت نے اسے پھر بھی فتح عطا فرمائی) پھر آپ نے لکھا کہ اسے فلاں جنگجو کے مقابلہ میں بھیجو وہ تیسری مرتبہ شہید ہو گیا۔ جب عورت کی عدت گزرتی تو داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا یہی عورت حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ تھی (1)۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ داؤد علیہ السلام کا گناہ یہ تھا کہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے (تاکہ آپ اس سے نکاح کر لیں) مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ امر اس وقت مباح تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند نہ آیا کیونکہ یہ کام دنیا میں رشت اور ازدواج کی کثرت کی طرف شوق رکھنے کی دلیل تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ پہلے بھی اتنی عورتیں عطا فرمادی تھیں کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی (2) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت حسن سے مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا جیسا کہ عبد بن حمید وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ جب بنی اسرائیل کے وعظ کا دن ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کا خود بھی ذکر کرتے اور انہیں بھی ذکر کروا دیتے۔ خود بھی روتے اور لوگوں کو بھی رلاتے۔ ایک دن محفل میں یہ تذکرہ ہوا کہ کوئی

ایسا شخص ہے جس کا دن اس طرح گزرے کہ اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دل میں سوچا کہ میں اس کام کی طاقت رکھتا ہوں بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ محفل میں عورتوں کے فتنہ ذکر ہوا (کہ کیا کوئی اس سے محفوظ رہ سکتا ہے) آپ نے دل میں سوچا کہ اگر مجھے عورتوں کے فتنہ میں مبتلا کیا جائے گا تو میں محفوظ رہوں گا۔ جب آپ کی عبادت کا دن ہوتا تو اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو جاتے اور دروازہ بند کر لیتے اور حکم فرماتے کہ کوئی اندر داخل نہ ہو۔ آپ ایک دن اسی کیفیت میں کمرہ کے اندر قورات پر جھک کر اس کی تلاوت کر رہے تھے کہ سونے کا ایک کبوتر آپ کے پاس آ بیٹھا جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے۔ علامہ ربوئی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عورت کے خاندان کو اپنے لشکر کی طرف بھیجا اور اسے لکھا کہ فلاں جگہ تم پہنچنا وہاں چلا تو شہید ہو گیا۔ آپ کو اس کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ جب داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے دن انسانی شکل میں دوفرشتے بھیجے۔ جب انہوں نے آپ کی عبادت گاہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو چوکیداروں نے ان کو روک لیا وہ انسانی شکل میں فرشتے دیوار بچاند کر آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کو محسوس نہ ہوا کیونکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے لیکن آپ کو اس وقت معلوم ہوا جب وہ آپ کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ فرشتے جبرئیل اور میکائیل تھے (۱)۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزِعَهُ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَحْزَنْ إِنَّا نَحْنُ بَعْضُ عَلَىٰ بَعْضٍ
فَأَحْكَمَ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا شُكَّ وَلَا هُدًى نَآئِلِي سِوَاكَ الصِّرَاطِ ۝

”اور جب آپ تک داخل ہوئے داؤد پر آپ کو کچھ گھبراہٹ کی تھی انہوں نے کہا ڈریے نہیں ہم تو مقدمہ کے دو فریق ہیں۔ زیادتی کی ہے ہم میں سے ایک نے دوسرے پر آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ فرمائیے اور بے انصافی نہ کیجئے اور دکھائیے ہمیں سیدھا راستہ۔“

۱۔ اِذْ دَخَلُوا اذ تسوروا سے بدل ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی گھبراہٹ کی وجہ تھی کہ وہ دو آدمی دن آپ کے پاس پہنچے؟ جب کہ کسی کو چوکیدار اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسرا یہ لوگ اوپر سے آئے اس وجہ سے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا۔ آنے والوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، یہ کلام علی سبیل الفرض ہے اور اس سے متصوّد فریض اور اشارہ کرتا ہے گویا انہوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، ہم میں سے بعض نے بعض پر بغاوت کی ہے اور ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائیں شط الرجحل شطاً واشط الاشطاطاً اس کا معنی ہے حکم اور فیصلہ میں ظلم کرنا اور یہاں معنی ہوگا حد سے تجاوز کرنا یہ شط الدار واشطت سے مشتق ہے۔ جس کا معنی دور ہونا ہے سوا مصدر یعنی قائل ہے اور یہ حقیقت میں الصراط کی صفت ہے لیکن صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسا کہ اخلاق ثواب میں صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے، یعنی ہمیں آپ عدل کا راستہ دکھائیں۔

إِنَّ هَذَا آخِرُ قَوْلِنَا وَسِعُونَ نِعْمَةً وَلِيَّ نِعْمَةٍ وَاحِدًا ۖ فَقَالَ أَكْفَيْنِيهَا
وَعَرَّيْنِي فِي الْخِطَابِ ۝

” (صورت نزاع یہ ہے کہ) میرا بھائی ہے اور اس کی نانوائی میں اور میرے پاس صرف ایک دینی ہے اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دے اور تخی کرتا ہے میرے ساتھ گفتگو میں۔“

۱۔ آئی ہے سے مراد یعنی اور ہم مسلک بھائی ہے۔ نعجۃ سے مراد عورت ہے کنایہ عورت کو نوحہ کہا جاتا ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں کلام تنبیہ اور تنہیم کے لئے ہے کیونکہ وہاں کوئی دنیاوی نہ تھیں۔ یہ جملہ ظریفہ ان کی دوسری خبر ہے ”دلی“ کو محض نے یاہ کے نوحہ کے ساتھ اور باقی فرماتے ہیں یاہ کے سکون کے ساتھ پرہا ہے۔ وَفِي تَحِيَّةٍ وَأَجْنَاجٍ كَمَا جَمَلَةٌ ظَرِيفَةٌ حَالٌ كِي بِنَاءٍ بِرُحْلٍ نَسَبٌ مِثْلُ هُوَ۔ اور اس میں عامل سابق ظرف ہے قال کا عطف له تسع و تسعون نعجۃ پر ہے۔ ابن عباس نے اکفلبھا کا معنی اعطیھا (یعنی یہ مجھے دے دو) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اس عورت کو طلاق دے دے تاکہ میں اس سے نکاح کر لوں (۱) حقیقت یہ ہے کہ اس کو تو میرے ساتھ ملا دے اور اس کو اس طرح کر دے تاکہ میں اس کی کفالت کروں جس طرح میں دوسری عورتوں کی کفالت کرتا ہوں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے اجعلھا کفلی و نصیبی (اسے میرا کفیل اور نصیب بنا دے)

عزنی کا عطف قال پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ مجھ پر بھگنے سے میں غالب آ جاتا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کلام کرتا ہے تو مجھ سے یہ زیادہ فصیح ہے اور اگر جنگ کرتا ہے تو مجھ سے زیادہ پکڑ کرنے والا ہے کیونکہ میرے ہاتھوں میں کمزوری ہے اگر چہ حق پر میں ہوتا ہوں (2) بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ عورت کو پیغام نکاح دینے میں وہ مجھ پر غالب آ جاتا ہے۔ میں بھی ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجتا ہوں اور میرے پیغام کے اور پرانا پیغام بھیجتا ہے پس وہ مجھ پر غالب آ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس سے نکاح کر لیتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ لِئَیْ نَعَّاجِهِ ۗ وَإِنَّ لَكُم مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَمِیْنٍ
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ
دَاوُدَ أَلْسِنًا فَاَتَتْهُ فَاسْتَعْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ﴿ۛ﴾

”آپ نے فرمایا جنگ اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالعہ کر کے کہ تیری دینی کو اپنی دنیاویوں میں ملا دے اور اکثر حصہ دار زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر سوائے ان حصہ داروں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں اور فوراً خیال آ گیا داؤد کو کہ ہم نے اسے آزمایا ہے سو وہ مجالاً مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گریز سے رکوع میں لے۔“

۱۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر معاملہ واقعی اس طرح ہے جیسا تم بیان کر رہے ہو تو اس نے تم پر یقیناً ظلم کیا ہے ظلمتک کا جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور اس اسلوب سے مقصود اس کے ملانے کے فعل پر انکار اس کے لالچ کی خدمت کرنا مقصود ہے سوال مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور دوسرے مفعول کی طرف اس کا الی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہونا اضافت کے معنی کی تضمین کے لئے ہے۔ خلطاء سے مراد شرکاء ہیں اور یہ خلیط کی جمع ہے وَإِنَّ لَكُم مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَمِیْنٍ کا عطف لَقَدْ ظَلَمَكَ پر ہے۔ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ایہام اور ان کی قلت سے تعجب کے لئے ہے۔ جب داؤد علیہ السلام نے فیصلہ سنایا تو ان آنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا اور وہ دونوں پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فیصلہ کے ذریعے امتحان میں مبتلا کیا ہے کہ اس فیصلہ سے چونکا ہوا ہوں یا نہیں۔ سدی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ جب ان آنے والوں میں سے ایک نے اپنا دعویٰ پیش کیا تو داؤد علیہ السلام نے دوسرے سے پوچھا (کہ کیا معاملہ واقعی اسی طرح ہے) اس نے کہا

میری نانوسے دنیاوں ہیں اور میرے بھائی کی ایک دینی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک دینی لے کر اپنی سونیاں پوری کروں اور یہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر تو نے ایسا کیا تو میں تجھے ناک اور پیشانی پر ماروں گا۔ اس نے اسے کہا اے داؤد آپ اسی سزا کے حقدار ہیں کیونکہ اور یا کی صرف ایک ہی تھی اور آپ کی نانوسے بیویاں تھیں۔ تم اسے قتل ہونے کے لئے تابوت سے آگے بھیج رہے تھی کہ وہ قتل ہو گیا اور پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا تو وہ غائب ہو گئے اور آپ کو کوئی شخص نظر نہ آیا آپ سمجھ گئے کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام کا صرف اتنا قصور تھا کہ آپ نے خواہش کی تھی کہ اور یا کی بیوی ان کے لئے حلال ہو جائے اتفاقاً اور یا جنگی لشکر میں شامل تھا وہاں شہید ہو گیا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی شہادت کی خبر پہنچی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ایسا لشکر کا اتہار نہ کیا جیسا کہ کسی دوسری لشکریوں کی ہلاکت پر کرتے تھے پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات پر آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ انبیاء کرام کے قصور اگر چہ انتہائی چھوٹے بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی شان بہت بلند ہوتی ہے۔

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قصور صرف اتنا تھا کہ اور یا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ اس سے نکاح کرنے کا پورا ارادہ کر چکا تھا لیکن جب وہ جنگ پر چلا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اسی عورت کی طرف پیغام نکاح بھیج دیا۔ اس عورت نے داؤد علیہ السلام کی عظمت و جلال کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیا۔ اور یا کو اس پر بہت رنج ہوا۔ اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے یہ ایک عورت بھی اس کے منگیتر کے لئے نہ چھوڑی حالانکہ آپ کے پاس پہلے نانوسے عورتیں تھیں (۱) علامہ ابنوبی نے حضرت انس بن مالک کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب اس عورت کی طرف دیکھا تو آپ نے ارادہ کر لیا اور پھر لشکر کے جزل کو پیغام بھیجا کہ جب دشمن سے مقابلہ ہو تو فلاں شخص کو تابوت کے آگے رکھنا کیونکہ اس دور میں تابوت کے ذریعے فتح طلب کی جاتی تھی جو تابوت کے آگے ہوتا تو وہ واپس نہ آ سکتی کہ شہید ہو جائے یا مخالف کا لشکر شکست سے دوچار ہو جائے۔ اس عورت کا خاندان قتل ہو گیا پھر درویشیے نازل ہوئے جنہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ معاملہ کو سمجھے اور جحدہ میں گئے اور آپ چالیس روز تک جحدہ میں پڑے رہے حتیٰ کہ آپ کے سر پر آنسوؤں کی وجہ سے گھاس اگ آئی اور زمین پیشانی کو کھٹائی اور جحدہ میں آپ یہ کہتے رہے اسے رب کریم! داؤد سے اس کی لغزش ہوئی ہے جو شرق و مغرب سے زیادہ ہے۔ اسے میرے پروردگار اگر تو نے رحم نہ فرمایا تو داؤد (علیہ السلام) کا گناہ معاف نہ ہوگا اور تو اس کے گناہ کو آنے والے لوگوں میں کہانی بنادے گا چالیس دنوں کے بعد حضرت جبرئیل آئے اور کہا ہے داؤد اللہ تعالیٰ نے تیری خواہش کو معاف فرمادیا ہے جس کا تو ارادہ کر چکا تھا۔ داؤد علیہ السلام نے کہا میرا رب اس بات پر قادر ہے کہ میرا ارادہ اور خواہش معاف فرمادے جو میں نے کی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ عادل ہے، اس کا کسی کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔ اس وقت کیا حالت ہوگی جب قیامت کے روز فلاں شخص آئے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار میرا خون جو داؤد کے ذمہ ہے (اس کا بدلہ دیا جائے) جبرئیل نے کہا میں نے یہ تو اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ایسا کروں گا۔ آپ نے فرمایا جاؤ پوچھو

آؤ (کس خون کا کیا ہے گا) جبرئیل اوپر چڑھ گئے اور داؤد علیہ السلام سجدہ میں گر گئے جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ سجدہ میں رہے پھر جبرئیل امین تشریف لائے تو کہا اے داؤد میں نے اس کام کے متعلق اللہ تعالیٰ سے پوچھا ہے جس کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا اور اس نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ داؤد کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو قیامت کے روز جمع فرمائے گا اور پھر اس سے فرمائے گا داؤد پر جو تیرا خون ہے وہ انہیں معاف کر دے۔ وہ شخص عرض کرے گا اے میرے پروردگار تجھے اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے شخص تو اس معافی اور بخشش کے بدلے جنت میں جو چاہتا ہے لے لے (1)۔ حضرت ابن عباس، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آئے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے خلاف خود ہی فیصلہ دے دیا تو وہ دونوں فرشتے اپنی بیعت میں ہو گئے اور اوپر چڑھ گئے اور یہ کہہ رہے تھے اس شخص نے اپنے خلاف فیصلہ سنایا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیقت حال کا پتہ چل گیا اور پھر آپ نے چاہا کہ میں سجدہ میں پڑے رہے، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا۔ صرف قضائے حاجت اور فرضی نماز کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ اس چالیس دن کے عرصہ میں آپ روتے ہی رہتے تھے کہ آپ کے سر کے ارد گرد گھاس اگ آئی اور آپ اپنے رب سے یہ انتہا کرتے رہے۔ اور تو بے کا سوال کرتے رہے آپ کی سجدہ میں دعا کے یہ الفاظ تھے پاک ہے ہر عیب اور نقص سے جو بادشاہ عظیم ہے جو جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کو آزمانے میں ڈالتا ہے پاک ہے نور کا تخلیق کرنے والا پاک ہے جو دلوں کے درمیان حائل ہوتا ہے پاک ہے وہ ذات جو نور کی خالق ہے اے میرے معبود تو مجھے اور میرے دشمن اٹھیں کو خانی پھوڑو یا جب اس کا فتہ مجھ پر اترا تو میں قائم نہ رہ سکا۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود تو مجھے پیدا کیا تو تیرے علم میں تھا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود بلا مات ہوگی۔ داؤد کے لئے جب اس سے پردہ اٹھے گا اور کہا جائے گا یہ داؤد خطا کار ہے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود قیامت کے روز میں کس آنکھ سے تیری زیارت کروں گا غلام پوشیدہ اور خفیہ نظروں سے دیکھیں گے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود میں کن قدموں سے تیرے آگے چلوں گا اور کیسے تیرے سامنے کھڑا ہوں گا؟ جب خطا کاروں کے قدم پھسل جائیں گے۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود غلام ہمیشہ اپنے آقا سے ہی مغفرت طلب کرتا ہے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو سورج کی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تو پھر تیری دوزخ کی گرمی کیسے برداشت کروں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو بجلی کی کڑک کی آواز برداشت نہیں کر سکتا پھر میں دوزخ کی آواز کیسے سن سکوں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود بلا مات ہو داؤد کے لئے اس عظیم گناہ کی وجہ سے جو اس سے سرزد ہوا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود تو میرے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ میرا عذر قبول فرما۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود اپنی رحمت کے طفیل میرے گناہ معاف فرمادے اور اپنی رحمت سے مجھے میری خواہشات کے باعث دور نہ کر دے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور سے ان گناہوں کی جنہوں نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں اپنے گناہوں سے بھاگ کر تیری طرف آیا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے تو مجھے مایوس ہونے والوں سے نہ کر اور قیامت کے دن مجھے سزا نہ دے۔ پاک ہے نور کا خالق (2)۔

مجاہد فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن سجدہ میں پڑے رہے اور سر نہ اٹھایا حتیٰ کہ آپ کے آنسوؤں کی نمی سے گھاس اگ آئی حتیٰ کہ گھاس نے آپ کا سر ڈھانپ دیا پھر آواز آئی اے داؤد کیا بھوکا ہے کہ تجھے کھانا کھلایا جائے کیا پیاسا ہے کہ تجھے پانی پلایا جائے کیا تیرا ہنر ہے کہ تجھے کپڑے پہنانے جائیں پس آپ کو وہ جواب ملا جو آپ نے طلب نہیں کیا تھا پس آپ نے پھوٹ پھوٹ

کے سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو رکوع کا اطلاق رکوع پر فرمایا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود تعظیم ہے خاص سجدہ نہیں ہے۔ اور تعظیم کا معنی رکوع و سجود دونوں میں ایک ہے اور تعظیم الہی کی ضرورت یا تو ان لوگوں کی اقتداء میں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی یا ان کی مخالفت میں ہے جنہوں نے تعظیم الہی سے انکار کیا اور یہی معنی ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے اس کو قیاس کہا جاتا ہے۔ آخر علامہ شیخین امام مالک امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں سجدہ کی جگہ رکوع جائز نہیں ہے اور یہ استحسان (قیاس خفی) ہے اور وجہ استحسان یہ ہے کہ واجب مخصوص جہت پر تعظیم ہے اور وہ موجود ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص فوراً آیت سجدہ پر رکوع نہ کرے حتیٰ کہ زیادہ قرأت پڑھ جائے اور پھر سجدہ کی نیت سے رکوع کرے تو بالاولیٰ جماع جائز نہیں ہے اور اس آیت میں رکوع کے ساتھ سجدہ کی تعبیر بھی غیر مسلم سے اگر تسلیم کیا بھی جائے تو یہ محض مجاز ہوگا اور یہ ایک کدوسرے کے قائم مقام رکھنے کا تقاضا نہیں کرتا۔

امام ابوحنیفہ یہاں قیاس کو استحسان پر ترجیح دیتے ہیں اور قیاس استحسان سے قوی ہے اور قیاس کی تائید عبد اللہ بن مسعود اور ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے یہ دونوں حضرات نماز میں رکوع کو سجدہ کے قائم مقام سمجھتے تھے اور کسی دوسرے صحابی کا ان سے اختلاف بھی مروی نہیں ہے نیز قیاس خفی کو اس کے خفا اور قیاس جلی کو اس کے ظہور کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ ترجیح کسی متصل معنی کی وجہ سے دی جاتی ہے اور قیاس جلی کو قیاس خفی کی معارضیت کی صورت میں بہت کم ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے دس سے کچھ زیادہ مواقع پر قیاس جلی کی قیاس خفی پر ترجیح کا ذکر کیا ہے۔ اصول فقہ سے یہ مواقع پہنچانے جا سکتے ہیں لیکن قیاس خفی کو قیاس جلی پر اتنی زیادہ ترجیح دی گئی ہے کہ مواقع کا شمار ممکن نہیں۔

مسئلہ: اگر آیت سجدہ کی تلاوت کے فوراً بعد رکوع کر لیا اور سجدہ تلاوت کی نیت نہ کی پھر نماز کا سجدہ کیا تو نماز کے فرضی سجدہ کی ادائیگی سے سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا خواہ نماز کی نیت نہ ہو یا نہ کی ہو یا نہ کی ہو۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے اگر آیت سجدہ کے بعد ایک آیت یا دو آیات تلاوت کرے اور پھر رکوع کر لے تو نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا۔ لیکن جمہور علماء اس کے خلاف ہیں اور آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھنے کے بعد نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت کی ادائیگی کے متعلق علماء کا اختلاف ہے اور تین سے زیادہ آیات پڑھنے کے بعد سجدہ تلاوت کے قائم مقام نہ رکوع ہوگا اور نہ سجدہ ہوگا خواہ سجدہ تلاوت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ مسئلہ۔ امام ابوحنیفہ رحمت اللہ علیہ کے نزدیک نمازی جب تک نماز میں ہے اس پر سجدہ تلاوت کی تقاضا واجب ہے۔ جمہور احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔ محمد بن مسلمہ کا خیال ہے کہ نماز کے سجدہ کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا قیاس ہے۔ اور استحساناً یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نماز کے سجدہ کا سجدہ خود فرض ہے کسی دوسرے کے قائم مقام نہیں ہوتا جیسے رمضان شریف کا روزہ کسی دوسرے دن کے قضاء روزہ اور اس دن کے ادار روزہ دونوں کے قائم مقام نہیں ہوتا پس یہاں قیاس استحسان پر مقدم ہے۔ رہا رکوع کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا تو قیاس اس کے خلاف ہے لیکن یہ استحساناً جائز ہے اور استحسان قیاس خفی ہے پس اس صورت میں استحسان کو قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک سورہ ص کی اس آیت کو تلاوت کرنے والے پر سجدہ واجب ہے اور امام مالک کے نزدیک اس آیت کی تلاوت کرنے والے پر سجدہ کرنا سنت ہے جیسے مطلقاً سجدہ تلاوت ان کے نزدیک سنت ہے۔ اسی طرح امام احمد کے نزدیک بھی ایک روایت کے مطابق سنت ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اور احمد کی مشہور روایت کے مطابق یہ سجدہ شکر ہے اور نماز کے باہر ادا کرنا مستحب

ہے اور نماز میں اس کو ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ابن عباس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ ص کا سجدہ کرتے دیکھا لیکن یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے (1)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے ترمذی کے طریق سے بیان کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے اس طرح روایت کیا ہے فرماتے ہیں سورہ ص واجب سجدوں میں سے نہیں ہے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا (2) ایک روایت میں ہے کہ مجاہد فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے پوچھا کیا میں سورہ ص میں سجدہ کروں تو ابن عباس نے وہن ذریعہ داؤد و سلیمان سے لے کر ہبہد اہم اقدہ تک تلاوت فرمائی۔ اور پھر ارشاد فرمایا تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کی اقتداء کریں (3)۔ تو حضرت ابن عباس کا یہ جواب وجوب کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ حدیث ہمارے حق میں حجت ہے اور ہمارے مسلک کے مخالف نہیں ہے اور ابن عباس کا یہ قول کہ لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ الشُّجُودِ (واجب سجدوں میں سے نہیں) موقوف ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے) پہلے قول کے معارض ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مرفوع ہے۔ ابن الجوزی نے ابوسعید الخدری کی حدیث سے بھی دلیل پکڑی ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں خطاب فرمایا اور سورہ ص تلاوت فرمائی جب آیت سجدہ سے گزرے تو آپ نیچے اترے اور سجدہ فرمایا اور ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا۔ پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ ص کی آیت سجدہ پڑھی تو ہم سجدہ کرنے کے لئے کھڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح سجدہ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا یہ ایک نبی کی توبہ کا سجدہ ہے لیکن میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تم سجدہ کرنے کے لئے تیار ہو پھر آپ منبر سے نیچے تشریف لائے، آپ نے سجدہ کیا اور ہم نے بھی سجدہ کیا (4) اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بھی ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ مطلقاً سجدہ تلاوت کے عدم وجوب پر دلالت ہے جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔ میرے نزدیک فتویٰ کے لئے یہی قول مختار ہے۔ احناف میں سے امام غماوی کا بھی یہی قول ہے لیکن امام صاحب کا قول سجدہ کے وجوب کا ہے اور ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ ص میں سجدہ کیا (5)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے ابوسعید کی حدیث میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ ص میں سجدہ کیا۔ اس حدیث کو غماوی ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سورہ ص میں سجدہ کیا (6)۔

سائب بن یزید سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی تو آپ نے سورہ ص میں تلاوت فرمائی اور اس میں سجدہ تلاوت کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک شخص نے کہا اے امیر المؤمنین کیا یہ سجدہ واجب سجدوں میں سے ہے؟ حضرت عمر نے حجر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سجدہ کرتے تھے (7) ابو مریم سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر شام پہنچے تو داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ میں آئے اور نماز ادا فرمائی اور اس میں سورہ ص تلاوت کی۔ جب آیت سجدہ پر پہنچے تو سجدہ کیا (8)۔ ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ ص میں سجدہ تلاوت ادا فرمایا اور فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور

- 1- جامع ترمذی، حدیث: 577 (دارالحدیث)
 2- صحیح بخاری، حدیث: 3240 (ابن کثیر)
 3- صحیح بخاری، حدیث: 3239 (ابن کثیر)
 4- سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 408 (الحسان)
 5- سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 406 (الحسان)
 6- سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 319 (الکفر)
 7- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 572 (العلوی)
 8- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 572 (العلوی)

احاطہ تحریر سے وراء ہے اور جو کمال اور قدر و منزلت کمال ندامت اور انتہائی توبہ و استغفار کی وجہ سے نصیب ہوا اگر ان سے یہ تفسیر نہ ہوئی تو انہیں حاصل نہ ہوتا۔ بعض علماء نے ذلفی کا معنی دنیا میں خیر اور قدر کی زیادتی کیا ہے۔ حسن مآب کا معنی حسن مرجع اور آخرت میں بہتر انجام ہے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ جو روایت کیا گیا ہے آپ نے اور یا کو بار بار جنگ میں بھیجا تھا کہ وہ قتل ہو جائے اور پھر اس کی بیوی سے نکاح کر لیں۔ یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ شان نبوت اس قسم کے الزامات سے بہت بلند ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ تو صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ نے خواہش کی ایک ایسی چیز کی جو آپ کے پاس نہیں تھی، جب کہ آپ کے پاس اس جیسی ننانوے چیزیں موجود تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے اس فیصلہ کے ذریعے آپ کو اس خواہش پر سمیٹ فرمادی کہ یہ آپ کی شایاں شان نہیں ہے تو اب آپ نے فوراً توبہ و استغفار کیا اور اس خواہش سے رجوع کر لیا۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو تاکہ میں اس سے نکاح کر لوں اور یہ اس دور میں ایک عام رواج اور معمول تھا اور ہمدردی کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا جس طرح کہ انصار نے مہاجرین سے اس قسم کا حسن سلوک پیش کیا تھا۔ اتفاقاً حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اور یا کی بیوی پر پڑی تو وہ انہیں اچھی لگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اور یا سے رواج کے مطابق اسے طلاق دینے کی فرمائش کی تو وہ حیا کی وجہ سے آپ کی بات کو رد نہ کر سکا۔ اس نے اسے طلاق دے دی اور پھر داؤد علیہ السلام نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

میں کہتا ہوں داؤد علیہ السلام نے وہ عمل نہ کیا جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ جب حضرت زینب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آئیں تو آپ نے ان کے خاندان حضرت زید سے فرمایا اَسْبَغْتُ عَلَيْكَ ذُوْجَكَ وَ اَتَيْتُ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو) تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا پھر داؤد علیہ السلام نے استغفار کیا اور رجوع فرمایا۔ قرآن کے الفاظ بھی اسی روایت کے مؤید ہیں کیونکہ مدنی نے یہی کہا تھا کہ یہ کہتا ہے اَلْفُلْفُلِيْنَ مَا وَ عَرَّ اُنِيْ فِي الْغُضَّابِ ۝ مدنی نے تو یہ نہیں کہا کہ یہ میرے قتل کا ارادہ کرتا ہے اور داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کرتے ہوئے بھی صرف اتنا کہا تھا کہ لَنْكُنَّ كَلْكَلِكَ بِسُوْاْلِ تَهْتَبِيْكَ اِنِّيْ نَحَاجُہٗ (جنگ اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دینی کو اپنی دنیوں میں ملا دے)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی تو آپ تیس سال اپنی خطا پر روتے رہے اور دن رات آپ کے آنسو بہتے رہتے تھے اور جب آپ سے خطا سر زد ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ستر سال تھی۔ اس خطا کے بعد آپ نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک دن بنی اسرائیل کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ایک دن اہل و عیال میں گذرتے اور ایک دن جنگوں اور پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و شاکر کرتے اور ایک دن اپنے گھر میں خلوت میں چلے جاتے۔ آپ کے گھر میں چار ہزار عبادت کی جگہیں تھیں۔ اس میں راہب لوگ جمع ہوتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ اپنے اوپر روتے اور لوگ بھی آپ کے ساتھ روتے پھر جب باہر جانے کا دن ہوتا تو آپ جنگوں میں نکل جاتے اور بلند آواز سے ایک خاصے میں روتے۔ جب آپ روتے تو پہاڑ چٹخراںوں پر پتہ سے سب آپ کے ساتھ روتے حتیٰ کہ ان کے آنسوؤں سے ادایاں بہنے لگتیں پھر آپ ساحل

سمندر پر آتے یہاں بھی بلند آواز سے ایک مخصوص انداز میں روتے۔ آپ روتے تو سمندر کی کھچھیاں سمندری جانور پرندے اور درندے سب آپ کے ساتھ روتے پھر جب شام ہو جاتی تو واپس تشریف لاتے اور جب اپنے نفس کی خطا پر رونے کا دن ہوتا تو ایک نرا کرنے والا ندا دیتا کہ آج داؤد علیہ السلام کے رونے کا دن ہے پس ان کے معاونین حاضر ہو جائیں۔ آپ اپنے اس عبادت خانہ میں داخل ہو جاتے جس میں بہت سی عبادت کی جگہیں بنی ہوئی تھیں پھر آپ بوریا کے تین فرش بچھاتے جن کے اندر بھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ آپ ان کے اوپر بیٹھتے وہاں آپ کے پاس چار ہزار راب آتے جن کے سروں پر ٹوئیاں ہوتی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں لاشعیاں ہوتی تھیں وہ ان عبادت کی مخصوص جگہوں میں بیٹھ جاتے تھے پھر داؤد علیہ السلام بلند آواز سے روتے اور اپنے نفس پر فوج کرتے۔ درہلش اور صوفیاء جو آپ کی مجلس میں ہوتے وہ بھی آپ کے ساتھ بلند آواز سے روتے تھے اور وہ متواتر روتے رہتے تھے حتیٰ کہ فرش ان کے آنسوؤں میں ڈوب جاتا تھا اور داؤد علیہ السلام سرگ کے پتے کی طرح اس میں گر پڑتے اور نکل کی طرح بھڑکتے رہتے پھر آپ کے بیٹے حضرت سلیمان آتے اور آپ کو اٹھالیٹے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان آنسوؤں کے پانی سے چلو بھر کر اپنے منہ پر ملتے تھے اور دعا کرتے اے میرے پاپہار مجھے معاف کر دے۔ اگر داؤد علیہ السلام کے رونے کا تمام دنیا کے لوگوں کے رونے کا موازنہ کیا جائے تو برابر ہوگا۔ وہب فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا سر بھی اوپر نہ اٹھایا حتیٰ کہ فرشتے نے یہ مژدہ سنایا۔ آپ کے معاملہ کی ابتدا لغزش ہے اور اس کا آخر مغفرت ہے، سر اٹھائے اس وقت آپ نے سر اوپر اٹھایا پھر بھی بعد کی پوری زندگی بھی پانی نہ پیا گرامں میں آپ کے آنسو ملے ہوتے تھے کبھی کوئی کھانا تناول نہیں فرمایا مگر اس میں آپ کے آنسوؤں کی آمیزش ہوتی (1)۔

اوزامی نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی آنکھیں مشکیزوں کی طرح تھیں جن سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا تھا اور آپ کے چہرے پر آنسوؤں کی وجہ سے اس طرح گڑھے پڑ گئے تھے جس طرح زمین میں پانی کے چلنے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں (2) وہب کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو عرض کی یارب تو نے مجھے بخش دیا لیکن میں کیسے اپنی خطائیں بھولوں گا پس میں اپنے لئے اور تمام خطاکاروں کے لئے قیامت تک معافی مانگتا رہوں گا۔ وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کی خطا کو آپ کے دائیں ہاتھ میں کندہ فرمایا تھا جب بھی آپ کھانے یا پینے کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو اسے دیکھ کر رونے لگ جاتے۔ جب لوگوں کو خطاب فرماتے تو اپنے لئے معافی مانگنے سے پہلے دوسرے خطاکاروں کے لئے معافی مانگتے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام میں خطا کے بعد ہمیشہ خطاکاروں کے پاس بیٹھتے تھے۔ آپ ان لوگوں کو بلا تے اور کہتے خطا کار داؤد کے پاس آؤ آپ پانی بھی پیتے تو اپنے آنسو ملا کر پیتے اور جوئی تنگ روئی پر آنسو بہاتے رہتے حتیٰ کہ وہ تر ہو جاتی پھر اس پر تنگ اور راکھ چھڑک کر تناول فرماتے تھے اور کہتے یہ خطاکاروں کا کھانا ہے۔ وہب فرماتے ہیں خطا سے پہلے داؤد علیہ السلام نصف رات قیام کرتے اور ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔ جب یہ خطا سرزد ہوئی تو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور ساری رات قیام فرماتے تھے (3)۔ ثابت فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عقاب (سزا) کو یاد کرتے تو آپ کے اعضاء اتر جاتے تھے پھر ان کو کسی بندھن کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور جب اللہ کی رحمت کو یاد کرتے تو اعضاء اپنی جگہ درست ہو جاتے تھے۔ آپ کے واقعہ میں یہ بھی ذکر ہے کہ پہلے وحشی اور پرندے آپ کی تلاوت سنتے تھے پھر جب آپ سے تقصیر ہوئی تو وہ

آپ کی تلاوت نہیں سنتے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ ان وحشیوں اور پرندوں نے کہا اے داؤد! آپ کی خطانے آپ کی آواز کی مناس کو ختم کر دیا ہے۔ (1)۔

يٰۤاٰدَمُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ حَلِيفَةً فِى الْاَرْضِ فَاَحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ
الْبُهْوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَصُوْنُوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗنَّ
عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۱۱

”اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو (اپنا) نائب زمین میں پس آپ فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے بیٹک جو لوگ بھٹک جاتے ہیں راہ خدا سے ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انہوں نے بھلا دیا تھا یوم حساب کو۔“

۱۔ یٰۤاٰدَمُ سے پہلے قلنا محض دوسے اور یہ فغفرنا لہ پر معطوف ہے، یعنی اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا یا یعنی کہ ہم نے آپ کو پہلے انبیاء کرام کا نائب اور خلیفہ (۱) بنایا۔ فاحکم پر فاء سببیہ ہے۔ بالحق سے مراد اللہ کے حکم سے ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِمْ كَمَا عَظَّمَ فَاَحْكُم پر ہے۔ لِيُضِلَّكَ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منسوب ہے۔ سبیل اللہ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبوت پر قائم فرمائے ہیں۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ جو خواہشات نفس کا پیرو کار ہوتا ہے اس کی رائے صائب نہیں ہوتی اور وہ اپنے اجتہاد میں ٹھوکر کھا جاتا ہے جیسا کہ وہ بہتر فرقتے ہیں جو اسلام کے مدعی ہیں اور راہ خدا سے بھٹکنے والوں کے لئے سخت عذاب اس لئے ہے کیونکہ وہ یوم حساب کو بھول گئے ہیں۔ اس دن کی یاد راہ حق کو لازم پکڑنے اور خواہشات نفس کی مخالفت کا تقاضا کرتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اٰتٰى كَاجْمَلَةٍ جملہ مستفاد ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّاۤ اِلَّا لِيُذَكَّرُوْا
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ النَّارِ ۝۱۲

1۔ تفسیر بنوی، جلد 4، صفحہ 601 (القر)

(۱) حضرت عمر بن خطاب نے حضرت طلحہ زبیر کعب اور سلمان رضی اللہ عنہم سے پوچھا خلیفہ اور بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے کہا ہم نہیں جانتے۔ حضرت سلمان نے کہا خلیفہ وہ ہے جو رحمت سے عدل کرتا ہے، ان میں مال تقسیم کرتا ہے اور راہی راہ عایا میں اس طرح ہرمان ہوتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر ہرمان ہوتا ہے اور اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتا ہے حضرت کعب نے فرمایا میرا تو خیال تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا فرق نہ جانتا ہوگا۔ حضرت سلمان سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے پوچھا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ حضرت سلمان نے فرمایا اگر تم مسلمان کی زمین ایک درہم یا اس سے کم شدت لے کر غیر مستحق کو دیتے ہو تو تم بادشاہ ہو خلیفہ نہیں ہو۔ حضرت عمر نے اس جملہ سے عبرت حاصل کی۔ مسلمان بن جو عا سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا مجھے معلوم نہیں میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ ایک شخص نے کہا اے امیر المؤمنین ان دونوں میں فرق ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو لیتا ہے تو حق و انصاف سے لیتا ہے اور اسے خرچ بھی صحیح جگہ پر کرتا ہے اور آپ اللہ کے فضل و احسان سے ایسا ہی کرتے ہیں اور بادشاہ وہ ہوتا ہے جو لوگوں پر ظلم و ستم کرتا ہے، اس سے لیتا ہے اس کو دیتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر خاموش ہو گئے۔ حضرت معاویہ جب منبر پر بیٹھے تو یہ ارشاد فرماتے اے لوگو! خلافت مال بیع کرنے اور تقسیم کرنے کا نام نہیں بلکہ خلافت تو حق کے ساتھ عمل کرنے سے حاصل ہے اور تقسیم کرنے اور حکم الہی کے مطابق لوگوں کا مواخذہ کرنے کا نام ہے (از علامہ شامہ اللہ پالی پٹی)

”اور زمین پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو جو کچھ ان کے درمیان ہے بے فائدہ ہے۔ یہ تو کفار کا گمان ہے۔ پس بر باد رہے کفار کے لیے آگ کے عذاب سے۔“

۱۔ پانچواں سے مراد ایسا کام ہے جس میں کوئی حکمت نہ ہو یا پانچواں ذوی باطل کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور بے حکمت کے نہیں فرمائی۔ یا معنی کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور عبث نہیں کی یا یہ مفہوم ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق اس باطل کے لئے نہیں کی جو خواہشات کی پیروی کرتا ہے بلکہ ہم نے اس کی تخلیق اس حق کے لئے کی ہے جو صانع کے وجود کا استدلال ہے۔ اس کے اوامر کی پیروی اور منہیات سے اجتناب کر کے اس کی نعمتوں کا شکر کرنا ہے۔ یہ جملہ مترضہ ہے۔

۲۔ یہ کفار کا گمان ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق عبث اور حکمت سے خالی ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے ہیں اور اطاعت گزار کے ثواب اور گناہگار کے عذاب کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا یہ انکار اس بات کا شخصی ہے کہ نظام عالم کی رنگینیاں عبث اور بے مقصد ہیں۔ ۳۔ ویل پر جو توحینِ تقدیم کے لئے ہے اور فناءِ سمیت کے لئے ہے۔ کفار کی مذمت اور برائی بیان کرنے کے لئے ضمیر کی جگہ پھر اس ظاہر اَلَّذِينَ كَفَرُوا اُكُوْرُوْا ذِكْرًا مَّا لَمْ يَنْفَعُوْا مِنْهُ شَيْئًا

اَمْ رَجَعَلِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۗ اَمْ هُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

”کیا ہم بتادیں گے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بتادیں گے پرہیزگاروں کو کفاروں کی طرح۔“

۱۔ ام منقطع بمعنی بل ہے اور ہمزہ دونوں فریقوں، یعنی نیکو کاروں اور فسادوں کے درمیان برابری کے انکار کے لئے ہے جو برابری زمین و آسمان کی تخلیق کے بے فائدہ ہونے کے لوازم میں سے ہے۔ یہ اسلوب استقہام اس لئے اپنایا تاکہ اس برابری کے تصور کی نفی ہو جائے۔ کفار جو گمان کرتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بے مقصد ہے ان کی اس لاپرواہی یا توں سے اعراض کے لئے ام بمعنی بل ذکر فرمایا۔ دوسرا ام بھی منقطع بمعنی بل ہے۔ پہلے مؤمنین اور کفار کے درمیان برابری پر انکار کیا پھر مؤمنین میں سے متقین اور مجرمین کے درمیان برابری پر انکار فرمایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دوسرا انکار پہلے انکار کے لئے ہو گا آخری دو وصف بھی حکیم ذات کے نزدیک برابری کا تقاضا نہیں کرتے تو پھر پہلے دو گروہوں کے درمیان برابری کا سلوک کیسے ہو گا؟ یہ آیت کریمہ ایک عقلمند دلیل ہے جو حشر کے وقوع کے وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ دنیا میں تو ان دونوں فریقوں کے درمیان عمومی طور پر کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ دنیا میں تو معاملہ الٹ ہے کہ مؤمنین کی حیثیت کا فر زیادہ عمدہ عیش و آسائش میں ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کوئی دوسرا موقع عمل ایسا ہونا چاہیے جہاں متقین کو اپنے اچھے اعمال کا نیک صلہ ملے اور کفار اور بدکار لوگوں کو اپنے کفر اور بد اعمالیوں کی سزا ملے۔

مقابل فرماتے ہیں کفار فریض کہا کرتے تھے کہ ہمیں آخرت میں اسی طرح خیرات و برکات میسر ہوں گی جیسے تمہیں میسر ہوں گی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْمُنَافِقَةُ ۗ وَلِلْمُنَافِقِمْ اَجْرٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَلَا يَأْتِيهِمْ سَاعَةٌ يَّجْعَلُوْنَ فِيْهَا مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا ۗ وَهُمْ فِيْ سَوَاءٍ سَآوٍ ۗ

”یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدریک کریں اسکی آیتوں میں لہ اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقلمند۔“

لے کثیبت سے مراد قرآن کریم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ هذا القرآن کی خبر ہے تقدیر عمارت اس طرح ہوگی هذا القرآن کثیبت من اللہ، یعنی یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک کتاب ہے۔ مبارک یعنی بڑی بابرکت اور نفع بخش ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اسے محبوب تم اور تمہاری امت کے علماء اس میں غور و فکر کرو تاکہ اس کے ظاہری مفہوم اور صحیح تاویلات کو پہچان لو اور معانی مستنبطہ کی معرفت حاصل کر لو یا یہ معنی کہ ہر وہ شخص جسے عقل کی دولت و نعمت سے نوازا گیا ہے وہ اس میں غور و فکر کرے تاکہ وہ جان لے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے، کسی بشر کا ایسی کام پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں تدریبات سے مراد آیات کی اتباع کرنا ہے۔

لے دوسرا مقصد اس کتاب کے نزول کا یہ ہے کہ عقول سلیمہ رکھنے والے اس سے نصیحت حاصل کریں یا یہ معنی کہ صاحب عقل لوگوں کے ذہنوں میں معرفت الہی اور حاصل کرنے کی جوتوت اور استعداد و ودیعت کی گئی ہے اس کے ذریعے وہ معرفت حاصل کریں، جس معرفت پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں کیونکہ سب الہی اس چیز کو بیان کرتی ہیں جو صرف شریعت سے معلوم ہوتی ہے نیز کتب سماویہ اس چیز کی طرف رہنمائی کرتی ہیں عقل خود جس کے حصول پر قادر نہیں ہوتی شاید تدریجاً پہلے معلوم کرنے لے ہو اور تدریجاً دوسرے معلوم کرنے لے ہو۔

وَوَهَبْنَا لِمَا يَأْتِيهِمْ آيَاتِنَا أَنْبَاءً مِّنْ نَّبَاتٍ

”اور ہم نے عطا فرمایا اور دوکوسلیمان (جیسا فرزند) بڑی خوبیوں والا بندہ بہت رجوع کرنے والا۔“

لے وَهَبْنَا کا عطف ففعو نا پر ہے اور ان کے درمیان جملے متر سے ہیں۔ العبد سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ آيَاتِنَا آيَاتِ كِتَابِ كَامِلَةٍ آپ کی تعریف کی علت اور وجہ بیان کر رہا ہے۔ آپ اللہ کی بارگاہ میں بہت زیادہ توجہ کرنے والے تھے یا تسبیح کی صورت میں بہت زیادہ اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے اس لئے آپ کی صفت آيَاتِ كِتَابِ كَامِلَةٍ ذکر فرمائی۔

إِذْ عَرَضَ عَلَيْهَا بِالْعِشِيِّ الضُّفَيْتِ الْجِيَادُ ۝

”جب پیش کئے گئے آپ پر سر پہر کو تین پاؤں پر کھڑے ہونے والے تیز رفتار گھوڑے۔“

لے اذ عرَضَ ہے آيَاتِ كِتَابِ كَامِلَةٍ کی اور ضمیر کا مرجع حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ عشی سے مراد ظہر کے بعد کا وقت ہے۔ صافن اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو تین قدموں پر کھڑا ہوتا ہے اور چوتھے قدم کے ہم کنارہ زمین پر ٹیکتا ہے۔ یہ عمل گھوڑے کی خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیاد جمع ہے جواد یا جود کی اور اس سے مراد تیز رفتار گھوڑا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جیاد جید کی جمع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد سہقت لے جانے والے گھوڑے ہیں (۱) بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے صفوں اور جودۃ دونوں صفات کو بیان فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں ٹھہرنے اور چلنے کے دونوں اوصاف جمع تھے، یعنی جب وہ کھڑے ہوتے ہیں تو اپنی تنگیوں پر بڑے سکون سے کھڑے ہوتے ہیں اور جب دوڑتے ہیں تو برق رفتاری سے دوڑتے ہیں یہی کہتے ہیں حضرت سلیمان نے اہل دمشق اور نصیبین سے جنگ کی تھی اور وہاں سے انہیں ہزار گھوڑے لے گئے۔ متقال فرماتے ہیں حضرت سلیمان کو اپنے والد ماجد

کو میرے پاس واپس لاؤ تو گھوڑے پیش کئے گئے۔ طفق بمعنی اخذ ہے اور اس کا عطف قال ردوہا پر ہے۔ مسحا یمسح کا مصدر ہے۔ یعنی یمسح السیف مسحا یعنی تلواریں کے ساتھ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے لگے اور یہ عربوں کے قول مسح علاوہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اس کی گردن کاٹ دی۔ ابن عباس، حسن، قتادہ، مقاتل اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر نے ابن جریج کے حوالہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ ان کی پنڈلیاں کاٹ دیں (1) بطرانی نے الاوسط میں، اسامیل نے اپنی معجم میں اور ابن مردودہ نے حسن سند کے ساتھ ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دیں (2) اور آپ کا یہ فعل اللہ کے حکم سے ذکر الہی سے غفلت پر توبہ کے طور پر تھا اور رضا الہی کے قرب کے حصول کے لئے تھا۔ حسن فرماتے ہیں جب آپ نے گھوڑوں کو مار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نعم البدل عطا فرمایا اور وہ ہوا حتی جو آپ کے حکم سے چلتی تھی (3) بعض مفسرین فرماتے ہیں آپ نے گھوڑوں کو ذبح کیا اور پھر ان کا گوشت صدقہ کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گھوڑوں کا گوشت حلال تھا جس طرح ہماری شریعت میں بھی جمہور علماء کے نزدیک گھوڑوں کا گوشت حلال ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت مکرمہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے ان گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے مخصوص فرمایا اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر داغ لگا دیئے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حکایت ہے کہ آپ نے مُرَدَّةً حَائِلَةً کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کو واپس لاؤ۔ فرشتے سورج کو واپس لائے حتی کہ آپ نے عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے پاس خدا میں جہاد کے لئے گھوڑے پیش ہوتے رہے حتی کہ سورج غروب ہو گیا (4)۔ زہری اور ابن کثیر فرماتے ہیں آپ گھوڑوں سے محبت اور ان سے شفقت و پیاری کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں سے اپنے ہاتھ کے ساتھ غبار جھاڑ رہے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ قول ضعیف ہے اور مشہور پہلا قول ہے (5) میں کہتا ہوں اس قول کا رد حضرت سلیمان علیہ السلام کے قول اِنِّیْ اُحِبُّنَّ حَبَّ الْفَخِیْرِ عَنِ ذِکْرِ رَبِّیْ حَتّٰی تَوَاذَّتْ بِالْحِجَابِ سے بھی ہو جاتا ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاٰلَہٗٓٓٔ عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا مِّمَّا اَنْتَابُ ﴿۳۱﴾

”اور ہم نے فتنہ میں ڈالا سلیمان (علیہ السلام) کو اور ڈال دیا ان کے تحت پر ایک بے جان جسم پھروہ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے۔“

یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور وہ بنا پر اس کا عطف ہے۔ فتننا کا معنی اختبرنا اور ابتلینا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات ننانوے عورتوں سے صحبت کروں گا (ایک روایت میں سو عورتوں کا ذکر ہے) اور ہر ایک سے شہسوار پیدا ہوگا جو راہ خدا میں جہاد کرے گا فرشتے نے کہا ان شاء اللہ کبڈ آپ نے یہ نہ کہا اور بھول گئے۔ آپ نے عورتوں سے صحبت کی لیکن ایک عورت کے سوا کوئی بھی عامل نہ ہوئی اور اس سے بھی

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 579 (اعلیٰ)

2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 580 (اعلیٰ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (المنکر)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 604 (المنکر)

5۔ مشکوٰۃ المصابیح، حدیث 5720 (المنکر)

ایک اور راوی بھی ہے ابو اسحاق۔ تم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو سب راہ خدا کے عاجز اور شہسوار ہوتے (بخاری مسلم (1) بعض علماء نے لکھا ہے کہ راوی نے وہ اور حورآب آپ کی کرسی پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ ذَا الَّذِي اَعْلَىٰ مَن وَبَيْنَهُمْ جَسَدًا كَالْبهي مضموم ہے۔ تم اناب کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے آئندہ ان شاء اللہ چھوڑنے سے رجوع کر لیا۔ طاؤس نے تم اناب کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ یہ تاویل تمام اقوال سے بہتر ہے کیونکہ اس کو صحیحین کی حدیث کی تقویت و تائید حاصل ہے اور اس تاویل میں انبیاء کرام کی تقدیس کا پہلو بھی ہے کیونکہ جسداں جسم کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو تو اس تاویل پر جسداں کا مفہوم صادق آتا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو جنوں نے کہا اگر یہ بچہ زندہ رہا تو ہم اس جبری مشقت اور فرائز واداری سے کبھی فارغ نہ ہوں گے پس ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں یا اسے دیوانہ بنا دیں۔ حضرت سلیمان کو جب جنوں کی اس سازش کا علم ہوا تو آپ نے شیطانوں کے خوف سے اسے بادل میں چھپا دیا پھر آپ کو اس کا کچھ علم نہ تھا حتیٰ کہ وہ مردہ حالت میں آپ کی کرسی پر گر پڑا۔ یہ سب کچھ اس الغرض پر تمہیدی کساپ نے اپنے رب پر بھروسہ کیوں نہیں کیا۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان نے سنا کہ سمندر کے جزیرہ میں ایک شہر ہے جس کا نام میدون ہے اور اس کا ایک عظیم الشان بادشاہ ہے چونکہ وہ سمندر کے جزیرہ میں رہتا ہے کوئی شخص اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو ایسی سلطنت اور بادشاہی عطا فرمائی تھی کہ بحر و بر کی کوئی چیز ان کے سامنے رکاوٹ نہ تھی۔ آپ ہوا پر سوار ہوئے اور ہوا پانی کے اوپر سے آپ کو اٹھا کر لے گئی تھی کساپ جن دنوں کے لشکر سمیت اس جزیرہ میں اتارے اور اس بادشاہ کو قتل کر دیا اور جو کچھ مال و متاع تھا سب پر قبضہ کر لیا۔ اس مال غنیمت میں آپ کو اس بادشاہ کی جرارہ نامی لڑکی بھی ملی تھی جو بڑی حسین و جمیل تھی۔ حضرت سلیمان نے اس کا اپنے لئے انتخاب فرمایا اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس عورت نے بادل نخواستہ اسلام قبول کر لیا۔ حضرت سلیمان اس سے انتہائی محبت فرماتے تھے ایسی محبت آپ دوسری عورتوں سے نہیں کرتے تھے۔ اس عورت کا آپ کے نزدیک ہر مقام و مرتبہ تھا لیکن وہ ہمیشہ مضموم رہتی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو نکلنے لگے رہتے تھے۔ حضرت سلیمان پر اس کی یہ کیفیت بہت گراں تھی۔ آپ نے پوچھا ایسا وجہ ہے تو ہر وقت غمگین رہتی ہے اور تیرے آنسو رکتے ہی نہیں ہیں۔ اس لڑکی نے کہا مجھے اپنے باپ کی یاد دلاتی ہے کبھی مجھے اس کا ملک یاد آتا ہے کبھی اس پر ٹوٹنے والی مصیبت یاد آتی ہے اس لئے میں ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھے اس سے بہتر ملک عطا فرمایا ہے، اس سے بڑی سلطنت عطا کی ہے، اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اور یہ نعمت سب نعمتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ کہنے لگی ہات بالکل اسی طرح ہے لیکن میں جب اپنے باپ کو یاد کرتی ہوں تو میری یہی کیفیت ہو جاتی ہے جو تیرے سامنے ہے اگر آپ جنوں کو حکم فرمائیں اور وہ میرے گھر میں میرے والد کی ایک مورتی بنادیں اور صبح و شام اس کو دیکھا کروں تو شاید میرا غم ہلکا ہو جائے اور مجھے کچھ تسلی ہو جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو حکم فرمایا کہ اس کے لئے گھر میں اس کے باپ کی مورتی بنا دو حتیٰ کہ وہ اس کے باپ کی عین تشریح ہو، کچھ فرق محسوس نہ ہو۔ جنوں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے اس کے باپ کا بت بنا دیا۔ اس نے دیکھا کہ بالکل اس کا باپ ہے مگر اس میں صرف روح نہیں ہے۔ اس

عورت نے اس مورتی کو ویسا لباس پہنا دیا جو اس کا باپ زندگی میں پہنا کرتا تھا پھر جب حضرت سلیمان گھر سے نکل جاتے تو صبح شام وہ اپنی خادماؤں کے جلوس میں اس مورتی کے پاس جاتی اور اسے سجدہ کرتی۔ خادما میں بھی سجدہ کرتیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چالیس دنوں تک اس واقعہ کا علم نہ ہوا۔ جب آصف بن برخیا کو اس کی خبر پہنچی جو ایک چنانچا انسان تھا اور اس کے لئے حضرت سلیمان کے دروازے پر کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی جس وقت حضرت سلیمان کے گھر آنا چاہتا آسکتا تھا خواہ حضرت سلیمان گھر میں ہوں یا نہ ہوں وہ آیا اور اس نے عرض کی اے اللہ کے نبی میری عمر بڑی ہو گئی ہے، میری بیڈیاں نرم پڑ گئی ہیں اور میری عمر ختم ہونے والی ہے میرے جانے کا وقت قریب ہے۔ میں اس چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک جگہ کھڑے ہو کر گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ کروں اور اپنے علم کے مطابق ان کی تعریف کروں اور لوگوں کو ان کی وہ باتیں بتاؤں جن سے وہ غافل ہیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا ایسا کرو اجازت ہے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کیا اور آصف بن برخیا بحیثیت خطیب کھڑے ہو گئے انہوں نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا اور ہر نبی میں سچ جو خوبیاں تھیں اور اللہ نے جو فضیلت عطا فرمائی تھی سب کو بیان کیا حتیٰ کہ سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ تک پہنچے اس نے کہا اے سلیمان تم بچپن میں بوئے حلیم الطبع تھے، انتہائی نیکو کار اور متقی تھے، انتہائی انصاف کے ساتھ فیصلے فرماتے تھے اور ہر ناپسندیدہ کام سے پرہیز کرتے تھے۔ آپ کے بچپن اور چھوٹی عمر کا تذکرہ کر کے خاموش ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس بات پر بہت غصہ آیا حتیٰ کہ آپ غصے سے بھر گئے۔ جب سلیمان علیہ السلام گھر گئے تو آصف کو بلا کر فرمایا آصف! تو نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا، تو نے ان کے ہر زمانہ کی تعریف اور ان کے ہر حال کو بیان کیا لیکن میرا ذکر تو نے صرف بچپن کے زمانہ کے ساتھ کیا اور پھر تو خاموش ہو گیا میری بعد کی زندگی کا تو نے ذکر نہیں کیا بعد میں میری زندگی میں کیا واقعہ ہوا ہے آصف نے کہا ایک عورت کی خواہش پر چالیس دنوں سے تمہارے گھر میں غیر اللہ کی عبادت ہو رہی ہے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا میرے گھر میں۔ آصف نے کہا ہاں جناب کے گھر میں۔ حضرت سلیمان نے کہا انا لله وانا الیہ راجعون یقیناً اب میں سمجھ گیا ہوں آپ نے جو کہا وہ کسی ایسی خبر کی وجہ سے کہا تھا جو تجھے پہنچ چکی تھی۔ حضرت سلیمان اپنے گھر کی طرف پلٹے اور وہ بت توڑ دیا اور اس عورت کو اور ان کی لوٹریوں کو سزا دی پھر پاک کپڑے لانے کا حکم دیا۔ آپ کے پاس ایسے کپڑے لائے گئے جن کے سوت کو نا باغذ عورتوں نے کا تھا، نا باغذ عورتوں نے ہی بنا تھا اور ان کو دھوئی بھی نا باغذ عورتیں تھی، ان کو کسی نا باغذ عورت نے چھوا نہیں تھا پھر آپ وہ کپڑے پہن کر کمرہ میں اکیلے نکل گئے اور وہاں آپ نے راکھ کا فرش بچھانے کا حکم دیا پھر آپ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنے لگے، اسی راکھ پر بیٹھ گئے اور کپڑوں کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کرنے کے لئے راکھ پر لوٹنے لگے اور ان کے گھر میں جو کچھ غیر اللہ کی عبادت ہوتی تھی اس پر رونے لگے اور مغفرت طلب کرنے لگے۔ آپ اسی آدھو کا کی کیفیت میں شام تک رہے اور پھر واپس گھر تشریف لائے۔

آپ کی ایک ام ولد لوٹری تھی جس کا نام امینہ تھا۔ جب آپ قصائے حاجت یا کسی بیوی سے صحبت کے لئے جاتے تو اپنی انگوٹھی اسی لوٹری کے پاس رکھ جاتے۔ آپ کے غسل کرنے سے پہلے تک وہ انگوٹھی اس لوٹری کے پاس رہتی۔ آپ اس انگوٹھی کو ہمیشہ طہارت کی حالت میں چھوتے تھے اور آپ کی حکومت اسی انگوٹھی کی وجہ سے تھی ایک دن اس انگوٹھی کو امینہ کے پاس رکھ کر بیت الخلا میں چلے گئے۔ سمندری جن اس لوٹری کے پاس آیا جس کا نام صخر تھا وہ بالکل حضرت سلیمان کی شکل میں آیا تھا، کچھ فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس جن نے امینہ سے کہا میری انگوٹھی مجھے دو امینہ نے وہ انگوٹھی اسے دے دی وہ اسے پہن کر باہر نکلا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تحت پر جا کر بیٹھ

گیا۔ سب پرندے جن اور انسان اس کے حکم کے پابند ہو گئے۔ حضرت سلیمان امینہ کے پاس آئے تو آپ کی حالت بدلی ہوئی تھی آپ نے فرمایا امینہ امیری انگوٹھی دو۔ اس نے کہا تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ امینہ نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سلیمان تو مجھ سے اپنی انگوٹھی لے کر اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان جان گئے کہ اس خطا کو کی وجہ سے گرفت ہو گئی ہے۔ آپ بنی اسرائیل کے گھروں کے دروازوں پر جاتے اور کہتے ہیں سلیمان بن داؤد ہوں لیکن وہ آپ پر مٹی پھینکتے اور برا بھلا کہتے اور کہتے دیکھو یہ جنوں ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟ کہتا ہے میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ جب سلیمان علیہ السلام نے معاشرہ کا یہ ناروا برتاؤ دیکھا تو آپ سمندر کی طرف نکل گئے۔ آپ چمھیروں کی چھیلیاں بازار میں لے آئے اور وہ آپ کو ہر روز دو چھیلیاں دیتے۔ جب شام ہوتی تو آپ ایک چھلی روٹیوں کے بدلے فروخت کر دیتے اور دوسری خود بھون لیتے۔ یہ سلسلہ چالیس دن تک جاری رہا۔ کیونکہ چالیس دن آپ کے گھر میں بت کی پوجا ہوتی رہی تھی۔ آصف بن برخیا اور علاء بنی اسرائیل نے ان چالیس دن میں اس اللہ کے دشمن شیطان کے احکام کو مجیب دیکھا۔ ایک دن آصف نے کہا بنی اسرائیل کیا تم ابن داؤد کے احکام مختلف دیکھتے ہو جیسے میں مختلف دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہم بھی ان کے احکام پہلے کی نسبت مختلف دیکھ رہے ہیں۔ آصف بن برخیا نے فرمایا میں ان کی بیویوں سے جا کر پوچھتا ہوں کیا ان کو بھی یہ تبدیلی محسوس ہو رہی ہے جیسا کہ ان کے عام امور میں ہم تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔ بیویوں کے پاس آصف بن برخیا نے اور ابن داؤد کے احکام میں تبدیلی کے متعلق پوچھا سب نے کہا ہم بہت زیادہ تبدیلی محسوس کر رہی ہیں۔ اب وہ جنس والی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتا اور غسل جنابت بھی نہیں کرتا۔ آصف بن برخیا نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو کھلی آزمائش ہے۔ پھر آصف بنی اسرائیل کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ خاص امور میں تبدیلی تو عام امور سے بھی زیادہ ہے۔ جب چالیس دن گزر گئے تو جن اپنی جگہ سے ازا اور سمندر کے پاس سے گزر اور وہ انگوٹھی سمندر میں پھینک دی۔ اس انگوٹھی کو ایک چھلی نے نگل لیا۔ پھر اس چھلی کو کسی شکاری نے کپڑا۔ اتفاق سے حضرت سلیمان اس دن اس شکاری کی مزدوری کرتے رہے شام کے وقت اس نے آپ کو دو چھیلیاں دیں جن میں ایک وہ چھلی تھی جس نے انگوٹھی نگلی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک چھلی روٹیوں کے عوض فروخت کر دی اور جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی اسے کاٹا تا کہ اس کو بھون لیں۔ آپ کو اس کے پیٹ سے انگوٹھی مل گئی آپ نے وہ چھلی لی اور اللہ کے حضور جمدہ میں گر گئے اس طرح پھر جن اور پرندے آپ کے ساتھ ہو گئے اور انسان بھی آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ بھگ گئے کہ جو کچھ ان کے گھر میں بت کی پوجا ہوتی تھی اسی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ آپ دوبارہ تخت شاہی پر متمکن ہو گئے اور اپنے گناہ کی توبہ کی پھر آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ سحر نامی جن کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ جنوں نے اسے تلاش کیا اور پکڑ کر آپ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک چٹان کو کاٹا اور پھر سحر کو اس میں داخل کیا پھر اس کے اوپر دوسری چٹان رکھ دی پھر لوہے اور تانبے کے ساتھ اسے مضبوطی سے باندھ دیا اور حکم دیا کہ اس کی حالت میں اسے سمندر میں پھینک دو۔ یہ واقعہ وہب نے بیان کیا ہے (۱)۔

سہی کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کا سبب یہ ہے کہ آپ کی سو بیویاں تھیں ان میں سے ایک کا نام جرادہ تھا۔ آپ سب عورتوں پر اسے ترجیح دیتے تھے اور اس پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے جب آپ قضاء حاجت کے لئے جاتے تو اس کے پاس اپنی انگوٹھی رکھ جاتے ایک دن جرادہ نے آپ کو کہا کہ میرے بھائی اور فلاں شخص کے درمیان ایک تنازعے میں جا رہے ہیں کہ

جب فیصلہ تمہارے پاس آئے تو فیصلہ میرے بھائی کے حق میں کر دینا۔ حضرت سلیمان نے کہا ٹھیک ہے ایسا کروں گا لیکن آپ نے ایسا کیا نہیں تھا، پس آپ اسی جواب کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کئے گئے تھے۔ آپ انگوٹھی جڑا وہ کوڈے کریت اللہاء میں گئے تو پیچھے سے شیطان آپ کی شکل میں آیا اور اس سے انگوٹھی لے گیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ آپ جب فارغ ہوئے اور اپنی بیوی سے انگوٹھی پوچھی تو اس نے کہا کیا تم وہ لے نہیں گئے ہو؟ حضرت سلیمان نے فرمایا نہیں۔ آپ اپنی جگہ چھوڑ گئے اور چالیس دن تک شیطان لوگوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ لوگ اس کے احکام کو مجب دیکھتے (لیکن بولنا کوئی نہیں تھا) ایک دن بنی اسرائیل کے قراء اور علماء جمع ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہم اس شخص کے احکام میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ اگر واقعی یہ سلیمان ہے تو پھر اس کی عقل ضائع ہو گئی ہے یہ سن کر عورتیں رونے لگیں۔ لوگ واپس آئے اور اسے ترجیح دیکھا ہوں سے دیکھنے لگے اور پھر تورات کھول کر پڑھنے لگے۔ وہ جن ان کے سامنے سے اڑا اور محل کی بالکنی میں جا بیٹھا۔ ابھی تک انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ پھر وہ اڑا اور سمندر پہنچ گیا وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی اور ایک پھلی نے نگل لی۔ حضرت سلیمان ایک شکاری کے پاس آئے، جبکہ آپ کو شہید بھوک لگی ہوئی تھی۔ آپ نے شکاری سے کہا نا طلب کیا اور اسے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا میں سلیمان ہوں۔ کسی شکاری نے آپ کے سر پر ڈنڈا مارا اور آپ کا سر زخمی کر دیا۔ آپ سمندر کے کنارے اپنے خون کو دھونے لگے دوسرے شکاریوں نے آپ کو مارنے والے شکاری کو ملامت کی اور آپ کو وہ چھپایا بھی دے دیں جو انہوں نے پہلے پکڑ رکھی تھیں۔ آپ نے ان دونوں کا پیٹ چاک کیا اور پھر ان کو دھوا شروع کیا۔ ایک پھلی کے پیٹ سے آپ کو اپنی انگوٹھی مل گئی۔ آپ نے وہ دو بین لئی اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی حکومت اور شان و شوکت واپس فرمادی۔ پرندے آپ کے اوپر گھومتے لگے لوگوں نے بھی آپ کو بچانا لیا کہ آپ سلیمان علیہ السلام ہیں اور جو کچھ وہ آپ سے اب تک سلوک روا رکھتے رہے اس پر معذرت کرنے لگے آپ نے فرمایا میں تم سے تمہارے عذر پر کوئی بات نہیں کرتا اور نہ تمہیں اپنے کئے پر ملامت کرتا ہوں یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا پھر آپ اپنے تخت حکومت پر تشریف لائے اور امور مملکت سنبھال لئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انگوٹھی لینے والے شیطان (جن) کو پکڑ کر لایا جائے۔ آپ نے اسے ایک لوہے کے صندوق میں بند کر دیا اور اوپر سے اسے تیل کر دیا اور اپنی مہر لگا دی پھر آپ نے حکم دیا کہ اسے اسی حالت میں سمندر میں پھینک دو وہ اب بھی اسی طرح زندہ ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا (1)۔

سعید بن مسیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام تین دن لوگوں سے چھپے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے سلیمان تم تین دن چھپے رہے اور میرے بندوں کے معاملات پر توجہ نہیں دی۔ پس اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ پھر انہوں نے بھی انگوٹھی اور شیطان کے انگوٹھی لینے کا واقعہ بیان کیا ہے جیسا کہ پیچھے ہم نے ذکر کیا ہے (2)۔ حسن فرماتے ہیں یہ شان الہی سے بعید ہے کہ وہ حضرت سلیمان (جبرئیل) کی عورتوں پر ایک شیطان کو مسلط کر دے (3)۔ (بنو کا کلام یہاں ختم ہوا)

عبد بن حمید نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے سدی سے نسائی اور ابن مردودہ نے ابن عباس سے یہ واقعہ وہب بن منبہ کی طرح روایت کیا ہے لیکن بعض طرق میں ہے کہ صحیح جن جب سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھا تو حضرت سلیمان اور آپ کی ازواج کے علاوہ ہر چیز میں اس کا حکم نافذ ہوا۔ اسی طرح پہلے علامہ بنوئی کے حوالے سے نقل ہو چکا ہے کہ حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی یہ

شایان شان نہیں کہ اس نے حضرت سلیمان کی ازواج پر شیطان کو مسلط کر دیا ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں انگوٹھی شیطان اور حضرت سلیمان کے گھر میں بت کا ہونا سب یہودی خرافات ہیں (اللہ ان پر لعنت کرے) علامہ بغوی لکھتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت سلیمان کی آزمائش شروع ہوئی تو آپ کی انگوٹھی ہاتھ سے گر گئی جس میں آپ کی حکومت کا دار و مدار تھا۔ حضرت سلیمان نے دوبارہ اس کو پہنا تو پھر وہ انگوٹھی حضرت سلیمان کو اس کے بار بار گرنے سے یقین ہو گیا کہ آزمائش شروع ہو گئی ہے۔ آصف بن برخیا آئے تو اس نے حضرت سلیمان کو کہا آپ اپنے گناہ کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے ہیں انگوٹھی چودہ دن تک آپ کے ہاتھ میں نہ ٹھہری پھر آپ اپنی سرانے میں چلے گئے آصف نے وہ انگوٹھی اٹھائی اور اپنے ہاتھ میں پہنی تو وہ نہ گری جس سے یہی مراد ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اَلْقَيْنَا عَلٰی كُرْسِيِّهِ جَسَدًا میں ذکر فرمایا ہے۔ پس آصف بن برخیا آپ کی سیرت کے مطابق چودہ دن تک آپ کی حکومت چلاتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو اس کی حکومت واپس فرمادی۔ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور انگوٹھی پہنی تو وہ نہ گری (۱)۔

میں کہتا ہوں وہب کی روایت کے اطلاق پر دلیل یہ بات ہے کہ اس روایت میں ہے کہ سمندر کے جزیرہ صیدون میں ایک عظیم الشان بادشاہ رہتا تھا اس پر آپ نے حملہ کیا تھا، جبکہ سمندر میں ہونے کی وجہ سے وہاں تک کوئی شخص پہنچ نہیں سکتا تھا۔ حضرت سلیمان اس شہر کی طرف نکلے، جبکہ ہوا آپ کو اٹھائے ہوئے تھی تو آپ ہوا کے ذریعے پانی کے اوپر سے گزر کر اپنے لشکر سمیت اس شہر میں جا اترے۔ جب قرآن صراحتاً کہہ رہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کی تخیر اس آزمائش اور رجوع کے بعد ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فسخرنا له الريح ليعبى فتداورا نابت کے بعد ہم نے اس کے لئے ہوا کو سخر کیا۔ اسی طرح آپ کی یہ دعاب ہب لی ملکا الخ بھی آزمائش کے بعد کی ہے۔

میں کہتا ہوں اس قصہ کو اگر صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو حضرت سلیمان سے عصیت کا صدور پھر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ صورتوں کا بنانا اس زمانہ میں جائز تھا اور آپ کو ان کے سجدہ کرنے کا علم نہیں تھا اس لئے ان کا یہ عمل آپ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَبْغِي ۗ لِي ۗ اَحَدٌ مِّنْ بَعْدِي ۗ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۱۰﴾

”عرض کی میرے رب! مجھے معاف فرما دے اور عطا فرما مجھے ایسی حکومت جو کسی کو میرے بعد نہ ہو۔ میرے بعد! بیشک تو ہی

بے انداز عطا کرنے والا ہے۔“

۱۔ انبیاء کرام اور صالحین کی سنت و عادت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے بادشاہی کا سوال کرنے سے پہلے استغفار کیا۔ نافع اور ابو عمر نے من بعدی کی یا کو کتخ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اس آیت کے سیاق سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش و ابتلاء دنیا و آخرت میں ان کو بلند درجات عطا کرنے کے لئے تھی جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش ان کو بلند مراتب عطا کرنے کے لئے تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے نہ کوئی لغزش ہوئی تھی اور نہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اگر کوئی گناہ سرزد ہوا ہوتا تو یہ دستاویز اور شرمندگی کے اظہار میں وہ انتہائی مبالغہ کرتے اور تو بہ و معفرت کے سوا کسی چیز کا سوال نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی اس طرح ہوتا فسخرنا له ذالک (ہم

نے اس کو بخش دیا جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا تھا۔

مقاتل ابن کیمان فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کسی کے لئے ایسی شاہی نہ ہو (1)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میرے سوا میرے دور میں کسی کو ایسی بادشاہی نہ ملے۔ جیسے یہ ارشاد ہے فَدَنَّا بِمَا كُنَّا بِنِعْمَةِ اللَّهِ عَظِيمًا، ابن ارباب فرماتے ہیں آپ کی طلب کی مراد یہ تھی کہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما کہ آخری عمر میں پھر مجھ سے جھینے نہ لے اور کسی غیر کو نہ عطا فرما دے (2) جیسا کہ پہلے تو نے مجھ سے جھین لی ہے، بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوال اس لئے کیا تھا تاکہ یہ بادشاہی ان کی نبوت کے لئے نشانی بن جائے اور ان کے لئے معجزہ ہو جائے۔ مقاتل فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام پہلے ہی بادشاہ تھے لیکن اس سوال سے وہ ہواؤں پر ندوں اور جنوں کی تسخیر چاہتے تھے۔ اس کی دلیل بعد والی آیات ہیں (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ رات ایک بہت بڑے جن نے تھوکا تاکہ میری نماز کو توڑ دے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمادی میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اس کو دیکھ لو (لیکن) مجھے اپنے بھائی (سلیمان علیہ السلام) کی دعا یاد آئی کہ رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَا يَنْبَغِيْ لِأَخِيذٍ مِنْهُ ۗ بَعْدِي اس لئے میں نے اسے دھکارتے ہوئے دہا پس لوٹا دیا۔ (تسبیح علیہ 4)

میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مراد یہ ہو کہ اسے ایسی حکومت نہ دینا جو میرا ہم مرتبہ ہو اور آپ کا یہ کہنا لوگوں پر اظہار شفقت کے لئے تھا، یعنی میری طرح جس شخص کا دنیا سے رشتہ منقطع ہو اور دل محبت الہی اور معرفت الہی سے سرشار ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کے نقصان دینے کا تصور اس کے دل میں نہ ہو اور کوئی چیز اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی نہ ہو تو اس کے لئے دنیا میں یہ نیکیاں حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن جو اس مرتبہ علیاً پر فائز نہ ہو تو دنیا اس کے لئے یا الہی سے غفلت کا سبب بنتی ہے اور اس کے لئے دنیا ہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث تو تمہاری تاویل سے موافقت نہیں رکھتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن اس کے باوجود آپ کو ان کی مثل حکومت و شاہی عطا نہیں کی گئی اسی وجہ سے آپ نے جن کو ستون کے ساتھ باندھا بھی نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرح حکومت عطا نہیں کی گئی تھی کیونکہ سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ملک (بادشاہ نبی) اور نبی عبد یعنی میں اختیار عطا فرمایا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی عبد بنانا پسند فرمایا تھا کیونکہ فقر آپ کے نزدیک افضل تھا اور حدیث شریف صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن کو ستون سے باندھنے کی قدرت عطا فرمائی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا خیال کرتے ہوئے اپنے اختیار سے اسے چھوڑ دیا تھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو جن و انس پر نافذ تھا۔

تَأْتِيْ بِدَعْوَتِيْهِ اِلَّا شَجَارًا سَاجِدَةً تَمْشِيْ اِلَيْهِ عَلٰى سَاقٍ بِلَا قَدَمٍ

2- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (القرن)
4- صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 26، حدیث 39 (احمدیہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (القرن)
3- تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (القرن)

(حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب درختوں کو اشارہ فرماتے ہیں تو وہ عمدہ کرتے ہوئے قدموں کے بغیر اپنے سنے کے سہارے خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفر اور کفر کی زندگی اور ان کا لباس مرغوب تھا۔ اسی طرح تمام خلفاء و راشدین کو بھی خلافت اور فخر دونوں عظیمتیں حاصل تھیں اور دونوں کے فضاائل میسر تھے۔ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ خُلَفَائِهِ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔
اسے اللہ تعالیٰ تیری ذات و باب (بہت زیادہ عطا کرنے والا) ہے جسے چاہتا ہے جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے جسے تو عطا کرے کوئی اسے محروم کرنے والا نہیں اور جسے تو عطا نہ فرمائے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ يَتَجَرَّى بِأَمْرِهِ مَرْحَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝۱

”پس ہم نے ہوا کو آپ کا فرمانبردار بنا دیا۔ جلتی تھی آپ کے حسب حکم آرام سے جدھر آپ چاہتے ل“

۱۔ ابو جعفر نے المرتبہ کو جمع کا معنی یعنی الريح پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے جس کے ارادہ سے مفرد پڑھا ہے۔ یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَاسْتَجَبْنَا دُعَاءَهُ فَسَخَّرْنَا لَهُ۔ یعنی ہم نے اس کی دعا کو شرف قبولت عطا فرمایا اور ان کے لئے ہوا کو فرمانبردار بنا دیا۔ تجری بامعنی الریح کی صفت ہے جس طرح ولقد امر علی اللیثم یسبئی میں یسبئی اللیثم کی صفت ہے یا تجری الریح سے حال ہے۔ رجاء کا معنی نرم ہے، یعنی اس میں لڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تھی۔ یا بمعنی کہ ہوا آپ کے ارادہ کے مخالف نہیں جلتی تھی حیت اصحاب تجری کی طرف ہے۔ یعنی جہاں کا آپ ارادہ فرماتے اور جلتی تھی۔ عرب کہتے ہیں
أَصَابَ الصَّوَابَ فَأَخْطَأَ الْجَوَابَ۔

وَالشَّيْطَانُ كُلُّ مَنَّا وَغَوْا إِيَّانَا ۝۲

”اور سب دیوانہ بھی ماتحت کر دیئے کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور ل“

۲۔ یعنی ہم نے جنوں کو بھی آپ کے لئے سخر کر دیا، کوئی قلعہ اور محلات تعمیر کرتے تھے اور کوئی آپ کے لئے سمندر کی تہ سے موتی نکال کر لاتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندر سے موتی نکلوائے تھے۔ کل، الشیاطین سے بدل ہے۔

وَآخِذِينَ مُمْقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝۳

”اور ان کے علاوہ (جو سرکش تھے) باندھ دیئے گئے زنجیروں میں ل“

۳۔ آخِذِينَ کا عطف کل پر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا تھا ایک گروہ مشقت طلب کام کرتا تھا جسے مکان تعمیر کرنا اور سمندر کی تہ میں غوطہ زنی کر کے موتی نکالنا اور دوسرا گروہ سرکش شیطانوں کا تھا جن کو آپ نے زنجیروں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ رکھا تھا تاکہ شر انگیزی نہ کر سکیں۔

میں کہتا ہوں شاید ایلیس پر آپ کو تسلط نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ فرمایا تھا فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝۱ اِنِّي يَوْمَ الرِّقَابِ
الْمُنْعَثُورِ ۝۲۔

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِعَبْرِ حِسَابٍ ۝۴

” (اے سلیمان!) یہ ہماری عطا ہے چاہے (کسی کو بخش کر) احسان کر چاہے اپنے پاس رکھ تم سے کوئی باز پرس نہ ہو

گی۔

یعنی ہم نے سلیمان کو کہا اے سلیمان ہم نے تجھے وسیع شاہی اور تسلط عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمایا اور یہ ہماری بخشش اور عطا ہے تو جس کو چاہے عطا کر دے اور جس سے چاہے روک لے، آپ سے اس معاملہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ ان میں تصرف کرنے کا اختیار تیرے سپرد کیا گیا ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جس کسی پر بھی انعام فرمایا تو وہ اس کے لئے بوجھ بن گیا لیکن سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسا نہیں تھا اگر وہ کسی کو عطا کریں تو ان کے لئے اجر ہے اور اگر کسی سے اپنی نوازشات روک لیں تو ان پر کسی قسم کا مواخذہ نہیں (۱)۔ اس مفہوم کے اعتبار سے پیغمبرِ حنیف ہامان کی ضمیر سے حال ہوگا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عطا سے حال ہو یا اس کے متعلق ہو اور درمیان میں کلام اعتراض ہو۔ یعنی ہم نے آپ کو اتنا کثیر عطا فرمایا جس کا شمار اور کثرت ممکن نہیں۔ مقابلہ کہتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جنوں کی تسخیر ہماری عطا ہے جنوں میں سے جس کو چاہا پھوڑو اور جس کو چاہا باندھ دو آپ پر ان کے پھوڑنے اور باندھنے کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا (۲)۔

وَإِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَكُرْتُفِيًا وَحَسَنَ مَآبٍ ﴿۳﴾

”اور بیشک انہیں ہمارے ہاں بڑا قرب حاصل ہے اور خوبصورت انجام لے۔“

یعنی دنیا میں ملک عظیم پر اتنا وسیع تسلط عطا فرمایا لیکن آخرت میں بھی ان کا ہماری بارگاہ میں بڑا قرب و مرتبہ ہوگا۔ حسن مآب سے مراد جنت ہے۔

وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّهُ أَلَيْسَ لِي بِعَذَابٍ ؕ ﴿۴﴾

”اور یا فرمائیے ہمارے بندے ایوب کو جب انہوں نے پکارا ہے رب کو (اے الٰہی) بیچٹائی ہے مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ لے۔“

اے اے یُؤُوبُ، عِبْدُنَا سے عطف بیان ہے اور اس جملہ کا عطف و اذکر عبدنا داؤد پر ہے۔ اذ نادى من عبدنا سے بدل اشتغال ہے۔ جزہ نے مَشْفِي كُوبَا کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے ياء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ سانی اپنے ام خبر سے مل کر حضرت ایوب علیہ السلام کی کلام کی حکایت ہے۔ نصب کو ابو جعفر نے نون اور صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے نون کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے تمام کا معنی شقت اور تکلیف ہے۔ عذاب سے مراد دکھ ہے۔ مقابل اور قراءہ فرماتے ہیں نصب جسمانی تکالیف اور عذاب مالی پریشانی ہے (۳) ہم نے سورۃ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف اور مدت آزمائش کا تذکرہ کر دیا ہے۔ پھر جب آپ کی مدت آزمائش مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔

أَمْ رَأَيْتُ بِرَبِّكَ ۗ هَذَا مَغْتَسِلٌ يَأْتِيهِ دُرٌّ وَسَرَّابٌ ﴿۵﴾

”حکم ہوا (اپنا پاؤں) زمین پر (مارو یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کے لئے لے۔“

یہ جملہ قلنا کی تقدیر کے ساتھ مستاقفہ ہے۔ هذا مغتسل الخ کا جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے
فَرَحُّضٌ فَخْرٌ حَتْ عَيْنٌ فَلَقْنَا لَهُ هَذَا مَغْتَسِلٌ یعنی جب آپ نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو ایک چشمہ جاری ہو گیا پھر ہم نے فرمایا

۱- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 609 (المنزل) 2- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 609 (المنزل) 3- تفسیر بنوری، جلد 4، صفحہ 610 (المنزل)

یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے جب اس پانی سے غسل فرمایا تو تمام نگاہری بیماریاں ختم ہو گئیں اور جب اس چشمہ کا پانی پیا تو باطنی ہر تکلیف دور ہو گئی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے دو مرتبہ زمین پر پاؤں مارا تو دو چشمے جاری ہوئے۔ ایک گرم تھا اور دوسرا ٹھنڈا۔ ایک سے آپ نے غسل فرمایا اور دوسرے سے نوش فرمایا۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے دایاں پاؤں مارا تو ایک چشمہ جاری ہو گیا پھر دایاں ہاتھ چینیہ کے پیچھے زمین پر مارا تو دوسرا چشمہ جاری ہو گیا۔ ایک سے آپ نے نوش فرمایا اور دوسرے سے غسل فرمایا (1)۔

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمَثَلَهُمْ فِي الْكُتُبِ وَالْأُولَى الْأَلْبَابِ ﴿٣٦﴾

”اور ہم نے عطا فرمایا انہیں ان کا اہل و عیال اور ان کی مانند ان کے ساتھ بطور رحمت اپنی جناب سے اور بطور نصیحت اہل عقل کے لئے ا“

1۔ اس کلام کا عطف سابق کلام کے مفہوم پر ہے، یعنی ہم نے انہیں شفا بخشی اور یہ سب کچھ عنایت فرمایا۔

وَحَدَّثَ بَيْنَهُمْ كَيْفَ قَامَ صَرْبُ يَهُوَّ وَلَا تَحْتُّ إِذَا وَجَدْنَهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ
إِنَّهُ أَذْوَابِ ﴿٣٧﴾

”اور (حکم ملا) پکڑ لو اپنے ہاتھ سے نکلوں کا ایک مٹھا اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو۔ بیشک ہم نے پایا انہیں سبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ ہے“

1۔ خذ کا عطف ارکض پر ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے وَوَهَبْنَا لَهُ اِنْجِلْمَ مَعْرُضًا ہوگا یا خذ قلنا کی تلقین پر وہنا پر معطوف ہے۔ ضغنا یعنی بھروسہ کی کہنیاں یا گھاس کے ٹکے۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی اس ترکیب کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام نے گھاس کا ایک مٹھا لے کر جس میں سوتیلیاں تھیں (اپنی بیماری کی حالت میں اٹھائی گئی قسم پوری کرنے کے لئے) اپنی بیوی کو مارا۔
یہ جملہ وہنا کی علت بیان کر رہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جو جسمانی تکلیف پہنچی اور مال و اہل کا جو نقصان ہوا کسی چیز پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زبان شکایت نہ کھولی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ہم نے انہیں صابر پایا۔ عافیت کی تمنا اور شفا کی طلب کو جزع فرغ نہیں کہا جاتا جیسا کہ ہم نے سورۃ انبیاء میں ذکر کیا ہے۔ ہمارے شیخ شہید (حضرت مرزا جان جاناں شہید) نے یہاں بڑی لطیف کلام فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام نے کئی سال تک اپنی مصیبت پر صبر کر رکھا (جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف کو دور کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اے ایوب اللہ تعالیٰ تجھ سے آزمائش دور کرنے کے لئے تصریح و زاری اور اپنی بارگاہ میں عجز و انکسار کے اظہار کا ارادہ فرماتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے رضائے الہی کو چاہتے ہوئے تصریح و زاری کو اختیار فرمایا حالانکہ آپ کی طبیعت صبر کی مقتضی تھی۔ پس اس طرح آپ مقام صبر سے مقام رضا کی طرف ترقی کر گئے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے صبر کی قدر دانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا اور ان کے مقام رضا کی طرف ترقی کرنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَذْوَابِ کہ ایوب خوبییوں والا بندہ ہے اور اپنے صبر اور نفس کے ساتھ تحمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والا ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اِبْرَاهِيمَ وَاسْتَسْقِ وَيَعْقُوبَ اُولِيَ الْاَيْمِي وَالْاَبْصَارِ ﴿٢٠﴾

”اور یاد فرماؤ ہمارے (مقبول) بندوں ابراہیمؑ اسحاق اور یعقوب کو بڑی قوتوں والے اور روشن دل تھے۔“

۱۔ تینوں اسماء عبدنا سے عطف بیان ہیں۔ ابن کثیر نے جمع کی جگہ جس کو رکھنے کی بناء پر عبدنا پڑھا ہے یا مفرد معنی کے اعتبار سے عبدنا پڑھا ہے اور صرف ابراہیمؑ اس کا عطف بیان ہے اسحاق اور یعقوب معطوف ہیں۔ ان پاکباز لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ بجا لانے کی قوت عطا فرمائی تھی نیز انہیں دین کی بصیرت اور معرفت الہی بھی عطا کی گئی تھی۔ ابن عباسؓ قنادہ اور مجاہد نے اُولِيَ الْاَيْمِي وَ اُولِيَ الْاَبْصَارِ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اطاعت الہی میں اعمال صالحہ کرنے کو ابدا سے تعبیر فرمایا کیونکہ اکثر اعمال صالحہ انہوں کی مدد سے کئے جاتے ہیں۔ معارف کو ابصار سے تعبیر فرمایا کیونکہ ابصار حصول معرفت کا قوی ترین مبداء ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جاہل لوگ اپنا ج اور انہوں کی مانند ہوتے ہیں۔

اِنَّا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ كَرِيْمٍ الدَّارِ ﴿٢١﴾

”ہم نے مختص کیا تھا انہیں ایک خاص چیز سے اور وہ دار آخرت کی یا تھی۔“

۱۔ یعنی ہم نے انہیں ایک مخصوص خصلت عطا کی تھی جو صرف ان میں پائی جاتی تھی اور وہ خصلت آخرت کی یا تھی، یعنی ان کی زندگیوں کا ہر لمحہ یا دار آخرت میں بسر ہوتا تھا۔ وہ آخرت کو سنوارنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ذکر الدار یا تو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے یا عنصی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا خالصہ سے بدل کی حیثیت سے مجرور ہے، یعنی ہمیشہ آخرت کے گھر کی یاد میں رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آخرت کی یاد دلاتے ہیں جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی عادت طیبہ ہوتی ہے اور ان کی ہر لمحہ یہ یاد طاعت میں اخلاص کے سبب ہوتی ہے کیونکہ جو اعمال بجالاتے ہیں یا جو ترک کرتے ہیں ان سب میں انہیں رضائے مطلوب ہوتی ہے ان کا مطلع نظر فقط رب تعالیٰ کی ملاقات ہوتی ہے اور یہ صرف آخرت میں ہی پائی جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہو تقدیر عبارت اس طرح ہو ذکر صی صاحب الدار یعنی وہ دار کے مالک کی یاد میں رہتے ہیں اور دار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے آخرت پر دار کا اطلاق کر کے یہ شعور یا کہ حقیقت میں دار (گھر) تو آخرت ہی ہے۔ دنیا تو فقط گزرگاہ ہے جس میں کسی کو قرار نہیں اور جس میں قرار نہ ہوا سے دار (گھر) نہیں کہا جاتا۔

نافع اور ہشام نے خالصہ کو ذکر صی کی طرف بیان کے لئے مضاف کر کے پڑھا ہے یا خالصہ محذوف معنی خلوص ہے اور اپنے فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ مالک میں دینار فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت اور دنیا کی یاد نکال دی ہے اور آخرت کی محبت اور آخرت کی یاد کے لئے ہم نے ان کو مختص کر دیا ہے۔ مقل فرماتے ہیں وہ آخرت کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلا تے تھے۔ سدی فرماتے ہیں وہ آخرت کے خوف کے ساتھ مختص تھے (۱)۔ ابن زید فرماتے ہیں خالصہ کو مضاف کر کے پڑھنے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں خاص فرمایا ہے ان نعمتوں کے لئے جو آخرت کی نعمتوں میں سے افضل ترین ہیں۔ انا احلصناہم کا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر سابق کلام کی علت ہے۔

وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنِ الْاَحْسَابِ ﴿٢٢﴾

”اور یہ (حضرات) ہمارے نزدیک چنے ہوئے بہترین لوگ ہیں۔ ل۔“
 ل۔ اختیار جمع ہے خبر کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ غنیمت کی جمع اور میت کی جمع اموات آتی ہے۔

وَاذْكُرْ اِسْمٰئِيْلَ وَ اَلْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ط وَ كُنْ مِنَ الْاَخْيَارِ ﴿١٠﴾

”اور یاد فرمائیے اسماعیلؑ، یسع اور ذی الکفلؑ کو یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں۔“

ل۔ یسع اخطوب کے بیٹے تھے جنہیں بنی اسرائیل پر غلیظ بنایا گیا تھا اور پھر نبی بنائے گئے تھے۔ حمزہ اور کسائی نے لام مشدود کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ یسع سے مقول کرتے ہوئے وَالْيَسَعَ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قرآن نے لام ساکن اور یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ذاکفل یسع کے چچا کا بیٹا تھا یا بشر بن ایوب کا بیٹا تھا۔ ان کے نبی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ آپ کا یہ لقب ہونے کی وجہ بعض علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی طرف بنی اسرائیل کے سونے تشریف لے گئے تھے اور اس نے ان سب کو پناہ دی تھی اور ان کی کفالت کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس نے ایک ایسے نیک شخص کی کفالت کی تھی جو ہر روز نمازیں پڑھتا تھا۔ کل من الاخيار اذکر کے مقول سے حال ہے۔

هٰذَا اِذْ كُرُوْا وَاِنْ لِّلْمُتَّقِيْنَ لِحُسْنِ مَّآبٍ ﴿١١﴾

”یہ نعمت ہے اور بیشک پرہیزگاروں کے لئے بہت عمدہ ٹھکانہ ہے۔ ل۔“

ل۔ ہذا کا اشارہ گزشتہ انبیاء کے واقعات کی طرف ہے، یعنی یہ ان کے لئے باعث شرف تھے یا یہ معنی کہ جو قرآن آپ پر تلاوت کیا جا رہا ہے یہ ان کی پاکیزہ حیات کا ذکر جنم ہے۔ آگے ان انعامات کا تذکرہ فرمایا جو انبیاء کرام اور ان کے متبعین کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ مآب کا معنی مرجع ہے۔ یعنی متقین کے لئے بہترین لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَلَّتْ عَنَّا مَقْفَحَةٌ لَّهُمْ الْاَبْوَابُ ﴿١٢﴾

”سدا بہار باغات کھلے ہوں گے ان کے لئے سب دروازے۔ ل۔“

ل۔ جَلَّتْ عَنَّا حَسَن مَّآبٍ سے عطف بیان ہے یا اس سے بدل ہے اور عدان اعلام غالبہ میں سے ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے جَلَّتْ عَنَّا اَلْبِقَاعُ وَعَنَّا الْخُلُقُ عِبَادًا كَا۔ (سدا بہار جن جن کا وعدہ (خداوند) رحمن نے اپنے بندوں سے کیا ہے) مفتحة، حال کی بناء پر منسوب ہے اور اس میں عامل متقین میں فعل کا معنی ہے لہم الابواب اس بناء پر مرفوع ہے کہ اس کی طرف مفتحة کو منسوب کیا گیا ہے اور ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مَفْتَحَةٌ لَّهُمْ الْاَبْوَابُ یا الابواب پر لام مضاف الیہ کے عوض ہے تقدیر اس طرح ہوگی مَفْتَحَةٌ لَّهُمْ اَبْوَابُهَا یا جنات کی طرف لوٹنے والی ضمیر مستر سے بدل اشتمال ہے۔

مُعْتَكِبِيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِمَا كِهْتُمْ كِيْرَةً وَّ شَرَابٍ ﴿١٣﴾

”مکئیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان میں طلب فرماتے ہوں گے وہاں طرح طرح کے پھل اور شراب و بات۔ ل۔“

ل۔ فاکہہ کی صفت کھیرہ ذکر فرمائی پھر اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے شراب کی صفت کثیر کو حذف کیا گیا ہے۔ متکئین اور يدعون دونوں حال مترادف یا حال متداخل ہیں لہم کی ضمیر سے۔ المتقین سے حال نہیں ہیں کیونکہ درمیان میں فاصلہ ہے۔ اظہر یہ ہے کہ يدعون، جنیتوں کی جنت میں حالت بیان کرنے کے لئے جملہ متاثر ہے اور متکئین اس کی ضمیر سے حال ہے۔ فاکہہ پر اکتفاء

فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جنہوں کا کھانا محض تلذذ کے لئے ہوگا کیونکہ بطور غذا کھانا اس لئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ جسم میں جو طاقت کی کمی واقع ہوتی ہے اسے پورا کیا جائے، جبکہ جنت میں تو کوئی کمزوری اور تحلیل ہوگی ہی نہیں۔

وَعِنْدَهُمْ فُصَاةٌ الطَّرْفِ اشْرَابٌ ﴿۵۱﴾

”اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی (عزیزان وکمال میں) ہم نخل (حوریں) ہوں گی۔“

یعنی ان کے پاس ایسی حوریں ہوں گی جو اپنے خاندانوں کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی۔ فرمایا اشْرَابٌ یعنی ہم عمر ہوں گی ان کی عمر تینتیس 33 سال ہوگی۔ اشْرَابٌ جمع ہے توب کی۔ مجاہد فرماتے ہیں اشْرَابٌ کا مضموم یہ ہے کہ وہ باہم محبت و پیار کرنے والیاں ہوں گی، ان کی سوتوں کی طرح آپس میں رقابت نہ ہوگی (۱) اور ایک دوسرے سے غیرت نہ دکھائیں گی۔ یہ جملہ ظریفہ حال ہے یاہم خیر کی خبر ہے۔

هَذَا مَالُهُمْ عَمَّا كَانُوا فِي الْحِسَابِ ﴿۵۲﴾

”یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ روز حساب (تمہیں ملے گا)۔“

۱۔ اتن کثیر نے یہاں اور سورۃ ق میں ظالم کا صیغہ بوعدون پڑھا ہے اور ضمیر متقین کے لئے ہے۔ ابو عمرو نے یہاں اتن کثیر کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے متقین کے لئے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یوم پر لام علت کے لئے ہے کیونکہ حساب جزاء کے ملنے کی علت ہے یا اس کا معنی فی یوم الحساب ہے۔

إِنَّ هَذَا الرِّزْقَ مِمَّا مَالَهُ مِنْ تَقَارِدٍ ﴿۵۳﴾

”بیشک یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو کبھی تم نہ ہوگا۔“

۱۔ ماله من نفاذ کا جملہ رزقنا سے حال ہے۔ ہذا کی دوسری خبر ہے۔

هَذَا وَإِنَّ لِلطَّاعِينَ لَسَّرَ مَأَبٍ ﴿۵۴﴾

”یہ (تو) پرہیزگاروں کے لئے) اور بلاشبہ سرکشوں کے لئے برا ٹھکانہ ہوگا۔“

۱۔ هَذَا یا تو الامور کی خبر ہے یا مبتدا ہے کما ذکر اس کی خبر ہے، یہ خذ کا مفعول ہے۔ طاعین سے مراد کافر ہیں۔ مآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَيَسَّوْنَ الْوُجُوْدَ ﴿۵۵﴾

”یعنی) جہنم وہ داخل ہوں گے اس میں تو یہ کتنا تکلیف دہ چھوٹا ہے۔“

۱۔ جَهَنَّمَ بشر مآب سے بدل یا عطف بیان ہے۔ یصلونہا، جہنم سے حال ہے۔ یسّس کا مضموم بالذم جہنم یا مہادہم مخذوف ہے۔

هَذَا لَا قَلْبِيْدٌ وَفَوْكَ حَوِيْمٌ وَعَسَاقٍ ﴿۵۶﴾

”یہ کھولتا پانی اور پیپ ہے جس کا پیسے کو وہ سے چکھیں۔“

ل۔ هَلْبًا كَمَا شَارِبِ الْيَهُ الْعَذَابِ ہے اور یہ مضر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر فلیذو قو اکر رہا ہے یا ہذا مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی یہ ان کی مہمان نوازی ہے، چاہیے کہ وہ اسے پکھیں یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی العذاب ہذا۔ یا ہذا مبتدا ہے اور حمیم اس کی خبر ہے۔ فراء نے یہی ترکیب کی ہے۔ اس آخری ترکیب کی صورت میں فلیذو قو کا جملہ مضر نہ ہوگا اور اسباق تاویلات کی صورت میں حمیم 'مبتدا محذوف ہو کی خبر ہوگا۔ حمیم' انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں۔ عساق کا عطف حمیم پر ہے۔ حمزہ کسائی اور حفص نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، بروزن فعال جیسے خباز اور طہارخ۔ جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ مذاب کی طرح فعال کے وزن پر پڑھا ہے۔

عساق کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ ان عباس فرماتے ہیں یہ انتہائی ٹھنڈک ہے جو دوزخیوں کو اس طرح جلائے گی جیسے آگ ان کو جلائے گی (1)۔

عابد اور متاق فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو انتہائی ٹھنڈی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغت ترک میں اس کا معنی بد بودار چیز ہے۔ قنادر فرماتے ہیں وہ چیز جو بے، یعنی دوزخیوں کی کھانوں اور گوشت سے بننے والی پیپ اور زانیوں کی شرمگاہوں سے نکلنے والا بد بودار مادہ (2)۔ یہ عسقت سے مشتق ہے جس کا معنی بہنا ہے اور عساق کا معنی انصاب (بہنا) ہے۔

تیسری نے عطیہ سے روایت کیا ہے کہ عساق سے مراد بننے والی پیپ ہے (3)۔ اسی طرح ابراہیم اور ابو زین کا قول نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم ابن ابی الدنیا اور الفیاء نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ عساق بیہنم میں ایک چشمہ ہے جس کی طرف سانپ بچھو وغیرہ ہرز ہرے جانور کا زہر بہہ کر جاتا ہے (4) پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اسے ٹوٹا دیا جائے گا وہ نکلے گا تو اس کی جلد ہڈیوں سے گر چکی ہوگی اور اس کی جلد اور گوشت اس کے ٹخنوں سے معلق ہوگا اور وہ اس طرح اپنے گوشت کو گھسیٹ رہا ہوگا جیسے انسان اپنے کپڑے کو زہن پر گھسیٹ کر چلتا ہے۔

وَ اَحَدٌ مِّنْ سَكْبَةٍ اَزْوَاجٍ ۝۵

”اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب ل۔“

ل۔ ابو عمر اور ابو ہریر نے حمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ اخوی کی جمع ہے جیسے کبری اور کبر۔ ابو عبیدہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس کی صفت ازواج بھی جمع ہے۔ باقی قراء نے حمزہ کے فتح اور اس کے بعد الف کے ساتھ مفرد پڑھا ہے، یعنی عذاب اخر یا مذوق اخر۔ مِّنْ سَكْبَةٍ اخوی کی صفت ہے، یعنی حمیم اور عساق کی مثل۔ مفرد ضمیر ما ذکر کے لئے ہے یا شراب کے لئے ہے جو حمیم اور عساق کو شامل ہے۔ ضمیر مفرد عذاب کے لئے ہے۔ ازواج کا معنی ہے تمام حمیم کا۔ یہ اخوی خبر ہے یا اس کی صفت ہے یا مذکورہ تینوں اسماء کی صفت ہے یا جار مجرور کے ساتھ مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جو ضم ہے۔

هٰذَا قَوْلُهُمْ مَّعَكُمْ لَا مَرْحٰلًا بَيْنَهُمْ وَ اَنْتُمْ صَالُوا النَّارِ ۝۶

”یہ (لو) دوسری فوج گھسنا چاہتی ہے تمہارے ساتھ کوئی خوش آمدید نہیں انہیں یہ ضرور آگ تانے والے ہیں ل۔“

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ کلام دوزخ کے دروغے و دوزخیوں کے قائدین سے کر لیں گے۔ لیڈر اور قائدین جب آگ میں داخل ہوں گے اور پھر ان کے پیروکار داخل ہوں گے تو دوزخ کے داروغھے قائدین سے مخاطب ہو کر یہ کہیں گے (۱)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام قائدین اور لیڈر آپس میں کریں گے، یعنی یہ پیروکاروں کی فوج آگ میں تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے۔ اتحیام کا معنی کساشی میں اپنے آپ کو تکمیل دینا ہے۔ کبھی کہتے ہیں دوزخیوں کو پہلے گرز مارے جائیں گے حتیٰ کہ وہ گرزوں کے خوف سے خود بخود دوزخ میں چھٹائیں لگا لگیں گے (2)۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین لوگوں کو آگ میں گرنے سے روک رہے ہیں اور آگ کا موجب بننے والے اعمال سے منع کر رہے ہیں لیکن لوگ برائیوں میں ملوث ہو کر دوزخ میں گھسنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب اس کا ارد گرد روشن ہو گیا تو پختے اور کیزے اس آگ میں گرنا شروع ہو گئے۔ میں انہیں اس آگ سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ اس پر غالب آجاتے ہیں اور وہ اس آگ میں گھس جاتے ہیں۔ فرمایا یہ میری اور تمہاری مثال ہے، میں تمہیں آگ سے بچانے کے لئے پیچھے سے روکتا ہوں (اور کہتا ہوں) آگ سے بچو آگ سے بچو لیکن تم مجھ پر غالب آجاتے ہو اور اس آگ میں گھس جاتے ہو (بخاری و مسلم) (3)

طُرُقُ الْفُتُوْرِ مُشْتَقِمٌ کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ جملہ مستأنفہ ہے، یعنی بعض سرکش دوسروں کے متعلق کہیں گے کہ یہ جماعت بھی تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے یا لیڈروں اور ردوکاروں کو کہا جائے گا کہ تمہارے قہقین آگ میں تمہارے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لیڈر کہیں گے لا مرحومہ بیہم۔ ان قہقین کو خوش آمدید نہ ہو۔ یہ قہقین کی اپنے قہقین کے لئے بددعا ہے اور یہ جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ قابل کلام کے ساتھ متصل ہے۔

اِنَّكُمْ صَلَاةُ النَّارِ کا جملہ لا مَرْحُومًا بیہم کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی وہ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے ہماری طرح اس آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لا مَرْحُومًا بیہم فوج کی صفت ہے یا حال ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا انہیں خوش آمدید نہ ہو۔ عرب آنے والے کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں مرحوبا، یعنی تو وسیع اور کھلے مکان میں آیا جس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ الرحب کا معنی وسعت ہے۔ اس لفظ (مرحوبا) سے آنے والے کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور جس کے لئے بددعا کرنی ہو اسے عرب کہتے ہیں لا مرحوبا۔ یعنی اس کی تحارت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ آیت میں بیہم کا کلام ان کے بیان کے لئے جن کے لئے بددعا کی گئی ہے۔

قَالُوا اَيْلَ اَنْتُمْ لَمْ يَرْحَبْ بِكُمْ اَنْتُمْ قَدْ مَسَّوْا لَنَا قَبِيْسَ الْقَرْمِیْنَ ﴿۱۰﴾

”وہ کہیں گے (ظالمو!) تمہیں کوئی خوش آمدید نہ ہو تم نے ہی آگے کیا اس عذاب کو ہمارے لئے سو بہت برا گھمکانہ ہے۔“

۱۔ یہ طبعاً کلام ہے، یعنی اتباع کرنے والے اپنی قائدین سے کہیں گے کہ تم جو کچھ ہمیں کہہ رہے ہو یا ہمارے متعلق کہا گیا ہے تم اس کے زیادہ متحق ہو کیونکہ خود بھی گمراہ تھے اور میں بھی تم نے گمراہ کیا۔ یہ عذاب تم نے ہمارے لئے آگے کیا کیونکہ تم ہی ہمیں کفر کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ ہمارے اور تمہارے لئے یہ جہنم بہت برا گھمکانہ ہے۔

قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هَذَا أَفَرِيذًا وَعَدَّ أَبَا عَدُوِّنَا فِي النَّاسِ ۝۱

”کہیں گے اے ہمارے رب! جس (بد بخت) نے آگے کیا ہے ہمارے لئے یہ عذاب پس بڑھا دے اس کا عذاب دو گنا آگ میں۔ ل۔“

یہ یہ متاملہ جملہ ہے، یعنی اتباع کرنے والے یہ کہیں گے، یعنی جو بد بخت ہماری اسی سزا اور عذاب کا باعث بنا اس کو وہ ہر اعتراض دے۔

وَقَالُوا مَا لَنَا لَنْزِيلِكَ أَلْمُومِينَ ۝۲

”اور کہیں گے کیا وجہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے (یہاں) وہ لوگ جنہیں ہم شمار کرتے تھے برے لوگوں میں۔ ل۔“

ل۔ لا نوری کا جملہ لنگی خمیر شکم سے حال ہے اور اس کا عامل فعل کا معنی ہے۔ اشراج ہے شریکی۔ شریکی کی ضد ہے اور نیرودہ چیز ہوتی ہے جس میں ہر شخص رخت رکھتا ہے اور شرودہ ہوتا ہے جسے ہر شخص ناپسند کرتا ہے، یعنی کافر نہیں گئے کیا وجہ ہے کہ دنیا میں جنہیں ہم ناپسند کرتے تھے اور جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے۔ ان کی مراد غضیب بلال مصہیب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے مومن فقراء ہوں گے جن سے دنیا میں یہ دولت کے نشے میں مست لوگ مذاق کرتے تھے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

أَتَّخَذْتُمْ مِصْحُومًا ۝۳

”ہم جن کا نسخہ اڑایا کرتے تھے۔ ل۔ یا پھر گئی ہیں ان کی طرف سے ہماری آنکھیں۔ ل۔“

ل۔ اہل بصرہ حمزہ اور کسائی نے حمزہ وصلی کے ساتھ اَتَّخَذْتُمْ پڑھا ہے اس حیثیت سے کہ یہ درجہ بالا کی دوسری صفت ہے یا فدی کی تقدیر کے ساتھ حال ہے یا کسائی کی دوسری خبر ہے۔ اہل حجاز ابن عامر اور عاصم نے استفہام کی بنا پر حمزہ قلمی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ ان سے مذاق کرنے میں اپنے اوپر انکار کر رہے ہیں۔ نافع حمزہ اور کسائی نے مصحوم کو تین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ سورۃ المؤمنین میں گزر چکا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ع۔ فراء کہتے ہیں یہ استفہام تعجب اور توجیح کے معنی میں ہے (۱) اور مالنا لا نوری کے قول سے مفہوم مقدر جملہ میں حمزہ کے لئے ام محادہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مَا لَنَا لَا نُرِيهِ هُوَ لِأَنَّ الَّذِينَ اتَّخَذْنَا بِهِ مِصْحُومًا الْبِشْوَاهُنَا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ أَبْصَارُنَا فَلَمْ نَرَهُمْ وَهُمْ هُنَا۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو نہیں دیکھ رہے جن سے ہم مذاق کرتے تھے۔ کیا وہ یہاں نہیں ہیں یا ہماری آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں پس ہمیں وہ نظر نہیں آ رہے جبکہ وہ یہاں موجود ہیں یا دوسری قرأت کے مطابق اتَّخَذْنَا هُمْ كَامِزَةٍ أَيْ الْآخِرِ مَا فَعَلْنَا بِهِمْ مِنْ الْأَمْتِيسْحَارِ مِنْهُمْ أَمْ تَحْقِيقِ هِمَّ كَيْفَ فِيهِمْ هُوَ، یعنی اپنے نفسوں پر مذاق اڑانے اور ان کی تحقیر کرنے کا انکار کر رہے ہیں کیونکہ آنکھ کا بھٹکانا ہی مفہوم سے کنایہ ہے۔ یا ام مقطوعہ ہے اور مراد ان کو ذلیل سمجھنے اور ان سے مذاق کرنے پر دلالت کرتا ہے، یعنی ہماری نگاہوں کا میز چاہیں تھا اور ہماری نظروں کا قصور تھا کہ ہم ان کی ظاہری بوسیدہ حالت کو دیکھتے رہے (اور ان کے دلوں میں جو جو پر ایمان اور ان کے اندر جو پاکیزہ اخلاق کے سدا بہار پھول تھے وہ ہمیں نظر نہ آئے) ابن کسائی کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ درویش صفت لوگ تو ہم سے ہزار درجہ بہتر تھے لیکن ہم ان کی عظمت شان کو نہ پہچان سکے اور ہماری آنکھیں ان

کے جو ہر باطن کو دیکھنے سے قاصر رہیں (۱)۔

إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿۱۰﴾

”یقیناً یہ سچ ہے دوزخی آپس میں جھگڑیں گے۔“

یعنی دوزخیوں کے متعلق جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ یقیناً ہوگا، ان کا آپس میں یہ مکالمہ ضرور ہوگا۔ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ، حق سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے دوزخیوں کا آپس میں جو سوال و جواب ہوگا اس کو جھگڑنے والوں کے درمیان جاری ہونے والی کلام سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے اس کو تَخَاصُمُ فرمایا یا اس لئے کہ قاعدین اپنے مقبوعین سے کہیں گے لا مرحبا ہم اور مقبوعین کا مکرین سے کہیں گے بل انتم لا مرحبا بکم تو یہ جھگڑا ہے اس لئے ان کی ساری گفتگو کو جھگڑے سے تعبیر فرمایا۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ الْوَاحِدَ الْقَهَّارُ ﴿۱۱﴾

”(اے حبیب!) آپ فرمائیے میں تو فقط ڈرانے والا ہوں اور نہیں ہے کوئی خدا مگر اللہ جو ایک ہے سب پر غالب ہے۔“

قل اپنے مقولہ سے مل کر جملہ متناقد ہے اور انہما تصریح کے لئے ہے اور یہ قَالَ الْكُفْرَانُ هَذَا السُّجُودَ كَذَّابًا ﴿۱۰﴾ کے ساتھ متصل ہے، یعنی میں ساحر و کذاب نہیں ہوں بلکہ میں تو عذاب الہی سے بروقت متنبہ کرنے والا ہوں ما من الہ الا اللہ کا عطف انہما پر ہے اور یہ اجْعَلْ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاجِدًا کے ساتھ متصل ہے۔ الواحد یعنی اللہ ایک ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں شرکت کو قبول نہیں فرماتا، وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ یہ کلام کفار کے لئے وعید ہے۔

سَرَابٌ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعِزَّةُ الْغَافِرُ ﴿۱۲﴾

”مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عزت والا بہت بخشنے والا۔“

لعزیز کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کسی کو سزا دے تو اسے کوئی مظلوم کرنے والا نہیں۔ الْعَافُ کالمفہوم یہ ہے کہ وہ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے چھوٹنے بڑے سب گناہ معاف فرمادیتا ہے۔ ان اوصاف کے ذکر میں توحید کا ثبوت موحدین کے لئے وعدہ اور مشرکین کے لئے وعید ہے۔ نیز پہلے تو قہر کی صفت ذکر کی گئی تھی اس سے جوش اور وہم پیدا ہوتا تھا ان صفات سے اس شہ کا زلہ ہو گیا۔ (کہ یعنی وہ صرف صفت قہر سے متصف نہیں بلکہ اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے غفار بھی ہے)

قُلْ هُوَ سُبُوٌّ اَعْظِيمٌ ﴿۱۳﴾

”فرمائیے یہ بڑی اہم اور عظیم خبر ہے۔“

ابن عباس نے عباد اور قادی فرماتے ہیں اس آیت میں جو کلام قرآن ہے (۲) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع قیامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عَنْ يَسْتَأْذُنُ ﴿۱۳﴾ عَنِ النَّبِيِّ الْعَظِيمِ ﴿۱۴﴾ میں قیامت کو نبیاء عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں تمہیں اس ذات کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو اس صفت سے متصف ہے، وہ معبود برحق الوہیت میں یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس صورت میں یہ کلام انما الامتداد الخ کے ساتھ متصل ہوگی۔

أَنْتُمْ عِنْدَهُ مُعْتَبَرُونَ ﴿۱۱﴾

”تم اس سے منموڑے ہوئے ہو۔“

یہ جملہ نباہ کی دوسری صفت ہے۔ یعنی تم اپنی انتہائی غفلت کی وجہ سے اس سے منموڑے ہوئے ہو حالانکہ عقلمند کے لئے ایسی بات سے اعراض درست نہیں ہوتا، جبکہ اس کی حقیقت پر بڑے واضح دلائل قائم ہو چکے ہیں۔
توحید کا تذکرہ تو پہلے کر چکا ہے اور نبوت پر آئندہ ارشادات دلالت کر رہے ہیں۔

مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَائِكَةِ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۱۲﴾

”مجھے کوئی علم نہ تھا مالک کے بارے میں جب وہ جھگڑ رہے تھے۔“

یہ لہی کو مختص نے نبی کے فحش کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملاء اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ ملائکہ کی باتوں کے متعلق خبر دینا جو کبھی کبھی میں وارد باتوں کے موافق ہوں اور پھر اس شخص کا خبر دینا جس نے نہ ملائکہ کی باتیں سنی ہوں اور نہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہو تو یقیناً ایسی باتیں اسے صرف اور صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں فرشتوں کے جھگڑے سے مراد آدم علیہ السلام کے شان کے متعلق جھگڑا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً ۗ قَالُوْٓا۟ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۗ (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیوں کرے گا)

حدیث شریف میں حضرت عبد الرحمن بن عائش الحضرمی سے مروی ہے فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے رب کو انتہائی حسین صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرشتے کسے بات میں جھگڑ رہے ہیں، میں نے عرض کی اسے میرے پروردگار تو بہتر جانتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی پھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینے میں پایا تو جو پھ آسمان اور زمین میں تھا میں جان گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكُنْ لِيْ رَٰسُ الْاَرْضِ اِيْمًا ۗ اِنْ يَّزِيْجِيْهِمْ مَّلٰٓئِكُتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيْلِيْكُوْنَ مِنَ الْاٰمَنُوْنَ ﴿۱۱﴾ (اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں) پھر اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آسمان کے فرشتے کسے بات میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے عرض کی کفارات میں بحث کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کفارات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی جماعت کی طرف پیدل چل کر جانا نمازوں کے بعد مساجد میں دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنا اور تکلیف کی جگہوں میں مکمل وضو کرنا فرمایا جو ایسا کرے گا خیر کے ساتھ زندہ رہے گا اور خیر کے ساتھ مرے گا اور اس کے گناہ اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے اس دن جس میں ماں نے اسے جنتا اور درجہات میں سے ہے کھاتا کھانا اسلام کا پھیرنا اور رات کو اس وقت قیام کرنا، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح دعا مانگو اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَلِيْكَ الْعِيْبَاتِ وَ تَرَكْتُ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبُّ الْمَسٰكِيْنِ وَ اَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَ تَرْضَخَنِيْ وَ تَتَوَّبَ عَلَيَّ ۗ وَاِذَا اُرْدَتْ فِتْنَةٌ فِیْ قَوْمٍ فَفَتُوْنِيْ غَيْرَ مُفْتُوْنٍ۔ (اے اللہ جس تھے سے نیک کام کرنے اور برے کاموں کو چھوڑنے اور مساکین کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور میں التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھ پر نظر عنایت فرما اور جب تو قوم کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے

تو مجھے بغیر آزمائش میں ڈالے اپنی بارگاہ میں بلا لے)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے یہ سب باتیں حق اور سچ ہیں (1)۔

اس حدیث کو نبوی نے شرح السنہ اور اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو داری نے من الموقنین تک روایت کیا ہے۔ ترمذی نے عبد الرحمن بن عائش سے نبوی کی طرح یہی حدیث روایت کی ہے۔ امام ترمذی نے ابن عباس اور معاذ بن جبل سے بھی اس کے ہم معنی عبارت کی کچھ تبدیلی کے ساتھ روایت کی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کی کلمات میں بحث و تجسس سے مراد وہ تمام اعمال ہوں جو لکھنے میں فرشتے ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں اور ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے رحمان کی بارگاہ میں انہیں پیش کروں جیسا کہ قاعد بن رافع کی حدیث میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ناز پر ہرے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روک سے سرائٹھایا تو کہا سمع اللہ لمن حمدہ، پیچھے سے ایک شخص نے کہا رہنا ولک الحمد حمدا کثیرا طیباً مبارکاً فہیہ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا میرے پیچھے ابھی یہ کلمات کس نے پڑھے ہیں؟ اس شخص نے کہا حضور میں نے پڑھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمیں 30 سے کچھ زائد فرشتے ان کلمات کو لکھنے میں جلدی کر رہے تھے کہ کون پہلے انہیں لکھتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ اذ علم کی طرف ہے یا محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی **مِنْ عَلِمَ بِكَلِمَاتِ الْمَلَائِكَةِ الْأَعْلَى**۔

إِنْ يُؤْحَىٰ إِلَىٰ إِلَّا أَسْمَاءُ تَأْتِيهِمْ مُمْبِئِينَ ۝

”نہیں وہی کی جاتی میری طرف مگر یہ کہ میں فقط کھلا ڈرانے والا ہوں۔“

ل انھا اپنے جملہ سے مل کر یا تو عمل رفع میں ہے کیونکہ یوحی کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یا محل نصب میں ہے اور یہ اغراب علیت کی بناء پر ہے اور اس صورت میں یوحی فعل سے مفہوم صدر کی طرف منسوب ہوگا، یعنی ماؤحی الیٰ الہ الانذار المبین اؤ ماؤحی الیٰ وخی الہ لا یاجل الانذار (میری طرف وہی نہیں کی جاتی مگر واضح ڈرانا یا میری طرف وہی نہیں کی جاتی مگر ڈرانے کے لئے) اور رسول بنا کر بھیجے کا مقصود بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں النبا العظیم سے مراد آدم علیہ السلام اور انہیں کا واقعہ ہے اور بغیر اسے واقعہ خبر دینا ہے۔ الملاء الاعلیٰ سے مراد ملائکہ آدم علیہ السلام اور انہیں ہیں جو اس واقعہ سے متعلق ہیں کیونکہ وہی آسمان میں تھے اور ان کے درمیان گفتگو تھی۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝

”اے حبیب! یا فرمائیے جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کچھ سے۔“

لہٰذا قَالَ اذ یخصمون سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے کیونکہ یہ واقعہ جس پر اذ داخل ہوا ہے۔ ملائکہ اور انہیں کی اس گفتگو پر مشتمل ہے جو انہوں نے آدم علیہ السلام کی تحقیق ان کے خلاف کے استحقاق اور ان کو سجدہ کرنے کے متعلق کی تھی جیسا کہ سورہ بقرہ میں لزر چکا ہے لیکن یہاں اسی تفصیلی واقعہ کو اختصار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور جو مقصود تھا صرف اسی پر اختصار فرمایا ہے اور وہ مقصود

مشرکین کو تکبر اور ہٹ دھرمی کی سزا سے ڈرانا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کبر و بڑائی کا مظاہرہ نہ کرو ورنہ تمہیں بھی اسی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جس میں ابلیس کو مبتلا کیا گیا تھا، جب اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان سے گفتگو کرنا کسی فرشتے کے واسطے سے ہو یا ملائعہ اعلیٰ سے مراد عام ہو جو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو شامل ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اذکار کو وجہ سے منسوب ہو۔

قَدْ اَسْوَيْتُمْهُ وَاَنْفَحْتُمْ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا السُّجُودَ ۝۱۰

”پس جب میں اس کو سورا دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے) خاص روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہو گے۔“

۱۔ سَوَيْتُمْهُ کا معنی اتمت خلقہ ہے، یعنی جب میں اس کی تخلیق مکمل کروں۔ آدم علیہ السلام کو شرف عطا کرنے یا روح کو شرف بخشنے کے لئے روح کو اپنی طرف مضاف فرمایا۔

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُونَ ۝۱۱

”پھر سجدہ کیا سب کے سب فرشتوں نے۔“

۱۔ مسجد کا عطف قال ریک ہے۔

اِلَّا اِبْلِيْسَ ۝۱۲ اِسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۳

”سوائے ابلیس کے اس نے گھمنڈ کیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔“

۱۔ اِسْتَكْبَرُ استثناء کی علت بیان کر رہا ہے اور کان بمعنی صار ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکبر کرنے کی وجہ سے یا اس کی اطاعت سے تکبر کرنے کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا یا علم الہی میں تھا کہ وہ کافروں میں سے ہے۔

قَالَ يَا اِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۝۱۴ اَسْتَكْبَرْتَ ۝۱۵ اَمْ كُنْتَ

مِنَ الْعٰلِيْنَ ۝۱۶

”اشارہ ہوا اے ابلیس، کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے

۱۔ کیا تو نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے۔“

۱۔ عٰلِيْنَ کا کلہ متشابہات میں سے ہے سلف صالحین اس کی کوئی تاویل نہیں کرتے تھے وہ فقط اس پر ایمان رکھتے تھے اور اس کا مرادو مفہوم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے تھے، جبکہ متاخرین علماء اس کی تاویل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم (علیہ السلام) کو ماں باپ کے واسطے کے بغیر پیدا فرمایا اور یہ ذکر فرمایا تاکہ اس کی تخلیق میں مزید قدرت کا اظہار ہو جائے اور پھر آدم علیہ السلام کے بغیر واسطہ کے اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہونے پر اس کے انکار کو مرتب فرمایا تاکہ یہ شعور ملے کہ اس قادر مطلق کی تخلیق ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے یا اس لئے اس کے انکار کو اس پر مرتب فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے پر جو دلیل اس لعین نے پکڑی ہے وہ سجدہ سے مانع ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی کیونکہ مراد اراد آقا کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعض

غلاموں کے لئے بعض کو خادم بنا دے خصوصاً جس کو کوئی خصوصیت حاصل ہے اس کے لئے دوسروں کو خدمت بجالانے کا حکم دے دے تو یہ کوئی بیچ امر نہیں ہے۔

۷۔ ہمزہ استہمام تو بخ اور انکار کے لئے ہے جو ہمزہ وصلی پر داخل ہوا ہے۔ یعنی کیا تو نے بغیر استحقاق کے تکبر کیا ہے یا تو ان میں سے ہے جو توفیق اور برتری کے حقدار ہیں۔ پہلی شق پر تو بخ ہے اور دوسری پر انکار ہے (یعنی اگر محض تکبر کی بناء پر مجبورہ کرنے سے انکار کیا ہے تو تو نے بہت برا کیا ہے اور اگر تو نے یہ سمجھا کہ یہ حکم کم درجہ فرشتوں کو ہے یہ بھی تیری کم نہی ہے)

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۙ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ سَرِيعٌ ۝

”وہ (گستاخ) بلا میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اے کچھڑے۔ حکم ملا (۱) ہے (یا) نکل جا بخت سے یشک تو پھنکارا گیا۔ ل۔“

۸۔ وٹھہا کی ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ بعض کے نزدیک آسمان ہیں۔ حسن اور ابو العالیہ فرماتے ہیں اس کی وہ خلقت مراد ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا تھا۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ تاویل صحیح ہے کیونکہ اٹیس نے اپنی خلقت کی وجہ سے تکبر کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی خلقت میں تبدیلی فرمادی وہ کالا سیاہ اور انتہائی بد صورت ہو گیا، جبکہ پہلے بڑا حسین تھا (۱)۔ فَاِنَّكَ سَرِيعٌ نکل جانے کے حکم کی علت ہے، یعنی تو بھلائی کے ساتھ زہر ہوگا۔

وَ اِنَّ عَلَيْكَ لَعَنَتِي اِلٰى يَوْمِ الدِّينِ ۝

”اور یشک تجھ پر میری لعنت بر سے گی قیامت تک۔ ل۔“

۹۔ لَعَنَتِي کو نافع نے پاء کے فتح کے ساتھ اور باقی قراء نے ياء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جب قیامت آئے گی تو لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ اس کا مقبوم یہ ہے کہ اس پر صرف لعنت قیامت تک ہے لیکن پھر لعنت کے ساتھ عذاب بھی مل جائے گا۔

قَالَ رَبِّ اَنْظِرْنِي اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝

”اٹیس بولا (اگر یہی اہل فیصلہ ہے) تو میرے رب مجھے مہلت دیجئے روز حشر تک۔ ل۔“

۱۰۔ فَاَنْظِرْ پرفاء سمیت کے لئے ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے اسے دھکارا گیا تھا اس لئے اس نے مہلت طلب کی تاکہ بنی آدم کو راہ راست سے بھٹکا تارے۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ۝

”جو اب ملا یشک تو مہلت دینے والوں میں سے ہے۔ ل۔“

۱۱۔ انک پرفاء سمیت کے لئے ہے کیونکہ اس کا سوال اس جواب کا سبب تھا۔ جملہ اسمیہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو مہلت دینے کا فیصلہ پہلے ہی علم الہی میں ہو چکا تھا۔ یہ اس کی دعا کا نتیجہ نہیں ہے۔

إِلَى يَوْمِ رَأَى الْقَوْمَ الْمَعْلُومَ ①

”یہ مہلت (مقررہ وقت کے دن تک ہے۔ ل۔“
 ل۔ وقت مقررہ سے مراد سچہ اولیٰ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورہ حجر میں گزری چکی ہے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأَعُوذَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ②

”کہنے لگا تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو۔ ل۔“
 ل۔ یہاں بھی لہاء سمیت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اس کو مہلت دینا اس کے لوگوں کے گمراہ کرنے کے عزم کے سبب تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت نہ ہوتی تو وہ بھی لوگوں کے گمراہ کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ لعین نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی تاکہ یہ اس کی مراد پر تسلط اور غلبہ کا وسیلہ نہ بن جائے۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخَلَّصِينَ ③

”سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا ہے۔ ل۔“
 ل۔ یعنی جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے اور گمراہی سے بچانے کے لئے منتخب فرمایا ہے یا یہ معنی کہ جنہوں نے اپنے دلوں کو اللہ کے لئے خاص کر دیا ہے۔ یہ دونوں عقوم قرأتوں کے اختلاف کی بنا پر ہیں۔ ابن کثیر ابوبکر اور ابن عامر نے اَلْمُخَلَّصِينَ کو لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ ④

”فرمایا تو میں حق ہوں۔ ل۔ اور میں سچ ہی کہتا ہوں۔ ل۔“
 ل۔ فَالْحَقُّ کو ماسم حمزہ اور یقوت نے مبتدأ محذوف کی خبر کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے یعنی انا الحق یا یہ مبتدأ ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور الحق اللہ تعالیٰ کے اسما میں سے ایک اسم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الحق یعنی او قسمی۔ باقی قراء نے حرف جر کے حذف کے ساتھ منضوم پڑھا ہے، یعنی حرف قسم حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو فالحق الحق۔
 ل۔ الحق قول۔ جملہ مقررہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم کے تکرار کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی۔

لَا مَلَكٌ جَهَنَّمَ مِثْلَ وَوَسْنِ تَبَعَكَ وَهُمْ أَجْمَعِينَ ⑤

”میں ضرور بھردوں گا جہنم کو تجھ سے اور تیرے سب فرماینداروں سے۔ ل۔“
 ل۔ یہ جملہ جواب قسم ہے اور منک سے مراد من جسک ہے تاکہ تمام شیطانوں کو شامل ہو جائے۔ وَوَسْنِ تَبَعَكَ وَهُمْ سے مراد بنی آدم ہیں۔ یعنی تم میں سے اور ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ من تبعک سے مراد کفار ہیں۔ اگر سابقہ جملہ کی تقدیر انا الحق یا حق الحق ہو تو یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہوگا۔ اجمعین دونوں ضمیروں کی تاکید ہے۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَبِّرِينَ ⑥

”آپ فرمائیے میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی اجر اور نہ میں بناؤں کرنے والوں میں سے ہوں۔ ل۔“

۱۔ علیہ کی ضمیر کا مرجع اندازاً باقران ہے یعنی میں تم سے انجام بد سے ڈرانے اور قرآن سنانے پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ تو میں قرآن اپنی طرف سے گھرنے والا ہوں یا یہ معنی کہ تم میرے حال سے واقف ہو۔ میں اپنے لئے کسی ایسی بات کا دعویٰ نہیں کرتا جو میرے پاس نہ ہو۔ یعنی میں بغیر حقیقت کے نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ خَلَّيْنَا مَا اسْتَلْكُمْ الخ کا جملہ سابقہ جملوں کے مضامین کو کاہت کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں تکلف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ علامہ بغوی نے مسروق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم عبد اللہ بن مسعود کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا اے لوگو! جسے کسی بات کا علم ہو وہ اسے کہہ دینی چاہئے اور جو نہ جانتا ہو، اسے جواب میں اللہ اعلم کہتا جائے کیونکہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے متعلق اللہ اعلم کہتا بھی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے نبی کو ارشاد فرمایا اے محبوب تم کہہ دو میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ میں جموں نے مدین میں سے ہوں (۱)۔ میں کہتا ہوں ما انفام المتكلمين ما استلکم الخ کے مضمون کی تاکید ہے کیونکہ جو کسی سے اجر کا سوال نہیں کرتا اسے بات میں تکلف کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾

”نہیں ہے یہ (قرآن) مگر نصیحت سب جہانوں کے لئے۔“

۱۔ لہٰذا جو کہ مرجع قرآن ہے عالمین سے مراد جن و انس ہیں۔ یعنی یہ قرآن جو تمام جہانوں کے لئے موعظت ہے میری طرف وہی کیا جاتا ہے اور میں اس کی تبلیغ کرتا ہوں۔

وَالْعَالَمِينَ سَبَّأً بَعْدَ حِينَ ﴿۱۱﴾

”اور (اے کفار) تم ضرور جان لو گے اس کی خبر کچھ عرصہ بعد۔“

۱۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی قرآن میں جو وعدہ اور وعید ہے اس کو جان لو گے یا اس کی صداقت کا تم اعتراف کر لو گے۔ ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں بعد حسین سے مراد بعد الموت ہے، یعنی مرنے کے بعد تم اس کی حقیقتوں کو جان لو گے۔ مکرر فرماتے ہیں بعد حسین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ حسن فرماتے ہیں اے ابن آدم مرنے کے بعد تیرے پاس یقیناً خبر آ جائے گی (۲)۔

☆

سورہ ص کی تفسیر المظہری اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 1207 ہجری کو مکمل ہوئی اور اس کے بعد ان شاء اللہ سورہ الزمر کی تفسیر ہوگی۔
وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيَّ خَيْرٍ خَلَقَهُ مُحَمَّدٌ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔
اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر عنایت سے سورہ ص کی تفسیر مظہری کا ترجمہ، فروری 2001ء بروز بدھ بعد نماز عشاء 110:45 اختتام کو پہنچا۔

أَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَأَوْلِيَاءِ أُمَّتِهِ وَأَعْلَمَاءِ أَهْلِ مَشْتَبَةِ أَجْمَعِينَ۔

اے مالک الملک ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں منظور و مقبول فرما اور ہمارے عیوب پر پردہ فرما دے اور ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور فرما دے، ہمارے گناہوں پر قلم غلو پھیر دے۔ تو معنی ہے، معنی ہے، رحمن ہے، رحیم ہے، غفار ہے، ستار ہے۔ اے ہمارے پروردگار میرے والدین پر اپنی خصوصی رحمت فرما ان کا سایہ عاقبت تادیر میرے سر پر قائم فرما۔ یا حی یا قیوم میری اولاد کو نیک سیرت بناؤ انہیں دین اور قرآن کی نعمت عطا فرما۔ اے کریم ان کی دنیا بھی بہتر فرما اور آخرت بھی بہتر فرما۔ اے کریم دارالعلوم محمدیہ نوشیہ اور اس کی برانچوں میں پڑھانے والے اساتذہ پڑھنے والے طلباء اور ان کے معاونین پر ہمیشہ کرم و احسان فرمائے رکھ۔ اے کریم میرے مرشد کریم کے آستانہ عالیہ کو اپنے ذکر اور اپنے دین کی خدمت سے آباد رکھنا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

www.muhammadiah.com

سورة الزمر

﴿ ایلہا ۷۵ ﴾ ﴿ شَوْرَةُ الزَّمْرِ ۳۹ ﴾ ﴿ مَرَكُوا عَاقِبَهَا ۸ ﴾

سورة الزمر کی ہے، اس میں پچھتر آیات اور آٹھ رکوع ہیں

قول باری تعالیٰ قُلْ يُبَادِلُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اٰیٰتِهٖ كَمَا سَوَّآءُ زَمْرِكُمْ هِيَ، اس کی 75 آیات ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی 72 آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرماتے والا ہے

تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝ اِنَّا اَنْزَلْنٰ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّیْنَ ۝

”اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو عزیز (اور) حکیم ہے۔ ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ جس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اطاعت کو۔“

۱۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مبتدا مضاف کی خبر ہے جو کہ ہذا ہے۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ہے۔ عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی ملکیت اور بادشاہی میں غالب ہے اور حکیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی صحت و کارگیری میں حکیم اور دانا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ متعلق ہے۔ یا دوسری خبر ہے یا حال ہے اور اس میں عالم معنی اشارہ یا تنزیل ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ پہلی ترکیب کے مطابق کتاب سے مراد سورت ہے اور دوسری کے مطابق قرآن کریم ہے۔

۲۔ بِالْحَقِّ سے مراد متلبسا بالحق یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب درآئیں۔ حق کے ساتھ مقرر اور ملی ہوئی ہے۔ یا اس کا معنی ہے۔ بِسَبَبِ اٰیٰتِ الْحَقِّ وَ اِظْهَارِهِ وَ نَفْصِیْلِهِ یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب حق کو ثابت کرنے کے لئے اسے ظاہر کرنے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے۔ اس میں اِنَّا اَنْزَلْنٰ کے ساتھ تنزیل کا تکرار لازم نہیں آتا کیونکہ تنزیل تو بطور عنوان ہے اور انزال جو کچھ کتاب میں ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ہے۔

مُخْلِصًا لِّلّٰهِ الدِّیْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ عبادتِ شرک اور یا کاری سے پاک ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ خبر کی تقدیم اس معنی انحصار کی تاکید کے لئے ہے جس کا فائدہ لازم دے رہا ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے صراحتاً مذکور کیا گیا ہو۔ یا پھر اسے (عبادت کے خالص معنی کو) دلائل کی کثرت اور بردہا میں کے ظاہر و باہر ہونے کے سبب علوم مقرر و محقق کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور کوئی حرف تاکید ذکر نہیں کیا۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ۝ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِیَآءَ ۝ مَا تَعْبُدُهُمْ

إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَآئِمٍ فِيهِ يَحْتَصِلُونَ
 إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾

”خبردار! صرف اللہ کے لئے ہے دینِ خالص، اور جنہوں نے بنائے اس کے سوا اور والی (اور کہتے ہیں) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان جن باتوں میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ہے اس کو جو جھوٹا (اور) بڑا شکر اہو ہے۔“

۱۔ آلا لیلید اللہین فی العالیٰ جملہ مترجمہ ہے اور یہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص اور لازم ہے کہ طاعت و عبادت خاصہ اسی کے لئے ہو کیونکہ وہی صفات الوہیت میں منفر دہے اور اسرار و رموز پر اطلاع پانے اور دل میں چھپی باتوں پر آگاہ ہونے میں ملتا ہے۔

۲۔ اور وہ کفار جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور والی بنائے ہیں اور کہتے ہیں ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لئے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں۔ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت اسی طرح ہے۔ گویا نعبدهم سے پہلے قالوا اهل مقدر ہے جو کہ ترکیب کلام میں اتخذوا اصل سے بدل ہے یا پھر قالوا سے قبل قدم مقدر ہے اور جملہ اتخذوا کے فاعل سے حال ہے۔

۳۔ ذلفی مصدر ہے جو قربی کے معنی میں ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ذلفی اسم ہے جسے مصدر کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا لیقر بونا الی اللہ تقرباً (یعنی ذلفی ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے) یا حال ہے۔ الدین اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر ان اللہ یحکم بینہم ہے۔ یعنی جن دینی امور کے بارے میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے بارے اللہ تعالیٰ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اس طرح کہ وہ جن کی راہ اختیار کرنے والوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور باطل پرستوں کو جہنم کے حوالے کرے گا۔ بے شک کسی ضمیر کا مرجع کفار اور ان کے مقابل اہل ایمان تمام لوگ ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسم موصول مبتدا کی خبر قالوا کا نعبدهم کا جملہ ہو۔ ان اللہ یحکم بینہم اور جملہ مستانفہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصول سے مراد معبودان باطلہ ہوں اور (ضمیر عائد) اور لوٹنے والی ضمیر کلام سے محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اذ اللہین اتخذوہم بین ذلویہ اولیاء۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن ملائکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بتوں کو انہوں نے والی (کار ساز) بنا رکھا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ اور جملہ ما نعبدہم قالوا مقدر کے ساتھ حال واقع ہوگا یا صلہ سے بدل ہوگا۔ اس رت میں وہ خبر نہیں ہو سکتا۔

جوہر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے آیت میں تمہیں لوگوں عامر کنا اور بنی سلمہ کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں مَا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں) (۲) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ان لوگوں سے جب یہ کہا جاتا تھا تمہارا رب کون ہے؟ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ زمین و آسمان کون نے بنایا ہے؟ تو کہتے تھے اللہ نے۔ پھر ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ ان بتوں کی عبادت اور پوجا پاٹ کا کیا مقصد ہے؟ تو جواب دیتے تھے

کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ (يُرِيْعُوْنَ يُؤْتَانَا رَبِّيَ الْغُلُوْزُ نَفِيًّا) (1)

اس صنفِ غُلُوْزِ كَلْبُت سے مراد وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بت ہماری سفارش کریں گے۔

کفار سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والے لوگ ہیں۔ اس طرح کہ وہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ہدایت دینے کا نذر ادا فرمایا ہے نہ فرمائے گا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتا تو انہیں باطنی ہدایت دے دیتا نتیجتاً وہ جھگڑاتے اور نہ کفر کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفَىٰ مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ سُبْحٰنَهُ هُوَ اللهُ
الْوٰحِدُ الْقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يَوْمَئِذٍ الْبَلِیْلُ عَلٰی
الشَّهٰرِ وَيَوْمَئِذٍ نُّفِثَ عَلٰی الْبَلِیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۗ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ
مُّسَمًّی ۗ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْعَقَّارُ ۝

”اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے تو جن لیتا اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا۔ وہ پاک ہے۔ وہی اللہ ہے جو ایک ہے سب سے زبردست ہے۔ اس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر۔ اور اس نے سحر کر دیا ہے سورج اور چاند کو۔ ہر ایک رواں ہے مقرر میعاد تک۔ غور سے سنو وہی عزت والا (اور) بہت بخشنے والا ہے۔“

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے جیسے ان کا گمان ہے تو اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا جن لیتا۔ آیت طیبہ میں ”ما“ موصولہ ہے اور جملے میں اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر منصوب محذوف ہے اور پھر موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر لا صطفی فعل کا مفعول ہے۔ اور مما میخلف اس سے حال ہے اور اس میں بھی ضمیر عائد منصوب محذوف ہے۔ یعنی ترتیب عبارت اس طرح بنتی ہے لَوْ اَرَادَ اللهُ اِتَّخَاذَ الْوَلَدِ لَا صْطَفٰی مَا يَشَاءُ هُوَ مِمَّا يَخْلُقُ۔ کیونکہ جو بھی موجود ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور دلہل سے یہ امر ثابت ہے کہ دو کا واجب الوجود ہونا مستلزم ہے اور جو واجب الوجود نہیں اس کی طرف واجب ہونے کی نسبت کرنا بھی مستلزم ہے اور اس میں بھی کوئی غیر نہیں کہ مخلوق خالق کی مثل نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کے بیٹے کے قائم مقام ہو۔ لہذا یہ کلام اس قول کی قوت میں ہے لَوْ اَرَادَ اللهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفُوْا ذٰلِکَ۔ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا) کلام ہے جزاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مما میخلف میں ما موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر مرفوع ہو اور معنی یہ ہو لَوْ اَرَادَ اللهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفٰی عَلٰی خَلْقِ الْاَشْيَاءِ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو وہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا جو چیزوں کی تخلیق پر قادر ہوتا) اور یہ امر محال ہے کیونکہ اس سے الھوں کا مستلزم ہونا لازم آتا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانے کا ارادہ کرنا مستلزم ہے۔ پھر اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے مضبوط اور پختہ کیا کہ سُبْحٰنَهُ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کو کوئی بیٹا ہو۔ هُوَ اللهُ الْوٰحِدُ الْقَهَّارُ (وہی اللہ ہے جو ایک ہے سب سے زبردست ہے) یعنی الوہیت

دُجوب کے تابع ہوتی ہے (یعنی اللہ کے لئے واجب الوجود ہونا لازم اور ضروری ہے) اور دُجوب ذات وصفات میں یکتا اور منفرد ہونے کو مستزم ہے اور مشاقت و مشارکت کی نفی کرتا ہے (یعنی نہ کوئی اس کی مثل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی شریک ہو سکتا ہے) تو پھر اس کا جینا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ جینا تو والد کا ہم جنس ہونا ہے اس لئے کہ وہ اس کے بعض اجزاء سے بنتا ہے اور اس کی قباحت کا منطبق ہونا سب سے زبردست اور قوت والا ہونا بھی اس بات کی نفی کرتا ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور اس کا کوئی بیٹا ہو۔ کیونکہ اولاد کی حاجت اسے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہوئے گا ہونے والا ہو اور اللہ تعالیٰ تو زوال پذیر ہونے اور فنا ہونے سے پاک اور ہمراہ و منزه ہے۔

پھر ما بعد قول اس پر بطور استدلال ذکر فرمایا۔ **سَخَّيْتُ السَّلْمُوتِ وَالْاَنْهَضُ بِالْحَقِّ الْاَلِيْفِ**

ع۔ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، ان میں سے کوئی بیکار اور ناکارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے پیدا فرمایا تاکہ وہ صالح بنانے والے کی قدرت پر دلیل ہو جائیں۔ وہی رات اور دن میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے ڈھانپ لیتا ہے۔ گویا کہ وہ انہیں ایسے ایک دوسرے پر لپیٹ دیتا ہے جیسا کہ لباس اپنے پہننے والے کے ساتھ لپٹ جاتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سبب غیب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ لٹاف کے سبب اس کے اندر موجود چیز غیب ہوتی ہے۔ یا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر مسلسل لگاتار اور تہہ در تہہ اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے کھانے کے تہہ در تہہ اور مسلسل ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے پیچھے لاتا ہے۔ سخن اور کلمی نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کو کم کرتا ہے اور دن کو بڑھا دیتا ہے اور پھر دن کو کم کرتا ہے اور رات میں اضافہ کر دیتا ہے (1)۔

ع۔ اور اس نے سخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو کہ ان میں سے ہر ایک تھروہ میعاد یعنی قیامت کے دن تک فلک میں روانی ہے۔ نور سے سنو، وہی غالب ہے اور ہر شی پر قدرت رکھتا ہے اور بہت بخشش والا ہے اس طرح کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور نہ وہ اس دنیا میں اپنی رحمت و منفعت سے کسی کو محروم کرتا ہے۔

**حَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَانزَلَ لَكُمْ مِنَ الٰهٖ نَعَامًا
ثُمَّ نَبَّيْنَا اٰرَافًا وَّحٰقَّقَكُمْ فِي بَطْوٰنٍ اَمَّهْتُمْ حَلَقًا مِّنْ بَعْدِ حٰقِّقٍ فِى ظُلُمٰتٍ مَّكْتُومَةٍ
ذَلِكُمْ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَہٗ السُّلْطٰنُ لَا اِلٰهَ اِلَّا ہُوَ فَاٰتٰی الصُّرٰفُوْنَ ۝۱**

”اس نے پیدا کیا ہے تمہیں فرد واحد سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا (اور پیدا کئے تمہارے لئے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے) ع۔ وہ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں (تدریجاً) ایک حالت سے دوسری حالت تین اندھیروں میں۔ یہ (قدرت والا) اللہ تمہارا رب ہے اسی کی حکومت ہے۔ نہیں کوئی معبود جز اس کے۔ پھر تم کو دھرم پھیر کر جا رہے ہو۔“

ع۔ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جنہیں بغیر ماں باپ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا) یہ رب کریم کی توحید پر دوسری دلیل ہے کہ اس نے نفس واحدہ سے ہی اس عالم سخی کو جوڑ بخشا۔ کلام میں لفظ ثم مفرد کلام پر عطف کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور وہ مفرد کلام نفس کی صفت ہے اور وہ ہے خلقہا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نفس واحدہ کو پیدا فرمایا اور پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا یا اس کا عطف معنی واحدہ پر ہے۔ یعنی من نفس واحدہ ثم

جعل منها زوجھا فلسفہا بھا: ایک نفس کو کھلانا یا پھرا اس سے جوڑا بنا دیا جس اس کے سبب وہ وہ ہو گئے (اور پھر ان دو سے تم تمام کو پیدا فرمایا) یا پھر اس کا عطف خلقکم پر ہے۔ اس صورت میں لفظ تم دو آیتوں کے درمیان تفاوت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں عادت جاریہ کا ذکر ہے، جبکہ دوسری آیت میں اس طرح نہیں بلکہ تخلیق کو دوسری قسم کا اظہار ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَلَقْتُمْ مِّنْ نَّفْسٍ کَامَعْنٰی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیٹا کو لیا تو تمام ادا و آدم کو ان کی پشت سے باہر نکالا پھر انہی سے ان کی زوجہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔

۷. وَ اَنْزَلْنَا لَكُمْ کَامَعْنٰی سے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے فیصلہ فرمایا اور تمہارے لئے بنا دیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وہ فیصلے جو لوح محفوظ میں لکھے ہوتے ہیں ان کے نفاذ کو نزول من السماء سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے یا معنی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے ایسے اسباب کے ساتھ (جانور) پیدا کئے جو حساب آسمان سے نازل ہوتے ہیں مثلاً ستاروں کی شمعیں اور بارش وغیرہ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے آٹھ جوڑے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں پیدا کئے پھر وہاں سے ان کے ساتھ تمہارے فائدہ کے لئے انہیں بھی اتار دیا۔ ثمنیۃ ازواج سے مراد آٹھ جوڑے، یعنی آٹھ جانور مذکر و مؤنث (اور وہ اونٹ گائے بھیر اور بکری جوڑا جوڑا ہیں۔ ترکیب کلام میں ثمنیۃ ازواج، الانعام سے حال ہے۔

۸. یَحْلِقُكُمْ اِنْخ سے سابقہ کلام کی وضاحت کے لئے ہے، جملہ مبینہ ہے۔ یعنی وہ انسانوں اور جانوروں کو اپنی ماؤں کے شکموں میں ترسجا پیدا فرماتا ہے۔ لیکن ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر ترجیح دیتے ہوئے خطاب صرف انہیں ہی کیا گیا ہے۔ حلقا من بعد خلق کا معنی ہے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف، یعنی پہلے نطفہ پھر ہما ہوا خون پھر گوشت کا لوتھرا پھر ہڈیاں پھر ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور بعد ازاں اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

۹. فَاَنْزَلْنَا نَسْفًا کَامَعْنٰی سے تین تاریکیوں میں۔ یعنی پیٹ کی تاریکی، رحم کی ظلمت اور جملی کا اندھیرا۔ یا پھر حلب (پشت) رحم اور پیٹ کا اندھیرا مراد ہے۔

۱۰. ذَلِکُمْ اللّٰهُ رَبُّکُمْ۔ یعنی جو یہ تمام افعال کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہی اللہ ہے تمہارا رب ہے۔ ترکیب کلام میں ذالکم مبتدا ہے لفظ اللہ خبر اول ہے۔ ربکم خبر ثانی ہے لکہ اللہ الذلک (اسی کی حکومت ہے) تیسری خبر ہے اور ذالک اللہ (اس کے سوا کوئی معبود نہیں) یہ چوتھی خبر ہے۔ یعنی اس کے بغیر کوئی بھی عبادت کے مستحق اور لائق نہیں کیونکہ پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

۱۱. فَاَنْزَلْنَا نَسْفًا کَامَعْنٰی سے اور اس میں فاء سببیہ ہے اور استفہام حقیقت سے دوری اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی تم اتنے واضح اور کامل استدلال و بیان کے باوجود راہ حق سے کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو۔

اِنْ تَنْفَرُوا فَاِنَّ اللّٰهَ عَنٰی عَنکُمْ ۗ وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ ۗ وَاِنْ تَشْکُرُوْا
 یَرْضَہُ لَکُمْ ۗ وَلَا تَوَسَّوْا اِلٰہًا اٰخَرَ ۗ وَاِنْ تَوَسَّوْا لَیْسَ لَہُمْ اِلٰہٌ اٰخَرَ ۗ ثُمَّ اِنۡی اَسْأَلُکُمْ فِیۡہِ نَبِیِّکُمْ
 ہَمَا لَکُمْ تَعْمَلُوْنَ ۗ اِنَّہٗ عَلَیۡہِمْ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۙ

”اگر تم ناشکری کرتے ہو تو بیشک اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ اور وہ پسند نہیں کرتا اپنے بندوں سے ناشکری کو۔“

اگر تم شکر اور کرم تو وہ پسند کرتا ہے تمہارے لئے سے اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔ پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے۔ بیشک وہ خوب جاننے والا ہے۔ سینوں کے رازوں کو ہے۔“

اگر تم ناشکری کرتے سو تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، یعنی اسے تمہارے ایمان لانے کی کوئی حاجت نہیں (وہ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے) اِنْ تَكْفُرُوا اشْرَطَ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور دلیل جزاء یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ عَسَىٰ عِنْدَكُمْ كُوْزُبًا کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنْ تَكْفُرُوْا يَنْفُذْ وَيُنَالُ مَكْرَهًا بِحُكْمِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَاِنَّ اللّٰهَ عَسَىٰ عِنْدَكُمْ - یعنی اگر تم کفر اختیار کرتے ہو تو اس کفر کا وبال تمہیں پر پڑے گا نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے، اسے کوئی ضرورت اور حاجت نہیں تم اس کے محتاج اور ضرورت مند ہو کہ تمہیں ہی کفر اور ناشکری کے سبب ضرر اور نقصان پہنچے گا اور ایمان کے سبب تمہارا ہی فائدہ اور نفع ہوگا۔

عَلَىٰ وَلَا يَلْمِزُ لَمْ يَلْمِزْ جَاہِلًا مِّنْ قَبْلِهِ پر عطف ہے۔ یعنی کفر اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے اگرچہ وہ اسی کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ قَسَبٌ يُّرْوَدُ اللّٰهَ اَنْ يُّعَذِّبَهُ يَعْذِبُهُمْ صَدْرًا لِّلَّذٰلِكَ اَوْ مِنْ قَبْلُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ يَعْذِبُهُمْ صَدْرًا كَمَا هُوَ حَقٌّ حَقًّا سَبَّحًا۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کے سینے کو انتہائی تنگ کر دیتا ہے۔ یہی حکم سلف کا قول ہے اور اسی پر اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع ہے۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ (وہ کفر اور معصیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کی طرف نہیں کرتے)

علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا (1) اور ان سے مراد وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے (شیطان کو) فرمایا تَقَارِبُ عِبَادِي لِيُقْسِمَ لَكَ اَعْلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ - بیشک میرے بندوں پر تیرا ظلم نہیں ہو سکتا۔ اس قول کا معنی اور بنیاد اس پر ہے کہ یہاں رضا مجازی طور پر ارادہ رکھنے کے معنی میں ہو۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ نہ تو رضا ارادہ کو مستلزم ہے (کہ رضا کے لئے ارادہ کا پایا جانا ضروری ہو) اور نہ رضا ارادہ کا مراد ہے اور ہم معنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو خیر اور شر تمام کو شامل ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔ اور مراد کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف ہونا محال ہے (یعنی یہ وہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کچھ ہو جائے یا وہ چاہے تو کچھ نہ ہو یا وہ چاہے تو خود ارشاد فرمایا ہے اِنَّمَا تَوَلَّوْنَا لِلْبَاطِنِ عَدَاوَةً اَلَا اَرٰى اَنْ تَقُوْلُوْنَ لَنْ نَّقُوْلَ لَكُمْ اَنْ تَقُوْلُوْنَ ۝۱۰

سے اِنْ تَشْكُرُوْا يَزِدْكُمْ لَكُمْ اور اگر تم شکر اور کرم تو وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔ یعنی اگر تم اپنے رب کے ساتھ ایمان لے آؤ اور اس کی اطاعت و فرما داری اختیار کرو تو وہ تمہیں اس پر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ یہی حاصل معنی ہے کیونکہ رضا ثواب دینے کو مستلزم ہے (یعنی رضایہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کے سبب اجر و ثواب دیا جائے) یروضہ اصل میں یروضہ تھا۔ جواب شرط ہونے کی وجہ سے حالت جزئی میں الف ساکت ہو گیا۔

نافع عاصم حمزہ اور ہشام نے حواہ ضمیر کی حرکت کو اپنی حالت پر برقرار رکھتے ہوئے اکتلاں (انفیر پر کے حرکت کو پڑھنا) کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کا باقی لفظ تقدیر آسان ہے۔ جبکہ ابو عمرو وابن کثیر ابن ذکوان اور کسایی نے حرکت کو اعتبا (حرکت کو پڑھنا) کے

وَالْأُنْبِيَّ ۝ میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا لیتا ہے تاکہ دین اسلام کی راہ سے بہکا دے۔ ابن کثیر ابو عمرو اور روئیس نے لخصاً لکھا ہے کہ یہ کفر ہے۔ جب منال اور اضلال اس ترتیب پر مذکور ہوں تو انہیں علیہ غایہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا لازمی نتیجہ خود گمراہ ہونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہی ہوتا ہے گویا یہی علیہ غایہ اور مقصود ہو جاتا ہے) جیسا کہ اس ارشاد میں بھی (لا تعلیل علیہ غایہ کے بیان کیلئے مذکور ہے فَاتَّقِطَّةَ الْفُلِّ فَيُؤَمِّنُونَ لِيُؤَمِّنُوا لَهُمْ عَدُوًّا وَحَكْمًا) (آل فرعون نے (موسیٰ علیہ السلام) کو اٹھا لیا نتیجہ وہ ان کے لئے دشمن اور باعث غم بن گئے)۔

یعنی اے محمد ﷺ! آپ اس کا فرکو کہہ دیں تو وہ دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے۔ اس قبیل مدت سے مراد مرنے کے وقت تک دنیوی زندگی کے دن ہیں۔ یہ امر تہدید اور جھکر کے لئے ہے۔ اس میں کفار کو آخرت میں (نعمتوں سے) لطف اندوز ہونے سے مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی آخرت میں ان کے لئے کوئی ایسی نعمت نہیں ہوگی جو ان کے لئے راحت بخش اور سکون آور ہوگی) یہی وجہ ہے کہ اس کی علت استہناف کے طریقے پر اپنے اس قول کے ساتھ بیان فرمائی اِنَّكَ يَوْمَئِذٍ مُّصْطَبٍ عَلَّامٍ۔ (وجہ یہ ہے) کہ بیشک تو دوزخیوں میں سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں نازل ہوئی۔ متعلق نے کہا ہے یہ آیت ابوحنیفہ بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی (۱)۔

اَمَّنْ هُوَ قَائِمٌ اَنْتَاَ الْبَيْلِ سَاجِدًا اَوْ قَابًا يَّحْدُمُ الْاِخْرَجَةَ وَيَرْجُو اَسْرَمَةَ رَبِّهِ ۝ مُلْكٌ
هَلْ يَسْتَوِي الْاَنْبِيَاءُ لَنْ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِينَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ كِسْفٌ مِّنَ الْاَنْجَابِ ۝

”بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے کبھی کھڑے ہوئے (یاں ہمہ) ڈرتا ہے
آخرت سے اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی۔ آپ پوچھئے کیا براہر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل۔ البتہ
صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔“

بھلا جو شخص عبادت کے وظائف ادا کرتے ہوئے رات کی گھڑیاں ادا کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ قنوت سے مراد قرآن کریم کی تلاوت اور (عبادت کی فرض سے) طویل قیام کرنا ہے۔

ابن کثیر بائع اور حزرہ نے منن کی نیم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے رات گزارتا ہے وہ اس کی مثل ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے کئی شریک اور مقابل بنا رکھے ہیں؟ یا قیوں نے نیم کو تشدید پڑھا ہے۔ اس صورت میں اَمَّ مقطوع ہوگا اور معنی اس طرح ہوگا اَمَّنْ هُوَ قَائِمٌ سَخْمَنٌ جَعَلَ لَهٗ اَنْدَادًا۔ (کیا طاقت و عبادت میں ہمہ تن مشغول رہنے والا اس کی مثل ہو سکتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک بنا رکھے ہیں) یا پھر اَمَّ متصل ہوگا اور کچھ عبارت محذوف ہوگی تقدیر کلام اس طرح ہوگی اَمَّنْ جَعَلَ اللّٰهُ اَنْدَادًا وَّلَمْ يَشْكُرْ نِعْمَتَهُ خَيْرٌ اَمَّ مَنْ هُوَ قَائِمٌ۔ کیا وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک بنا رکھے ہیں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا وہ بہتر ہے یا وہ جو طاقت و عبادت کرتے ہوئے رات کی گھڑیاں بسر کر دیتا ہے؟

ساجدا و قائما یہ دونوں فائز کی تیسری حالت ہیں۔ معنی یہ ہوگا درآ خمالیکہ وہ حالت نماز میں کبھی سجدہ کر رہا ہوتا ہے اور کبھی سر اُپا ادب بن کر ہاتھ باندھے (کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور کمزور خیال کرتے ہوئے آخرت کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے اور فقط اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ اپنے اعمال پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتا، یعنی وہ خوف ورجاء (امید) دونوں کو جمع کئے ہوتا ہے۔ نہ تو اتنا زیادہ خوف رکھتا ہے کہ بالکل ہی اپنا اور ناپا امید ہو جائے کیونکہ اس کے بارے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَیْسَ مِنْ شَرِّ دُخَانِ اللّٰهِ اِلَّا اللّٰهُ فَاَلْقُوْهُمُ الرِّجْمَ ۝۱۰۔ کہ فقط تو م کفار ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناپا امید ہوئی ہے اور نہ ہی رجاء (امید) میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بالکل ہی پر امن اور مطمئن ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بارے ارشاد خداوندی ہے فَلَا یَاۡتِیْہُمْ مِّنْکُمْ اِلَّا اللّٰهُ فَاَلْقُوْهُمُ الرِّجْمَ ۝۱۰۔ (اللہ تعالیٰ کی تدبیر (گردش) سے فقط خسارہ اٹھانے والے لوگ ہی مطمئن اور پر امن ہوتے ہیں)

ترکیب کلام میں دونوں بیعت (بعذر الاخیرہ اور یوجوار حیمۃ ربہ) حال کے محل میں واقع ہیں یا پھر علت بیان کرنے کے لئے محل ایضاً میں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ضحاک کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی۔

ابن ابی سعید نے کلبی سے ابوصالح کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (1)۔

جوہر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعود عمار بن یاسر اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ضحاک نے کہا ہے یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے نازل ہوئی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (3)۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے بھی آپ سے نقل کیا ہے۔

کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعود عمار اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم کے بارے نازل ہوئی (4)۔ مذکورہ تمام اقوال میں وجہ اجتماع و تطبیق یہ ہے کہ یہ آیت ان تمام افراد کے بارے میں نازل ہوئی۔

آپ پوچھنے کی بارہا ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات جلال و جمال سے متصف ہے پھر اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اس کی طاعت و عبادت کے اعمال کرتے ہیں اور معاصی و گناہوں سے بچتے ہیں اور وہ لوگ جو یہ نہیں جانتے (ایسے نظریات اور اعمال سے وہ ناواقف اور جاہل ہیں) اس آیت طیبہ میں استفہام انکاری ہے، یعنی بالیقین یہ لوگ آپس میں مساوی اور برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ جملہ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کی تائید بھی کرتا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کی تائید کرتا ہے مگر تشبیہ کے طریقے پر۔ یعنی جس طرح عالم اور جاہل آپس میں برابر

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 605 (اعلیٰ)

2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 605 (اعلیٰ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (اعلیٰ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (اعلیٰ)

اور ہم رجحان نہیں ہو سکتے اسی طرح اطاعت شعار اور گنہگار مطیع و فرمانبردار اور معصیت اور گناہ کا ارتکاب کرنے والا بھی آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ (گویا پہلے جملے کی اس جملے میں تشبیہ بیان کی گئی ہے)

بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلے جملے میں دونوں فرقیوں کے مابین قوت عملیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کی گئی ہے اور اس کے بعد اس جملے میں دونوں کے درمیان قوت عالیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کر دی گئی ہے تاکہ دونوں کے مابین کامل فرق ظاہر ہو جائے اور ایک فریق کی دوسرے پر فضیلت اور فوقیت بالکل واضح ہو جائے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ حَضْرَةَ عَمَّارِ بْنِ عَبْدِ مَنَّانٍ کے بارے کہا گیا ہے اور اَلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ابُو حَنِيفَةَ مَخْرُومٍ کے لئے۔ انعام بند کو سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کے بیانات اور امثلہ سے صرف عقلمندی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

قُلْ لِيَعْبُدِ الَّذِينَ يَنْبَغِيهِمْ اَمْشُوا اَتَقُوا بِكُمْ لِيَذْنِبَ اَحْسُو اِنِّي هُذِيَ الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَ اَرْضٌ نَّارٌ وَسَعَةٌ اَلْمَالُ يَوْمَئِذٍ كَالصُّبُرِ ۗ اَجْرُهُمْ بِعَيْرٍ حَسَابٍ ۝

”آپ فرمائیے اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے۔ (اور یاد رکھو) ان کے لئے جنہوں نے نیک اعمال کئے اس دنیا میں نیک صلہ ہے۔ اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔ (مصائب و آلام میں) صبر

کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“

۱۔ اَحْسُو یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خوب اچھی طرح عمل کئے یعنی اعمال کو خوب خشوع و خضوع اور عاجزی و انکساری کے ساتھ ادا کیا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا الاحسان ان تعدد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔ احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تجھے یہ کیفیت حاصل نہ ہو (یعنی اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا) تو پھر یہ یقین جانے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (پس یہی کسی طاعت و عبادت کی خوبی اور حسن ہے) اَحْسُو اِنِّي هُذِيَ الدُّنْيَا، اَحْسُو کے متعلق ہے (یعنی جنہوں نے اس دنیا میں نیک عمل کئے ان کے لئے آخرت میں اچھا صلہ ہے۔ اور وہ جنت ہے۔) (حسن سے مراد یہی ہے) ترکیب کلام میں حسنہ مبتدأ ہے اور اَلَّذِينَ اَحْسُو اَمْرٌ ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ اَتَقُوا بِكُمْ کی علت بیان کر رہا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ کَفِي الدُّنْيَا ظَرْفٌ مُسْتَقَرٌّ حَسْبُكَ سے حال ہے اور بھروسہ طرف مستقر کا فاعل ہے اور اس سے میری مراد قول باری تعالیٰ اَلَّذِينَ اَحْسُو اَمْرٌ ہے۔

سہمی نے کہا ہے کہ کَفِي هَلِي وَ الدُّنْيَا حَسَنَةً سے مراد صحت اور عافیت ہے (1) لیکن یہ قول صحیح اور قوی نہیں ہے کیونکہ صحت و عافیت تو جس طرح مومن کو عطا ہوتی ہے اسی طرح کافر کو بھی ملتی ہے بلکہ کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ (یعنی کافر صحت و عافیت کے ساتھ ہوتا ہے اور مومن اس نعمت سے محروم ہوتا ہے)

۲۔ اور اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے لہذا کفار کی مزاحمت کے پیش نظر طاعت و عبادت میں کوتاہی اور غفلت کرنے والوں کے لئے کوئی عذر نہیں۔ اس آیت میں اشارہ ایسے شہر سے ہجرت کر جانے کا مطالبہ ہے جس میں خیر اور نیکی کے اعمال کرنے میں دشواری اور تکلیف کا

اگر ثواب عطا فرمانے کیلئے ترازو لگائے جائیں گے اور ان کے اعمال کا پورا پورا اجر دیا جائیگا) اور پھر مصائب و آلام پر صبر اختیار کرنے والوں کو لایا جائے گا اور ان کے لئے میزان نصب نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال کے رجسٹر کھولے جائیں گے بلکہ ان پر تو اجر کی بارش کر دی جائے گی حتیٰ کہ عافیت و صحت کے ساتھ رہنے والے بھی وہاں مقام حساب میں یہ تمنا اور رزق رکھنے لگیں گے کاش ان کے جسم بھی قیچیوں کے ساتھ کاٹے جاتے۔ ان میں یہ خواہش مصائب برداشت کرنے والوں کے اجر و ثواب کو دیکھ کر پیدا ہوگی (۱)۔

ترمذی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن (دین کی خاطر) مصائب برداشت کرنے والوں اور اذیتوں پر صبر اختیار کرنے والوں کو اجر و ثواب سے نوازا جائیگا تو دنیا میں عافیت کے ساتھ رہنے والے بھی یہ خواہش کرنے لگیں گے کہ اگر ان کے جسموں کو بھی قیچیوں کے ساتھ کاٹا جاتا (۲) (تو آج انہیں بھی ان صبر کرنے والوں کا سا اجر و ثواب ملے)

میں کہتا ہوں شاید اہل البلاء سے مراد اہل عشق ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شہید کو اہل بلاء میں سے شمار نہیں کیا گیا حالانکہ دنیا کی مصیبتوں اور آفاتوں میں سے شدید ترین آزمائش قتل ہے اور شہید نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے پر صبر اختیار کیا ہے۔ (اور اس تکلیف کو برداشت کیا ہے۔)

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۗ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ

أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ۝ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

”فرمائیے! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اس کیلئے اطاعت کوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ آپ فرمائیے! میں ڈرتا ہوں اگر میں حکم عدولی کروں اپنے رب کی اس بڑے دن کے عذاب سے۔“

۱۔ نافع نے اتنی میں یاہو کوفتہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔

مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ کا معنی ہے کہ میں فقط اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کروں (کوئی دوسرا ان میں شریک نہ ہو)

۲۔ مجھے اخلاص کا حکم دیا گیا ہے تاکہ میں دنیا میں اور آخرت میں تمام سے آگے بڑھ جاؤں کیونکہ حقیقت کا انحصار اخلاص پر ہی ہے یا پھر اس لئے اخلاص کا حکم دیا گیا تاکہ میں قریش اور ان جیسے دین رکھنے والوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو جاؤں۔

دونوں آیتوں کے درمیان حرف عطف مغائرت کے لئے ہے چونکہ دوسرا امرت علت کے ساتھ مقید ہے اس لئے وہ پہلے کا مغائر ہے۔ کیونکہ پہلا امر تو ایسی عبادت کا ہے جو اخلاص کے ساتھ مقترن ہو (یعنی پہلی آیت میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم ہے) چونکہ عبادت کا حکم دیا گیا ہے اس لئے وہ ذاتی طور پر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس میں اخلاص پایا جائے اور عبادت اس لئے بھی اخلاص کا تقاضا کرتی ہے تاکہ سبقت دینی حاصل ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ لان اکون میں لام زائدہ ہو جیسا کہ اردت لان الفعل میں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا) میں ہے تو اس صورت میں امر سب سے اول خود اسلام قبول کرنے کیلئے ہوگا تاکہ اسلام کی دعوت دینے کے امر کے بعد اس دعوت کا آغاز اپنی ذات سے ہو کیونکہ آپ ﷺ کو لوگوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے یہ تقاضا

کرتا ہے کہ آپ ﷺ سب سے پہلے مسلم ہوں کیونکہ کسی غیر کو دعوت دینا اپنی ذات کو اس دعوت کے ساتھ متصف کرنے کی فرخ ہے۔ اس اسلوب بیان میں دوسروں کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے، یعنی میں تمہیں ایسی چیز کی طرف ہی دعوت دے رہا ہوں جو تمہارے لئے انتہائی نفع بخش اور بہتر ہے۔ کیونکہ اگر وہ مفید اور بہتر نہ ہوتی تو میں ذاتی طور پر اسے کبھی اختیار نہ کرتا حالانکہ سب سے پہلے میں نے اپنے لئے اسے اختیار کیا ہے۔

اس نافع ابو عمر داور ابن کثیر نے الیٰ کو یا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے کون کے ساتھ۔

آپ فرمادیتے ہیں کہ اگر اخلاص ترک کر کے اور جس شرک و برے اعمال میں تم مبتلا ہو ان کی طرف مائل ہو کر میں اپنے رب کی حکم عدولی اور نافرمانی کروں تو میں اس بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس آیت میں بھی سابقہ آیت کی طرح گناہوں (کے انجام) سے ڈرانا اور اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ کو اپنے آباء و اجداد کا دین اپنانے کی دعوت دی گئی (۱)۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لِّدِينِي ۗ فَاَعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ ۗ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخَسِرَانُ الَّذِيْنَ

”فرمائیے اللہ کی ہی میں عبادت کرتا ہوں خالص کر کے ہونے اس کے لئے اپنے دین کو۔ پس تم عبادت کرو جس کی چاہو اس کے سوا (نیز) فرمادیتے ہیں اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو گناہوں میں ڈالیں گے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن۔ سنو! یہی کھلا گناہ ہے۔“

پہلے یہ خبر دینے کا حکم ارشاد فرمایا کہ آپ کو عبادت کرنے اور اس میں اخلاص پیلے کر کے کا حکم دیا گیا ہے اور اس آیت میں یہ خبر دینے کا حکم دیا گیا ہے کہ میری عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ایک تو یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ اس کی مخالفت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ رہیں اور ساتھ ہی کفار کی تمام آرزوں اور امیدوں کو منقطع کرنے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے۔ (کیونکہ وہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید رسول اللہ ﷺ ان کی رائے اور تجویز قبول فرما کر اپنے آباء و اجداد کے دین پر چل پڑیں گے لیکن یہ حکم فرما کر انہیں مطلع کر دیا گیا کہ ایسا ممکن ہی نہیں بلکہ میری عبادت خالص اللہ کے لئے ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ انہیں خوفزدہ کرنے اور رسوا کرنے کے لئے انہیں فرمایا تم اللہ کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔ ترکیب کلام میں یہ جواب شرط ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے اِنْ لَّمْ تَوَافَّقُوْا فِي الْعِبَادَةِ خَالِصًا فَاَعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ۔ اگر تم عبادت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرنے میں میری موافقت نہیں کرتے تو پھر تم جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔ پس اس کے سبب جو عذاب تم پر آئے گا اور جو خسار تم اٹھاؤ گے عقرب تمہیں اس کا طم ہو جائے گا تم اس کا مشاہدہ کر لو گے۔

اس آیت پر فرمادیتے ہیں اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور گھر والوں کو گمراہی کے سبب خسارے میں ڈالیں گے، (اہلہم سے مراد ان کے تعین یعنی بیویاں اولاد اور خدمتکار غلام ہیں) جبکہ قیامت کے دن انہیں جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

ترکیب کلام میں یوم القیامۃ خسروا کی طرف ہے۔ یہ خسرو الناجو سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی تاجر اپنی تجارت میں دھوکہ کھا جائے اور نقصان اٹھائے۔ تو چونکہ ان لوگوں نے بھی خود گمراہ ہونے اور اپنے گمراہوں کو گمراہ کرنے کے سبب جنت میں اپنے حصوں کو جہنم میں موجود اپنے حصوں کے ساتھ بدل ڈالا ہے (یعنی انہوں نے جنت میں اپنے حصے اہل ایمان کے حوالے کر دیئے اور ان کے بدلے اہل ایمان کیلئے جہنم میں مقرر شدہ حصے ان سے لے لئے اس لئے ان کے لئے خسارے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) خسرو فعل اصلاً زام ہے لیکن یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔ (کیونکہ اَنْفُسُهُمْ ذُنُوبُهُمْ اس کا مفعول ہے)

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خسروان الاہل کے بارے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے جنت میں ایک گھر اور اس کے لئے اہل بنا رکھے ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اعمال کئے تو وہ اس گھر اور اپنے اہل کو پالے گا اور جس نے گناہ اور معصیت کا ارتکاب کیا تو اس کا گھر اور اہل اس کی بجائے دوسرے اطاعت و شعار اور فرمانبردار آدمی کے حوالے کر دیئے جائیں گے (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ اس تفسیر کی بناء پر خسرو کا معنی ہے فوت اہل۔ یعنی اس نے اپنے اہل کو ضائع کر دیا یا گم کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ خسروان الاہل کا مفعول یہ ہے کہ ان کو اس کے گمراہ والے اہل جہنم میں سے ہیں تو وہ اس کے گمراہ کرنے کے سبب دوزخ میں پھینچے ہیں اور یہ گمراہ اہل جنت میں سے ہیں تو یہ خود گمراہ ہو کر جہنم میں جا پہنچا۔ جس سے واپسی ممکن نہیں۔ لہذا اس طرح یہ ان سے دور ہو گیا۔

اس سنو اقیامت کے دن کا خسارہ ہی اتنا واضح اور کھلا خسارہ ہے کہ خسارے کی تمام اقسام میں سے کوئی بھی اس جہنمی نہیں۔ کیونکہ دنیا کا خسارہ آسان ہے اور تبدیل ہو سکتا ہے (جبکہ قیامت کے خسارے میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں) اس آیت میں کئی مبالغات کے ذریعے ان کے خسارے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ جملہ مستاتھ ہے اور اس کی ابتداء لفظ الا سے کی گئی ہے پھر درمیان میں ضمیر فصل ہو کر کی گئی ہے اور لفظ خسروان کو معرفہ ذکر کیا گیا اور پھر اس کی صفت اطمین ذکر کی گئی ہے اور پھر ما بعد آیت میں خسروان کی وضاحت فرمائی۔

لَهُمْ مِنْ قَوْقُبِهِمْ ظُلُلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلُلٌ ۗ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادًا ۗ لَّيُبَادِيَ قَاتِلُوْنَ ﴿۱۰﴾ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰجَسْتَبُوْا الطَّاغُوْتِ اَنْ يَّعْبُدُوْا هَا وَاَنَا نُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ قَبِيْرٌ عِبَادٍ ﴿۱۱﴾ ۝ الَّذِيْنَ يَّسْتَعْبُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اٰحْسَنَهٗ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰى اللّٰهُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْاَوْلٰٓئُ الْاَلْبَابِ ﴿۱۲﴾

”ان (بدبختوں) کے لئے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور نیچے سے بھی آگ کے شعلے۔ اس (عذاب الیم) سے ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اُسے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو! اور جو لوگ بچتے ہیں شیطان سے کہ اس کی عبادت کریں اور (دل سے) جھکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے لئے عذاب ہے۔ پس آپ مژدہ سنا دیں میرے ان بندوں کو! جو غمور سے سنتے ہیں بات کو پھر بیرونی کرتے ہیں اچھی بات کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے۔ اور یہی لوگ دانشور ہیں۔“

۱۔ ان بدبختوں کے لئے اوپر سے بھی آگ اور دھوئیں کے چھا جانے والے پردے اور نیچے ہوں گے اور نیچے سے بھی انتہائی گہرائی

تک آگ کے فرش اور بستروں کے۔ بیچے والے فرش کو بھی ظلل (سائبان) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے نیچے والوں کے لئے سائبان ہی ہوں گے۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں واقع کرنے سے بچائیں (یعنی ایسے کاموں سے اجتناب کریں جن کے سبب وہ اس عذاب الیم میں مبتلا ہو سکتے ہیں) اسے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو اور ایسے کام نہ کرو جو میری ناراضگی اور عذاب کا موجب ہوتے ہیں۔

۳۔ اور جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں (طاغوت کا معنی ہے سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا۔ انتہائی زیادہ سرکشی۔ یہ فعلوت کے ذریعہ ہے، مصدر میں ہانڈ کے اظہار کے لئے لام کلمے کو عین پر مقدم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رحوت ہے۔ پھر صفت میں اظہار ہانڈ کے لئے اسی کے ساتھ وصف بیان کر دیا گیا۔) تو چونکہ سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا شیطان ہے اس لئے طاغوت کا لفظ شیطان کے لئے مختص ہو گیا۔ علاوہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے طاغوت سے مراد بت لئے ہیں۔ کیونکہ قول باری تعالیٰ ان بعدوہا میں حاشیر مونت کا مرجع لفظ طاغوت ہے اور یہ تمکیر طاغوت سے بدل اشتمال ہے اور یہی اس کی دلیل ہے کہ طاغوت سے مراد بت ہیں۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو چھوڑ کر دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں ان کے لئے اجر و ثواب کی بشارت ہے۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اور موت آنے کے وقت ملائکہ کی زبان سے ان کے لئے خوشخبری اور مراد ہے۔ یعنی وہ لوگ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں بشارت دی جائے انہیں مراد بنایا جائے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا فبشرو عبادا۔ اے محمد ﷺ! آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیں۔

ابو شیبہ نے حالت وصل میں عباد کو یا مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقت میں یا ہما سن کے ساتھ اور ابو ہریرہ نے بڑی کی روایت سے حالت وصل میں یا مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقت میں یا ہما کھڑف کر دیا ہے۔ ابو عمر کے قول کا قیاس بھی یہی ہے کہ وہ حالت وقت میں صرف علامت کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ قراء نے حالت وصل اور حالت وقت دونوں میں یا ہما کھڑف کر دیا ہے۔

جویر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ لہا سبعۃ ابواب الایۃ نازل ہوئی تو انصار میں سے ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے سات غلام ہیں میں نے (سات دروازوں میں سے) ہر ایک سے (داخل ہونے کے لئے) اپنے تمام غلاموں کو آؤ زاد کر دیا (۱) تو اس وقت آیت کریمہ فبشرو عبادی نازل ہوئی۔

۴۔ یَسْتَسْمِعُونَ الْقَوْلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم اور دوسرا کلام سنتے ہیں۔ پھر اتباع اور بیروی قرآن کریم کی کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا کلام بھی سنتے ہیں اور کفار کا کلام بھی۔ لیکن بیروی رسول اللہ ﷺ کے کلام کی کرتے ہیں (پہلے معنی کے مطابق احسن سے مراد قرآن کریم اور دوسرے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ اور قول سے مراد مطلق کلام ہو گا جسے وہ کوئی ہو اور کسی کا ہو۔) سیاق کلام کا اقتضا تو یہ ہے کہ یہاں فبشرو ہم مذکور ہوتا۔ لیکن ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھتے ہوئے فرمایا قَبِيضَةً جَبَادًا اَنْزَلْنَا يَسْمَعُونَ الْخَبْرَ تو یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کے شیطانوں سے بچنے کا مبداء اور بنیاد یہ ہے کہ وہ مختلف اقوال کا تنقیدی تجربہ کر سکتے ہیں یا کثیرہ اور غیث کلام کے مابین تمیز کر سکتے ہیں۔ اچھے اور برے کے درمیان فرق کر سکتے ہیں اور پھر حسن اور احسن کے مابین

بھی امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لے آئے تو حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم ان کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے ایمان لانے کے بارے میں دریافت کیا۔ پس آپ نے انہیں اپنے ایمان لانے کی خبر دی تو وہ بھی ایمان لے آئے۔ چنانچہ ان تمام کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ مذکورہ تفسیر کے مطابق احسن (اسم تفضیل) بمعنی حسن (صفت مشبہ) ہے کیونکہ کفار کے کلام میں کوئی حسن اور خوبی موجود نہیں (کہ اس کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو احسن کہا جائے۔)

ابن زید نے کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں ان تین افراد کے بارے میں نازل ہوئیں جو زمانہ جاہلیت میں لا الہ الا اللہ کہا کرتے تھے اور وہ ہیں زید بن عمرو بن نفیل یا سعید بن زید ابو زرقاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اس صورت میں احسن سے مراد لا الہ الا اللہ کہنا ہے (1)۔ سدی نے کہا ہے کہ جن احکام کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ان میں سے حسین ترکی وہ پیروی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ظالم سے بدلہ لینے اور اسے معاف کر دینے کا ذکر کیا ہے لیکن ان دونوں امروں میں سے معاف کر دینا احسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عزائم اور رخصتوں کا ذکر بھی کیا ہے مگر ان میں سے عزائم احسن ہیں (2)۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ دانشور ہیں۔ یعنی ان کی عقلیں توہمات اور رسوم و رواج کی معارضت سے محفوظ اور پاک ہیں۔ اس آیت میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نفس کے اسے قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہدایت کو پیدا کرتا ہے اور نفس انسانی اسے قبول کرتا ہے۔)

أَقْسَمَ حَقٌّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَقَانَتْ تُسْعِدُ مَنْ فِي النَّارِ ۖ لَكِنَّ الَّذِينَ
اتَّقَوْا سَأَلَهُمْ عَرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا عَرَفٌ مَّيْبُتَةٌ ۚ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
وَعَدَ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ الْوَيْعَادَ ۝

”بھلا جس پر واجب ہو گیا عذاب کا حکم۔ تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں سے الہ البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لئے بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ رواں ہیں جن کے نیچے سے نہریں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا۔“

بھلا اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں جس پر عذاب کا حکم واجب ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی میں نے نہیں آگ کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اے محمد ﷺ! تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں سے۔ یعنی آپ اس کی قدرت نہیں رکھتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد ابواب اور اس کا بیٹا ہے (3)۔ ترکیب کلام میں جملہ شرطیہ محذوف جملہ پر معطوف ہے جس پر کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے: نَأْتُكَ مَالِكٌ أَفْرَهُمْ حَقٌّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ فَأَنْتَ تَنْقُذُهُ مِنَ النَّارِ۔ کیا آپ اس کے معاملے کے مالک ہیں جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے اور آپ

اسے آگ سے پھانسنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ (یعنی ایسا قطعاً نہیں ہو سکتا) اس انکار کی تاکید اور بعید از امکان کو ظاہر کرنے کے لئے جزاء میں ہمزہ استفہامیہ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے اور اسی لئے ضمیر کی جگہ پر من فی النار اسم ظاہر رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس پر دلالت کرنے کیلئے کہ جس کے لئے عذاب کا حکم ہو چکا ہے ایسے ہی ہے گویا اس میں واقع ہو چکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی منع ہے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا نہیں ایمان کی طرف دعوت دینے میں انتہائی جہد و جہد اور کوشش کرنا نہیں آگ سے پھانسنے کی ہی سعی اور کوشش تھی۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ امانت تنقذ جملہ مستافد ہو اور اسی معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہو اور جزاء محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ اَقْمَنَ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ فَهَدِيَهُ الْفَالْتِ تَنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ۔ کیا جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے آپ سے بدایت دے سکتے ہیں۔ کیا آپ اسے چھڑا سکتے ہیں جو آگ میں ہے۔ (یعنی یہ ممکن نہیں) کیونکہ جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے گویا کہ وہ ابھی سے آگ میں ہے۔ پھر اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید رسول اللہ ﷺ کی سعی و کوشش مطلقاً غیر مفید اور بے سود ہے تو اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے ما بعد کلام ارشاد فرمایا۔

لیکن وہ لوگ جن کے لئے اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں رحمت کا حکم واجب ہو چکا ہے تو وہی اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ آیت طیبہ میں اس مقام پر صیغہ ماضی یہ معنی ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے لئے معافی بننے کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ ایسے ہی ہیں گویا کہ تقویٰ کی صفت سے متصف ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے جنت میں انتہائی عالیشان اور بلند و بالا بالا خانے ہیں اور پھر ان کے اوپر ان سے بھی بلند تر بالا خانے ہیں اور ان تمام اوپر والے اور نیچے والے بالا خانوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان بالا خانوں کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ یہاں وعدہ مصدر ہے جو تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ لہم غرف وعدہ کے معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا کیونکہ وعدہ خلافی نقص اور عیب ہے (اور اللہ تعالیٰ نقص و عیب سے پاک اور منزہ ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت محال ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اصل جنت اوپر کے بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دکھائیں گے جیسے تم دور مشرق و مغرب کے اقیانوس پر باقی رہ جانے والے چپکے ستارے کو دیکھتے ہو اور ایمان کے درمیان مراتب و درجات کے باہمی تقاضا اور فرق کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اوہ تو انبیاء علیہم السلام کے محلات ہوں گے کوئی اور ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ محلات ایسے لوگوں کے لئے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان لائے اور انبیاء و رسل کی تصدیق کی (1)۔ اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں ہم نے وہ سورہ فرقان میں اَوْ تَلَّكَ يُحْزِنُ ذُنُوبُكَ فَتَنَادِيكَ مِنَ الْغُرُفَاتِ فَتَسْتَجِيبُ لَهَا ذِكْرُكَ دَرِيًّا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعٌ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهَا زُرْعًا مُّحْتَلِفًا اَلْوَانُ ثُمَّ يَمِيزُ فِتْرَتُهُ مُصَفًّوۃً اَلَمْ يَجْعَلْهُ حَطَامًا اِنَّ فِي

ذٰلِكَ لَنْ كُوِّمَىٰ لِاُولٰٓئِكَ ۝۱۱

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی پھر جاری کیا اسے زمین کے چشموں سے پھر اگا تا ہے اس کے ذریعہ فصلیں جن کے رنگ جدا جدا ہیں پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے پس تو دیکھتا ہے اسے زردی مائل پھر وہ اس کو چورا چور کر دیتا ہے۔ یقیناً اس (کرشمہ و قدرت) میں نصیحت ہے اہل عقل کے لئے۔“

۱۔ مآلو سے مراد بارش ہے۔ نمل میں استفہام انکاری ہے (چونکہ تم نہیں دیکھتے) فعل نملی ہے) اور نئی کا انکار اثبات ہوتا ہے (تم دیکھتے ہو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش نازل کی ہے) ترکیب کلام میں ان اپنے جملہ کے ساتھ ل کر لم تو کے دو مفعولوں کے ساتھ مقام ہے۔ فسئلکۃ یتاۓبہم فی الازہر فیض کا معنی ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین کے چشموں میں داخل کیا۔ اس میں طرف سلکۃ کے معلق ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے کُلُّ ذٰلِكَ سَخْلَةٌ فَاَقْبُوْبُ الْعَجْرُوْبِ ۝۱۱ اور ینابیع ضمر منسوب سے حال ہے۔ معنی نے کہا ہے کہ زمین میں جو پانی ہے وہ آسمان سے ہی آتا ہے (۱)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ینابیع سلکۃ کا مفعول ثانی ہو کیونکہ اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ اس جملے میں ہے ادخلہ بیتا فی الدار۔ ینبوع کا اطلاق چشمہ اور چشمہ سے نکلنے والے پانی پر ہوتا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمے سے نکلنے والا پانی ہے اور دوسری ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمہ ہے۔ پھر اس پانی کے سبب فصلیں اگتا ہے جن کے رنگ جدا جدا ہیں۔ مختلفا لوانہ سے مراد یا تو فصلوں کی مختلف اقسام ہیں مثلاً گندم جو وغیرہ۔ یا اس سے مراد رنگوں کی مختلف کیفیات ہیں جیسے سبزی اور سرخی وغیرہ۔

پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے۔ پس تو اسے سرسبز و شاداب ہونے کے بعد خشکی کے وقت زردی مائل دیکھتا ہے۔ پھر وہ اسے چورا چور کر دیتا ہے۔ یعنی وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ یقیناً اس کرشمہ و قدرت میں اہل عقل کے لئے نصیحت ہے) ذکر یہی معنی تذکیر ہے، اس کا معنی ہے یاد دہانی۔ یعنی یقیناً ان ایجادات اور تصرفات میں اس صانع قدیم کے وجود کی یاد دہانی ہے جو قادر بھی ہے اور ایسا حکیم بھی جس کی تدبیر شے میں کارفرما ہے۔ گویا اس آیت میں اس پر تشبیہ کیا کہ حیات دنیوی کے ذمہ سے اگلے والی فصل کی مثل ہے (اسی کی مثل اس میں تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں) لہذا اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے اور نہ اس پر فریفتہ ہونا چاہئے) لیکن اہل عقل کے سوا کوئی اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور جو نصیحت نہیں پکڑتا اس کا شمار اہل عقل و دانش میں نہیں بلکہ وہ تو جو پاپوں کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَكَ لِاِسْلَامٍ فَهُوَ عَلَىٰ نُوْرٍ مِّنْ سُرٰٓیْہٖ ط قَوْلٍ لِّلْقٰسِیٰتِ

قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِکْرِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۱

”بھلا وہ (سعادت مند) کشادہ فرمایا ہوا اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لئے تو وہ اپنے رب کی طرف سے دیے ہوئے نور پر ہے۔ پس بلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔“

۱۔ شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی روشنی اور چمک سے وہ حق کو حق اور

باطل کو باطل پہچان لیتا ہے۔ اور جو دین حضور نبی کریم ﷺ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کر آئے یا شک و شبہ کا مل پر اس کے بارے
اسے یقین آ جاتا ہے۔ کیونکہ سید دل اور روح کا مکمل ہے اور دل ہی اسلام کو قبول کرتا ہے تو جب اس کا دل احکام اسلام کو قبول کر لیتا ہے
تو وہ اس طرف کی طرح ہو گیا جو اپنے مظروف کے لئے مکمل جائے اور وسیع ہو جائے حتیٰ کہ مظروف مکمل طور پر اس میں سما جائے۔
پس جس آدمی کا سیدنا اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرما دے تو وہ شخص اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے۔ نور سے مراد
بصیرت اور دل کی بینائی ہے۔

الفمن میں ہنرہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور فاء سابقہ اس ارشاد کے مفہوم پر عطف کے لئے ہے اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كِتَابٌ
الْعَرَبِ اَفَاَنْتَ تُشْفِقُ مِنْهُ فِي الْقَارِعَةِ لَكِنَّ الْيَوْمَ اَنْتَ كَاْفِرٌ مِّنْهُمْ۔ کیونکہ اس سے کافر اور مومن کا فرق سمجھا جا رہا ہے۔ ترکیب کلام
میں من موصول مجتہد ہے اور اس کی خبر مزدوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتا ہے اور انکار مضمون فاء کی طرف راجع ہے۔ گویا کہ
اس طرح فرمایا کہ جب مومن اور کافر کے درمیان فرق ثابت ہو چکا تو پھر وہ آدمی جس کا سیدنا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کشادہ فرما دیا
اور پھر اپنی جناب سے ایسی بصیرت اور نور عطا فرمایا جس کے سبب وہ ایمان کی سعادت سے بہرہ ور ہو اور ہدایت سے مزین و آراستہ
ہو گیا تو وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہو سکتا جس کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور اس کا دل سخت ہو گیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كِتَابٌ لِّلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُفُوسٍ مُّشْرِكَةٍ
سزاوت فرمائی تو ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس آدمی کا سیدنا کیسے وسیع ہو جاتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جب وہ نور دل
میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سیدنا وسیع اور کشادہ ہو جاتا ہے۔ پھر ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اسکی علامت کیا ہے؟ تو آپ
ﷺ نے فرمایا اَلَا اِنَّهَا بِيْ اَدَارِ الْخُلُوْدِ وَالتَّجَاوِي عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالتَّاهِبِ لِلْمَمُوْتِ قَبْلَ نُوْرٍ لِّهٖ (۱۱)۔ دار الخلد یعنی یوم
آخرت کی طرف بہت متنوج ہونا دار الغرور مقام فریب یعنی دنیا سے دور ہونا اور موت آنے سے قبل اس کے لئے تیار کرنا۔ اسے
علامہ بغوی حاکم اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

مع (پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے) قولی میں فاء وسیع ہے اور من ذکر اللہ، الفاسیہ
کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے ان کے دل سخت ہوتے ہیں۔ یعنی جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا
ہے یا ان پر آیات الہیہ کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کی قساوت اور سختی اور بڑھ جاتی ہے۔ شدید ہو جاتی ہے اور یہ انداز من کی جگہ عن
لگانے کی نسبت زیادہ بیخ ہے کیونکہ جس شے کی وجہ سے دلوں میں قساوت اور سختی آ جاتی ہے اسے وہ قطعاً قبول کرنے کے لئے تیار نہیں
ہوتے بلکہ قبول کرنے سے انکار انتہائی شدید ہوتا ہے بخلاف ایسی صورت کے کہ (دعوت اور شے کی طرف ہو) اور قساوت سختی کا سبب
اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہو (تو پھر اسے قبول کرنے سے انکار اتنا شدید نہیں ہوتا)

جن لوگوں کا سیدنا اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرماتا ہے ان کے وصف قبول اور سخت دلوں کے وصف انکار میں اظہار مہا اللہ
کے لئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کا ذکر فرمایا تو سیدنا وسیع کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی اور جب اس کے
بالمقابل قساوت قلبی کا ذکر کیا تو اس کی نسبت دل کی طرف کی (کیونکہ بندہ مومن ذکر الہی سے متاثر ہوتا ہے اور کافر کی قساوت قلبی او
ر بڑھ جاتی ہے اور وہ اس کا انکار کرتا ہے) پس یہ آیت معنی کے اعتبار سے اس آیت کی طرح ہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ قَسْرٌ

قَدْ اَدَّبْتُمْ بِحَسَابِي رَجِيْبِي وَمَا تَدْرُوْنَ ۝۳۰

بعض نے کہا ہے کہ ذکر اللہ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی اصل عبارت مِنْ تَوَكَّبَ ذِكْرَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی جن کے دل اللہ کا ذکر ترک کرنے کی وجہ سے سخت ہو گئے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

مالک بن دینار نے کہا ہے کہ کسی بندے کے لئے قساوت قلبی سے بڑھ کر سزا مقرر نہیں کی گئی اور کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا غضب تب ہی آتا ہے جب اس کے افراد سے رحمت اور نرمی کے جذبات چھین لئے جاتے ہیں (1)۔ (یعنی جب ان میں رافت و رحمت اور باہمی نرمی ختم ہو جاتی ہے تو پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی گرفت آ جاتی ہے) حاکم وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوتا ہوا اور ایک طویل زمانہ تک آپ لوگوں پر اس کی تلاوت کرتے رہے تو آخر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں (تو وہ بہتر ہوگی) امین جریر نے حضرت عون بن عبد اللہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کچھ آتا گئے تو عرض کی اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

اللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مَّشٰيْهَا مَثٰنِي تَنْشُرُ مِنْهُ جُلُوْدَ الْاَنْبِيَا
يُحْشَوْنَ رَايِبِيْنَ ثُمَّ تَلٰوِيْنُ جُلُوْدَهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدٰى اللّٰهُ
يَهْدِيْ بِهٖ مَن يَّشَآءُ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۱

”اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں لہٰذا بار بار پڑائی جاتی ہیں اور کاپنہ گنتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جوڑتے ہیں اپنے پروردگار سے۔ پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ذریعے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔“

لے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ اور شاد باری تعالیٰ اِنَّا اَنْزَلْنٰ اٰتِيٰكَ الْكِتٰبَ کے لئے تقریر و تائید ہے اور ان کے درمیان تمام آیات بطور جملہ مقرر حد سے مذکور ہیں۔ اس آیت کی ابتداء میں اسم جلال لفظ اللہ ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد نزل مذکور ہے تو یہ انداز بیان ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن کریم کی نسبت ہونے میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ دوسرا نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے اور تیسرا حقیقتاً اس کے حسین اور خوبصورت کلام ہونے کی شہادت دیتا ہے۔

کِتٰبًا كَالْفَصْلِ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ سے بدل ہے یا اس سے حال ہے۔ اور مُتَشٰبِهًا، کِتٰبًا کی صفت ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات طیبات صحت معنی منافع عامہ پر دلالت کرنے اور معجز نما حسن میں باہم ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں (ایسا قطعاً نہیں کہ کوئی آیت دوسری کی تکذیب کرتی ہو)

عَلَى صَفَاتِيْ، کِتٰبًا کی دوسری صفت ہے، یہ مشابہت کی جمع ہے اور یہ اسم ظرف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں وعدہ و وعید امر و نہی اور اخبار و احکام کا ذکر بار بار کیا گیا ہے اس لئے ان کی تفصیل کے اختیار سے کتاب کی صفت مثانی ذکر کی گئی ہے (یعنی بار بار دہرائی اور پڑھی

جانے والی کتاب) پس یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے کہ قرآن سورہ میں ہے اور آیات ہے اور انسان رگیں ہے ہڈیاں ہے، گوشت ہے اور اعصاب (پٹھے) ہے۔ (تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ان تمام کا مجموعہ ہے) یا پھر مثنائی مثنائیاً سے تعبیر ہے۔ جیسا کہ قول ہے زَائِبٌ وَجِلَاءٌ جِنْسِنَا حَسَنًا شَمَائِلٌ۔ (تو اس میں شمالی، حسنا سے تعبیر ہے) یا پھر مثنیٰ۔ اسم قائل کی جمع ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیات اللہ تعالیٰ کی ذلت اور صفات کمال کی شہ بیان کرتی ہیں اس لئے اس کی صفت مثنائی (ثنائیان کرنے والیاں) ذکر کی گئی ہیں۔ اور کا پٹھہ لگتے ہیں اس کے پڑھنے سے ان کے بدن جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جب آیات و معجزہ پڑھی جاتی ہیں تو اس کے خوف سے یہ کانپ جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں نقش شعر منہ کا جملہ کتابا کی تیسری صفت ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عموم مغفرت کا ذکر آتا ہے تو اس کے سبب ان کے بدن اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔ آیت طیبہ میں مطلقاً ذکر اللہ فرمایا تو یہ اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اصل امر تو رحمت ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے (اس لئے ذکر اللہ کے ساتھ علیحدہ رحمت کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)

ثَلَاثِينَ فعل الی کے واسطے کے ساتھ ذکر اللہ کی طرف متعدی ہو رہا ہے حالانکہ الی ذکر اللہ کی بجائے لہذا ذکر اللہ ہونا چاہئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ذکر اللہ سے اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے تو گو یا تلتین فعل اطمینان اور سکون کے معنی کو مختصم ہے اور ان کا صلائی آتا ہے۔ (لہذا ای مناسب سے یہاں لام کی بجائے الی ذکر کیا گیا)

ذکر اللہ سے قبل قلوب کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادت کا بنیادی اثر دل پر ہی پڑتا ہے اور یہ دل کے عوارض میں سے ہی ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات و معجزہ میں جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مومنین کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگ جاتے ہیں۔ آتشہ اور کافری سے خوف کے وقت انسان کے بدن کا فیض ہو جانا مسکرا جانا اور اس میں تغیر رونما ہوتا۔ روضہ طاری ہونا اور جب قرآن کریم کی ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن میں رحمت کا وعدہ ہے تو مومنین کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اطمینان و سکون نصیب ہو جاتا ہے۔

پہلے قرآن کریم کے بارے فرمایا کہ وہ مثنائی ہے کیونکہ اس کی آیات وعدہ و وعید کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور اس مقام پر وہ اثر بیان فرمایا جو اہل ایمان وعدہ و وعید کی آیات سنتے وقت قبول کرتے ہیں۔ پس تقدیر کلام اس طرح ہے۔ يَخَافُ مِنْهُ قُلُوبُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَتَقْشَعِرُ جُلُودُهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَتَنْظُمِينَ قُلُوبُهُمْ اِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (قرآن کریم پڑھتے وقت ان کے دل خوفزدہ رہتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف متوجہ ہوتے وقت ان کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل مطمئن ہو جاتے ہیں)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خشک درخت سے اس کے پتے گرتے ہیں (1)۔ اسے طرانی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور علامہ بغوی نے ایک روایت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جب بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام قرار دیتے ہیں (2)۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ صوفیاء کرام میں سے بعض اہل عشق پر قرآن کریم سنتے وقت غشی طاری ہو جاتی ہے تو کیا ایسا ہونا قابل

تعریف اور پسند یہ وصف ہے یا کہ قبیح اور ناپسندیدہ؟

اس کے بارے امام محمدی السنۃ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی تفسیر میں انتہائی سخت موقف اختیار کیا ہے اور اسے انتہائی قبیح اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قنودہ نے اس کے بارے یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کے خوف سے بدن کا کانپ جاتا یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ ذکر اللہ کے سبب ان کے بدن کا کانپنے لگتے ہیں اور ان کے دل راحت و سکون حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کا یہ وصف بیان نہیں فرمایا کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی عقلیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور ان پر غشی اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہذا ایسا کرنا اہل بدعت کا خاصہ ہے اور یہ کیفیت شیطان کی جانب سے طاری کی جاتی ہے (1)۔ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ میں نے لہنی واوی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے پوچھا (اس مقام پر حضرت عبداللہ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہما کو بعدی (داوی) کہا ہے حالانکہ آپ ان کی والدہ تھیں اور جدہ کا لفظ ماں کے لئے مستعمل نہیں۔ شاید یہ عبارت میں سمو ہے) کہ رسول اللہ کے صحابہ کرام کے پاس جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی تھی تو ان کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا تلاوت قرآن کے وقت جو کیفیت ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ان کی وہی کیفیت ہی تھی کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی جھڑ رہے ہوتے اور ان کے بدن لرزہ براندہم ہوتے۔ پھر میں نے یہ عرض کی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے پاس قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ غش کھا کر گر پڑتے ہیں؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے جواب میں یہ پڑھا اعدوہ باللہ من الشیطن الرجیم (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر (اہل عراق میں سے) ایک کے پاس سے ہوا جو گرا پڑا اور اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ جب اس کے پاس قرآن پاک پڑھا جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنے تو یہی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور یہ کہ جاتا ہے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بلاشبہ بالیقین ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں لیکن اس طرح نہ کرتے ہیں نہ بے ہوش ہوتے ہیں اور آپ نے مزید فرمایا کہ شیطان لوگوں کے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے (اور وہ انہیں اس طرح گرا دیتا ہے) حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام تو اس طرح نہیں کرتے تھے (3)۔

میں کہتا ہوں کہ اس حالت کے طاری ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے برکات و تجلیات کا کثرت سے نازل ہونا ہے۔ جبکہ صوفی کا طرف تک اور قوت برداشت اور استعداد کمزور ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر طاری نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود کہ ان پر برکات و تجلیات کا نزول و افرا اور کثرت سے ہوتا تھا تو اس کا سبب اور وجہ یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کے طرف انتہائی وسیع اور قوت برداشت انتہائی مضبوط اور زیادہ تھی۔ (لہذا ان پر غشی طاری ہوتی اور نہ وہ بیہوش ہو کر گرتے) صحابہ کرام کے علاوہ دیگر صوفیاء میں سے جن پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو اس کا سبب یا تو نزول برکات کا کم ہونا ہے یا پھر ان کے حوصلہ اور ظرف کا وسیع ہونا ہے۔ لیکن تعجب ہے امام محمدی السنۃ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ پر کہ انہوں نے ان صوفیاء کا یہی انکار کر دیا ہے جن پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن انہوں نے انہیں ناپسندیدہ اور قبیح قرار دیا۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد

1- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (المنکر)

2- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (المنکر)

3- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 13 (المنکر)

بھول گئے۔ صحیحی اِذَا عَنِ عَنَّا يَوْمَ الْقَوْمِ اَمَّا اَقَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا اَلَيْسَ لَكَ عَيْنٌ اَلَيْسَ لَكَ عَيْنٌ اَلَيْسَ لَكَ عَيْنٌ ﴿١٠﴾۔ حالانکہ آپ نے خود اس آیت کی تفسیر میں حضرت نواس بن سمان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حکم کا ارادہ فرماتا ہے اور وہی کے الفاظ بیان فرماتا ہے تو اس کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے) تمام آسمانوں پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور جب آسمانوں کے مکین اسے سنتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اپنا سراٹھاتے ہیں۔ اللہ بیٹ۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو کلام سن کر محزون و دکھاری کے ساتھ ملائکہ اپنے پر مارتے ہیں تو اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے چٹان پر زنجیر لگنے سے آتی ہے۔ پھر جب ان کے دلوں سے وہ گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو (آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ تو دوسرے انہیں جواب دیتے ہیں (اس نے جو فرمایا ہے) وہ حق ہے اللہ بیٹ (۱)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ فَلَمَّا أَجْتَىٰ رَبُّكَ لِلْبَيْتِ جَعَلَهُ ذَاكِرًا ذُو مُنَىٰ صَعِقًا ۖ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ شیطان تمہارے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا تو انہیں اس سختی پر محمول کیا جائے گا کہ اس مقام پر ان دونوں کو یہ گمان ہوا کہ اس آدمی نے مکرو فریب کے ساتھ اپنے اوپر غشی طاری کر رکھی ہے اور وہی وجہ سے انہوں نے ایسے آدمی کی نسبت شیطان کی طرف کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے حوصلے وسیع تھے بقوت استعداد تو وہی بھی اس لئے ان پر اور ان کی مثل دیگر افراد پر ایسی حالت کبھی طاری نہ ہوتی تھی۔ (اسی بناء پر انہیں یہ شبہ ہوا کہ اس آدمی نے مکرو فریب سے یہ حالت بنا رکھی ہے) جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر بطور دلیل یہ بھی ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا جو قرآن کریم کی تلاوت سن کر غش کھا کر گر پڑتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق اس طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مکان کی چھت سے پاؤں پھینک کر بیٹھ جائے۔ پھر اسکے پاس اول سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا جائے تو اگر وہاں سے قرآن کریم سن کر وہ گر پڑے اور بیہوش ہو جائے تو جان لو وہ سچا ہے (2)۔ بصورت دیگر اس کی غشی اور اس کے گرنے کو جھوٹ اور مکرو فریب پر ہی محمول کیا جائے گا۔ گویا آپ نے اس کی سچائی اور ایک بلند و بالا مکان کی چھت سے اپنے آپ کو گرانے کے ساتھ متعلق کر دیا (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ایسے لوگوں کو فرجی خیال کرتے تھے)

جاننا چاہئے کہ انسان کی قوت برداشت ملائکہ کی نسبت زیادہ قوی ہے اور انسان کا حوصلہ اور ظرف ملائکہ کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی شاہد ہے ﴿اِذْیَ جَا عَلٰی الْاَرْضِ خَلِقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ عِطْمٍ صَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٠﴾ اور سید فرمایا اِنَّا عَزَّوَجَلَّ الْاِنْسَانَ عَلٰی الْاَرْضِ الْاَوَّلِ۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ جب بھی وحی سنتے ہیں تو ان پر غشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن انسان پر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کا نزول جب مکمل ہو جاتا ہے تو سوائے کسی نادر مثال کے ان کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل رونما نہیں ہوتا اور جب انسان کا عروج تو مکمل ہو لیکن نزول ناقص ہو تو پھر اکثر حالت بدل جاتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ جب صوفی حالت شکر میں ہوتا ہے تو شعر اور تقنی کی صورت میں محبوب کا ذکر سنتے وقت اسکی حالت اکثر بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء سماع کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن سماع قرآن کے وقت حالت کا تبدیل ہونا اس سے کہیں اشرف و اعلیٰ ہے۔

میں بہت بڑے پہاڑ کی مثل گندھک کی ایک چٹان لگی ہوگی۔ پس فوراً اس پتھر میں آگ بھڑک اٹھے گی (۱) یعنی کیا ایسا کافر اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو عذاب سے مکمل طور پر اسیں اور محفوظ ہوگا۔ یہاں بھی مبتدا کی خبر محذوف ہے جیسا کہ اس جیسے مقامات پر خبر کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کتاباً نصیب ہوگا۔

۱۱ اور ظالموں کو کہا جائیگا۔ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو اس لئے تاکہ ان کے ظالم ہونے پر مہر تقدیر یقینیت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تاکہ وہ اس سبب پر مطلع ہو جائیں جس کی بنا پر انہیں یہ کہا جا رہا ہے ھُوْٓءِذَا هَمُّوا لَنُنَكِّتَنَّوْنُ۔ کہ اب اس کا وبال چکھو جو تم کو مایا کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں قَبِيْلٌ لِّلظَّالِمِيْنَ کا جملہ یعقون کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ سابقہ کلام کے مضبوط پر معطوف ہو اور وہ ہے عذاب۔

۱۲ کفار کہہ سے پہلے آنے والے لوگوں نے بھی اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور انہوں نے بھی عذاب آنے کی خبر کی تکذیب کی۔ لیکن ان پر عذاب ایسی جہت اور سمت سے آیا جہاں سے عذاب آنے کے بارے ان کے دلوں میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۳ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دنیوی زندگی میں ذلت چکھائی مثلاً ان کی شکلیں مسخ کر دیں زمین میں دھنسا دیا یا قتل و غارت ان پر ہوا اور چیخ کا مسلط کرنا پتھروں کا برسا اور ان کا فراق کیا جانا وغیرہ۔

اور ان کے لئے جو عذاب آخرت تیار کیا گیا ہے وہ اس دنیوی عذاب کی نسبت اپنی شدت، سختی اور دائمی ہونے کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ اگر اہل کفر اہل علم اور نظر و فکر رکھنے والے لوگ ہوتے تو بالیقین اپنے سے پہلے آنے والے لوگوں کے حالات سے درس عبرت حاصل کرتے۔ یا معنی یہ ہے کہ اسی جھٹلانے والے اس تکذیب کے انجام کو جانتے ہوتے تو کبھی تکذیب نہ کرتے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۱﴾ قُرْآنًا
عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَسْتَفْقِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۱ اور ہم نے بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن (حکیم) میں ہر قسم کی مثالیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔ اور ہم

نے دیا ہے (انہیں) قرآن جو عربی زبان میں ہے جس میں ذرا کبھی نہیں تاکہ وہ اللہ سے ڈریں۔ ۱۲۔

۱۱ ہم نے لوگوں کے فائدے اور تیرے لئے اس قرآن حکیم میں ہر قسم کی ایسی مثالیں بیان کی ہیں جن کی امور دینیہ میں غور و فکر کرنے والے آدمی کو ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اس کے سبب نصیحت قبول کریں۔

۱۲ قُرْآنًا عَرَبِيًّا یا تو مدح کی بناء پر منصوب ہے (کہ اس سے پہلے امرح فعل محذوف ہے) یا اخذ اسے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بشرطیکہ ہم یہ کہیں کے مجرد مفعول یہ ہے۔ یا پھر تقدیر کلام اس طرح ہے فی تنزیل ہذا القرآن اس صورت میں ہذا القرآن، تنزیل مقدر کا مفعول ہو جائیگا اور اس میں استواء صفت پر ہوگا جیسا کہ اس قول میں ہے جاء فی زید رجلاً صالحاً۔

عَرَبِيًّا ذِي عِوَجٍ کا معنی ہے کہ اس میں کسی بھی اعتبار سے کوئی غلطی اور اختلال نہیں اور یہ لفظ مستقیم کی نسبت زیادہ طبع ہے اور یہ معانی کے ساتھ متفق ہے۔ (یعنی معنوی اعتبار سے بھی اس میں کسی نوع کا کوئی ضعف یا غلطی موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے قرآن کریم کوئی اختلاف (بیان) نہیں ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ

قرآن کریم میں کوئی التماس اور تنگ موجود نہیں اور سدی نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم مخلوق نہیں۔ حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی معنی روایت کیا گیا ہے (1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے سزتا بعین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کریم نہ خالق ہے اور نہ ہی مخلوق (2)۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ یہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے کہ یہ خالق ہو اور نہ یہ اس کا غیر ہے اور اس سے جدا ہے کہ یہ حادث اور مخلوق ہو جائے۔ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ کلام لفظی قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ کیونکہ وہ کلام نفسی جس پر کلام لفظی دلالت کرتی ہے وہ عربی ہونے کی صفت سے متصف نہیں ہو سکتی (کیونکہ عربی اور عجمی ہونا لفظی صفت ہے نہ کہ معانی کی)۔

اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کلام لفظی کے حروف اس کے حادث ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ (کیونکہ یہ حروف کے بعد دگرے ملا کر ایک جملہ اور کلام بنتا ہے اور یہ ترتیب حروف اس کے حادث ہونے کی علامت ہے۔) تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ محل کلام تنگ ہے اور حادث ہے۔ اس لئے تمام حروف کے بعد دگرے استعمال ہو کر سارے کلام کو حادث بنا دیتے ہیں۔ لیکن وہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں حروف کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کا وہم کرنا حاضر پر غائب کو قیاس کرنے کی طرح ہے۔ جیسا کہ روایت باری تعالیٰ کا انکار کرنے والے ایسے ہی وہم میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے روئے مخلوق پر روئے خالق کو قیاس کرتے ہوئے یہ شرائط ذکر کر دیں کہ انکھ کے ساتھ دیدار کے لئے جہت اور مسافت وغیرہ کا پایا نا شرط ہے۔ لیکن خالق کی روایت ان سب شرائط سے پاک ہے کیونکہ نہ تو کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی ذات میں اس کی مثل ہو اور نہ کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی صفات کے ساتھ متصف ہونے میں اس کی مثل ہو اور نہ کسی شئی میں اس کی صفات میں کوئی صفت اس جیسی موجود ہے بلکہ وہی سب سے اعلیٰ شان والا ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے وَ يَذِيْقُ الْمَثَلِ الْأَلَمِيِّ لَوْ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ تاکہ وہ کفر و معاصی کا ارتکاب کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ لعلمهم يتقون دوسری علت ہے جو پہلی علت لعلمهم يتقون پر مرتب ہے۔ یا اس سے بدل ہے یا پھر پہلی علت کا بیان ہے۔

صَرَ بَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّمُونَ وَرَجُلًا سَلَّمَ الرَّجُلُ هَلْ
يَسْتَوِينَ مَثَلًا الْعَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ③

”بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال ایک غلام ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں جو سخت بد خو ہیں۔ اور ایک غلام ہے جو پورا ایک مالک کا ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔“

لہ اللہ تعالیٰ نے شرک اور موصد کی ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ ترکیب کلام میں رجلاً مثلاً سے بدل ہے اور رجلاً سے پہلے مضاف مقدر ہے یعنی مثل رجلاً۔ مُتَشَكِّمُونَ کا معنی ہے باہم اختلاف رکھنے والے سخت بد خو۔ ترکیب کلام میں یہ مُتَشَكِّمُونَ کی صفت ہے اور وہ طرف مستقر کے لئے فاعل ہے۔ یا پھر شرکاً و مبتدا ہے اور (فید) طرف اس کی خبر ہے اور پھر مکمل جملہ رجلاً کی صفت ہے۔ چونکہ شرک اپنے زعم

باطل کے مطابق متعدد خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال ایسے غلام سے بیان فرمائی جو متعدد بد خصوصہ داروں کا مشترک غلام ہو کہ ان مالکوں میں سے ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور تمام شرکاء ہماری باری اسے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رکھتے ہیں۔ جس کے سبب وہ غلام حیرت اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور اس کا دل ہمہ وقت مضطرب اور غمزہ زد رہتا ہے، کبھی بھی اسے راحت و سکون نصیب نہیں ہوتا۔ (تو جس طرح مشترک غلام ہمہ وقت پریشان رہتا ہے اسی طرح مشترک بھی سکون اور راحت نہیں پاسکتا)

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ كَاعْنِي ۚ ہے اور ایک غلام ایسا ہے جو خاص ایک ہی آدمی کا مالک ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے سَلَمًا کو مَسَالِمًا اسم فاعل کے وزن پر پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے بغیر الف کے حسن کے وزن پر۔ اللہ تعالیٰ نے مومن موحد کی مثال ایسے غلام کے ساتھ بیان فرمائی ہے جس کا مالک صرف ایک ہے، اس کی ملکیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ (مقصود یہ ہے کہ جس طرح یہ غلام پر سکون اور راحت و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے۔ پریشانیوں اور غموں سے دور رہتا ہے اسی طرح بندہ مومن بھی اطمینان قلب پاتا ہے اور پر سکون زندگی بسر کرتا ہے)

ہے هَلْ يَسْتَوِيْنَ مَثَلًا۔ کیا ان دونوں غلاموں کا حال یکساں اور مساوی ہے۔ یہ استفہام انکاری اور تقریری ہے۔ یعنی مخاطب سے یہ اقرار کرنا مقصود ہے کہ ان دونوں کی حالت یکساں نہیں (یہ قطعاً مساوی حال میں نہیں) کیونکہ باطمینان ایسا غلام جس کا مالک صرف ایک ہو اس کا حال اس غلام کی نسبت بہت اچھا اور بہتر ہوگا جس کی ملکیت میں کئی شریک ہوں تو اسی طرح مومن موحد کا حال بھی مشرک کے مقابلہ میں کہیں بہتر اعلیٰ اور راحت بخش ہوگا۔ هَلْ يَسْتَوِيْنَ مَثَلًا میں تقدیر کلام اس طرح ہے: قَالَ اللَّهُ هَلْ يَسْتَوِيْنَ مَثَلًا (یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کا حال یکساں ہوتا ہے) اور یہ جملہ ضرب اللہ مثلاً کے مقصود کا بیان ہے اس کی وضاحت کے لئے ہے اور هَلْ يَسْتَوِيْنَ مَثَلًا میں مثلاً کا لفظ تمیز ہونے کی بنا پر مضمون ہے۔

سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ فی الحقیقت حمد و ستائش کے لائق ہونے میں کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں۔ کیونکہ وہی بذات متعم ہے اور مالک مطلق ہے (کوئی شی اس کی ملکیت اور قدرت سے خارج نہیں) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ لہذا وہ اپنی فرط جہالت کی بناء پر دوسروں کو اس کے ساتھ شریک سمجھاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں تقدیر کلام اس طرح ہے قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہ یعنی الحمد للہ۔ یعنی لفظ نقل مقدر ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو نعمت تو حید سے نوازنے والا ہے اور تمام تر تعریفیں اسی وحدۃ لاشریک رب کے ساتھ مختص ہیں جو ہیضہ قابل ستائش ہے۔ اس صورت میں بل اضراب کے لئے نہیں بلکہ یہ ابتداء ہے جو کہ جاہلین کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

اِنَّكَ صَبِيْتٌ وَّاِنَّهُمْ صَابِيْتُونَ ﴿ۛ﴾ لَمْ اَنْتُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ﴿ۛ﴾

”جینک آپ نے بھی (دنیا سے) انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے۔ پھر تم (سب) روز حشر اپنے رب کے حضور میں آجس میں جھگڑو گے۔“

۱۔ جینک آپ نے بھی دنیا سے حشر رب انتقال فرماتا ہے۔ یہاں صیبت صفت مشابہ کا صیغہ مذکر کیا گیا ہے جو کہ ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے (مضارع کا صیغہ نسوت وغیرہ ذکر نہیں فرمایا) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موت ایک یقینی امر ہے اس کے وقوع پذیر ہونے میں

ذره بھر تک وشہ نہیں (تو اسی یقین پر دلالت کرنے کے لئے صفت مشبہ کا صیغہ ذکر کیا) اور کفار مکہ یا تمام لوگوں نے موت سے اعراض کے باوجود بائیسین مرتنا ہے۔ لہذا موت کو عیب یا نقص نہیں۔

مکلی نے لکھا ہے کہ جب کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کے جلد انتقال کرنے کی خواہش کرنے لگے تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فر آدم اور کسانئی نے کہا ہے کہ میت (یعنی اگر یا ہمشدد ہو تو) اس آدمی کو کہتے ہیں جو مرنا ہو اور مستقبل میں مرنے والا ہو اور میت (یعنی اگر یا مخفف ہو تو) اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو مر چکا ہو۔ اسکی روح اس سے جدا ہو چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں میت اور مجھ ان کو یا ہمشدد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نہ کہ مخفف کے ساتھ۔

۱۱۔ پھر آپ اور کفار مکہ یا سب لوگ روزِ حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے۔ پس آپ ان کے خلاف حجت پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔ لے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اَلْقُرْآنَ الَّذِیْ نَزَّلْنَا وَارْتَدُّوا عَلٰی اَعْقَابِهِمْ لَمْ یَنصُرُوْهُمْ وَاُولٰٓئِکُمْ هُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ میں نے انہیں وعظ وارشاد اور تبلیغ کرنے کی کوشش کی اور یہ اپنے عناد اور تکذیب پر ہی ڈٹے رہے اور کفار اپنے باطل اور جوئے اتوال کے ساتھ معذرت پیش کرنے کی کوشش کریں گے مثلاً کہیں گے۔ وَ اَللّٰهُ یَبْتَآءُ مَا کُنَّا مُسْرِکِیْنَ ۝۱۱۔ قسم اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔ ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آیا ہی نہیں اور یہ کہیں گے اِنَّا اَعْمٰیۡتٌۢ مَا کُنَّا وَاُولٰٓئِکُمْ هُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ ہم اسی راہ پر چلتے رہے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ لوگ آپس میں (مقوق سے متعلق) ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔ پس سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا۔ شیخین نے تصحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون (مقل) کے بارے فیصلہ کیا جائیگا (۱)۔

چترندی ابن ماجہ طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مقتول حاضر ہوگا اس طرح کہ ایک ہاتھ میں اپنا سر لٹکائے ہوئے ہوگا اور دوسرے ہاتھ سے قاتل کو پکڑے ہوئے ہوگا اور اس کی گردن کی رگوں سے خون ابل رہا ہوگا یہاں تک کہ عرض کے پاس پہنچ کر عرض کرے گا اے رب العالمین! اس نے مجھے قتل کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قاتل سے فرمائے گا تو ہلاک ویر باد ہوا۔ پھر اسے جہنم کی طرف لے لیا جائیگا (۲)۔ اسے ترندی نے حسن کہا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مقتول اپنے قاتل کو پکڑے ہوئے حاضر ہوگا اور اس وقت اس کی گردن کی رگوں سے خون نکل رہا ہوگا اور عرض کرے گا اے میرے رب! اس سے پوچھئے اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا؟ تو قاتل کہے گا میں نے اسے قتل کیا تھا تاکہ فلاں کو عزت (غلبہ) حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تمام تر عزت تو فقط اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ہے (۳)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ذکر فرمایا۔ قاتل اور مقتول دونوں کو لایا جائیگا اور انہیں رحمان کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر قاتل سے پوچھا جائیگا تو نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ کے لئے قتل کیا ہوگا تو کہہ دے گا میں نے اسے قتل کیا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کے (دین کو) عزت و غلبہ نصیب ہو تو جواب یہ کہا جائیگا کہ جنگ

عزت و غلبہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے اور اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کے لئے نقل کیا ہوگا تو پھر کہے گا میں نے اسے اس لئے نقل کیا ہے تاکہ فلاں کو عزت و غلبہ نصیب ہو تو پھر جو پایا یہ کہا جائیگا کہ عزت و غلبہ فلاں کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ اشفاقا ہر اس ظالم کو قتل کر دیا جائیگا۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کو قتل کیا ہوگا اور اسے اتنے دنوں تک موت کا مزہ چکھایا جاتا رہے گا جتنے دنوں تک اس نے متوکل کو دنیا میں زندگی سے محروم رکھا ہوگا۔

احمد ترمذی اور حاکم نے عبد بن زبیر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ان کے باپ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ اِنَّكَ حَيِّتٌ وَاِنَّكَ عَلِيمٌ وَاِنَّكَ عَلِيمٌ بِسْمِ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى سِرِّكُمْ تَحْتُمْسُونَ نازل ہوئی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا دنیا میں ہمارے مابین سرزد ہونے والے ہمارے بڑے بڑے گناہ دوبارہ ہمارے سامنے لائے جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! انہیں تم پر دوبارہ لایا جائیگا یہاں تک کہ ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا قسم بخدا! معاملہ بڑا سخت اور شدید ہوگا۔ اسے حاکم نے صحیح کہا ہے (1)۔

طبرانی نے ایسی سند کے ساتھ جس پر کوئی اعتراض نہیں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے مرد اور عورت کا بھگڑا پیش کیا جائیگا۔ قسم بخدا! مرد اپنی زبان سے کچھ نہیں بولے گا۔ البتہ عورت کے ہاتھ اور پاؤں اس کے اپنے خلاف ان عیوب کی شہادت دیں گے جو وہ اپنے خاوند میں نکالا کرتی تھی اور پھر مرد کے ہاتھ اور پاؤں اس زیادتی کی شہادت دیں گے جو وہ عورت پر کیا کرتا تھا۔ پھر مرد کو اپنے خدام سے بتایا جائیگا پھر اصل بازار کو بلایا جائیگا۔ وہاں واقع اور قریبا نہیں پائے جائیں گے۔ بلکہ وہاں ظالم کی نیکیاں ہوں گی جو مظلوم کو دے دی جائیں گی اور مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر ظلم کرنے والوں کو لوہے کے گرزوں کے ساتھ لایا جائے گا اور کہا جائیگا انہیں جہنم میں پھینک دو (2)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سنن سنن کے ساتھ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے اپنا بھگڑا پیش کرنے والے دو پڑوسی اور بھائی ہوں گے (3)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی آدمی نے ظلم اپنے بھائی کا حق لے رکھا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دنیا میں ہی اسے ادا کر کے اپنے ذمے سے اتار دے کیونکہ قیامت کے دن کوئی درانہم دو دنیا تیر نہیں ہوں گے۔ بلکہ اگر اس کے کوئی اعمال صالحہ ہوں گے تو اس حق کی مقدار وہ اس سے لے لئے جائیں گے اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوں تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے (4)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت جانتے ہو مخلص کون ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی ہم میں مخلص وہی ہے جس کے پاس کوئی درہم ہو نہ ہی کوئی ساز و سامان تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں مخلص وہ ہے جو قیامت کے دن نماز روزے اور زکوٰۃ جیسے اعمال صالحہ لے کر آئے گا۔ لیکن اس نے کسی کے ساتھ بدکلامی کی ہوگی کسی پر تہمت عاندگی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا یا کسی کو مارا بیٹھا ہوگا۔ پس ایسے برے اعمال کے بدلے اسے پکڑ لیا جائے گا اور اس کی نیکیوں میں سے ان کا بدلہ چکھایا جائیگا اس طرح کہ کچھ نیکیاں ایک

1- مستدرک حاکم، حدیث: 2981 (اصحیہ)

2- معجم تفسیر از طبرانی، حدیث: 3989

4- مشکوٰۃ الصالح، حدیث: 5126 (انفکر)

3- مسند احمد، جلد 4، صفحہ 151 (صادر)

حقدار کو کچھ دوسرے مستحق کو (حتیٰ کہ تمام حقداروں کو ظلم و زیادتی کے سبب اس کی نیکیاں دی جائیں گی) اگر تمام گناہوں اور زیادتیوں کا بدلہ مکمل ہونے سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہوں گی تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں بھیج دیا جائے گا (1)۔

میں کہتا ہوں کہ وہ نیکیاں جن کا اجر مظلوم ظالم سے لے جایگا ان سے مراد ایمان کے علاوہ دیگر نیکیاں ہیں کیونکہ ظلم اور اس کے علاوہ دیگر برائیاں کفر کے سوا تمام گناہوں کی سزاقتناہی ہے۔ ختم ہو جانے والی ہے۔

اہل السنۃ والجماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کرنے والا ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رہے گا اور ایمان کی جزا ہمیشہ جنت میں رہنا ہے اور یہ غیر متناہی ہے۔ لہذا جو عمل (ظلم وغیرہ) متناہی ہے اس کا بدلہ غیر متناہی نہیں ہو سکتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب خطاؤں اور مظالم کا بدلہ چکا جائے تو قتل ظالم کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور صرف ایمان اس کے پاس باقی رہ جائیگا تو پھر مظلوموں سے ان کے کفر کے سوا دیگر گناہ اور غلطیاں لے کر ظالم کے حصہ میں ڈال دی جائیں گی کیونکہ کفر کی سزا غیر متناہی ہے لہذا کفر کو عمل کے بدلہ نہیں بنایا جا سکتا جس کی سزاقتناہی ہے کہ اسے ظالم پر ڈال دیا جائے۔ پھر ظالم کو جہنم میں ڈال دیا جائیگا اگر مظلوم نے اسے معاف نہ کیا اور وہ اپنے گناہوں کی سزا مکمل ہونے تک جہنم میں ہی رہے گا۔ بعد ازاں اسے جہنم سے نکال کر اس کے ایمان کے سبب جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہے گا۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی میرے قول کی طرح ہی بیان کیا ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ضرور بر ضرور دھوق ان کے اہل تک لوٹائے جائیں گے۔ حتیٰ کہ سیٹگوں والی بکری سے اس بکری کو بھی حق دلایا جائیگا جس کے سینک نہیں (2)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بغیر سیٹگوں والی بکری کو سیٹگوں والی بکری سے اور سرخ بیوی کو دوسری بیوی سے حق دلوا دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ پر یہ آیت نازل ہوئی **لَقَدْ اَنْتُمْ بِنُورِ الْقِبْلَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ** تو ہم نے کہا تھا کہ ہم کیسے جھگڑا کریں گے حالانکہ ہمارا دین اور ہماری کتاب ایک ہے حتیٰ کہ میں نے اس بات کو دیکھ لیا ہے کہ ہم میں سے بعض بعض کے چہروں پر تلواریں مار رہے ہیں تو میں نے بیچان لیا کہ واقعہ یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت کی ہے (3)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں یہ روایت ہے کہ ہم کہا کرتے تھے ہمارا بار ایک ہے ہمارا نبی ایک ہے اور ہماری کتاب ایک ہے پھر یہ خصومت اور قیامت کے دن حق طلی کا مطالبہ کیا ہے؟ پھر جب جنگ صفین ہوئی اور ہم میں سے بعض بعض پر تلواروں کے وار کئے تو پھر ہم نے کہا ہاں یہی وہ (خصومت ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے) (4)۔

ابراہیم کا قول ہے کہ جب آیت کریمہ **لَقَدْ اَنْتُمْ بِنُورِ الْقِبْلَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ** نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے کہا ہم کیسے جھگڑا کریں گے؟ حالانکہ ہم تو بھائی بھائی ہیں۔ پھر جب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو جب انہوں نے کہا یہی وہ

1- صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 111، حدیث: 59 (المنہج)

2- صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 112، حدیث: 60 (المنہج)

4- تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 15 (المنہج)

3- تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 15 (المنہج)

ہمارا بھڑا ہے (۱)۔

مذکورہ تمام اقوال کا مہتمیٰ یہ ہے کہ صحابہ کرام یہ گمان کرتے تھے کہ یہ قتل و خون کے جھگڑے فقط مومنین اور کفار کے درمیان ہوتے ہیں۔ لیکن جب مسلمانوں کے درمیان باہمی بغاوت اور فساد ظاہر ہوا تو تب ان پر یہ واضح ہوا کہ یہ جھگڑے اصل ایمان کے درمیان بھی ہو سکتے ہیں۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ أَطَىٰ أَلْبَيْسَ فِي جَهَنَّمَ
مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿٦٠﴾ وَالَّذِي جَاءَهُ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٦١﴾

”پس اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور نکتہ یہ کرتا ہے اس سچ کی جب وہ اس کے پاس آیا۔ کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے۔ اور وہ سستی جو اس سچ کو لے کر آئی اور جنہوں نے اس سچائی کی تصدیق کی یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں نہ۔“

۱۔ فَمَنْ أَظْلَمُ میں فاء مبیہ ہے۔ کیونکہ کفار کا حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنا ہی ان کے تمام لوگوں سے بڑھ کر ظالم ہونے کا سبب ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کی اولاد ہے اور (الہوئے میں) اور بھی اس کا شریک ہے۔

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ میں صدق سے مراد قرآن کریم اور پھر پیغام خداوندی ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے۔ لیکن اس نے بغیر کسی توقف کے اور اس کے بارے میں خود غلطی کی بغیر ہی اس کی تکذیب کر دی حالانکہ اس کی صداقت اور سچائی پر واضح شواہد اور قطعی دلائل موجود ہیں۔ (کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم ہو سکتا ہے؟) اَلَّذِي فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ۔ مَثْوًى کا معنی ہے اترنے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ یعنی کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔

انک میت وانہم میتوں سے لے کر اس آیت تک تمام آیات میں حضور نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی اور اطمینان کا پیغام ہے کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کرتی ہے۔ آپ ان سے انتقام کے بارے قطعاً فکر مند نہ رہئے کیونکہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر ان کے لئے جہنم ہی کافی ہے۔

۲۔ وَالَّذِي جَاءَهُ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ میں مراد جنس ہے۔ تاکہ یہ آیت تمام رسل علیہم السلام اور تمام مومنین کو شامل ہو جائے۔ اور اس پر ارشاد باری تعالیٰ اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ صیغہ جمع کے ساتھ مذکور ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت والذین جاءوا بالصدق وصدقوا به بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جاءہ بالصِّدْقِ سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ لا الہ الا اللہ کے کر تشریف لائے اور وَصَدَّقَ بِهِ سے مراد بھی آپ ﷺ کی اپنی ذات ہی ہے کہ آپ ﷺ نے خود اس کی تصدیق کی اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک یہ پیغام پہنچا یا نہ۔ اس تفسیر کی بناء پر جرمع اس لئے ذکر کی گئی کہ اُولَٰئِكَ سے آپ ﷺ اور آپ کے تمام قسمن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت طیبہ میں بھی اسلوب موجود ہے۔ وَ لَقَدْ آتَيْنَا مَوْسَىٰ الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٦١﴾۔ اس آیت میں لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ

صیغہ جمع سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے تعین ہیں۔

سدی نے کہا ہے کہ الٰہی جآء بالصدق سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور فصدق بہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں جنہوں نے اس جج کو قبولیت کے ساتھ لے لیا۔

کلبی اور ابو العالیہ کا قول ہے کہ الٰہی جآء بالصدق سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں (1)۔ اسی طرح زجاج نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

قناد اور مقاتل نے کہا ہے کہ الٰہی جآء بالصدق سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد تمام اہل ایمان ہیں۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ الٰہی جآء بالصدق سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں اور وصدق بہ سے مراد ان کے تعین اور جج و کار ہیں (2)۔

صاحب تفسیر مدارک اور بیضاوی نے کہا ہے کہ عربی اصول کے مطابق جآء اور وصدق دونوں کا فاعل ایک ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر فاعل مختلف ہو تو وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک الٰہی اسم موصول مضمون ہو اور یہ جائز نہیں۔ یا پھر اس سے ایسے فاعل کا مضمون کرنا لازم آتا ہے جس کا مرجع پہلے موجود نہیں اور یہ صورت بھی جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ کیسے یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ اسم موصول کا حذف جائز نہیں۔ حالانکہ تفسیر میں سے کلبی ابو العالیہ قناد اور مقاتل نے تو وہی کچھ ذکر کیا ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے اور اس پر بطور استشہاد حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر بھی موجود ہے جس میں اسم موصول محذوف ہے۔

أَنْ يُّهَيِّجُوا رَسُولَ اللَّهِ مِنْهُمْ
وَيَمْدَحُوهُ وَيَنْصُرُوهُ سَوَاءٌ
کیا ان میں سے وہ جو رسول اللہ ﷺ کی جھوکتا ہے اور (جو) آپ ﷺ کی مدح و ستائش بیان کرتا ہے اور آپ کی مدد کرتا ہے وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو اس میں تقدیر عبارت اس طرح ہے
أَنْ يُّهَيِّجُوا وَمَنْ يُّمْدَحُوهُ سَوَاءٌ۔

صاحب البحر الموانع نے کہا ہے کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق لف و نشر اجمالی کے باب سے ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے
قَالُوا لَنْ يَنْدَخُنَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَنْ كَانَ هُوَ ذَا أَوْ أَهْلَ بَيْتِهِ... یعنی قَالَتِ الْيَهُودُ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَنْ كَانَ هُوَ ذَا وَقَالَتِ النَّصَارَى لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَنْ كَانَ نَصَارَى۔

یاد بھی کہا جا سکتا ہے کہ الٰہی سے مراد فریق ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو وَالْفَرِيقَ الَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ الْبَدَايَةَ فریق رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کو شامل ہو اور دونوں فاعل کی ضمیر فاعل کا مرجع الٰہی اسم موصول ہو اور حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے اعتبار سے جآء بالصدق میں ضمیر فاعل الٰہی اسم موصول کی طرف راجع رہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات کے اعتبار سے وصدق بہ میں ضمیر فاعل اسم موصول الٰہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦﴾ لِيُكْفَرُوا عَنْهُمْ

أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا أَوْ يَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٥١﴾ أَلَيْسَ
اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدًا ۗ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ
هَادٍ ۖ ﴿٥٢﴾ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٥٣﴾

”انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے۔ یہ صلہ ہے محسنوں کا، تاکہ ڈھانپ لے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے بدترین اعمال کو، اور عطا فرمائے انہیں اجر اعلیٰ بہترین اعمال کا جو وہ کیا کرتے تھے۔ کیا اللہ کافی نہیں اپنے بندے کیلئے؟ (یقیناً کافی ہے) اور وہ (نادان) ڈراتے ہیں آپ کو ان معبودوں سے جو اللہ کے سوا ہیں۔ اور جسے اللہ گمراہ ہو جائے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جس کو ہدایت بخش دے اللہ تعالیٰ تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا انہیں ہے اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا ہے۔“

۱۔ جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے جنت میں انہیں ملے گا اور یہ محسنین کے احسان کا صلہ ہے۔

۲۔ تاکہ اللہ تعالیٰ مغفرت کے سبب ان کے بدترین اعمال کو ان سے ڈھانپ لے۔ یہاں ان شاء (بدتر اعمال) کا ذکر مبالغہ کے لئے کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے بدترین اعمال کو معاف فرمائے گا تو پھر ان کی نسبت کم درجہ کے برے اعمال کی مغفرت اور معافی تو بدرجہ اولیٰ ہو جائے گی۔ یہ آیت معتزلہ کے اس نظریہ کی تردید کرتی ہے (کہ کبیرہ گناہوں کی معافی نہیں ہوگی) کیونکہ یہ آیت کبیرہ گناہوں کی معافی دلالت کرتی ہے اور اسو الذی عملوا سے اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ ان سے جو گناہ بھی سرزد ہوتا ہے وہ اسے بڑا گناہ ہی سمجھتے ہیں اگرچہ فی الواقع وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ (گویا ان کی نظر میں تمام قسم کے گناہ بڑے ہی ہوتے ہیں) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل مطلق فضیلت اور بڑائی کے اظہار کے لئے ہو (یعنی ذاتی اعتبار سے وہ عمل انتہائی صحیح اور برا ہے) کسی دوسرے کے مقابلہ میں بڑائی اور فضیلت کے اظہار کے لئے نہ ہو۔ (یعنی تفضیل اضافی مراد نہ ہو)

۳۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا اجر و ثواب انہیں عطا فرمائے گا، یعنی ان کے بہت اخلاص کے سبب ان کے اچھے اور بہترین اعمال کے بدلے ایسا اجر و ثواب عطا فرمائے گا جو ان کے اعمال کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین اور عظیم ہو گا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل ”حسن“ مطلقاً ذاتی اور عظمت کے اظہار کے لئے ہو۔ (تفصیل اضافی مراد نہ ہو) مبالغہ کے لئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اور اچھے اعمال پر تو انہیں اجر و ثواب اور بدلہ عطا فرمائے گا لیکن ان کے برے اعمال پر انہیں کوئی بدلہ یا سزا نہیں دے گا (۱)۔

۴۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے اور یہ انداز اثبات میں اظہار مبالغہ کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی ہے۔ آیت میں عہد سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

۵۔ ابو جعفر حمزہ اور کسایی نے عبادہ کو عبادہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں عباد (بندوں) سے مراد انبیاء علیہم السلام یا حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ ترکیب کلام میں ویخوفونک کا عطف الیس اللہ بکاف پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح

ہوگی اللّٰهُ كَمَا فِي عِبْدِهِ وَيُخَوِّفُهُمْ فَوَيْلٌ لَّكَ۔ (یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے اور وہ (نادان) آپ کو ڈراتے ہیں) اور یخوفونک سے پہلے ہم مقدر مان کر اسے حال بنانا جائز ہے۔ (یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے حالانکہ وہ آپ کو خوفزدہ کرتے ہیں) ان معبودوں سے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین حضور نبی کریم ﷺ کو اپنے بتوں کی ناراضگی سے ڈرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے الہوں اور معبودوں کو گالی گلوچ دینے اور انکے بارے میں ایسا الفاظ استعمال کرنے سے باز رہیں ورنہ انکی جانب سے آپ پر بدحواسی اور جنون کی کیفیت طاری ہو جائے گی (۱)۔ اسی طرح عبدالرزاق نے بھی بیان کیا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لئے کافی سمجھے سے غافل ہو جائے اور ایسی چیزوں سے ڈرنے لگ جائے جو نقصان دے سکتی ہیں اور نہ ہی نفع تو پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں جو اسے رشد و ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخش دے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کیلئے فضل و عطا کا ارادہ فرمائے تو پھر اسے گمراہ کرنا الٰہ کوئی نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا نہیں ہے۔ یہ استغناء بھی انکاری ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غائب ہے۔ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ (اس سے وہ اپنے فرمایا ہندوں کو لوڑتا ہے) اور وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا ہے (یعنی نافرمانوں کو وہ سزا دینے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے)

وَلَكِنَّ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلْ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّيَّ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَتُهَا حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۱۷﴾

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ آپ فرمائیے پھر ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود دور کر دیں گے اس تکلیف کو یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہتا ہے تو کیا وہ روک سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو۔ فرمادیجئے مجھے کافی ہے اللہ تعالیٰ فقط اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔“

۱۔ اگر آپ کفار مکہ سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں واحد و بیکتا ہونے کی واضح دلیل ہے اور یہ امر بالکل بدیہی اور بظاہر ہے کہ بت کسی کو بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اہل مکہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

اسے پیار سے محبوب ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد آپ ان سے فرمائیے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے ہو کہ خالق کائنات صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن بتوں کو تم پوجتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچانا چاہے (یہاں ادا دنیٰ کو مزہ لے لیا سکتا ہے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یا کو مفتوحہ پڑھا ہے) تو کیا تمہارے وہ بت مجھ سے اس تکلیف کو دور کر دیں گے؟ یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہے تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ یا اگر وہ نے کاشفات اور مفسکات دونوں کو توہین کے ساتھ کاشفات اور مفسکات پڑھا ہے۔ اور ضرفہ اور رحمہ کو مقبول ہونے کی

بناؤ پر نصب دی ہے۔ جبکہ باقیوں نے نے مذکورہ دونوں نظموں کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ استنبہام انکاری ہے، یعنی ان کے اس اعتراف کے بعد کہ زمین و آسمان کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اس بات کا انکار لازم آتا ہے کہ بت اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی گئی کسی تکلیف کو دور کرنے یا اس کی عطا کردہ رحمت کو روکنے کی کوئی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (یعنی وہ بالکل قطعی طور پر کوئی ایسی قدرت نہیں رکھتے) مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئے کوئی جواب نہ دے سکے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ سے یہ ارشاد فرمایا قل حسبی اللہ (۱)۔ آپ فرمادیتے مجھے خیر و برکت پہنچانے کے لئے اور مجھ سے اذیت اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے فقط اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ مؤمنین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کیونکہ مؤمنین کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل اور بھروسہ کریں اس لئے آیت کریمہ میں ان کا ذکر متوکلین کے نام سے کیا گیا ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اَعْمَاؤُا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَابِدٌ ۙ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱﴾ مَن يَّاتِيْبُهُ عَذَابٌ
يُّخْزِيْهِ وَيُوْجِلُّ عَلَيْهِ وَاْدَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲﴾ اِنَّا اَنْزَلْنٰا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ
فَمَن اِهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَن ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِا وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِم بِوَكِيْلٍ ﴿۳﴾

”فرمائیے اے میری قوم! تم عمل کئے جاؤ یعنی جگہ پر میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ پس تم ضرور جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون ہے جس پر داغی عذاب اترتا ہے۔ (اے صبیح!) ہم نے تمہاری سے آپ پر یہ کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے حق کے ساتھ۔ پس جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ اپنا بھلا کرتا ہے۔ اور جو بہکتا ہے تو وہ بہکتا ہے اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے لئے۔ اور آپ ان (بدستگوں) کے ذمہ دار نہیں ہیں۔“

۱۔ عَلٰى مَكَانَتِكُمْ، علیٰ محالکم کے معنی میں ہے۔ یعنی اے میری قوم تم اپنے حال پر رہتے ہوئے عمل کئے جاؤ۔

مکانہ بمعنی جگہ نظر میں مکان ہے لیکن یہاں مجازاً احوال کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے جیسا کہ حیث اور ہندوؤں طرف زماں ہیں لیکن کبھی کبھی مجازاً طرف مکان کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

۲۔ اِنِّىْ عَابِدٌ کے بعد بھی علیٰ محالکم کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی میں اپنی حالت پر کام کرتا رہوں گا حذف سے مقصود کلام میں اختصار اور وعید میں مبالغہ کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حالت ایک خاص حد پر ٹھہر نہیں جائے گی بلکہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ آپ کی قوت و نصرت میں مزید اضافہ کرتا رہے گا۔ اسی لئے آپ نے کافروں کو ان کے خلاف دونوں جہاں میں کامیاب و کامران ہونے کی وعید سنائی۔ (کہ میں کامیاب ہوں گا اور تم تباہ و برباد ہو گے) اور اللہ نے فرمایا کہ تم ضرور جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے دشمنوں کا رسوا اور ذلیل ہونا ہی آپ کے ان پر غالب آنے کی دلیل ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو غرور میں ڈیل و رسوا کر بھی دیا۔

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ سے مراد دائمی عذاب ہے اور وہ جہنم کا عذاب ہے۔ یعنی اور کون ہے جس پر داغی عذاب اترتا ہے (یہ تمہاں لو گے)

ہے اور اس کی شعاع جسم میں باقی رہتی ہے۔ اسی کے سبب آدمی خواب دیکھتا ہے (۱) پھر جب آدمی نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لمحہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے (۱)۔

اگر یہ اثر صحیح ہے تو میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ بندے کی روح بدن سے باہر نکل کر عالم ملکوت میں عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور یہ خروج نیند کے وقت ہوتا ہے اور اس کی شعاع یعنی اس کا تعلق بدن کے ساتھ اس طرح باقی رہتا ہے جیسے پہلے تھا۔ پس اسی خروج کے سبب وہ خواب دیکھتا ہے اور جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لمحہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے۔

۲۔ پھر ان روجوں کو روک لیتا ہے جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے اور انہیں بدن کی طرف واپس نہیں لوٹانے گا یہاں تک کہ تجھ کو دعوت پذیر ہوگا (یعنی قیامت کے دن تک پھر انہیں واپس بدنوں میں نہیں لوٹاتا)

مزہ اور کسائی نے قضی کو سفید جمبول کی صورت میں قضی قاف کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور المصوت کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے سینہ معرف کی صورت میں قضی پڑھا ہے اور اس میں ضمیر مستتر قافل لفظ اللہ کی طرف راجع ہے اور لفظ المصوت کو مفعولیت کی بناء پر مضموم پڑھا ہے۔

۳۔ اور دوسری روجوں کو مقررہ میعاد تک واپس بھیج دیتا ہے۔ یعنی وہ سونے والے کی جان کو ہوش و حواس اور احساس و ادراک کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مقررہ وقت تک واپس بھیج دیتا ہے۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رات کے وقت حضور نبی کریم ﷺ آرام کے لئے بستر مبارک پر تشریف لے جاتے تو اپنا دست مبارک اپنے رخسار کے نیچے رکھ کر فرماتے اَللّٰهُمَّ بِنِكَ اَمُوْتُ وَاُخِي۔ (اے اللہ! میری موت اور میری زندگی تیرے ہی قبضہ اختیار میں ہے) اور جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ پڑھتے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَخْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَانَنَا وَاللّٰهِ الشُّهُوْرُ (۲)۔ (سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں موت (نیند) دینے کے بعد زندگی عطا فرمائی اور اسی کی طرف (قیامت کے دن) اٹھ کر جانا ہے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آرام کے لئے اپنے بستر کی طرف جائے تو اپنے بستر کو چاروں طرف سے پوجو جو خواب جہاز لینا چاہئے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی جگہ (بستر میں) کون آ گیا ہے۔ (یعنی سانپ پھجو اور دیگر اذیت ناک کیڑے مکوڑے وغیرہ) پھر زبان سے یہ کہے۔

۲۔ مکتوبات الصالح، ص ۵۲: 2382 (الکر)

۱۔ تفسیر بقرہ، ج ۵، صفحہ 18 (الکر)

(۱) سلیم بن عامر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا آدمی کا خواب بھی تجب خیر ہوتا ہے کہ وہ رات کو سوتا ہے اور ایسی چیز عالم داب میں دیکھتا ہے جس کا تصور تک اس کے دل میں نہیں نکلتا۔ پس کبھی تو اس کا خواب ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ (یعنی اس کا خواب بالکل سچا ہوتا ہے) اور آدمی کبھی ایسا خواب دیکھتا ہے کہ وہ حقیقتاً وہ کوئی شے نہیں ہوتا (یعنی وہ جھوٹا ہوتا ہے) تو حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے امیر المؤمنین! کیا میں آپ کو اس کے بارے میں خبر دوں؟ ہے تک اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَمْسُوْا فِىْ مٰمَاتِهِمْ شَيْئًا وَيَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَمْسُوْا فِىْ مٰمَاتِهِمْ شَيْئًا۔ پس اللہ تعالیٰ تمام جانوروں کو قبض کرتا ہے۔ آسمان کی بلند یوں میں اللہ تعالیٰ ہی پر ہے کہ قرب میں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ ہے خواب ہوتے ہیں اور جب وہاں سے انہیں جسموں کی طرف واپس بھیجا جاتا ہے تو شیاطین ان سے ملتے ہیں تو وہ ان کی دشمنی میں ہنسنے کی تہذیب کرتے ہیں اور کچھ جھوٹی باتوں کی استخردیتے ہیں وہ جھوٹے خواب ہوتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر خوب متعجب ہوئے۔

بِاسْمِكَ رَبِّي وَضَعْتَ جَنبِي وَبِكَ أَرْفَعُهُ إِنَّ أَسْتَكْتُ نَفْسِي فَأَرْحَمْهَا وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَأَحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِينَ۔ (اے میرے رب! میں نے تیرے ہی نام کی برکت سے اپنا پہلو (بستر پر) رکھا ہے اور تیرے ہی نام کی برکت اور مدد سے اس (بستر سے) اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو روک لے تو اس پر رحم فرما نا اور اگر تو اسے واپس آنے کے لئے چھوڑ دے تو اس کی ایسی چیزوں سے حفاظت فرما نا جن سے تو اپنے صالح اور نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ بستر کو چھانڈنے کے بعد وائیں پہلو پر لیٹ جائے اور پھر مذکورہ کلمات کہے اور ایک روایت میں ہے کہ اسے اپنے کپڑے کے پلو سے تین بار بستر چھانڈنا چاہئے اور اس میں اِنْ أَسْتَكْتُ نَفْسِي فَأَرْحَمْهَا کی بجائے اِنْ أَسْتَكْتُ نَفْسِي فَأَغْفِرْ لَهَا کے الفاظ ہیں۔ (یعنی اگر تو میری جان کو روک لے تو اس کی مغفرت فرما دینا) (۱)۔

یہ جینک جان قبض کرنے، بعض کو روک لینے اور بعض کو واپس بھیج دینے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے کامل ہونے اور اس کی رحمت کے عام ہونے کی نشیروں اور نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے جو نور و فکر کرتے ہیں کہ بدنوں کے ساتھ روحوں کے تعلق کی کیفیت کیا ہے۔ موت کے وقت کلی طور پر انہیں کیسے قبض کیا جاتا ہے اور بدنوں کے فنا ہونے کے باوجود یہ باقی رہتی ہیں اور پھر ان پر سعادت و شقاوت کے آثار کیسے ظاہر ہوتے ہیں اور ان میں کیا حکمت ہے کہ جانوں کو ظاہری طور پر قبض کر لیا جاتا ہے اور پھر وقتاً فوقتاً موت کے مقررہ وقت تک اسے قبض کرنے اور پھر واپس بھیجنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پس ان تمام میں غور و فکر کرنے والے یہ جان لیتے ہیں کہ وہ ذات جو ان تمام احوال و کیفیات پر قادر ہے وہ بالیقین دوبارہ اٹھانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ آیت قول باری تعالیٰ فلیتوکل المتوكلون کی علت بیان کرنے کے محل میں واقع ہے۔

أَوْرَأْتُمْ ذُوْنَ اللّٰهِ شَفَعَاءَ قُلْ أَوْلُوْكَأَنْتُمْ أَلَا يَسْتَكُوْنَ شَيْئًا وَلَا يَعْقُلُوْنَ ۝

قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا لَّهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ لِيْٓؤْتِرْجِعُوْنَ ۝

”کیا انہوں نے نہ مانے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اور سفارشی۔ پوچھئے اگر چہ وہ (مزمومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ

عقل و شعور رکھتے ہوں۔ آپ فرمائیے سب شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور

زمین کی پھر اسی کی طرف تم لوٹناے جاؤ گے۔“

اے اور اٹھنا، میں اس ابتدائی ہے اور ہمزہ انکار کے معنی میں ہے۔ یا پھر ام متسل ہے اور مزدوف جملہ پر محظوف ہے۔ اللہ پر کلام اس طرح ہے اجعلوا للہ شؤکاء ام اتخذوا من ذؤبہ شفعاء۔ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک بنائے ہیں یا اسے چھوڑ کر اور سفارشی بنائے ہیں؟ یا یہاں معتطف ہے اور بل انصاریہ کے معنی میں ہے اور یہ انصاریہ ان فی ذلک لایت لقوم یفکرون کے مضمون سے ہے۔

اے محمد ﷺ! آپ پوچھئے اگر چہ وہ (مزمومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل و شعور رکھتے ہوں اولو کانا میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ اللہ پر کلام اس طرح تھا ایشفعون لکم ونو کانا علی ہذہ الصفة الئی تشاهدونہم علیہا خماذاب لا تعقل ولا تقدیر۔ کیا وہ تمہاری سفارش کریں گے اگر چہ وہ اسی حالت پر ہوتے جس پر تم انہیں دیکھ رہے ہو کہ وہ

جمادات میں منتقل و شعور رکھتے ہیں اور نہ ہی قدرت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ ممکن تھا کہ وہ کہہ دیتے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقرب بندوں کی پوجا کرتے ہیں نہ کہ ان بتوں کی بلکہ یہ تو صرف ان کی تصویریں اور صورتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دش قول کو رد کرنے اور لامصلحوں کی علت بیان کرنے کے لئے فرمایا۔

قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۗ كَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلٍ وَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ مَا يَشَاءُوْنَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۙ ﴿۱۰۰﴾
 اے اللہ تعالیٰ! تو ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقرب بندوں کی پوجا کرتے ہیں نہ کہ ان بتوں کی بلکہ یہ تو صرف ان کی تصویریں اور صورتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دش قول کو رد کرنے اور لامصلحوں کی علت بیان کرنے کے لئے فرمایا۔

وَ اِذَا دُكِرَ لِلّٰهِ وَحْدًا ۙ اَسْمَاءُ كَثْرَتٍ قُلُوْبَ الْاِنۡسَانِ لَا يُوْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۗ وَاِذَا دُكِرَ
 الْاٰتِیَاتِ مِنْ دُوْنِهَا ۙ اِذَا هُمْ يَسْتَبِشِرُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
 عَلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۙ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِیۡ مَا كَانُوْا فِیۡهَا یَحْتَفِیۡوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”اور جب ذکر کیا جائے اکیلے اللہ کا تو کڑھنے لگتے ہیں ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ذکر کیا جاتا ہے ان کے سوا دوسروں کا تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ آپ عرض کیجئے اے اللہ! اے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین کے! اے جاننے والے غیب اور شہادت کے! تو ہی فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔“

اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں، منتقل ہو جاتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا بتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ حضور نبی کریم نے ﷺ سورۃ وانجم ان کے سامنے پڑھی اور شیطان نے اپنی طرف سے اس میں یہ کچھ ڈال دیا تلک الغواہب العلیٰ وان شفاعتھن لشریحی تو یہ سن کر کفار انتہائی مسرور ہوئے (۱)۔ ابن مندرد نے مجاہد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشمنز اور استبشار دونوں لفظوں میں انتہائی مباہلہ کا اظہار ہے حتیٰ کہ معنوی طور پر اپنے اعتقاد کو پختہ ہونے ہیں۔ کیونکہ استبشار کا معنی ہے دل کا خوشی سے اس طرح بھر جانا کہ اس کے آثار چہرہ سے ظاہر ہو جائیں اور چہرہ فرحت و انبساط سے کھل جائے اور اشمنز اسے مراد دل کا غم و غصہ سے اس طرح بھر جانا حتیٰ کہ چہرے کی کھال بھی منتقل ہو جائے سکتا ہے۔ اذائیں عال معنی مفاجات ہے (۲)۔

اے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو اپنی بارگاہ میں دعا کی التجاء کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ کیونکہ جب آپ ﷺ کفار کے معاملہ میں انتہائی پریشان اور حیران ہو گئے اور ان کی عداوت و دشمنی اور ان کی انتہائی درشتی اور بد اخلاقی کے سبب عاجز آ گئے تو چونکہ اللہ

تعالیٰ ہی تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہمارے تمام احوال اور جو چیزیں ہم سے غائب ہیں اور جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں ان سب کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (اس لئے اس نے اپنے محبوب کو اپنی بارگاہ میں استجاء کا حکم ارشاد فرمایا) کہ تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یعنی حق پر چلنے والے کی مدد فرمائے گا اور باطل پر چلنے والے کو ذلیل و سوا کرے گا۔ ان امور میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کن الفاظ سے رات کی نماز شروع کیا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا۔ آپ ﷺ یہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ رَبِّ جِبْرِئِلَ وَ مِيكَائِلَ وَ اسْرَافِیْلَ فَاطِنِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ غَالِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِیْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اَلْهٰدِیْنَ لِمَا اَخْتَلَفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاَذْنِكَ تَهْدِنِیْ مِنْ تَشَآءِ اِلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِیْمٍ۔

(اے اللہ! جبرائیل و میکائیل و اسرافیل اور اسی کے رب! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب اور شہادت کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ جب مسائل میں اختلاف ہو جائے تو مجھے اپنے اذن اور حکم کے ساتھ راہ حق کی راہنمائی فرما کیونکہ مجھے تو جانتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔)

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَصْلٰفًا اِلَّا اَرْضٌ جَبِیْعًا وَّمِثْلَهُ مَعَهُ لَا فِئْتٰنًا وَّ اِیْہِ مِنْ سُوْرَةِ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۗ وَ بَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَلْمُوْا یَحْتَسِبُوْنَ ۙ وَ بَدَا لَهُمْ سِیِّاٰتٌ مَّا كَانُوْا یَسْتَهْزِءُوْنَ ۙ

”اور اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا زمین میں جو کچھ ہے سب ہو اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تو چاہیں گے کہ بطور عذاب یہ ادا کر دیں اسے برے عذاب کے عوض قیامت کے دن اور (اس روز) ظاہر ہو جائے گا ان پر اللہ کی طرف سے جس کا وہ گمان بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اور ظاہر ہو جائیں گے ان پر وہ برے اعمال جو انہوں نے کئے تھے اور گھبرائے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔“

۱۔ اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا جو کچھ زمین میں ہے سب ثابت ہو جائے اور جمع ہو جائے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو تو وہ چاہیں گے کہ اسے برے عذاب کے عوض بطور عذاب یہ ادا کریں۔ قیامت کے دن یہ ان کے لئے انتہائی شدید وعید ہے اور انہیں خلاصی پانے سے حد درجہ مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی ان کے لئے عذاب سے نجات پانے کی قطعاً کوئی امید باقی نہیں ہوگی) اور اس روز ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دینے کے ایسے مراتب اور درجات ظاہر ہوں گے جن کا وہ وہم و گمان بھی نہیں کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے ارشاد فرمایا فَلَا تَتْلَمَّ نَفْسٌ مَّا اَسْفَقَتْ لَهَا مِنْ قُوَّةٍ اَوْ غَیْبٍ ۗ (پس کوئی نفس نہیں جانتا جو مومنین کے لئے آنکھوں کی مضحکہ خیزی رکھی گئی ہے) تو اس کے مقابلہ میں انتہائی زور اور مبالغہ کے ساتھ اہل جہنم کے لئے یہ فرمایا وَ بَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا كَانُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔

مقابلہ کے لئے کہا ہے جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اس وقت ان کے لئے وہ عذاب ظاہر ہوگا جس کا وہ دنیا میں گمان بھی نہیں

کرتے کہ آخرت میں انہیں ایسے عذاب سے واسطہ پڑے گا (1)۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ بت ان کی سفارش کریں گے یا ان کا وہم یہ تھا کہ ان کے لئے حشر و نشر نہیں ہوگا یا اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ آخرت میں ان کی حالت مومنین کی نسبت کہیں اچھی اور بہتر ہوگی۔ لیکن اس دن ان کے وہم و گمان کے خلاف ظاہر ہوگا۔

مندی نے کہا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں یہ سب نیکیاں ہیں لیکن قیامت کے دن ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ سب برائیاں ہیں۔ یعنی وہ بتوں کی پوجا کرنے کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ گمان کرتے تھے تو جب اس پر انہیں سزا دی جائے گی تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ ظاہر ہوگا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے (2)۔

جس ان پر ان کے اعمال نے پیش کئے جائیں گے تو شرک اور اولیاء اللہ کے ساتھ جانے والے ظلم و زیادتی جیسے اعمال کی برائی ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی اور انہیں وہ عذاب گھیر لے گا جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ماسکناؤ میں ماموصولہ ہے اور اس سے مراد عذاب ہے یا مامصدر یہ ہے اور معنی یہ ہے کہ ان کے استہزاء کرنے کی سزا انہیں گھیر لے گی۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا نَكْمًا إِذَا حَوْلَهُ نِعْمَةٌ مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أَزِيدُهُ عَلَىٰ
عِلْمٍ طَبْلٍ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّا كَثُرْهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٠﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يُكْسِبُونَ ﴿٢١﴾

”پس جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو ہمیں پکارتا ہے اور پھر جب ہم عطا کر دیتے ہیں اسے نعمت اپنی جناب سے تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت مجھے دی گئی ہے (اپنے) علم (و فضل) کے باعث۔ (اے غافل یوں نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ کئی تھی یہ بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے (جب ہم نے انہیں پکڑا) تو نہ فائدہ پہنچایا انہیں (مال و دولت نے) جو وہ کمایا کرتے تھے۔“

آیت میں الانسان سے مراد کافر انسان ہے (اور اس پر الف لام عہدی ہے) بعض نے کہا ہے کہ الف لام جنس ہے اور اس میں جنس انسان کی خبر دی جا رہی ہے لیکن چونکہ کفار کی تعداد زیادہ ہے لہذا اس کثرت کے پیش نظر جنس انسان سے مراد کافر انسان ہیں۔ ضرر کا معنی ہے شدت سخت تکلیف یعنی جب کافر انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا معنی مطلق قول باری تعالیٰ و اذا ذکر اللہ وحدہ و حرف فاء کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ مردمان میں پائے جانے والے تافہش کی وضاحت ہو جائے اور یہ بیان ہو جائے کہ وہ اسباب کو الٹا کیسے کرتے ہیں۔ یعنی صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت ان کے چہرے سکر جاتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں لیکن بتوں کے ذکر کے وقت ان کے چہرے کھل جاتے ہیں، ان پر فرحت و انبساط کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور پھر جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسے ہی پکارتے ہیں جس کا ذکر سن کر چہرے سکر گئے تھے نہ کہ انہیں جن کا ذکر سن کر انہیں خوشی ہوئی تھی۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملے معترضہ ہیں جو انکار کی تاکید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

پھر جب ہم اسے اپنی مہربانی اور فضل سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو مجھے اپنے علم و فضل کے باعث دی گئی ہے۔ تحویل کا لفظ مہربانی کرتے ہوئے کسی کو کچھ دینے کے ساتھ مختص ہے۔ (یعنی یہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے) علمی رہیم سے

مراد ہے کمائی کے اسباب اور ذرائع۔ یا یہ کہتا ہے کہ یہ نعمت مجھے اسلئے دی گئی ہے کہ میں اس کا مستحق تھا۔ یا یہ کہتا ہے کہ میں جانتا تھا کہ یہ نعمت مجھے عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے۔ اگر ما کو موصول بنایا جائے تو پھر اوتیہ کی ضمیر کا مرجع وہی ہے۔ ورنہ ضمیر نعمتی کی طرف راجع ہے۔ چونکہ نعمت سے مراد شے ہے اس لئے ضمیر مذکر ہے۔ (اسے غائل یوں نہیں) بلکہ یہ نعمت تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے امتحان اور آزمائش ہے کہ کیا بندہ اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ یا پھر یہ نعمت انہیں عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے ایک سبب اور خاص تدبیر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے بلکہ وہ بات جو انہوں نے کہی وہ ایک آزمائش ہے اور موجب عذاب ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان سے مراد جنس انسان ہے (۱)۔

(کیونکہ لیکن حرف استدرک ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نادانی کا حکم تمام انسانوں پر نہیں بلکہ اکثر کے لئے ہے)

میں کہتا ہوں کہ اگر انسان سے مراد کافر انسان بھی ہو تب بھی اکثر کفار سے مراد اہل کفار ہی ہوں گے۔ (لہذا جنس انسان مراد نہ لینے میں بھی معنی میں کوئی صعب پیدا نہیں ہوتا) یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کفار میں سے بعض یہ اعتقاد اور یقین رکھتے تھے کہ وہ باطل پر ہیں جیسا کہ علمائے یہود وغیرہ لیکن وہ جنس سرشی ٹھہری اور ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔

۱۔ یہ بات ان لوگوں نے کہی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد قارون ہے کیونکہ اس نے یہ کہا تھا اِنَّمَا اُوْتِيْتُكَ عَلٰی عِلْمِيْ بِمِيْنٰی (۲)۔ چونکہ بہت سے لوگوں نے اس کے اس قول کے ساتھ رضامندی اور اتفاق ظاہر کیا تھا اس لئے ان تمام کی طرف اس قول کی نسبت کرتے ہوئے قبلم میں ضمیر راجع نہ کر لی گئی ہے۔

پس وہ خزانے جن کی چابیاں اٹھانے کے لئے حاکموں کی ایک جماعت درکار تھی۔ ان خزانوں اور مال و دولت کے انبار نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۗ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوْا ۗ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۱۰ اَوْلٰٓئِكَ يَلْعَنُوْنَ ۗ اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

”پس جو برے کام انہوں نے کئے ان کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑا۔ اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان لوگوں میں سے انہیں بھی عذریب اپنی بد اعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اور یہ (ہمیں) عاجز نہیں کر سکتے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کشادہ عطا فرماتا ہے رزق جس کو چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کو چاہتا ہے) یقیناً اس (تقسیم رزق) میں اس کی (حکمت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے۔“

۱۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ میں (سینہ) برائی کی جزا کو سب کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ اس لئے ہے کیونکہ یہ برائی کے مقابلہ اور جواب میں واقع ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاءِ اور کفار مکہ میں سے جنہوں نے کفر (ظلم) کیا۔ انہیں بھی عذریب اپنی بد اعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ یعنی جیسے انہوں نے کہا ویسے ہی ان کے ساتھ بھی سلوک ہوگا۔ چنانچہ وہ سات سال تک قحط میں مبتلا رہے، میدان بدر میں ان کے بڑے بڑے سردار قتل کر دیئے گئے اور پھر انہیں جہنم میں داخل کیا گیا جائے گا صرف وہ بھیجیں گے جنہوں نے ان میں سے توبہ کر لی

ایسے ہی طبرانی نے ضعیف سنہ کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاصد وحشی کو دعوت اسلام دینے کیلئے ایک آدمی بھیجا تو اس نے جواباً یہ کہلا بھیجا آپ مجھے اپنے دین کی طرف کیسے دعوت دے رہے ہیں؟ حالانکہ آپ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ جس نے کسی کو قتل کیا یا شریک کیا یا زنا کا مرتکب ہوا تو وہ ایسا گناہ کرنے والا ہے جس کیلئے اسے قیامت کے دن دو گنا عذاب دیا جائیگا اور میں نے یہ سب کچھ کہا ہوا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِیْنَ ثَابَتْ وَاَعْرَضُوْا عَنَّا صَالِحًا لَّمَّا (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) تو وحشی نے کہا یہ شرط تو انتہائی شدید اور سخت ہے شاید میں اسے پورا کرنے پر قادر نہ ہو سکوں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا ذُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔

وحشی نے کہا یہ نکلنا اس میں مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ موقوف ہے اس لئے میں شبہ میں پڑ گیا ہوں کہ آیا توبہ کرنے کے بعد میری بھی مغفرت ہوگی یا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نقل لیا جاتی الآیۃ نازل فرمائی (1)۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں مزید یہ نقل کیا ہے (کہ اس آیت کے نزول کے بعد) مسلمانوں نے عرض کی کہ یہ صرف وحشی کے لئے ہی خاص ہے یا تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حاکم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ایسا آدمی جس نے اسلام قبول کرنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے بعد طرح طرح کے مصائب اور آزمائشوں میں مبتلا ہونے کے سبب اپنا دین چھوڑ دیا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ایسے لوگوں کے بارے میں آیت نقل لیا جاتی الآیۃ نازل ہوئی (2)۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیت عیاش بن ربیعہ ولید بن ولید اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر وہ آزمائشوں میں مبتلا ہو گئے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور آزمائشیں دی گئیں چنانچہ تنگ آ کر انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا تو ہم یہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان کو کوئی عمل قبول نہیں فرمائے گا چاہے وہ فرض ہو یا نفل۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اول اسلام لائے۔ پھر جب انہیں تکلیفیں اور دکھ پہنچائے گئے تو اسی کے سبب انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طہیات نازل فرمائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے ان آیات کو لکھ کر عیاش بن ربیعہ ولید بن ولید اور ان لوگوں کی طرف بھیج دیں۔ چنانچہ وہ پھر اسلام لے آئے اور ہجرت کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے (3)۔

۱۔ قُلْ لَیْسَ بِالَّذِیْنَ اٰتٰیَتْہُمْ اٰیٰتِنَا اَعْلٰی اَنْ یَّغْفِرَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۗ لَمَّا (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) تو وحشی نے کہا یہ شرط تو انتہائی شدید اور سخت ہے شاید میں اسے پورا کرنے پر قادر نہ ہو سکوں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا ذُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔

2۔ مستدرک حاکم، صفحہ 3628 (المعلیہ)

4۔ تفسیر بنوری، جلد 5، صفحہ 22 (المفکر)

1۔ معجم کبیر، طبرانی، صفحہ 11480

3۔ تفسیر بنوری، جلد 5، صفحہ 22 (المفکر)

قید بالا معنی ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ** اور اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں جو روایات ذکر کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہذا معنی یہ بنتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہو کر ایمان کو محض اس بنا پر نہ چھوڑو کہ تم نے اس سے قبل اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔

سے **إِنَّ اللَّهَ يُغْفِرُ الذُّنُوبَ كُلَّهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ** یعنی اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ بشرطیکہ تم شرک سے توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ واحدہ لا شریک کے ساتھ ایمان لے آؤ۔ کیونکہ اسلام سابقہ تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ ختم کرتا ہے (۱)۔ یہ روایت حضرت عمرو بن عباس رضی اللہ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول اگرچہ خاص ہے کیونکہ یہ صرف ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حالت شرک میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اور پھر اسلام لے آئے۔ لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور اس پر یہ مفہوم دلالت کرتا ہے کہ بندہ جب ایمان لے آئے (چونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادی کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرتے ہوئے فرمایا عبادی تو اس میں عبادہ قرآن کے مطابق یہ دلیل موجود ہے کہ عباد سے مراد وہ مومن بندے ہیں تب ہی اللہ تعالیٰ نے نسبت اپنی طرف فرمائی ہے) اور اگر وہ اسلام لانے کے بعد گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو پھر بھی یہ امید ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس کی مغفرت فرما دے گا اگرچہ اس نے توبہ نہ کی (لہذا اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) جیسا کہ اس معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيُغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ** اور اس کی علت یہ ارشاد بیان کر رہا ہے۔ **إِنَّهُ لَظَهْرُ الْعَقُولِ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْحَقِّ وَالْأَوَّلِ** ہمیشہ رحم فرمائو والا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا سینہ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا فائدہ دیتا ہے۔ مغفرت کے بعد رحمت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ آیت کے آغاز میں لفظ عبادی ہی مغفرت کے عام ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ لفظ عبادہ جزئی و انحصاری پر دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی طرف منسوب کرنا انحصار کا فائدہ دیتا ہے اور پھر عاجزی اور انحصار دونوں ہی رحم کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ پھر اس میں زیادتی اور گناہ کے ضرر اور نقصان کو انفس کے ساتھ خاص کر دیا اور پھر مطلق رحمت سے مایوس اور ناامید ہونے سے منع فرمادیا چہ جائیکہ کوئی مغفرت سے مایوس ہو۔ اور اس کی علت یہ قول بیان کر رہا ہے **إِنَّ اللَّهَ يُغْفِرُ الذُّنُوبَ كُلَّهَا**۔ (بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے) اور پھر ضمیر کی جگہ لفظ انحصار ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مستغنی (بے نیاز) ہے اور وہی منعم حقیقی ہے اور پھر لفظ ذنوب کی تاکید جمعیتاً سے ذکر کی (تو مذکورہ بالا تمام قرآن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بندہ مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت عام ہے چاہے اس سے گناہ کبیرہ ہرگز نزول یا صغیرہ۔ وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ ہر وہ حال میں اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں اور اس پر اجماع امت بھی ہے۔

مقاتل بن حیان نے تابع کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا گروہ یہ خیال کرتے تھے یا کہتے تھے کہ ہماری نیکیوں میں سے ہر نیکی مقبول ہے حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْغُوا إِلَهُاتِهِمْ** (اے اہل ایمان! تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو بیکار نہ کرو۔) تو ہم نے کہا کونسی وہ چیز ہے جس سے ہم اپنے اعمال کو باطل کر سکتے ہیں۔ تو ہم نے خیال کیا کہ وہ لفظ کبار اور

فوجش ہی میں آپ فرماتے ہیں۔ پھر جب ہم کسی کو گناہ کبیرہ کا ارتکاب عاکرتے دیکھتے تو ہم کہتے ہیں تو بلاک ہو گیا ہے تو پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ لِيُبَيِّنَ لِي الْاَلْبَانِ اَسْرُوْنَا - الایہ۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دونوں توپوں سے رک گئے۔ پھر جب ہم کسی کو دیکھتے کہ اس سے گناہ صادر ہوا ہے تو ہمیں اس کے بارے (بربادی، اعمال کا) خوف ہونے لگتا اور اگر کسی سے گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوتا تو اس کے لئے (قبولیت اعمال کی) امید رکھتے (۱)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے وہاں ایک وعظ کرنے والا جنم کے عذاب اور اس کے طوق وزنجیر کا ذکر کر رہا تھا تو آپ اس کے سر کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور کہا اے ذکر و نصیحت کرنے والے! لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) ہانپوں اور نا امید نہ کر۔ پھر آپ نے یہی آیت قُلْ لِيُبَيِّنَ لِي الْاَلْبَانِ اَسْرُوْنَا اَعْلَىٰ اَنْفُسِهِمْ لَا تَشْقُوْنَا مِنْ شَرِّ حَمِيَّةِ اللّٰهِ الْاِيَّاهِ پڑھی (۲)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پڑھتے سنا قُلْ لِيُبَيِّنَ لِي الْاَلْبَانِ اَسْرُوْنَا اَعْلَىٰ اَنْفُسِهِمْ لَا تَشْقُوْنَا مِنْ شَرِّ حَمِيَّةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُعْزِزُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيُهْزِئُ الْكٰفِرِيْنَ وَلَا يَسْتَعِيْزُ بِالْاَلْبَانِ (۳) آپ فرمائیے! اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور شرح السنۃ میں یقیناً کی بجائے بقول کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی نے نانوسے (99) انسانوں کو قتل کیا تھا پھر وہ ایک راہب (تارک الدنیا آدمی) کے پاس آیا اور (توبہ کے بارے) اس سے دریافت کیا تو اس راہب نے اسے کہا تیرے لئے اب کوئی توبہ نہیں۔ تو اس نے اسے بھی قتل کر دیا اور پھر لوگوں سے پوچھتا رہا (کہ توبہ کے بارے) دریافت کرنے کے لئے کہاں جاؤں؟ تو پھر اسے ایک آدمی نے بتایا فلاں گاؤں میں جاؤ وہاں ایک اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اس سے جا کر توبہ کا کوئی سبب اور طریقہ دریافت کرو۔ چنانچہ وہ اس کی راہنمائی پر اس گاؤں کی طرف چل پڑا لیکن ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں ہی اسے موت نے آلیا اور اس نے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ (دم نکلتے نکلتے) اپنا سینا اس گاؤں کی طرف اٹھا دیا (یعنی سینے کا رخ اوپر پھیر لیا) اور فوت ہو گیا تو اس کے بارے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف (گاؤں والی طرف) کی زمین کو حکم فرمایا تو قریب ہوجا (سکڑ جا) اور دوسری طرف (یعنی جدر سے دو چل کے آیا تھا) والی زمین کو حکم فرمایا تو دور ہوجا (گھٹیل جا۔ طویل ہوجا) اور فرشتوں کو حکم فرمایا ان دونوں کے درمیان مسافت ناپ لو۔ چنانچہ ملائکہ نے گاؤں والی طرف کی زمین کو ایک باشت قریب پایا (طے شدہ سفر کی نسبت باقی ماندہ ایک باشت کم لگی) تو اسی کے سبب اسے بخش دیا گیا۔ متفق علیہ (4) اس حدیث کو مسلم بن حجاج نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے مطابق روایت اس طرح ہے کہ اس قاضی کی راہنمائی راہب کی طرف کی گئی۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور کہا میں نے نانوسے افراد کو قتل کیا ہے کیا میرے لئے توبہ کا کوئی ذریعہ ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ چنانچہ اس نے اسے بھی قتل کر کے پورے سو کر دیئے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اہل زمین میں سے بڑا عالم کون ہے؟ چنانچہ اس کی راہنمائی ایک عالم کے بارے کی گئی تو اس نے ان کے پاس جا کر پوچھا کہ میں نے سوا فراد کو قتل کیا ہے کیا توبہ کا کوئی

1- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 22 (القرن)

2- تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 22 (القرن)

3- جامع ترمذی، حدیث: 3237 (دارالحدیث)

4- مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: 2327 (القرن)

ذرا میرے؟ تو عالم نے جواب دیا کیوں نہیں آپ کے اور تو بے کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ تم فلاں ہستی کی جانب چلے جاؤ۔ کیونکہ وہاں کے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ مل کر عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور اپنی زمین کی طرف لوٹ کر نہ آنا۔ کیونکہ یہ برائی والی زمین ہے۔ چنانچہ وہ اس ہستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آ گئی۔ اب ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف ہو گیا۔ پس ایک فرشتہ ظاہری صورت میں ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے حکم (تلاش) دیا جن لیا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں جانب کی زمین ناپ لو۔ کوئی جانب کی زمین قریب ہے جس جانب کی زمین قریب ہو (یعنی مسافت کم ہو) یہ اسی جانب کے لئے ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے زمین کو ناپا تو انہوں نے اس جانب کی زمین کو کم اور قریب پایا جس جانب وہ جارہا تھا تو اس طرح رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح پر قبضہ کر لیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا تو اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا پھر نصف رکھ چنگلی میں اور نصف کو سمندر میں اڑا دینا۔ کیونکہ قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اسے گرفت میں لے لیا تو پانچ مہینے اتنا شدید اور سخت عذاب دے گا جتنا وہ پوری کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے وہی کچھ کیا جیسے اس نے کہا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے وہ ساری رکھ جمع کر دی جو اس میں ڈالی گئی تھی۔ پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ ساری رکھ جمع کر دی جو اس میں اڑائی گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اب بتا تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو اس نے جواباً عرض کی اسے میرے رب! صرف تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ اور تو بہتر جانتا ہے تو اسی پر اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ متعلق علیہ (۱)۔

علامہ ابنوی نے ذکر کیا ہے کہ مضمضہ بن حوش نے کہا میں مدینہ طیبہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے شیخ نے آواز دے کر کہا اسے یمنی! میرے قریب آؤ حالانکہ میں انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کسی آدمی سے یہ نہ کہنا وَاللّٰهُ لَا يَغْفِرُ الْمَلَائِكَةَ وَلَا يُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ (قسم بخدا! اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کرے گا اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا) تو میں نے سن کر عرض کی اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے آپ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا میں ابو ہریرہ ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا ہم میں سے جب کوئی غصے اور غضب کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ کلمات تو وہ اپنے گھر والوں کو بھی کہہ دیتا ہے اپنی بیوی کو بھی اور اپنے خدام کو ایسے ہی کہہ دیتا ہے تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے دو آدمی تھے جو باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک انتہائی عبادت گزار تھا اور دوسرا گنہگار تھا تو عبادت گزار اپنے دوسرے گنہگار کو بہتار بتاتا تھا اب تو گناہوں سے باز آ جا تو وہ جواب دیتا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر، میں جانوں اور وہ۔ وقت گزارتا رہا یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنے ساتھی کو بہت بوسے گناہ میں مبتلا پایا تو اسی عبادت گزار نے اسے کہا اب تو گناہ چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر۔ کہا تجھے میرا گنہگار (اعمال کی ناک میں رہتے ہو) بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو عبادت گزار نے اس کے جواب میں کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ بھی مجی تیری مغفرت نہیں فرمائے گا اور تجھے کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف موت کا فرشتہ بھیجا۔ اس نے ان دونوں کی ارواح کو قبض کیا۔ اس طرح وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کرنے والے کو کہا تو میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کیا تو یہ طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے سے میری رحمت کو روک لے؟ تو اس نے عرض کی اسے میرے پروردگار ہرگز نہیں! تو رب تعالیٰ نے اس کے بارے میں حکم دیا اسے جہنم کی طرف لے جاؤ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس آدمی نے جو حکمت کہے تھے انہوں نے اس کی دنیا اور آخرت کو تباہ و برباد کر دیا (1)۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بعینہ یہی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت طیبہ قُلْ لِيُجَابِيَ الَّذِينَ اسْتَوْفُوا عَاقِبَتَهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ اللہ تعالیٰ نے انہوں کو بخش دیا اور ان کی تمام چیزوں میں سے کوئی شے میرے نزدیک پسندیدہ نہیں (2)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے محدثین کے ساتھ ابن جریر طبرستانی نے الاوسط میں اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور تہذیبی رحمتہ اللہ علیہ کی روایت میں بھی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور جس آدمی نے شرک کیا (کیا اسے بھی اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا) پس آپ ﷺ نے تعویذی دیر کے لئے سر جھکا یا اور پھر فرمایا مگر وہ جس نے شرک کیا آپ ﷺ نے تین بار ایسے فرمایا۔ (یعنی وہ آدمی جو شرک کر رہا اور اسی حالت پر اسے موت آگئی تو اس کی مغفرت نہیں ہوگی)

حضرت جناب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ فلاں آدمی کی مغفرت نہیں فرمائے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون ہے جو میرے نام کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بیشک میں نے اس فلاں کو بخش دیا اور تیرے اعمال کو ناکارہ کر دیا۔ او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ اے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ اِلَّا اللَّمَمَ (ایسے گناہ جنہیں کرنے کے بعد ندامت و شرمندگی محسوس ہو) کے بارے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے گناہوں کو اللہ تعالیٰ بخش دے گا اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادے گا۔ اے اللہ! تیرا کون سا بندہ ہے جس سے گناہ صادر نہ ہو (4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے۔ ایک طویل حدیث قدسی میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں (کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا) میں جو چاہتا ہوں وہی کرتا ہوں میری عطا بھی کلام ہے اور میرا عتاب بھی کلام ہے۔ کسی شے کے بارے میں میرا امر یہ ہے کہ جب میں چاہتا ہوں کہ وہ ہو جائے تو میں اس کے لئے فقط یہ کہتا ہوں کن (تو ہو جا) پس وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ اسے احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (5)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نیک اور صالح بندے کے درجات کو جنت میں بلند فرمادے گا تو وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب! میرے یہ درجات کیسے بلند ہو گئے؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے یا سبغفار و لندک لندک (6)۔ تیرے بیٹے کے تیرے لئے استغفار کرنے کے سبب (تیرا درجہ بلند کر دیا ہے) (رواہ احمد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں میت کی حالت اس ڈوبنے والے کی طرح ہوتی ہے جو فریاد کر

- 1- تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 24 (الکر)
- 2- مسند احمد، جلد 5، صفحہ 275 (مسار)
- 3- صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 143، حدیث: 137 (العلوی)
- 4- جامع ترمذی، حدیث: 3284 (دارالحدیث)
- 5- جامع ترمذی، حدیث: 2495 (دارالحدیث)
- 6- مسند احمد، جلد 2، صفحہ 509 (مسار)

رہا بؤدہ کا طالب ہو۔ مرنے والا انسان (اپنی قبر میں) باپ ماں بھائی یا کسی دوست کی جانب سے دعائے مغفرت کے پختہ پختہ کا منتظر رہتا ہے۔ جب کسی کی جانب سے اسے دعا پختہ ہوتی ہے تو وہ نیا اور اس کی تمام چیزوں کی نسبت اس کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اہل زمین کی دعائے پہاڑوں کی مثل ثواب اہل قبور کو پہنچاتا ہے اور زندوں کی جانب سے مردوں کیلئے تحفہ اور ہدیہ ان کے لئے استغفار کرتا ہے۔ اسے پہنچتی ہے شعب الایمان میں نقل کیا ہے (1)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیٹک اللہ تعالیٰ ابھتین اپنے بندے کی مغفرت فرمادے گا جب تک کہ کتاب (پڑھ) نہ واقع ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اسے کتاب کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کا ایسی حالت میں مر جانا کہ وہ مشرک ہو (2)۔ اسے احمد اور بیہقی نے کتاب البعث والنتور میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی اس حال میں اللہ تعالیٰ سے جا ملے کہ وہ دنیا کی کسی شے کو اس کے مساوی اور برابر نہ قرار دے پھر اگر اس پر پہاڑوں کی مثل بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا۔ اسے بیہقی نے کتاب البعث والنتور میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیٹک اللہ تعالیٰ کی سورتیں ہیں۔ اس نے ان میں سے رحمت کا ایک حصہ جن وانس اور دیگر چیزوں اور کبوترے کوزوں کو ودیعت فرمایا ہے۔ جس کے سبب وہ آپس میں ایک دوسرے سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں، تم سے ہیں آتے ہیں اور اسی کے سبب وحی جا نور بھی اپنی اولاد کے ساتھ رافت و شفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے نانا کو جسے پاس محفوظ رکھے ہیں جن کے سبب قیامت کے دن وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ متفق علیہ (3)۔ مسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا کلمہ کے ساتھ (الطبار بندہ نوکرمی) فرمائے گا۔

حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ قیدی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں لائے گئے تو ان میں ایک عورت بھی تھی اس کے پستان سے دودھ بہ رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی اور جب بھی وہ قیدیوں میں کوئی شیر خوار بچہ پاتی تو اسے اٹھا لیتی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلاتی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنی اولاد کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ تو ہم نے عرض کی۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو پوری کوشش کرے گی کہ وہ اولاد کو آگ میں نہ پھینکے تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ اذخمت بعبادہ من ہذہ بولیدھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم فرمائے والا ہے جتنا کہ یہ عورت اپنی اولاد پر۔ متفق علیہ (4)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ بیان فرماتے سناؤ لمتن خائف مقامہ ترہہ جنتین ①۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا وَلَمَسْنَ خَافَ مَقَامَهُ تَرَهَّبَهُ جنتین ②۔ میں نے بھی دوسری بار پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا وَلَمَسْنَ خَافَ مَقَامَهُ تَرَهَّبَهُ جنتین ③۔ میں نے تیسری بار پھر وہی عرض کی اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی

2۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 174 (مسار)

1۔ شعب الایمان، حدیث: 9295 (العلویہ)

4۔ صحیح بخاری، حدیث: 5653 (ابن کثیر)

3۔ مشکوٰۃ الصالح، حدیث: 2365 (المنکر)

یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ (وہ ایسا بھی کرے) ابوالدرداء کی ناک خاک آلود ہو (وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے) اسے احمد نے روایت کیا ہے (1)۔

حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا جو اپنے اوپر چادر لپیٹے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرا تو میں نے اس میں کسی پرندے کے بچوں کی آوازیں سنیں چنانچہ میں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنی اس چادر میں رکھ لیا۔ اتنے میں ان کی ماں آئی اور وہ میرے سر پر منڈلانے لگی تو میں نے اس کے لئے انہیں ایک بار ظاہر کیا تو وہ فوراً ان پر جھپٹ پڑی لیکن میں نے انہیں اپنی اس چادر میں لپیٹ لیا اور اب وہ میرے پاس ہیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا انہیں رکھ دو۔ پس میں نے انہیں رکھا اور ان کی ماں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہی (اسے اپنی جان کی فکر قطعاً دامن گیر نہ ہوئی) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر توجہ رکھنا ہو کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر کتنی مہربان ہے (کتنی شفقت اور پیار کا اظہار کر رہی ہے؟) قسم ہے مجھے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ سمجھوتہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور مہربان ہے جتنا کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) انہیں واپس لے جا اور اسی جگہ پر رکھو کہ جہاں سے تو نے انہیں پکڑا ہے۔ ان کی ماں ان کے ساتھ ہی تھی کہ وہ آدمی انہیں واپس چھوڑ آیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ ﷺ کا گوزر ایک قوم کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تم کوئی قوم ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم مسلمان ہیں۔ ان میں ایک عورت ہانڈی پکڑ رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ جب بھی آگ بھڑکتی اور شعلہ بلند ہوتا تو وہ بچے کو اپنے سے علیحدہ کر کے (آگ کی تپش سے دور رکھتی) وہ عورت حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر اس نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا اللہ تعالیٰ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی۔ بیٹک ماں تو اپنی اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی۔ بیٹک ماں تو اپنی اولاد کو آگ میں نہیں جھینکتی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سراقدرس جھکایا اور رونے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے سر نیا زانٹھایا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں ہی عذاب دے گا جو انتہائی سرکش ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی معاندانہ اور سرکش کا سلوک کرتے ہیں اور لا الہ الا اللہ کہنے سے باہل انکار کرتے ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس بندے نے لا الہ الا اللہ کہا (یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا) اور پھر اسی نظریہ پر قائم رہے ہوئے اسے موت آگئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کی اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ میں نے پھر عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ میں نے تیسری بار پھر عرض کی اگرچہ اس نے زنا کیا

اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے ابو ذر تیری ناک خاک آلود ہو اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ متفق علیہ (۱)۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انجام کار بندہ مومن جنت میں داخل ہوگا۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ نے کہا ہے کہ اگر گناہ کبیرہ کرنے والے نے توبہ کی تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

فرقہ مر جیہ والوں نے انہی احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ گناہ چاہے صغیرہ ہوں یا کبیرہ ایمان کی موجودگی میں (بندے کے لئے) ضرر رساں نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ حالت کفر میں طاعت و عبادت نفع مند ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن ان کا یہ نظریہ باطل ہے اور اس سے ان کثیر آیات و احادیث کا انکار لازم آتا ہے جو گناہوں سے روکنے کے لئے ذکر کی گئی ہیں اور ان میں یہ مذکور ہے کہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب تک لے جانے والے ہیں مگر جب کہ مغفرت بندے کی چارہ سازی کرے (تو پھر اس گرفت سے بچ سکتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ مذہب حق وہی ہے جو اہل السنۃ والجماعہ نے اختیار کیا ہے۔ بیشک حالت کفر میں طاعت و عبادت نفع بخش ثابت نہیں ہوتی کیونکہ طاعت ہوتی ہی نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خاص نہ ہو۔ بلکہ وہ تو معصیت ہوتی ہے اور طاعت و عبادت کے لئے ایمان اسی طرح شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔ لیکن معصیت اور گناہ اگر چہ ذاتی اعتبار سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں لیکن اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے اگر چاہے توبہ بندے کی مغفرت فرمادے اور اگر چاہے تو اسے عذاب میں مبتلا کر دے پھر اگر وہ اپنے معاف فرماتا چاہے گا تو اسے توبہ کے سبب معاف فرمادے گا یا حضور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے سبب یا حضور نبی کریم ﷺ کے تقسیمین میں سے کسی کی (دعا) کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کی دعا سے) یا پھر اس کی مغفرت محض اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہوگی اور اگر وہ اسے عذاب بھی دے گا تو اس کا عذاب دائمی اور ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ بندہ مومن ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (اہل ایمان کے ساتھ) یہ نبی پر اجر و ثواب کا وعدہ فرما رکھا ہے اور ارشاد فرمایا قَدْ نَعْنَسُ وَشَقَّالٌ ذَرَفَتْ عَيْنَا وَنُحَدِّثُكَ ۝ اور ایمان تمام نیکیوں کی اصل اور بنیاد ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی محال ہے اور اجر و ثواب کا صلہ بالیقین جنت ہے۔ لیکن بندہ مومن اپنے گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ہے (اور وہ اوپر سے گرنے کے قریب ہے) اور فاجرو کا فرسان اپنے گناہ کو ناک پر بیٹھے والی کھسی کی طرح گمان کرتا ہے اور اس کے بارے میں کہتا ہے کہ اس طرح ہاتھ کا اشارہ کریں گے تو وہ اڑ جائے گی۔ یہ حدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔

وَ اٰیٰتِیۡوَاۤ اِلٰی رَبِّکُمْ وَ اَسْلَمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ ۝ وَاَسْعَوْاۤ اَحْسَنَ مَاۤ اُنزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَبِّکُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَعۡثَةً وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

”اور (سچے دل سے) لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور سرخم کرو اس کے سامنے اس سے پہلے کہ آ جائے تم پر عذاب پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔ اور بیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اسے جو شکر کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے۔ اور تمہیں خبر تک نہ ہوئے پائے۔“

۱۔ اور تم (سچے دل سے) شکر کے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ اور تم اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرو اس

سے پہلے کہ تم پر قہر میں یا قیامت قائم ہونے کے بعد عذاب آجائے۔ پس اس وقت تمہارا ایمان لاتا تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس پر ﴿لَا تُنصَرُونَ﴾ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ ان الفاظ کا عطف جملہ مستند پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔
تُعَذَّبُونَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ۔ یعنی تمہیں عذاب دیا جائے گا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

یعنی اور یہی ذکر و عمدہ کلام کی جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے تو اس میں عمدہ کلام سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ یہ تمام کلاموں سے احسن اور عمدہ ہے یا پھر اس سے مراد عزائم ہیں نہ کہ نخصیں۔ (یعنی عزائم کو اپناؤ نہ کہ فقط رخصتوں پر عمل کرو) اس سے بیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تمہیں اس کے آنے کی خبر تک نہ ہو۔

أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يٰحَسْرَتِيْ عَلَىٰ مَا فَرَّطْتُ فِيْ جَنبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ
السّٰخِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ اَوْ تَقُولَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ السّٰقِيْنَ ﴿٢٦﴾ اَوْ تَقُولَ
حٰيْرَتًا مِّنَ الْعٰدٰىبِ لَوْ اَنَّ لِىْ كُوْنًا فَا كُوْنُ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٧﴾

” (اس وقت) کوئی شخص یہ کہنے لگے صدحیف! ان کو تائبوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں اور میں تو دستبردار

اڑانے والوں سے تھا۔ یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں ہو جاتا پرہیزگاروں میں سے۔ یا یہ کہنے

لگے جب عذاب دیکھے کاش! مجھے ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں نیکو کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔“

لَا اَنْ تَقُولَ كَمَا مَعْنٰی ہے (اس وقت) کوئی شخص مجبوراً یہ کہنے لگے۔ یا معنی ہے تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہے۔ نفس کو گمراہ ذکر کیا گیا ہے اور اس پر توین تکلیل کیلئے ہے کیونکہ قیامت کے دن یہ قول کہنے والے چند لوگ ہی ہوں گے یا توین تکثیر کیلئے ہے ترکیب کلام میں ان تفرق البیوت فعل کا مفعول لڑ ہونے کی بنا پر ماضی منصوب ہے۔ اور مبرر نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے بَادِرُوا وَاِخْلَدُوا اَنْ تَقُولَ نَفْسٌ (۱)۔

یخسرتی۔ صدحیف ہائے خسوس! اکامعنی حسرت اور غم میں اضافہ کا ہونا ہے۔ یہ اصل میں یا حسرتی ہے یا پھر یا گمراہ استغاش کی صورت میں الف کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے۔ بعض نے الف استغاش کے بعد پھر یا کو اس کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جیسا کہ ابو جعفر نے یا حسرتا پڑھا ہے۔

عَلٰی صَافِرٍ ظَلْفٌ مِّنْ مَّاصِدْرٍ یہ ہے معنی یہ ہے صدحیف! میری کوتاہی کرنے اور غفلت برتنے پر۔

فی جنب اللہ کا معنی حسن نے یہ کیا ہے۔ قصرت فی طاعة اللہ۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جو کوتاہی کی کجاہانے کہا فی امر اللہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں میں نے جو کوتاہی کی اور سعید بن جبیر نے کہا فی حق اللہ (۲)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حق میں جو کوتاہی ہوئی۔ بعض نے فی ذات اللہ بھی معنی کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جو کوتاہی ہوئی۔ اس صورت میں طاعت یا قرب مضاف مندوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کی اطاعت میں یا اس کے قرب میں جو کوتاہی ہوئی۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میں نے کوتاہی کی اس جانب میں جو مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی طرف لواتی تھی۔ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ میں ان خلفہ عن المثلہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے اور میں پر لام فارقہ داخل ہے اور مکمل جملہ حال ہونے کی

بناہ پر عمل نصب میں ہے۔ گویا کہ اس نے یہ کہا۔ ”اور میں تو اللہ تعالیٰ کے دین اس کی کتاب اس کے رسول اور اہل ایمان کے ساتھ تسخیر اور استہزاء کیا کرتا تھا۔“

ع۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے لئے ہدایت ثابت ہو جاتی تو میں بھی شرک اور گناہوں سے بچنے والے پرہیزگاروں میں سے ہو جاتا۔

ع۔ یا عذاب کو ظاہر دیکھ کر کہنے لگے کاش اچھے دنیا کی طرف لوٹنے کا ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں ان لوگوں میں سے ہو پڑوں گا جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے نیکو کار ہیں۔ فاکون میں فاء کے بعد ان نامہ مقدر ہے، اسی کی بناہ پر فعل منصوب ہے اور یہی تہمتی کے جواب میں واقع ہے، کیونکہ اس سے قبل او حرف تہنی واقع ہے۔ لو ان لمی حکوۃ او حرف عطف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ قیامت کے دن حسرت آمیز اور انہوس سے بھرے کلمات کہے گا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس دن نفع بخش اور سود مند ثابت نہ ہوگی تاکہ اس دنیا میں ہی اسے یہ علم ہو جائے کہ اس دن ایسی لغو اور بے معنی گفتگو کی گنجائش نہیں ہوگی۔

بَلَىٰ قَدْ جَاءَ ثَلَاثُ آيَاتِي فَمَا وَاسْتَلْبِزَّتْ وَلَكِنَّ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ تَسْرَىٰ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا عَلٰى اللّٰهِ وَجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَةٌ ۝ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ
مَنْسُوْبًا لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ وَيُنٰجِيْ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اَتَقَوْا بِسَفَاٰرَتِهِمْ ۝ لَا يَسْمَعُ
السُّوْعٰۗةَ وَاَلٰهَهُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

”ہاں! ہاں! آئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے انہیں جھٹلایا اور تو گھمنڈ کرتا رہا اور تو کفر کر نیوالوں میں سے تھا۔ اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ انکے چہرے سیاہ ہوں گے کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا تکبر کر نیوالوں کا؟ اور نجات دے گا اللہ تعالیٰ سستیوں کو کامیابی کے ساتھ۔ نہ چھوٹے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہونگے۔“

ع۔ بَلَىٰ قَدْ جَاءَ ثَلَاثُ الْاٰیٰتِ۔ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو کلی طور پر رد کر دیا ہے جسے کہنے والے کا قول لَوَ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰی لَبِیْتُ الْبَلٰغٰتِ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ مضمون ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت ہی نہیں دی۔ اب اگر ہدایت سے مراد اس کا معنی ارادۃ الطریق ہے (یعنی فتنہ اور نہایتی کرنا راستہ دکھانا) تو اس کا معنی یہ ہوگا کیوں نہیں۔ بلکہ میں نے تو میری رہنمائی کی تھی اس طرح کہ تیری طرف اپنا رسول بھیجا اور میری کتاب تیرے پاس پہنچی لیکن تو نے اس کی تکذیب کی اسے جھٹلایا تو پھر اس نے اپنے قول لو ان اللہ ہدانی کے ساتھ رسل علیہم السلام کی تبلیغ کا انکار کیا ہے (یعنی نہ میرے پاس کوئی رسول آیا اور نہ مجھے کسی نے اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچایا) جیسا کہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور آپ سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے تبلیغ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امت تک پہنچایا تھا؟ تو وہ جواب دیں گے جی ہاں! میں نے پیغام حق اپنی امت تک پہنچایا تھا۔ پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا نوح علیہ السلام نے تم تک پیغام پہنچایا تھا تو وہ کہیں گے نہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ ہاں آج آؤں بیٹھوں گا اور تم لوگوں نے یہ حدیث و کذٰلکَ جَعَلْنَا لَكُمْ اٰمَةً وَّ سَطَا لَیْتَلُوْۤا اَشْهَادًا عَلٰی النَّاسِ اور قول باری تعالیٰ فَتَلْمِزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا سِیۡۤا اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوْۤا فِیۡۤا اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوْۤا فِیۡۤا اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوْۤا فِیۡۤا اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوْۤا

ہدایت سے مراد خلق ہدایت اور ایصال الہی المطلوب (منزل مقصود تک پہنچانا) ہو تو بھران کے قول لو ان اللہ ہدنی الآیۃ کا معنی یہ ہوگا کہ میں تو مجبور محض تھا مجھے ایمان و اطاعت اختیار کرنے کی قدرت ہی حاصل نہ تھی (گویا کہ وہ یہ کہے گا کہ میں ایمان تو تب لاتا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی اختیار دیتا۔ اس نے مجھے کوئی قدرت ہی نہیں دی پھر میں کیسے صلح فرما بیٹھا اور بتا) تو اس قول کا رد کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا بئلی قد جآءتک الایۃ یعنی کون نہیں میں نے تو تجھ میں قدرت پیدا کی تھی (کہ اپنی مرضی اور پسند سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے ہم نے دونوں راستے تیرے لئے واضح کر دیئے ہیں) اسی قدرت اور اختیار کے استعمال پر عذاب و ثواب مرتب ہوتا ہے۔ لیکن جب میری آیات تیرے پاس آئیں تو تو نے اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ انہیں جھٹلا دیا۔ اس نظر سے بندوں کے افعال میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اثر انداز ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل السنۃ والجماعہ کا مذہب ہے۔

(لو ان اللہ ہدنی الآیۃ ان کا قول مردود ہے اور بئلی قد جآءتک الایۃ اس قول کا رد ہے اور ان دونوں کے درمیان ان تفویض حین تروی العذاب الآیۃ بطور فاصلہ موجود ہے) اب اگر یہ کہا جائے کہ رد اور مردود کے مابین اس فاصلے کی وجہ کیا ہے؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس آیت (قول رد) کو مقدم کرنے سے قرآن متفرق ہو جاتا ہے۔ قول مردود مؤخر ہو جاتا ہے اور وہ نظم کلام اور عبارت جو کہ موجود کیفیت سے مطابقت و موافقت رکھتی ہے اس میں ظلل واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے کو تا ہی اور غفلت پر اظہار حسرت و ندامت کرتا رہا ہے۔ پھر وہ ہدایت یافتہ نہ ہونے کے سبب کف افسوس مل رہا ہے اور پھر وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی خواہش اور آرزو کر رہا ہے۔

قد جآءتک الایۃ میں معنی کے اعتبار سے ضمیر خطاب مذکر ذکر کی گئی ہے۔

یہ قیامت کے دن آپ انہیں دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے تھے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان کرتے تھے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا ہرگز جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اولاد بنانا وغیرہ۔ اس حال میں کسان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ترکیب کلام میں جملہ وجوہ ہم مسودۃ تروی کے منقول سے حال واقع ہو رہا ہے کیونکہ اس کا تعلق رؤیۃ بصر (آکھ سے دیکھنے) کے ساتھ ہے۔

أَلَيْسَ لِي بِحَقِّكَ مَعْسُومٌ يُسْأَلُ عَنِّي نَارَ جَهَنَّمَ فَيُكَلِّمُنِي بِهَا وَلَا يَجِدُّ لِي عُسْرًا وَلَا يَخِيفُنِي أَلَيْسَ لِي بِحَقِّكَ مَعْسُومٌ يُسْأَلُ عَنِّي نَارَ جَهَنَّمَ فَيُكَلِّمُنِي بِهَا وَلَا يَجِدُّ لِي عُسْرًا وَلَا يَخِيفُنِي (یعنی اے حق تعالیٰ ان کا ٹھکانہ جہنم میں ہے) کیونکہ اس وقت وہ خود بھی اسے دیکھ لیں گے۔

یع اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ جہنم سے نجات دے گا جو شرک سے بچے اور درور رہے۔

حزہ کسائی اور ابو بکر نے بمفاز تہم کو بمفاز اتہم الف کے ساتھ جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر الف کے مفرد حالت میں پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے کامیابی۔ بعض نے اس سے مراد نجات لی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ بھی کامیابی کی اقسام میں سے ایک مخصوص اور اہم ترین قسم ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم سعادت (خوش بختی) اور عمل صالح بیان کیا ہے چونکہ یہ دونوں بھی کامیابی کے اسباب ہیں اس لئے اس میں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے اور بمفاز تہم میں باء سیبہ ہے اور یہ یسعی کا صلہ ہے (یعنی اس کے متعلق ہے) یا اس کا تعلق لا یمسہم السوء الآیۃ کے ساتھ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو حال ہے یا پھر کامیابی کے بیان کے لئے جملہ ساتھ ہے (معنی یہ ہے درآ نکھالید انہیں کوئی تکلیف نہیں چھوے گی اور نہ وہ ٹھکن ہوں گے)

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿٦٥﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَ
الْأَرْضِ ﴿٦٦﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٧﴾

”اللہ تعالیٰ پیدا کر نیوالا ہے ہر چیز کا۔ اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کتبوں کا۔ اور جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا وہی لوگ خسارہ میں ہیں۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ ہی خیر و شر اور ایمان و کفر میں سے ہر شے کو پیدا کر نیوالا ہے۔ یہ جملہ ارشاد باری تعالیٰ ﷻ اِنَّ اللّٰهَ يَتَوَفَّى الْاَنۡفُسَ الۡمُتَّصِلَةَ ہے۔ ان کے درمیان تمام جملے متر سے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔ یعنی تمام چیزیں اسی کے سپرد ہیں اور وہی ان کی حفاظت فرماتا ہے۔ یہ جملہ معطوف یا حال ہے۔

۲۔ مَقَالِيدُ مَقَالِدٌ و عَقْلًا و یاستفید کی جمع ہے جیسا کہ مفتاح کی جمع مفتاح یا منديل کی جمع منادیل آتی ہے۔

۳۔ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ کا معنی ہے کہ زمین و آسمان کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں اسی کی ملکیت میں، اس کے سوا کوئی بھی ان میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

۴۔ قَادِرٌ اور مقاتل نے بیان کیا ہے کہ زمین و آسمان کی چابیوں سے مراد رزق اور رحمت ہے۔ کلمی نے کہا ہے اس سے مراد بارش کے خزانے اور نباتات کے خزانے ہیں (۱)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے مقابلہ کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُخْبِي وَيُكْشِفُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲)۔ (۱) اسے ابو یعلیٰ نے اپنی سند میں ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں عقیلی نے ضعفاء میں طبرانی نے الدعاء میں اور عقیلی نے السماء والصفات میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے موصوفات میں اسے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو ان کلمات میں ذکر کی گئی ہیں وہی مقالید کی تفسیر ہیں۔ یعنی وہ ذات جو ان صفات سے متصف ہے وہی زمین و آسمان کے خزانوں کی مالک ہے تمام خزانے اسی کی ملکیت اور قبضے میں ہیں۔ وہی ان میں

۱۔ تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 26 (القرن)

2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 625 (العلویہ)

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے بارے سوال کا واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اسی طرح مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جو آدمی صبح و شام یہ کلمات دس دس بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اسے چھ وصف اور خصائص عطا فرمائے گا۔ ایک یہ کہ وہ شیطان اور اس کے لشکر سے محفوظ رہے گا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں عطا فرمائے گا، تیسرا یہ کہ اس کی زودیت میں فرخ چشم جو عطا فرمائے گا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا۔ چوتھا یہ کہ اگر ایمان علیہ السلام کی معیت میں ہوگا اور پھلدار کہ موت کے وقت بارہ فرشتے اس کے پاس حاضر ہوں گے وہ اسے حق کی بشارت دیں گے اور قبر سے موقف تک اسے عزت و احترام کے ساتھ لے جائیں گے۔ جب قیامت کے دن اسے کوئی خوف لاحق ہوگا تو فرشتے کہیں گے تو خوفزدہ نہ ہو بلاشبہ تو ان والوں میں سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر حساب و کتاب کو انتہائی آسان کر دے گا پھر اسے جنت میں لے جائے گا حکم دیا جائے گا تو فرشتے اسے موقف حساب سے جنت کی طرف ایسی شان اور عزت سے لے جائیں گے جیسے جن کو لے جایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے اذن سے جنت میں داخل کر دیں گے۔ حالانکہ عام لوگوں پر حساب انتہائی سخت ہوگا۔

تصرف کر سکتا ہے اور جو اس کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے وہ یہ اہلیت رکھتا ہے کہ اس کے لئے جلدی یادیر سے خزانوں کے منہ کھول دیئے جائیں۔

سے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آجوں کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم اور وہ کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی اور وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور زمین و آسمان کے معاملات کا حاکم مطلق ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

خسارے کو صرف کفار کے ساتھ ہی خاص اور محصور کیا گیا ہے کیونکہ ان کے سوا تمام کے تمام رحمت و ثواب سے کچھ نہ کچھ حصہ پانے والے ہیں۔ اگر کوئی نعمتوں میں سے کوئی شے انہیں نہ بھی حاصل ہوئی تو ان کے بدلے انہیں آخرت میں ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ ان کے بارے کسی کان نے سنا۔ لیکن کفار کے لئے اگر چند چاندنیوں رزق اور بارش کے خزانوں میں سے حصہ موجود ہے (وہ ان سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں) لیکن شکر میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی رحمت کے خزانوں میں ان کے لئے کوئی حصہ ہے اور یہ دنیا کی لذتیں اور نعمتیں جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے آخرت میں ان کے لئے وبال اور فریب میں بدل جائیں گی۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا کے ساتھ متصل ہو اور ان کے درمیان جملہ مترضہ ہو۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کا نگران ہے ان کے افعال و اعمال پر مطلع ہے اور انہی اعمال کی وجہ سے انہیں جزاء اور بدلہ دے گا اور لفظ کلام میں تبدیلی اس پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ مومنین کی فلاح اور کامیابی و کامرانی میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ چیز اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کفار کے خسارے میں سے سب سے بڑا خسارہ ان کا آیات الہی کے ساتھ کفر کرنا ہے۔ اجر و ثواب کے وعدہ کو صراحتاً ذکر فرمایا اور عید کا ذکر اشارتاً اور تعریفاً کیا اور یہ بھی ایک خاص تدبیر ہے۔ واللہ اعلم۔

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ ”آپ کو اتنا افرمال دیں گے کہ وہ میں امیر ترین آدمی بن جائیں گے اور جس عورت سے آپ چاہیں گے وہ اسی سے آپ کی شادی کر دیں گے“ انہوں نے کہا اسے محمد (ﷺ) یہ سب کچھ آپ کے لئے ہوگا بشرطیکہ آپ ہمارے جمہور کو برا بھلا کہنے سے رک جائیں۔ تاہم یہ کلمات کے ساتھ آپ ان کا تذکرہ نہ کریں اور اگر آپ یہ نہیں کرتے تو پھر یہ کریں کہ آپ ایک سال تک ہمارے جمہوروں کی عبادت کریں اور پھر ایک سال ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں وہی کروں گا جو میرے رب کی طرف سے نازل ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُفُّوا عَنِ الْعِبَادَةِ الَّتِي لَكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَارُ (۱)۔

قُلْ أَقْبَعِيَرِ اللّٰهُ تَأْمُرُوْنَ بِىٓ اَعْبُدْ اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ ﴿١٠﴾ وَ لَقَدْ اَوْحٰى اِلَيْكَ وَاِلٰى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ؕ كَلِمٰتٍ اَشْرَكَتْ لِيَّحْبِطَنَّ عَمَلُكَ وَاَلْتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿١١﴾
بَلِ اللّٰهُ فَاَعْبُدْ وَاَنْتَ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ ﴿١٢﴾

”آپ فرمائیے اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔ اور بیشک وحی تمہاری گئی ہے آپ

کی طرف اور ان کی طرف جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر (بفرض حال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے بلکہ صرف اللہ کی ہی عبادت کیا کرو اور ہو جاؤ شرک گزاروں میں سے۔“

۱۔ اسے محمد ﷺ: آپ فرمائیے اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔ تامل و فی میں نافع اور ابن کثیر نے یاہ لومنتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

علامہ بیہقی نے دلائل میں حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکین نے حضور نبی کریم ﷺ کو کہا ہے محمد ﷺ: آپ تو اپنے آباء و اجداد کو مگر اقرار دیتے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت قرین الشکیوین تک نازل فرمائی (۱)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مقابل کا قول ہے کہ کفار مکہ نے آپ ﷺ کو اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی (۲) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اہل شام نے تامل و فی کو دونوں مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے اس کی قرأت ایک نون مخففہ کے ساتھ کی ہے اور ایک نون کو حذف کر دیا ہے کیونکہ اسے اکثر حذف کر دیا جاتا ہے اور باقیوں نے ادغام کی صورت میں ایک نون مشدودہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ افعیر میں مزہ برائے انکار ہے اور فاء مخدوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ اور غیو، اعبد فعل کا مفعول ہے اور اسے عمل انکار ہونے کی وجہ سے فعل پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور تامل و فی جملہ محترضہ ہے۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ ءَاكْفُرْ فَعْبُدِ اللّٰهَ اَعْبُدْ تَامُرُوْنِيْ بِذٰلِكَ۔ (کیا میں کفر کروں اور غیر اللہ کی عبادت کروں تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو۔)

اور یہ بھی جائز ہے غیر اس فعل کے سبب منصوب ہو جس پر تامل و فی اعبد دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ تعددونی باب تفصیل کے معنی میں ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اس طرح ہے تَامُرُوْنِيْ اَنْ اَعْبُدَ غَيْرَ اللّٰهِ اِس سے ان کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو مرفوع پڑھا گیا۔ جیسا کہ اس قول میں ہے احضرو الوغی اور اس کی تائید اعبد نصب والی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ پس مفہوم عبادت اس طرح ہے کہ کیا اسے دلائل کے بعد بھی تم پر توحید واضح نہیں ہوئی کہ تم مجھ سے غیر اللہ کی عبادت کی توقع رکھتے ہو اور تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا مشورہ اور حکم دیتے ہو۔

۲۔ وَتَقْعُدُوْنِيْ اَلَيْتُك سے آخر آیت تک سارا کلام ایک فرضی مفہوم کے تحت ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد کفار کو مایوس اور ناامید کرنا ہے اور امت کو حکم پر مستحب کرنا ہے۔ اسی آیت سے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ مرتد ہونا تمام نیکیوں کے ثواب اور اجر کو ختم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اسلام اپنے سے قبل کی تمام برائیوں اور گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اگر کوئی آدمی مرتد ہونے کے بعد نماز کے وقت میں اسلام لے آیا۔ جبکہ مرتد ہونے سے قبل حالت اسلام میں اس وقت کی نماز ادا کر چکا تھا تو اس پر دو بارہ اس نماز کو پڑھنا لازم ہے۔ اسی طرح جس آدمی نے پہلے حج کیا پھر مرتد ہو گیا پھر دو بارہ اسلام لے آیا تو اس پر دو بارہ حج کرنا واجب ہوگا۔ امام ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اعمال کے ضائع کرنے کا حکم مطلق ہے اور یہ ان (انبیاء علیہم السلام) کے خصائص میں سے ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ ان کا شرک کرنا زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے اور یہ موت کے ساتھ مقید ہونے کا احتمال بھی رکھتا

ہے۔ (یعنی ارتداد سے اعمال ضائع تب ہوتے ہیں جب اسی حالت پر موت آ جائے) جیسا کہ اس ارشاد میں صراحت موجود ہے۔ وَ
مَنْ يَرْتَدْ عَنْ دِينِهِ فَسَبَّحْتَ عَنْ يَدِ اللَّهِ غَاسِقًا إِلَىٰ ذِي قَرْظٍ لَا يَلْتَمِسُ إِلَيْهِ اللَّهُ (1)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ یہ کہنا کہ ارتداد انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے یہ انتہائی فتیح اور برا
تصور ہے۔ قریب ہے کہ اس طرح کہنے سے آسمان پھٹ جائے۔ کیونکہ یہ کلام فرض محال کے طریقہ پر ہے اور اس سے مراد دوسروں
کے حکم پر مستند کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ مَنْ يَرْتَدْ عَنْ دِينِهِ فَسَبَّحْتَ عَنْ يَدِ اللَّهِ غَاسِقًا إِلَىٰ ذِي قَرْظٍ لَا يَلْتَمِسُ إِلَيْهِ اللَّهُ نہیں کرتا جب
تک مرتد کی موت حالت کفر پر نہ ہو اس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ مزید بحث آیت مطلق ہے اور ہمارے نزدیک مطلق اپنے
اطلاق پر ہی بانی رہتا ہے۔ اسے تنقید پر محمول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۔ بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کیا کرو۔ یعنی الحقیقت اس قول کا رد ہے جو کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا۔ لفظ اللہ
اعبد فعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے مضموب ہے۔ فاعبد پر فاء یا تو زائد ہے۔ یا پھر یہ امام مقدرہ کے سبب ہے۔ اس میں معمول کی
اپنے عامل سے تقدیر کا سبب ارادہ مضر ہے اور بل حرف عطف ہے جو کہ محدود کلام پر عطف کرنے کے لئے ہے جس پر قول باری
تعالیٰ لَنْ اَبْرَحَ اَرْضًا وَلَا اَكْفُرُ بِمَا كُنْتُ مِنْ قَبْلُ وَلَا اَلْبَسُ اِلَهًا غَيْرَ اللَّهِ تَعَالَىٰ اَوْ نَبِيًّا اَمَّا اللَّهُ فَاعْبُدْ۔

اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ اس میں بھی موجب اختصاص کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہی تمہیں
نعوتوں سے نوازنے والا ہے اور آپ اسی کے شکر گزار بننے سے نہیں) ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے
روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا اور اس نے کہا اے ابوالقاسم اتم کیا کہتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ
آسمانوں کو اس (دست قدرت کی انگلی) پر رکھے گا اور زمینوں کو اس پر رکھے گا اور پانی کو اس پر رکھے گا اور پہاڑوں کو اس پر رکھے گا (2)
(تو وہ کیا کرے گا؟) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاوَاتُ
مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ ۗ سُبْحٰنَہٗ وَّتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰﴾

”اور نہ قدر پیمانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پیمانے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی
مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔ پاک ہے وہ ہر مہیب
سے اور ترے لوگوں کے شرک سے۔“

۱۔ یعنی لوگوں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عظمت نشان کو اس طرح نہیں پہچانا جیسے پہچانے کا حق تھا۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے
ساتھ کسی دوسروں کو شریک ٹھہرا لیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے اوصاف کی نسبت کی جو قطعاً اس کی شان اور عظمت کے لائق
اور مناسب نہیں۔ انہوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کی جیسے اس کی عبادت کا حق تھا اور نہ ہی اس کی (نعوتوں پر) حق شکر ادا
کیا اور اس کے ساتھ ساتھ موت کے بعد وہ بارہ زندہ کئے جانے کا انکار کر دیا۔

۲۔ اَرْضٌ جَمِيعًا سے مراد ساتوں زمینیں ہیں اپنے تمام اجزائے ظاہرہ اور باطنہ کے ساتھ۔

قُبُضَةً کا معنی ہے ایک بار قبضہ کرنا۔ یہ لفظ انقباض سے بنایا گیا ہے اس کا اطلاق کسی بھی شئی کی اس مخصوص مقدار پر ہوتا ہے جو مٹھی میں بند ہو۔ یہ لفظ یا تو مصدر بمعنی مفصول ہے یا پھر اس سے پہلے ذات مضاف محذوف ہے۔ یعنی اس کے قبضہ والی چیزیں۔

یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے جسے اپنے ظاہر معنی سے پھیر دیا گیا ہے اور اس کی حقیقی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کرنا ہے اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ بڑے بڑے اور عظیم افعال جن کے بارے انسانی فہم و فراست حیرت زدہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی شان قدرت کے سامنے بالکل بیچ اور حقیر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ساری کائنات کو درہم برہم کرنا بالکل آسان کام ہے۔

علمائے بلاغت نے بیان فرمایا ہے کہ یہ کلام تشبیل و تخییل کے طریقہ پر وارد ہے۔ قبضہ اور عین سے نہ تو حقیقی معنی مروی ہے نہ مجازی۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول "شابت لمة اللیل" (رات کی زلفیں سفید ہو گئیں) اس آیت کے نازل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی نے (زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں) ایک بات کہی تھی اور اس نے یہ بات بائیس تین تورات سے نقل کی ہو گی۔ گویا یہ آیت اس (نظریہ) کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث اس طرح مذکور ہے کہ یہودیوں کا ایک عالم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا ہے عمر (رضی اللہ عنہ!) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کو (اپنے دست قدرت کی) ایک انگلی پر تمام زمینوں کو ایک انگلی پر پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر پانی اور تری کو ایک انگلی پر اور ساری مخلوق کو ایک انگلی پر روک لے گا۔ پھر انہیں جھنجھوٹے گا اور فرمائے گا میں بادشاہ ہوں اور میں اللہ ہوں تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس کی بات پر اظہار تعجب فرمایا اور مسکرا دیئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی۔ وَهَذَا كَرْمُ اللَّهِ صَلَّى قَدْرُهُ الْآيَةَ (1)۔ اظہار یہ لگتا ہے کہ ترمذی اور صحیحین کی روایت کے درمیان تعارض ہے (کیونکہ ترمذی کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کے قول کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ جبکہ صحیحین کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی کے قول کے بعد یہ آیت پڑھی۔ یعنی اس کا نزول پہلے ہو چکا تھا) پھر ان دونوں میں تطبیق کیسے ہو سکتی ہے؟ تو اس کا سبب تطبیق یہ ہے کہ یہ آیت یہودی کے قول کے بعد آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور اس وقت آپ ﷺ نے یہ آیت یہودی پر پڑھ دی۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضے میں لے لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں دست قدرت میں لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا میں تو شہنشاہ مطلق ہوں۔ زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟ (2)۔

مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ دے گا پھر انہیں دائیں دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ بڑی قوت و طاقت والے کہاں ہیں وہ خرد و تکبر کرنے والے۔ پھر زمینوں کو لپیٹ کر اپنے بائیں دست قدرت میں پکڑ لے گا اور ایک روایت میں الفاظ ہیں کہ انہیں دوسرے دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں کہاں ہیں وہ بڑی قوت و طاقت والے کہاں ہیں وہ خرد و تکبر کرنے والے (3)۔

2۔ صحیح مسلم جلد 17، صفحہ 109، حدیث: 23 (اعلیٰ)

1۔ صحیح مسلم جلد 17، صفحہ 108، حدیث: 19 (اعلیٰ)

3۔ صحیح مسلم جلد 17، صفحہ 109، حدیث: 24 (اعلیٰ)

ابو اسحاق نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمانوں اور ساتویں زمینوں کو اپنی منگی میں لے کر فرمائے گا میں اللہ ہوں میں رحمن ہوں میں بادشاہ ہوں میں (تمام نبیوں سے) پاک ہوں میں امن دینے والا ہوں میں محافظ اور نگران ہوں میں غالب ہوں میں زبردست قوت والا ہوں میں کبریائی اور بڑائی کا اظہار کرنے والا ہوں میں ہی دنیا کو ابتدا پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی شے نہ تھی اور میں ہی اسے دوبارہ پیدا کر رہا ہوں (آج دنیا کے) بادشاہ کہاں ہیں بڑی قوت و طاقت والے کہاں ہیں (1)۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قبضِ علمی اور اخذِ تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ کیونکہ آج آسمان بھی پھیلے ہوئے ہیں اور زمین بھی کھچی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے ان الفاظ کا معنی اٹھانا ذرا کم کرنا اور تبدیل کرنا ہے۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ طعی سے مراد قحط کر دینا اور قنہ کر دینا ہے (2)۔

ابن ابی حاتم نے حسن رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے (پہلے مخلوق کی) تنہی کی پھر انہوں نے آسمانوں زمین اور فرشتوں کی تخلیق میں غور و فکر کیا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگانا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ** (3)۔

حضرت سعید بن جبیر سے یہ قول مروی ہے کہ یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے کلام کیا اور ایسی ایسی باتیں کہیں جنہیں وہ نہ جانتے تھے اور نہ انہوں نے انہیں دیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے **وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ إِلَّا بِهٖ** نازل فرمائی (4)۔

ابن منذر نے ربیع بن انس سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت **وَصِبْغَ كُمُوسٍ يَؤْتِيهَا السَّمْوَاتُ وَالْأَرْضُ** نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جب کسی کی وسعت کا عالم یہ ہے تو پھر عرش کی وسعت کی کیفیت کیا ہوگی تو تب اللہ تعالیٰ نے آیت **وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ** **وَإِنَّ الْأَرْضَ جَمِيعًا مَّا فِي كَفِّهِ** **يَوْمَ الْقِيَامَةِ** **وَاللَّهُ يَخْتَارُ** نازل فرمائی (5)۔

سُبْحٰنَكَ وَتَعَالٰی عِزَّتِكَ أَيُّهَا الَّذِي لَا يَلْفُظُ لَكَ شَرِكًا جس کی قدرت اتنی وسیع اور مضبوط ہے وہ ان مشرکوں کے شرک کرنے سے انتہائی دور اور بلند و بالا ہے۔ یادہ اس سے پاک ہے جو اس کی طرف شرک کی نسبت کی جاتی ہے (یعنی اس کی ہم گیر قدرت و طاقت والی ذات و صفات میں کوئی بھی شریک نہیں مشرکین کے یہ سارے نظریات باطل ہیں)۔

**وَنُفُوحٍ فِي الصُّوْبِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ
ثُمَّ نُفُوحٌ فِيهِ وَأُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ ۝ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا
وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجَاءَ عِبَادُ النَّبِيْنَ وَالشَّهَادَةُ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُونَ ۝** **وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝**

”اور پھونکا جائے گا صور پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا (کہ بیوش نہ ہوں) پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگے“

1- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 628 (اعلیٰ)

2- تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 278

3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (اعلیٰ)

4- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (اعلیٰ)

5- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (اعلیٰ)

جائیں گے اور جگہ اٹھے کی زمین اپنے رب کے نور سے ملے اور رکھ دیا جائیگا دفتر عمل سے اور حاضر کئے جائیں گے انبیاء اور (دوسرے) گواہ سے اور فیصلہ کر دیا جائیگا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر (رتی بھر) ظلم بھی نہیں کیا جائیگا۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائیگا ہر شخص کو جو اس نے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں۔“

لے وَذُوْعَبْرَیْنِ الصُّوْرِ سے مراد ہے کہ جب پہلی بار مرور پھونکا جائیگا۔ فَصَوِّعُ مَنَ فِي السُّلُوْبِ الْاٰیۃ توجو آسمانوں میں سے اور جو زمین میں ہے وہ شش کھا کر گر پڑے گا یعنی وہ مر جائیگا۔ اِلَّا مَنۡ شَاءَ اللّٰهُ بَجَوٰنِ کے جنہیں اللہ چاہے گا۔ تو ان سے کون مراد ہیں اس کی وضاحت ہم نے سورہ نمل کی آیت وَیَوْمَ نُنْفِثُ فِی الصُّوْرِ مَنۡ فَعَزَّ وَنَمِنَ فِی السُّلُوْبِ وَنَمِنَ فِی الْاَرْضِ شَاۡءَ اللّٰهُ مٰکِ تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

حسن نے کہا ہے کہ اِلَّا مَنۡ شَاءَ اللّٰهُ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی ذات ہے (1)۔

پھر دوبارہ جب اس میں سور پھونکا جائیگا تو وہ اچانک اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہو کر حیرت سے دیکھنے لگ جائیں گے۔ مبہوت آدمی کی طرح تمام اطراف میں اپنی نظریں گھمائیں گے یا معنی یہ ہے کہ وہ انتظار کرنے لگیں گے کہ اب ان کے ساتھ کیا کیا جائیگا۔ دونوں گھول کے درمیان چالیس دن کا فاصلہ ہوگا۔ آخری محل نصب اور محل رفع دونوں میں ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس کے متعلق احادیث سورۃ التازعات میں ذکر کر دی گئی ہیں۔

لے وَ اَشْرَکَیۡتِ الْاِثْرَیۡنِ کا معنی ہے کہ میدان قیامت کی سرزمین اپنے خالق کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ ترکیب کام میں اس کا عطف نفع فیہ اخروی پر ہے۔

علامہ بنواری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمانے کے لئے جلوہ افروز ہوگا تو لوگوں کو اپنے رب کے نور کا مشاہدہ کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا جیسا کہ دن کے وقت کھلے آسمان میں چمکنے والے سورج میں انہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ حسن اور سدی نے کہا ہے کہ بنو دہبہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیا جانے والا عدل و انصاف ہے (2)۔ اسے نور اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عدل و انصاف بھی علاقوں کو مزین کر دیتا ہے اور حقوق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ (جیسا کہ نور ہر شے کو ظاہر اور مستشف کر دیتا ہے) اسی طرح ظلم کو ظلمت (تاریکی) کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ظلم یوم قیامت کی ظلمتیں اور تار یکیاں ہیں۔ متفق علیہ۔

اسے اور تمام لوگوں کا دفتر عمل ان کے سامنے رکھ دیا جائیگا۔ (چونکہ اسم جنس کا اطلاق جمع پر ہو سکتا ہے) اس لئے یہاں جمع کے لئے الکتاب اسم جنس پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام کے تمام اعمال اسے عرش کے نیچے ہیں۔ پس جب موقف ہوگا (یعنی جب لوگوں کو حساب و کتاب کیلئے ایک جگہ جمع کیا جائیگا) تو رب کریم ایک ہوا چلائے گا اور وہ انہیں دائیں بائیں لوگوں کے ہاتھوں تک اڑا کر لے جائے گی۔ سب سے پہلے اس میں یہ آیت لکھی ہوگی اِنۡقِرَ اٰکُفۡتُکُمْ کُلِّیۡ وَ یُنۡفِثُ عَلَیۡکُمُ الۡیَوْمَ عَلَیۡکُمۡ حَسِیۡبًا ۝ (اپنا نامہ اعمال پڑھ آج کے دن تو اپنے مجاہدے کے لئے خود ہی کافی ہے) ابو نعیم نے اسے

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن بندۂ مومن کا نامہ اعمال کا عنوان ہوگا "حسن ثناء الناس"

یعنی اور انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہ حاضر کئے جائیں گے۔ علامہ سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ حساب انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کی موجودگی میں ہوگا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن مصعب کا یہ قول ابن مبارک نے نقل کیا ہے کہ لیس من الیوم اِلاّ ویعرض علی النبی ﷺ اَمْنُهُ عَدُوٌّ وَ عَشِيَّةٌ فَيَعْرِفُهُمْ بِسِمَائِهِمْ وَ اَعْمَالِهِمْ فَذَا لِكُمْ بِشَهَادَتِهِمْ۔ (ہر روز صبح و شام حضور نبی کریم ﷺ کی امت آپ پر پیش کی جاتی ہے اور آپ ان کی پیشانیوں سے انہیں اور ان کے اعمال کو پہچان لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ قیامت کے دن ان کے متعلق شہادت دیں گے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شہداء سے مراد وہ ہیں جو رسول علیہم السلام کیلئے شہادت دیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت تک پیغام رسالت، یعنی احکام خداوندی پہنچادئیے تھے۔ اور یہ شہادت حضور نبی کریم ﷺ کی امت دے گی۔

حضرت عطاء نے کہا ہے کہ شہداء سے مراد اعمالنا سے لکھنے والے فرشتے (کرانہ کاتبین) ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے وَ جَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِرٌ وَ شَهِيدٌ (1)۔

یہ اور بندوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا اور ان پر ترقی بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا، یعنی نہ تو ان کے گناہوں میں اضافہ کیا جائیگا اور نہ ان کی نیکیوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔

یعنی اور ہر شخص کو اس کے عمل کی پوری پوری جزا دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال سے خوب واقف اور آگاہ ہے وہ کسی کاتب اور گواہ کا محتاج نہیں (2)۔ بلکہ یہ اعمالنا سے اور گواہ فقط عرف اور عدالت کے مطابق کافروں کے خلاف ان کے جرائم ثابت کرنے کے لئے ہوں گے (تاکہ انہیں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے)

پھر آئندہ آیت میں اعمال کا پورا پورا بدلہ دینے کی تفصیل بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

وَسَيُقَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا اِلَىٰ جَهَنَّمَ ذُرًّا حَثِيًّا اِذَا جَاءَهُمْ وَقْتُ حَتِّ اَبْوَابِهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُكُمْ لِقَاءِ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوا بَلٰى وَ لٰكِنْ حَقَّتْ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ عَلٰى الْكَافِرِيْنَ ﴿٥٠﴾ قِيْلَ اِذْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَمَنْ مَّتَّوٰى السُّكُوْتِ رَبِّيْنَ ﴿٥١﴾

"اور ہانکے جائیں گے کفار جہنم کی طرف گروہ درگروہ جب اس کے پاس آئیں گے تو کھول دیئے جائیں گے اس کے دروازے پر اور پوچھیں گے ان سے دوزخ کے پہرے دار کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے جو پڑھ کر سنا تے تمہیں تمہارے رب کی آیتیں اور ڈراتے تمہیں اس دن کی ملاقات سے۔ کہیں گے بیشک آئے تھے لیکن شہادت ہو چکا تھا (لوح محفوظ میں) عذاب کا حکم کفار پر آئیں انہیں کہا جائیگا داخل ہو جاؤ دوزخ کے دروازوں سے اس حال میں کہ

تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ پس کتابراٹھکانا ہے مفروروں کا ہے۔“

۱۔ زمر کا معنی ہے متفرق گروہ جو کہ ضلالت و گمراہی میں اپنے درجات کے مختلف ہونے کی بنا پر وہ آہل بس میں ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے۔ ابوعبیدہ اور آنکس نے کہا ہے کہ زمر سے مراد ایک فرقہ کے متفرق گروہ ہیں۔ زمر جمع ہے اور اس کی واحد زمرہ ہے اور یہ الزمر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے آواز۔ چونکہ کوئی جماعت اور گروہ آواز سے خالی نہیں ہوتی (اسی مناسبت سے جماعت اور گروہ کوئی زمر کہہ دیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ عربوں کے قول شاة زمرہ سے بنایا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی بکری ہوتی ہے جس کے بدن پر بال بہت کم ہوں۔ اسی طرح درجل زمرہ ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جس میں مروت انتہائی کم ہو۔ اسی وجہ سے قلیل جماعت کو بھی زمرہ کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ جنم میں اس کے پاس آئیں گے، ان کے داخل ہونے کے لئے اس کے سارے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ فصحت کو کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ قلیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے اسے مشدّد پڑھا ہے۔ یعنی فصحت۔ یعنی جنم کے سات دروازے کے عمل طور پر کھول دیئے جائیں گے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ بند تھے۔

۲۔ اور پھر انہیں جھڑکتے ہوئے اور زجر و توبیح کرتے ہوئے دوزخ کے پہرے داران سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہاری جنس میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو جنہیں تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنا تے اور تمہیں اس دن یعنی تمہارے جنم میں داخل ہونے کے وقت کی ملاقات سے ڈراتے؟

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ آدمی شریعت آنے سے قبل کسی بھی شے کا مکلف اور پابند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنم کے پہرے دار رسول علیہم السلام اور ڈرانے والی کتب کے آنے کو ہی اپنی ذر و توبیح کی علت و سبب قرار دیں گے (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ رسول علیہم السلام کے نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والے کو عذاب نہیں دیا جائیگا۔ بلکہ آیت تو اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دوزخ کے پہرے دار انہیں خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے کہیں گے کہ جب تمام دلائل مکمل ہو چکے ہیں۔ یعنی پیغمبر تشریف لائے، کتب الہیہ کا نزول ہو چکا۔ انبیاء علیہم السلام نے جنہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا تو پھر ایمان نہ لائے اور شرک کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ فقط عقل اگرچہ شریعت کی پہچان اور معرفت کے لئے کافی نہیں لیکن وہ قطعی دلائل جو کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم ہو چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے تو حید باری تعالیٰ کے لئے فقط عقل کا حکم اور فیصلہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول علیہم السلام کو بھیج دیا کہ تمہیں نازل فرمادیں اور مکمل راستہ واضح فرمادیا تو اب کفر و شرک پر مصر رہنے کا کوئی عذر بھی باقی نہیں رہا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ کہیں گے بیشک آئے تھے لیکن کفار پر عذاب کا حکم (لوح محفوظ میں) ثبت ہو چکا تھا۔ یعنی ازل سے ہی یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ بد بخت ہیں، اشتیاء ہیں لہذا ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب ہوگا۔ الکفرین کا لفظ ضمیر کی جگہ پر صراحتہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ یہ حکم کفار کے ساتھ خاص ہے۔

۴۔ انہیں کہا جائیگا تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اس حال میں کہ تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ اس میں کہنے والے کا نام ہمہم رکھا

گیا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ انہیں دیا جائیگا وہ انہیں انتہائی خوفزدہ اور ہشت زدہ کرنے والی بات ہوگی۔

فَيَسْئَلُ مَنِّي الْمَتَكُونِينَ فِي سُبُلِ مَعْرُورِينَ كَمَا كُنْهَانَا كَتَابًا رَابِعًا۔ الْمَتَكُونِينَ پرا الف لام ضمی ہے اور مخصوص بالذم مخذوف ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور وہ جہنم ہے۔ فہنس کے اوپر فاقسیبہ ہے۔ کیونکہ کلام سابق اس مذمت کا سبب ہے اور اس میں اس پر تشبیہ کیا جا رہا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم اس لئے ہے کہ انہوں نے حق کو قبول کرنے سے غرور اور تکبر کیا ہے اور یہ بات مذکورہ بالا نظریہ کے متنافی نہیں کہ ان کا جہنم میں داخل اس لئے ہے کہ ان کے بارے میں ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دینے جانے کا فیصلہ مثبت ہو چکا ہے۔ کیونکہ (فی الحقیقت) ان کے تکبر اور دیگر برائیوں اور قباحتوں کا سبب وہی ازلی فیصلہ ہی ہے (اور یہ چیزیں اس کا سبب ہیں) اس لئے دونوں میں کوئی تضاد نہیں) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جنت جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ اہل جنت کے اعمال کرتے کرتے اسے موت آجاتی ہے اور اس کے سبب وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایسے اعمال کرتے کرتے اسے موت آجاتی ہے اور اسی کے سبب وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے مالک ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے (۱)۔

وَسَيُقَالُ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِذَا جَاءُوْهُمَا وَقِيْحَتْ

اَبْوَابُهُمَا وَقَالَ لَهُمْ خذْنَهَا سَلَمًا عَلَيْكُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِينَ ﴿٥١﴾

”اور لے جایا جائیگا انہیں جو ڈرتے رہے تھے (عمر بھر) اپنے رب سے جنت کی طرف گروہ درگروہ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو کہیں گے انہیں جنت کے محافظ تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اللہ تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔“

۱۔ اور جو عمر بھر اپنے رب سے ڈرتے رہے تھے انہیں بڑی تیزی کے ساتھ جنت یعنی مقام عزت کی طرف لے جایا جائیگا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی سواریوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جنت کی طرف ہانکا جائے گا۔ کیونکہ انہیں سواریوں پر ہی جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ عزت و شرف اور عظمت میں مختلف ہونے کی بناء پر متعقد و گروہوں میں منقسم ہوں گے حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے وہاں آنے سے قبل ان کی عزت و تعظیم کی خاطر جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تاکہ انہیں وہاں انتظار نہ کرنا پڑے تو اس وقت انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم پر سلام ہو یعنی تمہیں کبھی کوئی ناپسندیدہ امر لاحق نہ ہو و فحنت کو کوفیوں نے مختلف پڑھا ہے اور باقیوں نے کشمیر کی بناء پر متعقد پڑھا ہے۔ طہیم کا معنی ہے تم خوب رہے تم ہی گناہوں کی مثل کچیل سے پاک رہے۔ یہ طہارت یا تو اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے (قابل مواخذہ) گناہوں کا ارتکاب کیا ہی نہیں یا یہ مفہوم ہے کہ مغفرت کے سبب وہ اپنے گناہوں سے پاک ہو چکے ہیں یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ گناہوں کی سزا برداشت کر چکے کے سبب ان سے پاک ہو چکے ہیں۔

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ جب اہل جنت جہنم کی مسافت طے کر چکیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان انہیں ایک بل پر روک لیا جائے گا اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے بدلہ اور انتقام لے لیں گے حتیٰ کہ جب وہ مکمل طور پر پاک صاف ہو جائیں گے تو جنت میں

داخل ہوں گے اس وقت رضوان جنت اور اس کے ساتھی اہل جنت کو کہیں گے سلمٌ عینکم جنتکم فاذا خلوا فاخلوا بئینکم (۱)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ متقی لوگوں کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کے پاس ایک درخت پائیں گے اس کے نیچے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے۔ جس بندۂ مومن ان میں سے ایک میں غسل کرے گا تو اس کا ظاہر پاک صاف ہو جائے گا۔ اور دوسرے چشمے سے پینے گا تو اس کے سبب اس کا باطن پاک صاف ہو جائے گا اور فرشتے جنت کے دروازوں (۱) پر ان سے ملاقات کریں گے اور یہ کہہ کر ان کا استقبال کریں گے سلمٌ عینکم جنتکم فاذا خلوا فاخلوا بئینکم۔

زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم دنیا میں شریک اور گناہوں کی نجاست اور گندگی سے پاک تھے (۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے تمہارے لئے یہ مقام (جنت) پاکیزہ اور صاف ہے۔ فاذا خلوا ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔ اس کی تاویلات اور توجیحات بھی سابقہ آیت کی توجیحات کی مثل ہی ہیں۔ لہذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کے محل اور مقام پاک پاک ہونا ان کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ یعنی چونکہ جنت ایک پاکیزہ اور محترم مقام ہے۔ اس لئے وہ اہل جنت کا محل ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خلدین کا معنی ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بن چکا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَعَدَاؤُنَا وَمَنْ تَتَّبِعُوا مِنَ الْجَنَّةِ
حَيْثُ نَسَأْتُمْ قُبُورَكُمْ أَجْرُ الْعَوَالِمِينَ ©

”اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ (کریم) کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا۔ اب ہم تمہیں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔ پس کتنا عمدہ اجر ہے نیک کام کرنے والوں کا۔“

۱۔ وَقَالُوا کا عطف محذوف کلام پر ہے اور وہی اذاکا جواب ہے اور اسے اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے کہ انہیں جنت میں داخل ہونے کے ساتھ ایسی عزت و کرامت حاصل ہوگی جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم اس کے اندر تشریف لے چلو پس جو نبی وہ اس میں داخل ہوں گے تو اس میں ایسی ایسی نعمتیں پائیں گے جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا تک نہیں۔ ان کے بارے کسی کان نے سنا تک نہیں بلکہ کسی کے دل میں ان کا تصور تک نہیں آیا اور اس الفاظ سے ان کا بیان ممکن ہے تو وہ ان انعامات خداوندی پر شکر ادا کرتے ہوئے کہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (المکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (المکر)

(۱) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے اپنے مال میں سے جوڑا (سونا چاندی) اللہ کے راستے پر خرچ کیا تو اسے جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور جنت کے کسی دروازے میں جس جوڑا ز اور کرنے والا ہوگا اسے باب الصلوٰۃ سے پکارا جائے گا روز سے دارکو باب الریان سے آرازدی جائے گی۔ صدقہ و خیرات کرنے والے کو باب الصدقہ سے بلایا جائے گا اور اہل جہاد کو باب الجہاد سے پکارا جائے گا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کوئی ایسا بھی ہے جسے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نعم وان جفوا ان تکون جنہم۔ ہاں اور میں امید رکھتا ہوں کہ تو ان لوگوں میں سے ہے۔

گے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَّقْنَا وَعَدَّ مَا کَرَّمَاہِ اِسْمَ اللّٰہِ کَرِیْمَہِ کے لئے ہیں جس نے جنت میں داخل کرنے اور وہ بھی نعمتیں جو آنکھوں کے لئے باعثِ راحت و شہدک ہیں عطا فرمانے کا وعدہ ہمارے ساتھ پورا فرمایا اور ہمیں سرزمینِ جنت کا وارث یعنی مالک بنا دیا۔ ہمیں سے ہر ایک جنت کی وسیع زمین میں جہاں چاہے ٹھہر سکتا ہے اور جب کوئی انبیاء علیہم السلام اور دیگر بلند رتبہ لوگوں کی زیارت کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ کھلتی میسر ہے۔

طبرانی، ابویوسف اور ضیاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک آپ میرے نزدیک میری جان اور اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہیں۔ میں جب گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کا ذکر کرتا ہوں تو مجھ پر صبر نہیں کر سکتا حتیٰ کہ میں آپ کے پاس حاضر ہو کر آپ کے دیدار سے آنکھوں کو خنڈا کرتا ہوں (اور راحت و سکون کا سامان کر لیتا ہوں) لیکن جب میں اپنی موت اور آپ کے وصال کا تصور کرتا ہوں تو بالیقین یہ جانتا ہوں کہ آپ تو جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تشریف فرما ہوں گے اور اپنے بارے میں زیادہ خوف محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو آپ کی زیارت اور دیدار سے تو شاد کام نہیں ہو سوں گا تو آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا (بلکہ سکوت اختیار فرمایا) یہاں تک کہ جبرئیل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہو گئے وَمَنْ يُطِيعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَقَدْ وَلِیْنَا مَا لَمْ يَدْرُ اَنَّ اللّٰہَ عَلَیْہِمْ قَرِیْبٌ الْبَیِّنَاتِ وَالَّذِیْنَ یُفِیْقُوْنَ وَاللّٰہَ اَدْرَاہُ وَالضّٰلِیْمِیْنَ وَحَسْبُ اَوْلِیٰکَ تَرَفِیْقًا ﴿۱﴾۔ (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ انبیاء و صدیقین شہداء اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوگا۔ اور یہ سب بہت اچھے ساتھی ہوں گے۔

فہم اجر العالمین میں نیک کام کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہوگا یعنی جنت۔

وَتَرَى السَّمٰوٰتَ حَاقِقٰتٍ مِّنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یَسْبِغُوْنَ بِحَمْلِہُمْ رَآیَہُمْ وَقَضٰی
بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقَبِلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲﴾

”اور (انے صحیب!) آپ دیکھیں گے فرشتوں کو حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے ارد گرد وسیع پڑھ رہے ہوں گے اپنے رب (علیل) کی حمد کے ساتھ اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ۔ اور کہا جائیگا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے۔“

۱۔ حَاقِقَاتٍ کا معنی ہے حلقہ بنائے ہوئے کھیرے ہوئے۔ یعنی اسے صحیب! آپ دیکھیں گے کہ فرشتے عرش کے ارد گرد حلقہ بنائے کھڑے ہوں گے اور وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ وسیع بیان کر رہے ہوں گے۔ علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں کی یہ وسیع بطور عبادت نہیں ہوگی بلکہ فقط وسیع اور تلافی کے لئے ہوگی (یعنی فرشتے اس وسیع سے لطف اندوز ہوں گے اور راحت و سکون حاصل کریں گے۔ کیونکہ یہ اس وقت عبادت کی پابندی تو ساقط ہو چکی ہوگی۔

ترکیب کلام میں یَسْبِغُوْنَ کا جملہ حاققین کے فاعل سے حال ہے۔

۲۔ اور مخلوق کے درمیان حق یعنی عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا ہوگا۔ اس طرح کراہل ایمان کو جنت میں داخل کیا جائیگا اور کفار کو جہنم کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جائیگا۔

بعض نے کہا ہے کہ بینہم کی ہم ضمیر سے مراد ملائکہ ہیں۔ معنی یہ ہے کہ تمام فرشتوں کو ان کے درجہ اور تہ کے مطابق اپنے اپنے مقام پر کھڑا کیا جائیگا (کسی کو قطعاً اپنے حق سے محروم نہیں کیا جائیگا)

تو جب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ اپنا وعدہ پورا فرمادے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو بطور شکر وہ یہ کہیں گے الحمد للہ رب العالمین۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو جنت میں داخل فرمادے گا اور اپنے دشمنوں کو جہنم کے سپرد کر دے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ملائکہ اس وقت کہیں گے الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورۃ نبی اسرائیل اور سورۃ زمر کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسے ترمذی نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے (۱)۔

حمت بالخیر

سورہ زمر کی تفسیر یکم رمضان المبارک 1207ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورہ زمر کا ترجمہ 30 رمضان 1421ھ بمطابق 27 دسمبر 2000ء بروز بدھ بوقت 1:30 بجے دن اپنے اختتام کو پہنچا۔

وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

www.muhammadiyah.com

اور عطا فرمائی ہے کہا ہے کہ حاء اسمائے حسنیٰ میں سے حکیم حمیدہ جی اور حیان کا پہلا حرف ہے اور میں رب العالمین کے اسماء میں سے ملک مجید اور منان کا پہلا حرف ہے۔

کسانی نے کہا ہے کہ حم سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ مستقبل میں وقوع پذیر ہوگا اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ گویا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حتم کا معنی ہے حتم (1)۔

ابن کثیر، قالون، جنس اور ہشام نے ہم والی تمام صورتوں میں حاء کو متوجہ پڑھا ہے۔ ورش اور ابو عمرو نے بین بین اور بتوں نے امال کے ساتھ پڑھا ہے۔

ج ترکیب کلام میں تثنیہ الکتبہ خیر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ہذا ہے یعنی ہذا تنزیل الکتب یا پھر تثنیہ بین الکتبہ مبتدا ہے اور اس کی خبر میں اللہ العزیز العلیٰ ہے عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے وہ اپنی مخلوق میں سے سب کچھ جاننے والا ہے شاید یہاں ان دونوں معنوں کو خصوصیت کے ساتھ ان لیے ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز اور برکت ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ مبین کے گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ النوب تاب یعوب توبۃ کا مصدر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ التوب توبہ کی جمع ہے جیسے دو مقلیٰ جمع دوم اور حو مقلیٰ جمع حوم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشے والا ہے جس نے کہا لا الہ الا اللہ اور اس کی توبہ قبول فرمانے والا ہے جس نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ عافی الذنب اور قابل النوب دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور ان میں اضافت معنوی ہے (کیونکہ صیغہ صفت کی اضافت اپنے معمول کی طرف ہوتی ہے)۔ کیونکہ ان دونوں معنوں کے اظہار کیلئے کوئی مخصوص زمانہ اور نہیں بلکہ یہ تو صفات جاری ہیں (اس کا اظہار ہر وقت ہوتا ہے)۔

ان دونوں صفتوں کے درمیان واو عاقلہ ذکر کی گئی ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں گناہوں کو مٹانے اور توبہ کو قبول کرنے کی دونوں صفتیں جمع ہیں یا دو کو دونوں معنوں کے درمیان مفاخرت ظاہر کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض ان دونوں معنوں کو باہم متحد اور ایک ہی گمان کرتے ہیں یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے واو عاقلہ لگائی گئی ہے کہ دونوں فعلوں کے ظہور کے محل میں مفاخرت پائی جاتی ہے کیونکہ غفر کا معنی ہوتا ہے و حانپ دینا۔ اس صورت میں گناہ باقی رہتا ہے اور یہاں سے آدی کیلئے ہوتا ہے جو توبہ نہ کرے اور توبہ کرنے والا تو اس کی مثل ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں (1)۔ یہ حدیث موقوف ہے اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 332 (الکفر)

(1) یزید بن اسم سے روایت ہے کہ اہل شام میں سے ایک طاقتور اور بہادر آدمی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی جرات و بہادری کے سبب اسے خاص مقام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ نائب ہو گیا تو آپ نے اس کے بارے لوگوں سے دریافت کیا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ اس عرصہ میں مسلسل شراب پیتا رہا ہے تو آپ نے اپنے کاتب کو بلا یا اور فرمایا لکھو یہ خطہ زمین خطاب کی جانب سے فلاں کے نام ہے تم پر سلام ہو۔ میں تیرے سامنے اس اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، گناہ کو بخشنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا، سخت مزاد دینے والا، بغض و کرم فرمانے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں سب نے ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ فاقبلی انکمن الذنب اللہ العزیز لا الہ الا هو عافی الذنب وقابل النوب شدید العقاب ذی العظون لا الہ الا هو ذیہ الغضیبین) پھر آپ نے دعا فرمائی اور اپنے پاس موجود افراد کو بھی دعا کیلئے کہا کہ اللہ تعالیٰ اسے دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر اس کی توبہ قبول فرمائے۔ جب وہ خط آدی کے پاس پہنچا اس نے اسے پڑھنا شروع کیا اور کہنے لگا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسعود رضی اللہ عنہ سے، حکیم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے، امین بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابن عباس کو دیکھتی تھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے پس یہ تفسیر اس پر دلیل ہے کہ جو تو بہ نہ کرے اس کی مغفرت جائز ہے۔ اور جس نے لا الہ الا اللہ نہ کہا اسے سخت سزا دینے والا ہے۔

۱۔ ذی القُذُوبِ کے بارے میں علامہ نے کہا ہے کہ وہ بڑی وسعت والا اور نفی ہے قنودہ نے کہا ہے وہ نعمتوں والا ہے بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے قدرت رکھنے والا۔ حسن نے کہا ہے فضل فرمانے والا (1)۔ بعض نے کہا ہے غافر الذنب اور اس کے بعد آنے والے تمام الفاظ بدل ہیں صفات نہیں ہیں۔ ان تینوں میں اضافت لفظیہ ہے جو تعریف کا فائدہ نہیں دیتی اس لئے یہ صفات نہیں ہو سکتیں۔ اسی بناء پر ذی القُذُوبِ بھی بدل ہے (کیونکہ اسے صفت بنانے سے بدل کا صفت سے مقدم آنا لازم آتا ہے) اور یہ ممتنع ہے۔

صاحب الکشاف اور بیضاوی نے کہا ہے کہ پہلی دوکی طرح یہ تمام بھی صفات ہیں اور ان میں اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس سے کوئی خصوص زمانہ مراد نہیں (لہذا یہ اضافت تعریف کا فائدہ دے رہی ہے) او شدید العقاب بمعنی مشددہ میں بھی اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اشد یہ عقاب ہے۔ پھر عبارت کو باہم ملانے کیلئے بھی التماس سے بچنے کیلئے لام کو حذف کر دیا گیا لہذا یہ حقیقی معرّف بالام ہے اور اسے بدل بنانے میں نظم کلام میں خرابی لازم آتی ہے (2)۔ مزاج نے کہا ہے کہ شدید العقاب بدل ہے صفت نہیں۔ صاحب مدارک کے نزدیک بھی صحیح یہی ہے کیونکہ کمرہ ہے اس میں لام کو حذف کرنا جائز نہیں۔ اس بناء پر ذی القُذُوبِ بھی بدل ہوگا اور جو کچھ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ وہ معنی کے اعتبار سے اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ یہ تمام تواتر ہیں اور اپنے متبور کے معانی پر دلالت کر رہے ہیں۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی مدح و ترغیب اور مقصود اصلی پر براہیمتہ کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہیں اور مقصود پانسیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہذا اسی طور پر اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ لا الہ الا اللہ وہ دوسری صفت ہے جیسا کہ ذی القُذُوبِ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جملہ صفتیں مفادہ اور الایۃ الٰہیہ فی القصص کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطیع (اطاعت شعار) اور گنہگاروں کو ان کے اعمال کے مطابق ثواب و عذاب کے ساتھ بدل دے گا۔

1۔ تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 32 (المنکر)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شباب، جلد 8، صفحہ 235-36 (العلیہ)

(یقیناً حاشیہ گزشتہ صفحے سے) غافر الذنب تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ وہ مجھے معاف فرمادے گا، قابلِ ثواب اور اس نے میری توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ شدید العقاب اس نے مجھ سے اپنے عذاب اور سزا سے ڈرایا ہے۔ ذی الطول اور طول سے مراد بخر کثیر ہے۔ ایہ المصوبوں کو وہ اس آیت کو بار بار مسلسل پڑھتا رہے یا یہاں تک کہ وہ ننگ لیا پھر اس نے گناہوں سے توبہ کی اور خوب اچھی طرح کر لی۔ جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا تم اپنے کسی بھائی کو راہ حق سے بھٹلے ہوئے دیکھو تو اسی طرح کیا کرو اس کو سیدھا کر دو اس کے ساتھ نرم سلوک کرو اور اس کیلئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور تم اس کے خلاف شیطان کے معاون و مددگار نہ بن جاؤ۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ مدنیہ طیبہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا اور حضرت عمرؓ بھی اس سے محبت فرماتے تھے۔ وہ مصر چلا گیا اور اس کے نظریات فاسد ہو گئے اور کبھی گناہ کے ارتکاب سے وہ باز نہیں رہتا تھا۔ اس کے گھر کا کوئی فرد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے عرض کی اس کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھیے۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ اس نے جواب دیا اس کے نظریات فاسد ہو گئے ہیں، وہ انتہائی اوجاش ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی طرف نظر لکھا حکم تنزیلی الیکتب من اللہ العزیز العظیم الایمہ پس اس نوجوان نے وہ خط پڑھا اور مسلسل پڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ توبہ کر کے نکلی اور خیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ابو اسحاق سلیمی سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عمرؓ کی بارگاہ میں آیا اور عرض کی یا امیر المؤمنین! میں نے نقل کیا ہے کہ امیر سے ملنے توبہ ہے؟ تو آپ نے یہی آیت پڑھ کر اسے تسلیم تنزیلی الیکتب من اللہ العزیز العظیم عافوا الذنب و قابل الثواب اور ساتھ فرمایا اس پر عمل کرو اور میں تو امید نہ ہو۔

مَا يَجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ تَقْدِيمَهُمْ فِي الْبِلَادِ ①

”نہیں تنازعہ کیا کرتے، اللہ کی آیتوں میں جو کفر ہے، پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کدو فرستے) آنا جانا مختلف شہروں میں۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا کفران کا رد کرنے یا آیات میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے یا آیت متشابہات کی ایسی تاویل کرنے میں جو کہ آیات حکمت یا حدیث متواتر کے خلاف ہو تنازعہ نہیں کرتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔ عمرو بن شیبہ اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو قرآن کریم کے بارے میں بحث کرتے سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی بعض آیات کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ حالانکہ کتاب اللہ کا نزول اس طرح ہوا کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں لہذا تم بعض آیات کے سبب بعض کی تکذیب نہ کرو پس جن کے بارے میں تم جانتے ہو ان کے بارے میں گفتگو کرو اور جن کے بارے میں نہیں جانتے اسے جانتے والے عالم کے سپرد کرو۔ (رواہ البغوی (1) اور مسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عبد اللہ بن عمرو (یعنی عمرو بن شیبہ کے دادا) نے کہا کہ میں ایک دن دو پہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے میں اختلاف کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے، آپ کے چہرہ مقدس پر غضب کے آثار ظاہر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کے سبب ہی ہلاک ہوئے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کریم میں جدال (جھگڑا کرنا) کفر ہے۔ اسے علامہ بغوی نے بیان کیا ہے۔ (2)۔

علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں طرابلسی نے حضرت مہد اللہ بن عمرو سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ ابو داؤد اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تحقیقاً یہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم اس کی جانب نازل کیا گیا ہے تو پھر اس میں طعن و تشنیع کرنے اور جن کو مغلوب کرنے کیلئے بحث مباحثہ اور جھگڑا کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَجَدُوا فِيهَا بِلَاطِلٍ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ

اور اگر جھگڑا اور مباحثہ اس بناء پر ہو کہ مسئلہ کی گہر کھل جائے، حقائق سامنے آ جائیں، اہل باطل کا استدلال روہو جائے اور ان کے طعن و تشنیع کا قلع قمع ہو جائے تو ایسا اختلاف اور مباحثہ بہت بڑی عبادت ہے (1)۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں لفظ جدال کفرہ ذکر فرمایا ہے۔ ”إِنَّ جِدَالَ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ“۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت جدال اور اختلاف سے ہی ہیں (3) (تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (القر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 38-237 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (القر)

(1) صاحب نہا نے لکھا ہے کہ یہ جدال آیات میں جس کی خدمت کی گئی ہے ان آیات سے تعلق رکھتا ہے جن میں تقدیر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہل کلام، اہل بدعت اور رائے پرستوں کے درمیان ان آیات میں جدال کیا جاتا ہے آیات الاکرام اور ابواب حلال و حرام میں اختلاف کی کمانت نہیں ہے۔ یہ اختلاف تو صحابہ میں تھا اور بعد میں آنے والے طلباء کے درمیان بھی ہوتا رہا ہے۔ اس سے قصود صرف حقیقت مسئلہ کا انکشاف اور حق رسائی کی ہوتا ہے، اپنے حریف پر غالب آنے کا جذبہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ جدال فقط اسی صورت میں ممنوع ہے جب اس سے مقصود حق کی تکذیب اور اسے نچاؤ دکھانا ہو۔

۱۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان لوگوں کا بڑے کروفر سے مختلف شہروں میں آنا جانا دھوکہ میں نہ ڈالے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں جو بہت دے رکھی ہے اور یہ اپنی دنیا کمانے میں خوب مصروف ہیں اور نفع بخش تجارت کی غرض سے مختلف شہروں، یعنی بلاد شام اور یمن وغیرہ میں پیکر کاٹ رہے ہیں (آپ اس سے نہ دھوکہ کھائیں اور نہ پریشان ہوں)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْرَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَتَّ كُلُّ أُمَّةٍ رِيسُهَا
لِيَأْخُذُوهُ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْخِلُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتَهُمْ فَكَيْفَ كَانَ
عِقَابِ ۝ وَكَذَلِكَ حَقَّتْ لِمَنْ كَفَرَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَصْحَابُ النَّارِ ۝

”جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور انکی (دوسرے) گروہوں نے ان کے بعد۔ اور قصہ کیا ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق کہ اسے گرفتار کر لیں اور جھگڑتے رہے (اس کے ساتھ) ناحق، تاکہ جھٹلا دیں اس کے ذریعے حق کو پس میں نے پکڑ لیا انہیں۔ پس کتنا شدید تھا میرا عذاب! اور اس طرح واجب ہو گیا اللہ کا فیصلہ کفار پر کہ وہ دوزخی ہیں۔“

۱۔ ابن ابی حاتم نے سدی کے واسطے ابو الیاس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حادث بن قیس سہمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے (1) یعنی عذیب انہیں اپنے کفر کے سبب اسی طرح پکڑ لیا جائیگا۔ جیسے ان سے پہلے (کفار کو) پکڑ لیا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ الْاِی۔ یعنی ان سے پہلے قوم نوح نے جھٹلایا تھا اور ان کے بعد ان دوسری قوموں نے جنہوں نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف گروہ بندی کی اور ان کے مقابلے میں اتر آئے۔ جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ، یعنی ان تمام قوموں نے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی تکذیب کی۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ فلا یغردک کی علت بیان کر رہا ہے۔

ان میں سے ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق یہ قصد کیا کہ اسے گرفتار کر لیں۔ حضرت ابن عباس نے لیاخذوه کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ اسے قتل کر دیں اور اسے ہلاک کر دیں (2)۔ البتہ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اسے گرفتار کر لیں۔ کیونکہ عرب اسیر (قیدی) کو احیہ کہتے ہیں۔

اور اسکے ساتھ ناحق جھگڑتے رہے مثلاً مَا كَانُوا يَلْمِزُوا آلَ مَرْيَمَ إِذِ اتَّخَذَتْ وَحْمًا (تم تو ہماری طرح ہی بشر ہو، کیونکہ انہوں نے عَلِيْسَا الْمَرْيَمَ) ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کئے گئے) اَوْ قَوْمِ لَيْسَانَ (یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں) اسی طرح کے اور اقوال بھی تھے تاکہ وہ اس جھگڑے کے ساتھ حق کو زائل کر دیں اور باطل قرار دیں۔ سو میں نے انہیں پکڑ لیا، یعنی ان کے اس (فاسد) قصد کی سزا دیے کیلئے میں نے انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا۔ ترکیب کلام میں فاخذتہم کا عطف جادلوا پر ہے۔ پس ان پر میرا عذاب کتنا شدید تھا۔ کیونکہ تم ان کے ویران گھروں کے پاس سے گزرتے ہو اور اس عذاب کے اثرات اور نشانات دیکھتے ہو۔ یہ استفہام تقریری ہے اور تعجب کیلئے ہے۔

۱۔ جس طرح دنیا میں انہیں ہلاک کرنا ثابت اور متحقق ہو چکا ہے اسی طرح آخرت میں بھی کفار کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ثابت اور متحقق ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس طرح سابق امتوں میں سے جھٹلانے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کی امت کے کفار کیلئے بھی عذاب کا فیصلہ واجب ہو گیا کہ وہ دوزخی ہیں۔ ترکیب کلام میں اصحاب النار کلمت ربک سے

بدل گل ہے۔ بشرطیکہ قرأت کلمہ ربک ہو۔ اور اگر قرأت کلمات ہو تو پھر بدل بعض ہے اور اگر لفظ یا معنی کا ارادہ کر لیا جائے تو پھر بدل اشتغال ہے۔ انہی نے کہا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لِأَنَّهُمْ وَبِأَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ۔

أَلَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ
لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا أَسْبَابَ سَبِيلِكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۝

”جو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور جو عرش کے ارد گرد (حلقہ زن) ہیں لہ وہ تسبیح کرتے ہیں حمد کے ساتھ اپنے رب کی اور ایمان رکھتے ہیں اس پر۔ اور استغفار کیا کرتے ہیں ایمان والوں کیلئے۔ (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو گھیرے ہوئے ہے ہر شے کو (اپنی) رحمت و علم سے۔ پس بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راہ کی اور بچا لے انہیں عذاب جہنم سے۔“

لہ جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے ارد گرد (حلقہ زن) ہیں، یعنی اس کا طواف کرنے والے ہیں۔ وہی کہو بیوان ہیں اور تمام ملائکہ کے سرور ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حاملین عرش میں سے ہر ایک کے نچلے سے لے کر قدم کے نچلے حصے تک پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ ان کے قدم زمیوں کی تہ میں ہیں اور تمام زمیں اور آسمان ان کی سرور تک آتے ہیں۔ (گویا ان کی کمروں سے اوپر کا حصہ تمام آسمانوں سے اوپر نکلا ہوا ہے) اور وہ ہمہ وقت یہ کہہ رہے ہیں سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَ الْجَبْرُوتِ سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوتِ سُبْحَانَ الْحَيِّ الْقَيُّومِ لَا يَمُوتُ سُبُوْحٌ قُدُّوسٌ زَبَّ الْمُنْتَهَى وَ الرَّوْحِ۔

میرہ بن عبد رب نے کہا ہے کہ انکی ناکھیں پاؤں سب سے نیچے والی زمین میں ہیں اور ان کے سر عرش کے نیچے ہیں۔ وہ انتہائی خشوع و خضوع کی حالت میں ہیں، وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھاتے وہ ساتویں آسمان کے باسیوں کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہیں ساتویں آسمان کے مکین اپنے سے نیچے والے آسمان میں رہنے والوں کی نسبت زیادہ ڈر رہے ہیں اور وہ اپنے ساتھ ملنے والے آسمان میں سکونت پذیر ہونے والوں کی نسبت زیادہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے کہ ملائکہ اور عرش کے درمیان نور کے ستر حجاب ہیں۔

محمد بن منکدر نے حضرت جابر سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ اجازت دی گئی ہے کہ میں حاملین عرش میں سے کسی ایک فرشتے کے بارے میں بیان کروں کہ اس کے کان کی کوئی لے لے کر کندھے تک درمیان میں سات سو سال کی مسافت ہے (1)۔ اسے ابو داؤد اور الضیاء نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

جعفر بن محمد نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عرش کے پایوں میں سے ہر دو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ایک تیز اثران والا پرندہ تیس ہزار سال میں اڑ کر ملے کرتا ہے اور عرش کو ہر روز نور کے ستر ہزار گھوں کا ایسا لباس پہنایا جاتا ہے جس کی طرف مخلوق خدا میں سے کوئی بھی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور تمام تر اشیاء عرش میں اسی طرح ہیں جیسا کہ وضع بیان میدان

میں چھلا (حلقہ) پڑا ہو۔

مجاہد کا قول ہے کہ ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ستر ہزار عجائبات ہیں۔ ایک عجاب نور کا ہے اور ایک ظلمت و تاریکی کا۔ پھر ایک عجاب نور اور ایک عجاب ظلمت و تاریکی کا (1)۔

وہب بن منہ نے کہا ہے کہ عرش کے ارد گرد ملائکہ کی ستر ہزار صفیں ہیں۔ ہر صف دوسری صف کے پیچھے ہے اور وہ عرش کا طواف کر رہے ہیں۔ کبھی وہ سامنے آتے ہیں اور کبھی وہ۔ اور جب ان میں سے کوئی دوسرے کے سامنے آتا ہے تو ایک طرف والے لایا اللہ کہتے ہیں اور دوسری طرف والے اللہ اکبر کہتے ہیں اور ان کے پیچھے ستر ہزار صفیں ہیں ان کے ہاتھ ان کی کمریوں کی طرف اٹھے ہوئے ہیں درآئینہ وہ انہیں اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ جب وہ اپنے سے آگے والی صفوں میں موجود ملائکہ کی پہنچیں و تکبیر کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی بلند آواز سے یہ کہتے ہیں۔ سُبْحَانَكَ وَبِعَظَمَتِكَ مَا اعْظَمَتِكَ وَاجْلَلْتَكَ اَنْتَ اللَّهُ لَا إِلَهَ غَيْرُكَ اَنْتَ الْخَلْقُ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ وَاجْعَلُونِ الْبَيْتَ اَوْرَانَ کے پیچھے ملائکہ کی مزید ایک لاکھ صفیں ہیں اور وہ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر فرشتہ ایک دوسرے سے مختلف انداز میں تسبیح و تحمید بیان کرنے میں مشغول ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے دو پروں کے درمیان تین سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ان کی نوسے لاکھ کاندھوں تک درمیان میں چار سو سال کی دوری موجود ہے اور اللہ تعالیٰ اور حاملین عرش کے بائیں ستر عجاب آگ کے ستر عجاب ظلمت کے ستر عجاب نور کے ستر عجاب سفید موتیوں کے ستر عجاب یاقوتِ احمر کے ستر عجاب پیلے یاقوت کے ستر عجاب بزرگ کے زرد کے ستر عجاب برف کے ستر عجاب پانی کے ستر عجاب اولوں کے اور ایسی ایسی متعدد چیزوں کے عجائبات موجود ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حاملین عرش اور عرش کے ارد گرد طواف کرنے والے فرشتوں میں سے ہر ایک کے چار قسم کے چہرے ہیں۔ تیل کا چہرہ، شیر کا چہرہ، گدھ کا چہرہ اور انسان کے چہرے کی شکل چہرہ اور ان میں سے ہر ایک کے چار پر ہیں اور وہ ہر اپنے چہرے پر اس خوف سے رکھے ہوئے ہے (کہ کہیں ایسا نہ ہو) کہ ان کی نظر عرش پر پڑ جائے اور وہ گر جائے اور وہ اپنے دو پر اس طرح بچنے کی جانب گرائے ہوئے ہے جیسا کہ پرندہ اپنے پروں کو حرکت دیتے وقت بچنے کی جانب مارتا ہے اور تسبیح و تحمید اور تکبیر و تمجید کے سوا وہ کوئی کلام نہیں کرتے (2)۔

وہ تسبیح کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی، یعنی وہ تمام صفات جلال و جمال کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرتے ہیں اور وہ اپنے رب کی ثناء حمد کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ تسبیح کو اصل بنایا گیا ہے اور حمد کو حال۔ کیونکہ حمد ہی فرشتوں کی حالت کا مشخصی ہے، تسبیح متفقانہ حال نہیں (3)۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اس کا وجود واجب ہے، وہی تمام اشیاء کا خالق ہے۔ وہ کہتا ہے۔ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ایمان لانے کی خبر دی ایک تو اس لئے تاکہ ایمان کی فضیلت و شرف کا اظہار ہو جائے اور اس لئے تاکہ اہل ایمان کی تعظیم و تکریم و شمع ہو جائے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملائکہ اظہار بندگی اظہار عجز و نیاز اور ایمان بالغیب رکھنے میں دیگر تمام مخلوق کی طرح ہی ہیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ کفار گمان کرتے ہیں کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور اس میں فرقہ جسد (جو اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں) کی

2- تفسیر بنوی، جلد 5، صفحہ 34 (القر)

1- تفسیر بنوی، جلد 5، صفحہ 34 (القر)

3- تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 240 (العلیہ)

تردید بھی ہے۔

شہر بن حوشب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حملۃ العرش اٹھ فرشتے ہیں۔ ان میں سے چار یہ کہتے ہیں **سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ** و **بِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی جَلْمِكَ بَعْدَ جَلْمِكَ**۔ (اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو جاننے کے باوجود بھی علم سے کام لیتا ہے) اور ان میں سے چار یہ کہتے ہیں **سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰی غَفْوِكَ بَعْدَ قَدْرَتِكَ**۔ (اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو قدرت کے باوجود غفور و رزور سے کام لیتا ہے) شہر بن حوشب کا کہنا ہے گویا کہ وہ فرشتے بنی آدم کے گناہوں کو دیکھ رہے ہیں (۱) (اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور غفور و رزور کی تعریف کرتے ہیں)

سے اور وہ اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں۔ اس میں اس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ فرشتوں کا ایمان لانے میں اہل ایمان انسانوں کے ساتھ شریک ہونا انسانوں کیلئے باعث نصیحت خیر خواہی اور شفقت ہے۔ اگرچہ فرشتوں کی جنس انسانوں کی جنس سے مختلف ہے۔ کیونکہ ایمان کا رشتہ بنی آدم سے مضبوط اور قوی رشتہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ**۔

وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور علم سے ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ (بقولون) رہنا مکمل جملہ مستغفروں کے فاعل سے حال ہے اور **وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ مَّرْحَمَتُنَا** اصل میں **وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَتُكَ** ہے۔ وصف رحمت و علم کی عمومیت میں خوب مبالغہ کے اظہار کیلئے اعجاز کلام تبدیل کیا گیا ہے اور ان دونوں وصفوں میں چونکہ مقصود بالذات رحمت ہے اس لئے اس کا ذکر علم سے پہلے کیا۔

فاغفور میں فاء سیدہ ہے کیونکہ وسعت رحمت ہی مغفرت کا سبب ہے۔ جس بخشش سے انہیں جنہوں نے نافر سے توبہ کی ہے۔ یعنی جو کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف لوٹ آئے ہیں اور انہوں نے تیرے راستہ کی پیروی کی ہے، یعنی تیرے اس دین کو اپنایا ہے جس کے ساتھ تو نے اپنے رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔

اور انہیں عذاب جنم سے پچالے۔ یعنی عذاب سے ان کی حفاظت فرما۔ اغفر میں عذاب جنم سے پچالنے کا ذکر اشارہ کیا گیا ہے اور یہاں صراحت اس کا ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ دعائے مغفرت میں مزید تاکید اور پختگی پیدا ہو جائے۔ طرف نے کہا ہے کہ مومنین کیلئے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ خیر خواہ ملائکہ ہیں اور اہل ایمان کیلئے ساری مخلوق میں سے زیادہ کھولنے اور مناقتی شیائین ہیں (۲)۔

رَبَّنَا وَادِّجْهُمْ جَنَّتِ عَذَابِ الْآلِئِي وَ عَذَابُهُمْ وَ مَنْ صَدَحَ مِنْ آيَاتِهِمْ وَ
أَرْوَأْجِهِمْ وَ ذُرِّيَّتِهِمْ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۗ وَ قِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۗ وَ مَنْ تَقِ
السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَسَّخَتْهُ ۗ وَ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

”اے ہمارے رب! داخل فرما انہیں سدا بہار باغوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور جو قابل بخشش ہیں ان کے والدین ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے۔ لیکن تو ہی سب سے زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ اور پچالے انہیں سزاؤں سے۔ اور جس کو تو پچالے سزاؤں سے اس دن تو گویا تو نے بڑی رحمت فرمائی اس پر۔ اور یہی ہے بہت

کرد اللہ تعالیٰ کی خالص کرتے ہوئے اس کیلئے پلین کو اگر چہ ناپسند کریں کفار سے۔

۱۔ تمہارے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہونے اور تمہارے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب اور وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو اکیلا اور واحد پکارا جاتا یا جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا اور اس کی وحدانیت کا اعلان کیا جاتا تو تم انکار کر دیتے (دوسری صورت میں اصل عبارت اِذْ اَدْعَى اللّٰهُ تَوْحِيْدًا وَحَدًا ۙ پھر فصل کوکلام سے حذف کر دیا گیا اور وحدہ کو حال ہونے کی صورت میں اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے) جب یہ کہا جاتا لا الہ الا اللہ تو تم انکار کر دیتے اور یہ کہتے اَجْعَلُ الْاِلٰهَةَ الْغَاثِرَةَ ۙ (کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا ہے۔)

اور اگر اس کے ساتھ کسی غیر کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم اس شرک کرنے کی تصدیق کر لیتے اور اسے مان جاتے اور جب تمہارے جنم میں داخل ہونے کا سبب یہ ہے۔ پس آج تو حکم کا اختیار صرف اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو عبادت کا مستحق ہے اور کسی بھی شریک سے منزه اور پاک ہے اور اس نے تمہارے کفر کے سبب تمہارے لئے ہمیشہ کیلئے شدید عذاب کا حکم لگا رکھا ہے۔ اگر کوئی اور ان میں سے اس کا شریک ہوتا جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو تو وہ جنہیں اس کے عذاب سے نجات دلا دیتا اور جب تمہارے لئے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بلند تر ہے کہ کسی غیر کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور کسی کو اس کے مساوی اور ہم پلے قرار دیا جائے۔

۲۔ وہی ہے جو جنہیں اپنی آیتیں دکھاتا ہے جو کہ توحید پر اور ان تمام چیزوں پر دلالت کرتی ہیں جنہیں جاننا واجب ہوتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے رزق یعنی بارش نازل فرماتا ہے جو تمہارے لئے رزق کا سبب بنتی ہے۔ گویا میں اس کی جہالت اور عدم علم کی معذرت کر دیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیاں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ پر آسانی سے استدلال کیا جاسکتا ہے (لہذا ان کا کوئی عذر قبول نہیں) اور ان آیات اور نشانیوں سے وہی نصیحت قبول کرتا ہے جو تعصب اور عناد کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ العللی الکبیر پر اصل جنم کا جواب مکمل ہو گیا اور پھر جو الہی سے نئے جملے اور کلام کا آغاز کیا گیا اور اس میں خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

۳۔ یعنی جب تم نے یہ سن لیا کہ مشرکین کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ رہا ہے تو تم صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرو۔ اور طاعت و عبادت کو ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے خالص اسی کیلئے کرو اگرچہ کفار کو یہ ناپسند ہی ہو یعنی اگرچہ تمہارے دشمن کفار اس پر غضبناک ہی کیوں نہ ہوں۔

سَافِعُكَ مِنَ الرَّجْحِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ
لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۗ يَوْمَ هُمْ لَبُودٌ ۚ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۗ
لَيْسَ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝

”بلند درجات پر فائز کرنے والا عرش کا مالک۔ نازل فرماتا ہے وہی اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ تاکہ وہ درائے ملاقات کے دن سے مع وہ دن جب وہ ظاہر ہو گئے۔ پوشیدہ نہ ہوگی اللہ تعالیٰ پر ان کے حالات سے کوئی شے۔ کس کی بادشاہی ہے آج؟ (کسی کی نہیں) صرف اللہ کی جو واحد (اور) قہار ہے۔“

لہ اس کے درجات کمال اتنے عالیشان اور بلند مرتبہ ہیں کہ کسی کا کمال اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اپنی بارگاہ قرب میں اپنے انبیاء و اولیاء کے درجات و مراتب بلند فرمانے والا ہے اور جنت میں بعض کے مراتب بعض سے اعلیٰ اور فائق ہوتے۔ ذہ عرش کا خالق اور مالک ہے۔ وہ اپنے فضل سے وحی نازل فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ آیت میں وحی کو روح کا نام دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ارواح کے سبب بدنوں کو حیات ملتی ہے اسی طرح وحی کے سبب مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہاں امر سے مراد فضل ہے اور من امر وہ میں ابتدا یہ ہے اور بعض نے امر سے مراد قول لیا ہے اور من کو بیان یہ قرار دیا ہے۔

ترکیب کام میں یہ تینوں عموماً متبادیٰ خبریں ہیں اور عموماً اصول کے مترادف ہے۔ یہ تینوں اوصاف اللہ تعالیٰ کی توحید اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کی بلندی اور (آخری جملہ) تمہید نبوت پر دلالت کرتے ہیں اور یہ جہتاً اخذ و ف کی خبریں ہیں جو کہ جو ہے۔ لیسندو، بلقی کے متعلق ہے اور اس میں پوشیدہ خمیر یا اللہ کیلئے ہے یا روح کیلئے ہے یا من کی طرف راجع ہے۔ یہی زیادہ ظاہر اور قرب ہے۔ اور اس کی تائید قرأت یعقوب بھی کرتی ہے کہ انہوں نے لیسندو کی بجائے لیسندو پڑھا ہے، یعنی اسے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تاکہ آپ ڈرائیں۔ اس کے معنوں کو حذف کر دیا گیا ہے تاکہ یہ دعوت کے عام ہونے اور اس انذار (ڈرانے) کے جن و انس تمام کو شامل ہونے پر دلالت کرے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (ملاقات کا دن) اس سے مراد وہ دن ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی ربنے والی تمام مخلوق جمع ہوگی۔ باہم ملاقات کرے گی۔ مقال اور قوادہ نے کہا ہے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں خالق اور مخلوق باہم جمع ہوں گے۔ میمون بن مہران نے کہا ہے اس دن ظالم اور مظلوم اور آپس میں جھگڑا کرنے والے یعنی مدعی اور مدعی علیہ آپس میں اکٹھے ہوں گے (1)۔ بعض نے کہا ہے اس دن عبادت کرنے والے اور ان کے موجود آپس میں جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ معنی لیا ہے اس دن آدمی اپنے اعمال کے ساتھ جمع ہوگا۔ یعنی اپنے اعمال سے جا ملے گا۔

حاکم ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیانے کتاب الاصول میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پڑھنا یَوْمَ تَشْفَقُ السَّمَاوَاتُ بِالسَّعَابِ۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن تمام مخلوق جن و انس و وحوش و طیور اور چوپاؤں وغیرہ کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا پھر آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور اس کے باہمی نیچے اتریں گے اور ان کی تعداد زمین میں رہنے والے جن و انس کی نسبت کہیں زیادہ ہوگی (2)۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں ساتوں آسمانوں کے یکتوں کے یکے بعد دیگرے زمین پر اترنے کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے نزول اجلال کا تذکرہ بھی ہے اور یہ کتابہات میں سے ہے (جس کی حقیقی کیفیت کا اور اس کی نہیں کیا جاسکتا) ہم نے اس کی تاویلات اور وضاحت سورۃ فرقان کی آیت یَوْمَ تَشْفَقُ السَّمَاوَاتُ اور سورۃ بقرہ کی آیت اَنْ يَّاتِيَهُمُ اللّٰهُ فَاُظْلَمُوْا فَاِذْ يَسْئَلُ الْكَلْبَ الْغَاوِرَ تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

یَوْمَ تَشْفَقُ السَّمَاوَاتُ بِالسَّعَابِ یعنی جس دن وہ اپنی قوموں سے ٹھکس گے یا جس دن وہ ظاہر ہونگے پہاڑوں ٹیلوں یا مکانوں میں سے کوئی شے انہیں چھپا نہیں سکے گی۔ یا جس دن ان کے نفوس ظاہر ہونگے اور بدن کے پردے انہیں نہیں چھپا سکیں گے یا جس دن ان کے اعمال

اور اسرار و رموز سب ظاہر ہو جائیں گے تو ان کی ذاتوں و اعمال اور ان کے احوال میں سے کوئی شے اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں رہے گی۔ لا یخفی علی اللہ و ہنہم شیء کا جملہ "یَوْمَ هُمْ لَبُؤُونَ" کی تفسیر یہ ہونا چاہیے ہے اور دنیا میں جو احوال مخفی رہنے کا وہم ہو سکتا ہے اسے زائل اور دور کرنے کیلئے ہے۔

آج کے دن کسی کی بادشاہی ہے؟ یہ سوال اس دن مخلوق کو فنا کرنے کے بعد اور دو بارہ اٹھانے سے قبل کیا جائے گا اور اسے بطور حکایت یہاں بیان کیا گیا ہے۔ تو اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمائے گا: **يَوْمَ لَا أَجِبُ الْمُتَقَابِرَ**۔ (کسی کی نہیں) صرف اللہ کی جو واحد (اور) قہار ہے۔ یعنی وہ جلال ذات اور کمال صفات میں یکساں اور منفر ہے اور وہ اپنی الوہیت میں کسی بھی شریک سے منزہ اور پاک ہے۔ وہ ساری مخلوق کو موت دینے اور اپنی مشیت کے مطابق اس میں تصرف کرنے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہے۔

مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور اسے دوبارہ اٹھانے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سوال و جواب کا ہونا ایک طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے جسے حضرت ابو بکرؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو بطبرانی نے مطولات میں ابو یعلیٰ نے مسند میں بیہقی نے البعث میں اور کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

ابن ابی داؤد نے البعث میں حضرت ابوسعیدؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک ندا دینے والا بلند آواز سے پکارے گا کہ: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ فَمَا كَانَ لَهُمْ لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ**۔ (قیامت) آگئی (یا ایہا الناس اتقوا اللہ) وہ اپنی آواز کو اتنا کھینچ کر بلند کرے گا کہ زندے اور مردے تمام اس آواز کو سنے گئے اور اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف نزول اجلال فرمائے گا۔ پھر ندا دینے والا پکار کرے گا کہ: **يَوْمَ لَا أَجِبُ الْمُتَقَابِرَ** (1)۔

علامہ بیہقی نے ایک مرفوع حدیث و نفع فی الصور الایہ کے تحت بیان کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (بہوش ہونے اور مرنے سے) تین فرشتوں یعنی جبرئیل میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام کی استشاء کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ (جو کہ خود بہتر جانتا ہے) ارشاد فرمائے گا کہ ملک الموت کون باقی ہے؟ تو ملک الموت عرض کرے گا ایک حیرتی کریم ذات اور تیرے بندوں میں سے جبرئیل میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں اور وہ بھی مرنے والا ہے چنانچہ رب کریم فرمائے گا مگر چاہے پھر اللہ تعالیٰ خود ندا فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کو سنبھلنا بار پیدا کیا ہے پھر دوبارہ بھی میں ہی اسے زندہ کروں گا۔ کہاں ہیں وہ ظلم و جبر کرنے والے اور غرور و تکبر کرنے والے؟ پھر ندا فرمائے گا **لَيْتَنُ الْمَلِكُ الْيَوْمَ**۔ (آج کے دن بادشاہی کسی کی ہے؟) تو کوئی ایک بھی جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی ارشاد فرمائے گا **يَوْمَ لَا أَجِبُ الْمُتَقَابِرَ**۔ پھر دوبارہ صورت میں بچوٹکا جائے گا تو یکدم سب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جائیں گے (2)۔

سابق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ سوال تب ہوگا جب ساری مخلوق زندہ ہو چکی ہوگی اور اس دن وہ قبروں سے باہر نکل چکے ہونگے۔ یا پھر اس حالت کا بیان ہے جس پر ظاہر حال دلالت کر رہا ہے کہ اس وقت تمام ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہونگے اور درمیانی واسطے اٹھ چکے ہونگے اور اللہ تعالیٰ کے سوائے غیر کی طرف مجازی طور پر بھی بادشاہی اور حکم کی نسبت نہیں کی جاسکتی گی۔ ورنہ حقیقت حال تو اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ حقیقی بادشاہی یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہاں بھی ہمیشہ کیلئے ایسی ہی ہوگی۔

أَلَيْسَ تَجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ لَا ظَلَمَ الْيَوْمَ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ
الْحِسَابِ ۝ وَأَذِئْبُهُمْ يَوْمَ الْأَرْزَاقَةِ إِذَا انْقَلَبُوا كَدَى الصَّاحِرِ لُطْمِينًا ۗ مَا
لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَيِّيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ۝

”آج جلد دیا جائیگا ہر نفس کو جو اس نے کمایا تھا۔ ذرا ظلم نہیں ہوگا آج۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ اور آپ ڈرا رہے انہیں قریب آنے والے دن سے جب کہ دل گلے میں انک جا میں گئے خوف و دہشت سے بھرے ہوئے۔ نہ ہوگا ظالموں کیلئے کوئی دوست اور نہ ایسا سفارشچی جس کی سفارش مانی جائے۔“

۱۔ یعنی اس دن اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک کی مجازی بادشاہی بھی سلب کر لی جائے گی اور اس دن ظاہری بادشاہی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ جیسا کہ حقیقی بادشاہی ہمیشہ کیلئے اسی کے ساتھ خاص ہے تو اس دن ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائیگا جو اس نے کمایا تھا۔ اس دن کسی کا ثواب کم کرے اور سزا میں اضافہ کرے ذرا بھر ظلم کسی پر نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے عین مطابق ہوگا۔ کیونکہ اس وقت حاکم مطلق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ وعدہ لاشریک ہوگا اور اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ظلم تو وہ ہوتا ہے جو کوئی دوسرے مالک کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو جو تصرف فرمائے گا وہ اپنی ملکیت میں ہی کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ وہ اپنی مشیت کی بناء پر ایام دنیا میں سے نصف دن کی مقدار کے برابر دنت میں تمام لوگوں کا حساب لے گا۔ حالانکہ وہ بالقرآن واحد میں بھی حساب و کتاب لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی کام دوسرے کام سے اسے مشغول نہیں رکھ سکتا۔

۲۔ وَأَذِئْبُهُمْ کا عطف سابقہ خبروں پر ہے۔ تقدیر کلام ہے یقال لک انذرہم آپ کو کہا جاتا ہے انہیں ڈرائیے۔ یوم الارزفہ قریب آنے والا دن یعنی قیامت۔ چونکہ قیامت قریب آنے والی ہے اس لئے اس کا نام یوم الارزفہ رکھا گیا ہے اور قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی چیز بائعین آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے (اور قیامت بھی بائعین آنے والی ہے) إِذَا انْقَلَبُوا میں اذ یوم الارزفہ سے بدل ہے اور لدی العناجر کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن شدت خوف اور سخت دہشت کی وجہ سے دل اپنے مقامات سے اوپر کواٹھ آئیں گے اور حلق میں پہنچ کر وہاں چٹ جائیں گے۔ اب نہ تو وہ وہاں اپنے مقامات کی طرف جائیں گے کہ آدمی کو راحت و سکون حاصل ہو جائے اور نہ ہی وہ باہر نکلیں گے کہ انہیں موت آ جائے۔

کاظلمین کا معنی ہے بے چین مضطرب خوف اور غم سے بھرے ہوئے۔ اور کظلم سے مراد ایسے غصے خوف اور غم کا دل میں آنا جانا ہے جسے وہ برداشت کر سکتا ہو۔ ترکیب کلام میں القلوب مبتدا ہے۔ لدی العناجر اس کی خبر ہے اور کظلمین القلوب سے حال ہے کیونکہ القلوب سے مراد اصحاب قلوب ہیں۔ کاظلمین کا ظلم کی جمع سالم ہے کیونکہ ظلم کے ساتھ ایسے فعل کی صفت بیان کی گئی ہے جو ذمی باعتبارقول کے افعال میں سے ہے۔

ظالمین سے مراد کفار ہیں۔ خانہ آگرچہ کفار کیلئے ہیں لیکن یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ یہ کیفیت انہی کے ساتھ متعلق ہوگی اور ان کے کفر و ظلم کی وجہ سے ہی ان کے لئے کوئی مشفق اور قریبی ساتھی ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشچی ہوگا جس کی سفارش قبول کی جائے۔ یعنی یہاں یہ مفہوم نہیں کہ سفارش کرنے والے کی سفارش مانی نہیں جائے گی بلکہ مفہوم یہ ہے کہ ان کیلئے مطلق

کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا لہذا اس صورت میں صفت بطن کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔ یا پھر یہ مفہوم ہے کہ مشرکین کا نرم باطن یہ تھا کہ ان کے بت ان کی- غارش کریں گے تو اس کے بارے فرمایا کہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ان کے بت ان کے لئے غارش کریں گے تو پھر بھی ان کی- غارش کو قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔

يَعْلَمُ خَائِبَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴿٥١﴾ وَاللّٰهُ يَفْضُلُ بِالْحَقِّ ۗ وَالَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَفْضُلُوْنَ بِشَيْءٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٥٢﴾

”وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور ان باتوں کو جنہیں سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ فرمائے گا حق کے ساتھ اور جنہیں وہ اللہ کے بغیر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“

۱۔ خَائِبَةَ صیغہ اسم فاعل ہے اور اس کا موصوف مذوف ہے۔ یہ اصل میں النظرة الخائبة ہے۔ یعنی خیانت کرنے والی نگاہ۔ جیسا کہ ایسی شے کی طرف دیکھنا جسے دیکھنا حرام ہو اور نظر چرا کر ایسی چیز کی طرف دیکھنا (خیانت نظر کہلاتا ہے) یا خائبة مصدر بمعنی خیانت ہے جیسا کہ عافیہ مصدر بمعنی معافا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ ہو الذی یریکم ایاتہ میں جو مہبت کی دوسری خبر ہے اور اللہ تعالیٰ ان رازوں کو بھی جانتا ہے جو ابھی سنوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کی جانب شہوت کی نظر سے نظر میں چرا کر دیکھتا ہے اور پھر وہ آدمی اس لہجہ عورت کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے دل میں غور و فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس غور و فکر سے بھی واقف و آگاہ ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہ مالک مطلق ہے وہ حکیم و دانایا ہے اور جو کچھ ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ سب کچھ جانتے والا ہے۔ لہذا وہ ہی فیصلہ فرمائے گا جس کا تقاضا اس کا علم اور حکمت کرے گی اور اس کا تقاضا حق ہی ہوگا۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف بعلم پر ہے۔

اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں شیاطین اور ظالم حکمرانوں کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس فیصلہ کرنے کی قدرت ہی نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ اللّٰهَ يَفْضُلُ بِالْحَقِّ ۗ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَفْضُلُوْنَ بِشَيْءٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٥٢﴾

”اے جو کفر کرنے والے! اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہ مالک مطلق ہے وہ حکیم و دانایا ہے اور جو کچھ ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ سب کچھ جانتے والا ہے۔ لہذا وہ ہی فیصلہ فرمائے گا جس کا تقاضا اس کا علم اور حکمت کرے گی اور اس کا تقاضا حق ہی ہوگا۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف بعلم پر ہے۔“

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ
قَبْلِهِمْ ۗ كَانُوْا مِنْهُمْ قُوَّةً ۗ وَاَنْرَا فِى الْاَرْضِ فَاَحَدَهُمُ اللّٰهُ

”اور بیشک ہمجاہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانوں اور روشن سند کے ساتھ۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا (یہ) جادوگر ہے بڑا جھوٹا ہے۔ پھر جب موسیٰ لیکر آئے ان لوگوں کے پاس حق ہمارے ہاں سے تو انہوں نے کہا کہ قتل کر ڈالو ان لوگوں کے بچوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور زندہ چھوڑ دو ان کی لڑکیوں کو۔ اور نہیں ہے کافروں کا ہر مکر مگر رائیگاں ہے۔“

۱۔ پالیٹینا سے مراد اونچرات ہیں اور دو سلاطین قہوین سے مراد واضح اور ظاہر دلائل ہیں اور عطف دونوں وصفوں کے درمیان مغازرت بیان کرنے کیلئے ہے (یعنی پالیٹینا اور دو سلاطین قہوین سے مراد علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں) یا پھر دو سلاطین قہوین سے مراد بھی بعض خاص اور اہم معجزات ہیں جیسا کہ عساف وغیرہ تو ان کی تم نشان کیلئے انہیں علیحدہ ذکر فرمایا گیا اس صورت میں عطف تخصیص بعد اعمام کیلئے ہوگا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح معجزات اور نشانیاں لے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف گئے تو انہوں نے آپ کے بارے کہا یہ تو جادوگر اور کذاب ہے۔ یہ جملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث تسکین اور تسلی ہے اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار سے پہلے لوگوں کے اعمام کا تذکرہ ہے جو اپنی قوت کے اعتبار سے ان سے زیادہ طاقتور ہے اور ان کا زمانہ بھی ان کے زمانے کے قریب تھا۔

۲۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس سے حق لے کر ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا ان لوگوں کے بچوں کو قتل کر ڈالو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دو۔ یعنی جیسے تم نے پہلے کیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کر لیا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہو کر ظاہر ہوا کہ انہوں نے کاراستہ ہی بند ہو جائے (اسی طرح اب بھی کر کہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے بچوں کو قتل کرادتا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے معاون و مددگار بن سکیں اور اپنی خدمت کیلئے ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو۔) وعا کید الکفرین میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو ان کے کفر پر ہم تقدیر ثبت کرنے کیلئے، دوسرا حکم کی عمومیت بیان کرنے کیلئے اور تیسرا حکم کی علت کا اظہار کرنے کیلئے۔ معنی یہ ہے کہ کافروں کا ہر مکر رائیگاں ہے۔ ان کی ہر تدبیر بے اثر اور بیکار ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو باطل کرنے اور آپ کے پیام حق کو روک کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو انہی پر لوٹا دیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا اور اس کے برعکس موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے قہمین کو زمین کا بادشاہ بنا دیا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرِّيَّتِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ سَرِيَّهُ ۗ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ
دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ۗ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّ

رَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝

”اور فرعون نے (بجھجھلا کر) کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کروں۔ اور وہ بلائے اپنے رب کو (اپنی مدد کیلئے) مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین بدل نہ دے یا فساد پھیلا دے ملک میں۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں بناؤں تمہارا دین اور اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس تکبر (کے شر) سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔“

۱۔ فرعون نے اپنی قوم سے کہا مجھے چھوڑ دو۔ ابن کثیر نے ذرؤتی میں یاہ کو مفتوح اور باقیوں نے یاہ کو ساکن پر محاسبہ ہے کہ میں موسیٰ کو قتل کروں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے یہ قول اس لیے کہا تھا کہ فرعون کی قوم میں سے کچھ خاص افراد ایسے تھے جو اپنی ہلاکت

اور تباہی کے خوف سے اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روک تھے (1) اور اسے یہ کہتے تھے کہ یہ موسیٰ وہ نہیں ہے جس سے تو ڈر رہا ہے بلکہ یہ تو جاوید گری ہے اور اگر تو اسے قتل کرادے گا تو بائبلین لوگ یہ گمان کریں گے کہ تو دلائل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے (لہذا ان کے مزاج مگڑ جائیں گے) علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا یقین تھا ہی وہ لے آپ کو قتل کرنے سے ڈرتا تھا یا اسے یہ گمان تھا کہ اگر اس نے ان کے قتل کا قصد کیا تو اس کیلئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا (2) اور اس کی تائید و لیدع بعد کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

۱۔ اور موسیٰ کو چاہیے کہ وہ اپنے اس رب کو بلائے جس کے ہارے یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے اسے ہماری طرف بھیجا ہے اور وہ آکر اس کی ہم سے حفاظت کرے۔ گویا فرعون نے اس قول میں اپنی اس جرات کا اظہار کیا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھی بلائے تو اسے اس کی کوئی پروا نہیں۔ اس کا قول ذرونی افضل موسیٰ فظا اپنی قوم کے ساتھ مکر کرنے اور دھوکہ سازی کیلئے تھا اور انہیں یہ وہم دلا تا مقصود تھا کہ وہ اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روک رہے ہیں (ورنہ میں تو اسے قتل کر دیتا حالانکہ بات اس طرح نہ تھی) کیونکہ حقیقتاً اسے قتل سے روکنے والا وہ عصا کے معجزہ کا خوف تھا جو اس کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔

انہی میں نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاہ کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ کو ساکن پڑھا ہے۔ کہنے لگا بیٹک اگر میں اسے قتل نہ کر دوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دیوں کو بدل دیکے، یعنی جو تم اب بتوں کی پوجا بات میں لگے ہوئے ہو اس میں تبدیلی اور تعمیر پیدا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَيَذَرُكَ الْغَائِبُ** یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔ اور فساد سے مراد دین کی تبدیلی بتوں کی عبادت میں تعمیر یا دنیا میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔

یعقوب اور اہل کوئٹہ نے **أَوْن** اور دوسروں نے **وَأَنْ** پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور بصرہ نے **يَظْهَرُ** باب افعال سے یاہ کو ضمہ اور ہاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الفساذ کو مفتوح ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور جبکہ باقیوں نے باب مجرد سے یاہ اور ہاء دونوں کو مفتوح یعنی **يَظْهَرُ** پڑھا ہے اور الفساذ کو فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔

۲۔ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تو آپ نے اپنی قوم سے کہا میں پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس سنگھ کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہاں کلام کا آغاز ان سے کیا جو کہ حریف تہا کید ہے اور یہ احساس دلانے کیلئے ہے کہ شر کو دور کرنے کا سب سے مضبوط اور پختہ سبب اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ہے۔ چونکہ یہاں موجود حفاظت اور تربیت ہے اس لئے خاص طور پر (امامیں سے) اسم رب ذکر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت ان تمام کی حفاظت کو مضمین اور شامل تھی اس لئے لفظ رب کی اضافت اپنی طرف بھی کی اور ان کی طرف بھی اور اس میں ان کو اس بات پر براہینیت کرنا مقصود ہے کہ وہ بھی پناہ طلب کرنے میں آپ کی موافقت کریں (یعنی وہ بھی آپ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں) کیونکہ اجتماعی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

یہاں آیت میں فرعون کا نام ذکر نہیں کیا بلکہ ایسا وصف (سنگھ) ذکر کیا ہے جو اسے بھی اور دوسروں کو بھی شامل ہے۔ ایک تو اس میں عمومیت مقصود ہے (کہ یہ پناہ فرعون جیسے ہر شریر کے شر سے ہے) دوسرا حق کی رعایت کرتے ہوئے اور تیسرا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے جو اسے شر پر براہینیت کرنے والی تھی (یعنی وہ اپنے سنگھ اور غرور کی وجہ سے ہی موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلا رہا تھا اور آخرت کا

انکار کرتا تھا) یہ بھی جائز ہے کہ ربکم کا خطاب فرعون اور اس کی قوم کو ہو اور اس کے ذریعے انہیں توحید کے اقرار اور شرک کے انکار پر متنبہ کرنا مقصود ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور رب نہیں۔

وَقَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي قَوْلًا مِّنْ قَوْلِ الْغَالِبِينَ ﴿١٠٠﴾
 اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَإِنَّ يَكُودًا لَّأَعْيُنُهُمْ كَذِبًا ۖ إِنَّ يَأْتِيهِمْ كَذِبًا مِّنْ رَبِّهِمْ
 صَادِقًا يُصِيبُكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الضَّالِّينَ ﴿١٠١﴾

”اور کہنے لگا ایک مرد مومن جو فرعون کے خاندان سے تھا اور چھپائے ہوئے تھا اپنے ایمان کو کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ حالانکہ وہ لے آیا ہے تمہارے پاس دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے (اسے اپنے حال پر نہ ہندو) اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کی شامت اس پر ہوگی اور اگر سچا ہو (اور تم نے اسکو گزند پہنچائی) تو ضرور پھینچے گا تمہیں عذاب جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اسے جو حد سے بڑھے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔“

مقابل اور سدی نے کہا ہے کہ وہ مومن مرد قحطی تھا جو کہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القصص میں اس طرح بیان کیا ہے: وَجَاءَكَ رَبُّكَ مِنْ أَجْثَا الْبَشَرِ نَبِيًّا ﴿١٠٠﴾ یعنی بعض نے کہا ہے اس کا نام حبیب تھا۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ اسرائیلی تھا اس کا نام جزیل تھا اور مجاز اس آیت میں وہی مقصود ہے: وَقَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي قَوْلًا مِّنْ قَوْلِ الْغَالِبِينَ ﴿١٠١﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر علمائے اسی طرح مروی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ اس کا نام جنبل تھا۔

کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا قصد کر رہے ہو (۱) جو کہتا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ یا کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہو ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنے معاملے میں نظر و فکر کرنے کے بغیر یا کسی قسم کا خوف رکھے بغیر یہ کہہ رہا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ لفظ بھی کا لفظ اللہ پر مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ صدیقی زید میں حصر پایا جا رہا ہے۔

حالا لکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیلیں، یعنی ایسے کثیر حجرات لے کر آیا ہے جو اس کی صداقت اور سچائی پر شاہد عادل ہیں۔ کیونکہ ایسے حجرات عطا کرنے کی کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جس نے تمہیں پیدا کیا ہے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے اس کے سوا کوئی بھی ایسی قدرت نہیں رکھتا۔

1- تفسیر بخاری، جلد 5، صفحہ 40 (الفر)

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ نے کہا اے لوگو! مجھے بتاؤ سب لوگوں سے بڑھ کر بہادر کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا ہم تو نہیں جانتے، آپ نے فرمایا ابو بکر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ قریش نے آجکے بچکر رکھا تھا ایک آپکے بچے کی جانب جھکارا تھا اور دوسرا آپ کو گتھی سے کھینچ رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے تو وہ ہے جس نے تمام ایہوں کو ایک اللہ بنا رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں قسم بخدا اللہ میں سے سوائے ابو بکر کے کوئی بھی قریب نہ ہوا۔ آپ نے ایک کو ایک طرف دھکا دیا اور دوسرے کو کھینچا ساتھ فرمایا تمہاری ہلاکت ہو مقظون ورجلان بقول ربی اللہ حضرت علی نے وہ چادر اوڑھائی جو اپنے اوپر لے ہوئے تھے اور نہ لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوئی پھر فرمایا میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کیا آل فرعون کا وہ بندہ علی مومن تھا یا ابو بکر؟ لوگوں کا خاموش رہے تو آپ نے فرمایا مجھے کیوں نہیں جواب دیتے؟ قسم بخدا ابو بکر کی زندگی کی ایک ساعت آل فرعون کے مومن کی زندگی سے افضل و بہتر ہے کیونکہ وہ آدمی اپنے ایمان کو چھپاتا تھا اور یہ آدمی اپنے ایمان کا اعلان کرتا تھا (یعنی ابو بکر صدیق نے اپنے ایمان کا اعلان کر رکھا تھا)

ہوئی تڑپتہ میں رب کی اضافت ان کی طرف ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس نے تمہیں پیدا فرمایا ہے اور تمہاری پرورش کی ہے وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب مسلط کر دے اور تمہیں اپنی گرفت میں لے لے۔ ترکیب کلام میں وفد جاء کم الخ۔ کا جملہ بقول کے قائل سے حال ہے۔ پھر اس آدمی نے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے استدلال کرتے ہوئے کہا۔

اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو پھر اس کے جھوٹ کا وبال اور شامت اسی پر پڑے گی وہ کبھی بھی اس سے بچ نہیں سکتا کسی اور پر نہیں پڑے گا کہ اسے دور کرنے کیلئے اسے قتل کرنے کی ضرورت ہو اور اگر وہ سچا ہے جیسا کہ معجزات اور شواہد اس پر دلائل کر رہے ہیں تو پھر کم از کم اس عذاب کا کچھ حصہ تمہیں ضرور پہنچے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اور وہی بعض تمہاری ہلاکت و بربادی کیلئے کافی ہے۔ اس کلام میں انہیں ڈرانے میں مبالغہ کا اظہار بھی ہے اور تعصب کے بغیر انصاف کا اظہار بھی یہی وجہ ہے کہ کاذینا کا ذکر پہلا کیا گیا ہے۔

بلیک اللہ تعالیٰ سے ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔ یہ تیسرا استدلال ہے جس میں دو اسلوب اپنائے گئے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ اگر وہ حد سے بڑھنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ معجزات اور دلائل کی جانب اس کی راہنمائی تک نہ فرماتا۔ جبکہ اسے اللہ تعالیٰ نے معجزات اور دلائل کے ساتھ قوت و طاقت عطا فرمائی ہے۔

اور ان میں سے دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اگر وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کر دے گا۔ وہی اسے ہلاک کر دے گا اور تمہیں اسے قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ شاید اس کی اس سے بھی مراد پہلا استدلال ہی ہے اور دوسرا تو فقط اس لئے اختیار کیا گیا کہ ان کے غصے اور غضب کو قدرے نرم کر دے اور اس میں فروخون کیلئے یہ تعریض بھی ہے کہ چونکہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور خوب جھوٹ بولنے والا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سیدھے اور نجات کے راستے کی طرف اس کی راہنمائی نہیں فرمائے گا۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن العاص رحمہ اللہ عنہ سے پوچھا مجھے اس شدید ترین انتہائی اور سخت برتاؤ کے بارے میں جو شریکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختیار کیا ہوا تھا تو انہوں نے فرمایا اس اثناء میں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ معظمہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک عقیقہ بن ابی معیط ادھر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر پکڑا آپ کے گلے میں ڈال لیا اور اسے مل دینے شروع کر دیئے اور اس نے انتہائی شدید اذیتاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹ دیا پس اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رحمۃ اللہ اذہر آ (۱) اور اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر رسول اللہ سے دور ہٹایا اور

(۱) حضرت عمر بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کے طواف سے جوئی فارغ ہوئے تو لوگ آپ پر بھت پڑے اور آپ کی پوری چادر کو پکڑ لیا اور کہا کیا آپ ہی ہیں جو ہمیں ان سے رد کرتے ہیں جن کی مبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے تھے تو آپ نے فرمایا ہاں میں ہی ہوں تو حضرت ابو بکر صدیق رحمۃ اللہ عنہ اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر سے چٹ گئے اور پھر فرمایا اَنْفَلْتُوْنَ وَ رَجَلَا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ وَفَدَّ جَاءَ شَمُّكَ بِالْبَيْتَاتِ مِنْ رَبِّنْكَ وَ اِنْ يُّكْفُ كَاذِبًا فَصَلِّ عَلَيْهِ كَذِبُهُ وَ اِنْ يُّكْفُ صَادِقًا يُّبْسِكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعْلَمُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَثَفَاتٍ۔ آپ نے یہ الفاظ انتہائی بلند آواز سے کہے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے حتیٰ کہ انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا شدید مارا کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی پس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور آپ کو پکڑ کر کہا تمہاری ہلاکت ہو اَنْفَلْتُوْنَ وَ رَجَلَا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ تو انہوں نے کہا کہ یہ کیوں ہے؟ لوگوں نے انہیں بتایا یہ ابن ابی قحافہ ہے (ازمضر رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

فرايماقتلون رجلا ان يقول ربي الله وقد جاءكم بالبينات من ربكم رواه البخاري (1)۔

يَقُولُ لَكُمْ الْمَلِكُ الْيَوْمَ ظَهْرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَتَّخِذُ مِنْ بَيْنِ اللّٰهِ اِنْ
جَاءَنَا قَالٍ فِرْعَوْنَ مَا اَمْرِيْكُمْ اِلَّا مَا اَمْرِيْ وَمَا اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۶
قَالَ الَّذِيْ اٰمَنَ يَقُولُ رِئِيْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝۷ وَمِثْلَ دَابِ
قَوْمِ نُوْحٍ وَعَادٍ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ بَيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۝۸ وَمَا اللّٰهُ يَبْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝۹

”اے میری قوم! امانا آج حکومت تمہاری ہے (نیز تمہیں) غلبہ حاصل ہے اس ملک میں (لیکن مجھے یہ تو بتاؤ) کون پچائے گا میں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے۔ (یہ سن کر) فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں اور نہیں راہنمائی کرتا میں تمہاری مگر سیدھے راستہ کی طرف ہے اور کہنے لگا وہی ایمان والا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر (بھی کہیں) پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن آ جائے ہے جیسا حال ہوا تھا تو مومنوں کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ اور اللہ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے ہے۔“

۱۔ اے میری قوم! امانا سر زمین مصر میں آج حکومت تمہاری ہے نیز تمہیں اس ملک میں غلبہ حاصل ہے۔ ظہر من کا معنی ہے غالب ہونا اور بلند مرتبہ ہونا۔ ترکیب کلام میں ظہرین، لکم میں تم ظہیر سے حال ہے۔

لیکن مجھے بتاؤ کون پچائے گا میں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے۔ یعنی آج اسی زمین میں تمہاری حکومت اور تمہارا غلبہ ہے۔ لہذا تم اللہ تعالیٰ کے نبی کو قتل کر کے اس کے عذاب کو دعوت دے کر اپنی حکومت اور غلبہ کو ضائع اور باطل نہ کرو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہم پر آ گیا تو کوئی بھی اسے ہم سے روک نہیں سکے گا۔ بنصرون نامہ میں تاخیر جمع ذکر کر کے کہنے والے نے اپنے آپ کو بھی اس میں داخل کیا ہے کیونکہ اس کا ان سے قربت کا تعلق تھا اور ساتھ ہی وہ انہیں یہ بات سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہے اور جو نصیحت وہ انہیں کر رہا ہے وہ اس میں ان کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

۲۔ یہ سن کر فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں۔ اُذِیْکُمْ الرّٰی سے ماخوذ ہے۔ صحاح نے یہ معنی کیا ہے کہ میں تمہیں وہی سکھاتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں (2)۔ یعنی اُذِیْکُمْ اعلمکم کے معنی میں ہے (اور میں تو موسیٰ علیہ السلام کے قتل کو درست خیال کرتا ہوں) سَبِيْلَ الرَّشَادِ کا معنی ہے سیدھا اور صحیح راستہ یعنی میں تمہاری راہنمائی نہیں کرتا مگر سیدھے راستہ کی طرف۔

۳۔ اور وہی ایمان والا کہنے لگا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی کہیں موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انہیں قتل کرنے کے سبب پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آ جائے۔ اس میں پہلی قوموں سے مراد وہ زمانہ ماضی کی امتیں ہیں۔ جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔ تقدیر عمارت یہ ہے انہی احصاف علیکم عذاباً مثل عذاب یوم الاحزاب۔ اس میں نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے انہی کی یاد کو مفلوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاد کو مسکن پڑھا ہے۔

(یوم الاحزاب میں احزاب کو جمع ذکر کیا ہے جبکہ یوم کو واحد) تو چونکہ احزاب کی تفسیر مابعد کلام میں کر دی گئی ہے اس لئے اس تفسیر سے

ہوتے ہوئے یوم کو جمع ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا پھر معنی ہی اس طرح ہے۔ عذاب یوم حزب من الاحزاب۔ جسے جیسا حال ہوا تھا تو یوم حزب عاد اور شمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ مثلاً قوم لوط اور نمرود وغیرہ۔ یعنی جیسے انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور انہیں اذیتیں پہنچائیں (تو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب آیا مجھے تو تمہارے بارے میں یہی ڈر اور خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے) یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ وہ آدمی قوم فرعون میں سے تھا اور پہلے لوگوں کے حالات سے واقف و آگاہ تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے۔ للعباد میں لام زائدہ ہے جو ظلم مصدر کے عمل کو تقویت دینے کیلئے لگا یا گیا ہے اور العباد ظلماً کا مفعول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ وہ کسی بندے پر ظلم کرے اور بغیر گناہ کے انہیں سزا دے یا بندوں میں سے کسی ظالم کو بغیر انتقام کے چھوڑ دے یا کسی کیلئے اس کی نیکی کے اجر میں کمی کر دے یا پھر کسی کی سزا میں اضافہ کر دے۔

وَيَقَوْمًا إِخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿٥٦﴾ يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مَدْيُنَ مَنَّا لَكُمْ مِّنَ اللَّهِ مِصْرًا عَاصِمًا ۚ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٥٧﴾

”اور اسے میری قوم! میں ڈرتا ہوں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے۔ جس روز تم بھاگو گے پیٹھ پھرتے ہوئے۔“
نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا۔ اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔“

اس نے انہیں عذاب دینا سے ڈرانے کے بعد آخرت کے عذاب سے ڈرایا اور کہا اسے میری قوم! میں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے ڈرتا ہوں۔ نافع ابن کثیر اور ابو عمر نے انہی میں یاہ کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ التناد کو ابن کثیر نے حالت وصل اور وقف دونوں میں یاہ کے اثبات کے ساتھ التنادی پڑھا ہے۔ ورس نے صرف حالت وصل میں اس طرح پڑھا ہے۔ قالون سے ان دونوں میں اختلاف منقول ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاہ کو حذف کر کے التناد پڑھا ہے۔

یوم تَوَلَّوْنَ مَدْيُنَ مَنَّا یوم التناد سے بدل ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے جس روز تم پیٹھ پھرتے ہوئے بھاگو گے مگر حج نہیں کسو گے (۱)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ دن ہے جس میں گھبراہٹ پیدا کرنے کیلئے حوٹ میں پھونکا جائے گا۔ یعنی اس سے مراد فوج کا دن ہے۔ جو کچھ صفحہ سے پہلے ہوگا۔ (یعنی پہلے گھبراہٹ پیدا کی جائے اور پھر بیوشی طاری ہوگی)

ابن جریر نے مطلوات میں ابو یعلیٰ نے مسند میں بتیقی نے ابیث اور عبد بن حمید اور ابوالفتح نے کتاب المغلطہ میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ اس میں آپ نے تین ٹخوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسرائیل علیہ السلام کو فتح اولیٰ کا حکم ارشاد فرمائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمانے کا کچھ فزع (گھبراہٹ پیدا کرنے) کیلئے صورت میں پھونک مار تو وہ اس میں پھونک ماریں گے زمین و آسمان کے تمام مادیوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ مگر جن کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا ان پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا تو حضرت اسرائیل علیہ السلام اس پھونک کو اور کھینچیں گے اور اسے لبا کرتے چلے جائیں گے اور اس میں انقطاع نہیں آنے دیں گے حتیٰ کہ دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں

سے غافل ہو جائیں گی۔ حاملہ عورتوں کے صل ساقط ہو جائیں گے۔ بچے بوڑھے ہو جائیں گے (ان کے بال سفید ہو جائیں گے) اور شیطانی گھبراہٹ کے سبب بھانگیں لگیں گے حتیٰ کہ وہ بھاگتے بھاگتے اطراف میں (کناروں تک) آتی ہیں گے۔ وہاں ان کی ملاقات مانگندے سے ہو جائے گی۔ وہ انہیں چروں پر ضرب لگائیں گے تو یہ داہیں لوٹ آئیں گے اور لوگ بھی پتھریں پھیر کر بھاگ رہے ہونگے اور آپس میں ایک دوسرے کو پکار پکار کر کہہ رہے ہوں گے یہ وہی دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التعداد فرمایا ہے۔ اللہ ریث۔

بعض نے کہا ہے کہ یوم التعداد سے مراد قیامت کا دن ہے، جبکہ تمام لوگوں کو ان کے پیشوا اور امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔ ابو نعیم نے ابو حازم الراعی کا بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا اے اعرج! قیامت کے دن ندا دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو! جاؤ تو تو ان کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہوجائے گا۔ پھر آواز دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو! جاؤ (یہ گناہ پھیلنے گناہ کے علاوہ دوسرا ہوگا) تو تو ان کے ساتھ بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ اے اعرج! آپس میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو ہر قسم کے گناہ کرنے والوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ابن ابی عاصم نے انسؓ میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا اے اللہ تعالیٰ کے حریفو! اٹھ کھڑے ہو (1)۔ اس سے مراد فرقہ قدریہ والے ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دیتے ہیں اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حریف اور مقابل قرار پائے (اس وقت اہل جنت اہل جہنم کو ندا دیں گے اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے اور اصحاب الاعراف بھی پکاریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ اعراف میں بیان کیا ہے۔ اس وقت سعادت و شقاوت کے ساتھ لوگوں کو بلایا جائے گا کہ فلاں بن فلاں ایسا خوش بخت اور سعادتمند بن چکا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ شقی اور بد بخت نہیں ہوگا اور فلاں بن فلاں ایسا بد بخت اور شقی بن گیا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ خوش بخت اور سعادتمند نہیں ہوگا۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ابن آدم کو لایا جائے گا اور اسے میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہو تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے ندا دے گا کہ ساری مخلوق اسے سن لے گی کہ فلاں ایسا سعادتمند ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی شقی نہیں ہوگا اور اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا نکلا تو وہ فرشتہ بلند آواز سے پکارے گا فلاں ایسا بد بخت اور شقی ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ سعادتمند نہیں ہوگا اور اس کی یہ آواز ساری مخلوق سے گئی (2) اور اس وقت یہ ندا بھی دی جائے گی کہ میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور ایک نسب اور رشتہ تم نے مقرر کیا تھا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ندا دینے والے کو حکم دے گا اور وہ یہ ندا دے گا خبردار! میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور تم نے دوسرا نسب مقرر کیا تھا آپس میں نے تو یہ مقرر کیا تھا کہ جو تم میں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوگا اتنا وہ زیادہ معزز اور قابل تکریم ہوگا۔ لیکن تم نے اس کا انکار کیا۔ اور تم نے یہ کہا کہ فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ آج میں اپنے مقرر کردہ نسب اور رشتے کو بلند کرنے لگا ہوں اور تمہارے مقرر کردہ نسب کو پست کرنے لگا ہوں۔ (لہذا اللہ تعالیٰ فرمائے گا) متقی اور پرہیزگار

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ الْبَيْتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّى
 إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ نَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ
 مُسْرِفٌ مُذْتَابٍ ﴿١٠٠﴾ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَنٍ إِلَهُمْ كَبِيرٌ مَقْتًا
 عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُنْكَرٍ وَجِبَارٍ ﴿١٠١﴾

(اے میری قوم!) بیشک آئے تمہارے پاس یوسف (موسیٰ علیہا السلام) سے پہلے روشن دلائل لے کر پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لے کر آئے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ نہیں بھیجے گا اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول۔ یونہی گمراہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہوتا ہے۔ (یونہی گمراہ کرتا ہے) انہیں جو جھگڑتے رہتے ہیں اللہ کی آیاتوں میں بغیر کسی (معتقول) دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو۔ (یہ طریقہ) بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک۔ اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر مغرور (اور سرکش) دل پر۔

۱۔ آیت میں یوسف سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں اور یہ تب مراد ہو سکتے ہیں، جبکہ آپ کے زمانے کا فرعون وہی ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون تھا، اور وہ اسے طویل زمانے تک زندہ رہا (کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین تقریباً چار سو سال کی مدت کا قاصد تھا)۔ یا پھر اس بناء پر آپ مراد ہو سکتے ہیں کہ آیا اجداد کے احوال کی نسبت اولاد کی طرف کر دی جاتی ہے اور مخصوص یہ ہو کہ تمہارے آیا و اجداد کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام واضح معجزات لے کر آئے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یوسف سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے پوتے یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام ہیں، انہیں ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

بِالْبَيْتِ - واضح معجزات لے کر۔ پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لیکر آئے تھے۔ عما جا حکم بہ کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دین کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کرتے ہوئے وعدہ لاشریک رب کی عبادت کرنے کا جو پیغام لے کر آئے تھے یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا، یعنی تم اپنے نفس پر ہی قائم رہے اور یہ گمان کرنے لگے کہ اللہ کوئی اور رسول بھیج کر تم پر تجدیدِ حجت نہیں کرے گا۔

كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ اِی گمراہ کرنے کی طرح اللہ تعالیٰ اسے گناہوں میں پڑے رہنے دیتا ہے جو حد سے بڑھنے والا ہوتا ہے، یعنی شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور شک کرنے والا ہوتا ہے، یعنی غلبہ وہم اور تقلید میں متہمک ہونے کی وجہ سے ان امور میں شک کرنے لگتا ہے جن کے سچا ہونے کی شہادت واضح دلائل اور معجزات پیش کرتے ہیں۔

۱۰۰۔ ترکیب کلام میں الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ پہلے موصول من سے بدل ہے کیونکہ وہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ بغیر سلطان کا معنی ہے بغیر واضح دلائل اور حجت کے یعنی (یونہی گمراہ کرتا ہے) اللہ تعالیٰ انہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں بغیر کسی ایسی واضح دلیل اور حجت کے کھسقلد یا بے بنیاد شہادت کی بناء پر جھگڑتے رہتے ہیں جو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہو۔

۱۰۱۔ كَبِيرٌ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ میں کبیر کی ضمیر فاعل من موصول کی طرف لوٹ رہی ہے اور لفظ من کا لفظ نکرہ رکھتے ہوئے کبیر فعل مفرد ذکر کیا گیا

ہے۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اَلَّذِينَ يُجَادِلُونَ نَحْنُ مُبْتَدِئُوهُمُ اور کبر مقتدا اس کی خبر ہو اور الذین سے پہلے مضاف محذوف ہو اور اسی کے لحاظ سے کبر فعل مفرد ذکر کیا گیا ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو جو جدال الذین یجادلون فی اہلث اللہ کبر مقتدا۔ یا یہ ترکیب ممکن ہے کہ اَلَّذِينَ يُجَادِلُونَ مُبْتَدِئُوهُمُ اور اس کی خبر بغیر سلطان ہو اور کبر کا فاعل کذلک ہو۔ اس طرح ککاف ہم بمعنی مثل ہو، یعنی کبر مقتدا مثل ذالک الجدال۔ اس صورت میں قول باری تعالیٰ یطیع اللہ جملہ مستنافہ ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ جملہ ان کے آیات الہی میں جھڑنے کے سبب پر دلالت کر رہا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ان طرح انہیں گمراہ کرنے کی مثل اللہ تعالیٰ ہر مغرور اور سرکش دل پر گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے اور اسے اس طرح گمراہی میں پختہ کر دیتا ہے کہ کہیں سے بھی نور ایمان دل میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ابو عمرو اور ابن ذکوان نے قلب کو تئوین کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ تکرر اور تکریم اس کی صفات ہیں کیونکہ یہ دونوں دل ہی کے افعال ہیں۔ جیسا کہ ان کے قول روایات عینی و سمعت اذنی (میری آنکھ نے دیکھا اور میرے کان نے سنا) (اس میں دیکھا اور سنا آکھ اور کان کے افعال ہیں) کا پھر اس وجہ سے کہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے علی قلب کل ذی قلب متکبر حیار (یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس آدمی کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کا دل مغرور اور سرکش ہو) باقیوں نے قلب کو اضافت کے ساتھ بغیر تئوین کے پڑھا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يُبَاهِنُ ابْنِ بَنِي صَرَْحًا نَعْنَى اَبْلَغُ الْاَسْبَابِ ۝ اَسْبَابِ السَّلْوَاتِ فَاطْلَعٌ اِلَى الْاَمْوَسِ وَ اِنِّي لَا ظَنُّهُ كَاذِبًا ۝ وَ كَذَلِكَ رَزَيْنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءَ عَمَلِهِمْ وَ صَدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۝ ۱۰ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِي تَبَابٍ ۝

”اور فرعون نے کہا اے ماہان! اپنا میرے لیے ایک اونچا نعل (اس پر چڑھ کر) میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں، یعنی آسمانوں کی راہوں تک پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے خدا کو۔ اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور یوں آراستہ کر دیا گیا فرعون کیلئے اس کا برا عمل اور روک دیا گیا اسے راہ (راست) سے۔ اور نہیں تھا فرعون کا سارا فریب مگر اس کی اپنی تباہی کیلئے۔“

۱۰ فرعون نے اپنے وزیر بامان سے کہا میرے لیے اتنا اونچا اور بلند نعل بنا دو جو کسی دور سے دیکھنے والے پر بھی غلطی نہ ہو۔ اسی اعتبار سے تفسیر معنی اظہار ہے (اس پر چڑھ کر) میں آسمانوں کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ اَسْبَابِ السَّلْوَاتِ سے مراد وہ راہیں اور دروازے ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ ہر وہ شے جو کسی دوسری شے تک پہنچانے کا ذریعہ ہو وہ سب کہلاتی ہے مظاہر سی اور ڈول پانی تک پہنچنے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے پانی کا سبب کہلاتے ہیں۔ دوسرے اسباب پہلے کیلئے بیان ہے پہلے اسباب کو ہم ذکر کیا پھر اس کی وضاحت فرمائی ایک تو ایسے تاکہ اس کی شہم شان کا بیان ہو اور دوسرا ایسے تاکہ سماع کو اس کی معرفت اور پہچان کا شوق دلا یا جائے۔

فاطلع کو حنص نے اصل کا جواب ہونے کی وجہ سے فاء کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے ابلغ پر عطف کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ پھر میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ اس میں ظاہر یہی ہے کہ فرعون نے بھی غرور کی طرح کا نعل بنانے کا حکم دیا اور اس کا ذکر ہم سورہ نمل میں کر چکے ہیں۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ شاید اس نے کسی بلند مقام پر ایک رصدگاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا ہو جس سے وہ ان ستاروں کے احوال کا مشاہدہ کر سکتے جو کہ اسباب سماویہ ہیں اور زمینی حوادث پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ کیا یہ اسباب سماویہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف بھیجا ہے (1)۔ یا پھر اس سے وہ لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول غلط ہے کیونکہ آسمان کے الہ کی جانب سے خبر دینا اس پر اطلاع پانے اور اس تک پہنچنے پر موقوف ہے (یعنی جو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وہ ہی اس کے حکم پر مطلع ہوگا اور پھر اسکی خبر دے گا) اور اس تک پہنچنا آسمانوں پر چڑھے بغیر ممکن نہیں اور انسان آسمان کی بلند یوں میں چڑھنے کی قوت اور قدرت نہیں رکھتا (اس سے یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دے رہے ہیں وہ سب من گھڑت اور غلط ہے) لیکن فرعون کی یہ ساری گفتگو اور مکر جہالت پر مبنی تھی کیونکہ نہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان سے واقف تھا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی کوئی کیسے بناتا ہے (اور اس تک وہ اپنے احکام کیسے پہنچاتا ہے؟)

۱۔ اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ موسیٰ اپنے دعویٰ رسالت میں جھوٹا ہے اور جس طرح آسمانوں کے رب پر واقفیت اور اطلاع پانے کیلئے اونچی اور بلند و بالا اہل کی تعمیر کو فرعون کی نظروں میں حسین بنا دیا گیا اسی طرح اس کے ہر برے عمل کیلئے مزین کر دیا گیا۔ یعنی ہر وہ برائے عمل جسے عقل سلیم قبول کرنے کیلئے کبھی بھی تیار نہیں وہ فرعون کو حسین اور خوبصورت لگنے لگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بصیرت کو ختم کر دیا تھا جس کے سبب وہ ہر برے عمل کو خوبصورت دیکھنے لگا اور اسے سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔

اہل کفر اور یعقوب نے صلہ کو صیغہ جمول کی صورت میں صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور باقیوں نے صاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ یعنی فرعون نے لوگوں کو اس قسم کے شبہات اور مکر و فریب سے راہ ہدایت سے روک دیا اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے و ما کید فرعون الا فی صیاب کہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل اور ناکام کرنے کیلئے فرعون کی ہر تدبیر اور مکر بیکار ثابت ہوا اور اس کے لیے خسارے اور ضیاع کا سبب بنی۔

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَقُولُ وَالتَّبَعُونَ أَهْدَيْتُمْ سَبِيلَ الرِّشَاوَةِ ۖ يَقُولُ وَ إِنَّمَا هِيَ
الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۖ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَامَةُ الْقَرَامِ ۖ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا
يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْشَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

”اور کہنے لگا وہ جو ایمان لایا تھا اسے میری قوم! میرے پیچھے چلو میں دکھاؤں گا تمہیں ہدایت کی راہ!۔ اسے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو (چند روزہ) لطف اندوزی ہے۔ اور آخرت ہی ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ جو برے کام کرتا ہے سزا دی جائے گی اسی قدر۔ اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو وہ داخل ہونگے جنت میں رزق دیا جائے گا انہیں وہاں بے حساب سے۔“

۱۔ اور کہنے لگا وہ جو اہل فرعون میں سے ایمان لایا تھا اسے میری قوم! میرے پیچھے چلو۔ التبعون کو ان کثیر نے حالت وصل اور وقف

دونوں میں اثبات یاہ کے ساتھ اتبعونی پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں اثبات یاہ کے ساتھ قرأت کی ہے، جبکہ باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاہ کو حذف کیا ہے اور اتبعون پڑھا ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ سے مراد ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے جو راہ راست اپنا رکھا ہے وہ گمراہی کا راستہ ہے (وہ راہ ہدایت نہیں۔)

اسے میری قوم (یہ دنیوی زندگی تو چند روزہ) لطف اندوزی ہے۔ یعنی یہ ایک حقیر اور تھوڑا سا سامان ہے جس سے انتہائی قابل مدت کیلئے لوگ لطف اندوز اور متعجب ہو سکتے ہیں پھر وہ ختم ہو جاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس آخرت ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہو گی لہذا تم پر لازم ہے کہ ایسے اعمال کرو جو آخرت میں تمہارے لیے نفع بخش اور فائدہ مند ہوں۔

جورے کام کہنا ہے اسے اسی قدر سزا دی جائے گی اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو اس میں ایمان کی شرط اسلئے لگائی گئی ہے کیونکہ ہر نیک اور صالح عمل کی جزا کیلئے ایمان بنیادی شرط ہے کیونکہ اعمال کی جزا دینے کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے تاکہ وہ عمل کیسے جائیں جن سے وہ راضی اور خوش ہوتا ہے کیونکہ جب عمل خالص اس کی رضا کیلئے ہوگا تو وہ جزا بھی عطا فرمائے گا۔

پغیر چسپاں کا مفہوم ہے کہ جنت میں انہیں اعمال کا اندازہ لگائے بغیر اور انکا موازنہ کیلئے بغیر رزق دیا جائیگا بلکہ اس رزق میں اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل اور رحمت سے کئی گنا اضافہ فرمادے گا۔

وَيَقُولُ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجْوٰى وَتَدْعُوْنِيْٓ اِلَى الْكُفْرِ
 بِاللّٰهِ وَاَشْرِكُ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ وَاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْعَقٰرِي ۗ لَا
 جَرَءَ مَا تَكْتُمُوْنَ عَلٰى نَبِيِّٓ اِلٰهِيْٓ لَيْسَ لَكَ دَعْوٰةٌ فِى الدُّنْيَا وَاَوْ لٰ فِى الْاٰخِرَةِ وَاَنْ مَّرَدُّهَا
 اِلَى اللّٰهِ وَاَنْ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۗ

”اور اسے میری قوم! میرا بھی عجیب حال ہے کہ میں تو تمہیں دعوت دیتا ہوں نجات کی طرف اور تم بلا تے ہو مجھے آگ کی طرف۔ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ اس کو جس کا مجھے علم تک نہیں۔ اور میرا حال ہے کہ میں پھر بھی تمہیں اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو عزت والا، بہت بخشے والا ہے۔ پس تم بات تو یہ ہے کہ جس کی (بندگی کی) طرف تم مجھے بلا تے ہو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے پکارا جائے اس دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یقیناً ہم سب کو لوٹنا ہے اللہ کی طرف اور یقیناً حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہیں۔“

اسے مالی میں اہل کفر اور ان دنوں ان کے پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ کو مسترح پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تمہارا حال بھی عجیب ہے۔ یہ تمہارے اس جہلے کی مثل ہے مالی اور اکم حزینا یعنی تم مجھے خبر دو تمہارے حالات کیسے ہیں جو عقل و عرف کے تقاضوں کے خلاف ہیں کہ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کے ساتھ ایمان لانے کے سبب آگ سے نجات دلانے کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے اس شریک کی طرف دعوت دیتے ہو جو جہنم کی آگ میں پہنچانے کا سبب ہے۔ انہیں بار بار دعا دی گئی ایک تو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کیلئے انہیں ہدایت دینے کا اہتمام کرنے کیلئے اور اس بات پر انہیں تنبیہ کرنے اور بھڑکے کیلئے کہ وہ اس کی نصیحت اور خیر خواہی کے مقابلے

میں بدخواہی کر رہے ہیں۔ ندائے ثانی کا نداء اول پر عطف نہیں کیا گیا کیونکہ یہ اپنے قائل کا بیان اور تفصیل ہے اور تیسری ندا کا عطف یادوسری پر ہے یا پہلی پر۔

لَا تَدْعُوْنِيْ بِاَلْفِ كَيْفَ يَدْعُوْنَ بِسَمِيْعٍ نَدِ عَوْسِيٍّ سَبِيْلُهُ نَدِ عَوْسِيٍّ سے بدل ہے۔ یا اس کا بیان اور تعلیل ہے۔ دعوائی مصدر ہدایت کی طرح الی اور لام کے واسطے کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

وَ اَشْهَدُكَ بِمَا لَمْ يَسْمَعْ مِنْ يَدِ يَوْمِئِذٍ اور میں اس کے ساتھ اس کو شریک ٹھہراؤں جس کے رب ہونے کا مجھے علم تک نہیں بلکہ اس کے رب نہ ہونے پر میرے پاس قطعی اور یقینی دلائل ہیں۔ ایمان کیلئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے پر دلائل موجود ہوں اور اعتقاد بغیر یقین و یقین کے صحیح نہیں ہوتا۔

العزیز کا معنی ہے غائب جو کہ کفر کرنے والے سے انتقام لینے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہو۔

الغفار۔ اہل ایمان میں سے جسے چاہے اس کے گناہ بخش دے اور الوہیت کی تمام صفات کا جامع ہے، یعنی اس کی قدرت کاملہ ہے، وہ ہر شی کا علم رکھتا ہے اور اس کا ارادہ مطلق ہے (یعنی وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ کوئی شے اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتی)

یعنی کہا گیا ہے کہ لا جو ہمیں لانا فیہ ہے اور تو ہم فرعون جو اس بندہ مومن کو بتوں کی عبادت کی طرف بلاتی تھی اس دعوت کو رد کرنے کیلئے یہ ذکر کیا گیا ہے اور جو ہم فعل بمعنی حق ہے (یعنی حق اور صحیح بات یہ ہے) اور ان اپنے سارے جملے کے ساتھ مل کر فعل کا فاعل ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ یہ حق اور ثابت شدہ بات ہے کہ تمہارے اہل ایمان کی طرف بلا نا دونوں جہان میں اس کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں۔ کیونکہ یہ عبادات ہیں دنیا میں اپنی عبادت کی طرف قطعاً دعوت نہیں دیتے اور نہ آخرت میں دعوت دیں گے بلکہ اپنے پیچاریوں سے برات اور بیزارگی کا اظہار کریں گے تو ان میں کوئی بھی ایسی شے نہیں جو ان کے الہ ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ یعنی یہ ہے کہ یہ بات حق اور ثابت شدہ ہے کہ ان کی دعا کا مقبول نہ ہونا یقینی ہے یا ان کیلئے کسی دعا کا قبول نہ ہونا یقینی ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ یہ بات نہ دنیا میں کسی کیلئے دعا کرتے ہیں نہ آخرت میں کریں گے (1)۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جو ہم فعل ہے اور جرم مصدر سے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے اقطع۔ (قطع کرنا کا نانا) اور لانا فیہ ہے جیسا کہ لا بد میں بد فعل ہے جو تہذیب بمعنی تفریق سے بنایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بتوں کے الہ ہونے کے دعویٰ کے باطل ہونے میں کوئی قطع و انقطاع نہیں۔ یعنی کسی وقت بھی اس دعویٰ کا بطلان منقطع نہیں ہوا پس اس کا معنی یہ بن جائے گا کہ اس کا باطل ہونا ہمیشہ جاری رہا۔ گویا اس میں مابرح اور ازالہ کا معنی پایا گیا۔ نتیجہ اس کا معنی ہوگا تھا یعنی قطعی اور یقینی ہونا، اور قاسوس میں ہے کہ لاجرم کا معنی ہے ضروری ہے حق ہے بالیقین الامحالہ یہ اس لفظ کے اصل معنی ہیں پھر یہی لفظ قسم کے معنی دینے کیلئے استعمال کیا جانے لگا (2)۔ اسی لیے اس کے جواب میں لام واقع ہونا ضروری ہے مٹا کہا جاتا ہے لا جرم لا ینسک (میں بالیقین ضرور تیرے پاس آؤں گے)۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جرم بمعنی کسب ہے اور اس کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے انہیں اس کی طرف دعوت دی مگر انہوں نے اسے اس طرف دعوت نہیں دی (یعنی اس نے تو انہیں اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنے کی طرف دعوت دی، جبکہ انہوں نے اسے شرک کرنے کی جانب بلایا) یعنی ان کے نزدیک اس کی دعوت کا باطل ہونا ایک امر ظاہر ہے۔ اس صورت

میں بھی لانا قیہ ہے اور ان کے دعویٰ کو رد کرنے کیلئے ہی ہوگا۔

اور یقیناً موت کے بعد ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے وہ ہر ایک کو اتنی جڑا و سزا دے گا جس کا وہ مستحق ہوگا اور یقیناً شرک کرنے اور خون بہانے کے سب گمراہی اور سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والے ہی جنہی ہیں وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَسَنَدَكُونُ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَقُولُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٦٠﴾
فَوْقَهُ اللَّهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوا وَإِخَاقُ بِأَلٍ فِرْعَوْنَ سَوْءَ الْعَذَابِ ﴿٦١﴾ أَلَمْ تَرَ يَعْزُومُونَ
عَلَيْهَا عَاوِا وَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ كَذَّبُوا بَعَثْنَا فِيهِمُ اثْنَيْنِ فَتَقَوُّا السَّاعَةَ أَذْجَاوَالِ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿٦٢﴾

”پس (اے میرے ہونٹو!) معترب تم یاد کرو گے جو میں (آج) تمہیں کہہ رہا ہوں۔ اور میں اپنا (سارا) کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔ پس بچالیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان اذیتوں سے جن سے پہنچانے کا انہوں نے حیلہ کیا اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے انہیں دوزخ کی آگ سے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں ہے۔“

ل (اے میرے ہم وطنو!) جو نصیحت آج میں تمہیں کر رہا ہوں یہ معترب تم آپس میں ایک دوسرے کو یاد دلاؤ گے۔ جب عذاب کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر لو گے لیکن اس وقت نصیحت کا یاد کرنا تمہارے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا اور میں تو اپنا سارا کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ مجھے تکلیف اور برائی سے محفوظ رکھے۔ یہ جملہ (یعنی اَقُولُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ) تب کہا تھا جب فرعونیوں کے دین کے ساتھ آپ کی مخالفت بالکل ظاہر اور واضح ہو گئی تو فرعونیوں نے اے آپ کو سزا دینے کی دھمکی دی تھی۔ اہموی میں نافع اور ابو عمرو نے یاد کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کون کون پرے اور کون باطل پر۔ پھر وہ بندہ مومن ان کے درمیان سے نکل گیا۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہ اسے پانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ج. فَوْقَهُ اللَّهُ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف محذوف۔ جملہ پر ہے۔ نقد پر عبارت اس طرح ہے فارا دال فرعون قتلہ ففر منہم فارسل فرعون جماعة لیاخذ وہ فوقہ اللہ۔ کہ تو فرعون نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ ان سے بھاگ نکلا پھر فرعون نے ایک جماعت اسے پکڑ کر لانے کیلئے بھیجی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے ارادہ کیا اور ہر طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو سخت عذاب سے گھیر لیا۔ یہاں تو فرعون کے ساتھ فرعون کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے بارے تو یقین تھا کہ عذاب کا سب سے زیادہ مستحق وہی تھا، سَوْءَ الْعَذَابِ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انہیں عرق کیا گیا اور آخرت میں انہیں جہنم میں ڈال دیا گیا۔

بعض نے کہا ہے حاق فرعون بال فرعون سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو سخت عذاب نے گھیر لیا جنہیں فرعون نے اس بندہ مومن کو تلاش کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ اس صورت میں سوء العذاب سے مراد قتل ہے کیونکہ جب وہ عبد مومن بھاگ کر پہاڑ کی طرف چلا گیا تو اس جماعت سے اس کا تعاقب کیا اور اسے نماز پڑھنے میں مشغول پایا اور کیا دیکھا کہ جنگی درندے اس کے ارد گرد گھوم رہے تھے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر وہ مرعوب ہو گئے اور وہاں لوٹ آئے تو فرعون نے ان تمام کو قتل کر دیا۔

سے اَلْأَنْفِ يُعْرَفُونَ الا یہ جملہ مستانفہ ہے یا النار مبتدا مخدوف کی خبر ہے۔ اور یغرضون بیان اور وضاحت کیلئے جملہ مستانفہ ہے یا پھر اَلْأَنْفِ سَوَاءٌ لَعْنَةُ اَبٍ سے بدل ہے اور یغرضون اسی سے حال ہے یا ال فرعون سے حال ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل فرعون کی ارواح سیاہ رنگ کے پرندوں کے پیڑوں میں داخل کر کے ہر روز دوسرے تپہ آگ پر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ صبح و شام آگ (جنم) کی طرف جاتے ہیں اور انہیں کہا جاتا ہے اے آل فرعون! تمہارا ٹھکانہ ہے جب قیامت قائم ہو جائے گی (1)۔ اسے عبد الرزاق اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

مقالہ سدی اور کبھی نے کہا ہے ہر کافر کی روح صبح و شام دوزخ پر پیش کی جاتی ہے جب تک یہ دنیا قائم ہے (2) یعنی قیامت قائم ہونے تک ایسا ہی ہوتا رہے گا اور اس کی تائید صحیحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی فوت ہوتا ہے تو اس پر اس کا ٹھکانہ صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہو تو اہل جنت کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اگر وہ اہل نار میں سے ہو تو اہل دوزخ کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اسے یہ کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسی پر تجھے اٹھائے گا (3)۔

اس آیت میں نفس (روح) کے باقی رہنے اور عذاب قبر ہونے پر استدلال موجود ہے۔ معتقد احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے اور اسی پر اجماع بھی مشفقہ ہوا ہے۔

سے ابن کثیر ابو عمرو و ابن عامر اور ابو بکر نے ادخلوں میں ہمزہ وصل اور خاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ادخلوا کہ انہیں کہا جائے گا۔ اے آل فرعون! تم شدید ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ۔ بانہوں نے ہمزہ کو قطعی اور خاء کو کسور پڑھا ہے، یعنی ادخال سے ادخلوا۔ کہ ملائکہ کو کہا جائے گا کہ آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اَلْأَنْفِ لَعْنَةُ اَبٍ سے مراد طرح طرح کا عذاب ہے جو کہ اس عذاب سے مختلف ہوگا جو انہیں عالم برزخ میں غرق کیئے جانے کے وقت سے دیا جا رہا ہے (4)۔

وَ اِذْ يَبْحَثُونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضَّعْفُو الَّذِي نِ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا
فَهَلْ اَنْتُمْ مُعْتَدُونَ عَمَّا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِي نِ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا كُنَّا
فِيهَا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝

” (اور کہتا ہوش رہا ماں ہوگا) جب باہم جھگڑیں گے دوزخ میں پس کہیں گے کہ زور لوگ انہیں جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے پس کیا تم دور کر سکتے ہو ہم سے کچھ حصہ آگ (کے عذاب) کا۔ جواب دیں گے منکر، تم سب آگ میں (جہنم رہے) ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے بندوں کے متعلق (اب اس میں دور بدل نہیں ہو سکتا)۔“
اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی قوم کے سامنے اس وقت کا تذکرہ کیجئے جبکہ اہل نار جنم میں باہم جھگڑا کریں گے۔ ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ ظرف (واو یتحاجون) کا عطف غلوا پر ہو۔ پس کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کیا کرتے تھے

2- تفسیر بنوی، جلد 6، صفحہ 81 (اتھریہ)

1- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 659 (اطہریہ)

4- تفسیر بنوی، جلد 6، صفحہ 81 (اتھریہ)

3- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 385 (قدیمی)

کہ دنیا میں ہم تو تمہارے تابع تھے۔ تبع واحد بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی کہ اس کا واحد تابع ہے جیسا کہ خدم، خادم کی جمع ہے۔ یہ اہل بصرہ کا موقف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اتباع کرنے والے یعنی ذوی تبع یعنی اتباع۔ گو ایسا سے پہلے مضاف مضر ہے یا مضاف کو مضر ماننا جائز ہے۔

اہل کوفہ نے کہا ہے کہ تبع جمع ہے جس کا واحد نہیں آتا البتہ اسکی جمع اتباع ہے (1)۔

پس کیا تم آگ (کے عذاب) کا کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو؟ اس میں استفہام بمعنی امر ہے اور نصیباً یا تو اس کا مفعول ہے جس پر معنون دلالت کر رہا ہے یا معنون کا مفعول ہے یا پھر مصدر ہے اور اس کا استعمال اسی طرح ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ لَنْ يُغْنِي عَنْكُمْ آئَاتُ اللَّهِ وَلَا تَأْوَدُكُمْ فِيهِ اللَّهُ شَهِيدًا مِّنْ شَيْئًا كَمَا اسْتَمَالَ بِهِ۔ پس اس صورت میں یہ معنون کا صلہ ہو جائیگا۔

عکبر کرنے والے جواب دیں گے کہ ہم سب یعنی ہم اور تم میں سے ہر ایک آگ میں جمل رہا ہے پس ہم کیسے تم سے عذاب دور کر سکتے ہیں اگر ہم ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تو بائیں اپنے آپ سے دور کرتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے بندوں کے متعلق ان میں سے اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے دوزخ میں داخل ہونے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں اب کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور نہ اس میں اب کوئی رد و بدل ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِوَ حَدَّثْنَا أَن نَّجِيَّكُمْ أَدْعُوا رَبَّكُمْ يَحْقِيقُ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۖ قَالُوا أَوْلَمْ نَكُ تَابِعِينَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ قَالُوا فَاذْعُوا وَمَا دَعَا الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ۝۴

”اور کہیں گے سارے دوزخ میں جنم کے داروں کو دعائے کر دینے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ) تخفیف فرمادے۔ وہ (جواب میں) کہیں گے کیا نہیں آیا کرتے تھے تمہارے پاس تمہارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ۔ وہ کہیں گے بیشک! داروئے کہیں گے تم خود ہی دعائے گمراہی اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے کافروں کی دعائے مگر محض بے سود۔“

۱۔ جب اہل جہنم پر عذاب کی شدت بڑھے گی تو اس وقت وہ جہنم کے داروں سے کہیں گے کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے عذاب میں کسی ایک دن تو کچھ تخفیف فرمادے۔ ضمیر کی جگہ جہنم کا لفظ صراحتاً ذکر کیا گیا تاکہ ہر شہوت اور خوف میں اور اضافہ ہو۔

۲۔ جہنم کے داروئے جواب میں کہیں گے کیا تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر نہیں آیا کرتے تھے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انہیں اس بات پر زجر و توبیح کرنے کیلئے ہے کہ انہوں نے دعا کے اوقات ضائع کر دیئے اور قبولیت دعا کے اسباب کھود دیئے۔ ترکیبی لحاظ سے اس کا مطلق محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اما علمتم فی الدنيا مال محکم فی الاخرة من العذاب ولم تک تاتیکم درسلکم بالبینات منفرین بعد کیا تم دنیا میں نہیں جانتے تھے کہ جو عذاب تمہیں آخرت میں ملے گا اور تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر ڈرانے کیلئے نہیں آتے رہے تو وہ جواب دیں گے کیوں نہیں۔ بلکہ ہمارے پاس رسول خوشخبری سنانے اور ڈرانے کیلئے آتے رہے تو جہنم کے داروئے کہیں گے تم خود ہی دعائے گمراہی اور بطور استہزا وہ انہیں یہ کہیں گے کیونکہ اس سے مقصود انہیں مایوس اور ناامید کرنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کافروں کی دعائیں ہوتی مگر محض بے سود اور بیکار۔ یعنی وہ کبھی

بھی قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ وَصَادُّنَا لَكُمْ قَوْمٌ بَنِي آلِ قَسْبٍ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ جنم کے داروں کے کلام میں ہو۔ اس بناء پر حال ہوگا یا جملہ محترضہ ہوگا۔

إِنَّا لَنَنْصُرُكُمْ سَلْمًا وَالْيَمِينَ أَمْنًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الرَّسْمُ ۗ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْرِفَتُهُمْ وَلَهُمُ النَّعْتَةُ ۗ وَلَهُمْ سَوْءُ الدَّارِ ۗ (۱۷) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْشَقْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۗ هُدًىٰ وَذِكْرًا لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

”جینک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی دینے کے لئے) کھڑے ہوں گے۔ ا۔ اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذرخواہی اور ان کیلئے لعنت ہوگی۔ اور ان کیلئے (دوزخ کا) بدترین گھر ہوگا۔ اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو (نور) ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا۔ جو سراپا ہدایت اور نصیحت تھی محظموں کیلئے۔“

۱۔ اس سے قبل فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی مدد کرنے اور انہیں فرعون پر غلبہ عطا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد اب بالعموم رسل علیہم السلام اور مومنین کی مدد کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے (کہ چونکہ وہ ہماری مدد نصرت کا استحقاق رکھتے ہیں لہذا ہم بھی انہیں اس سے محروم نہیں رکھتے) چنانچہ فرمایا إِنَّا لَنَنْصُرُكُمْ سَلْمًا الْاٰیِدِہ۔ ضحاک نے کہا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس مدد سے مراد دلائل اور حجت ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد غلبہ عطا فرمانا ہے (1)۔ علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بطور آ زمانہ و امتحان کفار کو بھی غلبہ عطا کیا گیا ہے لیکن اس سے اس آیت کا خلاف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اعتباراً انجام اور امر غالب کا ہوتا ہے (2) (اور انجام کار کے اعتبار سے ہمیشہ ہی انبیاء و رسل علیہم السلام کو غالب فرمایا گیا) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس مدد سے مراد انبیاء علیہم السلام کے دشمنوں سے دنیا میں ہی انتقام لینا ہے (کہ جس نے بھی نبی علیہ السلام سے عداوت اپنائی وہ اس کی سزا سے محفوظ نہ رہے گا۔)

وَيَوْمَ يَقُومُ الرِّسْمُ ۗ وَالشَّاهِدَاتُ ۗ سے مراد قیامت کا دن ہے یعنی قیامت کے دن کرنا کا تین فرشتے رسل علیہم السلام کے حق میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کیا (بیانات الہی اپنی اپنی امتوں تک پہنچائے) اور کفار کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور انہیں خوب جھٹلایا۔

۲۔ اس دن ظالموں (کافروں) کو ان کی عذرخواہی باطل ہونے کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ترکیب کلام میں وَيَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْرِفَتُهُمْ سے بدل ہے۔ ابن کثیر، ابوعمر و دار ابن عامر نے لانتفع قرأت کی ہے کیونکہ اس کا فاعل (معدن تمہم) موث ہے اور باقیوں نے لا ینفع پڑھا ہے ایک تو اس لئے کہ فاعل موث غیر حقیقی ہے اور ساتھ ہی فاعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی موجود ہے۔ وَذِكْرًا لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ کیلئے لعنت ہوگی یعنی رحمت سے بہت دوری ہوگی ترکیب کلام میں یہ اظہار میں سے حال ہے۔ اور ان کیلئے دوزخ کا بدترین گھر ہوگا۔

۳۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا الْاٰیِدِہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے ہے اور درمیان میں مذکورہ بالا بیان بطور جملہ محترضہ تھا اور ہم نے موسیٰ

علیہ السلام کو وہ کتاب ہدایت (توریت) عطا فرمائی جس سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ آپ کو یہ کتاب فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک اور تباہ و برباد کرنے کے بعد عطا کی گئی اور پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو توریت کا وارث بنا دیا۔ عقلمندوں کی ہدایت اور نصیحت کیلئے (یا پھر صدر بمعنی اسم فاعل ہے) یعنی ہدی بمعنی حاد یا اور ذری بمعنی مذکر ہے۔ یعنی وہ کتاب معمول سلیر رکھنے والوں کو ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی تھی۔

قَاصِدُونَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرُ لِدُنْكَ وَاَسْتَغْفِرُ لِحَسْبِكَ بِالسَّيِّئِ وَالْاَبْكَارِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيَاتِ اللّٰهِ بِعِيْرِ سُلْطٰنِ اَنْتُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبٰلِغِيْهِ فَاَسْعُدْ بِاللّٰهِ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾

”پس (اے محبوب!) آپ ممبر فرمائیے (کفار کی اذیتوں پر) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرتے رہئے اپنی (موہومہ) کوتاہیوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے شام کے وقت اور صبح کے وقت ۱۔ بیشک جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی سند کے جو ان کے پاس آئی ہو، انہیں ہے ان کے سینوں میں ججز۔ بڑائی کی ایک ہوں کے جس کو وہ پانچ نہیں کہیں گے۔ تو آپ اللہ کی پناہ طلب کیجئے۔ بیشک وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔“

۱۔ پس اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ شکر کین کی اذیتوں پر ممبر فرمائیے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ حق اور سچ ہے۔ قطعاً وعدہ خلافی کا کوئی احتمال اور امکان نہیں اور اس پر بطور استشہاد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ آپ اپنی موہومہ کوتاہیوں پر استغفار کرتے رہئے یہ امر تعجبی ہے بالیقین اس کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب و درجات میں اضافہ ہوگا (یعنی باوجود اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطا ہیں جب آپ حکم استغفار کی تعمیل میں استغفار کریں تو اس کے سبب آپ کے درجات بلند ہوں گے مراتب قرب میں اضافہ ہوگا) اور اس کے ساتھ امت کیلئے ایک سنت بھی قائم ہو جائے گی۔

اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے۔ یعنی اپنے رب کا شکر بجالانے کیلئے نماز پڑھئے۔ شام کے وقت اور صبح کے وقت۔ پانچویں و (۱۰) جگہ کے بارے میں سن لے کہا ہے اس سے مراد عصر اور صبح کی نمازیں ہیں اور حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد پانچوں نمازیں ہیں (۱)۔

۲۔ بیشک جو لوگ بغیر ایسی سند اور حجت کے قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہو۔ ان کے سینوں میں نہیں ہے مگر بڑائی کی ہوں۔ یہاں سینے سے مراد دل ہے۔ کیونکہ دل سینے میں ہی ہوتا ہے اور سینہ بدل کا محل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ انہیں آپ کی تکذیب پر کوئی شے برا بھیجتے نہیں کرتی مگر وہی بڑائی اور عظمت کا تصور جو ان کے سینوں یعنی دلوں میں موجود ہے (۲)۔ یعنی وہ اپنے آپ کو آپ سے بڑا خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عظیم اور برتر سمجھتے ہیں اس لئے وہ آپ کی اتباع کیلئے تیار نہیں ہوئے۔

دجال دائیں آنکھ سے کانٹا ہوگا۔ اس کی دائیں آنکھ پر گھور کی طرح ٹیٹ پھولا ہوگا۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی نبی نہیں گزرا مگر اس نے اپنی امت کو کانے کذاب سے ڈرایا ہے۔ خرد راز انبیا خوب جان لو کہ وہ کانٹا ہوگا اور تمہارے رب کی قدرت کی آنکھ میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کھفر لکھا ہوگا۔ متفق علیہ (2)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں دجال کے بارے میں کچھ باتیں نہ بتا دوں؟ کیونکہ ہر نبی نے اپنی امت کو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتایا ہے۔ بیٹک دہکا ہوگا اور وہ جنت اور دوزخ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ پس جسے وہ لے گا کہ یہ جنت ہے حقیقت میں وہ دوزخ ہوگی، میں تمہیں اس کے فتنے سے اس طرح ڈراتا ہوں جیسے نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیٹک دجال ظاہر ہوگا اور اس کے ساتھ پانی اور آگ دونوں ہوں گے۔ پس وہ شے جسے لوگ پانی گمان کر رہے ہوں گے فی الحقیقت وہ جلانے والی آگ ہوگی اور جسے لوگ آگ دیکھ رہے ہوں گے وہ حقیقت میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہوگا۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں گر جائے جسے وہ آگ کی صورت میں دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے۔ متفق علیہ (4)۔ اور مسلم شریف میں یہ زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ نہیں ہوگی بلکہ اس کی جگہ پر ایک موٹا ناخن ہوگا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوا ہوگا اور ہر مومن اسے پڑھ لے گا چاہے وہ خود لکھتا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو (5)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال بائیں آنکھ سے کانٹا ہوگا اس کے بال ٹھنڈے پالے ہوں گے۔ اس کے ساتھ اس کی جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی۔ پس جو اس کی دوزخ ہوگی وہ حقیقت میں جنت ہوگی اور جو اس کی جنت ہوگی وہ حقیقت میں دوزخ ہوگی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت نواس بن سمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر وہ میرے تم میں موجود ہونے کی حالت میں ظاہر ہوا تو پھر میں تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کروں گا اور اگر وہ میرے چلے جانے کے بعد ظاہر ہوا تو آدھی اپنی مقابلہ خود کرے گا اور اللہ تعالیٰ میری طرف سے ہر مسلمان کا مددگار اور معاون ہوگا۔ دجال ایک ذلیل و لیدہ نوجوان ہوگا اس کی آنکھ میں پھولا ہوگا جس سے عبد العزیٰ بن قطف کے مشابہ قرار دیتا ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پائے تو سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ کر اس پر دم کرے کیونکہ یہ آیات دجال کے فتنے سے بچاؤ کا سبب بن جائیں گی۔ اس کا خروج شام اور عراق کے درمیان سبزہ زار میں ہوگا۔ وہ اپنے دائیں بائیں فساد اور تباہی برپا کر دے گا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنی دیر تک زمین میں ٹھہرے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس دن۔ ان میں ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا ایک دن ایک مہینہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتے کے مساوی ہوگا اور بقیہ تمام دن تمہارے ان عام دنوں کی طرح ہی ہوں گے تو ہم نے عرض کی وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہی ہمارے لیے کافی ہو جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ

1- مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 472 (قدیمی) 2- صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 400 (قدیمی) 3- صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 400 (قدیمی) 4- صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 400 (قدیمی) 5- صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 400 (قدیمی) 6- صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 400 (قدیمی)

اوقات کا اندازہ لگا لینا (یعنی ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہوں گی۔ یہ طویل حدیث ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (1)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں ظاہر ہوگا تو اہل ایمان میں سے ایک آدمی اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے دجال کے مسلح افرادی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس سے پوچھیں گے تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو وہ جواب دے گا میں اسے پاس جانے کا قصد کرتا ہوں جس نے خروج کیا ہے تو وہ مسلح افراد سے کہیں گے کیا تو ہمارے رب کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا ہمارے رب سے کوئی شے مخفی نہیں ہے تو وہ کہیں گے اسے قتل کر دو۔ لیکن انھی میں سے کوئی کہے گا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس سے منع کیا ہے تم اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کرو۔ پس وہ اسے دجال کے پاس لے کر چلے جائیں گے تو جب بندہ مومن اسے دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا اے لوگو! یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا یہ سن کر دجال اسے توڑ دینے کا حکم دے گا اور کہے گا اے بچہ لو اور اسے پھاڑ ڈالو۔ چنانچہ (بترے اور تلوار میں مار مار کر) اس کی پیٹھ اور پیٹ کو پھاڑ دیا جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو اب بھی میرے ساتھ ایمان نہیں لائے گا؟ تو وہ بندہ مومن اسے جواب دے گا تو میں مسخ دجال اور کذاب ہے تو اس وقت دجال کی طرف سے یہ حکم دیا جائیگا کہ اسے سر کی چوٹی سے لے کر ٹانگوں کے درمیان تک آری کے ساتھ دو حصوں میں چیر ڈالا جائے۔ پھر دجال اس کے دونوں ٹکڑوں کے پاس چل کر آئے گا اور کھڑے ہو کر کہے گا کھڑا ہو جا۔ چنانچہ وہ آدمی بیدھا کھڑا ہو جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو میرے ساتھ ایمان لے آئے گا؟ تو وہ بندہ مومن جواب دے گا تیرے بارے میں میری بصیرت تو بڑھ گئی ہے۔ پھر وہ بندہ مومن کہے گا اے لوگو! میرے بعد یہ کسی سے بھی ایسا نہیں کر سکے گا۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال اسے ذبح کرنے کیلئے پھر پکڑ لے گا لیکن اللہ تعالیٰ اس کی گردن کی جڑ سے لیکر ہتلی تک ساری گردن کو تاننا دے گا۔ پس وہ اسے ذبح کرنے میں قطعاً کامیاب نہیں ہوگا۔ پھر وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں پکڑ کر اسے آگ میں پھینک دے گا۔ لوگ یہ گمان کر رہے ہونگے کہ دجال نے اسے آگ میں پھینک دیا ہے حالانکہ فی الحقیقت جنت میں پہنچا ہے تو رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا رب العالمین کے نزدیک یہ آدمی سب سے عظیم اور بڑا شہید ہوگا اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصفہا کے یہودیوں سے ستر ہزار افراد دجال کی اتباع اور بیروی کریں گے۔ وہ اپنے اوپر شاپانہ قیمتی چادریں اوڑھے ہوں گے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال آئے گا مگر مدینہ طیبہ کی گھائیوں میں داخل ہونا اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔ لہذا وہ مدینہ طیبہ سے ماتحت ریگستانی شوریلے علاقے میں اترے گا۔ پس لوگوں میں سے سب سے اچھا یا ایک بہترین انسان اس کی طرف نکل کر جائے گا تو وہ جا کر اسے کہے گا کہ میں شہادت دیتا ہوں تو وہی دجال ہے جس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا ہے۔ دجال کہے گا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں اسے قتل کر کے پھرا سے نہ نہ کروں تو کیا تم میرے معاملے میں کوئی شک کرو گے؟ لوگ کہیں گے ہرگز نہیں۔ چنانچہ وہ اسے قتل کر دے گا اور پھر زندہ کر دے گا تو عبد بن جراح اس وقت بیکار تھا کہ حکم بخدا اچھے تیرے بارے میں آج سے بڑھ کر بھی کبھی بھی بصیرت حاصل نہیں ہوئی۔ پس دجال یہ سن کر اسے بجا رہا قتل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس پر غالب نہیں آسکے گا۔ متفق علیہ (4)۔

2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 3-402 (قدیمی)۔

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 401 (قدیمی)۔

4- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 253 (قدیمی)۔

3- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 405 (قدیمی)۔

حضرت ابو بکرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبح وصال کا رعب مدینہ طیبہ میں داخل نہیں ہوگا۔ اس وقت مدینہ طیبہ کے سات دروازے ہو گئے اور ہر دروازے پر دو فرشتے مقرر ہو گئے۔ (متفق علیہ) 1۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ارشاد فرمایا وصال سرزمین شرق سے ظاہر ہوگا جسے خراسان کہا جاتا ہے، اس کے پیچھے کئی اقوام ہوں گی جن کے چہرے کوئی ہوئی (چھٹی) ڈھالوں کی مثل ہو گئے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وصال زمین پر چالیس سال تک ٹھہرا ہے گا۔ اس کا ایک سال (اپنے مختصر اور بے برکت ہونے کے سبب) ایک مہینہ کی مثل ہوگا اور ایک مہینہ ایک ہفتہ کی مثل ہوگا اور ایک ہفتہ ایک دن کی مانند ہوگا اور ایک دن کھجور کی ایک ٹہنی کے آگ میں گر کر رمل جانے کی مثل ہوگا (یعنی جتنا قلیل وقت اس ٹہنی کے جلنے میں لگتا ہے، اتنے قلیل وقت کا ایک دن ہوگا) اسے علامہ بخوی نے شرح السنۃ اور معالم میں بیان کیا ہے (3)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ستر ہزار افراد وصال کی اتباع کریں گے اور وہ تاج پہننے ہوئے ہوں گے (اس ارشاد میں شاید امت سے مراد امت دعوت ہے) اسے علامہ بخوی نے شرح السنۃ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس وقت وصال کی اتباع کرنے والے ستر ہزار یہودی ہوں گے جو تاج پہننے ہوئے اور طواریں سجائے ہوئے ہوں گے۔ (رواہ البخوی 4)۔

حضرت اسماء بنت یزید الانصاری رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں جلوہ افروز تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا بیشک اس کے سامنے تین سال ایسے آئیں گے کہ ایک سال میں آسمان اپنی بارش کا تیسرا حصہ روک لے گا اور زمین نباتات کا تیسرا حصہ روک لے گی (یعنی اس میں سبزہ تیسرا حصہ کم اگے گا) دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش کو روک لے گا اور زمین دو تہائی نباتات کو روک لے گی اور تیسرے سال آسمان مکمل طور پر بارش کو روک لے گا اور زمین مکمل طور پر نباتات کو روک لے گی (یعنی زمین سے کوئی شے نہیں اگے گی) اور ہر طرف فحشاء سانی پھیل جائے گی۔ تینتہ کوئی کھروں اور ڈانڈوں والا جانور باقی نہیں رہے گا وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے اور وصال کے فتنوں میں سے شدید ترین فتنہ یہ ہوگا کہ وہ ایک امرابی کے پاس آ کر کہے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر میں تیرے لیے تیرے اونٹوں کو زندہ کروں تو تو یقین نہیں کرے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ جواب دے گا کہ کیوں نہیں۔ پس وصال شیطانوں کو اونٹوں کی شکلوں میں اس کے سامنے کر دے گا۔ جن کے منہ انتہائی حسین اور کوہا نہیں بڑی بڑی ہوں گی۔ مزید فرمایا ایک ایسا آدمی آئے گا جس کا بھائی اور باپ مر چکے ہوں گے تو وصال اس سے کہے گا تیرا کیا خیال ہے اگر میں تیرے بھائی اور باپ کو زندہ کروں تو تو مجھے اپنا رب تسلیم کر لے گا؟ تو وہ آدمی جواب دے گا کیوں نہیں۔ پس وہ شیطانوں کو اس کے بھائی اور باپ کی شکل میں اسکے سامنے کر دے گا۔ آپ فرماتی ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کی غرض سے باہر تشریف لے گئے۔ پھر وہیں تشریف لائے تو جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے متعلق بتایا تھا اس کے سبب قوم انتہائی غم و اندوہ میں مبتلا ہو گئی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ارشاد فرمایا

2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 47-46 (ناروتی)

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 253 (قدیمی)

4۔ تفسیر بخوی، جلد 6، صفحہ 84 (انجاریہ)

3۔ تفسیر بخوی، جلد 6، صفحہ 83 (انجاریہ)

اسے اسماہ! کیا بات ہے کیوں پریشان ہیں؟ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجال کا ذکر سن کر ہمارے دل باہر نکلے جا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری ظاہری حیات میں اس کا خروج ہوگا تو میں اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میری جگہ ہر مومن کا نگہبان میرا رب ہوگا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم پیٹک ہم آنا گوندھتے ہیں اور ابھی اس کی روٹیاں پکانے نہیں پاتے کہ بھوکے ہو جاتے ہیں تو اس دن مومنوں کا حال کیا ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تسبیح خداوندی ان کے لیے بھی کافی ہوگی جو اہل آسمان کیلئے کافی ہوتی ہے (1)۔ رواہ احمد و ابو نعیم فی العالم۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کسی نے بھی مجال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا۔ وہ مجھے کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔ میں نے عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ روٹی کا پہاڑ اور پانی کا دریا اس کے ساتھ ساتھ ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ پر اس کی نسبت بہت آسان ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ یہ چیزیں رکھنے کی ضرورت ہی نہیں) متفق علیہ (2) جب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں ارشاد فرمایا وَلَٰكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) تو آگے آنے والی آیت میں اس پر متنبہ کیا کہ جاہل اندھے کی طرح ہوتا ہے اور عالم صاحب بصارت (دیکھنے والے) کی طرح ہوتا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا
الْمُسِيءُ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٥﴾ إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنْ
أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَهْتَمُونَ ﴿٥٦﴾

”اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا۔ اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں۔ تم بہت کم غور کرتے ہو۔ لہذا یقیناً قیامت آ کر رہے گی ذرا شک نہیں ہے اس میں لیکن بہت سے لوگ (قیامت پر) ایمان نہیں لاتے۔“

۱۔ جاہل اور عالم، نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کیلئے ایک ایسے عمل کا ہونا ضروری ہے جس میں ان کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر ہو۔ دنیا میں تو ان کے مابین کوئی تفاوت محسوس نہیں ہوتا البتہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد وہ فرق ضرور ظاہر ہوگا، وَلَا يُسْتَوِي الْمُسِيءُ وَالصَّالِحُ مِلًّا لَّا زَادَ لَهُ۔ کیونکہ مقصود نیکوکار سے اسکی مساوات کی نفی ہے۔ کیونکہ اس کیلئے تو ثواب اور عزت و کرامت ہوگی۔ اور دوسرے حرف عطف کے بعد اسم موصول (الذین) اپنے معطوفات سے مل کر الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ پر معطوف ہے اور عطف سے مقصود دونوں معطوفوں میں تقابری پائے جانے کا اظہار ہے۔ یا صراحة اور تمثیلاً دو متغایر معطوفوں پر دلالت کرتا ہے۔

تم بہت کم غور کرتے ہو۔ اس میں یا تو قلیل، اذ کو ا کی صفت ہے۔ یعنی تذکر قلیلاً، یا قلیلاً زمانا کی صفت ہے یعنی زمانا قلیلاً تم تھوڑی دیر کیلئے سمجھتے ہو۔ تذکر و کو کوئیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یا تو مخاطب کو غلبہ دیتے ہوئے یا طریقہ التفات پر یا خطاب کے سبب رسول علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے اور باقیوں نے اسے یا ء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ آیات کی ابتدا اور آخر میں غیبی قوم کے بارے خبر ہے اور اس جمع کی ضمیر الناس یا الکفار کی جانب لوٹ رہی ہے۔

۲۔ اس میں ذرا شک نہیں ہے یقیناً قیامت آ کر رہے گی یہاں تک کہ نیکوکار اور بدکار کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر ہو جائے گا۔ اس

کے آنے میں ذرا ٹھک نہیں کیونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اس کا خلاف ہونا محال اور ناممکن ہے لیکن بہت سے لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنی غفلت، بدبختی اور محسوسات میں کم غور و فکر کرنے کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق نہیں کرتے اور اسے سچا تسلیم نہیں کرتے۔

وَقَالَ رَبُّنَا اِذْ عَوْفَىٰ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي
سَيَذَرُوكُمْ خُلُوفَ جَهَنَّمَ ذُخْرِيْنَ ۝۱

”اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بیشک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ مغرب جہنم میں داخل ہونگے ذلیل و خوار ہو کر۔“

ل اد عوفی میں یا کوہن کثرت سے متعجب پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ تم میری ہی عبادت کرو میرے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ چونکہ عبادت کو دعا سے تعبیر کیا گیا ہے اسی لیے استجیبکم کے لکل میں استجب لکم فرمایا۔ (یعنی میں تمہیں ثواب دوں گا کی بجائے فرمایا میں تمہاری دعا قبول کروں گا) اور اس بات پر قرینہ کہ دعا سے مراد عبادت ہے اور قبول کرنے سے مراد ثواب دینا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَذَرُوكُمْ خُلُوفَ جَهَنَّمَ ذُخْرِيْنَ۔ یعنی جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ مغرب جہنم میں داخل ہو کر جہنم میں داخل ہونگے۔

ابن کثیر، ابو جعفر اور ابو بکر نے سَيَذَرُوكُمْ خُلُوفَ جَهَنَّمَ کے ساتھ اور خوار ہو کر نکلنے کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ اور خوار ہونے کو ضمہ کے ساتھ مینہ معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ دعا اور عبادت دونوں سے مراد سوال ہے۔ کیونکہ ہندہ ہر شے مانگنے اور اس کے بارے سوال کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونا ہے اور کسی بھی شے کیلئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہ کرنا ہی کمال عبودیت ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کو بے نیاز تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو اس کا محتاج قرار دینے کا اظہار ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے بعض لوگ اپنی تمام تر حاجات و ضروریات کے متعلق اپنے رب سے سوال کرتے ہیں حتیٰ کہ جب ان کے جوئے کا تمہ کوٹ جائے تو ان کا سوال بھی اپنے رب ہی سے کرتے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ اور حضرت ثابت بن ابی کثیر نے روایت میں یہ الفاظ لائے ہیں یہاں تک کہ وہ نمک کا سوال بھی اپنے رب سے کرتے ہیں اور جب کسی کے جوئے کا تمہ کٹ جائے تو وہ بھی اپنے رب سے ہی مانگتے ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا ہی عبادت ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت طیبہ پڑھی اِذْ عَوْفَىٰ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَذَرُوكُمْ خُلُوفَ جَهَنَّمَ ذُخْرِيْنَ (2) اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی مسانید میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں، حاکم نے مستدرک میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت نعمان بن بشیر سے بھی حدیث نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی پر یہ فرماتے سنا اگے مذکور حدیث ہی بیان کی (3)۔ حضور نبی کریم

1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 200 (فاروقی)

2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی)

3- مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 22 (دارالاج)

زاہدوں کے ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ دعا نہ کرنا اور کچھ نہ مانگنا افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور رضا بالتصا کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔

اور کیا گروہ نے یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کیلئے کرے تو پھر اچھا ہے اور اگر صرف اپنے لئے ہی دعا کرے تو یہ اچھا نہیں۔ ہمارا موقف کتاب اللہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے ثابت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی شے بھی قابل تکرم نہیں (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور حاکم نے بھی بیان کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا (2)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کے بارے سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ سے پسند کرتا ہے کہ اس سے کچھ سوال کیا جائے اور افضل ترین عبادت کشائش کا انتظار ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب اور ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے (4)۔ اسے ترمذی ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ ان احادیث سے مقصود یہ ہے کہ جو کوئی تکبر اور غرور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگتا تو اللہ تعالیٰ اس پر غضب و ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے: **إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِئِهِ لَشَكُورٌ مُّبِينٌ** (عن عبادتہ لیسئلہم ما لم یؤتوا بہم ذلک یخبرون۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا کرنے میں بجز (ضعف اور کمزوری) کا اظہار نہ کرو کیونکہ دعا کے ہوتے ہوئے کوئی بھی گریز ہلاک نہیں ہوگا (5)۔ اسے ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دعا مومن کا بھیاں ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے (6)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جن کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کیلئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور جس چیز کے بارے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جاتا ہے ان میں اس کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ اس سے عاقبت کے بارے سوال کیا جائے (7)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں اسے بیان کیا ہے اس میں الفاظ اس طرح ہیں کہ اس کیلئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

فصل :- یہ فصل اس بیان میں ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اس کیلئے قبولیت دعا کا وعدہ ہے۔ حضرت ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کیلئے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے (8)۔ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سلمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 2- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 3- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 197 (فاروقی)

4- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 5- صحیح ابن حبان، جلد 3، صفحہ 153 (موسسہ اہلسنت)

6- مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 472 (العصر) 7- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 193 (فاروقی) 8- مستدرک ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 22 (دارالمنج)

بیشک تمہارا رب بڑے حیاء والا اور بڑا کریم و دینی ہے۔ اسے اپنے بندے سے حیاء آتی ہے کہ جب بندہ اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے (1)۔ اسے ترمذی ابو داؤد اور نسائی نے الدعوات الکبیر میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی مسلمان اپنے رب سے دعا مانگتا ہے درآئیں گے نہ اس میں گناہ ہو اور اس میں کوئی قطع تعلقی ہو تو اللہ تعالیٰ تین چیزوں میں سے ایک اسے ضرور عطا فرمادیتا ہے۔ یا تو اس کی دعا جلدی پوری فرمادیتا ہے۔ یا اسے آخرت میں اس کیلئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ یا پھر اس دعا کی مثل اس سے کسی برائی اور شر کو دور فرما دیتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتنی زیادہ دعائیں ہم کیوں نہ کریں (جب بھی ہمارے لئے یہ معاوضہ ہوگا؟) تو آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے پاس سب سے زیادہ ہے اور ضرور عطا فرمائے گا (2)۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندے کی دعا قبول کرنی جاتی ہے جبکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے نہ ہو اور بندہ جلدی کا خواہشمند نہ ہو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلبت پسندی کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بندہ کہتا ہے میں نے دعا کی ہے میں نے دعا کی بار بار دعا کی لیکن مجھے اس کی قبولیت کے آثار نہیں دکھائی دیئے۔ پس اس وقت وہ تھک جاتا ہے اور دعا مانگتا پھوڑ دیتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا (ان مصائب کو دور کرنے میں) نفع بخش ثابت ہوتی ہے جو دعا سے نفس نازل ہو چکی ہوتی ہیں اور ان کے بارے بھی جو ابھی نازل نہیں ہو چکی ہو تو بس (بلکہ بعد میں امکان ہوتا ہے) پس اسے اللہ تعالیٰ کے بندو! تم پر لازم ہے کہ دعا مانگو (4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے ورواہ احمد بن معاذ بن جبل اور ترمذی نے حضرت جابرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرمادیتا ہے جو وہ مانگتا ہے یا وہ اس کی مثل برائی اور شر اس سے دور فرمادیتا ہے۔ شرطیکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے دعا نہ کرے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (5)۔

فصل :- یہ فیصل ان کے بیان میں ہے جن کی دعا رد نہیں کی جاتی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین (آدمیوں کی) دعائیں مقبول ہوتی ہیں ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ والد کی دعا مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا (6)۔ اسے ترمذی ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کی دعا رد نہیں کی جاتی ایک روزے دار کی دعا، جبکہ وہ روزہ افطار کرتا ہے۔ دوسرا عادل حکمران کی دعا اور تیسرا مظلوم کی دعا۔ مظلوم کی دعا بدعا ہادلوں سے اور پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند ہو جاتی ہے اس کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب کریم فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ضرور یہ ضرور تیری مدد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ رواہ الترمذی (7)۔

حضرت ابو داؤد اور احمد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان آدمی کی اپنے مسلمان بھائی کی عدم

- 1- سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 403 (البرہ)
- 2- مجمع الزوائد، حدیث: 17210 (الفرق)
- 3- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 352 (قدیمی)
- 4- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 193 (فاروقی)
- 5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 174 (فاروقی)
- 6- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 182 (فاروقی)
- 7- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 199 (فاروقی)

موجودگی میں اس کیلئے دعا مقبول ہوتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے بھائی کیلئے بھلائی اور خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے سر کے پاس موجود مقبرہ فرشتہ اس دعا پر کہتا ہے امین و لک بمعطہ (یعنی تیرے بھائی کے حق میں بھی یہ دعا قبول ہو اور تیرے حق میں بھی یہی قبول ہو جائے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ آدمیوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ایک مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ غالب آ جائے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ اہل آ جائے۔ مریض کی دعا یہاں تک کہ شفا یاب ہو جائے۔ ایک بھائی کی دوسرے مسلمان بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں دعا۔ پھر فرمایا تمام دعاؤں کی نسبت زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی یہی بھائی کی دعا ہے جو دوسرے بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے (2)۔ اسے بیہقی نے دعوت الکیبر میں نقل کیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی دعا ایک بھائی کی دوسرے غالب بھائی کیلئے کی جانے والی دعا ہے (3)۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔
فصل :- یہ فصل دعا کی قبولیت کی شرائط کے بیان میں ہے 1۔ اس میں بنیادی چیز کھانے پینے اور لباس میں حرام چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جو کہ انسان کا کھانا پینا اور لباس حلال، طیب اور طاہر ہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیگ ایک آدمی طویل سفر کرتا ہے۔ اس کے بال پر اگندہ ہوتے ہیں (جسم) غبار آلود ہوتا ہے وہ آسمان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے یا رب یا رب اسے میرے رب اسے میرے پروردگار حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے اس کا پینا حرام ہے اس کا لباس حرام ہے اور حرام سے ہی اس نے پرورش پائی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔

2۔ دعا کے وقت حضور قلب بھی شرط ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو درآنحائیکہ تمہیں اس کی قبولیت ہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے مانگی جانے والی دعا قبول نہیں فرماتا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے (5)۔

3۔ تیسری شرط یہ ہے کہ دعا خوب عزم اور کوشش کے ساتھ کی جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ بلکہ پورے عزم کے ساتھ اور انتہائی رنجت کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے جو عطا فرماتا ہے وہ چیز اس کے نزدیک کوئی بڑی نہیں ہوتی۔ رواہ مسلم (6)۔
فصل :- یہ فصل دعا کے آداب اور سنن کے بیان میں ہے۔

حضرت فضالہ بن عبید بیان فرماتے ہیں کہ اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد میں) تشریف فرما تھے۔ اس نے میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز ادا کی۔ اور یہ دعا مانگی اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ چکے اور بیٹھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح حمد و ثناء بیان کر جس کے وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پاک پڑھ پھر دعا مانگ۔ راوی فرماتے ہیں پھر اس کے بعد ایک دوسرا آدمی آیا۔ پس اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان

1۔ صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 352 (تقدیمی) 2۔ مشکوٰۃ الصالحہ صفحہ 196 (تقدیمی) 3۔ سنن ابی داؤد جلد 5 صفحہ 446 (ارشاد)
4۔ صحیح مسلم جلد 1 صفحہ 326 (تقدیمی) 5۔ جامع ترمذی جلد 2 صفحہ 186 (فاروقی) 6۔ صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 342 (تقدیمی)

کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: اے نمازی اب دعا مانگ۔ تیری دعا قبول کی جائے گی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ اسی طرح سے ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا (اس حال میں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ بھی تشریف فرما تھے۔ پس جب نماز پڑھ کر بیٹھ گیا۔ تو میں نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا پھر اپنے لئے دعا کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اب مانگ تجھے عطا کیا جائے گا۔ رواہ الترمذی (2)۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے آپ فرماتے ہیں کہ دعا زمین و آسمان کے درمیان ہی موقوف ہو جاتی ہے۔ اس میں سے کوئی شے بھی اوپر نہیں جڑھتی جب تک کہ تو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت مالک بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو دعا مانگو تو اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کی پٹھیں ظاہر کر کے نہ مانگو (4) اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے۔ سَلُّوْا اللّٰهَ بِطُنُوْنِ اَكْفُفِكُمْ وَلَا تَسْلُوْهُ بِظُهُوْدِهَا فَاِذَا فَرَعْتُمْ فَاَمْسِكُوْا بِهَا وَجُوْهَكُمْ۔ اپنی ہتھیلیوں کے باطن (یعنی اندرونی حصہ) کو پھیلا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کے پشتوں کے سب کچھ نہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (5)۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ دعا کیلئے بلند کرتے تھے تو انہیں اپنے چہرہ مقدس پر پھیرے بغیر نیچے نہیں رکھتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیلئے جامع الفاظ پسند فرماتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر الفاظ چھوڑ دیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد (7)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ اتنے بلند فرماتے تھے کہ آپ کی ہتھیلیوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی تھی (8)۔

حضرت سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا فرماتے تو اپنے دست مبارک کو بلند کرتے تھے پھر اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے تھے (9)۔ اسے ترمذی نے الدعوات الکبریٰ میں نقل کیا ہے۔ حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا دعا کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھ اپنے کندھوں یا ان کے قریب تک بلند کرے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (10)۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تمہارا ہاتھوں کو بلند کرنا بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے (یعنی سے) زیادہ اپنے دست مبارک بلند نہیں کئے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے (11)۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا ذکر کرتے اور اس کیلئے دعا مانگتے تو دعا کا آغاز اپنے

- | | | |
|--|---|--|
| 1- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 186 (فاروقی) | 2- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 76 (فاروقی) | 3- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 64 (فاروقی) |
| 4- سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 401 (ارشاد) | 5- سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 399 (ارشاد) | |
| 6- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 174 (فاروقی) | 7- سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 397 (ارشاد) | 8- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 140 (قدیمی) |
| 9- مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی) | 10- سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 403 (ارشاد) | 11- مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی) |

آپ سے فرماتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے (1)۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهَا وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَكَدُوفُضِّلٍ عَلَى
النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿١٠﴾ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ أَلَا إِلَهَ
إِلَّا هُوَ ۗ فَاَن تَوَفَّقُونَ ﴿١١﴾ كَذَلِكَ يُؤْفِكُ الَّذِينَ كَانُوا يَابِلِينَ ۗ اللَّهُ يَجْحَدُونَ ﴿١٢﴾

”اللہ ہی ہے جس نے بتائی ہے تمہارے لئے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور (بتایا ہے) دن کو روشن۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل (و کرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ (اس کی نعمتوں کا) شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ ہے اللہ تمہارا رب پیدا کرنے والا ہر چیز کا۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے۔ پس کیسے راہ حق سے تم روگردانی کرتے ہو۔ اسی طرح (راہ حق سے) منہ پھیر دیا جاتا ہے ان (بد نصیبوں) کا جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ج۔“

لِتَسْكُنُوا فِيهَا یہ تو تمہاری رات کے وقت نیند کے سبب راحت و سکون حاصل کرو اور النَّهَارَ مُبْصِرًا کا معنی ہے دن کو روشن بنایا۔ یعنی دن کے وقت ہر جانب دیکھا جاسکتا ہے (رات کے اندھیرے اور تاریکیوں کا نور ہو جاتی ہیں) ابصار کی نسبت دن کی طرف مجازی ہے اور مبالغہ کیلئے ہے۔ اسی لئے علت بیان کرتے وقت اس سے عدول کیا گیا اور فرمایا إِنَّ اللَّهَ لَكَدُوفُضِّلٍ بیشک اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے۔

لَا يَشْكُرُونَ لیکن اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اس لئے کہ وہ منہ حقیقی کی معرفت سے جاہل ہیں اور وہ نعمتوں کی اہمیت اور مواقع اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی عظمت سے غافل ہیں اور اناس کا لفظ دو بار اس لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کفران نعمت انہی کے ساتھ مختص ہے۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو کفران نعمت کرتے ہیں اور شکر بجا نہیں لاتے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ كَفَّارٌ ﴿١٠﴾۔

ترکیب کلام میں جملہ اللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ قول باری تعالیٰ هو الذی یوئیکم ایاتہ کے ساتھ متصل ہے۔ اسم جلال لفظ اللّٰھ مبتدا ہے اور الذی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہے۔ یا اسم جلال خبر مبتدا اللّٰھ ذوف کی ہے اور اسم موصول اسم جلال کی صفت ہے۔

ج۔ ذلکم ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے مابعد کلام خبر ہے۔ وہ ذات جس کے ساتھ وہ تمام افعال خاص ہیں جو اولویت و ربوبیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی تمہارا رب نہیں۔ وہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے چاہے وہ جوار ہو یا اعراض اور بندوں کے افعال۔ اس کے سوا کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو ان صفات میں سے کسی سے متصف ہو جو اس کی اولیت کا تقاضا کرتی ہوں اور مستوجب عبادت ہو۔ پھر کیسے تم اللہ تعالیٰ کی عبادت سے دوسروں کی عبادت کی طرف روگردانی کرتے ہو۔ یہ چاروں کی چاروں اخبارتزدادہ ہیں۔ جیسے کفار مکہ کا منہ پھیر دیا گیا اسی طرح راہ حق سے ان بد نصیبوں کا منہ پھیر دیا جاتا ہے جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۗ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ

بعض نے کہا ہے کہ الحمد للہ الخ سے پہلے قائلین محذوف ہے۔ یعنی یہ جملہ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ فرمائے کہا ہے کہ یہ جملہ خبر ہے اور اس میں او مضمرب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فادعوه و قولوا الحمد لله رب العالمین۔ (پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور کہو اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ) (1)۔

مجاہد نے حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ جو آدمی یہ کہے لا الہ الا اللہ تو اسے چاہئے کہ اس کے بعد یہ کہے الحمد للہ رب العالمین۔ پس یہی مفہوم رب کریم کے اس ارشاد کا ہے۔ فَادْعُوهُمْ مُخْلِصِينَ لَهُمُ النَّيْمَانَ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (2)۔ واللہ اعلم۔ جو میر نے حضرت ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیع نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس سے رجوع کر لیں اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر کار بند رہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (3)۔

قُلْ اِنِّي نُهَيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاءَنِ الْوَيْبُ مِنْ رَبِّيْ وَاَمَرْتُ اَنْ اُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ تَرَابٍ ثُمَّ مِنْ طَفْءٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُوْا اَسْءَدَكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا سِيُوْخًا ۝ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَكَّلُ مِنْ قَبْلِ وَّلِيْتَلُوْا اَجْلًا مَّسِيًّا ۝ وَعَلَيْكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْجِيْ وَيُيَسِّئُ ۝ فَاِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَاِنَّا لَنَعُوْلُ لَكَ اِنْ فَيَسُوْنُ ۝

”آپ فرمادیجئے کہ مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا (میں ان کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں) جب آگئی ہیں میرے پاس دلیلیں اپنے رب کی طرف سے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تسلیم تم کروں رب العالمین کے سامنے، اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر گوشت کے ٹوکھڑے سے پھر نکالا تمہیں (شکل مادر سے) بچہ بنا کر پھر (پرورش کی تمہاری) تاکہ تم پہنچو اپنی جوانی کو پھر (تمہیں زندہ رکھا) تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ، اور بعض تم میں سے فوت ہو جاتے ہیں پہلے ہی اور (یہ سارا نظام اس لئے ہے) کہ تم پہنچ جاؤ مقررہ معاد تک اور تاکہ تم (اپنے رب کی عظمتوں کو) سمجھنے لگ جاؤ، وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے اسے کہ ہو جاؤ وہ کام ہو جاتا ہے۔“

۱۔ لَمَّا جَاءَنِ الْوَيْبُ مِنْ رَبِّي۔ جبکہ میرے پاس اپنے رب کی طرف سے ایسی دلیلیں اور نشانیاں آگئی ہیں جو اول عقلیہ کے سبب قوی اور مستند ہوں اور وہ میرا اللہ کی عبادت کرنے سے روکتی ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے سامنے تسلیم تم کروں یعنی اسی کی اطاعت کروں اور اپنے دین کو اسی کیلئے خالص کروں۔

۲۔ طِفْلًا اطفال جمع کے معنی میں ہے اور مفرد ذکر کر کے مراد جنس لی گئی ہے۔ یا پھر تاویل عبارت اس طرح ہے۔ یعنی جو حکم کل واحد منکم طفلًا۔ (پھر تم جس سے ہر ایک کو حکم مادر سے بچہ بنا کر نکالا۔ لیتلغووا فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے تم بے یقینکم لتلغوا۔ (پھر تمہیں زندہ باقی رکھا تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ) اور لَمَّا يَتَكُوْنُوْا سِيُوْخًا میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس کا عطف لتلغوا پر کرتا بھی جائز ہے۔

نافع ابومرؤ حفص اور ہشام نے شیوخ میں کئی مضموم پڑھا ہے اور ہاتھوں نے شین کو کسور پڑھا ہے۔

اس اور تم میں سے بعض بڑھا ہے یا جوانی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے تاکہ تم مقررہ میعاد تک پہنچ جاؤ۔ یعنی اس معین وقت تک پہنچ جاؤ جس سے آگے وہ تمہارا وجود نہیں کر سکیں گے۔ اس سے مراد موت تک حیاتِ دنیویہ کی مدت ہے اور تاکہ تم سمجھ لو ان دلائلِ قدرت اور نشاناتِ عبرت کو جو اس میں موجود ہیں۔

یہ، لَوْ اَنَّ اَقْصَىٰ ہنس جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے صرف اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اسے اس کام کے کرنے کیلئے کسی نوع کی تکلیف اٹھانے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ فاذا میں فاء اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ یہ کلام سابقہ کلام کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کہ وہ کلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ذاتی ہے وہ کسی ساز و سامان، مواد اور تعداد کی محتاج نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادُوْنَ بَعْضَ آيَاتِ اللّٰهِ ۗ اَنْ يُّصْرَفُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِالْكِتٰبِ وَ بَنٰۤاۤ اٰمْرًا سَلْمًاۙ بِهٖۤ اٰمْرًا سَلْمًاۙ فَسَوْفَ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲﴾ اِذْ اَلَا غُلَّ فِيْ
اَعْنَاقِهِمُ وَالسَّلْسِلُ يُسْحَبُوْنَ ﴿۳﴾ فِي الْحَمِيْمِ ﴿۴﴾ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۵﴾

”کیا تم نہیں دیکھتے ان (نادانوں) کی طرف جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں یہ کہاں تک رہے ہیں۔ ۱۔ جن لوگوں نے جھگڑا یا اس کتاب کو اور اس چیز کو بھی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ انہیں (اپنی تکذیب کا انجام) معلوم ہو جاتا ہے گا۔ جب طوق ان کی گردنوں میں ہو گئے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائیگا کھولتے ہوئے پانی میں۔ پھر روزِ خ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔“

۱۔ کیا تم ان نادانوں کی طرف نہیں دیکھتے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہیں یا پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے طریقہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اس آیت میں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکارا ثبات اور تقرر ہوتا ہے اور اس میں اظہارِ تعجب مقصود ہے۔

آئی بھٹہ صُرْفُوْنَ یہ کہاں تک رہے ہیں یعنی یہ کیسے حق سے بھیر دیئے گئے ہیں۔ یہ استفہام زجر و توبیخ کیلئے ہے، جھگڑا کرنے والوں کا دوبارہ ذکر جلالہ اور جھگڑنے کی مذمت میں تاکہ یاد کیلئے کیا گیا ہے۔ یا پھر اس وجہ سے کہ جھگڑا کرنے والے باوجود مسائل جن میں جھگڑا کیا جاتا ہے وہ متعدد ہیں (اسی لئے ذکر بھی متعدد بار کیا گیا)

محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ پہلے آیت مشرکین کے بارے میں تھی اور یہ آیت قدریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ الایہ جن لوگوں نے اس کتاب کو جھگڑا یا اور ان شریعتوں کی تکذیب کی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ آیت الَّذِيْنَ يُجَادُوْنَ سے بدل ہے۔ پس اگر اس سے مراد فرقہ قدریہ جو کہ اس امت کے بخوبی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کتاب و سنت سے ثابت ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں مثلاً یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق ہے وہی غیر شر اور جو اہر و امراض کو پیدا کرنے والا ہے وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے وہ جس کیلئے چاہتا ہے اسکے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں سے جو چاہے ان کی مغفرت فرماتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے

اور جو ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس پر کوئی شے واجب اور لازم نہیں ہے۔ وہ جو کرتا ہے اس کے بارے اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی حالانکہ دوسروں سے باز پرس کی جائے گی فرقہ قدریہ ان تمام چیزوں کی تکذیب کرتا ہے علاوہ ازیں وہ پل صراط میزان اور شفاعت وغیرہ کے بھی منکر ہیں۔ ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اَلَّذِينَ كَفَرُوا مُبْتَدَاً هُوَ اَوَّلُ مِثْلٍ شَرْطًا كَمَا هُوَ اَوَّلُ اس کی خبر فَسَوْفَ يَجْعَلُونَ ہو۔

السَّلِيلُ مرفوع کا عطف الاغلال پر ہے یا بجر السَّلِيلُ مبتدا ہے اور اس کی خبر یسحبون ہے۔ یعنی جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں یا زنجیروں کے ساتھ انہیں کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ اس میں ضمیر کا مکمل حذف ہے اصل عبادت ہے يُجْعَلُونَ بھما۔ پہلی ترکیب کی صورت میں يُجْعَلُونَ حال ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابوالخز زکی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے وا السلسل کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور يُجْعَلُونَ کو صیغہ معروف کی صورت میں یا م فتح کے ساتھ یسحبون پڑھا ہے اور فرمایا ان پر شدید ترین اور انتہائی سخت تکلیف وہ حالت ہی ہوگی کہ وہ زنجیریں کھینچ رہے ہوں گے (1)۔

پھر انہیں دوزخ کی آگ میں جموںک دیا جائے گا، یعنی جلا دیا جائے گا یسحبون مسجر التصور سے ماخوذ ہے یہ تب کیا جاتا ہے جب کوئی تنور کو ایندھن سے بھرے۔ متاعل نے معنی یہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ آگ بھڑکانی جائے گی اور مجاہد نے کہا ہے وہ آگ کا ایندھن ہو جائیں گے (2) اور مراد یہ ہے کہ انہیں مختلف انواع کا عذاب دیا جائے گا لہذا بعض سے ایک نوع موقوف ہے اور بعض سے دوسری کہ کبھی انہیں کھولتے اٹلتے پانی میں ڈالا جائے گا اور کبھی آگ میں پھینکا جائے گا۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت یسحبون تک تلاوت فرمائی اور فرمایا درآ نکھلیک آپ نے اپنے سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اگر سب سے کا ایک گولہ آسمان سے زمین کی طرف چھوڑا جائے، جبکہ آسمان اور زمین کے مابین پانچ سو برس کی مسافت ہے تو وہ گولہ رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا (یعنی وہ اتنی طویل مسافت چند گھنٹوں میں طے کرے گا) اور اگر دوزخ کی زنجیر کا سرا اور سے چھوڑ دیا جائے تو وہ دن رات چالیس سال تک چلتی رہے تب دوزخ کی یہ انتہائی گہرائی تک جانچنے کی (3) (یعنی دوزخ کی گہرائی زمین و آسمان کی درمیانی پائی جانے والی مسافت کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔)

لَمْ يَتَّيَلَّهِمْ اَيْنَ مَا لَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿٤٠﴾ مِنْ دُونِ اللّٰهِ طَالُوْا صُلُوْا عَنَّا بَلْ لَمْ
تَكُنْ تَدْعُوْا مِنْ قَبْلُ سَيِّئًا ۗ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤١﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنتُمْ
تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَمْرٰٓئِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاٰتٰتُمْ تَسْرَحُوْنَ ﴿٤٢﴾ اُدْحٰوْا اَبْوَابَ
جَهَنَّمَ خٰلِفًاۙ فِيْهَا فَيَسُوْا مَشْوٰى الْمَتَكِبِيْنَ ﴿٤٣﴾

”پھر پوچھا جائے گا ان سے کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے سوا۔ (بعد یاں) کہیں گے وہ تو تم ہو گئے ہم سے بلکہ ہم تو کسی چیز کو پوجتے ہی نہ تھے اس سے پہلے۔ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے کافروں کو۔ یہ (سزا اور

رسوائی) بدلہ ہے اس کا کہ تم خوشیاں منایا کرتے تھے زمین میں (اپنے عارضی اقتدار پر) نالاق اور بدلہ ہے اس کا جو تم (اپنے فانی اموال و املاک پر) اترایا کرتے تھے۔ اب داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں تم وہاں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ پس یہ بہت برا ٹھکانا ہے تکبر و غرور کرنے والوں کا۔“

لَا يَدْخُلُونَ فِيهَا الْعَذَابَ مَا كَانُوا يَمْسُكُونَ۔ وہ ہم سے غائب ہو گئے ہیں پس ہم تو انہیں دیکھی ہی نہیں رہے۔ اپنے احوال کے اپنے ساتھ لٹنے سے پہلے پہلے وہ یہ بات کہیں گے یا پھر اس کا معنی یہ ہے وہ ہم سے ضائع ہو گئے پس ہم ان سے جو توقع رکھتے تھے وہ پوری نہیں ہوئی۔

بَلْ لَمْ يَكُنْ فِيهَا عِزًّا لِّمَنْ عَمِلَ سَاءً ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۚ ان کا صاف انکار کر دیا۔ جب کہ ان کے اس قول میں ہے وَاللَّهُ يَهْتَكُمُ الْكَيْدَ ۚ (قسم بخدا! اے ہمارے رب! ہم شرک کرنے والے نہیں تھے) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ ہم نے اس سے کلمہ کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کی جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتی یا نہ ہم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتی۔ حسن بن فضل نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اس سے پہلے ہم نے کچھ کیا ہی نہیں یعنی ہماری ساری عبادت ضائع ہو گئی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنا کام ضائع کر بیٹھے اور کہے ما کسکت اعمل شئنا کما شئنا تو کچھ کیا ہی نہیں (1)۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مشرک کو یا اس فرقہ کو یہ کو گمراہ کر دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو گمراہ کرتا ہے یہاں تک کہ ان کی ایسی شے کی طرف راہنمائی ہی نہیں کرتا جو ان کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

جس تمہیں گمراہ ہونے کی سزا اس لیے ملی کہ تم زمین میں خوشیاں منایا کرتے تھے، یعنی تم بغیر حق کے شرک کرتے ہوئے اور سرکش بن کر غرور اور تکبر کرتے تھے اور کڑھ کر چلا کرتے تھے اور یہ رسوائی اسی لئے حاصل ہوئی کہ تم زمین میں اقبہار خوشی میں حدود سے تجاوز کرتے تھے اور اپنے فانی اموال و املاک پر اترایا کرتے تھے۔ زجر و توبیح میں مبالغہ کرنے کیلئے اس آیت میں خطاب کی طرف عدول کیا گیا ہے۔

یعنی اب تم جہنم کے ان ساتوں دروازوں میں داخل ہو جاؤ جو تمہارے لیے مقرر کیئے گئے ہیں تمہارے لیے اس میں ہمیشہ رہنا مقدر بنا دیا گیا ہے پس وہ لوگ جو حق سے تکبر کرتے ہیں اور غرور کرتے ہیں ان کے لئے جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ لفظ کلام کا متعنی یہ تھا کہ فہنس مد حل المتکبرین ہوتا۔ (یعنی تکبر کرنے والوں کے داخل ہونے کی جگہ بہت بری ہے) چونکہ جہنم میں دخول غلو کی قید سے مقید ہے اسی لئے یہی اس کا سبب ہے کہ اسے متعنی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَأَصْبُرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ قَالِمَا تُرِيدُكَ بَعْضَ الَّذِي وَعَدْتَهُمْ أَوْ تَوَكَّبْتَهُمْ
فَالَيْتِنَا يُرْجَعُونَ ۙ ۞ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَمِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا
عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۚ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا
بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ۙ ۞

”(اے صبور!) آپ (ان کی نازیبا حرکتوں پر) صبر فرمائیے اللہ کا وعدہ سچا ہے سو ہم خواہ آج دکھا نہیں اس عذاب کا

کچھ حصہ جس کا ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے یا (اس سے پہلے ہی) آپ کو دنیا سے اٹھائیں (یعنی پتھر نہیں سکتے) آخر کار ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ اور ہم نے بھیجے تھے پیغمبر آپ سے پہلے بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا اور ان میں سے بعض کا ذکر (قرآن کریم میں) آپ سے نہیں کیا۔ اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ لے آتا کوئی نشانی اللہ کی اجازت کے بغیر۔ پس جب آئیگا اللہ کا حکم (تو) فیصلہ کر دیا جائیگا حق (و انصاف) کے ساتھ اور باطل پرست وہاں (سراسر) گھٹائے میں رہیں گے۔“

۱۔ اے محمد اصلی اللہ علیہ وسلم شریکین کی ایذا رسانوں پر صبر کیجیے۔ جنگ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمانے اور کفار کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ بالیقین حق ہے اور پورا ہونے والا ہے۔ فاما اصل میں فان ما ہے، ان شرطیہ ہے جو کہ مازائدہ میں مدغم ہے اور مازائدہ شرط میں تاکید پیدا کرنے کیلئے لگایا گیا ہے اسی وجہ سے فعل نوبتک کے ساتھ نون تاکید لقلیہ لگائی گئی ہے۔ نعد ہم جو ہم نے ان کے بارے میں قول اور قید کا وعدہ کر رکھا ہے۔ سو خواہ ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھائیں یا یہ دکھانے سے پہلے ہی آپ کو دنیا سے اٹھائیں۔ آخر قیامت کے دن وہ ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ پس ہم انہیں ان کے اعمال کی سزا ضرور دیں گے (وہ ہم سے پتھر نہیں سکتے) فالینا یو جعون یہ جملہ تنوہینک کا جواب ہے اور اسی کی مثل نوبتک کا جواب محذوف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی جملہ دونوں کا جواب ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر ہم انہیں آپ کی حیات طیبہ میں عذاب دیں یا نہ دیں جنگ ہم انہیں آخرت میں تو شدت پر تین عذاب ضرور دیں گے۔ اس موضوع میں صرف رجوع پر اقتصار کرنا ہی عذاب کی شدت اور سختی پر دلالت کرتا ہے (یعنی فقط) اتنا فرمایا کہ انہیں ہماری طرف ہی لوٹنا یا جائیگا تو یہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان پر عذاب سخت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت انتہائی شدید ہوگی)

۲۔ رسل پر تنوہین بخیر اور تعظیم کیلئے ہے، امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسندوں میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء علیہم السلام کی تعداد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار (انبیاء علیہم السلام تشریف لائے) پھر یہ پوچھا گیا ان میں سے رسل علیہم السلام کتنے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر (۱) ابن حبان نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ ان میں سے ساتیس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔

۳۔ کسی رسول کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ کے بغیر کوئی چیز لے آتا۔ انہیں یہ اختیار قطعاً نہیں کہ ان میں سے کوئی اپنی مرضی اور تجویز کے مطابق کسی چیز اور نشانی کا اظہار کر سکے۔

پس جب اللہ کا حکم آئے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور مومنین کی مدد کی جائے گا اور کفار پر عذاب مسلط کر دیا جائیگا تو وہاں باطل پرست سراسر گھٹائے میں رہیں گے یعنی وہ کفار جو اسے سرکش ہیں کہ اپنی پسند کی نشانیاں طلب کرتے ہیں لیکن معجزات کے سبب ان پر حق واضح اور ظاہر نہیں ہوتا اسے وہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔)

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبَإِغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفَلَاحِ تُصَلُّونَ ﴿٥١﴾
يُرِيكُمْ آيَاتِهِ قَائِمًا أَيَّتَ اللَّهُ شُكْرُونَ ﴿٥٢﴾

”اللہ پاک وہ ہے جس نے ہمارے لیے مویشی تاکہ ان میں سے کسی پر سواری کرو اور کسی کا (گوشت) کھاؤ۔ اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں اور ان میں سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ ان پر سوار ہو کر اس منزل تک پہنچو جو تمہارے سینوں میں ہے اور ان مویشیوں پر اور کشتیوں پر تم لے دو۔ پھرتے ہو۔ اور وہ دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں پس اللہ تعالیٰ کی کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔“

لے کیونکہ جانوروں کی بخشش سے کچھ ایسے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے مثلاً بھیر بکریاں وغیرہ اور بعض ایسے ہیں جن کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور ان پر سواری بھی کی جاتی ہے اور وہ اونٹ اور تیل وغیرہ ہیں یہ جملہ اللہ تعالیٰ الع قول باری تعالیٰ هو الذی یحیی و یمیت سے متصل ہے۔

۵۰۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں مثلاً اون، ہال، کھال اور دودھ وغیرہ اور ان میں ایک فائدہ یہ ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر سفر کرتے ہوئے اس منزل مقصود تک پہنچ جاؤ جو تمہارے سینوں میں ہے۔ و لتبأغو اھا کھانے اور عطف لڑکھو ہے۔ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفَلَاحِ شُكْرُونَ اور خشکی میں ان مویشیوں پر اور سمندر میں کشتیوں پر تم کو سوار کیا جاتا ہے۔ یہاں علی الفلک فرمایا ہے فی الفلک نہیں کہا تو ایسا علیہا کی مناسبت سے کیا گیا ہے اور جب کھانے کا ذکر کیا تو وہاں نظم کلام تبدیل ہوا اور فرمایا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ کیونکہ وہ محض ضرورت کے محل میں ہے اس سے مقصود صرف تعیش اور لذت کا حصول ہوتا ہے۔ جبکہ ان پر سوار ہونے اور سفر کرنے سے مقصود کبھی ایسے وچنی اغراض و مقاصد کا حصول ہوتا ہے جو واجب ہوتے ہیں یا مستحب۔ (پس اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے اسلوب کلام میں بھی فرق رکھا گیا ہے) یا پھر چین (ذات) اور منفعت کے درمیان فرق کرنے کیلئے اسلوب کلام میں تبدیلی کی گئی ہے۔

۵۱۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھاتا ہے جو اس کے وجود، کمال، قدرت اور اسکی بے پایاں رحمت پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔ یہ استفہام انکار پر انکار کیلئے ہے۔ کیونکہ یہ آیات اور نشانیاں اپنی شیر اور واضح ہیں کہ یہ کسی انکار کو قبول ہی نہیں کرتیں، یعنی ان کا انکار کیا ہی نہیں جاسکتا اور وہی فعل ای کو نصب دے رہا ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
كَانُوا أَكْثَرُ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَأُنْزَلُوا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَعْنَى عَنْهُمْ مَّا كَانُوا
يَكْسِبُونَ ﴿٥٣﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُرْسَاهُمْ رَأَوْا إِسْرَارًا مِّنْ عِندِهِمْ وَمِنَ الْعِلْمِ وَمِنَ
حَاقِّ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٥٤﴾

”کیا ان منگروں نے کبھی سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ انہیں نظر آ جاتا کہ کیا انجام ہوا ان (منگروں) کا جو ان

سے پہلے گزرے۔ وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں زبردست تھے اور زمین میں اپنی نشانوں کے لحاظ سے (کنہیں ہنرمند تھے) کہیں یہ بتائیں کہ کیا فائدہ پہنچایا انہیں اس دولت نے جو وہ کماتے تھے۔ پس جب آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو انہوں نے کفر کیا اور نازاں رہے اس علم پر جو ان کے پاس تھا اور (آخر کار) گھیر لیا انہیں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ مِنَ ظُلُمٍ إِلَى نُّورٍ بِإِذْنِهِ فَكَرِهَ الْجَاهِلُونَ لَئِنْ أُخْرِجُوا مِنْهَا قَدَسْتُمْ لَكُمْ وَرَأَيْتُمْ أَنَّ الْعَالَمَ لَهُمْ يَكْفُرُونَ ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْإِنْسَانِ لَإِنَّ شَاءَ النَّفْسِ الْفَاسِقَةِ إِذْ أُخْرِجُوا مِنْهَا قَدَسْتُمْ لَكُمْ وَرَأَيْتُمْ أَنَّ الْعَالَمَ لَهُمْ يَكْفُرُونَ ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْإِنْسَانِ لَإِنَّ شَاءَ النَّفْسِ الْفَاسِقَةِ إِذْ أُخْرِجُوا مِنْهَا قَدَسْتُمْ لَكُمْ وَرَأَيْتُمْ أَنَّ الْعَالَمَ لَهُمْ يَكْفُرُونَ ۚ

یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جسے وہ علم نافع گمان کرتے تھے حالانکہ فی الحقیقت وہ یا تو جہل مرکب تھا جیسا کہ الہیات اور بعض طبیعیات اور ریاضیات کے بارے میں یونانیوں اور دیگر کفار کے اقوال و افکار وغیرہ۔ اسی طرح کفار کا کہہ کر کہیں ہرگز نہ اٹھایا جائے گا اور نہ کوئی عذاب دیا جائے گا۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے اور یہود و نصاریٰ کا یہ کہنا کہ یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۚ

یہاں علم سے مراد وہ ہے جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور اس سے مقصود ان کا امور دنیا کی تدبیر کے بارے میں معرفت رکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۚ وہ ظاہر حیات دنیا کے بارے میں ہی جانتے ہیں اور آخرت کے بارے میں وہ بالکل غافل ہیں۔ پس جب رسل علیہم السلام ان کے پاس دین کے علوم لے کر آئے اور انہوں نے آ کر یہ تعلیم دی کہ دنیا کی طلب میں حسن و جمال اور اعتدال پیدا کرو اور فقط شہوات و خواہشات کی اشباع و پیروی ترک کر دو تو یہ معلومات ان کے علم سے بعد فاصل رکھتی تھیں اسی لئے انہوں نے ان کی طرف توجہ ہی نہ دی، انہیں حقیر سمجھا اور ان سے استہزاء کرنے لگے حتیٰ کہ انہیں علیہم السلام سے بھی استہزاء اور تمسخر کرنے لگے اور یہ اعتقاد بنا لیا کہ ان کا اپنا علم انہیں علیہم السلام کے علم کی نسبت زیادہ نفع بخش اور فوٹو کمانے والا ہے پس وہ اسی پر اتر آئے لگے اور تکبر و خرد میں مبتلا ہو گئے۔

یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَعَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۚ

یہاں علم سے مراد ایسی چیزوں کا علم ہے جو آخرت میں انہیں کوئی نفع نہیں پہنچائے گا مٹلا طبیعیات، ریاضی، نجوم، سحر اور شہیدہ بازی کا علم وغیرہ جو کہ اہل یونان اور اہل ہندو وغیرہ کی طرف منسوب ہیں۔ روایت ہے کہ افلاطون نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے ان کی نبوت کا امتحان لینے کی غرض سے یہ سوال کیا کہ اگر تمام آسمان کمانیں ہوں، حوادث ان سے نکلنے والے تیر ہوں، انسان ان کا نشانہ ہو اور تیر بھینکنے والا اللہ تعالیٰ ہو تو پھر بھاگ کر جانے کی جگہ کہاں ہے؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا قِفْرٌ ذُو آتِ الْغَيْبِ ۚ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَسَيَحْكُمَ بِحُكْمِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ مَعَ الصَّادِقِينَ ۚ

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی بھاگو تو اس وقت افلاطون کو آپ کی نبوت کا یقین تو ہو گیا لیکن اس نے یہ کہا کہ انہیں تو ناقص لوگوں کیلئے آتے ہیں ہم تو کامل ہیں ہمیں رسولوں کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔

ستراط کے بارے یہ قول ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (نبی ہونے کے) بارے سنا تو اسے یہ کہا گیا کہ اگر تو ان کی بارگاہ میں حاضر ہو جانا (تو بہتر ہوتا) تو اس نے جواب دیا تم تو ہدایت یافتہ قوم ہیں ہمیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت نہیں جو ہماری راہنمائی کرے اور ہمیں ہدایت دے۔ بعض نے فرحو کا معنی اس طرح کیا ہے کہ جو علماء انبیاء علیہم السلام کے پاس تھا وہ اس پر بطور استہزاء ہنستے تھے اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ وَحَاقٍ يُّهَمُّ مَا كَانُوا يهْمُ يَسْتَهْوِءُونَ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ فرحو اسی ضمیر رسل علیہم السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب انبیاء علیہم السلام نے کفار کی جہالت، سرکشی اور ان کے برے انجام کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں جو علم دیا گیا اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کفار کو ان کی جہالت اور استہزاء کی سزا نے ہر جانب سے گھیر لیا۔

فَلَمَّا آوَا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحَدَاهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿٥﴾ قَلَمٌ يَبْقَعُهُمْ إِيَّانَهُمْ لَسَّ آسَأُ وَا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۗ وَخَسِرَ هَٰذَا لِكُفْرٍ وَّوْنَ ﴿٦﴾

”پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تو کہنے لگے ہم ایمان لائے ہیں ایک اللہ پر اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔ پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب۔ یہی دستور ہے اللہ تعالیٰ کا جو (قدیم سے) اُس کے بندوں میں جاری ہے۔ اور سراسر خسارہ میں رہے اس وقت حق کا انکار کرنے والے سے۔“

۱۔ پھر جب کفار نے موت کے وقت ہمارے عذاب کی شدت اور حق کو دیکھ لیا تو کہنے لگے ہم ایک اللہ پر ایمان لائے اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے، یعنی ہم ان بتوں سے بیزاری اور ہر بات کا اظہار کرتے ہیں جن کی ہم عبادت کرتے تھے۔

۲۔ پس ان کے ایمان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا قَلَمٌ يَبْقَعُهُمْ إِيَّانَهُمْ تَارِخُ الْعَمَلِينَ کے قبطے سے ہے کہ دونوں فعلوں میں سے ایک عمل کر رہا ہے اور دوسرے میں فاعل ٹھہرے۔ یا پھر لَم بیک کا ضمیر نشان مستتر ہے یا لَم بیک تامہ ہے (تاقصہ نہیں) اور یبضعفہم ان مقدرہ کے ساتھ اس کا فاعل ہے۔

لَسَّ آسَأُ وَا بَأْسَنَا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ کیونکہ ایسے وقت میں تو یہ کی تو یہ کی قویات متع ہے اسی لیے فرمایا لَم بیک بمعنی لَم یصح اور لَم یستقم ہے یعنی اس وقت ان کا ایمان الٹا صحیح اور درست نہیں ہے۔

سُنَّتَ اللَّهُ مُحَمَّدٌ فَاعِلٌ مَصْدَرٌ ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور فعل تاکید کیلئے محذوف کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے سُنَّةَ اللَّهِ ذَالِكَ سُنَّةَ مَا فِيهِ فِي الْعِبَادِ ان الايمان عند نزول العذاب لا ينعف۔

کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور زمانہ ماضیہ سے ہی بندوں کیلئے جاری کر رکھا ہے کہ نزول عذاب کے وقت ایمان لانا نفع بخش اور فائدہ مند نہیں ہوتا اور عذاب انہی پر نازل ہوتا ہے جو رسل علیہم السلام کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سُنَّتَ اللَّهُ حرف جبر کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے، یعنی اصل میں تھا كَسَنَةُ اللَّهِ بعض نے کہا ہے کہ آخر کی بناء پر منصوب ہے یعنی اِحذِ وَا اسنة اللہ۔ (اللہ تعالیٰ کے دستور سے ڈرو) اور حق کا انکار کرنے والے عذاب کو دیکھنے کے وقت سراسر خسارہ میں رہے اسی لئے کہ ان سے

دونوں جہاں چلے گئے (نورینا باقی رہی اور نہ آخرت کی کوئی نعمت ہاتھ آئی) از جا بچنے کہا ہے کہ کافر تو ہر وقت خسارے میں ہوتا ہے۔ لیکن ان پر یہ خسارہ ظاہر تب ہوتا ہے جب وہ عذاب کا مشاہدہ کر لیتے ہیں (1)۔

تمت یاخبر

سورۃ المؤمن کی تفسیر 28 ذی الحجہ 1207ء اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اختتام پذیر ہوئی۔ سورۃ المؤمن کا ترجمہ 13 سوال 1421ء بمطابق 10 جنوری 2001ء بروز بدھ بوقت سہ پہر 4-15 بجے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے اپنے اختتام کو پہنچا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

www.muhammadiah.com

www.muhammadiyah.com

سورۃ فصلت / حم السجدہ

﴿ اٰیٰتِهَا ۵۳ ﴾ ﴿ مَجْرُومًا لِّتَقُوْنَهُ عَظِيْمًا ۲۱ ﴾ ﴿ رَكُوْعَاتِهَا ۲ ﴾

سورۃ فصلت (حم السجدہ) مکی ہے، اس میں چون آیات اور چور کوح ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حَمْدٌ مَّا تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا
لِّقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲﴾ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳﴾ اِنَّا نَحْمَدُكَ رَبَّنَا رَبَّنَا

”ح۔ ایم۔ اتارا گیا ہے (یہ قرآن کریم (خدا) کی طرف سے لے یا ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں۔ یہ قرآن کریم (ربانی) ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو علم (دہم) رکھتے ہیں۔ یہ عذر دہ سنانے والا اور (بروقت) خبردار کرنے والا ہے۔ یا میں ہمہ منہ پھیر لیا ان میں سے اکثر نے پس وہ اسے قبول نہیں کرتے۔“

۱۔ اگر آپ حم کو مبتدا بنائیں تو پھر اس کی خبر تنزیل من الرحمن الرحیم ہے اور اگر حم کو حرف و ہما شمار کریں تو پھر تنزیل مبتدا حمذوف کی خبر ہے۔ اور بخش نے کہا ہے کہ تنزیل صرف ما بعد معرفت سے مخصوص ہونے کے سبب مبتدا ہے اور اس کی خبر کتب فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ سے پہلی دونوں ترکیبوں کے اعتبار سے کتب یا تو تنزیل سے بدل ہے یا دوسری خبر ہے یا مبتدا حمذوف کی خبر ہے۔

چونکہ ان ساتوں سورتوں کا آغاز حم سے کیا گیا ہے شاید اسی وجہ سے ان کا نام بھی حم رکھا گیا ہے اور لطم و معنی میں ان کے ہم شکل اور باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ان کا آغاز کتاب کے بیان سے کیا گیا ہے۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اطلہ۔ طو اسین (طسم والی سورتیں) اور حواہیم (حم والی سورتیں) مجھے الواح موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کی تختیاں) میں سے عطا کی گئی ہیں (۱)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور بخاری نے حضرت معقل بن یسار سے نقل کیا ہے۔ اور الرحمن اور الرحیم کی طرف تنزیل کی اضافت اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ تمام دینی اور دنیاوی مصالح اور منافع کا دار و مدار اسی قرآن پر ہے۔ (کیونکہ یہ رحمن و رحیم رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)

۲۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں، یعنی اس میں احکام قصص اور مواظظ پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یا تو مدح کی بنا پر منصوب ہے۔ (کہ اس سے پہلے امدح فعل حمذوف ہے۔) یا ایضاً کی ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ کیونکہ ضمیر کی طرف فُصِّلَتْ کا فاعل مضاف ہے۔ (اور ضمیر مضاف الیہ ہونے کے سبب مجرور ہے۔) جیسا کہ قول باری تعالیٰ يٰۤاٰمَنُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا يَمِيْنُا فِيْكُمْ اٰيٰتِيْمْ وَمِيْنُا فِيْكُمْ اٰيٰتِيْمْ مِمَّا نَزَّلْنَا مِنْ سَمٰوٰتِنَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (۱) میں مِيْنُا کی یہی ترکیب ہے۔

معنی یہ ہے کہ عربی زبان میں قرآن کریم نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک عظیم احسان ہے کہ یہ ان کے لیے پڑھنا اور سمجھنا سہل اور آسان ہے۔ اگر یہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو وہ اسے نہ سمجھ سکتے بلکہ ان کے لیے یہ انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا۔ لَقَوْا وَيَسْمَعُونَ فی فصل لازم کے قائم مقام استعمال ہو رہا ہے، یعنی ایسی قوم کے لیے جو صاحب علم و نظر ہے نہ کہ ان کے لئے جنہوں نے اس سے اعراض کر کے منہ پھیر لیا۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ یعلمون کا مفعول محذوف منوی ہے، یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو قرآن کے معانی کو جانتے ہیں اور اس کے مفہیم کو سمجھتے ہیں۔ یا اس طریقہ پر کہ جو اسے سنتا ہے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

اس صورت میں اس کے دو مفعول مقدر ہیں، یعنی لقوم یعلمون نہ یعلمونہ حقائق ان لوگوں کے لئے جو اسے حق جانتے ہیں اور پھر یہ جملہ قرآنی دوسری صفت ہے یا تنزیل یا فصاحت کا صلہ ہے، (یعنی ان کے متعلق ہے) صفات کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اسے قرآنی دوسری صفت بنانا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو مخرمہ سنانے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو بروقت خبردار کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ یہ ان میں سے اکثر لوگوں نے قرآن کریم کو قبول کرنے اور اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے اعراض کر لیا، منہ پھیر لیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فصاحت پر ہے۔ پس وہ اسے عدوات اور عناد کی بنا پر سنتے ہی نہیں یا یَسْمَعُونَ یعنی ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے شفعت الی فلان فلم یَسْمَعِ قولی کہ میں نے فلان کے پاس سفارش کی مگر اس نے میری بات نہ سنی، یعنی اس نے میری بات قبول نہیں کی یہ جملہ اعراض کا بیان اور اس کی تفصیل ہے۔

وَقَالُوا اقْتُلُوهُمْ بِنَافِیْ اَکْثَرِ مِمَّا سَأَلُوا النَّبِیَّ وَفِیْ اَذَانِنَا وَقَوْمٌ مِّنْ بَیْنِنَا وَبَیْنِكُمْ
حِجَابٌ قَاعَمَلٌ اِنَّا لَعَالِمُونَ ۝۳

”اور (ان ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرائی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔“

وَقَالُوا اِنَّا عَرَضٌ لِّمَنْ یَّرِیءُ اور مشرکین مکہ نے کہا۔ ہمارے دل (پردوں میں) لپٹے ہوئے ہیں (۱)۔ اکتہ انان کی جمع ہے۔

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے جاتے جاتے کہ قریش مشورہ میں کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے اس وقت فرمایا ”میں کون سی شے اسلام قبول کرنے سے مانع ہے تم اسلام قبول کر لو عرب کے سرداران جاؤ گے۔“ انہوں نے کہا ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بچھا ہے کہتے ہیں نہ ہم اسے سمجھتے ہیں اور نہ ہم اسے سن سکتے ہیں کیونکہ ہمارے دلوں پر تو خلاف لپٹے ہوئے ہیں اور ابو جہل نے اپنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک کپڑا حائل کرتے ہوئے کہا ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قلوبنا میں اکتہ صما ندعونا الی و فی اذاننا وقر و من بیننا و بینک حجاب۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا میں تمہیں دو خصلتیں اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تم یہ شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لا شریک ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اسے جو کہی انہوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت کے بارے میں تا تو وہ پٹھان پھیر کر بھاگ چلے اور کہنے لگے کیا اس نے تمام معبودوں کی جا۔ یہ الہ بنا دیا ہے بیٹک ہے بڑی عجیب شے ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو کہا چلو اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈرنے رہو۔ بیٹک تصدوہ یعنی ہے کہ ہم نے ان سے دوسری قوموں میں سے کسی سے نہیں سنا یہ جہل من گھڑت بات ہے۔ کیا ہم میں سے صرف اسی پر نصیحت نامہ (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟ اب جو کچھ میں نے نہ سنا ہے اسے اور عرض کی اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ آپ کو سلام فرماتا ہے اور فرما رہا ہے ایسا نہیں جیسا کہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان پر ان غلافوں میں ہے۔ یہ کہہ کر دو کوئی بات سمجھ نہیں اور ان کے کانوں میں گرائی ہے لہذا وہ آپ کا قول نہیں سن سکتے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو تم دیکھ رہے ہو۔ لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے۔ لہذا تم پر لازم ہے کہ تم خوب کان لگا کر توجہ سے اسے سنو اور اسے قبول بھی کرو۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ میں نہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی جن کہ تمہارے لیے اس سے کچھ لینا ممکن نہ ہو۔ اور نہ ہی میں تمہیں ایسی شئی کی طرف دعوت دیتا ہوں جو خلاف عقل ہو اور عقلیں اسکا ادراک کرنے سے قاصر ہوں بلکہ میں تو تمہیں اس توحید کی طرف بلاتا ہوں جو عقل و نقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ پس تم طاعت و عبادت میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی توجہ کرو اور قطعاً اس کی طاعت سے اعراض نہ کرو۔ اور اسی سے ان تمام گناہوں شرک اور دیگر برے اعمال کی مغفرت طلب کرو جو تم کرتے رہے ہو۔

ع۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں اور مشرکوں کو عذاب سے ڈراتے اور جہنمی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: **وَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ** اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے۔ ترکیب کلام میں ویل جملہ ہے اور اس کی خبر مشرکین ہے۔
الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ کے بارے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کرتے حالانکہ یہی نفسوں کی زکوٰۃ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ توحید کا اقرار کر کے اپنے نفسوں کو شرک کی آلودگی اور نجاست سے پاک نہیں کرتے (1)۔

حسن نے کہا ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ اقرار نہیں کرتے اور نہ ہی اسے واجب خیال کرتے ہیں۔ اور یہ کہا جاتا تھا کہ زکوٰۃ اسلام کا پل ہے جس پر جس نے اس پل کو طے کر لیا وہ نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا (یعنی پل کو طے نہ کر سکا) وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔ مقال اور شاک نے کہا ہے کہ اعلیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاعت و فرمانبرداری میں بال خراج نہیں کرتے اور نہ ہی وہ صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ اور مجاہد نے یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو پاک نہیں کرتے ان کا تزکیہ نہیں کرتے (2)۔
 علامہ بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فروعات (ایمان) میں کفار بھی مخاطب ہیں (3)۔ یہ مسئلہ ہم نے سورہ مدثر میں قول باری تعالیٰ **لم تذك من المصلين**۔ الایذ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

وَهُمْ بِالْآخِرَةِ أَهْمٌ لَّهُمْ لفظون ترکیب کلام میں حال ہے اور یہ اس بات پر مطلع کر رہا ہے کہ وہ زکوٰۃ کا انکار یا لینے کرتے تھے کیونکہ وہ عقیدہ آخرت کا انکار کرتے تھے اور جو بھی آخرت اور زکوٰۃ کے ثواب کا اعتقاد نہیں رکھتا اس کے نزدیک فقیر کو مال دینا مال کو ضائع کرنا ہی ہے۔ لامحالہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے انکار کا تذکرہ شرک کرنے اور آخرت کا انکار کرنے کے ساتھ ملا کر کیا ہے۔ کیونکہ آدمی کے نزدیک مال انتہائی محبوب اور پسندیدہ اشیاء میں سے ہے۔ پس اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی پہلی نشانی اور دلیل ہے گویا اس آیت میں اہل ایمان کو زکوٰۃ ادا کرنے پر براہینت بھی کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی اس سے انکار کرنے پر شدید جزو توبہ بھی کی جا رہی ہے۔

ع۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ غیر ممنون کا معنی ہے ایسا اجر جو منقطع نہ ہوگا۔ مقال نے کہا ہے ایسا اجر جو ناقص نہ ہو گا بلکہ کامل ہوگا۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ایسا اجر جس کے سبب ان پر احسان نہیں جتلا یا جائے گا۔ ممنون من سے مشتق ہے اور من کا معنی ہے احسان جتلا نا۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی ہے حساب ہے۔ سدی نے کہا ہے یہ آیت مریضوں، ابا بھوں اور بوڑھوں کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ ان عذروں کے سبب طاعت و عبادت سے عاجز آجاتے ہیں تو ان کے لیے اسی قدر اجر لکھا جاتا

ہے جس قدر وہ حالت صحت میں عمل کیا کرتے تھے (1) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب خوب اچھے انداز میں عبادت کرتا ہو پھر وہ بیمار ہو جائے تو اس پر مقررہ نیت کو بجا جاتا ہے کہ اس کے لئے اسی طرح کا عمل لکھ دو جیسا یہ حالت صحت میں کرتا تھا اور یہ حکم تب تک برقرار رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری اور تکلیف سے چھٹکار دے اور صحت دلا دے (2)۔ رواہ البیہقی فی شرح السنۃ و التفسیر۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی بیمار ہو یا سفر پر تو اس کے لئے اس طرح کا عمل لکھا جاتا ہے جیسے وہ صحت مند اور حالت صحت میں کیا کرتا تھا (3)۔ رواہ البخاری۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی سمان آبی دسمانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم ارشاد فرماتا ہے اس کے لئے اسی طرح کا عمل لکھ دو۔ جیسے یہ اس تکلیف سے قبل کیا کرتا تھا پھر اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمادے تو (اس بیماری کے سبب) اس کے گناہ، محو ہوتے اور اسے پاک فرمادیتے ہے اور اگر اس کی روح قبض کر لے تو پھر اس کی مغفرت فرماتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے (4) رواہ البیہقی فی شرح السنۃ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لئے اسی قدر اجر لکھا جاتا ہے جس قدر بیمار ہی سے قبل لکھا جاتا تھا اور پھر بیماری سنہ وہ عمل کرنے سے اسے روک دیا۔ دو واہ دزین۔

قُلْ إِنَّمَا نَتَلَفَعُونَ بِالْمَنَىٰ حَافِي الْأَمْشَانِ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا
ذَلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾ وَجَعَلَ فِيهَا سِرًّا وَاسِيًّا مِنْ قَوَّيْمًا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّمَ
فِيهَا أَقْوَامًا فَآرَبَعَةً آيَاتٍ مَّا سَاءَ لِّلنَّاسِ بَلَدِينَ ﴿١١﴾

”آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مد مقابل۔ وہ تو رب العالمین ہے (اس کا مد مقابل کون ہو سکتا ہے) اور اس نے (اسی) بنائے ہیں زمین میں لڑے ہوئے پہاڑ جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازہ سے مقرر کر دی ہیں اس میں غذائیں، (بر نوع کے لئے) چار دنوں میں۔ (ان کا حصول) کیسا ہی ہے طلب گاروں کے لئے۔“

یہ استنبہام جزو توحیح کے لئے ہے اور یہ جملہ استنبہامیہ مستأنفہ ہے جو کہ ایک سوال کے جواب میں واقع ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر وہ سیدھی راہ نہ چلیں اور مغفرت طلب نہ کریں تو پھر میں انہیں کیا کہوں؟ تو اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ آپ ان سے یہ پوچھئے کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا فرمایا، یعنی دو دنوں کی مقدار میں پیدا فرمایا۔ ان دونوں سے مراد یک شب (اتوار) اور دو شب (پنج) ہے۔ اور اس کے لئے مد مقابل ٹھہراتے ہو حالانکہ کوئی اس کا مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا ہے اور وہ ان تمام ممکنات کا خالق ہے جو پائی جاتی ہیں اور ہر شئی کو بتدریج نقطہ عروج تک پہنچانے والا ہے۔ العلمین، عالمہ کی جمع ہے تو چونکہ عالم کی مختلف انواع

2۔ تفسیر بیہقی، جلد 6 صفحہ 88 (تجاویز)

1۔ تفسیر بیہقی، جلد 6 صفحہ 88 (تجاویز)

4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 136 (تقدیمی)

3۔ التزیب والتریب، جلد 4 صفحہ 289 (المکر)

ہیں اس لئے عاقلین جمع ذکر کی گئی ہے اور پھر ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر غلبہ دیتے ہوئے جمع یا ہائون کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔
جملہ ذٰلِكَ تَرْتَّبُ الْعَالَمِيْنَ زَجْرًا وَمَوْجًا كِي عِلْمَتِ بَيَانِ كَرِهًا هَبْ۔

ع۔ اور اس نے ہی زمین میں گڑے ہوئے اور جھے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں جو زمین کے اوپر بلند ہیں اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ تاکہ ان میں جو دیکھنے کی چیزیں ہیں وہ دیکھنے والوں کے لئے ظاہر ہوں اور ان کے منافع اور فوائد ظاہر کرنے والوں کے سامنے ہوں اور اس نے زمین میں بڑی برکتیں رکھی ہیں کہ اس میں سمندر، دریا، پھل، درخت اور حیوانات پیدا فرمائے۔ اور زمین کے پاسیوں کے لئے غذا نیک بھی زمین میں اندازہ سے مقرر کر دیں۔ اقواتھا اصل میں اقوات اہلہا ہے، یعنی اس میں مضاف مخدوف ہے۔ یا یہ اضافت ادنیٰ ملا بہت کے لئے ہے، یعنی اقوات خلق فیہا، یعنی ساری مخلوق کی خوراک اسی میں مقرر کر دی ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں اور چوپاؤں کا رزق زمین میں تقسیم کر دیا، یعنی جو شے جس کے لئے نفع بخش تھی اور جس کے سبب کوئی زندگی گزار سکتا تھا وہ شے اسی کے لئے عین کر دی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہاں قرأت ہی قسم فیہا اقواتہا کی ہے (1)۔

عکرم اور ضحاک نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شہر میں وہ شے مقرر فرمادی جو دوسرے شہر میں پیدا نہیں فرماتی تاکہ لوگ آپس میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف تجارت کر کے آسان زندگی گزار سکیں (2)۔

کلبی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علاقے کے رہنے والوں کے لئے روٹی مقرر فرمادی، دوسرے علاقے والوں کے لئے جواری، کسی علاقے کے پاسیوں کے لئے پھلی اور کسی علاقے کے رہنے والوں کے لئے کھجوریں مقرر فرمادی (3)۔

فی اربعة اہام، یعنی یہ سب کچھ چار دن مکمل ہونے تک کر دیا، یعنی کام کی تکمیل کے لئے پہلے دو دنوں کے ساتھ متصل ہی دو دن مزید لگائے اور وہ دو دن سرشبندہ (منگل) اور چہار شنبہ (بدھ) ہیں۔ یہ جملہ تمہارے اس قول کی طرح ہی ہے کہ میں بھرے بغیر ایک دن دنوں میں پہنچا اور کوئی تک پندرہ دنوں میں پہنچا۔

اور یہاں فی یومین نہیں فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دو دن پہلے دو دنوں کے ساتھ ہی متصل ہیں۔

سواءً یہ منصوب ہے اور اصل مہارت ہے استواء اور سواء یعنی استوار ہے۔ یا قلد تقدیر الحوا ہے۔ اور یہ جملے ایام کی صفت ہے۔ اور اس پر یعقوب کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ اس نے سواء کو اربعہ کی صفت بناتا ہے جو جزو پزہا ہے۔ بلش نے یہ کہا ہے کہ سواء، اقواتہا یا فیہا کی ضمیر سے حال ہے۔ ابو جعفر نے سواء مرفوع پزہا ہے۔ اس لیے کہ یہ مخدوف مبتدائی جز ہے اور وہ صوبہ۔ لیساً یلیف کا تعلق مخدوف کام سے ہے۔ یعنی یہ حصر سوال کرنے والوں کے لئے زمین اور اس میں جو کچھ ہے اسے پیدا کرنے کی مدت کو بیان کر رہا ہے (کہ ہر شے کی تخلیق چار دن میں مکمل ہو گئی)۔ قداوہ اور سدی نے اسی طرح کہا ہے۔ یا اس سے قبل قلد فعل مخدوف ہے یعنی طلبگاروں اور تلاش کرنے والوں کے لئے زمین میں ہر قسم کی خوراک چار دن میں پیدا کر دی گئی، مقرر کر دی گئی۔

ثُمَّ اسْتَوَى اِلَى السَّمَاوٰتِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَاٰلِئِنَّهَا لَمَرْضٰى اَنْتِ طَوْعًا وَاَوْ كَرْهًا قَالَتْ اَنْتَ اَنْتَ طَاوِعِيْنَ ۝ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمَوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْسٰى فِيْ كُلِّ سَمَاوٰٓةٍ

أَمْرَهَا وَرَبَّكَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِصَاحِبِهَا وَحَفَظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۱۰﴾

”پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف، وہ اس وقت کھل دھواں تھا۔ پس فرمایا اسے اور زمین کو کہ آ جاؤ (تعمیل حکم اور ادا سے) فرمائیں گے لیے اسے خوشی سے یا مجبوراً۔ دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں جسے پس بنا دیا۔ انہیں سات آسمان دونوں میں، اسے اور وہی فرمائی ہر آسمان میں اس کے حسب حال اور ہم نے مزین کر دیا آسمان و دنیا کو چرخوں سے اور اسے خوب محفوظ کر دیا یہ (سارا) نظام سب سے غالب سب کچھ جاننے والے (خدا) کا ہے۔“

۱۔ پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی، یعنی آسمان کا قصد کیا۔ جیسا کہ یہ قول ہے استوی المی مکان کذا یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کسی معین شئی کی طرف کامل توجہ کر لے اور اس کے سوا کسی غیر کی طرف رخ نہ پھیرے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں تم دو مخلوقوں کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے ترانی مدت کے لئے مذکور نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والارض بعد ذالک رکھو کیونکہ زمین کو پہاڑوں کی تخلیق سے پہلے بچھایا گیا۔ (اس لئے یہاں تاخیر زمانی مراد نہیں ہو سکتی۔) اور لوحان سے مراد شاید آسمان کا مادہ اور وہ چھوٹے اجزا ہیں جن سے اسے بنایا گیا ہے۔ آسمان کا مادہ دخان ہے جو کہ پانی کے بخارات ہیں۔ علامہ بغوی نے اسی طرح کہا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو فرمایا جو کچھ تاخیر و تاثر میں نے تم دونوں میں پیدا کیا ہے اس کے ساتھ (تعمیل حکم کے لئے) آ جاؤ اور جو مختلف اوضاع اور متوع قسم کی کائنات تم میں دو بیعت رکھی ہے اس کے اظہار کے لئے آ جاؤ، یا معنی ہے کہ میں تم دونوں سے جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تم میں سے ہر کوئی اسے ظاہر کر دے۔

۳۔ طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بندوں کے مصالح کے لئے جو منافع اور فوائد پیدا کیے ہیں انہیں ظاہر کر دو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے آسمان! تو اپنے سورج، چاند اور ستاروں کو طوع اور رضو دار کر اور اے زمین! تو اپنے دریاؤں کو جاری کر دے اور اپنے پھلوں اور نباتات کو باہر نکال دے (۱)۔

۴۔ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا (خوشی سے یا مجبوراً) یہ ترکیب کلام میں یا تو حال ہونے کی بنا پر منصوب میں یعنی وہاں حاکم کے لئے کریم دونوں حکم کی تعمیل خوشی خوشی کر دیا مجبوراً کر دے۔ یا ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور یہ ضمرہ سو طاع کے طریقہ پر ہے یعنی ایسا اتیان طوع اور کوہ۔ (تم خوشی یا مجبوری سے بالضرورت تعمیل حکم کے لئے آؤ۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا میں نے تمہیں جو حکم دیا ہے تم اس کی تعمیل کرو ورنہ میں تمہیں اس کی تعمیل پر مجبور کروں گا یہاں تک کہ تم مجبوراً اسے کرو گے (۲) تو ان دونوں نے خوشی خوشی یہ جواب دیا ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ یہاں طاعین جمع مذکر ذکر کیا گیا ہے طاعین نہیں کہا تو اس کا سبب یہ ہے کہ حکم کی نسبت آسمانوں، زمین اور ان میں بسنے والی ساری مخلوق کی طرف تھی، یعنی زمین و آسمان نے یہ کہا کہ ہم اپنے اندر بسنے والی ساری کائنات سمیت تعمیل حکم کے لئے خوشی خوشی حاضر ہیں۔ (اور ان میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں قسم کی مخلوق آباد ہے۔) چنانچہ ذوی العقول کو ترجیح اور غلبہ دیتے

تمہارے پاس بلاوجہ لیکر آ رہا ہے (یعنی اب اس کے خیالات وہ نہیں ہیں جو وہ لیکر گیا تھا۔) پس جب وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو ساتھیوں نے پوچھا اسے ابو الولید! کیسے واپس آئے ہو (کوئی خبر لائے ہو؟) تو اس نے جواب دیا خبر یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے خدا کی قسم! میں نے اس کی مثل کلام بھی نہیں سنا نہ تو وہ شعر ہے اور نہ ہی عمر اور نہ ہی وہ کہانت ہے۔ اسے گرد و قریش! تم میری بات مانو اور اس آدمی کا راستہ چھوڑ دو جو کچھ یہ کہتا ہے اسے کہنے دو اور کرنے دو تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس سے کوئی تعرض نہ کرو۔ میں نے اس سے جو کلام سنا ہے قسم بخدا! وہ حقیقت ہو کر رہے گا لہذا اگر عرب اس پر غالب آگئے تو تم اپنے مقصد کو پانے میں کچھ سکنے بغیر کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور اس طرح تم اس کے سب تمام لوگوں میں زیادہ معاون و مددگار و خوش بخت ہو جاؤ گے۔ یہ سن کر ساتھیوں نے کہا اسے ابو الولید! قسم بخدا! اس نے تجھ پر اپنی زبان سے جا دو کر دیا ہے۔ غیب نے جواب دیا تمہارے لیے میری یہی رائے ہے اب جو تم چاہو وہ کر (1)۔

فَاَمَّا عَادًا فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا اَمِنَّا اَشَدُّ مِمَّا قَوْمُوْنَا اَوْ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَنِيْهُمُ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوا بِاٰيَاتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿٥﴾
 فَاسْتَرْسَبْنَا عَلَيْهِمْ مِرْيَاحًا صَرَّصًا فِيْ اٰيَاتِنَا وَنَحْسَبَاتٍ لِّتُنۡذِرَ يٰعِقۡمَ عَدَاۤءَ الْخٰزِرِيۡ فِي الْحَيٰوَةِ الدُّنْيَا وَلَعَدَابِ الْاٰخِرَةِ اَخٰزِرِيۡ وَهُمۡ لَا يَبۡصُرُوْنَ ﴿٦﴾

”پس قوم عاد نے تو سرکشی اختیار کی زمین میں ناحق اور کبے گلے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے۔ اور وہ (تو) ہمیشہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے لے پس ہم نے بھیج دی وہی برحمت ٹھنڈی تند ہوا تمہیں دنوں میں تاکہ ہم انہیں چکھائیں ذلت آمیز عذاب اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بہت زیادہ رسوا کن ہوگا اور ان کی برتر مدد دینا چاہئے گی۔“

۵۔ قوم عاد نے بغیر کسی استحقاق کے اپنے آپ کو اہل زمین سے برتر اور عظیم سمجھا (انہوں نے اتنا تکبر اور رعونت اختیار کر لی کہ جب انہیں عذاب سے ڈرایا گیا تو وہ اپنی شوکت و سلطنت اور قوت و طاقت پر غرور و تکبر کرتے ہوئے کہنے لگے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ یعنی ہم سے بڑھ کر کوئی قوت و طاقت والا نہیں۔ ہم اپنی قوت و طاقت سے نڈب کو دور بنا دیں گے (ان کی قوت کا عالم یہ تھا) کہ ان میں سے ہر کوئی پہاڑ سے ہماری بھر کم سخت چٹان اٹھیز کر جہاں اسے رکھنا چاہتا رکھ لیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے؟ اؤ لَمْ يَبۡصُرُوْنَا اس استفہام انکار ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ نقد یہ کلام اس طرح ہے قالوا ذلک ولم یروا۔ (کیا انہوں نے یہ کہا ہے اور وہ نہیں جانتے؟)

اور وہ ہمیشہ ہماری آیات یعنی معجزات کا انکار کرتے تھے یعنی وہ جانتے تھے کہ یہ حق ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان کا انکار کرتے تھے اس سبب کا عطف قالوا پر ہے۔

۶۔ فَاسْتَرْسَبْنَا عَلَيْهِمْ مِرْيَاحًا صَرَّصًا عطف قالوا پر ہے۔ صرصر سے مراد ایسی آندھی اور تیز ہوا ہے جو سخت ٹھنڈی اور تین لی آواز والی ہو۔

یہ الصر سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی سردی اور ٹھنڈک ہے اور بصیر کا معنی ہے جمع رہنا۔ اور مضبوط رہنا۔ یا الصرۃ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے پیچ دکھانا، شور و غل۔

قُبْحًا یَا وَجِیْہَاتِ مِیْنِ اَیْنِ کَثِیْرٍ نَافِعٍ، ابو عمر اور لیتقوب نے حاء کو ساکن پڑھا ہے اور یاقوب نے کسور۔ ان سے مراد وہ دن ہیں جو ان کے حق میں انتہائی نیکوں تھے۔ شحاک نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال تک ان سے بارش کو روک رکھا اور ان پر بغیر بارش کے ہواؤں چلتی رہیں (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ شمال کے آخر میں ایک بدھ سے نیکر دوسرے بدھ تک کے ایام تھے۔ اور ہر قوم کو عذاب بدھ کے دن ہی دیا گیا۔ عَذَابُ الْخُزْیِ سے مراد رسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے۔ عذاب کی خزی کی طرف اضافت موصوفی کی صفت کی طرف اضافت ہے جیسا کہ رجلی العزب اور حاتم الحدادی نے اور اس کی دلیل وَعَذَابُ الْاِخْزِیَةِ الْاٰخِرٰی ہے۔ اصل میں اسی طرح سے ترکیب کلام میں وَعَذَابُ الْاِخْزِیَةِ الْاٰخِرٰی کا عطف ارسلنا ہے دراصل احدی، معذب (یعنی عذاب دیا گیا) کی صفت ہے، لیکن مبالغہ کے لئے مجازاً عذاب کی صفت اخزی بیان کی گئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ آخرت کا عذاب تو بہت رسوا کن ہوگا اور ان سے عذاب دور کر کے ان کی ہرگز مدد نہیں کی جائے گی۔

وَاَمَّا سُوْدٌ فَهَدِيْمٌ فَاسْتَجَبُوا الْعَمٰی عَلٰی الْهٰدِیْمِ فَاَخَذَتْهُمُ صِعْقَةٌ الْعَذَابِ
الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَنَجَّیْنَا الْاَنْبِیَیْنَ اَمْوَاكًا وَاَوْیَسْتُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَیَوْمَ
یُحْشَرُ اَعْدَاؤُ اللّٰهِ اِلٰی النَّارِ فَهُمْ یُبَدِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

”باقی رہے عمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے ان کو تو توں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے تھے اور (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرتے رہتے تھے۔ اور (ذرا خیال کرو) اس دن کا جب جمع کیے جائیں گے اللہ کے دشمن آتش (جہنم) کی طرف پھروہ (گروہوں میں) بانٹ دیئے جائیں گے۔“

۱۔ ہم نے قوم ثمود کی طرف رسل علیہم السلام کو بھیجا اور خیر و شر کے بارے میں ان کی خوب راہنمائی کی اور راہ ہدایت ان کے سامنے واضح کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح بیان کیا ہے (2)۔ لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر توجیح دی اور ایمان کے مقابلے میں جہالت اور کفر کو اختیار کیا۔ تو انہیں آسمان کی طرف سے ذلت آمیز رسوا کن جملہ ترین عذاب کے لئے صِعْقَةٌ کی ایک چیخ اور کڑک نے پکڑ لیا۔ اظہار مبالغہ کے لئے صِعْقَةٌ کی اضافت عذاب کی طرف اور عذاب کی صفت الْهُوْنِ (رسوا کن) بیان کی گئی ہے۔ ہما کائو ائیسٹوون سے مراد یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے مگر اسی اور ملامت کو پسند کیا تھا اسی کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہو۔

۲۔ اور ہم نے ان لوگوں کو اس عذاب سے بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے تھے۔

۳۔ اور یاد کرو اس دن کو جب اللہ تعالیٰ کے دشمن جمع کئے جائیں گے۔ نافع اور لیتقوب نے بحشو کی بجائے صیغہ جمع متکلم معروف بحشو پڑھا ہے۔ اور اعداء اللہ کو مقبول ہونے کی بنا پر نصب دی ہے اور یاقوب نے فعل مضارع مجہول سے صیغہ واحد مذکر

غائب یحشر نصب پڑھا ہے اور اعداء اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اِنَّا الْكٰفِرِيْنَ فَمِنْ يُّوْزَعُوْنَ اور اُنہیں آتش جہنم کی طرف بانٹا اور دکھایا جائے گا۔

تقادہ اور سدی نے کہا ہے ان میں سے پہلوں کو روک دیا جائے گا تاکہ آخر میں آنے والے ان سے جائیں (1)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس سے مقصود اہل جہنم کی کثرت کا اظہار ہے (2)۔

حَتّٰى اِذَا مَا جَا عَرُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَبْعِيْنَ وَاَبْصَارُهُمْ وَاَجْمَعُوْهُمْ يَمَّا كَانُوْا يَمْتَلِئُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَقَالُوْا اَلْجُنُوْدُ هُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْا اَنْطَقْنَا اللّٰهَ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اَلْيَوْمَ نُرْجِعُوْنَ ﴿٥١﴾

”یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب آجائیں گے (تو حساب شروع ہوگا سوقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گے (ہم بے بس ہیں) ہمیں تو گویا کر دیا ہے اللہ نے جس نے گویا کیا ہے ہر شے کو اور اسی نے ہمیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ اور اب اسی کی طرف تم لوٹاے جا رہے ہو۔“

بل حتی ابتداء یہ ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب حاضر ہو جائیں گے اِذَا مَا میں ماز اندہ ہے جو کہ شہادت کو حضور (حاضری) کے ساتھ ملانے کی تاکید کے لئے ہے۔

سدی اور ایک جماعت کا قول ہے کہ جلود سے مراد شرمگاہ ہیں اور مقاتل نے کہا ہے کہ ان کے اعضاء بول پڑیں گے (3) اور ان کے خلاف شہادت دیں گے امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ آپ اچانک مسکرانے لگے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہوں کہ کس کے سبب میں مسکرا رہا ہوں؟ ہم نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے مسکرانے کا سبب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس طرح عرض کناں ہوگا اسے میرے پروردگار! کیا تو نے مجھے علم سے پناہ نہیں دے دی ہے؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا) تو رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں تو پھر بندہ عرض کرے گا میں اپنے خلاف کوئی شہادت نہیں کروں گا مگر وہی جس کا تعلق مجھ سے ہو۔ تو رب کریم فرمائے گا آج کے دن تیرے خلاف تیرے نفس کی شہادت ہی کافی ہے۔ اور تیرے خلاف اعمال کئے والے فرشتے (کرنا تاکتین) ہی شہادت دیں گے۔ چنانچہ اس کے منہ پر مہر گا دی جائے گی اور اس کے اعضاء بدن کو کہا جائیگا تم بولو۔ چنانچہ وہ اس کے اعمال کے بارے میں گفتگو کریں گے پھر اس کے منہ سے مہر بنادی جائے گی) اور اعضاء بدن اور اس کے درمیان گفتگو کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی تو وہ اُنہیں کہے گا اور ہو جاؤ تمہارے لیے پھینکا رہو میں تو تمہاری طرف سے ہی چٹھڑ رہا تھا اور تمہارا ہی دفاع کر رہا تھا (4)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث نقل کی ہے اس میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ران کو حکم دے گا تو

2 تفسیر بیضاوی، صفحہ 632 (فراس)

1 تفسیر بنوئی، جلد 6، صفحہ 91 (الجماریہ)

4 صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدی)

3 تفسیر بنوئی، جلد 6، صفحہ 91 (الجماریہ)

کیسب بخلاص من عیبہم کی تفسیر مجرور سے حال ہے۔ یعنی کما نین فی جملتہ امم۔ اور قَدْ خَلَّصْتُمْ مِنْ قُبُلِهِمْ فی اُفُوقِکُمْ کی صفت ہے۔ یعنی جمعہ ان امتوں میں سے جو انسانوں اور جنوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ اور انہوں نے ان کی طرح کے اعمال کئے۔ تفسیر کا مسموع بنی اچھوڑا لیں، امم کی دوسری صفت ہے۔ اَلَّذِیْنَ کَانُوا خَیْرًا مِّنْ کُلِّ اُمَّةٍ یہ ہے۔ کہ وہ سب اگلے پچھلے انسان اٹھانے والے تھے کیونکہ انہوں نے عذاب سے بچنے والے اعمال کو اپنے اعمال پر ترجیح دی جو رحمت کا سبب بنتے ہیں۔ گویا یہ جملہ ان کے عذاب کا آئینہ بن کر ملت بیان کر رہا ہے۔ اور انہیں تفسیر یا تو فحاشی کی طرف لوت رہی ہے یا پھر اس کا مرتبہ ام ہیں۔

ع اور اہل بیت میں سے کہہ سکتے تھے۔ اس قرآن کو مت سنا کرو اور اس کی تلاوت کے درمیان شروع مل جیاد یا کرو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نے اپنے اہل بیت میں ایک آدمی کو دیکھا کہ جب قرآن کو سن کر کہتا ہے کہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں تو تم ان کے سامنے رخصت ہو کر بیٹھ کر اور تشریح کرو یا فہم باتیں خوب سنا کر کرو۔

عجاہب نے جانتے کہ یہ ان شروع و عمل پجانے سے مراد تائیاں اور شیماں بجانا ہے۔ شاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم خوب کثرت سے باتیں کیا کرو اور جو جو ہو۔ ہر سے ہوں است غلطی ملط کرو یا کرو۔ اور سندی کا قول ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے سامنے خوب سچو پکارو اور شروع و عمل کیا کرنا یہ ان طرف تشریح صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت پر غالب آ جاؤ۔

فَسَنُيَقِّنُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۗ وَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَا الَّذِي كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾ ذٰلِكَ جَزَاءُ الَّذِي اَعْتَدَ اللهُ لِلْكَافِرِ فِيهَا اَمْرٌ اَلْحَدِيْطُ جَزَاءُ الَّذِي
كَانُوا يَابِيْتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿٥١﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَا اَمْرًا الَّذِيْنَ اَصْلَنَّا
مِنْ الْجَحِيْمِ وَالْاِنْسِ نَجْعَلُهٗمَا تَحْتَ اَقْدَامِ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ اِلٰهِنَا سٰغِدِيْنَ ﴿٥٢﴾

”جس نے تم پر ظلم کیا ہے اللہ کے کفار کو شدید عذاب (کامزہ) اور انہیں بدل دیں گے بہت برا اس (نافرمانی) کا جو وہ کیا کرتے تھے۔ یہ ہے سزا اللہ کے دشمنوں کی یعنی آگ ان کے لیے اس میں ہی ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے۔ یہ سزا ہے اس بات کی کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔ اور کافر کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا دو دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے ہم انہیں روند ڈالیں گے اپنے قدموں کے نیچے تاکہ وہ ہو جائیں پست ترین لوگوں سے۔“

۱۔ فَسَنُيَقِّنُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ ایک تو ان کے کفر پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تاکہ یہ حکم انہیں اور دیگر تمام کفار کو شامل ہو جائے۔

۲۔ وَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَا الَّذِيْنَ كَانُوا يَعْمَلُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم یقیناً انہیں ان کے برے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم باہتین انہیں ان کے اس کفر کا بدلہ دیں گے جو ان تمام اعمال میں سب سے برا تھا جو وہ نہایت کیا کرتے تھے۔

۳۔ ذٰلِكَ (اسم اشارہ) مبتدا ہے اور اس کا مشار الیہ اسو ہے۔ اور جَزَاءُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس کی خبر ہے النار، جزاء سے عطف بیان ہے یا پھر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ دار الخلد سے مراد دار الاقامہ (قیامگاہ) ہے جزاء فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ جو کہ بیحد و بے۔ اور یہ مکمل جملہ ماقبل کلام کی تاکید کے لئے ہے باینما میں آیات سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور

یہ جحدوں کا معنی یہ ہے کہ وہ جن کا انکار کرتے تھے یا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کے وقت شروع ہوئے اور لغو باتیں کرتے تھے اور یہاں جو (انکار) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ انکار ہی ان کے شروع کرنے کا حقیقی سبب تھا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا كَذَّبْنَا كَذِبًا كَذِبًا وَمَا نَحْنُ بِمُؤْمِنِينَ (یعنی کفار کو یہ عذاب دیا جائے گا اور وہ آگ میں پھینک دیئے جانے کے بعد کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا دو دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے۔ یعنی ان دونوں انواع کے وہ دونوں شیطان جو انہیں گمراہی اور گمراہی پر آکساتے اور برا بھینتہ کرتے تھے۔ وہ دکھا بعض نے کہا ہے کہ دونوں شیطانوں سے مراد ابلیس اور قاتیل بن آدم علیہ السلام ہے۔ کیونکہ یہی دونوں کفر و معصیت کی بنیاد رکھنے والے تھے۔

اورنا کو ابن عامر، ابن کثیر، بیہقوب، ابو بکر اور السوسی نے تحفیف، یعنی را کے سکون کے ساتھ اور نا پڑھا ہے۔ ان کی یہ قرات اسی مقام کے ساتھ خاص ہے مگر الدوری نے را کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ اور باقیوں نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

ہم انہیں آگ میں اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالیں گے تاکہ وہ پست ترین لوگوں سے ہو جائیں، یعنی تاکہ وہ جہنم کے سب سے نیچے والے حصہ میں ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تاکہ وہ دونوں ہماری نسبت شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو جائیں (1)۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَتَخَفُوا
لَا تَحْزَنُوا وَلَا أَبْسُوا وَابِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۱۰﴾

”بیگم وہ (سعادتمند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے۔ اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔“

لَا تَتَخَفُوا اللّٰهُ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر صراط مستقیم کو لازم پکڑ لیا۔ یعنی یہ آیت طیبہ خلیفہ رسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتائی ہوئی ہے۔ لَمْ يَسْتَقَامُوا۔ میں ہم اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ استقامت کا رتبہ اقرار ربوبیت سے سو فر ہے۔ استقامت سے مراد اعتدال اختیار کرنا کج روی اختیار نہ کرنا اور حق سے کسی بھی اعتبار سے انحراف نہ کرنا ہے۔ نہ ہی اعتقاد کے اعتبار سے اور نہ ہی اخلاق و اعمال کے لحاظ سے (2)۔

صاحب تاملوں نے کہا ہے استقام یعنی اعتدال اور قومتہ، بمعنی عدلتہ، میں نے اسے سیدھا گردیا اور تویم اور مستقیم دونوں ہم معنی ہیں۔ اسی سے صراط مستقیم بھی ہے، یعنی وہ سیدھا اور ہموار راستہ جو چلنے والے کو باہتین منزل اور مطلوب تک پہنچاتا ہے استقامت ایک مختصر لفظ ہے جو کہ جمع احکام شرعیہ کو شامل ہے، چاہے ان کا تعلق ایسے امور سے ہو جن کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے یا ان کا تعلق منہیات سے ہو جن سے اجتناب کرنا اور باز رہنا لازم اور ضروری ہو۔ بشرطیکہ اس ادائیگی اور اجتناب پر دوام و ثبات حاصل ہو (3)۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اسلام کے بارے میں مجھے ایسا قول ارشاد فرمائیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (اور ایک روایت

2- تفسیر جلالین، صفحہ 399 (وزارت تعلیم)

1- تفسیر ربوئی، جلد 6، صفحہ 92 (اتحادیہ)

3- القاسمی، جلد 2، صفحہ 1516 (الترغی العری)

کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر کسی سے سوال کی ضرورت نہ پڑے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا ”قل امنت باللہ ثم استقم“ (کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس قول پر استقامت اور چنگلی اختیار کرو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (1) سے استقامت کے بارے میں پوچھا گیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا (اِنَّ لَا نَشْرُوكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا)

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”الاستقامة ان تستقيم على الامر والنهي ولا توغ وروغان الصعاب“ (کہ استقامت سے مراد امر و نهي پر مضبوطی سے عمل کرنا اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر مڑنے کی جیلہ سازی نہ کرنا ہے۔)

حضرت عثمان ذوالنورین بن عفان رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایا ”اخلصوا العمل لله“ کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرو)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایا دو القرائض، یعنی استقامت کا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کئے (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کرنے میں استقامت اختیار کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر عمل پیرا رہے اور مصیبت و گناہ سے اجتناب کرتے رہے۔ مجاہد اور کریمہ کا قول یہ ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دینے پر مضبوطی سے ڈٹے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ معرفت پر مضبوطی سے قائم رہے اور اسے کبھی نہیں چھوڑا (3)۔

جتنی عبارات ہم نے ذکر کی ہیں ان میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے وہ امر نهي پر مضبوطی سے قائم رہے اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر نہ مڑے۔ اور حضرت علی ابن عباس اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ استقامت کا لفظ ان تمام امور کو شامل ہے جنہیں ادا کرنا اور جن سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق و اعمال سے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انہوں نے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیے ان تمام میں اس چیز کی وضاحت ہے کہ ان کے عمل میں قطعاً شہرت نہ لیا کاری مطلوب نہیں ہوتی۔ اور یہی معنی مجاہد اور کریمہ کے قول کا بھی ہے۔ پس استقامت کا لقب و لقب کو فائز بغیر

1- صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 48 (قدیمی)

2- تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 93-92 (اتھارپی)

3- تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 93 (اتھارپی)

(1) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا تم ان دونوں آیتوں کے بارے کیا کہتے ہو؟ ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقامو اور الذین امنوا و لم یلبسو ايمانهم بظلم۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے انہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر اس کے مطابق عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر پوری استقامت کے ساتھ کار بند رہے اور گناہ کا ارتکاب نہ کیا۔ اور لم یلبسو بظلم کا معنی بھی یہی ہے کہ انہوں نے گناہ نہیں کیا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے اس آیت کو اجنبی شدید امر پر محمول کیا ہے۔ آپ نے فرمایا آیت الذین امنوا و لم یلبسو ايمانهم بظلم کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان کو شریک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا اور آیت الذین قالو ربنا اللہ ثم استقامو کا مطلب ہے کہ پھر وہ جن کی عبادت کی طرف نہیں لوٹے شیخ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازلیہ الخفاء میں اسی طرح بیان کیا ہے سنا ہی بزار اور ابویعلیٰ وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ان الذین قالو ربنا اللہ ہم پر تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ بعض لوگوں نے خوف کے سبب ایسا کہا پھر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے اور جو مرے وقت تک یہ کفار باہم استقامت اختیار کرنے والوں میں سے ہے۔

اور معرفت الہی حاصل کے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ صوفیہ نے بھی بیان کیا ہے اور مقاتل کے قول کا مفہوم بھی یہی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب بھی یہ آیت تلاوت کرتے تھے تو ساتھ ہی دعا کرتے تھے اللھم انت ربنا فارزفنا الاستقامۃ۔ (۱) اللہ! تو ہمارا پروردگار ہے ہمیں استقامت کی توفیق عطا فرما۔ (۱) حضرت حسن بصری صوفیہ کے سرخیل تھے اکثر سلاسل کی ابتداء آپ پر ہی ہوتی ہے۔

۱۔ ان پر موت کے وقت فرشتے اترتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔
قتادہ اور مقاتل کا قول یہ ہے کہ جب وہ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان پر فرشتے اتریں گے (۲)۔

وکیع بن جراح نے کہا ہے خوش خبری، بشارت تین مقامات پر ملے گی موت کے وقت قبر میں اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت (۳)۔ (۱) صحیح بخاری فرماتے ہیں کہ تم خوف نہ کرو۔ اس میں ان مفسرہ ہے کیونکہ تَشْتَرُونَ عَنْهُمْ اس وحی کے معنی کو ملاحظہ فرمائیے جو قول کے معنی میں ہے۔ یا یہ ان خلفہ عن مسئلہ ہے اور اس کا اہم ضمیر شان ہے۔ یا بجران صدر یہ ہے۔ یعنی امر آخرت میں سے جس پر تم آگے پیش ہو رہے ہو اس سے خوفزدہ نہ ہو۔ چاہہاں نے اسی طرح کہا ہے اور جو اہل وعیال اور اولاد میں سے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کے بارے میں خوفزدہ نہ ہو کیونکہ ان کی جگہ تم تمہارا ساتھ دیں گے۔ خوف سے مراد ایسا تم ہے جو مستقبل میں آنے والی متوقع مصیبت اور تکلیف پر ہوتا ہے اور حزن سے مراد ایسا تم ہے جو کسی نفع بخش چیز کے ضائع ہونے یا نقصان دہ چیز کے لاحق ہونے کے سبب ہونے والی تکلیف اور دکھ کے سبب ہوتا ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کی بنا پر نہ خوفزدہ ہو اور نہ ہی کوئی حزن و ملال کرو، یعنی سزا کا خوف نہ رکھو اور گناہوں کے صلہ دہرے ہوئے پر خوفزدہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا (۴)۔ تمہیں بشارت ہو اس جنت کی جس کا دنیا میں رسولوں کی ربانی تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ابوہریرہ نے ثابت بناتی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے جب سورۃ حم اسجدہ پڑھی تو جب ارشاد باری تعالیٰ تَشْتَرُونَ عَنْهُمْ اَلْجَنَّةَ پڑھنے پر فرمایا کہ ہم تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ جب بندہ مومن کو اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس سے وہی دوفرشتے آکر ملیں گے جو دنیا میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اسے یہ کہیں گے تو نہ خوف کرو اور نہ ہی غمزدہ ہو تجھے اس جنت کی بشارت ہو جس کا تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اسے خوف سے محفوظ فرما دے گا اور اس کی آنکھوں کو کھنڈار کھے گا۔

نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُنَّ أَنْفُسُكُمْ
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۗ تِلْكَ آيَاتُ الْكُفْرَانِ ۚ لَنْ نُؤْتِيَ الْمُؤْمِنِينَ ۗ

”تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ شے ہے جو تمہارا حق ہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو گے۔ یہ میزبانانے بہت بخشے والے ہمیشہ رحم فرمانے والے کی طرف سے ہے۔“

۱۔ ہم وہ ہیں جن سے تمہارے ساتھ تھے۔ شیاطین سے تمہاری حفاظت کرتے تھے اور تمہارے ذہنوں میں اچھی اور خیر کی باتیں القا کرتے

2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (تجوید)۔

4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (تجوید)۔

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (تجوید)۔

3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (تجوید)۔

تھے اور آخرت میں بھی ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم تم سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ اور تمہارے لیے جنت میں وہ لذتیں اور عرصہ تمیں ہیں جن کی خواہش تمہارے دل کریں گے۔ اور تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کی تم تمنا اور آرزو کرو گے۔ مدعوں، دعا سے ماخوذ ہے یہ طلب کے معنی میں ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ عام ہے۔

۱۔ ترکیب کلام میں نزلا، ماحدعون سے حال ہے۔ اور اس میں اس بات پر مطلع کیا جا رہا ہے کہ جس شی کی وہ آرزو اور تمنا کریں گے اس کے مقابلہ میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جس کا تصور تک ان کے دل میں نہیں کھٹکے گا۔ اور ان کے لیے یہ عطا ایسے ہی ہوگی جیسے مہمان کے لئے میزبانی ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ میزبان ہوگا اور اہل جنت مہمان ہونگے) بزار، ابن ابی الدنیا اور تکلی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم جنت میں پرندے کی طرف دیکھو گے اور (اس کا گوشت کھانے کی) خواہش کرو گے تو وہ تمہارے سامنے اس حال میں گر پڑے گا کہ بھونکا ہوا ہوگا (۱)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جو نبی جنت میں پرندے (کا گوشت کھانے کی) خواہش کرے گا تو فوراً بختی اونٹ کی مثل پرندہ اس کے دسترخوان پر آگرے گا۔ اسے نہ دھوئیں نے مس کیا ہوگا اور نہ ہی آگ نے چھوا ہوگا۔ وہ اس سے کھانے لگ جائے گا یہاں تک کہ سیر ہو جائیگا پھر وہ پرندہ (صحیح سالم) اڑ جائیگا (۲)۔ ترمذی اور تکلی نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ مومن جنت میں پہنچے گی خواہش اور آرزو کرے گا تو فوراً اس کی یہ خواہش پوری ہو جائیگی اور ایک گڑھی میں اس کے حمل، پیدائش اور عمر کے مراحل طے ہو جائیں گے ترمذی نے اس حدیث کو سن کہا ہے (۳)۔

ہناد نے الزہد میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اولاد آنکھوں کی خشتک ہے اور یہی کامل راحت و سرور کا ذریعہ ہے کیا اہل جنت کی اولاد بھی ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب وہ چاہے گا (۴) الخ۔

اصہبانی نے الترفیب میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک غیر مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا جب اہل جنت میں سے کوئی آدمی بچہ پیدا ہونے کی تمنا اور خواہش کرے گا تو اس کے حمل موددھ پینے اور دودھ چھڑانے کی مدت اور اس کی جوانی کے مراحل سب ایک ہی ساعت میں طے ہو جائیں گے (۵)۔

علامہ بیہقی نے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ آدمی جنت میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش کرے گا تو وہ بالظور ہو جائیگا۔ علامہ بیہقی نے اسے تاریخ وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۷﴾

”اور ہر شخص سے بہتر کس کا کلام ہے جس نے دعوتِ الٰہی کی طرف اور نیک عمل کئے اور کہا کہ میں تو (اپنے رب کے) فرمانبردار بندوں سے ہوں۔“

1۔ الترفیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 527 (القرن)

2۔ الترفیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 527 (القرن)

4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 733 (احمدیہ)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (انتجاریہ)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 80 (ناروتی)

یعنی کسی شخص کا کلام اس سے بہتر نہیں جس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی توحید کی طرف دعوت دی۔ اور نیک عمل کے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں سے ہوں۔ قول سے مراد فخر کرنا یا اسلام کو دین اور مذہب بنانا ہے یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ ہذا قول فلان۔ یعنی یہ فلاں کا مذہب ہے۔

محمد بن سیرین اور سدی نے کہا ہے کہ ہذا قول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بندہ مؤمن ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعوت اسلام کو قبول کیا اور اعمال صالحہ کئے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں (1)۔

حضرت امام ابوحنیفہ عاشر صدیق رضی اللہ عنہما نے فرمایا میرا خیال ہے کہ یہ آیت مؤمنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (2) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دعاء ائی اللہ سے مراد اذان دینا ہے اور وَعَيْلًا صَلَاتًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔

تیس بن حازم نے کہا ہے کہ وَعَيْلًا صَلَاتًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھنا ہے (3)۔

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان اس کے لئے نماز ہے جو پڑھنا چاہے۔ متفق علیہ (4)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نہیں جانتا، تحقیق حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دعا جو نہیں کی جاتی جو اذان اور اقامت کے درمیان کی جائے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے (5)۔

اذان کی فضیلت کا بیان: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا قیامت کے دن تمام لوگوں میں مؤمنین کی گردنیں بلند اور طویل ہوں گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک مؤمن کی آواز جن دہن اور دیگر مخلوق میں سے کوئی سنتا ہے قیامت کے دن وہ اس کے لئے شہادت دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (7)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا امام خاصین ہوتا ہے اور مؤمنین امین ہوتا ہے۔ اے اللہ! اماموں کو ہدایت عطا فرما اور مؤمنوں کی مغفرت فرما (8)۔ اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور امام شافعی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سات سال تک ثواب حاصل کرنے کے لئے خلوص نیت کے ساتھ اذان کہی اس کے لیے جہنم سے برات لکھ دی گئی (9) اسے ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین آدمی جنت کے ٹیلوں (یعنی بلند مقامات) پر ہوں گے ایک وہ

- 1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (بخاری)
- 2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 684 (اعلیٰ)
- 3- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (بخاری)
- 4- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 87 (ترمذی)
- 5- جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 199 (قاروقی)
- 6- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 167 (ترمذی)
- 7- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 86 (ترمذی)
- 8- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 486 (ارشاد)
- 9- جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 29 (قاروقی)

غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا حق بھی دوسرا وہ آدمی جس نے کسی قوم کی امامت کی ذمہ داری ادا کی اور وہ لوگ اس سے راضی اور خوش رہے۔ اور تیسرا وہ آدمی جو ہر روز پانچ نمازوں کے لئے اذان کہے (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث فریب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک مؤذن کی آواز جاتی ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ ہر خشک وتر شے اس کے لئے شہادت دے گی۔ نماز میں حاضر ہونے والے کے لئے پچیس نمازوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور دو نمازوں کے درمیان ہونے والے نگاہ اس سے مناد یہے جاتے ہیں (2)۔ رواہ احمد و ابو داؤد ابن ماجہ حضرت اہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (وقت) ہیں جن میں دعا روئیں کی جاتی یا بہت کم رو کی جاتی ہے ایک اذان کے وقت دعا اور دوسرا جنگ کے وقت کی دعا جبکہ لوگ آپس میں باہم دست و گریبان ہوں (3)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے بارہ سال تک اذان کہی اس کے لئے جنت واجب ہوگی۔ ہر روز اس کے لئے اذان دینے کے سبب ساٹھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ہر اقامت کہنے کے سبب تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعا مانگنے کا حکم دیا جاتا تھا (5)۔ اسے علامہ بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔

فصل :- اذان کے جواب کا بیان۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم مؤذن کی اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود پاک پڑھو کیونکہ جو ایک بار مجھ پر درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگو۔ وسیلہ جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی ایک کو عطا کیا جائے گا۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں امور خلافت سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اذان دینے کی طاقت رکھتا تو ضرور اذان کہتا۔ پس جو میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگے گا اس پر میری شفاعت کھل جائیگی (یعنی اسے میری شفاعت نصیب ہوگی)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مؤذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر تو تم میں سے بھی ہر کوئی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر اکر اکر اکر۔ یعنی جیسے مؤذن کہتا ہے تم نے بھی اسی طرح کہا اور جب مؤذن نے کہا حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح۔ تو سننے والا یہ کہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (7)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ مؤذن تو ہم پر فضیلت پا جائیں گے (ہم سے بڑھ جائیں گے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم وہی کہو جیسے وہ کہتے ہیں۔ جب ختم کر چکو تو (جو چاہو) دعا مانگو تمہیں عطا کیا

1- مشکوٰۃ الصالح صفحہ 65 (قدیمی) 2- سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 461 (ارشاد) 3- مشکوٰۃ الصالح صفحہ 66 (قدیمی)

4- سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 396 (الحمیدی) 5- مشکوٰۃ الصالح، صفحہ 66 (قدیمی) 6- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 166 (قدیمی)

7- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 187 (قدیمی)

جائے گا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (1)۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ ادْفَعِ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَأِذَا الَّذِي
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٥٧﴾ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا
يُلْقِيهَا إِلَّا دُوحًا عَظِيمٌ ﴿٥٨﴾ وَإِمَائِكَ رَعَتْكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزَعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٥٩﴾

”نہیں یکساں ہوتی نیکی اور برائی برائی کا تذکرہ اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگہاں وہ شخص، تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے، یوں بن جائیگا گویا تمہارا جانی دوست ہے، اور نہیں تو یقین دی جاتی ان (خصائل حمیدہ) کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نہیں تو یقین دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو اور (اے سننے والے) اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو (اس کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگ یقیناً وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔“

۱۔ نیکی اور برائی جزاء اور حسن انجام کے اعتبار سے یکساں اور مساوی نہیں ہوتی دوسرا لازمہ ہے اور نفی کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں تک انسان کے لئے ممکن ہو اسے چاہیے کہ وہ بری خصلتوں اور عادات کے مقابلہ میں اچھی اور نیک خصلتوں کو ضرور اختیار کر لے۔ اسے چاہیے کہ وہ غضب اور غصے کے مقابلہ میں صبر، جہالت کے مقابلہ میں علم و بردباری، انتقام کے مقابلے میں عفو و درگزر، بغل کے مقابلہ میں سخاوت، بزدلی کے مقابلہ میں شجاعت و بہادری اور گناہ کے مقابلہ میں عصمت و پاکدامنی کو اختیار کرے اور ترجیح دے۔ اور برائی کا تذکرہ اس نیکی سے کرو جو بہتر ہے۔ آیت طیبہ میں احسن سے مراد ایسا اچھا اور نیک عمل ہے جس میں مطلقاً نیکی اور اچھائی زیادہ پائی جاتی ہو۔ (ایسا عمل مراد نہیں جو کہ برائی کے مقابلہ میں نسبتاً اچھا ہو) کیونکہ برائی میں تو بالکل اچھائی پائی ہی نہیں جاتی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے جو کسی پر غضب اور غصے کا اظہار کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کسی پر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں علم و بردباری اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو کسی سے برائی سے پیش آتا ہے تو اس کے مقابلے میں عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام تر نیکیاں یکساں نہیں ہوتیں اور نہ ہی تمام تر برائیاں مساوی ہوتی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض کو بعض پر نیکی اور برائی میں فوقیت اور برتری حاصل ہوتی ہے، لہذا جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے ساتھ برائی سے پیش آئے تو اس کا تذکرہ اور دفاع نیکیوں میں سے احسن ترین نیکی کے ساتھ کرو، جیسا کہ اگر کوئی آدمی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو اسے معاف کر دینا بھی نیکی ہے لیکن اس سے نیکی کرنا اور اچھا برتاؤ کرنا اس سے حسین تر اور اعلیٰ نیکی ہے۔

فَأِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ہے۔ اسے جملہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور اس میں عامل معنی مضافات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ آدمی جس کے درمیان اور تیرے درمیان عداوت ہے اس وقت ایسا ہو جائیگا گویا تمہارا گہرا اور جانی دوست ہے ترکیب کام میں الذی

لا شریک ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لہذا تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ ہی چاند کو۔ کیونکہ یہ بھی تمہاری طرح مخلوق اور حکم کے پابند ہیں بلکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کو کریں جس نے ان تمام کو پیدا فرمایا ہے خلقہن میں ہن ضمیر مذکورہ بالا چاروں چیزوں (رات، دن، سورج اور چاند) کی طرف راجع ہے مگر نہ مقصود ولا یتعبدون فعل کا تعلق شمس و قمر سے قائم کرنا ہے کہ تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ (کیونکہ رات اور دن کو کوئی سجدہ کرتا ہی نہیں۔) پھر سورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے ممانعت کے مقام پر ایل و نہار کا ذکر اسی لئے کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ جس طرح رات اور دن کوئی علم اور اختیار نہیں رکھتے، سورج اور چاند بھی اسی طرح ہیں (یعنی جس طرح لیل و نہار سجدہ کے لائق نہیں اسی طرح شمس و قمر بھی اس قابل نہیں کہ انہیں سجدہ کیا جائے) کیونکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے۔ امام شافعی کے نزدیک آیۃ التَّعْبُدُونَ ہی مقام سجدہ ہے، کیونکہ سجدہ کرنے کا حکم (و اسجدوا للہ) اسی کے ساتھ مقرر ہے۔ (یعنی اس مقام پر پہنچ کر سجدہ حالات اور کرنا چاہیے۔) حضرت ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ امام غلامی نے اپنی سند کے واسطے سے عبد الرحمن بن یزید سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سورۃ ہم کی پہلی آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ اور امام غلامی نے حضرت تابع کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے (۱)۔

۱۱۔ پھر بھی اگر وہ قبیل حکم اور سجدہ کرنے سے تکبر کریں (تو ان کی قسمت) کُلَّانِ امْتَلِكُوْا شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کی علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فان استکبروا لا یضرہ یعنی پھر بھی اگر وہ لوگ تکبر کرتے رہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں۔ پس وہ جو آپ کے رب کے پاس ہیں ان سے مراد انبیاء مٹانے والے اور اولیاء کرام ہیں ان عند ربک کے الفاظ سے ان کے لئے جس قرب خداوندی کا ذکر کیا گیا وہ غیر تکلیف ہے اس کی کیفیت اور حالت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

مترجمین بارگاہ الہی شب و روز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور وہ جھکتے نہیں۔ ترکیب کلام میں وہم لا یستمنون کا جملہ یا تو ماقبل پر معطوف ہے یا یہ حال ہے۔ (یعنی وادعا ظنہ ہے یا حال ہے۔) یعنی یہ ہے کہ وہ تسبیح کرتے کرتے آگے نہیں بلکہ اس سے لذت اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوالانجہ راحت پہنچاؤ (۲)۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں راحت ملتی تھی)

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وَهْمٌ لَا یَسْتَمِنُوْنَ مقام سجدہ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے نقل کیا ہے امام غلامی نے مجاہد کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے سے یہ نقل کیا ہے کہ آپ حم سزبل کی آخری (دوسری) آیت میں سجدہ کرتے تھے (۳)۔ اور ایک روایت میں یہ زاد بھی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو قول باری تعالیٰ اِنَّ لَكُمْ دِيْنًا تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے دیکھا تو اسے فرمایا تو نے جلدی کی ہے (یعنی مقام سجدہ آنے سے پہلے ہی تو نے سجدہ کر دیا ہے۔)

امام غلامی نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۃ ہم میں مقام سجدہ کے بارے سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا دونوں آیتوں کے آخر میں سجدہ کرو۔

امام غلامی نے اپنی سند سے ابوداؤد کے بارے سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ حم میں آخری (دوسری) آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ ابن سیرین

سے بھی اسی طرح مروی ہے اور قارہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول (روایت کے اعتبار سے) غریب ہے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احتیاط کے پیش نظر اس قول کو لیا ہے کیونکہ اگر حقیقی مقام جہدہ وعبدون ہو تو ہر جہدہ کو دوسری آیت کے اختتام تک منسوخ کرنا قطعاً نقصان دہ نہیں۔ اور اگر مقام جہدہ لا یستثنون ہو تو پھر اس سے قبل جہدہ ادا کرنا جائز نہیں۔ (اس لئے احتیاطاً کا تقاضا یہی ہے کہ وہم لا یستثنون پر جہدہ تلاوت ادا کیا جائے)۔

امام مجاہد نے کہا ہے کہ حاصل کلام یہ ہے کہ جہدہ تلاوت دوسری آیت میں کرنا نظر و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ مقامات جن پر بالاتفاق جہدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے وہ وہں ہیں۔

- 1- سورۃ اعراف اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمَّا اتَّبَعُوا مَا يُلْقُوا مِنْ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِمْ وَيُسَبِّحُونَكَ وَلَهُ يُسْجُدُونَ ﴿٦٠﴾
- 2- سورۃ الرعد اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے وَ لَوْ سَجُدُوا لِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظُلْمًا لَمَّا يَلْعَنُوا وَالْأَصْحَابُ ﴿٦٠﴾
- 3- سورۃ النحل اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے وَ لَوْ سَجُدُوا لِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَمَّا كَانُوا إِلَّا لِقَابٍ فِي السَّمَوَاتِ لِمَنْ سَجَدُوا وَ لَوْ سَجُدُوا لِمَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظُلْمًا لَمَّا يَلْعَنُوا وَالْأَصْحَابُ ﴿٦٠﴾
- 4- سورۃ بنی اسرائیل اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے وَ يَخْرُجُونَ لِيْلَاذِقَانِ يَسْمُومُونَ ﴿٦٠﴾
- 5- سورۃ مريم اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے إِذْ اسْتَلَّمْنَا عَلَيْهِمُ الْمِيثَاقَ حُرًّا مَسْجُودًا وَ لِيُكَلِّمَهُمُ الْكَلِمَ الْجَمِيَّةَ ﴿٦٠﴾
- 6- سورۃ الحج اس میں متن علیہ آیت جہدہ ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسْجِدُ لِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ الْاٰيٰةِ 7- سورۃ الفرقان اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ سَجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْۤا مَا الرَّحْمٰنُ اِلَّا مَا اَنْزَلْنَا مِنْ سَمٰوٰتٍ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرًا مِّنْ سَمٰوٰتٍ ﴿٦٠﴾
- 8- سورۃ نمل اس میں مقام جہدہ یہ آیت ہے اَلَا يُسْجِدُ الْاِنْسَانُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُ مِنْ نَفْسٍ عَلِيْقَةٍ ﴿٦٠﴾
- 9- سورۃ المرزوق اس میں مقام جہدہ سما گیا ہے اِنَّمَا الْاِنْسَانُ لِرَبِّهِ الْكَافِرُ الْوَكْبٰنُ ﴿٦٠﴾
- 10- سورۃ حمز تزل اس میں مقام جہدہ میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے وہ وعبدون ہے اور بعض کے نزدیک وہم لا یستثنون ہے۔

مذکورہ مقامات میں سے ہر مقام میں کلام بصورت خبر مذکور ہے، یعنی اس میں تکبر کرنے کے تکبر کرنے کا ذکر ہے یا خشوع و خضوع کرنے والوں کے خشوع کا بیان ہے۔ اور ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم تکبر کرنے والوں کی مخالفت کریں اور خشوع کرنے والوں کی موافقت اور پیروی کریں۔ ان میں سے کسی مقام پر بھی جہدہ کرنے کا حکم موجود نہیں۔ اور بعض دیگر مقامات پر ہم نے دیکھا ہے کہ جہدہ کا ذکر صیغہ امر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اَفْتَحْنَا لِيُوْسُفَ وَ اِسْحٰقَ مِثْلَ الَّذِيْ اَوْفَعْنَا لِمُوْسٰى وَ هٰذَا سِجْدٌ لِلّٰهِ لَكِن لِّمَنْ اِنَّ مَقَامَاتِ پر بالا جماع جہدہ تلاوت واجب نہیں ہے۔ لہذا اس میں نظر و فکر اور غور و تدبر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں صیغہ امر کے ساتھ جہدہ کا حکم دیا گیا ہے اس کو عبادت اور جہدہ نماز پر محمول کیا جائے گا۔ (جہدہ تلاوت پر نہیں) اور وہ تمام مقامات جہاں جہدہ کا ذکر بصورت خبر مذکور ہے وہاں جہدہ تلاوت ادا کی گئی واجب ہوگی۔ یہ نظر و فکر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ سورۃ حج میں دوسرا جہدہ مذہب کیونکہ وہاں صیغہ امر مذکور ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ كَلِمَةَ الْاِسْحٰقِ وَ اِسْحٰقُ مِثْلَ الَّذِيْ اَوْفَعْنَا لِمُوْسٰى وَ هٰذَا سِجْدٌ لِلّٰهِ لَكِن لِّمَنْ اِنَّ مَقَامَاتِ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے مراد نماز کا جہدہ ہے اور اس کی دلیل اس کے ساتھ رکوع کا ذکر ہونا ہے (چونکہ رکوع سے مراد تو بالظن نماز کا رکوع ہے اس لئے جہدہ سے مراد بھی نماز کا جہدہ ہی ہونا چاہیے) اسی ضابطہ کے مطابق اس سورت میں پہلی آیت پر جہدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس میں واسجدوا صیغہ امر کے ساتھ جہدہ کا ذکر مذکور ہے۔ اور دوسری آیت پر جہدہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں کلام بصورت خبر مذکور ہے۔

یہی نظر و فکر تقاضا کرتی ہے کہ سورہ ص میں جحدہ تلاوت ہو جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا بخلاف دوسرے ائمہ کے، کیونکہ اس میں بھی مقام جحدہ پر کلام بصورت خبر مذکور ہے نہ کہ بصورت امر۔ اور وہ یہ ارشاد خداوندی ہے **فَاسْتَعِزَّزْ بِهَا وَخَرَّكَهَا كَخَلَا**۔ اسی طرح سورہ اذا السماء انشقت میں ہے **فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢﴾**۔ تو یہ بھی محل اخبار ہے امر نہیں (اس لئے اس مقام پر بھی جحدہ تلاوت ہوگا۔) مگر نظر و فکر یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ سورہ النجم اور اقراء میں جحدہ تلاوت نہ ہو کیونکہ دونوں سورتوں میں مقامات جحدہ میں صیغہ امر ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ النجم میں ارشاد ربانی ہے **فَاسْمِعْهُ الْجُودَ وَاللَّهُ يَعْتَبِدُ ذَا ۝** اور سورہ اقراء میں ارشاد ہے **وَالسُّجْدَ وَالْأَقْرَبَ ۝**۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ان مقامات پر قاعدہ نظر و فکر کی اتباع و پیروی نہیں کی۔ اس لئے کہ آپ کے نزدیک یہ بات ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مقامات پر جحدہ اور فرمایا جیسا کہ ہم نے ان مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مفصل سورتوں میں کہیں جحدہ تلاوت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے سورہ بروج میں وہ مفصل دلائل ذکر کئے ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس میں دو جحدہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْتَرَى الْآرْمَضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَاءَ اهْتَرَّتْ وَ
سَابَتْ ۚ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُسْحِي الْمَوْتِ ۚ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٥٠﴾ إِنَّ
الَّذِينَ يُحَدِّثُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْهَا ۚ آفَسَ يُلْتَمَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ آمْرٌ مَن
يَأْتِي ۚ آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ اعْمَلُوا مَا يَشَاءُكُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٥١﴾

”اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ (کسی وقت) خشک بھر ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو جھونے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے۔ بیشک وہ (قادر مطلق) جس نے زندہ کر دیا ہے زمین کو وہی زندہ کرنے والا ہے مردوں کو۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو پھینکا جائے گا آگ میں وہ بہتر ہے یا جو آبیگا اس و سلاستی کے ساتھ قیامت کے دن (وہ بہتر ہے) تم وہ کرو جو تمہاری مرضی۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو، وہ خوب دیکھ رہا ہے۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ تو کسی وقت زمین کو خشک غبار آلود دیکھتا ہے، اس میں کہیں نباتات اور سبزہ دکھائی نہیں دیتا۔ خَاشِعَةً کا لفظ خشوع بمعنی تزلزل سے مجاز خشک غبار آلود کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے پھر جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہ جھونے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے، یعنی نباتات اور سبزہ نکلنے کے سبب ابھرتی اور پھول جاتی ہے۔ بیشک وہ قادر مطلق جس نے زمین کی نباتات اور سبزہ کو زندہ کر دیا ہے وہی قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہ زندگی عطا فرمانے اور موت دینے وغیرہ پر پوری طرح قادر ہے۔

۲۔ مجاہد نے کہا ہے **يُحَدِّثُونَ فِي آيَاتِنَا** کا معنی سیٹیاں اور تالیاں بجانا، بشور و غل کرنا اور لغو اور غلط باتیں کرنا ہے۔ (یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات سننے کے وقت تالیاں بجاتے ہیں اور شور و غل کرتے ہیں۔) قتادہ نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے

ہیں۔ ساری نے کہا ہے جو معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں۔ مقالے نے کہا ہے یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تم اسے اس کے اپنے مقام پر رکھو اور اس میں اپنی خواہشات کی اتباع نہ کرو (۱)۔

میں کہتا ہوں کہ **يُجَادِلُونَكَ لِقَاعًا** عام ہے جو کہ تکذیب کرنے اور لغویات بکنے والوں کو بھی شامل ہے اور تحریف کرنے اور اسلاف کی تاویلات کے خلاف تاویلات باطلہ کرنے والوں کو بھی شامل ہے، یعنی جو لوگ کسی بھی اعتبار سے ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، پس وہ سزا اور انتقام سے بچ نہیں سکتے۔ **المن** بقلی۔ میں امزہ و استہقام، انکاری کے لیے ہے اور قاء مخدوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام ہے **بمغتصو** هولاء **والکفار** و **یعمجون** بانفسہم **المن** بقلی **فی النار** (یہ کفار فخر کر رہے ہیں اور اپنے نفسوں پر اتر رہے ہیں۔ کیا جو آگ میں پھینکا جائے گا وہ بہتر ہے یا قیامت کے دن جو اسن و سلامتی کے ساتھ آئے گا وہ بہتر ہے؟) ابن مندرد نے بشر بن قح سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو جہل اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے (2)۔ بعض نے کہا ہے کہ **من** یا **فی** اصناف سے مراد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور بعض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مراد لئے ہیں۔ آیت کے یہ الفاظ مذکورہ تمام افراد کو بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں پھینکے جانے کے مقابلے میں مبالغہ کے لئے اسن و سلامتی کے ساتھ آنے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس طرح کہا جاتا کہ وہ بہتر ہوگا جو آگ میں پھینکا جائے گا یا وہ جو جنت میں داخل ہوگا؟ کیونکہ کلام کا مفاد اسکی ہے کہ اسن و سلامتی کے ساتھ آنے والا اس سے بہتر ہوگا جسے آگ میں پھینکا جائے گا تو جسے عزت و کرم دی جائے گی اور وہ جنت میں داخل ہوگا تو اس کے ساتھ مساوات کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

اے کفار! کفر و معاصی میں سے جو چاہو کرتے رہو یقیناً جو بچھ تم کرتے ہو وہ خوب دیکھ رہا ہے اور تمہیں اپنے اعمال کی پوری سزا دی جائے گی۔ اس جملہ میں ان کے لیے شدید وعید اور جھمک ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّ لَهُمْ لَكِتَابًا عِزِّينًا ﴿١٠﴾ لَا يَأْتِيهِمُ الْبَاطِلُ
مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَتَنَزَّلُ مِّنْ حَكِيمٍ حَسِيدٍ ﴿١١﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا
قَدْ نَزَّلَ لِلرَّسُولِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَكُنُوعٌ مَّعْفُوفٌ ﴿١٢﴾ وَذُو عَقَابٍ ﴿١٣﴾

”بیٹک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا جب وہ ان کے پاس آیا (تو وہ ہٹ دھرم لوگ ہیں) اور بیٹک یہ بڑی عزت (حزمت) والی کتاب ہے، اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے یا ساری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سرا ہے کی طرف سے، (اے حسیب!) نہیں کہا جاتا آجکو مگر وہی جو کہا گیا پیغمبروں کو آپ سے پہلے۔ بیٹک آپ کا پروردگار (اہل ایمان کے لئے) بہت بخشنے والا اور (سکرین کے لئے) درد ناک عذاب دینے والا ہے۔“

۱۔ ذکر سے مراد قرآن کریم ہے۔ ترکیب کلام میں ان اپنے جملہ کے ساتھ مل کر **إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ** سے بدل ہے۔ یا جملہ مستانف ہے۔ اور ان کی خبر مخدوف ہے۔ اور وہ معاندون (بیٹک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا وہ عتاد رکھنے والے ہیں) یا

ہالکون ہے (یعنی وہ ہلاک ہونے والے ہیں) یا پھر خبر بجزا بیہم بکفر ہم ہے۔ (یعنی اللہ انہیں ان کے کفر کی سزا دے گا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی خبر بعد میں آنے والا یہ ارشاد کر ہی ہے اولئک بنا دون من مکان بعید۔ اور بیشک قرآن کریم بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے۔ ترکیب کلام میں ذَرَاةٌ لِّکَبِّتٍ عَلٰی حَالٍ ہے یا جملہ مستفہ ہے۔ کبھی یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عزت والی ہے اور قنادہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی عزت اور نغہ عطا فرمایا ہے کہ باطل اس کی جانب قطعاً راہ نہیں پاسکتا (1)۔

۲۔ قنادہ اور سدی نے کہا ہے کہ باطل سے مراد شیطان ہے (2) یعنی شیطان اس میں تغیر و تبدل کرنے یا اس میں کمی بیشی کرنے کی قطعاً طاقت نہیں رکھتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ جن و انس میں سے تمام شیاطین کو شامل ہے۔ جیسا کہ رؤف نے قرآن کریم دس پاروں کا اضافہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس مذموم کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تہمید اور کفر فریب کو رد کر دیا۔ پھر انہوں نے بعض آیات میں بعض الفاظ کا اضافہ کیا مثلاً انہوں نے قول باری تعالیٰ اِنَّمَا اَنْتَ مُنذِرٌ وَّذِیْکَ قُوٌّ وَّحَدِیْجٌ کے بعد لفظ علی کا اضافہ کر دیا اور وَتَسْتَعْلِمُ اَنْ یُّزِنَ تِلْکَ لَوْنًا کے بعد آل محمد کے الفاظ بڑھا کر پھر آخِرٌ مِّنْ قَلْبٍ یَّسْتَفْهِمُوْنَ کیا۔ اسی طرح کی انہوں نے ناکام کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کوشش کو باطل اور مردود قرار دیا اور ان کے بڑھانے ہوئے الفاظ جز و قرآن نہ بن سکے۔

زجاج نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم محفوظ ہے اس کے نزدیک نہ تو باطل سامنے آ سکتا ہے یعنی اس میں کمی بیشی کی جا سکتی۔ اور نہ ہی باطل پیچھے سے اس کے نزدیک آ سکتا ہے، یعنی اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معنی کی بناء پر باطل سے مراد کمی بیشی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تکلیف نہ تو ان کتابوں میں سے کسی سے ہو سکتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کتاب آئے گی جو اسے باطل قرار دے یا اسے منسوخ کر دے (3)۔ یہ قرآن کریم اتر ا ہوا ہے اس کی طرف سے جس کی حکمت کامل ہے اور سب خوبیاں مولا ہے۔ ہر مخلوق اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے کیونکہ ہر مخلوق پر اس کی نعمتیں عیاں ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ہی حید ہے وہ کسی غیر کی حمد و ثناء کا محتاج نہیں۔

۳۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی دینے کے لئے نازل کی گئی ہے اس طرح کہ جو کچھ کفار مکہ آپ کو کہہ رہے ہیں (وہ کوئی نئی اور نوجھی باتیں نہیں بلکہ) اسی کی مثل آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کو بھی کہا گیا۔ کہ اے ساحر کذاب! ہذا آپ بھی انہی کی طرح صبر کیجئے اور قطعاً غمزدہ نہ ہوں۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ آپ کی طرف بھی ایسے ہی وحی کی گئی جیسا کہ آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی گئی تھی، یعنی توحید باری تعالیٰ کے احکام و مہدوں کے اصول و ضوابط اہل ایمان کے لئے (دووں جہاں میں کامیابی و کامرانی کا) وعدہ اور کفار کے لئے طرح طرح کی وعید بڑی و بیرونی نازل کی گئی۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ قول کا مقولہ یہ جملہ ہے اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرٍ وَّوَدُوْدٍ عَفَیْۤ اَیْمِیۡنٍ۔ بیشک آپ کا رب اہل ایمان کے لئے بہت بخشنے والا اور مسکرنے کے لئے دردناک عذاب دینے والا ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہ جملہ مستفہ ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآٰنًا عَجَبِیًّا لَّآلَؤًا لَّوَلَا فُصِّلَتِ الْآیٰتُ لَعَجَبِیُّوۡا وَعَرَبِیُّ قُلُوبُهُمْ

لَا يَنْبَغُ أَنْ تُؤْمَرُوا بِشَيْءٍ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَسَىٰ
 أُولَٰئِكَ يُنَادُونَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ۖ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ فَأَحْبَبَ فِيهِ ۖ وَلَوْلَا
 كَرَمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِّبَ بَيْنَهُمْ ۖ وَإِنَّهُمْ لَكُلِّ شَيْءٍ مُنْهَ مَرِيضٍ ۖ مَنْ عَمِلَ
 صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۖ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لَدُنَّ عِبَادٍ ۖ

”اور بالفرض اگر ہم اسے بنا کر بھیجے قرآن مجلی زبان میں تو کہتے کیوں نہ کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں۔ کیا چنچا ہے کتاب مجلی اور نبی عربی! آپ فرمائیے ایہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے توحید ایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ بین ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے۔ انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے، اور ہم نے عطا فرمائی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ اور اگر ایک بات طے نہ ہوگئی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو (ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان۔ اور بیشک وہ ایک شک میں جتنا ہیں اس کے بارے میں جو بے چین کر دینے والا ہے، جو نیک عمل کرتا ہے تو اپنے بھلے کے لئے اور جو برا لکھتا ہے اس کا وبال اس پر ہے۔ اور آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“

۱۔ جب کفار نے بہت دھرمی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محفل اعتراض کی غرض سے یہ کہا کیا قرآن کریم کسی عجمی زبان میں نازل ہوا ہے؟ جیسا کہ تو ریز اور انجیل عجمی زبان میں نازل ہوئیں تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ کہ یہ قرآن جو تم لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہو اگر ہم اسے اس طرح بنا دیتے کہ یہ عجمی زبان میں پڑھا جاتا۔ تو پھر اہل مکہ یہ کہتے کہ اس کی آیتیں عربی زبان میں کھول کر واضح انداز میں کیوں نہ بیان کی گئیں؟ تاکہ ہم بھی انہیں سمجھ لیتے اور ہم فریفتہ حاصل کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ان جملوں کے ساتھ متصل ہے جو سورت کی ابتداء میں قرآن کریم کی مدح و توصیف میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی کتاب فُضِّلَتْ لِأُمَّتِنَا۔

عَرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ گویا ہوا ہے اور رسول عربی ہے اور رسول عربی ہے) اور باقیوں نے اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہاں تنہا ام انکاری ہے۔ ابو بکر ہمزہ اور کسائی نے دونوں ہمزوں کو ثابت رکھا ہے۔ جبکہ باقیوں نے ایک ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابو عمر دونوں اسے اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ ان کا قول ہے کہ ہمزہ محققہ اور ہمزہ ملینہ کے درمیان الف کو داخل کرنا چاہئے۔ و درش نے اس کے اصول کے مطابق دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دیا ہے اور دونوں ہمزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ علامہ ابن کثیر نے بھی اصل کے مطابق دوسرے ہمزہ کو بغیر کسی فاصل کے بین بین پڑھا ہے۔ حفص اور ابن ذکوان نے بھی صرف اس مقام پر ہی اس طرح پڑھا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامر حفصی کے غلام یبار کے پاس تشریف لے جاتے تھے وہ یہودی اور عجمی نژاد تھا۔ اس کی کنیت ابو بکر تھی۔ مشرکین کہنے لگے کہ یبار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے آقا نے اسے خوب مارا اور کہا تو تم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے؟ تو یبار نے کہا (ایسا ہرگز نہیں بلکہ) وہ مجھے تعلیم دیتے ہیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (۱)۔

علامہ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قریش نے کہا یہ قرآن عربی اور عجمی دونوں زبانوں میں کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے آیت **لَقَالُوا لَوْلَا نُفِّلَتْ إِلَيْهِمْ أَلْفُ نَزْلِ** اور اس آیت کے بعد اس میں لکل لسان نازل فرمایا (1)۔ ابن جریر نے کہا ہے کہ عجمی کی قرأت بغیر ہمزہ واستفہام کے ہے۔

۱۔ ابو محمد اسلمی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیتے ہیں قرآن کریم اہل ایمان کے لئے خلافت و مگر ای سے ہدایت دینے والا اور سینہ میں موجود مرض جہالت اور قلب و نفس کو اوصاف رزلیہ جیسی امراض کے لئے بہت بڑی شفا ہے۔ شفاء میں جو بین اور حکیم تعظیم کے لئے ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم جسمانی بیماریوں اور دردوں کے لئے شفا ہے۔ ترکیب کلام میں **وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ** متدا ہے اور اس کی خبری قیاد انہم وقتل ہے۔ وقر کا معنی قتل اور بوجھ اور بہرہ پن ہے۔ عجمی سے مراد ظلمت تاریکی اور شبہات ہیں۔ قیادہ نے کہا ہے کہ ایمان نڈلانے والے قرآن کریم سے اندھے اور بہرے تھے۔ اس لئے وہ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتے تھے (2)۔ انھس نے کہا ہے دو عالموں کے دو موموں پر عطف جار ہے۔ اور مجرور مقدم ہے۔ لہذا ان کے نزدیک الذین اسم موصول للذین آمنوا اھل اھدی و شقاوت پر معطوف ہے۔ **وَلَقَدْ بَعَثْنَا لِقَوْمِكَ مِنْهُنَّ مَنَّانًا**۔ میں کفار کے قرآن کریم کو نہ سننے اور اسے قبول نہ کرنے کو اس آدمی کے ساتھ بطور تشبیہ و تمثیل بیان کیا ہے جسے بہت دور مسافت سے پکارا جا رہا ہو (اگرچہ وہ کچھ آواز سنتا ہے مگر سمجھتا کچھ نہیں) جس ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی ہیں اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ فاختص فیہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مابین کتاب کی تصدیق و تکذیب کرنے کے اعتبار سے بہت اختلاف ہوا جیسا کہ قریش نے قرآن کریم کے بارے اختلاف کیا ہے۔

اور اگر جھٹلانے والوں سے قیامت کے دن تک عذاب مؤخر کرنے یا ایک مقررہ مدت تک عذاب مؤخر کرنے کی ایک بات آپ کے رب کی طرف سے طے نہ ہو گئی ہوتی تو ابھی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی انھیں دنیا میں ہی عذاب دے دیا جاتا اور ہلاک و برباد کر دیا جاتا۔ بیگ تکذیب کرنے والے تو ریت یا قرآن کریم کے بارے میں ایک شک میں جھلا ہیں۔ جو تک عمل کرتا ہے تو وہ اپنے نفع اور فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وہ ہال اور نقصان اسی پر ہے۔ آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ پس وہ نیکی کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور نہ انہوں نے کرنے والوں کی سزا میں اضافہ نہیں کرے گا۔

کفار پر یہ تعزیر کرنے کے لئے کہ وہ بہت زیادہ ظلم کرنے والے ہیں اور ظلم و زیادتی میں انتہائی مبالغہ کرتے ہیں ظلام مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تو قطعاً ظلم و زیادتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (چاہے وہ تھوڑا ہی زیادہ) کیونکہ ظلم وہ ہوتا ہے جو غیر کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کیا جائے۔ (اور اللہ تعالیٰ تو ساری کائنات کا خود مالک ہے اسلئے یہاں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا)۔

لَا يَوْمَ يُدْعَى السَّاعَةَ ۗ وَمَا تَجْرَبُونَ ۗ سَرَاتٍ قَبْلُ ۗ كَمَا هُمْ وَأَمْ تَنْجِلُونَ مِنَ النَّاسِ ۗ وَلَا تَصْغُرُ إِلَّا يَوْمَ يَوْمَ يَبْدَأُ بِهِمُ آيَاتِنَا ۗ فَكَأَيُّ قَوْمٍ قَالُوا أَذْنُكَ ۗ مَا مِمَّا مِنْ

سَّهِيْبًا ۝ وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَلُّوا مَا لَهُمْ مِنْ مَّجِيْبٍ ۝

”اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم۔ اور جس کوئی پہل اپنے غلاموں سے اور نہ حاملہ ہوتی ہے کوئی مادہ اور نہ پچھتی ہے اس کے علم کے بغیر۔ اور جس روز وہ انہیں پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟ کہیں گے ہم (پہلے) عرض کر چکے ہیں ہم میں سے کوئی بھی (اس پر) گواہی نہ دے گا۔ اور تم ہو جائیں گے ان سے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔“

قیامت قائم ہونے کے وقت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ یعنی جس سے بھی قیامت قائم ہونے کے وقت کے بارے سوال کیا جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ یہ کہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے (اللہ اعلم) کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی اس کے بارے نہیں جانتا۔ اور کوئی پہل اپنے غلاموں سے نہیں نکلتا۔ اکمام، کسم کی جمع ہے اس کا معنی غلاف اور خول ہے۔ نافع ابن عامر اور حفص نے ثمرات جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بطور جنس واحد کی صورت میں شترہ پڑھا ہے۔ اور مانفہ ہے۔ من ثمرات میں من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور ثمرات محل رفع میں ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ماموصلہ ہو اور الساعیدہ پر معطوف ہو اور کن بیان یہ ہو۔ بخلاف اس ارشاد کے وَمَا تَشَاءُونَ مِنْ اٰمَلِيٍّ۔ اس میں بالیقین مانفہ اور من زائدہ ہے۔ اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے علم کے بغیر پچھتی ہے۔ یعنی اس کے علم کا تعلق اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اس کے سوا قیامت کا علم کوئی نہیں رکھتا اسی طرح جو پہل غلاموں سے نکلتے ہیں اور جو مادہ حاملہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے بارے بھی کوئی نہیں جانتا۔ ترکیب کلام میں الابلعہ، استسنا مفرغ ہے اور یہ علی سبیل التنازع سابقہ تینوں افعال کی طرف متوجہ ہو رہا ہے آخری فعل اس میں عامل ہے اور پہلے دونوں میں اسے مقدر مانا گیا ہے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ شریکین کو اس قول کے ساتھ پکارے گا ابن شکرہ عی؟ (کہاں ہیں میرے شریک؟) ابن کثیر نے شریکوں میں یاہ کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ یعنی اللہ تعالیٰ بطور استہزاء و زجر و توبخ کے لیے ان سے پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جنہیں تم الگ مان کرتے تھے؟ شریکین جواب دیں گے اب ہم تجھے عرض کر رہے ہیں ہم میں سے کوئی بھی اس پر گواہی نہ دے گا، یعنی ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کے لئے شریک کی عبادت دے گا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے۔ یعنی جب وہ عذاب کا مشاہدہ آنکھوں سے کر لیں گے تو وہ ان معبودان باطلہ سے اپنی عبادت کا اظہار کریں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کا مشاہدہ کر رہا ہو کیونکہ وہ ہم سے غائب ہو چکے ہیں۔

یعنی اور ان سے تم ہو جائیں گے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے، یعنی وہ انہیں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گے یا وہ ان سے غائب ہو جائیں گے اور وہ انہیں نظر تک نہیں آئیں گے۔ من قبل سے مراد ہے آج کے دن سے پہلے، یعنی دنیا میں۔ وظنوا کا معنی ہے اور وہ یقین کر لیں گے ماثلتہم قرآن مجید میں۔ کہ اب ان کے لئے بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ محض بھاگ جانے کی جگہ۔ فلن کو حرف نفی کے سبب عمل سے روک دیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے ماثلتہم قرآن مجید میں۔ جملہ منفیہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

لَا يَسْمَعُ الْاِنْسَانُ مِنْ دَعَاِ الْخَيْرِ ۚ وَ اِنْ سَمِعَ الشَّرَّ فَيَسُوْسُ فَمَا يَسُوْسُ ۚ وَ لٰكِنْ اَذْقَنَهُ
مَرَحًا ۚ وَمَا مِنْ بَعْدِ مَرَاۗءَ مَسْتَهۗٔ يَفُوْلُوْنَ هٰذَا ۙ وَ مَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۙ وَ لٰكِنْ

سُرَّحْتُ إِلَى سَرَاتِي إِنَّ لِي عِنْدَكَ لِلصَّغِي ۚ فَلْتَسْتَبِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا ۗ وَ
لَنْ يَنْفَعَهُمْ مِنْ عَذَابِ عَلِيِّ ۝

”نہیں اکتا انسان بھلائی کی دعا کرنے سے۔ اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل مایوس (اور) ناامید ہو جاتا ہے اور اگر ہم چکھائیں اسے رحمت اپنی جناب سے اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے تو کہتا ہے میں اسی کا مستحق ہوں۔ اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہوگی۔ اور اگر میں لوٹا یا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا۔ (یہ حق کیا سوچ رہے ہیں) ہم تو آگاہ کریں گے کافروں کو جو کجرت انہوں نے کئے اور ہم ضرور چکھائیں گے انہیں سخت عذاب سے۔“

۱۔ کافر انسان بھلائی کی دعا کرنے سے نہیں اکتا، یعنی مسلسل اللہ تعالیٰ سے مال و دولت اور صحت و تندرستی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہی رہتا ہے۔ اور اگر اسے فقر و افلاس اور بیماری میں سے کوئی تکلیف آ پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی راحت و رحمت سے بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

۲۔ اور اگر ہم کافر کو اپنی جناب سے رحمت چکھائیں اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور رحمت سے مراد مال و دولت اور صحت و عافیت ہے۔ لَيْقُوْنَ لَطْفَ الْمَلِكِ الْعَلِيِّ ۙ لفظ جواب قسم ہے اور معنی شرط ہے۔ یعنی کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے کیونکہ مجھ میں جو فضل و کمال اور علم و عمل پایا جاتا ہے (اس کا تقاضا ہے کہ یہ مجھے حاصل ہو) یا یہ سب میرے لئے دعا کی اور ہمیشہ رہنے والا ہے کبھی زائل نہیں ہوگا۔ اور میں تو گمان بھی نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا گیا۔ اب و عمر و نافع سے قانون سے اختلاف روایت کے ساتھ رہی کی یاہ کو مستخرج پڑھا ہے اور باقیوں نے یاہ کو ماسکن پڑھا ہے۔ تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا۔ یعنی اگر بالفرض قیامت قائم بھی ہوگی تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس بھی عزت و کرامت کے ساتھ میری حالت اچھی اور بجز ہوگی۔ اور اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں (مال و متاع اور صحت و عافیت) اس کے پاس ہے وہ اس کا استحقاق ہے لہذا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی اس سے یہ عزت و کرامت بھی جدا نہ ہوگی۔

۳۔ فَلْتَسْتَبِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ۔ محذوف قسم کا جواب ہے اور فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ ہے ہم تو کافروں کو آگاہ کریں گے جو کجرت انہوں نے کئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ معنی یہ ہے ہم باہتین انہیں ان کی بد اعمالیوں پر فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کریں گے (۱)۔ اور ہم انہیں سخت عذاب ضرور چکھائیں گے جس سے دور ہونا اور بچنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔

وَإِذَا أَعْتَبْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۗ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُودًا ۗ عَاثٌ
عَرِيضٌ ۝ قُلْ أَسْرَأْتُكُمْ إِن كَانُوا مِنْ عِندِ اللَّهِ لَمَّا كَفَرْتُمْ بِهِ مِنْ أَصْلَابٍ وَمِنْ
هُوَ فِي سَفَاتِكُمْ بَعِيدٌ ۝

”اور جب ہم احسان فرماتے ہیں انسان پر تو وہ (تکبر سے) منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔ اور جب اسے

تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ فرمائیے (اے کافر!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو۔

۱۔ اور جب ہم کافر انسان پر احسان فرماتے ہیں تو وہ (شکر کے سبب) شکر کرنے سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلوی جی کرنے لگتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جانب سے مراد کناہتکس ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ جنب اللہ میں جنب سے مراد ذات ہے۔ یعنی وہ اپنے نفس کو ادائے شکر سے دور لے جاتا ہے اور انتہائی زیادہ مغفلت کے سبب کلی طور پر وہ شکر سے دور ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ کثرت سے دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ آیت میں عرض یعنی کثیر ہے اور یہ اس شئی سے مستعار ہے جس کا عرض وسیع ہو اور مقصود کثرت کی خبر ہے۔ محاورہ عرب میں طول و عرض (لمبا چوڑا) کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے اطال فی الکلام و الدعاء و اعرض۔ (اس نے کام اور دعائیں کثرت کی) اور عرض طویل کی نسبت زیادہ بلخ ہے کیونکہ طول (لمبائی) اور چوڑائی کی دو مسافتوں میں سے) طویل اور لمبی مسافت کو کہا جاتا ہے اور جب عرض بھی اسی کی مشابہت ہو جائے تو پھر اس کی وسعت کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خست کی وسعت کے بارے ارشاد فرمایا جَعَزَ عَنِ السَّلْمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝

قول باری تعالیٰ وَاِذَا مَسَّهٗ الضُّرُّ قُلُوْبًا وَعَمَّرَ عُنُقًا ۝ یعنی کھینکھینک کے مابین بظاہر منافات اور تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں اور تو م مراد ہے۔ جبکہ دوسری آیت میں ان کے سوا دوسرے لوگ ہیں۔ شاید پہلی آیت کفار کے بارے ہے کیونکہ وہی مایوس اور ناامید ہوتے ہیں جیسا کہ ان ارشادات میں بھی ہے وَلَا يَاقِيْنُ ۝۱۱۱ مِّنْ تَرَاوَعِ اللّٰهُ اِلَّا اَلْقَهْوَمُ ۝۱۱۲ اَلْكَافِرُوْنَ ۝۱۱۳ وَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سَمٰوٰتٍ رَّابِعَةً ۝۱۱۴

دوسری آیت، یعنی قُلُوْبًا وَعَمَّرَ عُنُقًا یعنی نفس مائل مومنین کے بارے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیتیں کفار کے بارے ہوں اور مراد یہ ہے کہ جب انہیں تکلیف اور کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے پورے خلوص نیت کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ اور جب دعا کی قبولیت میں ذرا تاخیر دیکھتے ہیں تو بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں جبکہ صالح مومنین کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ وہ کبھی بھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتے بلکہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہاتھیں کسی حکمت کے تحت دعا کی قبولیت میں تاخیر ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں یا تو جلد ہی (دنیا میں) عطا فرماتا ہے یا پھر ان کے لئے اسے اپنے پاس ذخیرہ کر لیتا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ وہ دل سے تو مایوس اور ناامید ہوتے ہیں اور زبان سے کثرت سے لمبی چوڑی دعائیں کرتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ وہ ہتوں سے ناامید ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کثرت سے دعائیں مانگتے ہیں۔

مسئلہ: جو آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ شدت اور مصیبت کے وقت میں اس کی دعا قبول ہو تو اسے چاہئے کہ وہ فراموشی اور خوشحالی کی حالت میں کثرت سے دعائیں مانگے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح ہے۔

۱۱۔ آپ فرمائیے (اے کافر!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو۔ یہ جملہ ارشاد باری تعالیٰ قل هو للذین امنوا ہدی وشفاء سے متصل ہے۔ گویا کماصل یہ ہے کہ تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم موصول کو رکھا گیا ہے تاکہ ان کے حال کی وضاحت ہو سکے اور ان کے بہت زیادہ گمراہ

ہونے کی علت بیان ہو سکے۔ کیونکہ یہ ارشاد اس قول کے معنی میں ہے کہ اگر یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو بلاشبہ یہ حق اور حج ہے اور مخالفت کرتے ہوئے اس کا انکار حق سے انتہائی زیادہ دوری ہے اور تم نے اس کا انکار کیا ہے لہذا تم سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں۔

سُرِّيهِمْ الْيَتَا فِي الْأَفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنََّّهُ الْحَقُّ أُولَئِكَ يَكْفُرُونَ بِرَبِّكَ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٥٧﴾ أَلَا إِنَّهُمْ فِي صِرَاطٍ مُنْقَلَبٍ رَابِعًا ۗ

”ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں۔ تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے بل سنو! یہ لوگ شک میں مبتلا ہیں اپنے رب سے ملنے کے بارے میں۔ یاد رکھو! وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔“

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد گزشتہ امتوں کے مکانات اور گھروں کے (کھنڈرات) ہیں۔ اور آیات فی الانفس سے مراد واقعہ بدر ہے۔ (جس میں کفار مکہ کو ہر قسم کی قوت و طاقت ہونے کے باوجود شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا) قتادہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیات فی الانفس سے مراد جسمانی امراض اور مصائب آلام ہیں۔ مجاہد اور سدی نے کہا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد ان شہروں اور ممالک کی فتوحات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبیؐ کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائیں اور فی انفسہم سے مراد فتح مکہ ہے (1)۔

عطا اور ابن زید نے کہا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو زمین و آسمان کی اطراف میں پائی جاتی ہیں مثلاً سورج چاند ستارے نباتات درخت اور دریا وغیرہ اور فی انفسہم سے مراد لطیف صنعت اور عمدہ حکمت ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے وہ واقعات ہیں یا زمانہ ماضی میں ہونے والے حوادث کے وہ آثار ہیں جن کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے ممالک پر اللہ تعالیٰ نے جو غلبہ اور فتوحات اپنے پیارے محبوب ﷺ اور آپ کے خلفا کو بطور مجزوءہ و کرامت عطا فرمائیں وہ بھی آیات فی الافاق میں شامل ہیں (3)۔ اور آیات فی الانفس سے مراد وہ واقعات ہیں جو اہل مکہ کو پیش آئے یا جو مصائب اہل مکہ پر نازل ہوئے یا پھر اس سے مراد انسانی بدن میں پائی جانے والی عیب اور نارسختی و کارگیری ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہے۔

یہ تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن کریم حق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے یا تو یہی تائید اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین حق ہے یا اللہ تعالیٰ حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے ہر ایک میں باہر اندہ ہے اور ربک فاعل ہونے کی بناء پر کل رفع میں ہے۔ اور صرف مادہ گنہی میں ہی فاعل پر باہر اندہ آتی ہے۔

انہ کل شئی شہید فاعل سے بدل ہے۔ آیت میں استفہام انکار ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے انشک فی عاقبہ امرک ولم یکف انہ تعالیٰ علی کل شئی و شہید۔ کیا آپ اپنے معاملے کے انجام میں شک کرتے ہیں اور یہ کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر گواہ ہے اور ثابت کرنے والا ہے۔ لہذا اس نے آپ کے معاملہ میں جن علامات و

نشانات کو ظاہر کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ انہیں ضرور پورا فرمائے گا۔ جیسا کہ اس نے ان تمام اشیاء کو پورا کیا ہے جن کا اس نے وعدہ فرمایا تھا۔ یا شہید کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلع ہے لہذا وہ آپ کے حال کو بھی جانتا ہے اور ان کے حال سے بھی واقف ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا انسان گناہوں کے ارتکاب سے نہیں رکاوٹ اور اسے روکنے کے لئے یہی بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر مطلع ہے اور کوئی بھی چھپنے والی چیز اس پر مخفی نہیں ہے؟ وہ ہر شئی پر اسے بدلہ اور جزا دے گا۔

مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تیرا رب بذات خود اس پر شاہد ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے (1) اور اس کی شہادت یہ ہے کہ اس نے قرآن کو معجزہ بنایا ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ لفظ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل بیان کر دیئے ہیں جو تصدیق کے لئے کافی ہیں یعنی کیا تیرے رب کی شہادت کافی نہیں (یعنی وہ یقیناً کافی ہے) کیونکہ وہ ہر شئی پر شاہد ہے کوئی شئی بھی اس سے غائب اور مخفی نہیں۔

اسے سنو یہ کفار مکہ اپنے رب سے ملاقات کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ لقاء وہم سے مراد بعث بعد الموت اور اعمال کی جزا و سزا کا ملنا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ہر شئی کا اجمالی اور تفصیلی علم رکھتا ہے اور ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے کوئی شئی بھی اس کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ہر شئی کا ذاتی طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ احاطہ غیر متکلیف ہے (یعنی اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی) کوئی شئی بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

تمت بالخیر

سورہ فصلت کی تفسیر 28 ماہ صفر 1208ھ کو اختتام پذیر ہوئی
اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سورہ فصلت کا ترجمہ بمطابق 17 ذیقعدہ 1421ھ 12 فروری 2001ء بروز پیر بوقت ساڑھے دس بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين و على آله واصحابه اجمعين۔

www.muhammadiyah.com

والا ذلیل اور سوا ہوجاتا ہے۔ م سے مراد ملک ہے جو ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ع سے مراد قریش کے دشمن ہیں جو ان کا قصد کرتے ہیں۔ س سے مراد قحط ہے۔ ق سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جو اس کی مخلوق میں نافذ ہوتی ہے (1)۔
ع حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ کوئی صاحب کتاب نبی نہیں ہے جس کی طرف حَمَّ عَسَقِ وَجِی نہ کی گئی ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے كَذَلِكَ يُؤْتِيكَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ الْعِلْمَ (2)۔

العزیز کا معنی ہے وہ اپنی قوت و طاقت کے سبب سب پر غالب ہے۔ الحکیم کا معنی ہے صحیح فیصلہ کرنے والا اپنے فیصلہ میں غلطی اور خطا نہ کرنے والا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو معانی اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں انہی کی مثل یا جس طرح یہ سورت بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اسی طرح کی وحی اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اور آپ سے قبل رسولوں کی طرف بھی وحی فرمائی ہے۔ آیت میں یوحی صیغہ مضارع، ماضی کی حالت بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ استمرار وحی پر دلالت کرے اور اس بات پر دلالت کرے کہ اس طرح وحی کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت جاری ہے۔

جہور نے یوحی کو حاء کے ساتھ مضارع معروض کی صورت میں پڑھا ہے اور اس کا فاعل لفظ اللہ ہے۔ جبکہ ابن کثیر نے حاء کو فتح کے ساتھ مضارع مجہول کی صورت میں یوحی پڑھا ہے۔ اس صورت میں کذلک مثل ذالک کے معنی میں مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور یوحی اس کی خبر ہے جو اس کی ضمیر کی طرف مستند ہے۔ یا کذلک مصدر یہ کی بناء پر منصوب ہے اور یوحی الیک کی طرف مستند ہے۔ اور لفظ الفعل حذف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے جس پر ایک سوال مقدر دلالت کرتا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ ان کی طرف وحی کرنے والا کون ہے؟ تو اس کے جواب میں فرمایا گیا اللہ۔ اسی طرح شاعر کے قول میں بھی ہے لیک یزید صارع لخصومة۔ اس میں فعل مجہول ہے۔ (اور یزید فعل حذف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے) اور العزیزُ اَلْحَكِيمُ اللہ تعالیٰ کی دو صفیں ہیں جنہیں موحی کی علوشان کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یا بحر لفظ اللہ مبتدا ہے اور العزیز اور اس کا مابعد کلام اس کی خبریں ہیں۔ یا العزیزُ الْحَكِيمُ دونوں اس کی صفیں ہیں۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ لَدَعَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ صَفْت ہے اور اس سے قبل الذی مقدر ہے یا یہ حال ہے۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ کا معنی ہے وہی اپنی ساری مخلوق پر سب سے اعلیٰ ہے اور عظمت والا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ دوسرا حال ہے یا تدریجی ہے۔ اور یہ دوسری وجہ کی بناء پر دونوں جملے مستانہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عزت و غلبہ اور اس کی حکمت و دانائی کی تائید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَنْفَطِرْنَ مِنْ قَوْقِحٍ ۗ وَ السَّلٰكِلُ يُسْحِقُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۗ وَ
يَسْتَغْفِرُونَ لِسَنِّ فِي الْاَرْضِ ۗ اَلَا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَفُوُّ الرَّحِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ
اَتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ اللّٰهُ حَفِيْظُهُمْ عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

”قریب ہے کہ (جلال الہی سے) آسمان پھٹ پڑیں اپنے اوپر سے۔ اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے تسبیح کر رہے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور بخشش طلب کر رہے ہیں اہل زمین کے لئے۔ سن لو! یقیناً اللہ ہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اور جنہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (اور) دوست اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کے

حالات سے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔“

نافع اور سہمی نے نکاح کو بیاہ کے ساتھ نکاح پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے (اس لئے نفع کو مذکر ذکر کرنا بھی جائز ہے) جبکہ باقیوں نے التسلوٰت فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ نکاح پڑھا ہے۔ تَخْلُوهُمُ التَّسْلُوٰتُ یَتَقَفَّنُ کا معنی یہ ہے کہ قریب ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور علوشان کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔

ارشاد باری تعالیٰ اَنْعَلُ الْعَظِيْمُ کے بعد اس کا ذکر اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ قریب ہے مشرکین کے اس قول۔ اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کے سبب آسمان پھٹ پڑے اسی کی مثل سورہ مريم میں یہ ارشاد بھی ہے لَقَدْ وَصَّيْنَا آدَمَ بِأَنْ يَذَّكَّرَ فَتَلَاَّى السَّمَوٰتِ يَتَّقَفُنَّ۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قریب ہے ملائکہ کی کثرت کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آسمان چرچا اور اس کا حق بھی ہے کہ وہ چرچا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے آسمان میں ایک بالشت بھر بھی ایسی جگہ نہیں جس میں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے سجدہ ریز نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان نہ کر رہا ہو۔ اسے ابن مردودہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور علامہ ابن کثیر کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ آسمان میں قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی فرشتہ قیام کرے یا سجدہ کرنے میں مشغول نہ ہو۔

بھریاں اور ابوبکر نے متظفر کو متظفر ن پڑھا ہے جو کہ لفظ سے ماخوذ ہے۔

مِنْ قُوَّةٍ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں کے پھٹنے کی ابتدا اور پر والی جہت سے ہوگی۔ پہلی تفسیر کے مطابق اس جہت کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی علامات میں سے عظیم تر ہے اور اس کی علوشان اور برتری پر سب سے زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق اور پر والی جہت کی تخصیص اس لئے ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ نیچے والی جہت بطریق اولیٰ پھٹ جائے گی۔ اور تیسری تفسیر کے مطابق تخصیص کا سبب یہ ہے کہ ملائکہ کا اثر دھام اور پر والی جہت پر ہی ہے۔ (لہذا اس کا بار بھی اور پر والی جہت پر ہی پڑے گا اس لئے وہ اسی جہت سے پھٹ پڑیں گے)

بعض نے کہا ہے کہ مِنْ قُوَّةٍ کی ضمیر الارض کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ الارض سے مراد جس ہے۔ (اور جس کی طرف جمع کی ضمیر لوٹ سکتی ہے) اور یہ قول دوسری تفسیر کے مطابق درست ہے۔

۱۰ اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہیں۔ یعنی ظالم جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو قطعاً اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں فرشتے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ ایسے تمام اقوال سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان اور طہرت ملاحظہ کر رہے ہیں لہذا وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ زمین میں بسنے والے مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش طلب کر رہے ہیں۔ چونکہ مومنین ایمان قبول کرنے میں ملائکہ کے ساتھ شریک ہیں اس لئے ان کا حق بنا ہے کہ ملائکہ ان کے لئے مغفرت طلب کریں ترکیب کلام میں وَيَتَسَفَّخُونَ نَجَاح کا جملہ حال ہے۔ سن لو اَلْيَقِيْنَا اللّٰهَ اِسْنَةَ دُوسْتُوں کو بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔

قیامت کے دن سے ڈرائیں جس میں پہلے بعد میں آنے والے تمام لوگ جمع ہو گئے۔

پہلے تندر کے دوسرے مفعول کو اور دوسرے تندر کے پہلے مفعول کو تہویل و تعمیم پر دلالت کرنے کے لئے حذف کر دیا گیا ہے۔ لکن ترتیب فیہو جملہ مترضہ ہے ترکیب میں اس کا کوئی عمل نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اس دن کی آمد میں کچھ بہ نہیں اس دن ایک فریق جنت میں اور ایک فریق جہنم کی ہوئی آگ میں ہوگا۔ وہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ **فَوَيْلٌ لِّمَنْ هُمْ فِي الْجَنَّةِ وَقَدْ بَقِيَ فِي السَّعِيرِ**۔ انہم کی خمیر جمع ہونے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ جمع اسی پر دلالت کر رہی ہے اور یہ دونوں جملے جمع ہونے والوں سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں یعنی ہوتی آگ آپ انہیں ڈرائیں اس دن سے جس میں وہ جمع ہو گئے درآئیں دار الشواب (جنت) اور دار العقاب (دوزخ) میں منفرق ہو گئے۔ یا پھر یہ دونوں جملے مستاعی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ اپنے دست مبارک میں دو کتابیں چلائے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو آپ کے دائیں دست مبارک میں تھی کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں ان کے پاپوں کے نام ہیں۔ ان کے خاندانوں کا ذکر ہے اور ان کی تعداد اور رنج ہے اور یہ تحریر ان کے پاپوں کی صلیبوں اور ماؤں کی رحموں میں نطق قرار پذیر ہونے سے پہلے کی ہے۔ ابھی تک وہ (ان کے خمیر) مٹی میں گوندھے جا رہے تھے۔ پس نہ ان میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ یوم قیامت تک آنے والے تمام اہل جنت کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اجمالی تحریر ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمل کرد۔ صحیح اور پختہ عمل کرد اور قرب ہوتے چلو کیونکہ جنتی آدمی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوگا۔ اگر چہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل جہنم کے عمل پر ہوگا اگر چہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **قِيَّتِي فِي الْجَنَّةِ وَقِيَّتِي فِي السَّعِيرِ**۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انصاف اور عدل ہوگا (۶)۔ اسے علامہ بنوری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلْنَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ وَلَٰكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي مَحَبَّتِهِ ۗ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَبِيلٍ ۗ وَلَا لِيُصِيبَهُ ۙ أَوْرَاقُ الشَّجَرِ ۚ أَوْ لِيُؤْتِيَهُم مِّمَّا يَتْلُونَ ۚ هُوَ الْوَلِيُّ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا ان (سب) کو ایک امت لیکن وہ داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں اور جو ظلم کرنے والے ہیں نہ ان کا کوئی دوست ہے اور نہ دغا گار۔ کیا انہوں نے بنا لئے ہیں اسے چھوڑ کر دوسرے کا رساز۔

پس اللہ ہی حقیقی کارساز ہے اور زندہ کرتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

۱۔ **وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ**۔ الایہ کا معلق **قِيَّتِي فِي الْجَنَّةِ** کے مضمون پر ہے، یعنی امت و حصوں میں تقسیم ہو جائیگی۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ایک دین پر کر دیتا۔ ماقائل نے کہا ہے کہ اگر چاہتا تو سب کو دین اسلام پر

کردیتا (۱)۔ اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وَكُنُوزَآءِ اللّٰهِ لَجَعَلْنٰمْ عَلٰی الْاٰمِدِیۡ۔ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام کو ہدایت پر جمع فرمادیتا) لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اسے دین اسلام کی طرف ہدایت دیکر اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور جو ظلم کرنے والے، یعنی کافر ہیں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں، یعنی وہ انہیں اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا۔ اس لئے نہ ان کا کوئی دوست ہوگا جو ان سے عذاب کو دور کر سکے گا اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا جو انہیں جہنم کی آگ میں جانے سے بچا سکے گا۔

شاید اس کے مقابلہ میں طرز کلام کی تبدیلی وعید میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ یہ کلام انہیں ڈرانے کے لئے کیا گیا ہے۔ (طرز کلام میں تبدیلی اس طرح ہے کہ پہلے فرمایا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے مقابلہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا لیکن ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا جو ظلم کرنے والے ہیں ان کا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار تو یہ تبدیلی وعید میں مبالغہ کے لئے ہے۔)

ع۔ اَوْ اَتَّخِذُوا كَاعْظَفٍ وَالظَّالِمُونَ پُر ہے۔ اس میں ام منقطعہ بمعنی بل افرابیہ ہے اور ہمزہ برائے انکار ہے۔ یعنی انکار نے اللہ تعالیٰ کو دوست اور مددگار نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اسے چھوڑ کر بتوں اور شیاطین وغیرہ کو کارساز بنا لیا ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا یا پھر معنی یہ ہے کہ جنہیں کارساز بنایا گیا ہے وہ ان کے دوست اور مددگار نہیں ہونگے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے۔ ترکیب کلام میں فاللہ ہو الولیٰ محذوف شرط کا جواب ہے۔ یعنی اگر انہوں نے کارساز بنانے کا ارادہ کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے، یعنی وہی حق رکھتا ہے کہ اسے کارساز بنایا جائے۔ اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا تاکہ وہ ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور بدلہ دے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے یہ جملہ یعنی وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ بقول باری تعالیٰ ہو الولیٰ کی علت بیان کر رہا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کا بھی ولی، یعنی مددگار ہے اور ان کا بھی جو آپ کے پیروکار ہیں (2)۔ اس صورت میں فاللہ کی فاعل عطف کے لئے ہوگی نہ کہ شرط کی جزا کے لئے۔

وَمَا اٰخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحَكْمَةُ اِلٰى اللّٰهِ ۗ ذٰلِكُمْ اَللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيَّهِ تَوَكَّلْتُ وَ اٰلِيْهِ اٰيٰتُ النَّبِيِّ ۙ قٰطِرُ السُّبُوٰتِ وَاِلَّا مَرَضٌ ۙ جَعَلْ لَّكُمْ مِّنَ النَّفْسِ الْكَافِرَةِ اَزْوَاجًا وَّمِنْ اِلَّا نَعْمًا وَاَزْوَاجًا يَدْرُوْنَ كَمَا فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۗ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِيْرُ ۝

”اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دو۔ میں اللہ میرا رب ہے اور اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ وہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اسی نے بنائے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے اور موسیٰوں سے بھی جوڑے بنائے۔ وہ پھیلتا تارتا ہے تمہاری نسل کو اس کے ذریعہ۔ میں نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔“

لے اے لوگو! امر دین میں سے جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہی قیامت کے دن اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور اہل حق کو اہل باطل سے ممتاز کر دے گا۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ آیت متشابہ کی تادل میں تمہارے درمیان جو اختلاف رونما ہو جائے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے محکم آیت

کی طرف رجوع کرو۔ (یعنی کوئی ایسی تاویل نہ کرو جو کسی حکم آیت کے حکم کے خلاف ہو) وہ جو تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ اللہ ہے۔ اسے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے یہی اللہ میرا رب ہے۔ (ترکیب کلام میں ربی لفظ اللہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے) میں نے دشمنوں کے کمر و فریب کو رد کرنے میں اور تمام امور میں اسی پر بھروسہ کیا ہے۔ اور سخت مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۷۔ وہ آساقوں اور زمین کو بنانے والا ہے۔ ترکیب کلام میں قائلین السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ذُو الْعَرْشِ کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ خود مبتدا ہے اور اس کا مابعد کلام اس کی خبر ہے۔

اسی نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے ہیں، یعنی عورتیں پیدا کی ہیں۔ اور موشیوں کے لئے ان کی جنس سے جوڑے بنائے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے موشیوں کی کمی محضیں پیدا کی ہیں یا ان میں سے مذکر اور مؤنث پیدا کئے ہیں۔ جمل کا جملہ پہلی دونوں تفسیروں کے مطابق حال واقع ہوا ہے اور اس سے پہلے تقدیر ہے۔

بذروکم۔ کا معنی ہے وہ تم میں اضافہ کرتا رہتا ہے وہ پھیلاتا رہتا ہے۔ یہ ذرے سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیلاتا اور نکھیرنا ہے۔ کم ضمیر سے مراد مخاطبین اور انعام (چوپائے) تمام ہیں۔ لیکن مخاطبین کو غلبہ دیتے ہوئے خطاب کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔ فیہ سے مراد ہے اس تدبیر میں اور تدبیر سے مراد لوگوں اور موشیوں کو جوڑا جوڑا بنانا ہے تاکہ اس کے سبب سلسلہ توالد جاری رہے اور نسل بڑھتی رہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس ذریعہ تمہاری نسل پھیلاتا رہتا ہے۔

بعض نے فیہ کی ضمیر سے مراد جم اور بعض نے پیٹ مراد لیا ہے۔ اور بعض نے فی کو باء کے معنی میں قرار دیا ہے۔ یعنی وہ اس کے سبب تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔ بعض نے اس کا معنی بیان کیا کہ وہ جوڑے بنا کر تمہاری تعداد کو بڑھاتا ہے۔

۸۔ قَبَسٌ مَّشْهُومٌ یعنی ہوس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں لفظ مثل زائد ہے اور معنی یہ ہے کہ کسی شے کی طرح نہیں ہے۔ اور اس میں لفظ مثل تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے قُلْ اَمْثُلُوا بِمِثْلِ مَا اَمْسَلْتُمْ بِهِمْ۔ بعض نے کہا ہے کہ کاف زائد ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی مثل کوئی شے نہیں ہے جو اس سے موافقت اور مناسبت رکھتی ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کی کوئی نظیر نہیں ہے (۱)۔ بعض نے کہا ہے یہ کنایہ کے باب سے ہے۔ اسی کی مثل ان کا یہ قول ہے کہ جب کسی سے فعل کی نفی کرنے میں مبالغہ مقصود ہوتا کہا جاتا ہے منطک لایفعل کذا۔ تیری مثل آدمی اس جیسا کام نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ جب مخاطب سے مناسبت رکھنے والے اور اس کا قائم مقام بننے والے سے کام کی نفی کر دی جاتی ہے تو بطریق اولیٰ مخاطب سے اس کام کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ کنایہ ہے تو پھر یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس کی کوئی مثل ہو کیونکہ کنایہ میں معنی حقیقی کا تحقق اور ثبوت شرط نہیں ہوتا۔ جیسا کہ لے تقد والے آدمی کے لئے کہا جاتا ہے فَلَاحٍ طَوِيلٍ السَّجَادِ۔ (فلاح آدمی کا پر تلہ طویل ہے یعنی وہ دراز قد والا ہے) اگرچہ اس کا پر تلہ بالکل ہی نہ ہو (پھر بھی کلام صحیح ہوگا) اسی کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ بَلْ يَدْعُونَكَ مَنَّانًا ۝۹۰۔ یعنی ہونے سے کنایہ ہے اس کے باوجود کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے اعضا کا ہونا محال ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مثل بمعنی صفت ہے، یعنی اس کی صفت کی طرح کسی شے کی صفت نہیں۔ اور وہی وہ سب کچھ سننے والا ہے جو سنا جاسکتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھنے والا ہے جو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا تمام سننے

والوں کو قوتِ سماعت اور دیکھنے والوں کی قوتِ بصارت اللہ تعالیٰ سے معھار لی ہوتی ہے یہاں ان دو صفوں کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہو جائے کہ جس طرح اس کی کوئی مثل موجود نہیں اسی طرح شایدا اس کی کوئی صفت بھی نہیں۔ اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے اور صفات ثابت کرنے کے لئے یہاں ان صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰﴾ سَرَّعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا
إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا
تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۗ كَبُرَ عَلَى السُّرُكِينِ مَا نَدُّعُوهُمْ إِلَيْهِ ۗ اللَّهُ يَجْتَبِي الَّذِينَ يَشَاءُ
وَيَهْدِي الَّذِينَ يُنْتِزِبُ ﴿۱۱﴾

”اسی کے قبضہ میں ہیں کہیں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) بیشک وہ چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو۔ کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور تفرقہ نہ ڈالنا اس میں ہے۔ بہت گراں گزرتی ہے مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ نہیں بلاتے ہیں اللہ تعالیٰ جنہاں لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے۔“

۱۰۔ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سے مراد آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے رزق کے خزانے ہیں۔ کبھی نے کہا ہے اس سے مراد بارش اور نباتات ہے۔

یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ کے لئے چاہتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو تنگ کر دیتا ہے اور وہ ویسے ہی کرتا ہے جیسے کرنا مناسب ہوتا ہے۔

۱۱۔ سَرَّعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ سے خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ اور الیک میں (تعمیر سے خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آیت طیبہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین اسلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے مقرر فرمایا ہے وہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ کیونکہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور حق کے بعد ضلالت اور گمراہی ہوتی ہے۔ اور اہل کتاب نے محض عداوت اور عناد کے پیش نظر اس دین کا انکار کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری راہنمائی کے لئے ایک سیدھا سادہ کھینچا اور فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دائیں بائیں بہت سے خطوط بنائے اور فرمایا یہ راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر شیطان ہے اور وہ اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ مَا تَلَّيْتُمْ حُكْمًا ۗ (۱۱)۔ (بیشک میرا راستہ یہ سیدھا ہے پس تم اس

کتاب کے بعد۔ لَقَدْ شَاقُّوْهُ وَهُوَ اَبْنِي كِتَابٍ يٰۤاَقْرٰنُ كَرِيْمٍ كَيْ تَعْلَقَ اَيْسُوْهُ شَكٌّ مِّمَّنْ جَلَّ اَبْنِي جَوْقَلِقْ اَنْكَبِيْرٌ هُوَ۔ یعنی وہ اسے اس طرح نہیں جانتے جیسے جانتے کا حق ہے اور نہ وہ اس کے ساتھ اس طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے ایمان لانے کا حق ہے۔

فَقِيْلَ لِيْكَ قَادِمٌ ۗ وَاسْتَقْبَلْتُمْ كَمًا ۗ اَمْرًا ۗ وَلَا تَتَّبِعُوْهُ اَهْوَاءَهُمْ ۗ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۗ وَاَمْرًا لَّا عَدِلَ بَيْنِكُمْ ۗ اَللّٰهُ رَٰبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۗ لَنَّا اَعْمَالُنَا وَاَلَمْ
نَلْمُ اَعْمَالَكُمْ ۗ لَاحِجَةٌ بَيْنَنَا وَبَيْنِكُمْ ۗ اَللّٰهُ يَجْزِيْكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۗ وَالْيَوْمَ الْمَوْجِدِ ۗ

”پس اس دین کی طرف آپ دعوت دیتے رہئے۔ اور ثابت قدم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ اتباع کیجئے ان کی خواہشات کا۔ اور (برہا) فرمائیے کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل کروں تمہارے درمیان۔ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ کسی بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہمارے اور تمہارے درمیان۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف (سب نے) پلٹنا ہے۔“

۱۔ اہل کتاب کے تفرقہ کے سبب آپ کو لوگوں کو اذان دین کی طرف دعوت دیتے رہئے اور تفرقہ نہ ڈالیے اور جو کچھ آپ کو عطا کیا گیا ہے اس کی اتباع و پیروی کرنے کی تلقین کرتے رہئے۔ فادع پر فاعل افعال مذکورہ کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کا نام اس طرح ہے امانت فادع الناس الی القامة الدین الخ۔

اور آپ اس پر ثابت قدم رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور آپ ان کی ٹیڑھی اور کج روخاہشات کی پیروی نہ کیجئے۔ اور برہا فرمائیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان لایا۔ نہ کہ اس طرح جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کہا اِنَّا مَوْنِ بَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَكَيْفَ يُدُوْنَ اَنْ يَّبْعُوْهُ وَاَبْعُوْهُ اِنْ لَمْ يَكُنْ سَبِيْحًا ۗ (کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ درمیانی راہ نکالنا چاہتے ہیں) اور مجھے عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے اور مخالفین کے درمیان فیصلہ کرنے میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ پہلا یعنی اَمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فُوْرَہ نظر یہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے اور یہ لاء عدم ہتکم توہ عملیہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے وہ تمام کا خالق ہے اور تمام کے امور کا ستوی ہے۔

ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کسی بحث و تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تمہارے اعمال ہمیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے اور ہمارے اعمال تمہارے ضرر رساں ثابت نہیں ہوں گے۔ ہم تو تمہاری نصیحت اور فائدے کی خاطر تمہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ عداوت اور بحث کے تکرار کی قطعاً کوئی وجہ نہیں۔

یہ آیت جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے کہ کرمہ میں نازل ہوئی تھی پھر آیت قتال (جہاد) کے ساتھ اس کا حکم منسوخ ہو گیا اور اس کا ناسخ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا اَعْدُوْنِيْ وَاعْبُدُوْا عَلٰى مَا كُنتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۗ اَللّٰهُ هُوَ الَّذِيْ بَنٰٓءَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدُوْۙ وَكُو الْبَيْضَةَ اَلَا يَدْرٰ اَحْقٰبِيْ قَوْمِيْ وَاٰبَاؤُنَا اَللّٰهُ خَدّٰۙ

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہم سب کو جمع کرے گا اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور اسی کی طرف سب نے پلٹنا ہے۔

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةً عِندَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿١٥﴾ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ
بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٥﴾

”اور جو لوگ حجت بازی کرتے ہیں اللہ (کے دین) کے بارے میں اس کے بعد کہ (اکثر حق شناس) اس کو مان چکے
ہیں سوان کی حجت بازی لغو ہے ان کے رب کے نزدیک اور ان پر (اللہ کا) غضب ہے اور انہی کے لئے سخت عذاب
ہے۔ اے اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نازل کیا ہے کتاب کو حق کے ساتھ اور (نازل کیا ہے) میزان کو۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ
شاید وہ گھنٹی قریب ہی ہو۔“

ابن منذر نے عمر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب سورہ نصر اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَمَا يُرِيدُ الْإِنْسَانُ إِذْ يُؤْتَىٰ مِنْ رَبِّهِ
أَنْزَالًا ﴿٢﴾ نازل ہوئی تو مشرکین مکہ نے اپنے درمیان رہنے والے مؤمنین سے کہا اللہ تعالیٰ کے دین میں لوگ گروہ درگروہ داخل ہو
رہے ہیں تم بھی ہمارے درمیان سے نکل جاؤ تک تم ہمارے درمیان قیام پذیر ہو گے اس وقت آیت وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ
نازل ہوئی (1)۔

عبدالرزاق نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حجت بازی کرنے والے یہود و نصاریٰ تھے وہ کہتے ہیں ہماری کتاب تمہاری کتاب
سے پہلے ہے، ہمارا نبی تمہارے نبی سے مقدم ہے لہذا ہم تم سے بہتر اور افضل ہیں یہی ان کا جھگڑا تھا (2)۔ اس کے بعد کہ اکثر حق شناس
لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر چکے ہیں اور وہ اسلام قبول کر کے آپ کے دین میں داخل ہو چکے ہیں کیونکہ آپ کے حجرات اور حسن
دعوت بالکل ظاہر اور واضح ہے۔ سوان کی حجت بازی ان کے رب کے مزہ یک لغو ہے ان کی خصومت اور جھگڑا باطل اور لاجینی ہے یا
معنی یہ ہے کہ جسے وہ حجت گمان کرتے ہیں فی الحقیقت وہ ایک باطل شبہ ہے۔ ان کے اسی معاندانہ رویہ کے سبب ان پر اللہ تعالیٰ کا
غضب ہے اور ان کے کفر کے سبب انہی کے لئے شدید عذاب ہے۔

یہ کتاب سے مراد جس کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے کتاب کو نازل فرمایا ہے دراصل ایک وہ حق کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور باطل
سے بہت دور ہے۔ یا اس کے نزول کا مقصد عقائد حقہ اور احکام صحیحہ کی حقیقت کو واضح کرنا اور ان کی تعلیم دینا ہے۔

قتادہ، مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ میزان سے مراد عدل ہے۔ چونکہ میزان ہی انصاف اور مساوات کا آلہ ہے اسی لئے عدل کو میزان
کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میزان کے ذریعے صحیح صحیح پورا تو لے کر حکم ارشاد فرمایا ہے اور تولنے
میں کمی کرنے سے منع فرمایا ہے (3)۔

بعض نے کہا ہے میزان سے مراد شریعت ہے کیونکہ شریعت کے سبب ہی حقوق میں توازن اور لوگوں کے مابین مساوات اور عدل
تائید ہوتا ہے۔

لَعَلَّ الشَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٥﴾ کے بارے میں کئی کہیں کہا ہے کہ اس کا معنی ہے شاید قیامت کا آنا قریب ہو (4) پس تم کتاب کا اتباع کرو بشرط
2- تفسیر بنو جلد 6 صفحہ 100 (التجاریہ)

1- الدر المنثور جلد 5 صفحہ 697 (العلویہ)

4- تفسیر بنو جلد 6 صفحہ 100 (التجاریہ)

3- تفسیر بنو جلد 6 صفحہ 100 (التجاریہ)

پر عمل پیرا ہو اور عدل و انصاف پر مواظبت اختیار کرو اس لیے کہ ہم اچانک تم پر قیامت برپا کر دیں گے اس وقت تمہارے اعمال کا وزن کیا جائیگا اور ان پر تمہیں پورا پورا بدلہ اور جزا دی جائے گی۔

المساعة مونث ہے اور قریب مذکر ہے ان کے درمیان موافقت قائم کرنے کے لئے بعض نے کہا ہے کہ قریب ذات قرب کے معنی میں ہے یعنی قرب والی (گویا مونث معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے) یعنی قریب بروزن فعلی مونث ہے (یا تو جہہ یہ ہے کہ یہاں الساعۃ بمعنی البعث ہے ترکیب کلام میں لَعَلَّ السَّاعَةَ تَقْرُبُ جملہ بعد یک کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اس میں لعل نے ہی فعل کو عمل کرنے سے روکا ہے۔

مقابل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کا ذکر فرمایا اس وقت آپ کے پاس مشرکین موجود تھے تو انہوں نے اس کی تکذیب کرتے ہوئے کہا قیامت کب آئے گی؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی (1)۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا
وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُسَارِقُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ①
اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ②

”جلدی چاہتے ہیں اس کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے اس پر۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ خوفزدہ رہتے ہیں اس سے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ تجرداً جو لوگ شک کرتے ہیں قیامت کے متعلق وہ بڑی گمراہی میں (جلا) ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور وہی قوی (اور زبردست ہے)۔“

۱۔ وہ لوگ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی۔ وہ بطور استہزا اور تمسخر اس کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں وہ عذاب کے احتمال کے سبب ان سے خوفزدہ رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ حق ہے اور باطمینان آئے گی۔

يَسَارِقُونَ فِي السَّاعَةِ کا معنی یہ ہے وہ لوگ جو قیامت کے بارے میں گھڑا کرتے ہیں اور اس کے آنے کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ المرية اور المرية کا معنی شک اور گھڑا ہے۔ مازاہ معاراة فلاں نے اس میں شک کیا۔ فی الحقیقت یہ مہرنت المناقہ سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب اونٹنی کی کھیری کو دودھ دہنے کے لئے زور سے دایا جائے۔ چونکہ گھڑا کرنے والے بھی ایک دوسرے کے لیے انتہائی سخت کلام زبان سے نکالتے ہیں اسی لئے ان کے گھڑا کو مویعہ کہا جاتا ہے۔

لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ۔ وہ بڑی گمراہی میں (جلا) ہیں، یعنی حق سے بہت دور ہیں۔ کیونکہ قیامت کے دن وہ بارہ اٹھایا جاتا ایک ایسا امر ہے جو کتاب و سنت اور شہادت عقل سے صراحۃ ثابت ہے کہ دارالجزا کا ہونا ضروری اور لازم ہے۔ اس لیے یہ ابھی اگر چہ غائب ہے لیکن یہ دلائل سے اتنا واضح ہے کہ امر محسوس کے مشابہ ہے اس لیے وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے ہاں جو قیامت قائم ہونے کا یقین نہیں رکھتا وہ انتہائی گمراہ اور حق کی طرف راہنمائی پانے میں انتہائی دور ہے۔

ع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اَللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ كَمَا سَمِعِيْ بِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰی اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ مگر مرنے کہا ہے وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرنے والا ہے۔ سدی نے کہا ہے وہ نرمی کرنے والا ہے اور مقاتل نے کہا ہے وہ نیک اور گنہگار تمام بندوں پر مہربان ہے (۱) اس طرح کہ وہ گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا کے طور پر ہلاک و برباد نہیں کرتا۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے وہ اپنے لطیف اور اک کے سبب منافع پہنچانے اور مصائب و آلام کا رخ پھیرنے میں بڑا لطیف اور باندھیر ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ عقلی اور مشکل امور کے بارے اس کا علم باریک بین اور دقیقہ رس ہے جرائم سے درگزر کرنے میں اس کا علم انتہائی عظیم ہے، وہ نیکیوں اور اچھائیوں کو پھیلاتا ہے اور عیوب و نقائص پر پردہ ڈالتا ہے، وہ بندے کو حاجت و ضرورت سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے اور بندے کی قوت و طاقت سے کم عبادت و طاعت کا اسے مکلف و پابند بناتا ہے۔

ع وہ جسے جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے، بندوں میں سے ہر ایک کے لئے جتنی بھلائی اور احسان کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے وہ اسے عطا فرماتا ہے اور وہ ہر مومن کو رزق عطا فرماتا ہے پس یہ سب ان میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں رزق دے۔ حضرت امام محمد بن محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمانے میں دو تدبیریں کی ہیں ایک یہ کہ اس نے تمہیں پاکیزہ اور طیب رزق عطا فرمایا ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے تمہیں سارا ایک ہی بات نہیں دے دیا (۲)۔ اور دوسری قوی ہے یعنی اس کی قدرت بالکل ظاہر اور واضح ہے اور زبردست ہے ایسا کہ اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا ترکیب کلام میں وَهُوَ اَلْقَوِيُّ كَمَا بَمَلَدِ حَالٍ -

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِيْ حَرْثِهِ ۗ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا
نُؤْتِيْهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۗ اَمْ لَكُمْ شُرَكَاءُ اَسْرَعُوْا لِمَنْ هُمْ مِنَ
الدُّنْيَا مَا لَمْ يَأْذُنْ بِوَاللّٰهِ ۗ وَ لَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَفُصِّلَ بَيْنَهُمْ ۗ وَاِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

”جو طلبگار ہو آخرت کی کھیتی کا تو ہم (اپنے فضل و کرم سے) اس کی کھیتی کو اور بڑھا دیں گے اور جو شخص خواہشمند ہے (صرف) دنیا کی کھیتی کا تو ہم اسے دے دیں گے اس سے اور نہیں ہوگا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔ کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے مقرر کیا ہے ان کے لیے ایسا دین جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اور اگر ان کے فیصلہ کی بات پہلے سے طے نہ ہوتی تو ان کا قصہ کبھی کاچکا دیا گیا ہوتا۔ اور جو ظالم ہیں یقیناً ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

ع حَرْثُ كَمَا سَمِعِيْ بِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰی سے ہر زمین میں بیج ڈالنا اور زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کو بھی حَرْثُ کہہ دیا جاتا ہے۔ قاسموس میں ہے کہ حَرْثُ كَمَا سَمِعِيْ بِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰی سے ہر زمین میں بیج ڈالنا اور زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کو بھی حَرْثُ کہہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب دنیا میں کیے جانے والے عمل کا ثمرہ اور پھل ہوتا ہے اسی لئے اسے زرع (کھیتی) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یا پھر اسے کماٹی جتنی جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ دنیا میں انسان جو کچھ کماتا ہے اسی کے سبب آخرت

2- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (تجاویذ)

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (تجاویذ)

3- القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 267 (الترات العربی)

میں ثواب بھی حاصل ہوگا۔

جو آخرت کی کشتی کا طلبگار ہو تو ہم اپنے فضل و کرم سے اس کی کمائی اور کشتی کو اور بڑھا دیں گے اور ہم اسے ایک کے بدلے دس سے لیکر سات سو گنا تک عطا فرمائیں گے جیسا کہ ایک دانہ سے سات بالیاں آگئیں اور ہر بالی میں ایک سودا نہ ہو۔ **اَكْمَلُ حَبَّةٍ اَمْحَمَّتْ سَبْعَةً سَبَابِلًا فِي كُلِّ مَسْبَلَةٍ مِائَةً وَخَمْسُونَ**۔

اور جو شخص اپنے عمل کے عوض صرف دنیوی کشتی اور حصے کا ارادہ رکھتا ہے تو ہم اسے اس میں سے دیں گے جو ہم نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ترکیب کلام میں **وَصَالِحِي الْاُخْرَىٰ الْخَالِصُ** کا عطف مؤنثہ پر ہے۔ حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اعمال کا دار مداریتوں پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو پانے کے لئے یا عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی یہ روایت متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس امت کو نور و چمک، رفعت و بلندی فتح و نصرت اور زمین میں غلبہ و اقتدار کی بشارت دے دو۔ پس ان میں سے جو بھی آخرت کا عمل دنیا کے لئے کرے گا آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسے علامہ بنوری نے روایت کیا ہے (2)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ مِمَّا كَفَرُوا لَعْنَةُ اللَّهِ الْفَاسِقِينَ یعنی لگدگیاں ان کے لئے وہ ہیں جنہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک گمان کر رکھا ہے چونکہ انہوں نے شریک بنائے ہوئے تھے اسی لئے شرکاء کو انہی کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ کہا شرکاء نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یعنی انہوں نے دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین مقرر کر دیا ہے (3) جس میں شرک، دوبارہ زندہ کئے جانے سے انکار اور محض دنیا کے لئے عمل کرنے کی ترغیب و تعلیم ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ **شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا شَاءَ** اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ام متصل ہے اور محذوف جملہ کے مقابلہ میں آ رہا ہے جس کا آغاز حمزہ سے ہو رہا ہے۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے **اِقْبَلُوا مَا شَاءَ اللَّهُ** ما مشروع لہم شرکاً وہم۔ کیا وہ اس دین کو قبول کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا اسے چھوڑ کر شرکاء کے مقرر کیا ہے۔ اگر قیامت کے دن تک جزا اور بدلہ کو مؤخر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی نہ ہو چکا ہوتا تو مؤمنین اور کفار کے درمیان ابھی فیصلہ کر دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ آپ کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا میں ہی عذاب دے چکا ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما رکھا ہے **بَلَىٰ السَّاعَةَ مَوْجِدًا**۔ ترکیب کلام میں **وَلَا كَلِمَةَ الْفَصْلِ** جملہ معترضہ ہے۔

چمک ظلم کرنے والوں، یعنی مشرکین کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر **الظَّالِمِينَ** ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی وضاحت ہو جائے کہ وہ اپنے شرک کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ **انہم لہم عذاب الیم لما کانوا یسکرونہ**۔

2۔ تفسیر بنوری، جلد 6، صفحہ 101-100 (انتھارپیڈ)

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (تذیبی)

3۔ تفسیر بنوری، جلد 6، صفحہ 101 (انتھارپیڈ)

تَسَى الظَّالِمِينَ مُشَفِّقِينَ وَمَا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْحَاتٍ الْجَنَّاتِ ۗ لَهُمْ مِمَّا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٥٠﴾ ذَٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۗ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حَسَنًا ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥١﴾

”آپ دیکھیں گے ظالموں کو ڈر رہے ہوں گے ان (کرتوتوں) سے جو انہوں نے کمائے اور وہ ان پر واقع ہو کر رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے سبکی بڑا فضل ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے ہیں۔ آپ فرمائیے میں نہیں مانگتا اس (دعوت حق) پر کوئی معاوضہ بجز قربت کی محبت کے۔ اور جو شخص کما تا ہے کوئی نیک کام دہا لاکر دیں گے اس کے لیے اس میں حسن بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے۔“

۱۔ آپ دیکھیں گے کہ شریکین قیامت کے دن شرک اور دیگر ان گناہوں کی سزا سے ڈر رہے ہونگے جو انہوں نے کمائے۔ ترکیب کلام میں مشفقین، تری فعل کا مفعول ثانی ہے یا حال ہے۔

ان کے کرتوتوں کی سزا یا عین ان پر واقع ہو کر رہے گی چاہے وہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ ترکیب کلام میں وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ حال مقدرہ ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے، یعنی وہ انتہائی پاکیزہ حسین عمدہ اور تفریحی مقامات پر ہونگے۔ وہاں وہ جس چیز کو چاہیں گے اور خواہش کریں گے وہی ان کے لئے ان کے رب کے پاس سے حاضر اور موجود ہوگی۔ اور جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہی بہت بڑا فضل ہے، یعنی دنیا میں جتنی نعمتیں ان کے پاس تھیں وہ اس نعمت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

۲۔ یہ وہ ثواب ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ابن کثیر، ابو عمر و جزہ اور کسایی نے بیشکو کو تخفیف کے ساتھ ہی بَشِّرُ پڑھا ہے جو کہ شترۃ سے ماخوذ ہے۔ جبکہ باقیوں نے باب تفعیل سے بَشِّرُ پڑھا ہے۔

۳۔ اے محمد اسلمی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمادیجئے کہ میں تمہیں جو وعدہ و تلخیص کر رہا ہوں اور دعوت حق دے رہا ہوں اس پر بجز قربت کی محبت کے تم سے کوئی اجرت (نفع) نہیں مانگتا۔ یعنی میری تمہارے ساتھ جو قربا بنداری ہے اس کے سبب تم مجھ سے مودت و محبت رکھو۔ یہ جملہ مترضہ ہے۔ اور فی القربی المودۃ سے حال ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں عبد الملک بن بسیرہ کی سند سے طاس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے المودۃ فی القربی کے بارے دریافت کیا گیا تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ القربی سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آل بیت اطہار ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم نے جواب میں جلدی کر دی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اللہ تعالیٰ نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب اجرت کا جو حکم دیا تھا وہ منسوخ ہو۔ ابن کثیر نے مجاہد کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کے یہ معنی روایت کئے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اطاعت کے سبب اس کا قرب حاصل کرو۔ یہی قول حسن کا بھی ہے آپ فرماتے ہیں کہ قربی ہے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب ہے مفہوم یہ ہے کہ تم طاعت و عبادت اور عمل صالح کے سبب اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرو اور اس سے اظہار مودت و محبت کرو۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم میرے قراہتداروں اور میری اولاد سے محبت کرو اور ان کے معاملہ میں تم میرا لحاظ رکھو۔ یہی قول سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب کا ہے (1)۔

ابن ابی حاتم بطرانی اور ابن مردودہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرش کی کئی بار رسول اللہ ﷺ آپ کے قراہتدار کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے رضی اللہ عنہم (2)۔

شیعہ حضرات نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں ہی محصور ہے اور پہلے تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت باطل ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں مذکورہ حدیث اور اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت واجب ہے اور آپ کے سوا کسی اور کی محبت واجب نہیں۔ اور محبت کا وجوب اطاعت کے وجوب کو مستلزم ہوتا ہے پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آپ ہی امام برحق ہیں کسی اور کی امامت و خلافت صحیح نہیں۔ مگر ان کا یہ استدلال متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

1: یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک روای حسین الاشعری ہے جو انتہائی سخت غالی شیعہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت کہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہاں حضرت خاتون جنت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی بیٹا نہیں تھا۔
2: ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہما اور ان کے دونوں صاحبزادوں کی محبت واجب ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کے سوا کسی کی محبت واجب نہیں۔ یہ کیونکہ ممکن ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حب ابی بکر و عمر و ایمان و بعضہما کفر (کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض رکھنا کفر ہے۔ جس نے میرے صحابہ کرام کے بارے سب و شتم اور گالی گلوچ کا اظہار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھینکا رہے اور جس نے ان کے معاملہ میں میرا لحاظ رکھا تو میں قیامت کے دن اس کی حفاظت کروں گا۔

اسے ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار کا بغض نفاق کی علامت ہے یہ حدیث نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (3)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قریش کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض کفر ہے اہل عرب کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس نے عربوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے عربوں سے بغض رکھا گویا اس نے مجھ سے

میں تو یہ کہتا ہوں کہ آیت کی تاویل و تفسیر میں یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ میں تم سے مطالبہ نہیں کرتا مگر صرف یہ کہ تم میرے قرائنداروں، اہل بیت اطہار اور میری اولاد سے محبت کرو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو خاتم النبیین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہو سکتا لہذا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوت الی اللہ کا فریضہ علماء امت کو ہی ادا کرنا ہے، چاہے وہ علوم ظاہرہ کے ماہر ہوں یا علوم باطنہ کے شہسوار۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کو اپنی اہل بیت سے محبت و دوست رکھنے کا حکم دیں، کیونکہ حضرت علی کریم اللہ وجہ اور آپ کی اولاد میں سے ہونے والے ائمہ کرام کمالات ولایت کے قطب تھے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں علم کا شہسوار ہوں اور علی (رضی اللہ عنہ) اس کا دروازہ ہیں (1)۔ یہ حدیث بزاز اور طبرانی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اور اس کی تخریج و دیگر احادیث حضرت ابن عمر، ابن عباس، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور آپ کے بھائی سے بھی مروی ہیں۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مشائخ تصوف کے سلاسل کی ابتدا اہل بیت پر ہوتی ہے۔ اور سادات عظام میں کثیرا اولیا و کالمین گزر چکے ہیں مثلاً غوث الثقلین شیخ الدین شیخ عبدالقادر جیلانی، آخستنی و آخستینی، حضرت شیخ بہا الدین نقشبندی، السید السند حضرت شیخ مودود چشتی، حضرت معین الحق والدین سید شیخ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ ابوالحسن الشاذلی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کتاب اللہ اور اپنی اولاد۔ اکثر علماء تفسیر کی رائے یہ ہے کہ یہاں منشی متقطع ہے اور لفظاً جراسے حقیقی معنی میں مستعمل ہے اور معنی یہ ہے میں کبھی بھی تم سے اجزکا خواہ شہتہ اور طالب نہیں۔ لیکن تمہیں قربی کی محبت یاد دلاتا ہوں اور میرا تم سے جو رشتہ قرابت ہے اس کی یاد دلاتا ہوں۔ جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے کہ میں تمہیں اپنی اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں (2)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اقرباء کے ساتھ محبت کرنے کا جو مطالبہ اپنی امت سے کیا تاکہ اس کے سبب امت کو فائدہ اور منافع حاصل ہوں اسی مفہوم کی تائید ارشاد باری تعالیٰ و من یفترف حسنة الخ سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی جو شخص کوئی نیکی کماتا ہے اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی آل پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابعین کی محبت ہے۔ ورنہ اس جملہ کی سابقہ کلام سے کوئی مناسبت قائم نہیں ہوگی۔ البتہ حدیث کا لفظ عام ہے جو ہر نیکی کو شامل ہے۔

ثُمَّ ذَلِكُمْ فَهَذَا حَسَنًا۔ ہم اس کے لیے اس میں حسن دو بالا کر دیں گے۔ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل (یعنی مشائخ طریقت) کی محبت کا ثمر یہ ہے کہ اس کے سبب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سبب اللہ تعالیٰ کی محبت و قرب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ صوفی کو سب سے پہلے فانی الشیخ کا مقام حاصل ہوتا ہے پھر وہ فانی الرسول کی سعادت حاصل کرتا ہے اور آخر میں فانی اللہ تعالیٰ کے عالی مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ اور فنا سے مراد محبت کی ایسی وارفتگی اور رشدت ہے کہ محبت، محبوب کے ذکر کے وقت اپنی ذات کو بھول جائے اور ماسوا سے محبوب کے نہ اسے کچھ دکھائی دے اور نہ کوئی اور نشان باقی رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ظلیقہ الرسول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور آپ کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی اس کے اظہار کے لیے نازل ہوئی۔ حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ

عندکابارشدافضل کیا ہے کہ اہل بیت کے معاملہ میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ رکھو (1)۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اولیاء سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے شاید ارشاد باری تعالیٰ لِيُبْعَثَنَّكَ اللَّهُ مَا تَشَاءُ مِنْ كَثُوفٍ وَضُرَبٍ مَخْرُومٍ سے یہی مراد ہے کہ مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیاء اور دوستوں کے گناہ ہوں۔ اور وہ بخوشی ہے، یعنی اپنی اطاعت و محبت کرنے والوں کا بڑا قدر دان ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَإِنْ يَشَاءُ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ ۗ وَبِإِذْنِ اللَّهِ
الْبَاطِلُ وَالْمُبِينُ الْحَقُّ بِكَلِمَاتِهِ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥١﴾

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے۔ لیکن اگر اللہ چاہتا تو مہر لگا دیتا آپ کے دل پر، اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے ارشادات سے جسے بیگ وہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔“

۱۔ اَمْ يَقُولُونَ میں ام متعلقہ ہے اور جملہ قول باری تعالیٰ قُلْ اَنْ سَأَلْتُمْ عَنِ النَّبِيِّينَ فَاجْرَا سے متصل ہے۔ امزہ انکار و توجیح کے معنی میں ہے اور اس میں او ا جر سے انضراب کے لئے لے کے معنی بھی ہیں یعنی انہم لایودون اجر الرسالۃ بل بقولن وہ اجر رسالت تو ادا نہیں کرتے بلکہ کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ نبوت کے سبب یا قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے۔

عَلَىٰ فَإِنْ يَشَاءُ اللَّهُ الخ جملہ معترضہ ہے۔ یہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ آپ جیسی ذات سے افتراء پر دازی بعید از امکان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے دل پر جہالت کی مہر ثبت ہو۔ لیکن جو صاحب بصیرت ہو، اپنے رب کی معرفت رکھتا ہو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔ گویا اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی ذات و رسوائی چاہتا تو یقیناً آپ کے دل پر مہر لگا دیتا تاکہ آپ اس کے خلاف افتراء پر دازی اور بہتان باندھنے کی جرأت نہ کرتے۔

مجاہد نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو مہر کے ساتھ مضبوط کر دے گا حتیٰ کہ گفاری کی اذیتیں اور ان کا یہ قول کہ آپ افتراء پر داز ہیں آپ پر شاقی اور گراں نہیں گزرے گا (2)۔

فقہاء نے کہا ہے۔ اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ کے دل پر مہر لگا دیتا جس کے سبب قرآن اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے سب بھول جاتا۔ پس آپ انہیں خبر دے دیں کہ اگر میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا تو پھر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا جس کی اطلاع اس نے اس آیت میں دی ہے (3)۔

عَلَىٰ وَبِإِذْنِ اللَّهِ الْبَاطِلُ الخ جملہ مستندہ ہے جو افتراء پر دازی اور بہتان بازی کی نفی کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر یہ جھوٹا بہتان ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاری ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور وحی یا اپنے فیصلے کے ساتھ حق کو ثابت رکھتا ہے۔ یا یہ مفہوم ہے کہ اس نے ان کے باطل کو مٹانے کا وعدہ کر رکھا ہے اور آپ کے حق کو قرآن یا

اپنے اس فیصلے کے ساتھ ثابت رکھنے کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اور جسے رد نہیں کیا جاسکتا۔

کسائی نے کہا ہے کام میں تقدیم تاخیر ہے، یعنی اصل عبادت اس طرح ہے واللہ یحکو بالاطل۔ اور یہ کلام عمل نفع میں ہے اس کا عطف یحکم فعل مجزوم پر نہیں ہے کیونکہ نحو (مٹانا) شرط کے ساتھ مطلق نہیں بلکہ یہ مطلق وعدہ ہے۔ پھر لفظ کی اتباع کرتے ہوئے یحکو کے آخر سے آتات میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ویدع الانسان اور سَنَنْمُ الذِّبَانِ بَانِيَةً ۝ میں واو کو حذف کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا کہ ان کے باطل کو مٹا دیا اور اپنی آیات و احکام نازل فرما کر کلمہ اسلام کو بلند فرمایا۔

ۛ علامہ بیہقی اور طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ لَا اسْتِغْنَمُ عَلَيَّ اجْرًا اِلَّا الْمَوْلَاةُ مِنَ النَّعْمٰی نازل ہوئی تو بعض لوگوں کے دلوں میں عجیب سا خیال پیدا ہوا چنانچہ وہ کہنے لگے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بعد اپنے ساتھ رشتہ قربت رکھنے والوں کی اتباع و پیروی پر ہمیں برا سمجھتے کریں۔ پس جبرئیل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور آپ کو اطلاع دی کہ یہ لوگ اس طرح آپ کو تنہم کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّكَ عَلِيمٌ بِمَا يَتَّكِرُ الْفٰسِقُونَ نازل فرمائی ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور اس وقت راج ذیل آیت نازل ہوئی (1)۔

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِّن فَضْلِهِ ۗ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝

”اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی۔ اور رد کر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے اور جاتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے۔ اور کفار ان کے لیے سخت عذاب ہے۔“

ۛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا عن عیادہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور ان کی طاعت و عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے قبلت منہ الشیء۔ میں نے اس سے چیز لے لی اور میں نے اسے مبداء قبول بنایا۔ (یعنی عمل کا صلہ من ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے لے لینا اور قبول کر لینا۔) اور قبلت عنہ کا معنی ہے میں نے اس سے جدا کر دیا علیحدہ کر دیا (یعنی جب صلہ من ہو تو اس کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔)

بعض نے توبہ کا یہ معنی بیان کیا ہے ”التَّوْبَةُ تَوَكُّبُ الْمَعَاصِي نِيَّةٌ وَفِعْلًا وَالْإِقْبَالُ عَلَى الطَّاعَةِ نِيَّةٌ وَفِعْلًا“ یعنی توبہ سے مراد نیت اور عملاً گناہوں کو ترک کرنا ہے اور نیت اور عملاً عبادت و طاعت کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

حضرت اسمٰعیل بن عبد اللہ نے کہا ہے ”التَّوْبَةُ انْتِقَالٌ مِنَ الْاَخْوَالِ الْمَحْذُومَةِ اِلَى الْاَخْوَالِ الْمَحْمُودَةِ“ یعنی توبہ سے مراد برے اور مذموم احوال سے پسندیدہ اور محمود احوال کی طرف منتقل ہونا ہے (2)۔

علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ توبہ کا اطلاق گزشتہ گناہوں سے توبہ کرنے کے بارے میں سچے معافی

پر ہوتا ہے 1۔ اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنا 2۔ ضائع ہو جانے والے فراتھس کو دوبارہ ادا کرنا 3۔ ظلم و ستم اور (دوسروں کی حق تلفی) سے باز آنا 4۔ نفس کو طاعت و عبادت میں اسی طرح پھیلانا جیسے اسے معصیت اور گناہ میں پھیلایا ہے۔

5۔ نفس کو طاعت و عبادت کی تلقین اور کڑواہٹ پھیلانا جیسے اسے معصیت گناہ کی حلاوت و شیرینی پھیلانے کے بدلے اب اسی طرح رونا (1)۔

علامہ بخاری نے شرح السنۃ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ تو بہ شرمندگی اور ندامت کا نام ہے۔ اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں (2)۔

فصل :- حضرت حارث بن سوید کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عبادت کے لئے گیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت کہیں زیادہ خوش ہوتی ہے جو کسی ہلاک کر دینے والے صحرا میں ہو، اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی وغیرہ سب لدا ہوا ہو پس وہ (تھوڑا سا آرام کرنے کے لئے) ایک مقام پر اترے اور جو جائے۔ جب نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا اونٹنی غائب ہے چنانچہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر خوب گھومنا اور پھر لگائے یہاں تک کہ اسے سخت پیاس لگنے لگی اس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اسی مقام کی طرف لوٹ جاؤں جہاں میری اونٹنی تھی اور وہیں مر جاؤں چنانچہ وہ اس مقام کی طرف واپس لوٹا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بیدار ہوا تو ایک دیکھا اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس کا کھانا اور پانی سب اس پر موجود ہے (3)۔ (تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنی خوشی اور مسرت اس آدمی کو اپنا ساز و سامان دیکھ کر ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی رب کریم کو اس وقت ہوتی ہے جب اس کا بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔) اسے علامہ بخاری نے روایت کیا ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جب کوئی بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو اس آدمی کی نسبت زیادہ فرحت و مسرت ہوتی ہے جو کسی ویران بیابان زمین میں ہو۔ اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہوا ہو پھر وہ اونٹنی تم ہو جائے اور وہ آدمی اسے تلاش کر کر کے واپس واپس لدا ہوا جائے اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر لیٹ جائے پس جو بونی وہ نیند سے بیدار ہو تو چنانک دیکھے اس کی اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔ پھر وہ اس کی مہار پکڑے اور فرحت و مسرت سے مغلوب ہو کر یہ کہہ دے اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں یعنی اس نے فرط مسرت اور شدت فرحت کے سبب یہ قول کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا (4)۔

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب (اپنے گناہ کا) اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ (متفق علیہ) (5)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سورج کے مغرب

1۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 642 (فراس) 2۔ مشکوٰۃ الصالح صفحہ 206 (قدیمی) 3۔ تفسیر بخاری، جلد 6، صفحہ 103

(التاریخ)

4۔ صحیح مسلم جلد 2، صفحہ 355 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم جلد 2، صفحہ 366 (قدیمی)

کی جانب سے طوع ہونے سے پہلے پہلے جس نے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا (1)۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا (2)۔

یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اس کے معیروہ اور کبیرہ گناہوں سے درگزر کر لیتا ہے اور معاف فرمادیتا ہے چاہے وہ (گناہ کرنے والا) توبہ کرے یا نہ کرے

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی اچھا اور نیک عمل نہیں کیا تھا اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب وہ مر جائے تو اسے جلا دیں پھر اس کی نصف راکھ خشکی میں اڑا دیں اور نصف سمندر میں پھینک دیں بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اس پر قابو پایا تو وہ باپتین اسے ایسا شدید عذاب دے گا جیسا پورنی کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے دیئے ہی ایسا کیسے اس نے وصیت کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم فرمایا تو جو خاک اس میں تھی وہ اس نے جمع کر دی اور پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ سب راکھ جمع کر دی جو اس میں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے دریافت فرمایا تو نے ایسے کیوں کیا؟ تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو بہتر جانتا ہے میں نے یہ فقط تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے ایسے کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حقارت فرمادی، اسے بخش دیا (3)۔

امام احمد نے حضرت ابو درداء سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ممبر پر فرماتے ہوئے سنا ہے۔ وَلَمَّا خَالَفَ مَقَامَهُ رَبِّهِ جَنَّتَيْنِ (اور جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے تو اس کو دو باغ ملیں گے) تو حضرت ابودرداء کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا وَلَمَّا خَالَفَ مَقَامَهُ رَبِّهِ جَنَّتَيْنِ (میں نے دوبارہ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار پھر فرمایا وَلَمَّا خَالَفَ مَقَامَهُ رَبِّهِ جَنَّتَيْنِ (میں نے بھی تیسری بار پھر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابودرداء! تیری ناک خاک آلود ہو (اگرچہ اس نے ایسا بھی کیا تب بھی رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہوں گی) (4)۔

اور وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ جزہ کسی اور شخص نے تعلقوں تاکہ ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب شکر میں کو ہے۔ اور باقیوں نے اسے یاد کے ساتھ بظلمون پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ غیب قوم کے بارے میں خبروں کے درمیان میں واقع ہے اس سے پہلے خبر عن عبادہ ہے اور اس کے بعد وَيَوْمَ يُنْفَخُ عَنْهُمْ قَطْعُ لِبَاسِهِمْ۔

اس ترکیب کلام میں وَيَسْتَجِيبُ الَّذِي يَدْعُوكَ عَظْفًا يَقْبَلُ بِرَبِّهِ۔ معنی یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے جب وہ اس سے دعا مانگتے ہیں۔ الذین سے پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے جیسا کہ وَإِذَا كَانُوا مِنْكُمْ يَدْعُونَ فَارْتَدَّ بَعْضُهُمْ أَلْفًا يَدْعُونَ فَارْتَدَّ بَعْضُهُمْ أَلْفًا يَدْعُونَ۔ والذین اصل میں للذین تھا اور کالوہم اصل میں کالوہم تھا۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو طاعت قدم رکھتا ہے (5)۔ اور علامہ بیضاوی نے اس پر بتایا ہے کہ ایسا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 326 (المفکر)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 534 (المعجم)
3۔ مجمع مسلم، جلد 2، صفحہ 365 (تذری)
4۔ تفسیر ربیع، جلد 6، صفحہ 103 (التحاری)
5۔ تفسیر ربیع، جلد 6، صفحہ 103 (التحاری)

دیکھئے والا ہے۔

حاکم نے حضرت علیؑ کا قول نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا کاش ہمارے پاس بھی (مال) ہوتا۔ گویا طرح انہوں نے نغنی اور مالدار ہونے کی تمنا اور آرزو کی (۱)۔ طبرانی نے حضرت عمرو بن حرب سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ علامہ بخاری نے اپنی سند سے حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطے سے رب کریم کا یہ قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو کوئی میرے ولی کی اہانت اور تذلیل کرتا ہے وہ مجھے جنگ کے لئے دعوت مبارزت دیتا ہے اور میں اپنے اولیاء کے بارے میں ایسے ہی غضبناک ہوتا ہوں جیسے کاٹ کھانے والا شیر غضبناک ہوتا ہے۔ میرا مؤمن بندہ (کسی بھی عمل سے) اتنا میرے قریب نہیں ہوتا جتنا میرے لازم کردہ فرائض کو ادا کرنے سے ہوتا ہے میرا مؤمن بندہ نوافل ادا کرنے کے سبب مسلسل میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان آنکھ اور ہاتھ ہو جاتا ہوں اور میری تائید اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں مجھے کسی کام کے کرنے میں اتنا تردد نہیں ہوتا میں اسے کر گزرتا ہوں جتنا اپنے مؤمن بندے کی روح کے قبض میں تردد ہوتا ہے (کیونکہ) وہ موت کو تائب نہ کرتا ہے اور میں بھی اسے دکھا اور تکلیف پہنچانا ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن موت کے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ کا نہیں۔ میرے مؤمن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے عبادت کا دروازہ کھولنے کی التجا کرتے ہیں لیکن میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تاکہ فرار نکیران میں داخل ہو کر ان کے ایمان کو فاسد نہ کر دے۔ میرے بعض مؤمن بندے ایسے ہیں جن کے ایمان کی اصلاح اور سلامتی مال و دولت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر میں انہیں محتاج کر دوں فقر و افلاس ان پر غالب کر دوں تو وہ ان کے ایمان کو فاسد اور خراب کر دے، بعض مؤمن بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے ایمان کی حفاظت فقر و افلاس کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر میں انہیں غنی کر دوں (و اگر مقدار میں مال و دولت سے نواز دوں) تو وہ ان کے ایمان کو ضائع کر دے۔ اور میرے مؤمن بندوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ بیماری کے بغیر ان کا ایمان سلامت اور محفوظ نہیں رہ سکتا اگر میں انہیں صحت عطا کر دوں تو یقیناً وہ ان کے ایمان کو خراب اور فاسد کر دے۔ پیچک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اپنے علم کے مطابق کرتا ہوں۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے میں اسے خوب جاننے والا اور خوب باخبر ہوں (2)۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَضَوْا وَيُنشِئُ مَرْحَمَةً ۗ وَهُوَ الَّذِي
الْحَيِّدُ ﴿۵۰﴾ وَمِنَ الْآيَاتِ خَلْقُ السَّوَابِ وَالْأَرْضِ وَمَابَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّو ۗ
هُوَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝

”اور وہی ہے جو برساتا ہے پھر اس کے بعد کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلا دیتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی
کار ساز حقیقی (اور) سب تعریفوں کے لائق ہے۔ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی
تخلیق ہے اور جو جاندار اس نے پھیلا دیے ہیں آسمان و زمین میں اور وہ جب چاہے ان کو مہج کرنے پر پوری

قدرت رکھتا ہے۔“

لے ترکیب کلام میں وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ كَاطْفِ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ پر ہے۔ اور درمیان میں جو جملہ شرطیہ ذکر کیا گیا ہے وہ جملہ معترضہ ہے۔ نافع ابن عامر اور عاصم نے نزل کو باب تفعیل سے مشدود پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ نزل پڑھا ہے۔ غیث سے مراد اسی نفع بخش بارش ہے جو قحط کے وقت لوگوں کی فریادری اور معاونت کرتی ہے۔ فقطو اکا معنی ہے لوگ بارش کے نزول سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔

ترجمہ سے مراد یا تو بارش ہے یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خاص رزق ہے جو وہ نباتات اور حیوانات کی صورت میں ہموار میدانوں اور پہاڑوں میں پھیلا دیتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُعْطِي دَیْءِی ہے جو اپنے احسانات کے سبب اپنے بندوں کی کارسازی کرتا ہے اور ان پر اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔ الحمید کا معنی ہے وہی سب تعریفوں کے لائق ہے ایک تو اس لئے کہ وہ فی ذاتہ مستحق حمد و ستائش ہے اور دوسرا اس لئے کہ احسان فرمانے والا ہے (اور اس کے احسانات کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد و ستائش کی جائے)

لے اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدانیت قدرت باہرہ اور صفات کمال کے دلائل اور علامات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے۔ کیونکہ یہ تمام اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے ایسے صالح کے وجود پر دلالت کر رہے ہیں جو قادر بھی ہے اور حکیم بھی۔

وَصَافٍ فِیْہِمَا کَاطْفِ یا تو سموت پر ہے یا خلق ہو ہے۔ موشد آتقو سے مراد ہر جائداد اور زندہ رہنے والا ہے۔ (کیونکہ دابہ کا لغوی معنی ہے ریختے والا اور رنگین زندگی کی علامت ہے) لہذا یہاں اہم سبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے۔ پس اس صورت میں لفظ دابہ ملائکہ جنات شیاطین انسان اور تمام حیوانات کو شامل ہوگا۔ یاد رہے کہ مراد وہ جانور ہیں جو زمین پر رنگ کر چلتے ہیں۔ اس صورت میں فیہما کی ضمیر مشدہ اگرچہ زمین و آسمان دونوں کی طرف راجع ہے لیکن مراد صرف زمین ہوگی۔ اور وہ چیز جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ شی من جملہ زمین و آسمان میں ہے۔

وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اور اللہ تعالیٰ جب چاہے وہ انہیں جمع کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔ پس وہ انہیں قیامت کے دن جمع فرمائے گا۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِیْبَةٍ فَمَا كَسَبْتُمْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوا عَنْ کَثِیْرٍ ۗ وَمَا اَنْتُمْ بِبُعْجُزِیْنِ فِی الْاَمْرِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ ۗ وَلَا تَصْیِرْ ۝۱۰
مِنَ الْاَیْتِیۡمِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ کَالْاَعْلَاقِ ۗ

”اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرما دیتا ہے (تمہارے) بہت سے کثوتوں سے لے اور تم عاجز نہیں کر سکتے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں اور نہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ہے اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے وہ سمندر میں تیرنے والے جہاز جو

پہاڑوں کی مانند ہیں۔“

لے اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں پہنچی ہے۔ مَا اَصَابَكُمْ میں ما شرطیہ ہے یا موصولہ ہے جو شرط کے

معنی کو مختصن ہے۔ اسی وجہ سے اس کی خبر میں فاولائی گئی ہے۔ جمہور کی قرأت اسی طرح ہے۔ نافع اور ابن عامر نے بغیر فاء کے بجا کسبہ پڑھا ہے۔ اسی طرح مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحب میں بھی فا ذکر نہیں کی گئی کیونکہ ہلش سبب کا معنی ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں۔

وَيَقُولُ اَعْنِ كَلِمَةً كَاطْفٍ جملہ اسمیہ پر ہے یا یہ جملہ مقررہ ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کسی کلمہ کی خراش قدم کی پھلاہٹ اور کسی رگ کی پھڑک بغیر کسی گناہ کے نہیں ہوتی اور جن سے اللہ تعالیٰ درگزر فرماتا ہے وہ گناہ کہیں زیادہ ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندہ مؤمن کی بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے (2)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور علامہ بیہقی نے روایت کیا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں کتاب اللہ میں سے افضل ترین آیت کے بارے نہ بتاؤں جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا (پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی) وَهَذَا صَاحِبُكُمْ مِنْكُمْ (پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اے علیؓ! اب میں تیرے لئے اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں کہ جو بیماری سزا یا دنیوی ابتلاء تم پر آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب ہی پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انتہائی کریم ہے۔ اس کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ آخرت میں دو بارہ ٹہکی ہندوں کو سزا دے۔ اور جس گناہ سے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا ہے (اور اسے معاف کر دیا ہے) تو اللہ تعالیٰ انہم الی کمین سے وہ معافی کے بعد پھر سزا نہیں دے گا (3)۔ اسے احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت مجرموں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ مجرمین کے علاوہ دوسرے لوگوں کو جو مصیبت اور تکلیف آتی ہے اس کے اسباب اور ہوتے ہیں ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ابتلاء اور مصیبت میں مہر کرنے کے سبب اسے اجر عظیم عطا کیا جائے (4)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ عکرمہ کا قول ہے کہ جو بھی معمولی خراش یا اس سے زیادہ جو تکلیف بھی آتی ہے وہ کسی گناہ کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اس کا گناہ معافی نہیں فرماتا یا پھر کسی درجہ اور تہ پر فاقہ پڑنے کے لئے ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر وہ رتبہ پر نہیں پہنچ سکتا (5)۔

ع اور زمین میں تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ یعنی جن مصائب و آلام کا تمہارے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے تم ان سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ ترکیب کلام میں وما انتم الا اصحابکم کے مفعول سے حال ہے یا پھر ما اصحابکم کے جملہ پر معطوف ہے اور ارشاد باری تعالیٰ وَهَذَا كَلِمَةٌ مِنْ دُونِ الْكَلِمَاتِ عَطْفٌ وَمَا انتم الا پر ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست نہیں جو تمہیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے اور نہ کوئی مددگار ہے جو تم سے ان مصائب کو دور کرے۔ مع الحجوار کو ابن کثیر نے وصل اور وقت دونوں حالتوں میں یاہ کے ساتھ الجوار ہی پڑھا ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں یاہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاہ کو حذف کر دیا ہے۔ الجوارنی الجرح کا معنی ہے وہ جہاز جو سمندر میں

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (اتحادیہ) 2- التزیب والتریب، جلد 4، صفحہ 287 (المقرئ)
3- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (اتحادیہ) 4- تفسیر بیضاوی، صفحہ 643 (فراس)
5- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105

تیرے ہیں۔ کلام علامہ وہ پہاڑوں کی مانند ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ الجوار کی صفت ہے۔ اسی طرح با بعد آنے والا جملہ شرطیہ بھی اس کی صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ أَمَرْنَا عَلَى اللَّيْمِ نُسَيْبِيٌّ میں ہے۔

إِنَّ يَيْسًا يَسْكُنُ الرِّيحَ فَيُظَلِّنُ سَوَادًا كَدَّ عَلَى ظَهْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّحَمَلٍ صَبَّارًا شَكُورًا ۝۱۰۱ أَوْ يُؤَيِّسُ بِنَسَائِهِمْ وَيَسْتَبِقُوا أَصْفَادَهُمْ ۖ وَإِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّعَلْمِ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا ۗ مَا لَهُمْ مِنْ مَّعْجُونٍ ۝۱۰۲

”اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے پس وہ رکے رہیں سمندر کی پشت پر۔ بیشک اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لئے۔ یا (اگر وہ چاہے تو تباہ کر دے انہیں لوگوں کے اعمال بد کی وجہ سے اور درگزر فرمادیا کرتا ہے بہت سے گناہوں سے۔ اور (اس وقت) جان لیں گے جو ٹھٹھا کرتے رہتے ہیں ہماری آیتوں میں کہ ان کے لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔“

۱۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس ہوا کو ساکن کر دے جس کے سبب جہاز چلتے ہیں اور ہوا کے ساکن ہونے کے بعد وہ سمندر کی پشت پر ہی رکے رہیں پتھر جائیں اور چل نہ سکیں۔ بیشک اس میں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، یعنی ہر مومن کے لئے نشانیاں ہیں کیونکہ یہ بندہ مومن کی صفت ہے کہ وہ تکلیف اور شدت کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی کی صورت میں شکر ادا کرتا ہے۔ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّعَلْمِ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِنَا ۗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان دو حصوں میں تقسیم ہے نصف صبر میں ہے اور نصف شکر میں۔ اسے پہنچتی ہے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

۲۔ أَوْ يُؤَيِّسُ بِنَسَائِهِمْ کا عطف فیظللن پر ہے یعنی او ان یسایسکن الریح فیویقھن بدوام السکون۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہواؤں کو ہمیشہ ساکن رکھ کر جہازوں میں سوار لوگوں کو ہلاک کر دے اور جہازوں کو تباہ کر دے۔ بعض نے کہا ہے اس کا عطف یسکن الریح پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے او یوسلھا عاصفہ فیویقھن۔ یا سخت طوفان اور آندھیاں بھیج دے اور انہیں تباہ کر دے۔

۳۔ یسائسکون کا مطلب یہ ہے ان گناہوں کے سبب جو ان میں سوار لوگوں نے کمائے۔ وَیُؤَيِّسُ بِنَسَائِهِمْ جملہ مترضہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کے گناہوں سے درگزر فرما کر انہیں نجات عطا فرماتا ہے یا یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح بنتی ہے ان یسایسکن الریح فیظللن رواکد او یوسلھا عاصفہ فیویقھن او طیبة یعیف عن کثیر۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے اور وہ ہیں رکے رہیں یا سخت طوفان بھیج دے اور انہیں تباہ کر دے یا مناسب ہوا بھیج دے اور بہت سے لوگوں سے درگزر فرمائے۔ اصل مقصود پر ہی اقتصار کرتے ہوئے درمیان سے کلام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

۴۔ ناسخ اور ابن عامر نے استیفاف کی بناء پر یعلم کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے ہوا کو ساکن کرنے اور جہازوں کو تباہ کرنے کی علت مقدمہ پر عطف کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے، یعنی ان یسایسکن الریح لینتقم من اهل السفینة ویعلم۔ اگر اللہ تعالیٰ

چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تاکہ جہاز والوں سے انتقام لے اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہمارا آیات کی تکذیب کرتے ہوئے اور انہیں باطل قرار دیتے ہوئے ان میں جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا عطف جزا پر ہے اور اس کو نصب دی گئی ہے ان مقدمہ کی وجہ سے کیونکہ یہ ایشیائے سنہ (نئی نئی وغیرہ) کے جواب میں واقع ہے اس بنا پر کہ مصدر کا عطف مصدر پر ہے۔ یعنی ان یسنا اللہ تعالیٰ اسکان الریح و اھلاک نریم و انجاء قوم و علم من یجادل فی ایاہنا۔ (اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو ساکن کرنا، قوم کو بلا کرنا، قوم کو نجات دینا اور آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو اس طرح بتانا چاہے کہ ان کے لیے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی چاہئے پناہ نہیں) ترکیب کلام میں مالہم من محیص جملہ بعلم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ حرف نفی کے سبب اس میں تعلق موجود ہے۔ یعنی دو لوگ جو قرآن کی تکذیب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے سبق حاصل نہیں کرتے جب قیامت قائم ہونے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے تو جان لیں گے کہ عذاب سے بھاگ کر نکل جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ یا ستمی یہ ہے کہ جس وقت سند میں ہوا میں نہیں ہر طرف سے گھیر لیں تو وہ جان لیں کہ اب ان کے لئے تباہی سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔

فَمَا أَوْبَيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّامُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْلَىٰ لِلَّذِينَ
أُصْوَءَ وَعَلَىٰ رَأْيِهِمْ يَبْئَسُونَ ﴿٦٠﴾ وَالَّذِينَ يَحْسَبُونَ كِبِيرَ الْأَرْثِمِ وَالْفَوَاحِشِ وَ
إِذَا مَخَّضُوا أَمْهَمُ بِعَفْرُونَ ﴿٦١﴾

”پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بدکاروں سے اور جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو وہ محاف کر دیتے ہیں۔“

۱۔ پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے، یعنی تم اس سے اپنی فانی زندگی کی مدت حیات تک لطف اندوز ہو سکتے ہو اور منافع حاصل کر سکتے ہو لیکن یہ تمہاری آخرت کے لئے توشہ اور زور اور آہ نہیں۔ لہذا تم اس کی طلب میں حسن پیدا کرو اور اتنی مقدار پر اکتفا کرو جو تمہاری ضرورت ہو اور اس سے اجتناب کرو جو تمہیں آخرت سے غافل کر دے۔ اور وہ ثواب جو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ مقدار اور کیفیت میں اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مفید ہے اور وہ کسی مشقت کی آمیزش کے بغیر خالص منفعت اور فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کر دیا تو کچھ لوگوں نے آپ کے اس عمل پر آپ کو طامی کی۔ تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئی۔ آیت میں پہلا موصولہ ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اس طرح کہ جو کچھ انہیں دیا گیا اس کے دینے کا سبب دنیوی زندگی میں اس سے لطف اندوز ہونا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جواب فَمَتَّامُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا پر فاء ذکر کی گئی ہے۔ بخلاف دوسرے ما کے (کہ وہ شرط کے معنی کو متضمن نہیں) آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ مومن اور کافر دونوں اس اعتبار سے مساوی اور برابر ہیں کہ دونوں کے پاس دنیوی سامان ہوتا ہے اور دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ مومنوں کے لئے انتہائی بہتر اور نفع بخش ہے۔

عَلَىٰ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ كَقَوْلِ الرَّسُولِ إِذْ قَالَ يَا قَوْمِ أُوذِيَ النَّاسُ مِنِّي وَإِنِّي مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٠٥﴾ اور کسائی نے سورہ نجم اور یہاں پر کبیر الائمہ صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تخبیر جمع پڑھا ہے۔

فواحش سے مراد گناہ کبیرہ ہیں۔ سدی نے کہا ہے اس سے مراد زنا ہے اور مقاتل نے کہا ہے فواحش سے مراد ایسے گناہ ہیں جو حد واجب کرتے ہیں (۱)۔ ہم نے سورہ النساء میں کبیرہ گناہوں کا تذکرہ کیا ہے وَإِذَا مَا عَجَبُوا أَنَّهُمْ يُخْفَوْنَ كَمَا عَطْفَ يَجْتَسُونَ پر ہے۔ اس میں ظرف اذا بغفرون کے متعلق ہے۔ اور خبر ہونے کی وجہ سے بغفرون لہم ضمیر پر محمول کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ بیشک وہی حالت غضب میں معاف کر دینے کے اہل ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ صرہ معطوف ہے اور موصول لَئِنِ اتَمَّنُوا پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور سے یا مدح کی بنا پر منصوب ہے یا پھر مرفوع ہے۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٠٦﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْمِصْرُ بَينَهُمْ يَتَخَفَتُونَ ﴿١٠٧﴾

”اور جو اپنے رب کا حکم مانگتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں۔“

اور جو اپنے رب کا حکم مانگتے ہیں، یعنی طاعت و عبادت میں سے جس جانب اللہ تعالیٰ نے انہیں دعوت دی انہوں نے اسے قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا۔ شوری مصدر ہے جیسا کہ فیصا ہے اس کا معنی ہے باہم مشورہ کرنا، یعنی وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں ان تمام معاملات میں جو انہیں پیش آتے ہیں اور ان کا فیصلہ کرنے میں وہ قطعاً جلدی نہیں کرتے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بندہ مؤمن اپنے مؤمن بھائی سے مشورہ کرتا ہے تو وہ اسے ایسا ہی مشورہ دیتا ہے جو وہاں میں اس کے لیے خیر و برکت کا سبب ہوتا ہے وہ اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے (2)۔ اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، ترمذی نے حضرت اسلم رضی اللہ عنہما سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے الاوسط میں حسن سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے لہذا جب کسی سے مشورہ لیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا مشورہ دے جسے وہ اپنی ذات کے لیے کرنا بھی پسند کرے۔

طبرانی نے الکبیر میں حسن سند کے ساتھ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہے اگر چاہے تو اشارہ کرے اور اگر چاہے تو اشارہ نہ کرے (3)۔ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے وہ خیر اور نیکی کی راہ میں خرچ کر کے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ صرہ معطوف ہے یا حال ہے۔

عَلَىٰ النَّبِيِّ كَمَا مَعْنَى ظَلَمَ زِيَادَاتِي اور عداوت ہے۔ اور هُمْ يَتَخَفَتُونَ کا معنی ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں مگر بدلہ لینے میں ان پر زیادتی نہیں کرتے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی دو قسمیں بنائی ہیں ایک قسم میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے

اور ظلم کرنے والوں سے درگزر کر لیتے ہیں اور ان سے انتقام لینے بغیر انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ اور دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں انہی لوگوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

ابراہیم نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ذلیل و رسوا ہونا پسند کرتے ہیں اور جب قدرت اور قابو پا لیتے ہیں تو پھر معاف کر دیتے ہیں۔

عطاء نے کہا ہے ان سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہیں ظلماً بغیر حق کے مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ ان کا جرم فقط یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سر زمین پر غلبہ اور اقتدار عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں سے مناسب انتقام اور بدلہ لے لیا (1)۔

علامہ بیضاوی نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان لوگوں کے تمام بنیادی اور اہم ترین فضائل و اوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ذلت و رسوائی کو ناپسند کرتے ہیں اور یہ وصف ان کے وصف غفران کے خلاف نہیں۔ (یعنی ان کے درمیان اس طرح کوئی تضاد نہیں کہ ان کا وصف محمود درگزر بھی اور پھر ان کا وصف انتقام اور بدلہ لینا بھی ہے۔ تو بظاہر ان میں تضاد دکھائی دیتا ہے حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں۔) کیونکہ وصف غفران اس پر مطلق کر رہا ہے کہ جس کو معاف کیا جا رہا ہے وہ مکمل طور پر عاجز آچکا ہے۔ اور لفظ انتقام (انتقام لینا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا دشمن عاجز نہیں آتا بلکہ مقابلہ کرتا ہے۔ اور عاجز سے علم و بردباری سے پیش آنا پسند یہ اور قابل ستائش ہے۔ اور مقابلہ کرنے والے سے درگزر کرنا مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس طرح اسے ظلم و زیادتی پر مزید جرات اور اگلیخت ملتی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ظلم اللہ تعالیٰ اور عامرہ المؤمنین کے حق میں زیادتی اور حدود سے تجاوز کرنے والا ہو تو ایسی صورت میں اس سے انتقام لینا صرف بہتر ہی نہیں بلکہ واجب ہے، تاکہ قہقہے کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اور اگر وہ کسی فرد واحد کے حق میں زیادتی کرنے والا ہو تو پھر بھی اس پر زیادتی کئے بغیر اس سے انتقام اور بدلہ لینا جائز ہے لیکن محمود درگزر کرنا، اصلاح کرنا اور برائی کازال اچھائی اور نیکی سے کرنا افضل ہے (1)۔ واللہ اعلم

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (تجاریہ)

2- تفسیر بیضاوی، صفحہ 644 (فراس)

(1) ابن عون نے ذکر کیا کہ قول باری تعالیٰ وَلَتَنْتَقِمَنَّ بَدَنَهُ لِمَا كَفَرَ مِنْ تَبِئِهِ ﴿١٠﴾ کے بارے میں پوچھا جاتا تھا کہ اس میں انتقام سے مراد کیا ہے۔ چنانچہ علی بن زید بن سمران نے مجھے اپنی سوتیلی ماں ام محمد سے ایک یہ روایت بیان کی ہے کہ ابن عون نے کہا ہے۔ کہ ان کا گمان ہے کہ ام محمد ام المؤمنین کا شوحدیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ بتی ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ایک حضرت زینب بنت جہش میرے پاس بھیجی ہوئی تھیں کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنے دست مبارک کے ساتھ کچھ کرنے لگے۔ تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے آپ کو زینب کے موجود ہونے کی اطلاع دی تو آپ نے ہاتھوں کو روک لیا۔ زینب حضرت عائشہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور کچھ سخت سہت کہنا شروع کر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے روکا مگر وہ باز نہ آئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا تم بھی اسے سخت سہت الفاظ کو چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا تو حضرت زینب اٹھ کر حضرت علی کے پاس چلی گئیں۔ اور وہاں جا کر بتایا کہ عائشہ نے تمہیں ایسے ایسے کہا اور اس اس طرح کیا چنانچہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا رب کی قسم! عائشہ صدیقہ میرے باپ کی جیویہ اور پسندیدہ ہے۔ تو آپ وہاں سے واپس چلی گئیں اور جا کر انہیں بتایا کہ میں نے اس اس طرح کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اس طرح فرمایا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور اس بارے میں گفتگو کی۔ اور جابجا اورداد۔

ساتھ عیاض بن ہمارے اسے نقل کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا قیامت کے دن بکثرت لعن طعن کرنے والوں کی نہ شہادت قبول ہوگی نہ شفاعت (یعنی نہ وہ شاہد ہو گئے اور نہ ان کی شفاعت قابل قبول ہوگی) اسے مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باہم گالی گلوچ دینے والوں کے بارے جو کچھ فرمایا ہے تو اس کا اطلاق ابتدا کرنے والے پر ہوتا ہے یہاں تک کہ مظلوم جواب دینے میں اس سے آگے بڑھ جائے (1)۔ (تو پھر دونوں اس زمرہ میں آ جا سکیں گے) اسے امام احمد، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابتداء کرنے والا زیادہ ظالم ہے اور جواب دینے والے کے لئے (اسی کی شکل جواب دینے کی) کراخت ہے۔

۱۔ پس جو کوئی اپنے ساتھی کا ظلم معاف کر دے اور اپنے اور ظالم کے درمیان صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔ بیشک بالیقین اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا فرمائے گا۔

علامہ بخاری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک بیکار نے والا ندا دے گا کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ کھڑا ہو جائے؟ تو صرف وہی کھڑا ہوگا جس نے اپنے ساتھ جرم اور زیادتی کرنے والے کو معاف کیا ہوگا (2) پھر انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

بیشک وہ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا، یعنی کالی گلوچ میں ابتدا کرنے والوں اور انتقام و بدلہ لیتے وقت حد مساوات سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو ظلم و زیادتی کرنے کی ابتداء کرتے ہیں (3)۔

وَلَمَّا اتَّخَذْنَا لِكُلِّ قَوْمٍ نَبِيًّا لِيُنذِرَهُمْ وَأَعَلِّيَهُمْ سَبِيلًا ۗ ﴿١٠﴾ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى
الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِعَدْوٍ لَّحِقٍ ۗ ﴿١١﴾ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ ﴿١٢﴾ وَلَكِنَّ صَدِّقًا وَعَقْفَرًا إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْوِرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾

”اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد یہیں لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں ہے بیشک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور نساہت پر پا کرتے ہیں زمین میں ناحق یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور جو شخص (ان مظالم پر) صبر کرے اور (حقارت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔“

۱۔ بَعْدَ ظُلْمِهِمْ میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے، یعنی جو بدلہ لیتے ہیں ظالم سے ان پر ظلم کرنے کے بعد تو یہ انتقام لینے والے وہ لوگ ہیں جن کے لئے کوئی عتاب نہیں اور نہ ہی ان پر کوئی مواخذہ ہے۔

۲۔ بیشک آخرت میں سزا اور دنیا میں عتاب اور مواخذہ ان لوگوں پر ہوگا جو لوگوں کو نضرا اور نقصان پہنچانے کی ابتداء کرتے ہیں۔ اور ناحق ان کو جان و مال اور عزت و آبرو کے اعتبار سے انہیں اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور زمین میں ناحق فساد برپا کرتے ہیں۔ قاسموس میں ہے شی بیھی بغیا اس نے تکبر کیا، اس نے ظلم کیا، حق سے اعراض کر لیا اور غلبہ حاصل کیا۔

۳۔ لَمَّا تَصَدَّقَ عَطْفَ مَنْ انْتَصَرَ پر ہے اور ان دونوں کے درمیان جملہ محترمہ ہے۔ معنی یہ ہے جو کوئی اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے ظلم

پر صبر کرے اور ظلم کو معاف کر دے اور اس سے انتقام نہ لے، ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو کہ نحو افضل الناس ہے۔ (یعنی وہ لوگوں میں سے افضل ہے) تو کلام سے خبر کو حذف کر کے اس کے مقام پر اس کی علت کو رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول ہے اِنَّ ذٰلِكَ لَیْسَ بِعَزِیْزٍ عَلٰی الْمُتَّقِیْنَ یہ صبر اور معاف کرنا یقیناً یہ بڑی بہت کے کاموں میں سے ہے۔ یہاں عزم معنی معزوم ہے اور اس کا معنی مطلوب شرعی یعنی صبر کرنا اور معاف کرنا ان امور میں سے ہیں جو شرعاً مطلوب و مقصود ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے یہ ان امور میں سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم اور شرف فرمایا ہے زجاج نے کہا ہے کہ صابر کو اس کے صبر کے سبب ثواب عطا کیا جاتا ہے اور ثواب میں رغبت رکھنا ہی کامل طلب ہے (1)۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهِ ۗ وَسَرَى الظَّالِمِیْنَ لِمَا سَرَّوْا
 الْعَذَابَ یَقُولُوْنَ هَلْ اِیْ مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلِی ۗ وَتَدْرَبْهُمْ یَعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا
 خُشْعِیْنَ مِنَ الدَّلٰلِ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرَفِیْ خَفِیْ ۗ وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ
 الْعُسْرَیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۗ اِلَّا اِنَّ الظَّالِمِیْنَ
 فِیْ عَذَابٍ مُّقْتَدِمٍ ۗ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِیَآءَ یَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ
 یُّضْلِلِ اللهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِیْلِی ۗ

”اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کا کوئی کارساز نہیں اس کے بعد۔ اور آپ ملاحظہ کریں گے ظالموں کو جب وہ دیکھیں گے عذاب (تو شٹنا جائیں گے) پوچھیں گے کیا واپس لوٹنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟ اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ پیش کیے جا رہے ہونگے دوزخ پر اس حال میں کہ عاجز و دردماندہ ہونگے ذلت کے باعث دیکھتے ہوئے کٹکھیں سے چوری چوری۔ اور انہیں گے اہل ایمان کہ حقیقی گھائے میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے گھائے میں ڈالا اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو قیامت کے روز۔ سن لو ظالم لوگ ضرور ابدی عذاب میں ہونگے ج۔ اور نہیں ہونگے (اس روز) ان کے لیے مددگار جو مدد کریں ان کی اللہ کے بغیر۔ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو اس کے لیے (بچنے کی) کوئی راہ نہیں ہے۔“

۱۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اسے رسوا اور ذلیل کرنے کے بعد اس کے لئے کوئی مددگار نہیں جو اسے راہ ہدایت پر گامزن کر سکے اور عذاب الہی سے اسے بچا سکے۔ یہ جملہ مترفع ہے۔

اسے مخاطب! آپ ظالموں کو ملاحظہ کریں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے (تو شٹنا جائیں گے) چونکہ انکا قیامت کے دن عذاب کو دیکھنا ایک ثابت شدہ اور یقینی امر ہے اسی لئے آیت میں مضار کی بجائے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں یَقُولُوْنَ هَلْ اِیْ مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلِی کا جملہ تری فعلیہ و مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یعنی آپ انہیں یہ قول کہتے ہوئے دیکھیں گے۔

هل لفظاً استفہامیہ ہے لیکن یہاں سوال، درخواست اور التجا کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی التجا اور درخواست کریں گے۔

باعث (تو شور مچانے لگتا ہے) بیٹک انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔“

۱۔ اِسْتَجِيْبُوْا لِیْرْتَدِّمُکُمْ کَا مَعْنٰی ہے (کو لو!) تم اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لو۔ وہ دن آنے سے پہلے جس کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے واپس نہیں لوٹائے گا۔ اس صورت میں صون اللہ کا تعلق مرد سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ صون اللہ اَنْ یَّکُوْنٰی کے متعلق ہے، یعنی اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ دن آ جائے جسے لوٹنا نامکن نہیں ہوگا۔ اس دن سے مراد موت کا دن ہے یا قیامت کا دن ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی بھانسنے کی جگہ نہیں ہوگی جہاں تم پناہ لے سکو۔ ملجھکا معنی ہے بھانسنے کی جگہ، پناہ گاہ۔ اور جو کچھ تم نے اعمال کئے ہیں اس دن تم ان کا انکار نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ سب تمہارے اعمال ناموں میں لکھے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف تمہاری زبانیں اور دیگر اعضائے بدن شہادت دیں گے یا تکبیر یعنی منکر برائیاں ہے۔ یعنی اس دن منتہی برائیاں اور بد اعمالیاں تمہارے ساتھ ہوں گی ان کے سوا تمہارے لیے کوئی برائی نہیں ہوگی۔

۲۔ اے محمد! اصلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ پھر بھی آپ کی اطاعت و فرمانبرداری سے روگردانی کریں تو آپ قطعاً غمزدہ اور پریشان حال نہ ہوں کیونکہ ہم نے آپ کو ان پر تکبہاں اور ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کی روگردانی اور اعراض کی صورت میں مؤاخذہ آپ سے کیا جائیگا۔ کلام میں شرط کی جزا کو حذف کر دیا گیا ہے اور علت کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَلَا تَحْزَنْ یٰۤاَبٰٓیٓ قٰنٍ مَاۤ اٰزْسَلْنَاکَ عَلَیْہِمْ رَقِیْبًا مَّوٰجِدًا عَلٰی اِغْرٰہِمْ۔

آپ کا فرض تو صرف احکام پہنچانا دینا ہے اور آپ وہ فرض ادا کر چکے ہیں۔ اِنَّ عَلَیْکَ اِلٰہَ الْبَلٰدِ قَوْلَ بَارِیِّ تَعَالٰی مَا اِرْسَلْنَاکَ عَلَیْہِمْ حَفِیْظًا۔ کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳۔ اور جب ہم اپنی رحمت کا مزا انسان کو چکھا دیتے ہیں تو اس سے وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اس میں انسان سے مراد جنس انسان ہے۔ اور رحمت سے مراد مال و دولت اور صحت ہے (۱)۔ صیغہ سے مراد نقطہ، فقرہ، اظہار یا مرض ہے۔ ہَا قَدْ مَعَتْ اٰیٰتِہُمْ یعنی ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے اس سے قبل کیے اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے (تو وہ شور مچانے لگتا ہے۔) چونکہ اکثر افعال ہاتھوں کے ساتھ ہی کیے جاتے ہیں اسی لئے انہیں ایدہیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بیٹک انسان انتہائی زیادہ ناشکر گزار ہے۔ یعنی جب بھی اس پر معمولی سی تکلیف اور ہلکی سی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والی سابقہ تمام نعمتوں اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ بار بار تکلیف اور دکھ کا ذکر کرتا ہے اور انہیں خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے لیکن اس کے اسباب میں غور و فکر نہیں کرتا۔

اگرچہ یہ حکم مجرموں کے ساتھ مختص ہے تب بھی اس کی نسبت جنس انسان کی طرف کرنا صحیح ہے کیونکہ تمام کے تمام مجرم بھی جنس انسان میں شامل ہیں۔ پہلے جملہ شرطیہ میں اذا ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے میں حرف شرط ان ذکر کیا گیا ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ نعمتوں کا مزہ چکھنا اور نعمتوں سے بہرہ ور کرنا ایک ثابت شدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور اس کی رحمت و اذیت اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ بطور حرف شرط اذا ذکر کیا گیا ہے (کیونکہ یہ ثابت شدہ امر پر دلالت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے) جبکہ اس کے برعکس آزمائش میں جٹلا کر نانو اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور نہ ہی اس کی رحمت اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ یہ کسی جرم اور گناہ کے سبب آتی ہیں اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ ان حرف شرط ذکر کیا گیا ہے (جو مطلق شک کے معنی دیتا

ہے۔ (کلام میں جزا کی علت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور دوسرے جملہ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ اس جنس کو کفر ان نعمت کے ساتھ موصوم کیا گیا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ يَخْلُقْ مَا يَشَاءُ ۗ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ اِنَّا كٰوْنُوْنَ
 يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُرِيْهِمْ ذُرِّيَّاتَهُمْ اَوْ يَجْعَلُ مَن يَشَاءُ
 عَقِيْمًا ۗ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۱۰ ۙ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يَّكَلِمَ اللّٰهَ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ
 وَّرَآءِ حِجَابٍ ۙ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاٰيٰتِهٖمَا يَشَاءُ ۗ اِنَّهٗ عَلٰى حَكِيْمٍ ۝۱۱

”اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے بخشنا ہے جس کو چاہتا ہے بچیاں اور عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے فرزند یا ملا کر دیتا ہے انہیں بیٹے اور بیٹیاں اور بنا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بانجھ۔ چینگ وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے۔ اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا جس پر وہ بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے۔“

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اس لیے وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے چاہے نعمتوں سے نوازے یا اعمال بد پر ناقص اور بدلے۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا معلق قول باری تعالیٰ وَمِن اٰيٰتِهٖ الْجَوٰرِ سے متصل ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے یہ جملہ سابقہ کلام کی علت ہے۔ اور قول باری تعالیٰ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ اِنَّا كٰوْنُوْنَ کے مطابق خلق کا بیان اور تفصیل ہے، یعنی وہ بعض لوگوں کو صرف بچیاں عطا فرماتا ہے ان کے ہاں بچہ موجود نہیں ہوتا۔ چونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے بچیوں کا ذکر کیا ہے اسی لئے بعض نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی عورت کے ہاں سب سے پہلے بچی کا پیدا ہونا اس کے لئے باعث رحمت و برکت ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ جنہیں چاہتا ہے صرف بچے عطا فرماتا ہے اور ان کے پاس بچیاں نہیں ہوتیں۔ اور بعض کے لئے دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور ان کے پاس بچے اور بچیاں دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے اور اس کے پاس کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ چینگ اللہ تعالیٰ جسے پیدا کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس کی قدرت رکھتا ہے اور وہ اپنا کام اپنی کمال حکمت و دانائی اور اختیار کے ساتھ کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جملہ وَيَخْلُقُ مَن يَشَاءُ اِلٰیٰح یخلق سے بدل بعض ہے۔

ع علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ نبی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتے اور اسے دیکھتے کیوں نہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور اس کا دیدار کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا (1)“ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يَّكَلِمَ اللّٰهَ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ فرمائی۔ کہ کسی بشر کے لئے یہ صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست کلام کرے۔

وحیا اور اس کے معطوفات مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بنا پر منصوب ہیں کیونکہ ہرگز آئی ججایب کلام مخذوف کی صفت ہے۔ اور ارسال بھی کلام کی ایک نوع ہے، یعنی وہ کلام جو کہ رسول کے واسطے سے ہو۔ اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہ حال ہونے کی وجہ منصوب ہو اور مصدر بمعنی مفعول استعمال ہو رہا ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو الاوحی او مستمعان و رای حجاب او مرسل۔ (مگر وہ کلام وہی کیا جائے یا پردے کے پیچھے سنا جائے یا رسول کے واسطے سے بھیجا جائے۔)

لغت میں وحی سے مراد انتہائی تیز اشارہ ہے "الاشارة السريعة والمراد ههنا كلاما خفيا غير مركب من حرف مقطعة متعاقبة يلقيه تعالى في قلب النبي صلى الله عليه وسلم في المنام او اليقظة۔

یعنی یہاں وحی سے مراد ایسا مخفی کلام ہے جو یکے بعد دیگرے آنے والے حروف مقطعات سے مرکب ہو (یعنی بسیط ہو) اللہ تعالیٰ یہ کلام حالت تنہا یا حالت بیداری میں اپنے ہی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر القا کرتا ہے اس کو الہام بھی کہا جاتا ہے اور یہ بالمشافہہ کلام کو بھی شامل ہے جیسا کہ حدیث معراج میں ذکر ہے اور اس حدیث میں جس کے آخر میں روایت باری تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور تفسیری آواز سنائی دینے کو بھی شامل ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور طور پر اتفاق ہو، (اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں 1۔ بلا واسطہ کلام کرنا 2۔ تفسیری آواز سنائی دینا) لیکن قول باری تعالیٰ آذین ذرآئی ججایب اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مذکورہ دونوں قسمیں وحی کی قسم اول کے ساتھ خاص ہیں اور وحی کی دوسری قسم من و رآی حجاب ہے۔ یہ آیت روایت باری تعالیٰ کے جائز ہونے پر تو دلیل ہے لیکن اس سے روایت کی نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ بغوی نے اس آیت کا جو شان نزول ذکر کیا ہے وہ تو دنیا میں وحی کے وقت اللہ تعالیٰ کے ویدار کی نفی پر دلالت کرتا ہے لہذا یہاں وحی کا معنی کلام بسیط کا دل میں القا کرنا ہوگا "القا کلام بسیط فی القلب" اور قول باری تعالیٰ آذین ذرآئی ججایب سے مراد وہ کلام جو فرشتے کے واسطے کے بغیر سنا جائے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنا نہ جائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور کوہ طور پر اتفاق ہوا تھا اسی طرح علامہ بغوی نے کہا ہے یا وہ کوئی پیغامبر، یعنی فرشتہ بھیجے جائے وہ فرشتہ جبرئیل امین ہو یا کوئی اور فرشتہ ہو۔ اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کرے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

جمہور نے وحیا پر عطف کرتے ہوئے یوسل اور یوحی کو منصوب پڑھا ہے اور ان سے پہلے ان مصدر یہ مقدر ہے۔ اور نافع نے بطریق اجتہاد انہیں مرفوع پڑھا ہے، یعنی جبرئیل کی لام کو ضمہ کے ساتھ اور یوحی کی یاہ کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا کلام فرماتا دو قسموں میں محصور ہو جاتا ہے 1۔ وہ فرشتے کے واسطے کے بغیر کلام فرماتا ہے 2۔ وہ فرشتے کے واسطے سے انبیاء علیہم السلام سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبھی تو ایسے وحی آتی ہے جیسے گھنٹی بجنے کی آواز ہوتی ہے اور یہ وحی مجھ پر انتہائی شدید اور نقیص ہوتی ہے۔ جب وہ سلسلہ مجھ سے منقطع ہوتا ہے تو اس میں جو کلام ہوتا ہے وہ مجھے یاد ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور وہ مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں (1)۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا انتہائی سخت ٹھنڈے دن میں وحی کا نزول ہو رہا ہے تو جب یہ سلسلہ منقطع ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پر پیدہ بھوٹ رہا تھا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا ہے تو آپ مضطرب ہو جاتے اور آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اعلان نبوت کے بعد) پندرہ برس تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ سات برس تک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آواز سنتے تھے اور روشنی بھی دیکھتے تھے لیکن کوئی وحی نظر نہیں آتی تھی اور آٹھ سات تک آپ کی طرف وحی آتی رہی۔ اور دس سال تک آپ مدینہ طیبہ میں مقیم رہے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک پندرہ (65) برس تھی۔ متفق علیہ (3)

حضرت ابو المثنیٰ بن عاصمہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں سب سے اول جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز ہوا وہ حالت نیند میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خواب تھے۔ اللہ عیث متفق علیہ (4)۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات سے اور وحی شان والا ہے اور بہت دانا ہے وہ وہی کچھ کرتا ہے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے پس کبھی بغیر واسطہ کے کلام فرماتا ہے اور کبھی واسطہ کے ساتھ۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا
الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْتَدِي
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٥١﴾ صِرَاطَ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيْرُ الْأُمُورِ ﴿٥٢﴾

”اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک جانفزا کلام اپنے حکم سے۔ نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن (اسے حبیب!) ہم نے بنا دیا اس کتاب کو (سراپا) نور ہم ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعہ جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے۔ اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف۔ جو اللہ تعالیٰ کی راہ ہے وہ اللہ جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ خوب سن لو! سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔“

ل وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا
الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْتَدِي
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٥١﴾ صِرَاطَ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ
أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيْرُ الْأُمُورِ ﴿٥٢﴾

3- مشکوٰۃ الصالح، صفحہ 521 (قدیمی)

2- مشکوٰۃ الصالح، صفحہ 522 (قدیمی)

1- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی)

5- تفسیر ربغوی، جلد 6، صفحہ 108 (انجاری)

4- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی)

ادواح کے سبب زندہ رہتے ہیں اسی طرح دلوں کی زندگی قرآن سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کو روح کہا گیا ہے۔ ربیع نے کہا ہے کہ روح سے مراد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہیں (1) اور معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا روح سے مراد ثبوت ہے۔ اور حسن نے کہا ہے روح سے مراد حمت ہے (2) پس اس سے مراد بھی قرآن کریم ہی ہے کیونکہ قرآن نبوت اور حمت کا اثر (نشان) ہے۔

ربیع ائمہ کا مفہوم یہ ہے ہم جو دینی آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔ اپنے حکم سے بھیجتے ہیں من امر ناروح کے لئے ظرف مستقر ہے، یعنی روح ہمارے امر سے ہے۔ حاکمیت کا مفہوم یہ ہے کہ کلام میں الیک کی کا فی ضمیر سے حال ہے، یعنی درآئیہ علیہ دہی سے پہلے آپ نہیں جانتے تھے۔ حاکمیت کا مفہوم یہ ہے کہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور حرف استفہام نے اسے عمل سے روک دیا ہے۔ (کہ کتاب کیا ہے اور یہ کہ ایمان کیا ہے؟) یعنی آپ ان شرائع اور احکام کو نہیں جانتے تھے جنہیں جاننے کا معنی اور نقل کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ (یعنی عقلی طور پر انہیں جانتا محال اور ناممکن تھا۔)

محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اس مقام پر ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے 'ماکان اللہ لیسعیغ ایسانکم' (3) (اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے کہ تمہاری نمازوں کو ضائع کر دے) اس تفسیر کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو ایمان کے بارے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ الہام آگاہ کیا گیا چنانچہ وہ اسی الہام کے سبب عالم کے لیے ایک ایسا صالح تسلیم کرتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہوئے، محبوب و نفاکس سے منزہ اور زوال پذیر ہونے سے مبرا ہونے کے اعتبار سے یکتا اور منفرد ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دہی سے نقل دین ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ یہ ایسا قول ہے جس کی تائید نہ عقلی دلائل سے ہوتی ہے اور نہ ہی عقلی سے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اور نہ ہی دین ابراہیمی قریش میں رائج اور عام تھا بلکہ وہ تو چچروں کی پوجا کرتے تھے ہاں اتنا ضرور تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گوشہ تنہائی پسند فرماتے تھے، اور غلوٹ نہیں رہا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامل مومن تھے حقیقت ایمان کا یقین رکھتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اسی حالت کا نام ایمان ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُورًا کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ضمیر سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے (4) یعنی جہالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ایمان کو یا قرآن کو نور بنایا۔ اور ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اس کے سبب اسے دنیا میں خالص اور سچے عقیدہ تک اور آخرت میں جنت اور مراتب قرب تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ تمام لوگوں کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔ اور صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے اور یہاں ہدایت سے مراد۔ ارءاء الطریق (راستہ دکھانا) ہے۔

2- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (النجاریہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (النجاریہ)

4- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (النجاریہ)

3- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (النجاریہ)

ع۔ و سراط اللہ۔ و سراط مستقیم سے بدل ہے۔ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی مخلوق ہے۔ اور سن لو آخرت میں تمام مخلوق کے امور کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ تمام واسطے اور تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ اس آیت طیبہ میں اطاعت شعرا اور فرمانبردار لوگوں کے لئے (ایچھے انجام کا) وعدہ ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے (عذاب کی) وعید ہے۔ واللہ اعلم۔

تمت بالخیر

سورہ شوریٰ کی تفسیر بروز ہفتہ 13 ربیع الاول 1208ء اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان اور اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ لطف و کرم کے طفیل سورہ شوریٰ کا ترجمہ 22 فروری 2001ء بمطابق 27 ذوالقعدہ 1421ء بروز جمعرات رات ایک بج کر پینتالیس منٹ پر اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين و على اله وصحبه اجمعين۔

چھوڑ دیں گے اور تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں کوئی سزا نہیں دیں گے (۱)۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّ فِي الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيِّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ فَاهْلَكْنَا أَشْدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَ مَضَىٰ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ۝

”اور ہم نے بکثرت بھیجے ہیں نبی پہلے لوگوں میں۔ اور ان کے ساتھ مذاق کرنے والے کوئی نبی مگر وہ (کفار) اس کا مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ پس ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا جو ان سے زیادہ طاقتور تھے اور گزر چکا ہے حال پہلے لوگوں کا۔“

۱۔ ہم نے کثیر انبیاء بھیجتے کیے۔

۲۔ یٰٰتٰیہم میں فعل مضارع صیغہ حال ماضی کی حکایت کے طور پر ہے اور یہ ارسلنا کا معطوف ہے یا یہ جملہ حال ہے من نَبِیِّ میں من زائد ہے اور نبی کی شکل رفع میں ہے۔ کائنات پہ یَسْتَهْزِئُونَ یہ معنی ہے اور گل نصب میں ہے۔ اور یا تمہم کے مفعول بہ سے حال ہے معنی یہ ہوگا ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تمہا مگر یہ اس کے ساتھ مذاق کرنے والے تھے یا یہ معذوف مفعول مطلق کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یا تمہم من ایہنا الا ایہنا کا نوابہ يستهزؤن یا یہ مفعول قید ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کوئی نبی کسی زمانہ میں ان کے پاس نہیں آتا مگر وہ نبی کے ساتھ مذاق کرنے والے ہوتے ہیں حشر آج کی قوم آپ کا مذاق اڑاتی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے۔

۳۔ منہم میں ہم تمہیر سے مراد فضول خرچی کرنے والے ہیں ہم تمہیر سے مراد اہل مکہ ہیں اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف القات (کلام کو پھیرا گیا ہے)۔ معنی یہ ہوگا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا حالانکہ وہ مشرکین مکہ سے زیادہ طاقتور تھے۔ بطش کا معنی قوت ہے یہ اشد کی نسبت سے تمہیر سے یا یہ اہل مکہ سے مفعول مطلق ہے۔

پہلے لوگوں کے ہلاک ہونے کا عجیب و غریب قصہ گزر چکا ہے حق تو یہ تھا کہ وہ ضرب المثل کے طور پر مشہور و معروف ہوتا اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وعدہ ہے اور استہزاء کرنے والوں کے لیے اس قسم کے عذاب کی وعید ہے جس کا سامنا پہلے لوگوں نے کیا تھا۔

وَلَیِّن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ حَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً وَّ بَقَدَمًا ۝ فَاَنْشَرْنَا بِوہٗ بَلَدًا کَاٰمِنِیْنَ ۝
كُلُّ لَیْكٌ تُحَرِّجُوْنَ ۝

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے پیدا کیا ہے انہیں بڑے زبردست سب کچھ جانتے والے نے۔ جس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے زمین کو گوارا اور بنا دیئے ہیں تمہارے لیے اس میں راستے تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو۔ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق جس ہم نے زندہ

کر دیا اس سے ایک مردہ شوہر کو بونہی تمہیں بھی (قبروں) سے نکالا جائیگا۔“

لہم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں یہ جملہ مذبذوب قسم کا جواب ہے کیونکہ لسن میں لام مفتوح ہے حَفَعْتُمْ الْعَزِيْزَ الْعَلِيْمَ جو اب دیتے ہیں یہ ارشاد اس کو لازم ہے یا وہ جو جواب دیتے تھے اس پر یہ اجمالی طور پر دلالت کرتا ہے۔ لازم کو جواب کے جواب کے قائم مقام اس لیے رکھا گیا تاکہ ان پر الزام جت ہو جائے کیونکہ کئی مواقع پر یہ بات صراحت کے ساتھ آئی ہے کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے کیونکہ عزیز و کبیرہم صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہی ہیں یہ بھی جائز ہے کہ یہی ان کا مقول ہو اور یا بعد جملہ مستند ہے۔

ع۔ زمین کو بچھونا بنا دیا جس طرح بچے کے لیے بچھونا ہوتا ہے اور اس میں ایسے راستے بنا دیے جن میں تم چلتے ہو تاکہ تم اپنے مقاصد تک پہنچ سکیا ان چیزوں میں غور و فکر کر کے صانع کی حکمت تک پہنچ سکو۔

ع۔ قدر سے مراد اسکی مقدار ہے جو فوج دیتی ہے نقصان نہیں دیتی فانشرفنا میں غائب کے صیغہ سے تکلم کے صیغہ کی طرف التفات ہے جس کا معنی ہے ہم نے زندہ کر دیا، یعنی جس طرح ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا ہے اس طرح ہم تمہیں قبروں سے زندہ کریں گے کُلِّ يَوْمٍ يُخْرِجُنَّ يَوْمِيَوْمٍ يَوْمِيَوْمٍ ہے شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں ٹخوں کے درمیان چائیں کا فاصلہ ہو گا لوگوں نے پوچھا ہے ابو ہریرہ کیا وہ چائیں دن ہو گئے؟ تو جواب دیا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا چائیں سال ہو گئے؟ تو جواب دیا میں اس سے بھی انکار کرتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا تو لوگ زمین سے اس طرح نکل آئیں گے جس طرح سبزیاں اُگی ہیں انسان کے جسم کی ہر چیز بوسیدہ ہو جائیگی مگر ایک بڑی باقی رہے گی جسے دمڑ کے لیے بڑی کہتے ہیں اس سے اس کا سارا جسم جوڑا جاتا ہے (1) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے ابن جریر نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ ایک وادی عرش کے نیچے سے بہتی ہے اسی سے روئے زمین پر ہر جانور پیدا ہوتا ہے پھر روحمیں اترتی ہیں انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جسموں میں داخل ہو جائیں اللہ تعالیٰ کے فرمان يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُنْمِطَةُ ﴿۱﴾ اتر چھی ائی تریا۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ امام احمد اور ابو یعلیٰ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا جبکہ آسمان سے ان پر ٹہلی بارش ہوگی۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَرْوَاحَ وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الظُّلُمِ الْأَتْعَامَ مَا تَرْكَبُونَ ﴿۱﴾
لِيَسْتَوِيَ أَعْيُنُكُمْ تَدْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذْ اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهَا وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ
الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿۱﴾ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَبِلُونَ ﴿۱﴾

”اور جس نے ہر قسم کی مخلوق پیدا فرمائی اور بنا دیں تمہارے لیے کشتیاں اور مویشی جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم جم کر ٹیٹھوان کی بیٹیوں پر پھر (دلوں میں) یاد کرو اپنے رب کی لوت کو جب تم خوب جم کر ٹیٹھ جاؤ ان پر اور (زبان سے) یہ کبوا پاک سے وہ ذات جس نے فرمانبردار بنا دیا ہے اسے ہمارے لیے اور ہم اس پر قابو پانے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف لوت کر جانے والے ہیں۔“

ع۔ ازواج سے مراد مخلوقات کی تمام قسمیں ہیں۔ یہاں تَدْكُرُونَ کا مفعول ضمیر ہے یہ فعل دو طرح متعدي ہوتا ہے ایک صورت یہ ہوتی

ہے کہ اپنے مفعول کی طرف بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یہاں واسطہ کے بغیر متعدی ہونے کو غلبہ دیا جائے کیونکہ یوں جملہ کہا جاتا ہے رکبت الدابة و رکبت فی السفينة۔ یا جسے اللہ تعالیٰ نے سواری کے لیے پیدا کیا ہے اسے انسان کی بنائی ہوئی چیز پر غلبہ دیا ہے یا جو چیز عموماً سواری کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے کبھی کبھی سواری کے لیے استعمال ہونے والی چیز پر غلبہ اسی وجہ سے دیا فرمایا جن پر تم سوار ہوتے ہو ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھ جاؤ۔

۳. یہاں ظہور کا لفظ ماکہ معنی کے اعتبار سے جمع ذکر کیا ہے پھر دل سے اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو خواہ وہ سواری خشکی پر ہو یا سمنہ میں ہو اور تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اپنی زبانوں سے یہ کہو کہ میں اس ذات پاک کی تسبیح بیان کرتا ہوں جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا جبکہ ہم اس کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ یہ افرن السنی سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی اس کو قبا بولنے کی طاقت رکھتا ہو اصل میں اس کا معنی ہے کہ اس نے اسے اپنا ساتھی بنا لیا جبکہ کوئی تو یہ چیز کمزور کا ساتھی نہیں ہوتی۔ وَهَذَا كَمَا تَلَا مَعْفُورِيْنِ يَهْدِي هَذَا سَعَالٍ هِيَ يَا لَهَا كَيْ تَمِيرُ هِيَ سَعَالٌ هِيَ۔

۴. كَيْ تَمِيرُ كَيْ تَمِيرُ کا معنی ہے کہ ہم لوٹنے والے ہیں۔ ما قبل کلام کے ساتھ اس کے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سوار انسان اس لیے ہوتا ہے تا کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جبکہ سب سے بڑا انتقال اللہ تعالیٰ کی طرف چلتا ہے یا یہ بہت ہی عظیم الشان چیز ہے اس لیے اسے غافل نہیں ہونا چاہیے اور اسے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے کوشش کرنی چاہیے یہ جملہ ہے اور دوسرا حال ہے۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور بغوی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ جب آپ اپنا پاؤں رکاب میں رکھتے تو کہتے بسم اللہ۔ جب اس پر سوار ہو جاتے تو کہتے الحمد للہ۔ پھر کہتے سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَمُقْرِنِيْهِ وَاِنَّا لَمِنۡ كٰفِرِيْهِمْ اَوْ اِنَّا لَمِنۡ كٰفِرِيْهِمْ اَوْ اِنَّا لَمِنۡ كٰفِرِيْهِمْ پھر آپ نے تین دفعہ الحمد للہ کیا اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا۔ پھر کہا لا اله الا انت ظلمت نفسی فاغفر لى ذنوبى فانه لا يغفر الذنوب الا انت۔ پھر آپ مسکرائے آپ سے عرض کی گئی کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے تو فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جس طرح میں نے کیا ہے اور جو کچھ میں نے کہا تمہارے آپ نے کیا پھر آپ مسکرائے تھے ہم نے عرض کی تھی آپ کو کس چیز نے ہنسنے پر مجبور کیا تھا فرمایا جب کوئی بندہ لا اله الا انت ظلمت نفسی فاغفر لى الله لا يغفر الذنوب الا انت کہتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے (۱) الذی جعل لکم الارض۔ اور اس کے تمام مطوقات العزیز العظیم کی صفات ہیں اگر انہیں جملہ مستأجر بنا جاوے تو یہ مبتداء معزوف کی خبریں ہونگی یا یہ اعمی کا مفعول یہ ہو سکے۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادٍ جُزْءًا ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۹﴾ اَوْ اَحَدًا مِّمَّا يَخْلُقُ بِنَبْتٍ ۙ وَاَصْفَلَكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

”اور بنادی ہے (مشرکوں نے) اس کیلئے اس کے بندوں سے اولاد بے شک انسان کھلا ہوا ناشکر گزار ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے پسند کر لی ہیں (اپنے لیے) اپنی مخلوق سے بیٹیاں اور خصوص کر دیا ہے تمہیں بیٹوں کے ساتھ ج۔“

۱. اس جملے کا مطلق ولن سالنہم پر ہے اس کے ساتھ اتصال کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کلاموں کے درمیان تاقض ہے کیونکہ انہوں نے پہلے اس بات کا اعتراف کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے پھر اس کی یہ صفت بیان کی کہ اس کا کوئی جز بھی ہے اور

جس چیز کی تقسیم کی جائے اس کے لیے واجب الوجود ہونا محال ہے اور اس کا خالق ہونا بھی محال ہے۔ یہاں اس سے مراد ان کا یہ قول ہے الملئکۃ بنات اللہ کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بچہ والد کے نطفہ سے جنم لیتا ہے اور نطفہ والد کا جزء ہوتا ہے اسی وجہ سے بچے کو والد کا جزء یا ضعیف کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے فاطمۃ بضعة منی فمن اعضبها اعضبنی۔ فاطمہ میرا جزء ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا (1) اسے امام بخاری نے مسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور حاکم کے نزدیک ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے فاطمۃ بضعة منی بغضبنی ما بغضنیہا وبسبطنی ما بسبطنہا۔ قیامت کے روز تمام رشتے ختم ہو جائیں گے مگر میرا نسب اور سرالی رشتہ قائم رہے گا۔

فرمایا انسان واضح یا شکر کی کرنے والا اور بہت زیادہ جہالت سے کام لینے والا ہے کیونکہ وہ یہ نہیں پہچانتا کہ اسے کس چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور کسے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔

ع۔ اس جملے کا معنی بخلق پر ہے یا یہ مطلق فعل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ مستأنف ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فُلْ لَّهُمْ اَمَّ اتَّخَذُوْهُمۡ مِمَّا يَخْلُقُوْنَ سَبْتٌ وَّ اَضْفَكُمۡ بِالْبَيِّنِ۔ اسی قول کی وجہ سے ضم میر کا ذکر کرنا جائز ہے ورنہ یہ دو ایسی کلاموں کے درمیان واقع ہے جو عاقبت کی طرف منسوب ہیں۔ دو کلاموں سے میری مراد وجعلوا الہ من عبادہ جزءا اور اذا بشر احدہم ہے۔

ام مطلقہ یہ ہمزہ کے معنی میں ہے۔ مقصود تو بیع انکار اور تعجب کا اظہار ہے بلکہ یہ انکے قول ان لله و لدا سے اضراب ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہوں نے اسی پر قناعت نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ کے اجزاء بنا دیئے بلکہ اس کی مخلوقات میں سے کز و چیزوں کو اس کا جزء بنایا جبکہ وہ اجزاء (بیٹیاں) انکے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں کیونکہ جب انہیں اس چیز (بیٹی) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو انکے غم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا صَرَبَ لِلرَّاحِلِنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَ هُوَ كَظِيمٍ ﴿۱۵﴾ اَوْصَنَ يَبْتَشُرُوْا فِي الْغُلِيَّةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ عَيْرٌ مُّبِينٌ ﴿۱۶﴾

”اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو اس کی جس کی نسبت اس نے رحمان کی طرف کی ہے تو اس کا چہرہ (خراپہ رخ سے) سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا وہ (ایسی اولاد دے گا) جو پروان چڑھتی ہے زیوروں میں اور وہ مباحثہ کے وقت پناہ عاواض نہیں کر سکتی ع۔“

ع۔ مثل سے مراد یا تو وہ جنس ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جنس بتایا گیا کیونکہ بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس سے ہو۔ یا مثل سے مراد صفت اور حالت ہے۔ معنی ہوگا جب ان میں سے کسی کو اس وصف کی بشارت دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کا وصف قرار دیتے ہیں تو شدت غم کی وجہ سے انکے چہرے سخت سیاہ ہو جاتے ہیں جبکہ ان کا دل کرب سے بھرا ہوتا ہے بھر شریطہ کو مبتدا مقدر ماننے کے ساتھ ہم ضمیر مقدر سے حال ہے تقدیر کلام یہ ہوگی هُمْ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ۔

ع۔ محض ہمزہ اور کسائی نے بَشُرُوْا کو باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے جس کی تربیت کی گئی ہو جبکہ باقی قراء نے مجرد سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے تو اس سے مراد غور تیس ہیں کیونکہ ان کا حسن صورت میں

مختصر ہوتا ہے اور زیورات سے آراستہ ہوتی ہیں تاکہ حسن بڑھ جائے۔ مردوں کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ ان کا عمومی حسن اوصاف و اقدار کی وجہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے وہ زیورات کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زینت و زینت میں پروان چڑھنا اچھائی میں سے نہیں اس لیے مردوں پر ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کریں اور تقویٰ کے لباس سے اپنے آپ کو آراستہ کریں۔

کیونکہ عقل میں کسی جسموں اور دلوں میں کمزوری ہونے کی وجہ سے وہ مقابلہ اور جھگڑے میں زبان اور تلوار سے اپنا مدعا بیان نہیں کر سکتیں۔ قیادہ نے کہا جو عورت بھی اپنے حق میں بات کرنا چاہتی ہے وہ ایسی بات کر دیتی ہے جو اس کے خلاف دلیل بن جاتی ہے (۱) من ینشؤ۔ یہ عمل نصب میں ہے اس کا عطف بنات پر ہے۔ ہمزہ کو مکرر اس لیے ذکر کیا تاکہ انکار کی تاکید تو بیخ اور توجہ کے اظہار کا فائدہ دے۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت صفات میں اختلاف کی صورت میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیبیوں کو اپنا جائزہ بنایا ہے انکار کے نزدیک مبعوض اور ناپسند ہیں انکے چہروں کی سیاہی کا باعث ہیں زیورات پہننے پروان چڑھتی ہیں۔ دل، عقل اور جسم کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، مبتدا ہو اور اس کی خبر معذوف ہو اس کا عطف مبتدا معذوف پر ہو۔ تقدیر کا م یہ ہوگی امن کان شانہ ما ذکر ومن ینشؤ فی الحلیئہ ومن هو فی الخصام غیر مبین ولد اللہ سبحانه۔ کیا جس کی مذکورہ شان ہے اور جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے اور جو جھگڑے کے وقت اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کر سکتی وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے؟

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبِدُ الرَّحْمٰنِ اِذَا نَاغُوا اَشْهٰدًا وَّحٰكِمِيْنَ
سَتَكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيَسْئَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۝ مَا لَكُمْ
بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝

”اور انہوں نے ٹھہرا لیا ہے فرشتوں کو جو (خداوند) رحمان کے بندے ہیں عورتیں کیا یہ موجود تھے ان کی پیدائش کے وقت لکھ لی جائیگی ان کی گواہی اور ان سے باز پرس ہوگی اور (کفار) کہتے ہیں کیا گرجا پتا (خداوند) رحمن تو ہم انہیں نہ پوجتے انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔“

۱۔ نافع اور ابن کثیر نے عند پڑھا ہے کہ یہ ظرف ہے جبکہ باقی قراء نے عباد پڑھا ہے جو عہد کی جمع ہے۔ اس جملہ کا عطف وجعلوا لہ من عبادہ جزء ا پر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ذکر کی ہے جو اس کے شایان شان نہیں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے اس کا ایک بیٹا ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں بلکہ اس کی تذلیل ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بہترین اور مقرب بندے ہیں انکی کوئی کیفیت نہیں یہ بات کر کے انہوں نے فرشتوں کی تذلیل کی ہے۔

اہل مدینہ نے اوشد پڑھا ہے پہلا ہمزہ استفہام انکاری ہے اور مذکورہ طعن و تفتیح کی علت بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا ہمزہ مضموم ہے اور یہ باب افعال سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ قالون نے ابی خلیل کی روایت سے اس کے برعکس پڑھا ہے وہ دونوں ہمزوں کے درمیان الف ساکن کا اضافہ کرتا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ استفہام کا پڑھا ہے اور مجرد سے فعل ماضی معروف کا صیغہ پڑھا

ہے پہلی قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کیا انہیں حاضر کیا گیا تھا دوسری قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب فرشتوں کو موبت بنایا جا رہا تھا اس وقت وہ حاضر تھے تو فرشتوں کے خلاف ان لوگوں کی گواہی لکھی جائے گی کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور انھیں شرمندہ کرنے کے لیے قیامت کے روز ان سے سوال کیا جائے گا۔

ابن منذر نے قنادہ سے نقل کیا ہے کہ منافقوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا جنوں سے رشتہ ازدواج قائم ہے۔ نمود باللہ اور فرشتے اس کی اولاد ہیں تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1) انا مبعوثی نے کہا کلمی اور مقاتل نے کہا جب اہل مکہ نے یہ قول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہیں یہ کس نے بتایا؟ کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں تو انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے اباہما اور اباہما سے سنا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی شہادت لکھ لی جائے گی اور قیامت کے روز ان سے باز پرس ہوگی (2)۔

اس جملے کا مطلق جَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ ہے وہ کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔ یہ قنادہ، مقاتل اور کلمی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا یہاں ہم ضمیر سے مراد بت ہیں (3) انہوں نے یہ استدلال کیا کہ ان کی عبادت پر اللہ تعالیٰ کی مشیت کی نفی نہیں کی گئی اس لیے ان کی عبادت کے بارے میں کلمی بھی موجود نہیں۔ یا انہوں نے یہ استدلال کیا کہ ان کی عبادت کرنا اجماع ہے یہ سب باطل ہے کیونکہ مشیت تو ایک ممکن کو دوسرے ممکن پر ترجیح دیتی ہے خواہ وہ ممکن مامور ہو یا ممنوع ہو، حسین ہو، یا قبیح ہو ان کی جہالت اور قہاحت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں یا اللہ تعالیٰ فرشتوں یا جنوں کی عبادت پر راضی ہے ان کا یہ دعویٰ کسی محسوس یا عقلی دلیل کی طرف منسوب نہیں جو علم کو ثابت کرے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا مَشْرُؤُونَ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے یعنی وہ جن و جنین سے باطل قول کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انکے گمان کے فساد کی وجہ کو ظاہر کیا اور انکے شہ کو بیان کیا پھر اس بات کی نفی کی کہ انکے پاس محسوس یا عقلی دلیل موجود ہو پھر کلام کو ایک صورت کی طرف پھیر دیا کہ انکے پاس کوئی عقلی دلیل بھی موجود نہیں۔

اَمْ رَاَيْتُمْ كَيْتَابًا مِّنْ قَبْلِهِ فَهَمَّ بِهٖ مُّسْتَسْبِئُوْنَ ۝۱۰۰ بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَا اٰیٰتِهَا عَلٰی
اُمَّتِنَا وَاِنَّا عَلٰی اٰرْهُۡمِ مُّهْتَدُوْنَ ۝۱۰۱ وَكَذٰلِكَ مَا اٰتٰرَسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قُرْۡاٰنٍ مِّنْ
تَنْذِيْرٍ اِلَّا قَالُ مُّشْرِكُوْهَا اِنَّا وَجَدْنَا اٰیٰتِهَا عَلٰی اُمَّتِنَا وَاِنَّا عَلٰی اٰرْهُۡمِ مُّهْتَدُوْنَ ۝۱۰۲

”کیا ہم نے وہی انہیں کوئی کتاب اس سے پہلے پس وہ اسے مضروبوں سے چبڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ خود کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نقوش پا رہے ہیں اور اسی طرح جب بھی ہم نے بھیجا آپ سے پہلے کسی ہستی میں کوئی ڈرانے والا تو کہا وہاں کے عیش پرستوں نے کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نشانات قدم کی بیرونی کرنے والے ہیں۔“

۱۔ ام متحلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان الشہدہ و احلفہم کا عدل ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کی پیداائش کے وقت وہ حاضر تھے یا ان کے

پاس آسانی کتاب کا علم تھا۔ قبلہ میں ہنیر سے مراد قرآن ہے، ایمان کا دعویٰ ہے یعنی کیا اس سے پہلے بھی کوئی ایسی چیز تھی جو ان کے قول کی سخت پر دلالت کرے اور وہ اسی پر مضبوطی سے قائم ہیں؟

اس کا عطف ام اتینا ہم پر ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ انکی پیداؤں کے وقت حاضر نہیں تھے اور نہ انہیں کوئی کتاب دی گئی بلکہ وہ تو اپنے آباء و اجداد کی تقلید کی وجہ سے یہ باتیں کہے جا رہے ہیں یہاں امت سے مراد دین اور ملت ہے۔ دین اور ملت کو امت کا نام اس لیے دیا کیونکہ ان کا بھی بقصد کیا جاتا ہے جس طرح جس شخص کی طرف کوچ کیا جائے اسے رحلہ کہہ دیتے ہیں۔ مجاہد نے کہا یہاں امت کا معنی امام ہے (1) یعنی انکے پاس نہ عقلی دلیل ہے اور نہ ہی نقلی دلیل ہے بلکہ وہ تو اپنے جاہل آباء و اجداد کی تقلید کی طرف مائل ہو گئے اور اسی تقلید کو اجتہاد کا نام دیا۔

اس الاقوال یہ استقام مفرغ ہے جو قریہ کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الا فی قریۃ قال مسرفوھا مترف کا معنی المادار ہے اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلی دی جا رہی ہے کہ ان جیسے امور میں تقلید انکی گمراہی ہے اور ان کے آباء و اجداد کے پاس بھی کوئی ایسا علم نہیں تھا جو حقیقت میں علم کے اسباب کی طرف منسوب ہو یہاں خوشحال لوگوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعور دلایا جائے کہ خوشحالی بھی صحیح نظر و فکر سے تقلید کی طرف جانے کا سبب ہے۔

قُلْ اَوْ لَوْ جِئْتُمْ بِاٰهْدٰى مِمَّا وَّجَدْتُمْ عَلٰى اٰبَائِكُمْ قَالُوْا اِنَّا بِمَا اٰمَرْتُمْ
بِهٖ لَفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاتَّقِنَّمَا مِنْهُمْ فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْفِرِيْنَ ﴿۱۱﴾

”اس نبی نے فرمایا کہ اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر یا پاپا نے تم نے اپنے باپ و دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا کہ ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ پس تم نے ان سے انتقام لیا ذرا دیکھو کیا (المناک) انجام ہوا جھٹلانے والوں کا ہے۔“

لے حفس نے ماضی کا صیغہ قال پڑھا ہے کیونکہ نذر نے جو انہیں کہا اس کی خبر ہے جبکہ باقی قراء نے اسے امر کا صیغہ پڑھا ہے اس صورت میں امر ماضی کی حکایت ہوگی جو اس سے پہلے نذیر کی طرف دتی گئی یا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوگا پہلی قرأت کی تائید کلام کا سابق کرتا ہے کیونکہ فاتقنما منہم ماضی کا صیغہ ہے۔

ابو جعفر نے لوجنما کم جمع کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے واحد متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ عقل سے پہلے ہمزہ استفہام انکاری ہے جبکہ واو حالیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اتصنوں اباؤکم و لوجنتمکم۔ یعنی کیا تم پھر بھی اپنے آباء و اجداد کی اتباع کرو گے جبکہ جو میں تمہارے پاس پیغام لایا وہ زیادہ ہدایت کا باعث ہے؟ اس کی نسبت جس پر تم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا تھا تو کافروں نے انبیاء کے جواب میں کہا ہم اس پیغام کا انکار کرنے والے ہیں جو تم لائے ہو اگرچہ وہ دین زیادہ ہدایت کا باعث ہوا انکے اس قول کرنے کا مقصود یہ تھا کہ وہ انبیاء کو اس امر سے مایوس کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس دین میں غور و فکر کریں گے۔ اہدی صفت کا صیغہ ہے اس سے پہلے دین یا طریقہ کا لفظ بطور معطوف محذوف ہے۔

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 111 (الطہاریہ)

(۱) ما تعبدون کے پہلے معنی میں باصدا یہ ہے جبکہ دوسری صورت میں ما تقول ہے۔ (مترجم)

۱۰ فرمایا ہم نے انہیں تباہ و برباد کر کے ان سے انتقام لیا آپ دیکھیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسے ہوا؟ جن لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے ہم ان سے بھی اسی طرح انتقام لیں گے اس لیے آپ انکے جھٹلانے سے ٹھکن نہ ہوں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِرَبِّهٖمُ لَا يَبۡرَءُ مِنِّيۤ اِنَّنِيۤ اَبْرَءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱﴾ اِلَّا الَّذِيۤ
فَطَرَنِيۤ فَاِنَّهٗ سَيَّبِدُنِيۤ ﴿۲﴾ وَ جَعَلَهَا كِبۡرَۃً بَاقِيَةً فِىۤ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۳﴾
بَلْ مَتَّعْتُ هٰؤُلَاءِ وَاَبۡاءَهُمْ حَتّٰى جَاۤءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيۤنٌ ﴿۴﴾ وَ لَمَّا
جَاۤءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْۤا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا لَكٰفِرُوْنَ ﴿۵﴾

”اور (یاد کیجئے) جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہ میں بے زار ہوں ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ بلکہ میرا اس کے جس نے مجھے پیدا فرمایا ہے شک وہی میری رہنمائی کرے گا۔ اور آپ نے بنا دیا کہ تو حید کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں تاکر وہ (اس کی طرف) رجوع کریں۔ بلکہ میں نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں اور ان کے آباء و اجداد کو یہاں تک کہ تم گمیا ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنا والا رسول ہے اور جب آگیا ان کے پاس حق تو وہ کہنے لگے یہ تو جاوہ ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔“

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں تمہاری عبادت یا تمہارے معبودوں سے بری ہوں۔ یہاں برا و مصدر ذکر کیا اس صفت کے صیغہ کی جگہ بطور مبالغہ ذکر کیا ہے اسی وجہ سے اس کا تشبیہ اور مع کا صیغہ ذکر نہیں کیا جاتا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برأت کا اظہار کیا تھا تاکہ یہ لوگ بھی انہی تقلید سے برأت کریں اور قطعی دلیل کی پیروی کریں یا اگر تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقلید کرو کیونکہ یہ سب بات اس کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کے آباء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے معزز ہیں۔

۲۔ فطرنی کا معنی ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے یا متصل ہے۔ متصل کی صورت میں ماذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو عام ہوگا کیونکہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے جو ذہ العقول نہیں یا یہ استثناء نہیں بلکہ صفت ہے کیونکہ تعبدوں میں ما موصوفہ ہے اس صورت میں تقدیر کا یہ ہوگی انہی براءۃ مِنَ الْاِلٰهَةِ تَعْبُدُوْنَ نَهَا غَيْرِ الَّذِيۤ خَلَقْنِيۤ۔ یعنی جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم رکھے گا یا وہ مجھے کیے بعد و غیر سے ہدایت کے درجات عطا فرماتا جائے گا۔

۳۔ جعلہا میں ضمیر مرفوع سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہے اور حائضہ منصوب سے مراد یہ کل تو حید ہے جو آپ کے فرمان انہی براءۃ سے سمجھا جا رہا ہے عقیدہ سے مراد آپ کی اولاد ہے۔ قتادہ نے کہا آپ کی اولاد میں سے ہمیشہ ایسے افراد موجود رہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرتے تھے (۱) قرطبی نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی وصیت کو آپ کی نسل اور اولاد میں باقی رکھا۔ ابن زبیر نے کہا اس سے مراد آپ کا یہ ارشاد ہے اسلمت لرب العالمین (۲) ساتھ ہی اس کی تلاوت کی گئی تھی لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

یعنی اے محبوب کرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم کی بات ان کے سامنے بیان کیجئے شاید مکہ والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین اور آپ کی وصیت کی طرف پلٹ آئیں۔

بل انصراب کے لیے ہے اور یہ جملہ لعلہم پر جنوں سے انصراب ہے۔ یعنی میں نے ان موجود کفار کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر ہیں اور ان کے آباء و اجداد جو شرک پر ہی مرے انہیں لطف اندوز ہونے کا موقع دیا انکے کفر پر انہیں جلد سزا نہ دی یہاں تک کہ انکے پاس قرآن اور رسول تشریف لے آیا۔ سخاک نے کہا حق سے مراد اسلام ہے رسول کی صفت تین اس لیے ذکر کی کیونکہ آپ کی رسالت معجزات کے ساتھ ظاہر ہے۔ یا آپ تو حید کو دلا لک کے ساتھ ظاہر کرنے والے ہیں یا آپ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے احکام کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

یہ یہاں حق سے مراد قرآن ہے، یعنی جب انکے پاس قرآن آ گیا تو انہوں نے کہا یہ قرآن تو جادو ہے انہوں نے قرآن کو جادو اس لیے کہا کیونکہ وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے۔

ابن جریر نے سخاک کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو عربوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اکان لئلا یحسبوا انهم یؤفکون... نازل فرمائی (1) جب اس جیسی آیات بار بار نازل ہوئیں تو انہوں نے کہا اگر بشر رسول ہو سکتا ہے تو پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگ اس کے زیادہ مستحق ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرِيبَيْنِ عَظِيمٍ ۝ اَهُمْ يَفْهَمُونَ سَرَاحَتِ رَبِّكَ ۗ لَنَحْنُ قَسَمًا بَيْنَهُمْ مَّعْبُوسَتُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا ۗ وَرَاحَتِ رَبِّكَ حَيْرًا مَّا يَجْعَلُونَ ۝

”اور کہنے لگے کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو ان دو شہروں میں بڑا ہے۔ کیا وہ بانٹا کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو؟ ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زینت کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا ہے بعض کو بعض پر مراتب میں تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور آپ کے رب کی رحمت (خاص) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

لے قریبین سے مراد مکہ مکرمہ اور طائف ہے، یعنی ایسے شخص پر کیوں قرآن نازل نہیں ہوا جو مرجب اور مال و الا تھا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت ایک عظیم منصب ہے جو عظیم آدمی کے بھی شایان شان ہے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ایک روحانی رتبہ ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان فضائل و کمالات سے آراستہ ہو اور اس میں تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ کے تحمل ہونے کی کامل استعداد موجود ہو نہ کہ اس کے لیے دنیاوی شان و شوکت کی ضرورت ہے۔

ابن منذر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اگر یہ حق ہوتا تو یہ قرآن مجھ پر یا مسعود ثقفی پر نازل ہوتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

امام بخاری نے کہا مجاہد نے کہا کہ رجل عظیم سے مراد مکہ میں سے عتبہ بن ربیعہ اور طائف میں سے عبد یالمیل لیتے ایک قول یہ کیا

گیا کہ مکہ مکرمہ میں سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے حبیب بن عمرو اور یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انکے رد میں فرمایا (1)۔

۱۔ اس میں استنباط انکار ہی ہے رحمت سے مراد نبوت ہے اس میں انکے فیصلہ پر انکی جہالت کا اظہار ہے۔ انہیں شرمندہ کیا گیا ہے اور تہج کا اظہار کیا گیا۔ عیثت سے مراد رزق ہے رَحْمَنُ قَسْتًا لِيَوْمِهِمْ والے جملہ میں انکی جہالت اور انہیں شرمندہ کرنے کی علت بیان کی جا رہی ہے۔ درجات ترکیب کلام میں یہ نسبت سے تیز ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے درجات کو بلند کیا جو مال اور مرتبہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بلند ہیں۔ ہم نے بعض کو غنی بنایا اور بعض کو فقیر بنایا۔ بعض کو مالک بنایا اور بعض کو مملوک بنایا۔ لیکن خدا جا رہا جو دوسرے کے متعلق ہے مسخوہ کے آخر میں یا نے نسبت ہے۔ قنودہ اور ضحاک نے کہا ان میں سے بعض اپنے مال کے ذریعے دوسرے کا مالک بن جاتا ہے لیکن وہ اپنے رزق میں اضافہ نہیں کر سکتا اور دوسرے کے رزق میں کمی نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے یہ حق حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مال میں جو کمی کی کہ اس پر اعتراض کرے (2) رَحْمَتٌ تَرْهَقُكَ مِنْ رَحْمَةِ مَرَدِنَاتٍ اور اس کے متعلقات ہیں تیرے رب کی رحمت، یعنی نبوت جو دنیا کی نعمتوں سے سب سے بہتر ہے جب انسانوں میں سے کوئی بھی دنیا میں اپنے طور پر اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا تو اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اپنے لیے مختص کر سکے جس کے لیے وہ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم نعمت نبوت ہے دنیا کے سامان اور رزق عظیم نہیں یہ جملہ یا تو معطوف ہے یا حال ہے۔

کنافہ کے نزدیک کیونکہ عظمت و رفعت کا معیار دنیاوی مال و متاع تھا تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا حقیر اور ناپسندیدہ چیز ہے۔

وَلَوْلَا اَنْ يَكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ حُلِيًّا لِيَزَيِّجُوْهُمْ سُقُطًا مِّنْ سَّمَآءٍ وَّ مَعَارِبٍ عَلَيْهِمْ يُطَهَّرُوْنَ ﴿١﴾ وَّ لِيَزَيِّجُوْهُمْ اَنْبِيَآءًا وَّ مَسْرٰٓمًا عَلَيْهِمْ يَتَكَبَّرُوْنَ ﴿٢﴾ وَّ رُحُوْفًا وَّ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَتَّامٌ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاٰخِرَةُ لَءَشَدُّ مَرٰٓبًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣﴾

”اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کیلئے جو انکار کرتے ہیں زمین کا ان کے مکانوں کے لیے چھتیں چاندی کی اور سبز ہیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی)۔ اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیے لگاتے ہیں وہ بھی چاندی سے اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت (کی عزت و کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک پرہیزگاروں کیلئے ہے۔“

۱۔ کیونکہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور آخرت سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اگر ان سب کے کافر ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو ہم چاندی کے چھت اور سبز ہیاں بنا دیتے جن کے ذریعے وہ اوپر چڑھتے۔ ترکیب کلام میں ان اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہے اور انکی خبر منضوہ ہے جو حاصل ہے۔ لولا کا جواب لاجعلنا ہے لیبیوتہم یہ لمن یکفر سے بدل ایشمال ہے یا انکی ملت ہے جس طرح تیرا قول ہے وَهَبْتُ لَهُ فُؤَادًا لِقَبِيضِهِ میں نے انکی قبض کے لیے اسے کپڑا دیا۔ ابن کثیر اور ابو جعفر نے سقفا پڑھا ہے، یعنی یہ واحد کا

میں ہے اور جس مراد ہے جبکہ باقی قراء نے صنف کی جمع متناہی پر معاً ہے جس طرح دھن کی جمع زغب آتی ہے ابو عبیدہ نے کہا اس کی کوئی اور مثال نہیں ہے کہ فعل کی جمع فعلی کے وزن پر ہو (1) ایک قول یہ کیا گیا یہ صنف کی جمع ہے ایک قول یہ کیا گیا یہ جمع کی جمع ہے، یعنی صنف کی جمع صنف اور صنف کی جمع صنف آتی ہے۔ معارج کا معنی چاندی کی بیڑھیاں ہیں۔ معارج کی صفت من فیضة ذکر نہیں کی کیونکہ یہ اس کے معنوں میں مذکور ہے وہاں اس کا ذکر کافی ہے۔

اسے ستر کی جمع مسود ہے یعنی ہم ان کے لیے چاندی کی چار پائیاں بنا دیتے۔

اسے زخرف کا معنی زینت ہے اس کا عطف صنف پر ہے یا اس کا معنی سونا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس فرمان میں ہے **أَذْيَلُونَ لَكَ بَيْتًا مِّنْ ذَهَبٍ وَكُوفٍ**۔ اس کا عطف من فیضة کے محل پر ہے۔ آکار کے لیے دنیا کی شخصیں اس لیے ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اور کافر بھی اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اس لیے مبغوض چیز مبغوض کو دے دی جائیگی۔ ذلک اسم اشارہ ہے مراد چاندی کا چھت، زینے، دروازے، پلنگ اور ان کی زینت سب ہیں۔

عام ہمزہ اور ہشام نے لکھا کہ کھلم پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہاں ان تانیہ ہے۔ اور لفظاً الا کے معنی میں ہے۔ معنی یہ سب لگایے سب نہیں ہے مگر نیا دی زندگی کا سامان ہے اس کو کوئی بقاء حاصل نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے جبکہ باقی قراء نے لکھا کہ صنف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ان متعلقہ سے مختلف ہے۔ امام تاجد اور تاجد میں فرق رکھنے کے لیے ہے اور اس میں ما زائد ہے۔ جبکہ دار آخرت اللہ تعالیٰ کے علم اور فیصلہ میں متفقین کے لیے ثابت ہے۔ **أَلَا حَوْرَةَ صَفْتِ** ہے اس کا موصوف الدار ہے۔ یہاں متفقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ اس آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ آخرت میں عظیم چیز عظیم لوگوں کے لیے ہوگی دنیا میں ایسا ہونا ضروری نہیں ساتھ ہی یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ دنیا کی تمام آسائشیں مؤمنوں کے لیے کیوں نہیں بنائی گئیں ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے مختص کر دی گئی ہیں کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ہے اس لیے مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب کی سب کافروں کے لیے مختص کر دی جائیں مگر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں سارے لوگ کفر پر ہی جمع نہ ہو جائیں۔ اگر دنیا کی آسائشیں اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہوتیں تو کسی کافر کو بھی ان میں سے کچھ بھی عطا کیا جاتا۔

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **رَأَيْتُمْ لَيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ تَقْرَأُ بِهَا مِثْرًا مِّنَ اللَّيْلِ** یعنی تو کوئی کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نصیب نہ ہوتا (2) ایک روایت میں پانی کا قطرہ نصیب نہ ہوتا کے الفاظ ہیں اسے امام ترمذی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

مستور بن شداد سے مروی ہے کہا میں ان لوگوں میں شامل تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبریٰ کے ایک مردہ بچے کے پاس خضر سے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ چیز مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہوگی یہاں تک کہ انہوں نے اسے باہر پھینک دیا صحابہ نے عرض کی اس کے بے قدر ہونے کی وجہ سے ہی اسے پھینکا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دنیا اس سے بھی بڑھ کر حقیر چیز ہے اسے امام بخاری نے روایت کیا (3)۔

ابو نعیم نے داؤد بن ہلال صمعی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحفیوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اسے دنیا تو نیک لوگوں کی نظر میں کتنی حقیر ہے تو ان کے سامنے مزین ہو کر جاتی ہے لیکن میں نے ان کے دلوں میں تجھ سے نفرت اور تجھ سے امراض

پیدا کر دیا ہے۔ میں نے تجھ سے زیادہ حقیر کوئی چیز پیدا نہیں کی تو برا اعتبار سے حقیر ہے تیرا انجام ناپا ہوتا ہے جس وقت میں نے تجھے پیدا کیا تھا اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ تو کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہے گی اور نہ ہی کوئی تیرے لیے ہمیشہ رہے گا اگرچہ مالک تیرے لیے کتنا حریص کیوں نہ ہو اور تیرے بارے میں نکل کیوں نہ کرے نیک لوگوں کو مبارک ہو جو راضی لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہیں اور صدق و اسقامت پر قائم رہتے ہوئے۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے لیے میرے پاس جو بڑا ہے وہ انکے لیے مبارک ہو جب وہ قبروں سے اٹھ کر میری طرف آئیں گے تو نور انکے سامنے دوڑ رہا ہو گا فرشتے انھیں گھیرے ہوئے ہو گئے یہاں تک کہ وہ نور انہیں اس رحمت تک پہنچا دے گا جس کی وہ مجھ سے امید کرتے تھے۔

حضرت جابر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا اور دنیا میں جو کچھ ہے سب ملعون ہے مگر جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو (1) اسے ضیاء نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے اور طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے اسی جیسی مرفوع روایت نقل کی ہے صرف استثناء میں یہ ذکر ہے مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے لوازمات، عالم اور معلم۔ بڑا بڑا حضرت ابن مسعود سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس میں استثناء یہ ہے مگر نیکی کا حکم یا برائی سے روکنا یا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح کی مرفوع روایت نقل کی ہے استثناء یہ ہے مگر جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا آخرت میں کوئی گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا (آخرت میں) کوئی مال نہ ہو اسے وہی جمع کرتا ہے جس میں کوئی عقل نہ ہو (2)۔ اسے امام احمد اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود کے موقوف روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کفر کے لیے جہنم ہے جب وہ دنیا چھوڑتا ہے تو وہ قید خانہ اور خواب کو چھوڑتا ہے (3)۔ اسے امام احمد طبرانی، حاکم نے مستدرک میں اور ابویوسف نے حلیہ میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے (4)۔ اسے امام احمد مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی اور حاکم نے حضرت سلمان سے اور بزار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ مومن دنیا میں اگرچہ خوشحال ہی ہو تاہم آخرت میں اس کے لیے جو ثواب تیار کیا گیا ہے دنیا اس کے مقابلہ میں قید خانہ اور خواب ہے کافر اگرچہ دنیا میں مصیبت اور تکلیف سے دوچار ہوتاہم آخرت میں اس کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا اس کے لیے جنت ہے واللہ اعلم۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مسند فردوس کے مؤلف نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل آخرت کے لیے دنیا حرام ہے اور اہل دنیا کے لیے آخرت حرام ہے جبکہ اہل اللہ کے لیے دونوں حرام ہیں (5) تو اس کا کیا مفہوم ہے۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ مومنین پر دنیا کی محبت حرام ہے دنیا کے سامان سے لطف اندوز ہوتا حرام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ مَنْ حَضَرَ حَرْمًا زِينَةً أَنفُسِهِمْ أَمْذَرُوا لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ مِنَ الَّذِينَ هُمْ أَكْثَرُ

- 1- سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 470 (اعلیٰ)
2- مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 515 (مفکر)
3- مسند الفردوس، جلد 2، صفحہ 230 (اعلیٰ)
4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 407 (قدیمی)
5- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)

خَالِدَةً يُؤْتِيهِمُ الْغِيَاثَ - (اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی آسائشیں مومنوں پر حرام نہیں) جو آدمی دنیا کی محبت میں منہمک ہو گیا اس نے آخرت میں اپنا نقصان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا۔ جس نے آخرت سے محبت کی اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا اس لیے فانی چہر چہر باقی کو ترجیح دہ (1) امام حاکم نے مستدرک اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسوی سے روایت نقل کی ہے کہ جس کے پیش نظر صرف دنیاوی مقاصد ہوں اس پر آخرت کی نعمتیں حرام ہوتی ہیں اس سے مراد کافر ہیں انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قَوْمٌ لَّا يَأْتِيهِمُ الْغِيَاثُ وَرِثَاتُهُمْ فِي الْأَخْزَابِ مِنْ خَلْقِكَ ۝ اهل اللہ ہو دنیا اور آخرت کی محبت حرام ہے اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں ان کے دل دنیا و آخرت کی کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت مائی رابعہ بصریہ نے اپنے ایک ہاتھ میں پانی کا برتن لیا اور دوسرے ہاتھ میں آگ لی ان سے عرض کی گئی کہاں کا ارادہ ہے؟ تو فرمایا میرا ارادہ ہے کہ میں جہنم کو بچھا دوں اور جنت کو چلا دوں تاکہ لوگ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کر لیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اسکی عبادت کریں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا حضرت مائی رابعہ بصریہ کا یہ ارشاد کچھ پر جینی ہے مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنت کی خواہش کرے لیکن محض جنت کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے خواہش کرے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کمال ہے۔ جہنم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عرصہ کمال ہے ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جائز ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ یا بندے کے حق کی وجہ سے حرام نہ ہوں جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں روزی کمانا جائز ہے بلکہ فرض ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی کے بعد حلال روزی کی تلاش فرض ہے (2)۔ اسے طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے تو پھر دنیا اور دنیا کی محبت کا کیا معنی ہوگا؟

میں کہتا ہوں دنیا کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے آخرت پر ترجیح دے اس کے حصول اور اس کی لذتوں میں منہمک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثواب حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے سے قائل ہو جائے مال جمع کرنے اور لمبی آرزوں کا حریص ہو جانے اغنیاء کو فقراء سے بہتر جانے اغنیاء کی دولت و ثروت کے باعث انہیں فقراء پر ترجیح دے کسی کی اہمیت سے بچنے یا احسان کا بدلہ چکانے کے لیے انکی تعظیم نہ کرے یا کسی اور جائز امر کی وجہ سے انہیں ترجیح نہ دے یا وہ زمین میں برتری حاصل کرنے یا فساد کے ارادہ سے ایسا کرے جہاں تک روزی کی تلاش اور اموال کے حاصل کرنے کا تعلق ہے اگر وہ روزی کمانا ہے تاکہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرے جس کے نتیجے میں وہ عبادت کے قائل ہو جائے یا اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے مال کما لے تو یہ امر ضروری نہیں بلکہ اس طرح مال حاصل کرنے کی صورتوں میں کچھ صورتیں واجب ہیں اور کچھ مستحب ہیں اور کچھ مباح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے حلال مال کمایا خود کھایا یا اسے پہنا اور پھر دوسروں کو اس سے کھلایا پہنایا تو اس کا یہ عمل اس کی زکوٰۃ بن جائے گا ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابوسعید کی حدیث سے روایت کیا ہے لیکن طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی طلب میں وہ باوقار انداز اپنانے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کی طلب میں باوقار انداز اپناؤ کیونکہ ہر ایک کو اسی چیز کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہوتا ہے اسے ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

وَمَنْ يُدْسِ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِصَ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُمْ
سَيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهُتَدُونَ ﴿٦١﴾

اور جو شخص (دانست) اندھا بناتا ہے رحمان کے ذکر سے لے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کیلئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے۔ اور شیاطین روکتے ہیں ان (انہوں) کو راہ ہدایت سے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔“

یعنی جو آدمی قرآن سے اعراض کرتا ہے دنیاوی لذتوں میں مشغول ہونے اور شہوات میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس سے اندھا بننے کی کوشش کرتا ہے (۱) جب اس فعل کا صلائی استعمال ہوتا ہے تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے کہ تو نے ہدایت پاتے ہوئے اس کا قصد کیا اور جب اس کا صلائی استعمال ہوتا ہے تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے تو نے اس سے اعراض کیا۔ جس طرح یہ بتلے بولے جاتے ہیں عدلت الی فلان و عدلت عنہ۔ یعنی میں نے اس کی طرف میلان کیا اور اس سے اعراض کیا اسی طرح رغبت و رغبت عنہ کا معنی ہوتا ہے۔ ظیل بن احمد نے کہا خشو کا معنی ہے گز و نظر سے دیکھنا (۱)۔

۱۔ یعقوب نے نقیض کو ادا حد ذکر ناقب کا معنی بقیض پڑھا ہے اس صورت میں ہو ضمیر لفظ الرحمن کی طرف لڑنے کی جگہ باقی قرآن سے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے ذکر کیا، یعنی ہم شیطان کو اس کا ساتھی بنا دیتے ہیں اور اس پر مسلط کر دیتے ہیں تو شیطان ہی اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتا۔ شیطان اس کے لیے برے اعمال کو مزین کرنے کے پیش کرتا ہے اور اس کے سامنے یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہے۔

۲۔ ہم ضمیر سے مراد شیاطین ہیں، یعنی شیاطین اسے ہدایت کے راستے سے روک دیتے ہیں ہم ضمیر من موصولہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جمع ذکر کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے راستے سے اندھے بنتے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یحسبون والا جملہ لیصدونہم میں ہم ضمیر منصوب سے حال ہے اور پھر یہ عمل جملہ معترضہ ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَا لَيْتَ بَنِيَّ وَبَيْنَكَ بَعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ قِيَسٌ
الْقَرِينُ ﴿٦٠﴾ وَكَنْ يَتَّبِعُهُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَتَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُضْتَرًّا ﴿٦١﴾

”یہاں تک کہ جب وہ (اندھا) ہمارے پاس آجگا تو (آنکھیں کھل جائیں گی) کہے گا کاش! میرے درمیان اور (اے

۱ تفسیر بنوی، جلد ۶ صفحہ ۱۱۳ (التجاریہ)

(۱) حضرت محمد بن عثمان غزوی سے مروی ہے کہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صحابی کے لیے ایک آدمی مہین کیا جو اسے اپنا منہ اٹانے حضرت ابوبکر صدیق کے لیے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ کو مہین کیا۔ طلحہ حضرت ابوبکر صدیق کے پاس اس وقت آیا جب آپ اپنی قوم میں تشریف فرما تھے حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا تم مجھے کسی چیز کی طرف لاتے ہو تو طلحہ نے کہا میں تجھے لات دوزخی کی عبادت کی طرف لات دیتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا اسے کیا چیز ہے تو طلحہ نے کہا میں انہیں انہوں نے کہا اسے کوئی جواب دو تو ہم بھی خاموش رہی تو طلحہ نے کہا اے ابوبکر! انہو اور کہا اشہد علیہ حب ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے گا۔ طلحہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا اے کوئی جواب دو تو ہم بھی خاموش رہی تو طلحہ نے کہا اے ابوبکر! انہو اور کہا اشہد لا الہ الا اللہ وان محمدًا رسول اللہ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

سے فعل کے آخر میں نون تاکید تھیہ موجود ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر انہیں عذاب دینے سے پہلے ہم آپ کو موت عطا کر دیں تو ہم آپ کے بعد ان سے دنیا اور آخرت میں انتقام لیں گے۔

۱۔ یا ہم نے انہیں عذاب دینے کا جو آپ سے وعدہ کیا وہ دنیا میں ہی آپ کو دکھادیں گے اور ہم اس پر قادر ہیں اور اس میں کوئی توجہ کی بات نہیں کیونکہ ہم انہیں عذاب دینے کی قدرت رکھتے ہیں وہ ہم سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہم جس طرح چاہتے ہیں ہم انہیں عذاب دے سکتے ہیں۔ ہم ضمیر سے مراد مکہ کے مشرک ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بدر کے روز انتقام لیا یہی اکثر مفسرین کا قول ہے حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مسلمان ہیں کیونکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت سے نوازا آپ نے اپنی امت میں ایسی چیزیں ہی دیکھیں جس سے آپ کی آنکھوں کو ہنسنے کا سبب بن گیا۔ صحابہ کو آپ کے بعد تک موقوف کر دیا (1) روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ دکھایا گیا جو آپ کے بعد آپ کی امت میں وقوع پذیر ہونے والا تھا تو اس کے بعد آپ کو سکرے اور خوش نہ دیکھا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کر لیا (2) میں کہتا ہوں شاید اس سے مراد حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہو اور بنو امیہ کے حکمرانوں نے جو کچھ کیا قتادہ مراد وہ عبد الرحمن بن مسعود عہدی سے مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا نے اس آیت کو پڑھا اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ کے دشمنوں میں اللہ کا عذاب باقی رہا۔

فَأَسْتَمْسِكُ بِالَّذِي أُوْحِيَ إِلَيْكَ ۚ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٦١﴾ وَإِنَّكَ لَنِي مُّؤْتِكٌ
وَالْقَوْمِ ۚ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ﴿٦٢﴾

”پس مضبوطی سے پکڑے رہے اس (قرآن) کو جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے۔ بے شک آپ سیدھی راہ پر ہیں۔

اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کیلئے اور آپ کی قوم کیلئے اور (مے فرزند ان اسلام) تم سے جواب ملتی ہوگی۔“

۱۔ الذی اوحی الیک سے مراد وحی منلو اور وحی فرخو درووں ہیں انہیں یاد رکھیے اور ان پر عمل کیجئے۔ اس میں فاء سبب ہے یہ جملہ انا جملنا ۚ فَاذْأَعْرَبْنَا۔ کے ساتھ متعلق ہے درمیان میں جملے معترضہ ہیں آپ ایسے راستہ پر ہیں جس میں کوئی گمراہ نہیں یہ جملہ استمسک فعل امر کی علت ہے۔

1- تفسیر بنوی جلد 6 صفحہ 113 (التجاریہ)

2- تفسیر بنوی جلد 6 صفحہ 113 (التجاریہ)

(1) حضرت عدوی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دل میں میری قوم کی جو جنت ہے اللہ تعالیٰ اسے جانا ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی قوم کے ساتھ عزتوں سے نوازا۔ اور ارشاد فرمایا وَإِنَّكَ لَنِي مُّؤْتِكٌ وَالْقَوْمِ ۚ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ۔ اللہ تعالیٰ نے میری قوم کو اپنی کتاب میں عزت و شرف عطا فرمایا وَأَنْتَلُوْا عَشِيْرَتَكَ الْآلِ بْنِ ۝ وَخِيفُ خِنَا حَك لِمَنْ لِيْمَنُ حَك مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے اس نے میری قوم سے میرا صدیق، میری قوم سے شہید اور میری قوم سے امام بنا لے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اہل پند و یاقربین عربوں میں سے بہترین قرار دیا وہی وہ مبارک درخت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَخِيفُ خِنَا حَك لِمَنْ لِيْمَنُ حَك مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَفَرَقْنَا فِيهَا الشَّمَاءَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی اصل برسی پر حرام ہے اس کی شاخیں آسمان میں ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق ہی جس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں عزتیں دیں پھر انہیں اسلام پر قائم رکھا ان کی شان میں ایک سورت قریش نازل فرمائی۔ حضرت عدوی بن حاتم نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کا ذکر نہیں ہوتا تو لوگ خوشی کے آثار آپ کے چہرے سے نمایاں دیکھتے آپ ان کو اس آیت کی تلاوت کرتے وَإِنَّكَ لَنِي مُّؤْتِكٌ وَالْقَوْمِ ۚ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ۔

۱۔ ہضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یعنی قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم (۱) قریش کے لیے شرف اور بزرگی ہے۔ یہ جملہ استمک کے فاعل سے حال ہے امام بغوی نے کہا شحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ جب حضور ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا پھر یہ آیت نازل ہوئی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب آپ سے سوال کیا جاتا کہ آپ کے بعد خلافت کا امر کس کے لیے ہوگا فرمایا قریش کے لیے (۱) حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک قریش کے دو دفتر بھی باقی رہیں یہ امر قریش میں رہنا چاہیے (۲) حضرت معاویہ سے مروی ہے آپ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ امر قریش میں ہی رہے گا جو بھی ان سے اس معاملہ میں مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرے گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دین پر قائم رہیں (۳) مجاہد نے کہا یہاں قوم سے مراد عرب ہیں قرآن ان کے لیے شرف کا باعث ہے کیونکہ یہ ان کی زبان میں نازل ہوا پھر عربوں میں سے یہ شرف انہیں میں سے خاص لوگوں کے لیے خاص ہوا وہ قریش ہیں اور قریش میں سے یہ شرف بنی ہاشم کے لیے ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرما کر آپ کو شرف سے نوازا اور آپ کی قوم کو ہدایت سے نوازا کر شرف عطا فرمایا (۴)۔

قیامت کے روز آپ سے قرآن اور اس کے حقوق کے بارے میں پوچھا جائیگا یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَسَأَلْنَا مِنْ رَبِّكَ مِنْ شَرْسَلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ الْيَهَةَ
يُعْبَدُونَ ۝ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِذْ فُرِعُونَ وَمَلَائِكَةٌ فَقَالَ إِنِّي
رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ إِذْ أَهْمُ مِنْهَا يَصْحَكُونَ ۝

”اور آپ پوچھنے ان سے جنہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں سے کیا ہم نے بنائے ہیں خداوند رحمن کے علاوہ اور خدا کا کہی پوجا کی جائے۔ اور ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پس آپ نے (انہیں) کہا بیشک میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں پس جب آپ آئے ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر تو اس وقت وہ ان سے ہنسنے لگے۔“

۱۔ امام بغوی نے کہا جن سے یہ سوال کیا جائے گا ان کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو حضرت آدم اور آپ کی اولاد میں سے انبیاء کو اٹھایا گیا حضرت جبرئیل امین نے آذان کہی پھر آپ نے ہی اقامت کہی اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھئے اور ان انبیاء و درسل کو نماز پڑھا میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے سے فارغ ہوئے تو جبرئیل امین نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سابقہ رسولوں سے پوچھئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے یہی کافی ہے۔ یہ امام زہری، سعید بن جبیر اور ابن زید کا بھی قول ہے کہ معراج کی رات تمام انبیاء و درسل کو جمع کیا گیا تاکہ آپ ان سے اس بارے میں پوچھیں آپ کو کیونکہ اس بارے میں کوئی شک نہ تھا اس لیے آپ نے کوئی سوال نہ کیا (۵)۔

اکثر مفسرین نے کہا اس کا معنی ہے کہ آپ پہلے رسولوں کی امتوں اور ان کے علماء دین سے پوچھیں تمام روایات میں یہ حضرت ابن

۱- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (انجاریہ) 2- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 550 (تذیبی) 3- مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 550 (تذیبی) 4- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (انجاریہ) 5- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (انجاریہ)

عباس کا قول ذکر کیا گیا ہے جو مجاہد، قتادہ، ہشاک، سعدی، حضرت حسن بصری سے مروی ہیں اس کے اوپر حضرت ابن مسعود اور ابی بن کعب کی روایت دلائل کرتی ہے جو یہ ہے وہ سنل الذہین ارسلنا علیہم سوال کرنے کے حکم کا مطلب قریش پر یہ ثابت کرنا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں نہ کوئی کتاب نازل ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی رسول مبعوث کیا ہے۔ (1)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تہلی دی جائے اور شریکین مکہ جو کہتے تھے ان کا رد کیا جائے وہ یہ کہتے کہ یہ قرآن مکہ مکرمہ اور طائف کے کسی عظیم سردار پر کیوں نازل نہیں کیا گیا ساتھ ہی ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے توحید کی طرف دعوت پر استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ معجزات لے آئے جو آپ کی رسالت پر دلائل کرتے تھے جیسے عصا اور ید بیضا وغیرہ جب کفار نے پہلی دفعہ ان معجزات کو دیکھا تو سوچے سمجھے بغیر ان کا مذاق اڑانے لگے لہذا طرف ہے جو اب بعد نبی کی طرف منصف ہے اور مفاجات کے معنی کے ساتھ متعلق ہے جو اذان میں عامل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لَمَّا جَاءَهُمْ بَابُنَا فَوَسَّيْنَا وَفَتْ كُوْبُهُمْ يَضْحَكُونَ۔ فوجی کا عطف اللہ تعالیٰ کے فرمان فَتَقَالُ اِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ پر ہے۔

وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اٰتِيَّتِهِمْ وَ اَخَذْنَاهُمْ بِالْعَدَابِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُونَ ﴿٦٠﴾ وَقَالُوا يَا اَيُّهَا السَّحَرٰدُ لِمَ كُنَّا رَبِّكَ بِسَاعِهٖمْ عِنْدَكَ اِنَّا لَكٰمُ هٰمِسُوْنَ ﴿٦١﴾

”اور ہم نہیں دکھاتے تھے انہیں کوئی نشانی مگر وہ بڑی ہوتی پہلی سے اور ہم نے جتلا کر دیا انہیں عذاب میں تاکہ وہ باز آجائیں اور وہ بولے جادوگر! دعوائے ہمارے لیے اپنے رب سے بسبب اس عہد کے جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے ہم ضرور ہدایت قبول کریں گے۔“

۱۔ عذاب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی دکھاتے جیسے قحط، طوفان، بھڑیاں، جو میں، مینڈک، خون وغیرہ یہ سب نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر دلیل تھیں اور جو بھی نئی نشانی ظاہر ہوتی وہ پہلی سے بڑی ہوتی۔ مثلاً نینبہ الا جملہ سابقہ آیت میں منہا کی ضمیر سے حال ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ ان عذابوں میں سے ہر ایک عذاب اجازت کے آخری حد کو پہنچا ہوا تھا جو بھی اسے دیکھتا وہ سبق لمان کرتا کہ ہر عذاب دوسرے عذاب سے بڑھ کر ہے۔ جس طرح شاعر کا قول ہے ان میں سے مجھے تو نے لے گا تو سردار کو لے گا جس طرح ستارے جن کی روشنی میں تو چلتا ہے۔ یعنی ان کا ہر آدمی سردار محسوس ہوتا ہے جس طرح ہر ستارہ دوسرے سے بڑھ کر روشنی دیتا ہے یا یہ معنی کیا جائے گا کہ نشانی اپنے اندر اجازت کی ایک مستقل صورت رکھتی ہے جس وجہ سے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر تھی۔

اَخَذْنَاهُمْ مِنْ هٰمِمْ ضَمِيرٌ مِّنْ هٰمِمْ سَرَادُ فِرْعَوْنَ كِي قَوْمٍ هِيَ اَنْبِيَسُ عَذَابٍ مِّنْ جَزَائِنِ كِي وِي هِيَ هِيَ تَا كِهْ وَهْ لَفْرَسٌ لَوْتُ اَكْمَلُ وَ اَخَذْنَاهُمْ بِمَلِكِ عَطْفٌ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا بِرَہ۔

۲۔ فرعون اور انکی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے جادوگر۔ ابن عامر نے یہ کہی تھا کہ اصل کی صورت میں مضموم پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح اصل قاعدہ ہے۔ ابو عمرو اور کسایی نے وقف کی صورت میں الف کے ساتھ اصل قاعدہ کے مطابق پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اے کو بغیر الف کے پڑھا ہے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایمان لانے کا طعنے دیا

اور اپنی ہدایت کو ان کی دعاء اور عذاب کے ختم ہونے کے ساتھ معلق کر دیا لیکن اس کے باوجود آپ کو نبی کے نام سے یا نہیں کیا بلکہ آپ کو سا کر کہا جس طرح اس سے پہلے وہ آپ کو ساحر کہتے تھے یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کفر کے حد درجہ جریس اور انتہائی احمق تھے۔ زجاج نے کہا انہوں نے اس نام سے انہیں اس لیے بلایا کیونکہ پہلے بھی وہ آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے (1) ایک قول یہ کیا گیا انہوں نے آپ کی تعظیم اور توقیر کے لیے اس نام سے یاد کیا کیونکہ ان کے نزدیک جادو عظیم علم اور پسندیدہ صفت تھی گویا انہوں نے یہ کہا اے کامل اور ماہر عالم میرے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ جب انہوں نے آپ کی نبوت کا انکار کیا تھا تو انہوں نے پہلی دفعہ آپ کو اس نام سے یاد کیا تھا اور کہا تھا إِنَّ هَذَا لَيْسَ مِنْهُمْ ۖ قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْبَشَرِ لِمَا جَاءَهُمْ أَيْحُزُّ هَذَا وَلَا يُلْقِيهِمُ السَّحَرُونَ۔ انہوں نے کہا یہ واضح جادو ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا جب حق تمہارے پاس آ چکا تو تم اسے جادو کہتے ہو جبکہ جادو گرو توفوز و فلاح پانے والے نہیں۔

بِنَا عَهْدٍ جَسَدِكَ جَارِحٌ وَرَادِعٌ فَعَلَ مَعَهُ مَطْلِقٌ ہے۔ یعنی آپ نے اپنے بارے میں جو یہ کہا کہ جب میں دعا کروں گا تو یہ عذاب ختم ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے یہ جملہ مستألفہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی انتہاء پر عذاب کے خاتمے کی انتہاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو ان سے اٹھالیا۔

فَلَمَّا كَسَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْتَلُونَ ۖ وَ تَأَذَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ
يَقَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَ هَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۗ أَفَلَا
تُبْصِرُونَ ۖ ۝ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَتَذَكَّرُ ۖ ۝

”جب جس ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب تو فوراً وہ مہمٹنی کرنے لگے اور پکارا فرعون اپنی قوم میں (اور) کہتے گا اے میری قوم! کیا میں مصر کا فرمانروا نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہ رہی ہیں کیا تم (انہیں) دیکھ نہیں رہے؟ اے! کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا۔“

ل جب عذاب فرعونوں نے ختم ہو چکا تو فرعون نے اپنی قوم کے مجمع یا اپنی مجلس میں یہ کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی مسلمان ہی نہ ہو جائے۔ انہار سے مراد نیل سے نکلنے والی چار بڑی نہریں تھیں، نہر ملک، نہر طولان، نہر رمیاط اور نہر تھیس۔ ہذیہ الاَنْهَارُ کا مطلق مُلْكٌ و مِصْرٌ ہے۔

نافع ابو عمرو اور بڑی نے حتیٰ کو یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی کیا یہ نہریں میرے مملکت کے نیچے سے یا میرے حکم سے یا میرے سامنے بانوں سے نہیں بہتیں؟ تنجیہ میں تَحْقِيقٌ یہ ہذیہ الاَنْهَارُ سے حال ہے یہ بھی جائز ہے کہ ہذا اسم اشارہ موصوف ہو الا انہار اس کی صفت ہو کہ مبتدأ اور بعد الا جملہ اس کی خبر ہو مبتدأ و خبر جمل کر حال بن رہا ہو ذلک اسم اشارہ محذوف تَجْرِي مِّنْ تَحْتِي کا مفعول یہ ہے۔

یع میں اس مملکت اور خوشحالی کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہوں کیونکہ وہ ضعیف اور حقیر ہے اپنے ضعف اور قلت کی وجہ سے ریاست و اقتدار کی استعداد انہیں رکھتا اور اپنی زبان میں لگت کی وجہ سے اپنا نقطہ نظر بھی صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا جبکہ زیادہ لگت آپ کی

دعا کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی آپ نے یہ التجا کی تھی وَأَخْلَصَ عَقْدًا قَدِيمًا لِيَسْمَاعِيلَ ﴿١٠﴾ یہاں ام منقطع ہے اور عمرو نہدہ کے معنی میں ہے کیونکہ آپ کی فضیلت کے اسباب متحقق ہو چکے تھے۔ امام بغوی نے کہا ام، بل کے معنی میں ہے۔ اکثر مفسرین کی سبکی رائے ہے (1) فراء نے کہا ام پر وقت ہے اس میں کلام مضمیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی افلا تبصرون ام تبصرون (2) بعد میں نئی کلام ہے اس صورت میں ام متصل ہوگا ایک قول یہ کہ گیا کہ ام متصل ہے کیونکہ مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ انخبر کا معنی ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں بہتر ہوں۔ بہتر ہونے کا علم دیکھنے کا سبب ہے گویا کلام یوں کی گئی افلا تبصرونی ام تبصرون فَتَلْعَمُونَ اَنِّي خَيْرٌ۔

فَلَوْلَا اَلْقَىٰ عَلَيْكَ اَسْوَرَةً مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿١١﴾
فَاَسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوهُ لَٔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿١٢﴾ فَلَمَّا اَسْفَوْا
اِنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَعْرَضْنَاهُمْ اٰجْمَعِيْنَ ﴿١٣﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿١٤﴾

” (اگر یہ سچائی ہے) تو کیوں نہ اتارے گئے اس پر سونے کے ٹکٹن یا کیوں نہ آئے اس کے ساتھ فرشتے قطار در قطار
۱. یوں اس نے اسحق بنا دیا اپنی قوم کو سو وہ اس کی بیروی کرنے لگے اور حقیقت یہ نافرمان لوگ تھے جس میں جب انہوں
نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پھر ہم نے ان سب کو فرق کر دیا جس اور بنا دیا انہیں جوش زد اور کہاوت
پچھلوں کے لیے ہے“

۱. علیہ میں مضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فلو میں فاء سببیہ ہے کیونکہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو غرور اور تکبر تھا کا
ظہن کرتا تھا یہ چیز اس کا سبب تھی کہ لوگوں کو باخبر کیا جائے کہ انکے پاس عزت و شرف نہیں۔ محض اور یعقوب نے اسورہ پڑھا ہے جو
سوار کی جمع ہے جبکہ باقی قراء نے اسورہ پڑھا ہے جو جمع الجمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں اساورہ ہے یا کے عوض
تاہ (۱)۔ کہی گئی ہے ایک قرأت میں اس طرح پڑھا بھی گیا۔ مجاہد نے کہا مصریوں میں رواج تھا جب وہ کسی کو سردار بناتے تو اس کے
ہاتھوں میں ٹکٹن ڈالتے اور گلے میں سونے کا طوق ڈالتے اور یہاں ظہار کرتے کہ اب یہ ہمارا سردار ہے اور اسکی اطاعت ہم پر لازم ہے۔
مُتَقَرِّنِينَ یعنی پے در پے فرشتے کیے بعد دیگرے کیوں نہیں آتے جو آپکی صداقت کی گواہی دیتے اور آپکی مدد کرتے۔

۲. استخف کا معنی ناداری ہے۔ قوم سے مراد قبلی لوگ ہیں، یعنی اس نے اپنی قوم کو جاہل پایا کیا تو یہ یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے
کہ فرعون نے اپنی قوم کو سلفی افعال اور جہالت کے کاموں پر برا بھینٹا کیا جس طرح کہا جاتا ہے استخف وایہ، یہ جملہ اس وقت بولتے
ہیں جب وہ اسے جہالت پر برا بھینٹ کرے اور صحیح راہ سے بھٹکا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس نے اپنی اطاعت میں ان سے سخت اور
جہالت کا مطالبہ کیا تو قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وعدہ توڑنے میں فرعون کی اطاعت کی کیونکہ قوم قاسم تھی اس لیے
انہوں نے قاسم کی ہی اطاعت کی۔

۳. جب انہوں نے دشمنی، نافرمانی میں زیادتی کر کے ہمیں غمے کیا جس طرح کہا جاتا ہے اسف فلان یہ اس وقت کہتے ہیں جب آدمی

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 115 (انجاریہ) 2- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 115 (انجاریہ)

(۱) عربی مہارت اس طرح ہے تاہم محض ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ کتابت میں رہ گئے ہیں یعنی اساورہ میں قلب کیا گیا ہے اور وہ اسورہ کی بنا پر یا ہوتا ہے بل
دیا اور وہ اسورہ بنا۔

خفت غصے ہو۔ لہذا طرف انقضا کے متعلق ہے انقضا کا عطف اطعواہ پر ہے اسی طرح اغرقہم کا اس پر عطف ہے، یعنی ہم نے ان سب کو بحرئیل میں غرق کر دیا۔

یہ حمزہ اور کسائی نے سلف کو تین اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا یہ سلف کی جمع ہے جس طرح رغیف کی جمع رغف آتی ہے یہ سلف۔ سلف سے شق ہے جس کا معنی آگے ہونا ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جس طرح صابر کی جمع صبر آتی ہے یا یہ سلف کی جمع ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جس طرح خادم کی جمع خدم آتی ہے ہم نے پہلے بھی جاتا کہ بعد والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ مثلاً کا معنی عبرت اور نصیحت ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ معنی یہ ہے کہ اس امت کے کفار کے لیے جہنم کی طرف جانے والوں کے پیشرو ہیں اور بعد والوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ بعد والوں کے لیے ضرب اہل نہیں کیونکہ یہ عجیب و غریب واقعہ ہے یہ اس طرح زبان زد خاص و عام ہو۔ جس طرح ضرب اہل ہوتی ہے تو کہا جائے گا تمہاری مثال تو مفرعون کی مثال جیسی ہے واللہ اعلم۔

امام احمد نے صحیح سنہ کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر بس کی بھی پوجا کی جاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں تو قریش نے کہا کیا یہ آپ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ نبی اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں جبکہ انکی عبادت بھی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے مابعد ایت کو نازل فرمایا (1)۔

وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذْ أَقْرَبَهُ مَلَائِكَةٌ مِّنْهُ يَصِدُّونَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوا إِنَّا لَنَهْتُمُ
حَبِيبًا أَمْ رُوهُ وَمَا ضَرَبُوا لَكَ إِلَّا طَبْعًا لَّا تَبْلُغُهُمْ قَوْمٌ حَبِصُونَ ﴿٢١﴾

”اور جب بیان کیا جاتا ہے مریم کے فرزند (عیسیٰ) کا حال تو آپ کی قوم اس سے شور مچا دیتی ہے اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ، وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے گرج بجھی کے لیے درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں لفظ“

ابن مروہ نے اور ضیاء نے مختار میں حضرت عباس سے روایت نقل کی کہ عبد اللہ بن زبیری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمد تم یہ گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ اِنَّمَا وَجَّهْنَا لِيَوْمِئِذٍ مِنَ الَّذِينَ هَاجَرُوا حَبِصًا وَمَا كُنَّا لِنَهْتُمُ لَهَا لَوْ كُنَّا عَادِلِينَ ﴿٢٠﴾ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا ہے تو کہنے کا سورج چاند فرشتوں اور حضرت عزیر کی بھی تو عبادت کی گئی ہے تو کیا یہ سب ہمارے معبودوں کے ساتھ جہنم میں ہونگے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ يَوْمَئِذٍ الْاٰمَنَاتُ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ اَلْبَعْدُ وَاُولٰٓئِكَ ﴿٢١﴾ اور یہ آیت نازل ہوئیں۔ وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا حَبِصُونَ۔

اہل مدینہ اہل شام اور کسائی نے یصدون پڑھا ہے جس کا معنی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اس سے رک جاتے ہیں یا لوگوں کو اس سے روکتے ہیں جبکہ باقی قراء نے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں قراءوں کا معنی ایک جیسا ہے۔ کسائی نے کہا انکی یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح يعرضون کوراء کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھتے ہیں (3) سعید بن مسیب نے بھی یہی کہا ہے۔ شاک نے کہا اس کا معنی

ہے وہ تعجب کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا وہ جزع فزع کرتے ہیں۔ قرطبی نے کہا وہ دل کی ٹنگی کا اظہار کرتے ہیں۔ قتادہ نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم انکی عبادت کریں اور اسے اپنا معبود بنالیں جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنایا تھا (1)۔

ع کو قیوں نے اسے دونوں زمروں کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں زمروں کے بعد الف ساکن ہے جبکہ باقی قراء نے دوسرے ہمزے کے کوسمیل کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں کے بعد الف ہے لیکن کسی قاری نے ان دونوں زمروں کے درمیان الف ساکن داخل نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہتر ہیں کہ ہم انکی عبادت کریں اور انکی اطاعت کریں جبکہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ابن زید اور سدی نے کہا ہم وہیں ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی بھی عبادت کی جاتی ہے وہ سب جہنم میں ہیں تو ہم اس بات پر راضی ہیں کہ ہمارے معبود حضرت عیسیٰ، حضرت مراد فرشتوں کے ساتھ جہنم میں ہوں (2)۔

انہوں نے یہ مثال محض بھگڑنے کے لیے بیان کی ہے حق اور باطل میں تیز دینے کے لیے ذکر نہیں کی کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عبادت کروانا چاہتے یا اس کا مطلب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس آیت سے مراد بت ہیں کیونکہ ماغیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔

بلکہ وہ قوم سخت بھگڑا ہے اور اس کی عادی ہے حضرت ابوامامہ سے مروی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قوم بھی ہدایت کے بند گمراہ ہوئی اسے جہل (جنت بازی) کا ملکہ دیا گیا تھا۔ یعنی پہلے وہ بھگڑتے ہیں پھر گمراہ ہو جاتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی (3)۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام احمد، امام ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

إِنَّ هُوَ إِلَّا عَمِدٌ أُنْعَمْنَا عَلَيْكَ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۖ وَكُوفِرْنَا
لِجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ ۖ وَإِنَّ لَكُمْ لَعَلًّا فَلَآ
تَمْتَرْنَ بِهَا وَالتَّبَعُونَ ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝

”نہیں ہے عیسیٰ مگر ایک بندہ ہم نے انعام فرمایا ہے ان پر اور ہم نے بنا دیا ہے انہیں ایک نمونہ نئی اسرار تکل کیلئے اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسادے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے۔ اور بے شک وہ ایک نشان ہیں قیامت کیلئے پس برگز شک نہ کرو اس میں اور میری بیروی کیا کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔“

۱۔ جو ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں بیٹا نہیں۔ ہم نے اس پر نبوت اور اپنے قرب کا انعام کیا ہے اور ہم نے اسے ضرب اٹل مثالی اور عبرت بنا دیا ہے جس کی مدد سے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں کہ جس طرح وہ چاہے کر سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے بغیر پیدا کیا ہے۔

۲۔ یہ جملہ معترضہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے اگر ہم چاہتے تو انسانوں میں سے فرشتے بنا دیتے یا اس کا معنی ہوگا اگر ہم چاہیں تو تمہیں ہلاک کر دیں اور تمہاری جگہ فرشتے لے آئیں جو زمین میں تمہارے نائب ہوں جو زمین کو آباد کریں میری عبادت کریں

اور میری اطاعت کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے نائب ہوئے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان بے شک عجیب ہے تاہم ہم اس سے زیادہ عجیب پر قادر ہیں فرشتے تمہاری مثل ہیں کیونکہ وہ بھی تمام ممکن ہیں جس طرح انہیں ابتداءً مثال کے بغیر پیدا کرنا ممکن ہے اسی طرح انہیں ولادت کے ذریعے بھی پیدا کرنا ممکن ہے تو وہ موجود بننے کے کیسے مستحق بن سکتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے؟

ع انہ میں وہ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعریف لانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جس کے ذریعے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قیامت بہت ہی قریب ہے۔ حضرت ابن عباس ابو ہریرہ اور قتادہ نے اسے یوں پڑھا ہے وانہ لعلم الساعۃ یعنی علم کلام کے فقہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی نشانی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب حضرت ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ایک فرد ہوگا اسے یسعیٰ نے یحییٰ میں روایت کیا ہے (1)۔

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اچانک تعریف لائے جبکہ ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے آپ نے پوچھا کس کے بارے میں باتیں کر رہے ہو؟ فرمایا ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں آپ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس نشانیاں ظاہر نہ ہوگی۔ دخان (دھواں) دجال (جانور) مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے اترنا یا جوج و ماجوج کا آنا، تین جگہ زمین کا دھنسا، ایک مشرق میں ہوگا ایک مغرب میں ہوگا اور ایک جزیرہ عرب میں ہوگا سب سے آخر میں ایک آگ ہوگی جو چین سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی (2) ایک روایت میں دسویں نشانی یہ ہے کہ ایک ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے نواس بن سمان سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا پھر ایک طویل حدیث ذکر کی یہاں تک یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا آپ دوزخ پر پہنچنے والی ہتھیلیوں کو دو فرشتوں کے پروں پر رکھے دمشق کی مشرقی جانب سفید منارہ کے پاس اتریں گے جب آپ سر جھکانیں گے تو (پینے کے قطرے) گریں گے جب سر اوپر اٹھائیں گے تو پھر بھی موتیوں کی طرح سفید قطرے گریں گے اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے بقدر قدرت میں میری جان ہے وہ وقت قریب ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ مال (پانی کی طرح) بہائیں گے یہاں تک کہ مال قبول کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اس وقت ایک عجمہ دینا دیا جائیگا بھتر ہوگا۔ اسے یسعیٰ نے یحییٰ میں روایت کیا ہے (4) امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ اونٹیاں چھوڑ دیں گے کوئی انہیں نہیں پکڑے گا آپ باہمی بعض دھماکو ختم کر دیں گے آپ مال دینے کے لیے لوگوں کو بلائیں گے مگر کوئی بھی اسے قبول نہ کرے گا۔

1- صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 393 (قدیمی)

2- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی)

3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 409 (قدیمی)

4- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 402-400 (قدیمی)

امام مسلم نے حضرت جابر سے حدیث نقل کی ہے کہ تمہارا امام کہے گا آؤ ہمیں نماز پڑھاؤ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس امت کے احترام میں فرمائیں گے تمہیں میں سے بعض بعض کے امیر ہیں (1) امام بنوی نے ذکر کیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس پہنچیں گے لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے ہوں گے امام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے پیچھے بٹے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کو آگے کھڑا کریں گے اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق نماز ادا کریں گے آپ خنزیر قتل کریں گے صلیب کو توڑ دیں گے یہود یوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو گرا دیں گے نصرانیوں کو قتل کریں گے مگر جو آپ پر ایمان لائے گا اسے قتل نہیں کریں گے (2) حضرت حسن بصری نے کہا انہ کی تفسیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہوگا قرآن قیامت کی نشانی ہے جو قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اس کے احوال اور ہولناکیوں کے بارے میں خبر دیتا ہے (3)۔

فلا تمترن فیہ فاعلموا بحقیقہ، یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے واقع ہونے کی علامت ہیں تو اس کے برپا ہونے میں شک نہ کرو۔ حضرت ابن عباس نے کہا اس کا معنی ہے تم اس کو نہ جھلاؤ۔ ابو عمرو نے وصل کی صورت میں وا تہو ان کو یا، کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں اس کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے، معنی یہ ہوگا میری ہدایت کی اتباع کرو یا میری شریعت کی اتباع کرو یا میرے رسول کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اتبعونی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ تو تقدیر کلام یہ ہوگی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری اتباع کرو اور جس امر کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں یہی صراط مستقیم ہے جس راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوگا **هُدًى وَصِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ** یہ اتبعونی کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَا يَصِدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۱﴾ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْبُدُونِ ﴿۱۲﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ فَاعْبُدُوا ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۱۳﴾

”کہیں روک نہ دو تمہیں شیطان (اس راہ سے) بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور جب آئے عیسیٰ (علیہ السلام) روشن نشانیاں لے کر تو فرمایا میں آیا ہوں تمہارے پاس حکمت لیکر اور میں بیان کروں گا تم سے کچھ وہ بات جس میں تم اختلاف کرتے ہو جس ڈر رہا کرو اللہ سے اور میری فرمانبرداری کیا کرو۔ **يَقِينًا** اللہ تعالیٰ وہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اس کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔“

یہ شیطان تمہیں میری اطاعت سے نرو کے۔ اس جملے کا عطف اتبعون پر ہے شیطان کی تم سے عداوت ظاہر و باہر ہے کیونکہ اسی نے تمہیں جنت سے نکالا اور تمہیں مصیبتوں پر پیش کیا حق کی پیروی اور جنت تک پہنچنے سے تمہیں روکا۔

یہ بیانات سے مراد مجوزات نہیں یا انجیل کی آیات ہیں یا شریعت کے واضح احکامات ہیں۔ حکمت سے مراد علوم حقہ ہیں یا ہدایت کے معنی میں ہے یا فضل کو مستعدی بنانے کے لیے ہے یا یقین لگنے کا تعلق فعل محذوف کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے و جنتکم لابین لکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہودی خواہشات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بہتر فرقوں میں بٹ گئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہیں باطل عقائد سے روکا اور حق صواب کی طرف انہیں دعوت دی۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ

عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۱﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَ كَانُوا
مُسْلِمِينَ ﴿۲﴾ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿۳﴾

”گھر سے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو سچی (اور پرہیزگار) ہیں۔ اے میرے (بیارے) بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم (آج) غمزدہ ہو گے۔ (یعنی) وہ بندے جو ایمان لے آئے تھے ہماری آیتوں پر اور فرمانبردار تھے۔ (حکم ہوگا) داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں خوشی خوشی۔“

۱۔ امام بغوی نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے فرمایا اس آیت میں دو دو دوستوں کا ذکر ہے دو دوست مؤمن ہیں اور دو دوست کافر ہیں۔ مؤمنوں میں سے ایک فوت ہو جاتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا تھا وہ مجھے بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا تھا اور مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات ہوگی اے اللہ! میرے بعد اے گمراہ نہ کر دینا جس طرح تو نے مجھے ہدایت دی ہے اسے بھی ہدایت دینا جس طرح تو نے مجھے عزتوں سے نوازا ہے اسے بھی عزتوں سے نوازا۔ جب اس کا مومن ساتھی فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے انھیں فرماتا ہے تم دونوں میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی تعریف کرے اور وہ کتنا اچھا بھائی ہے کتنا اچھا دوست ہے کتنا اچھا ساتھی ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا ایک کافر فوت ہوتا ہے تو وہ بتاتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت سے منع کرتا تھا مجھے برائی کا حکم دیتا تھا مجھے بھلائی سے روکتا تھا مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات نہ ہوگی تو وہ کہے گا وہ کتنا برا بھائی ہے کتنا برا دوست ہے اور کتنا برا ساتھی ہے (1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا میری وجہ سے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ مجھے اپنے جلال کی قسم میں انھیں آج اپنے خاص سامنے میں جگہ عطا کروں گا آج میرے سامنے کے علاوہ کوئی سائینس۔ اے امام مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دو آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر باہم محبت کریں ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان دونوں کو ضرور جمع فرمائے گا اور کہے گا تو اس سے میری وجہ سے محبت کرتا تھا (3) اے امام تہجدی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے واللہ اعلم۔

۲۔ قول کے مقدر ماننے کے ساتھ یہ ایک اور جملہ مستألف ہے تقدیر کلام یہ ہے یقول اللہ للمنتحبین المقضین یومئذ یا عباد۔ امام بخاری نے معتمر بن سلیمان سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا کہ جس آدمی کو بھی قیامت کے روز اٹھایا جائے گا تو وہ گھبرا یا ہوا ہوگا ایک منادی کرنے والا یہ ندا کرے گا اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔ لوگوں میں کچھ امید پیدا ہوگی اور اس کے پیچھے چل پڑیں گے (4)۔

۳۔ اَلَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا کی صفت ہے، یعنی جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لائے تھے انہیں کوئی خوف نہیں درآ تھا۔ یہ مسلمان تھے و کَانُوا کَانُوا الْمُسْلِمِينَ یعنی اَمَّنُوا کے قائل سے حال ہے، معنی یہ ہوگا جو اخلاص کے ساتھ ایمان لائے۔ اس جملہ نے پہلے کلام کی ہی تاکید بیان کی

2- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 317 (قدیمی)

4- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 117 (اتھاریہ)

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 117 (اتھاریہ)

3- مشکوٰۃ الصالح، جلد 1، صفحہ 427 (قدیمی)

موصول اس کی خبر ہے اور جملہ اذخلو کے قائل سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر جنسی کو حسرت دلانے کے لیے جنت میں اس کے ٹھکانے کو دکھایا جائے گا تو وہ یہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت عطا کرتا تو میں بھی متقین میں سے ہوتا۔ ہر جنسی کو بھی جہنم میں اس کا مکہ ٹھکانہ دکھایا جائے گا تو وہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے۔ یہ کلام بطور شکر کرے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر ایک کے لیے جنت اور جہنم میں ٹھکانہ ہے مؤمن جنت میں کافر کے ٹھکانہ کا وارث بن جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ **وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا لِأَنَّكُمْ تَعْمَلُونَ (1)**۔

یہ جملہ ظریفہ حال ہے۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے جنتی کوئی پھل نہیں لے گا مگر اس کی جگہ اس کی شل پیدا کر دیا جائے گا بزار نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو جنت سے نکالا تو انھیں زاد راہ کے طور پر جنت کا پھل عطا کیا ہر چیز کی تعریف کی تعلیم دی تمہارے لیے پھل جنت کے پھل ہی میں فرق یہ ہے یہ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ خراب نہیں ہوتے (2)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ وہ شام میں تھے تو لوگوں نے جنت کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا جنت کے انکوار کا گچھا یہاں سے صنعا تک ہوگا (3) ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت کے پھل کی لباٹی ہاتھ باہر ہوگی اس میں گتھلی نہ ہوگی۔

إِنَّ النَّجْرَ وَمِثْلَ فِي عَذَابٍ جَهَنَّمَ خُلِدُونَ ﴿١٠﴾ لَا يَغْتَرَّ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيهِ
مُبْسُوتُونَ ﴿١١﴾ وَ مَا ظَلَمْتُهُمْ وَ لَكِنْ كَانُوا هُمْ الظَّالِمِينَ ﴿١٢﴾ وَ نَادُوا لِلَيْلِكَ
لِيَقِضَ عَلَيْهِمْ سَائِرَاتِكُ لِقَالَ إِنَّكُمْ مُسْكُونُونَ ﴿١٣﴾

”یہ نیک مجرم عذاب جہنم میں ہمیشہ رہیں گے نہ لپکا کیا جائے گا ان سے (یہ عذاب) اور وہ اس میں آس تو زمینیں گے اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ (اپنی جانوں پر) ظلم تو چھانے والے تھے اور وہ پکاریں گے اے مالک بہتر ہے کہ تمہارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر ڈالے وہ جواب دے گا کہ تمہیں تو یہاں ہمیشہ (چلے) رہنا ہے۔“

۱۔ یہاں مجرمین سے مراد کامل مجرم ہیں، یعنی کافر کیونکہ یہاں انہیں مؤمنوں کے مقابل ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اور بعد والا جملہ، جملہ مستأنفہ ہیں۔

۲۔ ان سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ کی جائے گی یہ نصرت عنہ الحمی سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بخار میں تخفیف ہو۔ وہ اس عذاب میں اس طرح رہیں گے کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی امید نہ ہوگی۔

۳۔ نادوا کا عطف ان کی خبر پر ہے۔ مالک جہنم کے داروں کے نام ہے۔ جنہی مالک کو خدا کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں موت عطا کر دے تاکہ ہم آرام پائیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا مالک ہزار سال کے بعد کہے گا تم نے عذاب میں یہاں ہی رہنا ہے موت کے ساتھ اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے

۱۔ اگر سابقہ جملہ میں قال میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو یہ جواب کا تہہ ہے۔ اگر قال کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے نہ ہو تو یہ آیت جواب ہوگا گویا فرشتوں کے جواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسکے جواب سے اعراض فرمایا، یعنی ہم نے رسولوں کو سبوت کر کے اور کتابیں نازل کر کے حق تمہارا ہے پاس بھیجا لیکن تم حق کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس میں تمہیں کس کے خلاف احکام ہیں۔

۲۔ ام مقطوع ہے اور یہ انکار اور اضراب کے معنی میں ہے، یعنی وہ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اس میں ترقی کر رہے ہیں، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکر کرنے اور حق کو جھٹلانے میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ وہ صرف ناپسندیدگی پر اکتفا نہیں کرتے اس لیے ہم بھی انہیں جزا دینے میں محکم ہیں۔

ابن جریر نے محمد بن قرقی سے روایت نقل کی ہے تین آدمی کعبہ شریف اور اس کے پردہ کے درمیان تھے ان میں سے دو قریش اور ایک ثقیفی تھا یاد ثقیفی اور ایک قریشی تھا ان میں سے ایک نے کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے دوسرے نے کہا جب تم بلند آواز سے باتیں کرتے ہو تو وہ سنتا ہے جب تم راز دارانہ انداز میں بات کرتے تو نہیں سنتا تو یہ آیت نازل ہوئی (۱)۔

۳۔ ام مقطوع ہے جو انکار اور اضراب کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہوگا بلکہ کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انکی راز دارانہ باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے کیونکہ ہم انہیں سنتے ہیں اور سنا سنا کر ان کا تبیین سب کچھ لکھ رہے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ لَّكَانَ آوَّلَ الْعِلْمِ وَإِنَّ سُبْحَانَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَ
الْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۰﴾ قَدْ رَأَاهُمْ يَحْضُرُونَ ﴿۱۱﴾ وَيَلْعَبُونَ حَشَى
يُلْقُوا أَيُّ مَهْمٍ أَلْزَمِي يَوْمَ عَدْوَنَ ﴿۱۲﴾

”آپ فرمائیے (بفرض حال) اگر رحمن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا چہاری ہوتا، پاک ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار (اور) عرش کا رب ہر اس عیب سے جو یہ بیان کرتے ہیں، میں نے انہیں (اے حبیب) آپ رہنے دیں انہیں کہ بے ہودہ باتیں بتاتے رہیں۔ اور کھیل (تماشہ) کرتے رہیں حتیٰ کہ طلاق سے ہو جائے ان کی اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

۱۔ حزرہ اور کسائی نے واؤ کے ضمیر اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اسے محبوب کہو اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ اور جو چیز اس کے شایان شان ہے اور جو اس کے شایان نہیں سب کچھ دوسروں کے بنسبت زیادہ جانتے ہیں اور جس کی تعظیم بجالانا واجب ہے اس کی ضرورت تعظیم بجالانے جو والد کی تعظیم بجالانا ہے وہ بیٹے کی تعظیم بھی ضرور بجالاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قاطر میرا کلام ہے جو اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے ایک روایت میں ہے جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا (۲) امام بخاری نے اسے سور سے روایت کیا ہے اس آیت کا برسر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا جائز ہے یا اس کی عبادت کرنا جائز ہے کیونکہ حال چیز حال کو ہی مستلزم ہوتی ہے بلکہ یہاں مقصود دونوں کو مبلغ ترین انداز میں رد کرنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَوْ كُنَّا فِيْهِمْ آلِهَةً إِلَّا اللَّهُ لَقَسَدْنَا لَوْ شَرَطْ اور جزا اور دونوں کی نفی کا تقاضا کرتا ہے ان جزاء کے اثبات کا اور نہ اس کی نفی کا شعور دلاتا ہے کیونکہ وہ جمل شرط کے لیے وضع کیا گیا ہے اس

کا مقصود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے ہونے کا انکار کسی عباد کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے پہلے اور اکل انداز میں اعتراف کرتے۔ سدی نے یہی بات کہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو (تو ہوا کرے) میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہوں اور اس کی توحید کا اقرار کرنے والا ہوں، یعنی میں اس طرح کی بات کرنے والا نہیں جس طرح تم گمان کرتے ہو ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں تمہارے قول کا سب سے پہلے منکر ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں سب سے پہلا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے غضبناک ہوا، یعنی جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے تو میں سب سے زیادہ اس سے نفرت کرنے والا ہوں۔ قاسمیں میں ہے عبد کا لفظ جب باء کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی غصہ، سخت جنگ، بڑھتی، نفس کی ملامت، الالچ اور انکار ہے جب عبد باء کے کسر و کے ساتھ ہو تو بجز بھی اس کا معنی سخی ہے۔ یہاں مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی غضب اور انکار ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا نہیں میں سب سے پہلے اس کی شہادت دیتا ہوں اس سے پتہ یہ چلا کہ یہاں ان نافیہ ہے شرط نہیں (۱)۔

۱۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے جو کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جب آسمان، زمین اور عرش جو طویل عرصہ تک باقی رہنے والے ہیں جب ان چیزوں سے پاک ہیں جن سے دوسرے اجسام متصف ہیں تو انکے خالق کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ ۲۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چھوڑ دو کہ وہ باطل اعتقادات میں پھینکتے رہیں اور دنیاوی زندگی میں کھیل کود میں ہی لگے رہیں یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ عذاب کو دیکھیں اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ان کا قول سراپا جہالت اور خواہش نفس کی اتباع ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ انکے دلوں پر ہمہ گیر کئی گئی انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿١٠﴾
 تَبَّوْكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ عِنْدَ كَعِلْمِ
 السَّاعٰتِ ﴿١١﴾ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿١٢﴾ وَ لَا يَسْئَلُكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ
 الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾ وَ لِيُوْنِ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ
 لَيَقُوْنَنَّ اللّٰهُ فَاَنْ يُّوْفُوْا نُوْنٌ ﴿١٤﴾ وَ قِيْلَ لِيْرَبِّ اِنْ هُوَ اِلَّا يُؤْمِرُ بِالْاَيُّوْمِ وَاَنْ
 قَاصِفَحَ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلِمٌ ﴿١٥﴾ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٦﴾

”اور وہی ایک آسمان میں خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہی بہت دانا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور تمہیں اختیار رکھتے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں شفاعت کرنے کا ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے پھر کہہ یہاں لے پھر رہے ہیں۔ اور تم سے میرے رسول کے اس قول کی کہ

سورة الدخان

﴿ اٰیٰتھا ۵۹ ﴾ ﴿ سُورَةُ الدَّخَانِ مَكِّيَّةٌ ۲۴ ﴾ ﴿ رُكُوْعَاتھا ۲ ﴾

سورة الدخان مدنی ہے، اس میں آئندہ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حَمْدٌ ۙ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۙ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۙ اِنَّا كُنَّا مُنذِرِیْنَ ۙ

”حامد حق کو واضح کرنا والی کتاب کی قسم لے لے شک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں ہماری یہ شان ہے کہ ہم بروقت خبردار کروا چکے ہیں۔“

۱۔ کتب مبین۔۔۔ سے مراد قرآن حکیم ہے اسکی عین صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ یہ حلال و حرام کے احکام کو ظاہر کرنے والا ہے اگر ہم کی قسم اٹھائی مٹی تو پھر وہا عاقلہ ہوگی اور اگر اس کی قسم نہ اٹھائی مٹی ہو تو پھر یہ واقعہ ہے کہ اس کا جواب قسم ہے۔

۲۔ اَنْزَلْنٰهُ میں ہمزہ سے مراد قرآن ہے۔ اسے برکت والی رات اس لیے کہا کیونکہ اس میں قرآن نازل ہوا جو دعائی اور دنیاوی منافع کا سبب ہے۔ اسی میں فرشتے رحمت نازل ہوتی ہے اور دعائی قبولیت ہوتی ہے اس رات سے مراد ایلئے القدر ہے۔ قادمہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر میں قرآن کو ام الکتاب سے آسمان دنیا پر نازل فرمایا پھر جبرئیل امین میں سال (۱) تک آیات کی صورت میں نازل کرتے رہے (۱) جو یہ قول کیا گیا کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد نصف شعبان کی رات ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے شہور رمضان الذی انزل فیہ القرآن اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ اور قاسم بن محمد سے جو روایت مروی ہے جسے وہ اپنے باپ یا چچا سے روایت کرتے ہیں پھر دادا سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف رات کو آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ہر انسان کو بخش دیتا ہے مگر ایسے انسان کو نہیں بخشتا جس کے دل میں کینہ ہو۔

یادہ مشرک ہو۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے (۲) اور کہا اس روایت میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ قرآن حکیم پندرہ شعبان کی رات کو نازل ہوا۔

فرمایا ہم قرآن حکیم میں سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اِنَّا كُنَّا مُنذِرِیْنَ یہ جملہ ساتھ ہے یا یہ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ سے بدل استعمال ہے۔

فِیْہَا یَقِیْرُ فِیْ كُلِّ اَمْرٍ حَرِکْنِیْ ۙ اَمْ رَاقِنِ عِنْدِنَا ۙ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۙ رَاحِصَةً

2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (انچاریہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (انچاریہ)

(نزل قرآن کا وہاں یہ بائیس سال سے زائد ہے۔ مترجم)

ذکر کیا تصدو یہ شعور دلاتا ہے کہ یہ ربوبیت کا تقاضا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال سنتا ہے اور ان کے احوال جانتا ہے۔ اس آیت اور مابعد آیت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ثبوت ہے۔ جس میں یہ صفات ہوں وہی رب ہونے کا مستحق ہے۔

یہ دلیل کو فہم و لب کو جو کر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ دیکھ سے بدل ہے جبکہ باقی قراء نے اسے ریح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ان کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ السَّيِّئَاتِ الْمُعْلَمَاتِ کی صفت ہے یا مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ اِنْ لَدُنْكُمْ مُّؤْمِنُونَ شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر تم علم میں یقین رکھتے ہو یا اگر تم اپنے اقرار میں یقین رکھتے ہو تم سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو تم نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو تم نے جان لیا کہ بات تو اسی طرح ہے جس طرح ہم نے کہا تھا یا معنی یہ ہے کہ اگر تم یقین کا ارادہ رکھتے ہو تو اس کا یقین کر لو یا اگر تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کا رب ہے تو یقین کر لو کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ سَرَبُّكُمْ وَسَرَبُّ آبَائِكُمْ ۖ الْأَوْلَادُ لِلَّذِينَ ۖ بَلَّ هُمْ فِي
سَلْبٍ ۖ يَلْبَعُونَ ۖ قَامَرْتَقِبَ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ ۖ يَتَّبِعُنِي
النَّاسُ ۖ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ

”نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی رب ہے بلکہ وہ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں بلکہ تمہیں آپ انتظار کریں اس دن کا جب ظاہر ہوگا آسمان پر صاف نظر آنے والا دھواں جو چھان جائے گا لوگوں پر یہ دردناک عذاب ہوگا۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ یہ جملہ جہل ربیب السملویۃ و الاثریض کے معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔ یا یہ ان کی دوسری خبر ہے۔ یہ یحییٰ و یمیت یہ ان کی ایک اور خبر ہے، یعنی جس طرح تم مشاہدہ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یا یہ صو سے حال ہے۔ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمْ یہ ان کی ایک اور خبر ہے یا یہ ہو سے بدل ہے۔ بلکہ انصراب کے معنی میں ہے بلکہ وہ دوبارہ اٹھانے یا قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ بلبعون یہ ظرف میں موجود ضمیر سے حال ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ قرآن اور آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اس میں غائبہ کے صیغے سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

۲۔ یہاں فاء سببیہ ہے یوم، اور تاقب کا مفعول بہ ہے اس دوہوں کے بارے میں اختلاف ہے حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ابن جریر، نقیبی اور بغوی نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی پہلی نشانیوں میں سے دوہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور آگ ہوگی جو عدن کی غار سے نکلے گی جو لوگوں کو میدانِ محشر کی طرف ہانکے گی جب لوگ قتلوار کریں گے تو آگ بھی ٹھہر جائے گی۔ حضرت حذیفہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! وہاں کیا چیز ہے تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی فرمایا دھواں مشرق و مغرب کو بھر دے گا۔ وہ چالیس دن رہے گا جہاں تک مومن کا تعلق ہے اسے اسے دوہوں سے اتنی تکلیف ہوگی جیسے زکام لگ جاتا ہے۔ کافر بے ہوشی کے عالم میں ہو

گا دھواں اس کے تھنوں کا نوں اور دربرے نکل رہا ہوگا (1)۔ طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ ابو بکر اشعری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب نے تمہیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے۔ دھواں جس سے مومن کو زکام لگ جائے گا کافر اس دھواں سے بچول جائے گا دوسرا داہ اور تیسرا دجال اس روایت کی کئی شواہد بھی ہیں۔

رَأَيْتَا أَكْشِفَ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾ أَلَيْسَ لَكُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ
مَأْسُورٌ مُّبِينٌ ﴿١١﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عُنُقَهُ وَقَالُوا مَعْلَمٌ مَّجْنُونٌ ﴿١٢﴾ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابَ
قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٣﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطِشَةَ الْكُبْرَىٰ ﴿١٤﴾ إِنَّا فَتَقِيُونَ ﴿١٥﴾

” (اس وقت کہیں گے) اے ہمارے رب دور کر دے ہم سے یہ عذاب ہم (ابھی) ایمان لاتے ہیں لے ان کے نصیحت قبول کرنے کی امید کہاں حالانکہ ان کے پاس تعریف لے آیا روشن رسول۔ علی پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تھا اس سے اور کہا سکھایا ہوا ہے۔ یوں ہے علی ہم دور کرنے والے ہیں عذاب کو قلیل عرصہ کے لئے تم پھر کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے جس روز ہم انہیں پوری شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدل لے لیں گے۔“

لے اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے اور یہ جملہ مقولہ ہے اور پھر حال بن رہا ہے إِنَّا الْمُؤْمِنُونَ اگر عذاب دور ہو جائے تو یہ ان کی طرف سے ایمان لانے کا وعدہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یَقُولُ الْكَافِرُونَ مِنْ النَّاسِ هَذَا الْقَوْلُ۔ یوں گوں میں سے کافر یہ قول کریں گے۔ علی اس میں کلمہ استہتام انکار کے معنی میں ہے، یعنی اس حالت میں ان کے لئے نصیحت کرتا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ جملہ مستحکم ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کھل بند کرو یعنی کیا وہ نصیحت حاصل کریں گے؟ وَقَدْ جَاءَهُمْ مَعْلَمٌ مَّجْنُونٌ اور وہ جملہ حال بن رہا ہے۔ یعنی اس حال میں کہ ان کے پاس شان والا رسول آیا تھا جس کی دلیل واضح تھی اور وہ ان کے لئے ایسی آیات اور معجزات ظاہر کرنے والا تھا جو اس نصیحت کو واجب کرنے والے تھے۔

س انہوں نے آپ سے اعراض کیا اور کہا انہیں سکھایا گیا، سکھانے والا ایک عجمی غلام ہے جو بنو نقیث کے ایک آدمی کا ہے۔ بعض نے کہا یہ مجنون ہے۔

یہ کلام ان کے قول رَأَيْتَا أَكْشِفَ عَنَّا الْعَذَابَ کا جواب ہے، یعنی ہم چالیس روز تک تم سے عذاب کو دور کرنے والے ہیں قَلِيلًا یا تو منقول مطلق ہے مفعول فیک صورت میں منصوب۔ اس سے مراد ان کی باقی ماندہ عمریں ہیں یا دنیا کی باقی ماندہ عمر ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ یہ کَاشِفُوا الْعَذَابَ کی علت ہے۔

یہ یوم سے مراد یوم قیامت ہے یہ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر مُتَّقِيُونَ دلالت کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے اس تفسیر کا انکار کیا۔ امام بخاری نے ابوعبی سے انہوں نے مسروق سے روایت کیا ہے فرمایا ایک آدمی کندہ کے حملہ میں بیان کر رہا تھا کہ قیامت کے روز ایک دھواں ہوگا جو منافقوں کے کانوں اور آنکھوں کو ناکارہ بنا دے گا اور مومنوں کو اس قدر تکلیف ہوگی جیسے زکام لگ گیا ہو تو ہم گھبرا گئے۔ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے آپ غضبناک ہو گئے اور بیٹھ گئے فرمایا جسے علم ہو تو وہ کہے جسے علم نہ ہو تو کہے اللہ اعلم جب علم نہ ہو تو اللہ اعلم۔ کہنا ہی علم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم سے فرمایا قل ما استسقم علیہ من اجرو وما اتانا من المتكفلین قریش نے اسلام قبول کرنے

میں شامل ہے کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں بددعا کی اسے اللہ! قریش کے خلاف میری مدد فرما کہ انہیں سات سال تک خشک سالی آئے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں خشک سالی آئی تھی انہیں خشک سالی نے آیا اس میں لوگ ہلاک ہوئے، مردار اور بڑیاں کھائیں، بھوک کی شدت کی وجہ سے آسمان اور زمین کے درمیان دھوئیں جیسی سفید چیز کود کھیتے۔ ایسفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو عرض کی اسے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں جبکہ آپ کی قوم ہلاک ہوتی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاروقیہ یوم قاسمی السماء سے اس آیت تک آیات کی تلاوت کی۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا **لَوْ كُنْتُ الْكَلْبُ لَأَكَلْتُ مِنْ بَدَنِ بَدْرٍ كَادُونَ** ہے (1)۔ امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ پانچ چیزیں گزر چکی ہیں بدر کادن روم، کلا، چاند کا شق ہو نا اور دھواں (2) امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے صحیح میں نقل کیا ہے کہ جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے میں مدد سے بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے قحط کی بددعا کی تو قریش کو بھی قحط نے آیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بڑیاں کھائیں ایک آدمی آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اسی دھوئیں جیسی چیز نظر آتی تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا تو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ! مضمر کے لئے بارش کی دعا کیجئے وہ تو ہلاک ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی تو بارش ہو گئی تو یہ آیت نازل ہوئی **إِنَّا كَاتِبُوا الْعَذَابَ لَكُمْ وَلَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَنُذُرًا لِّقَوْمٍ يَّتَذَلُّونَ لَكُم مِّنْ حَيْثُ يَشَاءُونَ** جب دوبارہ خوشحالی آگئی تو کفر کی طرف پھر پلٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آخری آیت کو نازل فرمایا (3) یہاں یوم سے مراد یوم بدر ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ مَدْيَنَ وَعَوْنًا وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿١﴾ أَنْ أَذِّبُوا إِلَىٰ آلِ عِمَادٍ
اللَّهُ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿٢﴾ وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ﴿٣﴾ إِنِّي أَنبِئُكُمْ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِينٍ ﴿٤﴾ وَإِنِّي عِدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿٥﴾

”اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قوم مدین کو اور آیتا تھا ان کے پاس معزز رسول (اس نے فرمایا تھا) کہ میرے حوالے کر دو اللہ کے بندوں کو میں تمہارے لئے معزز رسول ہوں، اور نہ سرکشی کرو اللہ کے مقابلے میں نے آیا ہوں تمہارے پاس اپنی رسالت کی روشن دلیل ہے اور میں نے پناہ لے لی ہے اپنے رب کی اور تمہارے رب کی کرتم جو پھر پتھر اڑا کر سکتے“

۱۔ یہ جملہ جواب قسم ہے۔ کفار مکہ سے پہلے ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو بھی آزمایا تھا ان کے پاس بھی عظیم الشان رسول آیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یا مومنوں کے ہاں اپنے حسب و نسب میں بڑا معزز تھا اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔
۲۔ یہاں ان مصدر یہ ہے۔ آپ نے فرعونوں سے فرمایا اپنی اسرائیل میرے حوالے کر دو انہیں میرے ساتھ جانے دو انہیں آزاد کر دو انہیں اذیتیں نہ دو یا اس کا معنی ہے اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور میری دعوت کو قبول کرو۔ یہاں عباد اللہ سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو کیونکہ رسول رسالت اور دعوت کے ساتھ ہی آتا ہے اور رسالت و دعوت میں قول کا

ساتھ تعبیر کیا۔

۱۰۔ فاسوس میں فاء جزائے ہے۔ یہاں قول محذوف ہے، معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اور فرمایا اگر بات اس طرح ہے تو اورت کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکل جاوے شک فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کرے گی۔ نافع اور ابن کثیر نے فاسوس میں ہمزہ وصلی پڑھا ہے یہ سری یسوی سے مشتق ہے جبکہ باقی قراء نے اسوی یسوی سے ہمزہ قطعی پڑھا ہے یہاں عبادی سے مراد بنی اسرائیل ہیں جب فرعون کو یہ معلوم ہوگا کہ تم نکل گئے ہو تو وہ تمہارا پیچھا کرے گا یہ جملہ مستافہ ہے۔

۱۱۔ دھوا یہ البحر سے حال ہے جس کا معنی کھلا ہوا، سورج اور صبح اور ساکن ہے، یعنی جب آپ اور اس کے ساتھی سمندر سے نکل جائیں تو اسے ملانے کے لئے اپنا عصا سمندر پر نہ مارنا۔ قنادہ نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر عبور کر لیا تو اس طرف مائل ہوئے کہ سمندر میں اپنا عصا ماریں تاکہ وہ ل جائے اور یہ بھی خوف ہوا کہ کہیں فرعون اور اس کے لشکر ان کا پیچھا نہ کریں تو اسے کہا گیا سمندر کو اسی طرح کھلا رہنے دیں جس طرح وہ تھا۔ رھوا مصدر ہے جو اسم قائل کے معنی میں ہے ﴿لَهُمْ جَنَّاتٌ مِّنْ دُونِ جَمَلٍ مَّسْتَافَةٌ﴾ ہے جو لعل کی جگہ واقع ہے۔

۱۲۔ انہوں نے بہت سارے باغات، چشمے، کھیتیاں، مزرین، محافل اور خوبصورت گھر چھوڑے اور ایسی نعمتیں چھوڑیں جن سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے ﴿مَنْ مَّزَّجْنَا وَآلِ الْاَجْمَلِ﴾ جملہ مقررہ ہے۔

۱۳۔ کلبی نے کہا اس کا معنی یہ ہے جو میری نافرمانی کرتا ہے میں اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا معاملہ اسی طرح ہے اور فقہا کا عطف کلام محذوف پر ہے جو سلینا ہا ہے ﴿وَمَا أَشْرَيْنَا بِهٖ﴾ مراد بنی اسرائیل ہیں یا اور فنا کا عطف متروکوا پر ہے۔

۱۴۔ اس جملے کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی لٹا کر ہلاک کیا گیا تو ان پر آسمان و زمین نہیں روتے۔ یہ کلام اس چیز سے مجاز ہے کہ ان کی ہلاکت اور ان کے موجود ہونے کی کسی کو کوئی پروا نہیں۔ جس طرح اس کی تعین میں یہ کلام کی جاتی ہے بکت علیہم السماء وکسفت علیہم الشمس، یعنی آسمان ان پر رویا اور سورج کو گرہ بن لگ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کلام اپنے حقیقی معنی میں ہے اس کا مومن کے خلاف معاملہ ہے جب مومن مرتبا ہے تو اس پر زمین و آسمان روتے ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بندے کے لئے آسمان میں دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے اس کا عمل چڑھتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نیچے اترتا ہے۔ جب اسے موت آ جاتی ہے تو دونوں اسے نہیں پاتے اور اس پر روتے ہیں (۱) ابن جریر اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے ﴿فَمَا بَیَّتَ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ﴾ کی تعبیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا یہاں مخلوقات میں سے ہر ایک کے لئے آسمان میں سے ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے اور اس پر عمل اوپر چڑھتا ہے جب مومن فوت ہوتا ہے تو آسمان کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دروازہ روتا ہے زمین کے جس حصے پر وہ نماز پڑھتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا تھا جب وہ نماز کی جگہ سے نہیں پاتی تو وہ اس پر روتی ہے (۲)۔

امام بغوی، ابویعلیٰ اور ابن ابی حاتم نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے (۳) حضرت ابن عباس کی روایت کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ نے ﴿فَمَا بَیَّتَ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ﴾

انہیں اس کی تلاوت کی۔ ابن جریر نے شرح ابن عیینہ حضری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مومن حالت سفر میں فوت ہوتا ہے اس کے رشتہ دار اس کے پاس موجود نہیں ہوتے تو اس پر زمین و آسمان روتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی قرأت کی قَمَا بَدَأْتُمْ بِهِمُ السَّمَكَةَ وَالْإِنْمَاطَ پھر فرمایا کہ فرپر یہ دونوں نہیں روتے (1)۔ وَمَا كَانُوا مُتَقَرِّبِينَ كَمَا عَطَفَ هَلْكَوْا پر ہے یعنی انہیں مہلت نہیں دی جاتی۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْهَبِيثِ ۖ مِنْ فِرْعَوْنَ ۗ إِنَّهُ كَانَ عَلِيًّا قَوِيًّا
 مُسْرِفِيْنَ ۖ وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلِيٍّ عَلَىٰ الْعَالَمِينَ ۖ وَأَنبَيْتُهُمْ مِنْ آيَاتِنَا قَوِيًّا ۖ بَلَّوْا الْهَبِيثِينَ ۖ
 ”اور بے شک ہم نے نجات دی بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے لہ (یعنی) فرعون (کی غلامی) سے بلاشبہ وہ بڑا متکبر (اور) حد سے بڑے زلے والوں میں سے تھا۔ اور ہم نے چنا تھا بنی اسرائیل کو جان بوجھ کر جہان والوں پر سے اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی ہے“

لہ عذاب مہین سے مراد ان کے بیٹوں کا قتل، ان کی عورتوں کا زندہ رکھنا، مردوں کو غلام بنالینا اور ان سے سخت کام لینا ہے۔
 ۗ مِنْ فِرْعَوْنَ ۗ یمن العذاب سے بدل ہے۔ فرعون کو عذاب قرار دینا بطور مجاز ہے وہ لوگوں کو بہت زیادہ عذاب دیتا تھا اس لئے اسے عذاب قرار دیا گیا۔ یا لفظ فرعون سے یہ بلا عذاب کا لفظ محذوف ہے اس صورت میں یہ العذاب سے بدل کل ہو گا یا
 مِنْ فِرْعَوْنَ الْعَذَابِ سے حال ہے، کیونکہ یہ عذاب فرعون کی طرف سے واقع ہوتا تھا۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ فرعون تکبر سرکشی اور شرارت میں حد سے زیادہ تجاوز کرنے والا تھا، یمن المُسْرِفِیْنَ ۖ کان کی دوسری طرف سے، یعنی وہ تکبر اور فضول خرچ تھا یا عیال میں جو ضمیر ہے اس سے یہ حال ہے کیونکہ وہ ان میں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ مکمل جملہ یا تو جملہ معترضہ ہے یا جملہ مستأنفہ ہے۔
 ۖ لَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلِيٍّ عَلَىٰ الْعَالَمِينَ ۖ عیال علیہ ترکیب کلام میں تا ضمیر سے حال ہے، یعنی ہم جانتے تھے کہ بنی اسرائیل اس کے حقدار ہیں یا معنی یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنی اسرائیل بعض مواقع پر گمراہ ہو جائیں گے ہم نے انہیں تمام جہانوں پر منتخب کیا۔

ۗ مِنْ فِرْعَوْنَ ۗ سے مراد سمندر کا پھٹ جانا سمندر کا سایہ دینا من اور سلویٰ کا نازل ہونا۔ قنارہ سے بلا کا معنی نعمت کیا ہے، یعنی اس میں واضح نعمت ہے۔ ابن زید نے کہا ان کی آزمائش، خوشحالی اور نگی کی صورت میں ہوتی پھر یہ آیت پر بھی کہ نَبَلُّوْکُمْ بِالْبَیِّنَاتِ وَالْخَبْرِ فَبَشِّرْنَهُ (2)۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَیَقُولُونَ ۖ إِنَّمَا مَوْتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِّينَ ۖ
 قَاتُوا يَا بَآئِنَا إِن لَّكُم صُدُقٌ قَبِيْنٌ ۖ أَهْمٌ حَبِيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبِیْعُ ۗ وَالَّذِيْنَ مِنْ
 قَبْلِہِمُ ۗ أَهْلَكْتُمُ ۗ إِنَّہُمْ كَانُوا مُجْرِمِیْنَ ۖ

”بے شک یہ (کفار کہہ) بھی کہتے ہیں لہ نہیں ہے (ہمارے لئے) مگر ہماری (نبی) پہلی موت اور نہ ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ بھلا ہمارے باپ دادوں کو تو زندہ کر کے لے آؤ اگر تم سچے ہو س (اے لوگو ذرا سوچو) کیا یہ لوگ

عَنْ مَوْلَى سَيِّدَاؤَلَاهُمْ بَيِّنُونَ ﴿١٠﴾ اَلَا مَنْ رَحِمَ اللّٰهُ اِنَّهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيْمُ ﴿١١﴾

”اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کیل کے طور پر۔ ہمیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان و زمین کو مگر حق کے ساتھ لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ یقیناً فیصلہ کا دان ان سب کو (دوبارہ زندہ کرنے کے لئے) مقررہ وقت ہے۔ جس روز کوئی دوست کسی دوست کے ذرا کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ جس سوائے ان کے جن پر اللہ نے رحم فرمایا ہے بے شک وہ سب پر غالب ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔“

۱۰۔ ہم نے زمین و آسمان اور اس کے درمیان جو کچھ پیدا کیا یہ عبت اور باطل نہیں یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون سے حال ہے کیونکہ وہ اپنے ضمن میں دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار کے معنی کو لئے ہوئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے انکر والبعث والحال انه ما خلفنا السموات والارض خلقنا انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا جبکہ ہم نے زمین و آسمان کو فضول پیدا نہیں فرمایا بلکہ ہم نے انہیں اس لئے پیدا کیا تاکہ ہم اس سے اپنے وجود اور صفات کمالیہ پر دلیل قائم کریں نیز انسان کی آزمائش کے لئے انہیں پیدا کیا۔ ۱۱۔ ہم نے زمین و آسمان کو اس لئے پیدا کیا تاکہ حید اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے واجب ہونے کو واضح کریں تاکہ ہم مطیع کو ثواب دیں اور گناہ گار کو عذاب دیں۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

لیکن اکثر لوگ اس چیز کو نہیں جانتے کہ ان چیزوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ توحید پر استدلال کیا جائے اور لوگوں کو آرمایا جائے ان کے نہ جاننے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں نظر و فکر کی صلاحیت کم ہے اور وہ دنیا میں منہمک ہیں۔ ۱۰۔ یَوْمَ الْقَضٰی سے مراد یوم قیامت ہے جس میں حق کو باطل سے اور حق پرست کو باطل پرست سے الگ کیا جائے گا۔ وَیَقَالُھُمْ سے مراد ان کے حشر اور جزا کا وقت ہے یہ جملہ بھی سابقہ جملہ کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کی تخلیق کا مقصد استدلال اور آزمائش ہے۔ ۱۱۔ یَوْمَ لَا یُغْنٰی عَنْہُمْ الْقَضٰی سے بدل ہے یا یَوْمَ الْقَضٰی جس فعل پر دلالت کرتا ہے اس سے ظرف ہے، یعنی اس روز کوئی رشتہ دار کسی دوسرے رشتہ دار کو نفع دے گا اور نہ ہی تکلیف دور کرے گا اور نہ ہی وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے ہم ضمیر پہلے مولیٰ کے لئے ہے کیونکہ معنی کے اعتبار سے وہ عام ہے۔

۱۰۔ مگر جنہیں معاف فرما کر اور ان کے حق میں شفاعت قبول فرما کر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے وہ مؤمن ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے حق میں شفاعت کریں گے انہیں شفاعت کی اجازت بھی ہوگی۔ مستثنیٰ عمل رفع میں ہے کیونکہ وہ بصرون کی خمیر سے بدل ہے یا یہ مستثنیٰ ہونے کی حیثیت میں منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے وہ جسے عذاب دینے کا ارادہ کرے کوئی اسے عذاب سے بچا نہیں سکتا۔ سعید بن منصور نے ابوالک سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل کھجور اور مکھن لاتا اور کہتا زقوم چکھو کیونکہ یہ وہ زقوم ہے جس سے تمہیں حمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ڈراتا ہے (۱)۔

اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقْوٰمِ ﴿۱۰﴾ طَعَامٌ اَلَا یَتَمِیْمٌ ﴿۱۱﴾ کَالْمُهْلِ یَغْلٰی فِی الْبَطْوٰنِ ﴿۱۲﴾ لَعَلَّی

الْحٰوِیْمِ ﴿۱۳﴾

” بلاشبہ زقوم کا درخت لہ گناہ گار کی خوراک ہوگا۔ پچھلے تاجے کی مانند بیڑوں میں جوش مارے گا۔ جیسے کھولتا پانی جوش مارتا ہے۔“

لہ، لہ، اٹیم کا معنی بہت زیادہ گناہ کرنے والا ہے اس سے مراد کافر ہے یہ جملہ اور ابا بعد جملے سابقہ کلام کا بیان ہے جس میں حق پرست اور باطل پرست میں فرق کیا گیا ہے۔

لہ کا تھمیل بیان کی ایک اور خبر ہے۔ مہل سے مراد وہ معدنیات ہیں جو آگ میں پگھل جاتی ہیں ایک قول یہ کیا گیا تیل کی سیاہ چھٹ ہے قاسوس میں اسی طرح ہے (1) یعنی یہ ان کی ایک اور خبر ہے انہں کثیر اور حفص نے بغلی پر حا ہے اس صورت میں جو ضمیر طعام اور زقوم کے لئے ہوگی، مہل کے لئے نہ ہوگی کیونکہ جملہ انہیں دو میں سے ایک سے حال ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں ضمیر شجرہ کے لئے ہوگی۔

لہ زقوم کفار کے پیٹ میں یوں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے اگر زقوم کا ایک قطرہ زمین پر گرے تو تمام دنیا و ان لوں کی زندگی کو کڑوا کر دے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کا یہی کھانا ہے اور کوئی کھانا نہیں (2) امام ترمذی نے امام نسائی ابن ماجہ ابن ابی حاتم ابن حبان حاکم اور بیہقی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔ عبد اللہ بن احمد نے زوائد زبیر میں اور ابو نعیم نے ابوعمر و خولانی سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ کہ انسان دنیا سے جو حصہ لیتا ہے دنیا بھی اس سے اتنا ہی حصہ لے لیتی ہے

هٰذَا ذُو الْعَارِضَاتِ اِنِّي سَوَّاءٌ الْجَحِيمِ ﴿١٠﴾ لَمْ صَبُّوا فَوْقَ رَاسِهِ مِنْ عَذَابِ الْجَحِيمِ ﴿١١﴾ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكُوْبِيُّ ﴿١٢﴾ اِنْ هٰذَا اِمَّا لَكُمْ يَوْمَ تَسْتُرُوْنَ ﴿١٣﴾

” (عسم ہوگا) اس (آبار) کو پھڑلو پھرا سے تھمیت کر لے جاؤ جہنم کے وسط میں لہ پھر اٹھ لیلو اس کے سر کے اوپر کھولتا پانی (اسے) عذاب دینے کے لئے لہ لو چھو تم بڑے معزز و کرم ہو سہ بے شک یہ وہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔“

لہ جہنم کے دارو غوں سے کہا جائے گا اس گناہ گار کو پھڑلو یہ جملہ اپنے قول کے ساتھ مل کر ان کی ایک اور خبر ہوگی۔ کوفہ کے قراء ابو جعفر اور ابو عمرو نے فاعلوں کی تاء کو کم اور جبکہ باقی قراء نے مضموم پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی اسے زبردستی جہنم کے وسط میں لے جاؤ عقل کا معنی کسی چیز کو ہر طرف سے پھڑلانا ہے اور زبردستی کھینچنا ہے۔

لہ مراد یہ ہے کہ اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی اٹھ لیلو تا ہم مبالغہ کے لئے یوں کلام کی جاتی ہے صوا فوق واسہ عذابا هو الحميم۔ پھر عذاب کو حیم کی طرف مضاف کیا گیا تا کہ تخفیف کا فائدہ دے۔ یہاں من کو ذکر کیا تا کہ اس پر دلالت ہو کہ جس چیز کو ان پر اٹھ لیا گیا وہ اس نوع کا کچھ حصہ ہے۔

لہ اس سے پہلے قول محمد و ف ہے اس عذاب کا مزا چھو تم اپنے آپ کو بڑا معزز خیال کرتے تھے۔ جزو نے انک کے جزو کو فخر کے ساتھ

پڑھا ہے۔ یعنی اس سے پہلے لام حرف جار محدود ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستأنف ہے۔ امام بخاری نے کہا مقاتل نے کہا جنم کا دارود اس جنمی کے سر پر ضرب لگائے گا اور دماغ تک اس کے سر میں سوراخ کر دے گا اس میں کھولتا ہوا پانی اترے گا جو گرمی میں اکتھا ہو پینچا ہوگا پھر اسے کہا جائے گا ڈنک اذنی انک انک العزیز التوہم یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ابو جہل کہتا تھا میں اس وادی کا سب سے معزز اور محترم ہوں۔ جنم کے دارود نے اسے یہ الفاظ شرمندہ کرنے کے لئے کہیں گے (1)۔ اموی نے نکرہ سے معازی میں نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابو جہل سے ملے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں کہوں اولیٰ لک فاولیٰ تو ابو جہل نے اپنے ہاتھ سے کپڑا اتارا اور کہا تو اور تیرا صاحب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں اس وادی کا سب سے طاقتور اور عزت والا آدمی ہوں۔ غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اسے قتل کر دیا اسے ذلیل و رسوا کیا اور ان کلمات کے ساتھ اسے شرمندہ کیا (2) اور اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن جریر نے قتادہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

یہ وہی عذاب ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿١٦١﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿١٦٢﴾ يَلْمِزُونَ مِنْ شُؤْنِهِمْ سَائِدِينَ ﴿١٦٣﴾
 اَسْتَبْرَقَ مُتَّقِيَلِينَ ﴿١٦٤﴾ كَذَلِكَ نَعْنِدُ وَرُوحَهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿١٦٥﴾

”یقیناً پرہیزگاروں کی جگہ میں ہوں گے۔ باغات میں اور (پتے ہوئے) چشموں میں جسے پہنے ہوئے ہوں گے لباس باریک اور دیز ریشم کا آنے سانے بیٹھے ہوں گے جسے ہاں یونہی ہوگا اور ہم بیاہ دیں گے انہیں گوری گوری آہو چشم عورتوں سے۔“

1. اہل مدینہ اور اہل شام نے مقام کوہیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ صدر رسمی ہے اور اقامت کے معنی میں ہے، جبکہ باقی قراء نے نیم کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ طرف کا صیغہ ہوگا۔ اس جگہ کو امین اس لئے کہا گیا کیونکہ جو وہاں پہنچ جائے گا وہ تمام مصیبتوں اور وہاں سے منتقل ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔

2. یہ مقام سے بدل ہے۔ بدل ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ صاف ستھری ہے اور اس میں لطف عطا کرنے والے کھانے اور مشروب بات ہوں گے۔

3. یہ ان کی دوسری خبر ہے اس ضمیر سے حال ہے جو اس شہ فعل میں پائی جا رہی ہے فی مقاماً آمیناً جس کے متعلق ہے یا یہ جملہ مستأنف ہے۔ سندس باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدینانے کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ اگر جنت کا کوئی کپڑا آج پہنا جائے تو جو اسے دیکھے گا وہ ہوش ہو جائے گا اور لوگوں کی آنکھیں اسے برداشت نہ کر سکیں گی۔ صابونی نے ماتین میں حکم سے نقل کیا ہے کہ ایک جنتی حلقہ پہنے گا تو ایک وقت میں اس کے ستر رنگ ہوں گے وہ جنتی ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مانوس ہوں۔

4. یہ جملہ خبر ہے اس کا مبتدا الامر ہے وَرُوحَهُمْ بِحُورٍ عِينٍ قند کے ضمیر ہونے کے ساتھ حال ہے یا ان کی خبر پر اس کے ساتھ عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے انہیں حوروں کے ساتھ ملا دیا ہے اسی وجہ سے اس کا صلہ باء ذکر کیا ہے کہ عقد نکاح کا ذکر نہیں کیونکہ اس

موت پر زو جتہ ہاموہ نہیں کہا جاتا ہے۔ ابو سعید نے کہا اس کا معنی ہے ہم نے انہیں حوروں کے ساتھ جوڑا جوڑا بنا دیا ہے جس طرح ایک جوتا دوسرے جو تے کے ساتھ مل کر جوڑا بن جاتا ہے حورہ عورتیں ہیں جو پاکیزہ صاف ستھری اور سفید رنگ کی ہوں گی ان کی سفیدی اور رنگ کی صفائی کی وجہ سے آنکھیں متحیر ہو جائیں گی۔ حور حوراء کی جمع ہے عین عینا، یعنی جمع ہے جس کا معنی بڑی آنکھوں والی ہے۔ طبرانی نے ابوامامہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حورین زعفران سے بنائی گئی ہے (1)۔ عقیلی نے اسی کی مثل حضرت انس سے مرفوع اور حضرت ابن عباس سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ مجاہد سے بھی اسی طرح روایت مروی ہے۔ ابن مبارک نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حورین کو مٹی سے پیدا نہیں فرماتا اللہ تعالیٰ انہیں کستوری کا فور اور زعفران سے پیدا فرماتا ہے (2)۔ ابن ابی الدنیانے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حور سمندر میں لعاب ڈالے تو اس کے لعاب کے مٹھاس کی وجہ سے سارا سمندر مٹھا ہو جائے (3)۔ ابن ابی الدنیانے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اگر حور زمین و آسمان کے درمیان اپنی مٹھلی باہر نکالے تو تمام مخلوق اس کے حسن کی وجہ سے اس کی فریفتہ ہو جائے اگر وہ اپنی اور حسنی نکالے تو اس کے حسن کے سامنے سورج ایک دیے کی صورت اختیار کر لے اور اس کی کوئی روشنی نہ رہے اگر حور اپنے چہرے کو باہر نکالے تو اس کا حسن زمین و آسمان کے درمیان گور و شن کر دے (4)۔

ہنا نے حبان بن اہلیہ سے روایت کیا ہے کہ جب دنیا کی عورتوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو انہیں اعمال کی وجہ سے حورین پر فضیلت دی جائے گی۔

يَذْعُونَ فِيهَا بِخُلُقٍ نَّكَالٍ وَأُولَئِكَ فِيهَا النَّبَاتِ وَالْوُجُوهُ الْأُولَىٰ
 وَوَقَّعَهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٠﴾ فَصَلِّ لِمَنْ مَّرَّ بِكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْقَوْدُ الْعَظِيمُ ﴿٥١﴾ فَإِنَّمَا
 يَسِيرُهُ يَلْسَانُكَ لَعَلَّهُمْ يَسْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ فَأَرْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُونَ ﴿٥٣﴾

”وہ منگولیا کریں گے وہ ہیں ہر جسم کا پھل اطمینان سے نہ چکھیں گے وہاں موت کا ڈانٹہ بجز اس پہلی موت کے اور اللہ نے بچا لیا ہے انہیں عذاب جہنم سے لے محض آپ کے رب کی مہربانی سے سبکی وہ بڑی کامیابی ہے (جس کی انہیں آرزو تھی) جس میں ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں لے سو آپ بھی انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں ۵۰“

۱۔ اس پھل کے قسم ہونے اور اس کی تکلیف سے وہ امن میں ہوں گے۔ یہ جملہ ایک اور حال ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو پھل بھی مٹھا یا کڑوا ہو گا وہ جنت میں بھی ہو گا یہاں تک کہ شبہ بھی ہوگا۔ ابن ابی حاتم ابن جریر اور عقیلی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں اس کے صرف نام ہیں۔
 ۲۔ یہ جملہ ایک اور حال ہے، یعنی وہ جنت میں موت کا ڈانٹہ نہیں چکھیں گے بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں گے یہاں مستحق منتقل ہے یا متصل ہے مٹھا۔ جس میں خیر آخرت کے لئے ہے اور موت آخرت کا پہلا مرحلہ ہے۔ یا ہاٹھمیر سے مراد جنت ہے اور میت موت کے ساتھ جنت

2- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (اعلیٰ)

1- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (اعلیٰ)

4- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (اعلیٰ)

3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (اعلیٰ)

سورہ جاثیہ

﴿ اسباق ۳۷ ﴾ ﴿ سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۲۵ ﴾ ﴿ مَرْكُوعَاتُهَا ۴ ﴾

سورہ الجاثیہ کی ہے، اس میں ستیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حَمْدٌ مَّا نَزَّلَ الْكِتٰبَ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِی خَلْقِكُمْ مَّوٰاِیِبًا مِّنْ ذٰلِکَ اٰیٰتٍ لِّعٰوْمٍ یُّؤْتُوْنَ

”حامیہ، اتار کی گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ آیتوں کی شکل آسمانوں اور زمین میں (اس کی یکتائی)، (قدرت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے اور (خود) تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو وہ پھیلا رہا ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔“

۱۔ آیتوں کو مبتدا بنایا جائے تو تنزیل الکتب اس کی خبر ہوگی اور اگر یہ حرف مقطعات ہوں تو اس صورت میں تنزیل الکتب مبتدا ہوگی اور میں اللہ العزیز الحکیم اس کی خبر ہوگی عزیز صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ انتقام لینے میں غالب ہے اور حکم صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ تدبیر میں حکمت والا ہے اگر حکم کو مبتدا بنایا جائے تو میں اللہ تنزیل کے متعلق ہوگا ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہم کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے اور تنزیل الکتب اس کی صفت ہے اور مابعد آیات اس کا جواب قسم ہیں۔

آسمان و زمین میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلائل کرتی ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت کا معنی وہی ہو جو ظاہر طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں یا اس کا یہ معنی ہوگا کہ ان کی تخلیق میں مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں جس طرح مابعد آیت میں ہے۔

۲۔ تمہیں نطفہ دے ہوئے خون اور گوشت کے لقمہ لے اور مکمل انسان کی صورت میں پیدا کرنے میں قدرت کی نشانیاں ہیں وَمَا یَلْبَسُ مِنْ ذٰلِکَ مَا عَطَفَ کَمُضْمِرٍ پُر کرنا بھی جائز ہے تاہم زیادہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ اس کا عطف خَلْقِكُمْ پر کیا جائے کیونکہ جانوروں کا زمین میں پھیلا ہوا ہونا اس کی مختلف اقسام کا ہونا اور ان چیزوں پر مشتمل ہونا جس سے انسان کی زندگی مکمل ہوتی ہے ان میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدانیت اور کمالات پر دلائل ہیں۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب نے آیات پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے جبکہ باقی قراء حضرات نے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم کے محل پر ہے۔ فرمایا ان دلائل سے دینی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور قیامت کے برحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

وَ اٰخْتِلَافِ الْبَیِّنِیْنَ وَ التَّهٰمِیْنَ وَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِزْقٍ فَاٰخِیَابِہِ

الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفَ الرِّيحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٥﴾

” نیز گردش ہل و نہار میں اور جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے رزق (کاسبب مینہ) پھر زمرہ کروا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے ادھر ادھر چلنے میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقلمند ہیں۔“

۱۔ موسم گرم اور موسم سرما کے آنے جانے یا رات اور دن کے آنے جانے آسمان سے رزق نازل کرنے زمین کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو سرسبز و شاداب کرنے اور ہواؤں کے رخ بدلنے میں عقل مند لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ربیع کو واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے جنس مراد ہوگی جبکہ باقی قراء نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ہوا مختلف سمتوں سے چلتی ہے جنہیں قبول دیور جنوب اور شمال کہتے ہیں۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب نے آیات کو تاری جہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نکل نصب میں ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف دو مختلف عاملوں کے معمولوں پر ہے وہ عامل فی اور ابتداء ہیں۔ یا انحصار کے طریقہ پر آیات کو نصب دی گئی ہے۔ یا محمی ضمیر مضمربے اور آیات مرفوع ہے کیونکہ یہ خبر ہے۔ امام بیضاوی نے کہا یہاں تین آیات کا اجتماع تین مختلف الفاظ پر کیا گیا ہے کیونکہ ان میں جو دلائل ہیں وہ وقت اور ظہور میں مختلف ہیں (۱) جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام کے محاسن کے اعتبار سے ہے ورنہ ایمان اور ایقان کا معنی ایک ہے کیونکہ عقل سلیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آسمان و زمین کے خالق پر ایمان لایا جائے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ قَوْمًا يُحَدِّثُكَ بَعْدَ اللَّهِ وَالتَّيْمُومُونَ ﴿٦﴾

” یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ پس وہ کون سی ایسی بات ہے جس پر وہ اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد ایمان لائیں گے۔“

۱۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ مبتداء اور خبر ہے تَتْلُوهَا عَلَيْكَ حال ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا صحتی ہے۔ یا یہ مبتداء کی دوسری خبر ہے بالحق، نفلوا کے فاعل سے یا مفعول سے حال ہے قَوْمًا يُحَدِّثُكَ بَعْدَ اللَّهِ جزا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فان لم تؤمنوا بآيات اللہ فیای حدیث بعد اللہ و آية یؤمنون۔ یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں پر ایمان نہیں رکھتے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرنے والے جو دلائل ہیں ان کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ کفار کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ابن عامر حمزہ کسائی ابو بکر اور یعقوب نے یُؤْمِنُونَ کو تَوْمِنُونَ پڑھا ہے۔ اس صورت میں غائب کے صیغہ سے خطاب کی طرف التفات ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَيَلِّ لِكُلِّ أَقْلَانِ آيَاتٍ ۖ لِّئَسْمَأُيْتِ اللَّهُ تَتْلُو عَلَيْكُمْ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن

لَمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٧﴾

” ہلاکت ہے ہر چھوٹے بکار کے لئے۔ جو سنتا ہے اللہ کی آیتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے پھر بھی وہ (کفر پر) اڑا رہتا ہے فرور کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں پس آپ اسے دردناک عذاب کا مزہ سنا دیں۔“

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ تَجْرِيًّا فَلَئكَ فِيهِ يَأْمُرُ بِالْوَلَّاتِ يَنْصُرُونَ وَفَصَلِّهِمْ
 لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٦﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ فِي السَّلْوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جِجِيعًا مِمَّا
 إِنَّمَا فِي ذَلِكَ لَآيَاتٌ لِقَوْمٍ يُتَفَكَّرُونَ ﴿٧﴾

”اللہ ہے جس نے سخر کر دیا ہے تمہارے لئے سمندر کو تاکہ رواں رہیں اس میں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ تم بجزی تجارت سے) تلاش کرو اس کا فضل اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کیا کرو۔ اور سخر کر دیا ہے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے بے شک اس (نظام) میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی سطح کو چکنا، ہموار بنایا لکڑی جیسی چیز اس کے اندر جانے کے بعد اس پر تیرنے لگتی ہے اور اس میں غوطہ لگانے میں کوئی رکاوٹ نہیں سمندر دُور یا کو اس طرح اسی لئے بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلتی رہیں اور تجارت غوطہ لگانے اور شکار کے ذریعے اس میں سے اپنا رزق کماؤں فصلیہ یہ تبغوا کے محذوف مفعول یہ سے حال ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ اس کا عطف یَسْتَبْغُوا ہے معنی یہ ہوگا تاکہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ اَللّٰهُ الَّذِي وَاَلَا جَمْلًا ن آيات کے ساتھ متصل ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا ذکر تمام میان میں مقرر فرماتے ہیں۔

۲۔ اس کا عطف سخر پر ہے معانی السَّلْوَاتِ سے مراد سورج، چاند ستارے پانی اور برف وغیرہ ہیں مافی الارض سے مراد حیوانات نباتات معدنیات چشمے اور تھریں ہیں۔ جمعاً یا تو تاکید ہے یا حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چند امور کے لئے انہیں سخر کیا جن کا نفع تمہیں ہی پہنچتا ہے منہ جا رہمرد ماموصلہ سے حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمہارے لئے سخر کیا یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے اللہ پر کام یہ ہوگی ہی جمعاً منہ یا یہ معانی السَّلْوَاتِ کی خبر ہے یا معانی الاثر میں کی خبر ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے زجاج نے کہا اس کا معنی ہے یہ سب اس کی طرف سے فضل ہے (۱)۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرتے ہیں ان کے لئے ان میں بڑی نشانیاں ہیں۔

قُلْ لِّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَعْفِرُوْا اللّٰثِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا
 كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦﴾ مِّنْ عَمَلٍ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِمْ ۗ وَ مِنْ اَسْءَآءِ فَعَلَيْهَا سُمْ اِلٰى
 بِرَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧﴾

”اے حبیب! فرمائیے اہل ایمان کو کہ درگزر کرتے رہیں ان لوگوں سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ اللہ خود بدل دے ہر قوم کو جو وہ کیا کرتے تھے۔ جو نیک عمل کرتا ہے پس وہ اپنے بھلے کے لئے کرتا ہے اور جو برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔“

۱۔ امام بغوی نے کہا کہ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے نقل کیا ہے کہ بنی غفار کے ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ

میں گالی دی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں (۱) تو اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا یہاں قول کا مقولہ حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جواب امر اس پر دلالت کرتا ہے جواب امر یغفور واسے معنی ہے بنے گا آپ انہیں کہیں کہ معاف کر دو اگر آپ انہیں معاف کر دینے کا کہیں گے تو وہ معاف کر دیں گے اور درگزر سے کام لیں گے۔ لکن یٰٰنِیْنَ لَا یُؤْتِجُزْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان ایام کی توقع اور خوف نہیں رکھتے جن میں ان پر مصیبت آ سکتی ہے یہاں اس سے مراد کفار ہیں۔ عربوں کے ہاں جنگ کے واقعات کو ایام العرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی کفار ان اوقات کا خوف نہیں رکھتے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی فتح اور ان کی جزاء کے لئے معین کر رکھا ہے۔ امام بخاری نے کہا قرظی اور سدیی نے کہا یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ ابھی انہیں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور مشرک انہیں سخت اذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (۲) پھر اس آیت کا حکم جہاد والی آیت سے منسوخ کر دیا۔ ابن عامر حمزہ اور کسائی نے لحنجوی جمع منکلم کا صیغہ پڑھا ہے تاکہ عظمت شان کا اظہار ہو، جبکہ باقی قراء نے واحد مذکر کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے واحد مذکر کا صیغہ جمہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں فعل مصدر کی طرف منسوب ہوگا۔ کسائی نے یہی قول کیا ہے۔ یہاں جزاء سے مراد وہ چیز ہوئی جس کے ساتھ جزاء دی جاتی ہے کیونکہ جب مفعول بہ موجود ہو تو پھر فعل کی مصدر کی طرف نسبت کرنا ضعیف ہوتا ہے۔ قوم سے مراد یا تو مومن ہیں پھر معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ مومنوں کو بدلہ عطا فرمائے گا کیونکہ وہ کفار کی اذیتوں پر صبر کرتے رہے ہیں یا قوم سے مراد کفار ہیں تو پھر معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کفار کو کامل جزاء دے گا۔ دنیا میں اس سے انتقام لینے کی وجہ سے ان کو سزا میں کوئی کمی نہیں کرے گا یا معنی یہ ہے دونوں قوموں کو ان کے اچھے برے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

۱۔ جو انسان اچھا عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے کیونکہ اس کا ثواب اسے ہی ملتا ہے اور جو بر عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی برا کرتا ہے کیونکہ اس کا برا انجام اسی کو کھانا ہوتا ہے۔ جب تم اپنے اعمال کی وجہ سے جزاء اور سزا کے مستحق بن جاؤ گے تو پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اگر اچھا عمل کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا اگر بر عمل کیا ہوگا تو سزا دے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَسَرَّاهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ وَ
فَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۰﴾ وَأَتَيْنَاهُم بَيْنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاسَاءتُمْ فَجَاءتْكُم مِّنَ اللَّهِ
بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيَابًا يَّبِينُهُمْ ۗ إِنَّ سَاءَ لَكُم مَّا كُنْتُمْ تَفْعَلُونَ ﴿۱۱﴾

”اور بے شک ہم نے عطا فرمائی بنی اسرائیل کو کتاب حکومت اور نبوت اور ہم نے ان کو پاکیزہ رزق دیا اور انہیں بزرگی دی (اپنے زمانے کے) اہل جہان پر۔ اور ہم نے انہیں دین کے معاملہ میں واضح دلائل دیئے ہیں آپس میں انہوں نے جھگڑا شروع نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ انہیں (حقائق) کا صحیح علم آ گیا محض باہمی حسد و عناد کے باعث یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔“

۱۔ یہاں اَلْمُكَلِّبُ سے مراد تو رات اُنکیل اور زور ہے۔ حکم سے مراد عطا اور بادشاہ ہیں، یعنی حکم والے عطا کئے۔ نبوت کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ بنی اسرائیل میں کثیر انبیاء ہو گزرے ہیں۔ پاکیزہ رزق سے مراد سن و سولگی اور دوسرے لذیذ کھانے ہیں اور انہیں اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوا۔ فَصَلَّيْتُمْ میں ہم صحیح بنی اسرائیل کی طرف اس اعتبار سے لوٹنے کی کہ ان میں سے بعض (انبیاء) کو اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان سے بڑھ کر کوئی معزز نہ تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان سے بڑھ کر کوئی محبوب تھا (1) اس آیت میں یہ دالالت موجود ہے کہ خاص بشر خاص فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

۲۔ پینٹ ہیں انصر سے مراد ایسے دلائل ہیں جو دین کو واضح کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے انہیں ان چیزوں کا علم حاصل ہو گیا جس کا جاننا اور اعتقاد رکھنا واجب تھا۔ ساتھ ہی انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی نشانیوں کا علم بھی حاصل ہو گیا۔ وہ آپ کو یوں پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ علم حاصل ہونے کے بعد انہوں نے دین کے معاملہ میں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختلاف محض رہنمائی حسد اور خواہش نفس کی غلامی کی وجہ سے کیا، ان کی مخالفت کسی قطعی دلیل کی طرف منسوب نہ تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اکثر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہونا کسی دلیل کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ وہ انہوں میں قطعہ کے مقابلے میں وہم کی بیروی کرتے تھے جس طرح معتزلے نے فلاسفہ کی بیروی کی، جبکہ ان کا گمان یہ ہے کہ کافی اور اکت کے لئے عقل کافی ہے جس طرح مجسمہ ہیں۔ انہوں نے کہا جو جو کاجسم ہوتا ہے یا نفسوں اور خاریجیوں کی طرح انہوں نے حسد اور عناد کی بیروی کی۔

دین کے معاملہ میں جو وہ اختلاف کرتے تھے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا مواخذہ کر کے اور ان کے اعمال کا بدلہ دے کر فیصلہ فرما دے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيحَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا
يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّهُمْ لَنُ يُعْنُوا عَنكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَاللَّهُ وَذِي الْمُتَّقِينَ ۝ هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝

”پھر ہم نے پختہ کر دیا آپ کو صحیح راہ پر دین کے معاملہ میں پس آپ اس کی بیروی کرتے رہیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی بیروی نہ کریں جو علم میں نہ ہیں، یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو قطعاً کچھ فائدہ نہ پہنچائیں گے۔ بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ہیزگاروں کا دوست ہے۔ یہ بصیرت افروز باتیں ہیں سب لوگوں کے لئے اور (باعث) ہدایت و رحمت ہے ان کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔“

۱۔ شریعت سے مراد صراطِ مستقیم اور حق کا راستہ ہے جن پر تمام رسولوں کو مبعوث کیا گیا۔ علی شریعتہ یہ جعلنا کا دوسرا مفعول ہے۔ امر سے مراد دین کا امر ہے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ حق کے راستہ کی اتباع کریں یہاں فاء سبب ہے وَلَا تَتَّبِعْ میں امر چھ خطاب ظاہر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد آپ کی امت ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ کی امت ان لوگوں کی اتباع نہ کرے جن کے پاس کتاب

الہی کا علم نہیں خواہ وہ جہل مرکب ہو جیسے فلاسفہ کا علم یا جہل سہیہ ہو جیسے قریش کے سرداروں کا علم یا ان لوگوں کے پاس کتاب الہی کا علم تو ہو لیکن انہوں نے کتاب پر عمل کرنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو یا انہوں نے اس میں جھوٹی اور غلط تاویلیں کر لی ہوں تو یاد و حقیقت میں کچھ علم بھی نہیں رکھتے جس طرح یہودیوں کے علماء اور گمراہ فرقوں کے علماء خواہ ان کا تعلق مسلمانوں سے ہی کیوں نہ ہو۔

جے دو لوگ جو آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ حق کا راستہ چھوڑ کر ان کی اتباع کریں اگر آپ ان کی اتباع کریں گے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے جن اللہ جبار مجرور شہینا سے حال ہے اور شہینا، مفعول بہ ہے یا بھیجا یعنی کا مفعول مطلق ہے من عذاب اللہ میں من بعضیہ ہے اور یہ مکمل جملہ لاکتشفیحی علت بیان کر رہا ہے۔

ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اس لئے انہیں اپنا دوست نہ بنائیں کیونکہ باہم اکٹھے ہونے کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہوتا ہے (جبکہ وہ ظالم ہیں اور تم ظلم سے دور رہتے ہو) اللہ تعالیٰ ستمیوں کا دوست ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور شریعت کے احکام کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں جملے اس قول سے کنایہ ہیں کہ وہ آپ کو کچھ نقصان نہیں دے سکتے کیونکہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پر بیزار گاروں کا دوست ہے ان دونوں دوستیوں میں کتنا فرق ہے اللہ تعالیٰ کی دوستی قوی ہے اس لئے وہ ظالم آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

اس ام اشارہ سے مراد قرآن یا شریعت کی اتباع ہے، یعنی اس میں ایسے اسباب ہیں جو لوگوں کے لئے دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی کی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں اس میں گمراہی سے ہدایت اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والی قوم کے لئے رحمت ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَالْبَحْرُ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

”کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنادیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ یکساں ہو جائے ان (دونوں) کا جینا اور مرنا بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور پیرا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس کو جو اس نے کیا اور ان پر (قطعاً) ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

۱۔ اس جملہ کا عطف ہذا بصلان پر ہے۔ ام ملاحظہ۔ ہے اس میں ہمزہ انکار اور شرمندہ کرنے کے لئے ہے اور ام ضربا کے معنی میں ہے آیت کا معنی یہ ہوگا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ قرآن سرابا ہدایت ہے بلکہ جنہوں نے گناہ کئے وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح بنادیں گے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے۔ کالذین آمنوا یہ جعل کا دوسرا مفعول ہے۔ یہ آیت مشرکین کہہ کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ مومنوں سے کہتے تھے جو تم وہ بارہ زندہ کئے جانے کے بارے میں کہتے ہو اگر وہ حق ہے تو تم آخرت میں بھی تم سے فضیلت رکھنے والے ہوں گے جس طرح ہم دنیا میں تم سے بہتر حالت میں ہیں۔ حمزہ، کسائی اور محض نے سو اہل مکتوب پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ کالذین آمنوا سے بدلہ اشتمال ہے یا یہ حال ہے یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے مکتوب ہے اور کالذین آمنوا سے بدلہ اشتمال ہے۔ سو اہل مکتوب پڑھا ہے۔ دونوں ضمیریں پہلے ام موصول کے لئے ہیں اگر دونوں ضمیریں دوسرے ام موصول کے لئے

ہوں گی تو پھر سوا دوسرے ام موصول سے حال ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہوں تو سوا، کائناتیں اَشْتَا سے بدل ہوگا یا دوسرے ام موصول کی پاپلی کی ضمیر سے حال ہوگا۔ باقی قراء نے سوا کو مرفوع پر حابے کیونکہ یہ خبر مقدم ہے اور مَفْعِلًا مَعًا اَتَتْهُمْ مبتدا ہے اور جملہ دوسرے مفعول سے بدل ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ مفعول ثانی ہو یا یہ جملہ مستأنف ہو اور اس انکار کا تقاضا کرنے والا امر کی وضاحت کرتا ہے یا یہ حال ہے اور ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ موت کے بعد وہ دونوں برابر ہوں یا مواخذہ نہ کے جانے میں برابر ہوں جس طرح وہ دنیا میں رزق اور رحمت میں برابر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں اور جملہ مستأنف ہے۔ معنی یہ ہوگا مومن دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا محبت اور محبوب ہوتا ہے، جبکہ کافر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہوتا ہے۔

وہ مساوات کا جو فیصلہ کرتے ہیں وہ کتابی براہوت ہے امام بغوی نے کہا اس وقت نے کہا اہل مکہ کے ایک آدمی نے مجھے کہا یہ تیرے بھائی حیم داری کی قیام گاہ ہے اللہ کی قسم ایک رات صبح ہو چکی تھی یا صبح ہونے والی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے آیت پڑھتے تھے رکوع کرتے سجدہ کرتے اور رور ہے تھے اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَنْتَظِرُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبُطَنَّهُمْ مَا لَمْ يَكُنْ لِيَنْتَظِرُوا وَعَمَلُوا الصَّالِحَاتِ (1)۔

اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو خلق کے ساتھ پیدا کیا تاکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت اور صفات کمال پر دلالت کریں گویا یہ مذکورہ امور پر دلیل ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو فضول پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی یہ شان اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلائے، گناہ گار اور نیکوکار میں فرق کرے اور اگر دنیاوی زندگی میں انہیں ایسا ہوا تو موت کے بعد ضرور ایسا ہونا چاہیے۔ نتیجہ جی کا عطف بالحق پر ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے یا اس کا عطف محذوف علت پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ لوگ اس کے ذریعے صانع اس کی قدرت اور اس کے عدل پر استدلال کریں اس کی اطاعت پر قائم رہیں اور ہر نفس کو اچھے برے عمل کی جزا دی جائے گی۔ نہ ان کے ثواب میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی ان کے عذاب میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہاں اسے ظلم کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل بھی ظلم نہیں۔ اس میں مشاکلہ کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور یہ فعل کرتا تو یہ ظلم ہوتا جس طرح ابتلاء اور اختیارات اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور سے صادر ہوتے ہیں ظلم ہوتا ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَصَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمِهِ وَحَتَمَ عَلَىٰ سَعْيِهِ وَقَلْبِهِ

وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غَشَاةً فَن يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿١٠﴾

”ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنا لیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ پس کون ہدایت دے سکتا ہے اسے اللہ کے بعد (لوگو!) کیا تم غور نہیں کرتے!۔“

۱۔ قاء عاظف ہے۔ اس جملہ کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ اللہ پر کلام یہ ہوگی اتھم ان قہدیہم فرایت۔ من شرطیہ ہے، اتخذه اول جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر شرط ہے جس وجہ سے رایت معلق ہو گیا ہے فَمَنْ يَهْدِيهِ يَشْرُطُ کی جزاء ہے، اتخذه اول معطوف اول ہے اور اللہ مفعول ثانی ہے۔ معنی یہ ہوگا اس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کو چھوڑ

دیا اور منہیات سے اعراض کرنا ترک کر دیا، اپنی خواہشات کی بیروی کی گویا اس کو اپنا معبود بنا لیا۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت حسن اور قتادہ نے کہا وہ کافر ایسا ہے جس نے اپنا دین اپنی خواہشات کو بنا لیا وہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا مگر اسے اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کما حقہ یقین نہیں رکھتا اس لئے ڈرتا، نہیں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہوتی ہیں انہیں حرام نہیں جانتا۔ دوسرے علماء نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنا معبود خواہش نفس کو بنا لیا ہے۔ اس کا نفس جو خواہش کرتا ہے تو وہ اس کی عبادت کرنے لگتا ہے (1) ابن جریر اور ابن منذر نے یہی روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے سعید بن جبیر کا ایسا قول ذکر کیا ہے کہ عرب چتر سونے اور چاندی کی عبادت کرتے تھے اگر وہ پہلے سے خوبصورت چتر کو دیکھتے تو پہلے چتر کو پھینک دیتے اسے توڑ دیتے اور دوسرے کی عبادت کرنے لگ جاتے (2) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ امام شعبی نے کہا خواہش کو ہوی اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ خواہش کرنے والے کو جنہم میں گمراہ دیتی ہے (3)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کمر اہی کو مقدر کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی گمراہی اور استعدا کے فساد کو جانتا تھا، ایک قول یہ کیا گیا کہ اس انسان کی تخلیق سے پہلے اس کے علم میں تھا کہ یہ انسان گمراہ ہو جائے گا۔ امام احمد نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے جسے لوگ حضرت ابو عبد اللہ کہتے آپ کے ساتھی حضرت ابو عبد اللہ کی عبادت کرنے کے لئے آئے، جبکہ آپ رورہے تھے۔ ساتھیوں نے پوچھا کیوں روتے ہو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ نہیں فرمایا تھا اپنی مونچھیں کاٹ لو پھر اس پر ثابت قدم رہو یہاں تک کہ مجھے ملو تو ابو عبد اللہ نے کہا میں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دائیں ہاتھ میں ایک مٹی بھری اور بائیں ہاتھ میں دوسری مٹی بھری فرمایا یہ (دائیں) اس (جنت) کے لئے ہیں اور یہ (بائیں) اس (جہنم) کے لئے ہیں مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں اب میں کچھ نہیں جانتا کہ میں کس مٹی میں سے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے اس لئے وہ نہ نصیحت کو سنتا ہے اور نہ آیات میں غور و فکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں پر پردہ ڈال دیا ہے اس لئے وہ ہجرت کی نظر سے آیات میں نظر و فکر نہیں کر سکتا، حمرہ نے عشوہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قرآن نے عشوہ پڑھا ہے یہ بھی جائز ہے کہ من موصول ہو اور وہ صلہ کے ساتھ مل کر آیت کا مقبول اول ہو اور اس کا دوسرا مقبول مخدوف ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ اَرَأَيْتُمْ تَهْتَدُونَ۔

فہم بھدی کا عطف وایت پر ہے۔ اس میں استنبہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا جب اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں گمراہی کو مقدر کر دیا ہے تو اب اسے کوئی ہدایت عطا نہیں فرمائے گا اور افرایت والا جملہ جملہ مترغہ ہوگا۔ اَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ کا عطف مخدوف کلام پر ہو گا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَلَا تَعْقِلُونَ۔ فَلَآ تَذَكَّرُونَ۔

ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ دور جاہلیت میں لوگ یہ کہا کرتے تھے رات دن ہمیں ہلاک کر دیتے ہیں (4) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْدِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا نَهْمُ

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (اتحادیہ)
2- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (اتحادیہ)
3- الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 758 (الاعلیٰ)
4- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (اتحادیہ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ لَكُمْ فَايِدٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ هُمْ اِلَّا يَظُنُوْنَ ﴿٥١﴾

”اور وہ کہتے ہیں نہیں (کوئی دوسری) زندگی بجز ہماری دنیا کی زندگی کے (نہیں) ہم نے مرنا اور زندہ رہنا ہے اور نہیں مٹا کرتا ہمیں مگر زمانہ حال کا۔ انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض تخن (و تخمین) سے کام لے رہے ہیں۔“

۱۔ اس نیکل کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی کافر اپنی خواہشات کی اتباع کر کے گمراہ ہو گئے اور انہوں نے یہ کہا کہ زندگی تو صرف دنیاوی زندگی ہے جس میں کسی وقت ہمیں موت آ سکتی ہے اور کسی وقت ہم زندہ ہوتے ہیں، اس میں زندگی کو دنیاوی زندگی پر محدود کرنے کا بیان ہے۔ یہاں مَمْنُوْتُ وَ مَمْنُوْتُ کے الفاظ اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک زندگی موت کے بعد ہوتی ہے کہ وہ صرف جِن کے معنی پر دلالت کرتی ہے، ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔ زجاج کا یہی قول ہے وَمَمْنُوْتُ مَمْنُوْتُ وَ مَمْنُوْتُ پر ہے، یعنی زمانے کا گذرنا انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور اسے موت آ جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے۔ دھر کا لفظ اصل میں اس مدت کو کہتے ہیں جو عالم کی پیدائش سے لے کر عالم ختم ہونے تک محیط ہوتا ہے پھر ہر طولی عمر کو بھی دھر کہہ دیتے ہیں۔ زمانہ کا اطلاق چھوٹی بڑی دونوں مدتوں پر ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی علم نہیں کیونکہ علم یا تو بدیہی طور پر حاصل ہوتا ہے یا برابن کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں بلکہ دلیل تو اللہ تعالیٰ کے وجود پر قائم ہے جو حکیم بھی ہے اور قادر بھی ہے۔ یہ جملہ قائلو کے ناعلم سے حال ہے۔ وہ علم اور دلیل کے بغیر ہی فیصلہ کے جا رہے ہیں۔ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دھر کو گالی نہ دو کیونکہ اللہ ہی زمانہ (زمانہ کو پھرنے والا) ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (1) امام بغوی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم تو یہ نہ کہا کر اے زمانہ کی تباہی و بربادی کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں، رات دن میں ہی بھیجتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو اسے قبض کر لوں (2) حدیث کا معنی یہ ہے تم میں سے جب کوئی زمانہ کو گالی دیتا ہے تو اس کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حادثات اور مصائب لانے والا زمانہ ہے، جبکہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہوتا ہے، کوئی اور چیز اس میں مؤثر حقیقی نہیں تو تمہاری زمانے کو گالیاں اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافر مان فان اللہ هو اللہہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانے اور زمانے میں جو حکیم ہے اس کو پیدا فرمانے والا ہے تو تمہارا زمانے کو گالی دینا تمہارے اس گمان کے مطابق ہے کہ زمانہ انہیں پیدا کرتا ہے تو یہ شرک ہو گیا اس لئے ایسی بات کرنے سے اجتناب کرو۔

وَ اِذَا شِئْتُمْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانُ حُجَّتْهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا اِنَّا بَاۤسِمًا اِنْ

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٥٢﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْعَلُكُمْ اِلٰىٰ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

لَا رٰبِيبَ فِيْهِ و لٰكِنَّا اَكْثَرُ النَّٰسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٣﴾

”اور جب یہ کہہ سنائی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تو (ان کے جواب میں) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ لے آؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو، فرمایا اللہ نے زندہ فرمایا ہے

اللہ مجھے معاف کر دے میں اپنے سوا کسی کے بارے میں تجھ سے سوال نہیں کرتا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ائمہ جاہلہ روزِ قیامت جماعت یہ جو بے شوق ہے جس کا معنی جماعت ہے۔ جزری نے نہایت ہی محنت سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے ان الناس بصیرون یوم القیامتہ جناء جناء کو جہتی بھی روایت کیا گیا ہے جو جاہل کی جمع ہے، یعنی قیامت کے روز اپنے اپنے نی کے پیچھے جماعت در جماعت چل رہے ہوں گے۔ جب یہ جاہل کی جمع ہو تو پھر اس کا معنی ہوگا وہ گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا ہے۔ عبد اللہ بن احمد نے زوائد زبد میں اور بیہقی نے عبد بن ثانیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گو یا میں تمہیں جہنم سے پرے کر کے مقام پر اکٹھے دیکھ رہا ہوں پھر سفیان نے اس آیت کی تلاوت کی وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَانِبِ غَابِطٍ (2) ابن حجر نے کہا یہاں کرم سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔

یعقوب نے كَلَّمَ اُمَّةً کے معنی میں مکتوب پڑھا ہے کیونکہ یہ پہلے كَلَّمَ اُمَّةً سے بدل ہے یا اس کی تاکید لفظی ہے اور ما بعد اس کی صفت ہے یا یہ توری کا دوسرا مفعول ہے، جبکہ جمہور قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور و تَرَىٰ عَلٰی رِاسِ الْكَلْبِ اس کی خبر ہے یعنی اسے اپنے اعمال کے عینوں کو پڑھنے کی دعوت دی جائے گی جس طرح فرمان باری تعالیٰ ہے اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۗ كَلَّمٰ سُلَيْمٰنَ وَتَبٰرَكَ اَلَيْهٖ مَا عَدٰتُكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾ حضرت انس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں۔ جب حشر پڑھا ہوگا اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا۔ وہ دائیں بائیں ان عینوں کو اڑائے گی۔ اس میں سب سے پہلی تحریر ہوگی اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۗ كَلَّمٰ سُلَيْمٰنَ وَتَبٰرَكَ اَلَيْهٖ مَا عَدٰتُكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾ اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اَلَيْهٖ مَا عَدٰتُكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾ والا جملہ یا تَوَكَّلْ اَلَيْهٖ مَا عَدٰتُكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾ دوسری صفت ہے یا دوسری خبر ہے اور اس سے پہلے قول مخدوف ہوگا۔ اَلَيْهٖ مَا عَدٰتُكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾ اللہ بکلام یہ ہوگی اِقْرَأْ كِتَابَكَ صَبِيًۡٔا ﴿۱۰﴾

هٰذَا كِتٰبُنَا يٰطٰٓئِفُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنبُِٔكُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱﴾
 فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَدِّعُ اٰلِهٖمُ رَحْمٰتِهٖ ۗ ذٰلِكَ هُوَ
 الْغَوْرُ الْمُبِيۡنُ ﴿۱۲﴾ وَ اَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوْا ۗ اَقَلَّمْ تَكُنَّ اَلْبَتٰى تُشَلٰى عَلَيْكُمْ
 فَاَسْتَبْرٰتُمْ وَاَسْتَبْرٰتُمْ وَاَسْتَبْرٰتُمْ فَاَسْتَبْرٰتُمْ وَاَسْتَبْرٰتُمْ ﴿۱۳﴾

”یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ ہم لکھ لیا کرتے تھے جو تم (دنیا میں) عمل کیا کرتے تھے۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا یہی وہ روشن کامیابی ہے۔ اور جو لوگ کفر کرتے رہے (ان سے پوچھا جائے گا) کیا میری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں پھر تم (سن کر) تکبر کیا کرتے تھے اور تم لوگ (عادی) مجرم تھے۔“

یہ تمہارے نامہ اعمال ہیں جن کو ہمارے حکم سے کرنا کا تین نے لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے ان اعمال کو لکھا ہے اس لئے کتاب کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی۔ کِتَابُنَا یہ ہڈی کی صفت ہے اور خیر یَطِیْقُ عَلَيْكُمْ ہے، یعنی جو کچھ تم اعمال کرتے رہے ہو اس کے بارے میں یہ صحیفے صحیح گواہی دیں گے یا کِتَابُنَا اور یَطِیْقُ عَلَيْكُمْ دونوں اسم اشارہ کی خبر ہیں یا یَنْطِقُ حَال ہے اور اس میں

عالم اسم اشارہ کا معنی ہے بالحق یعنی سچائی کے ساتھ۔ نہ اس میں اضافہ ہوگا اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی۔ جو تم عمل کیا کرتے تھے ہم فرشتوں سے لکھوا لیتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تَشْتَشِبُ لِحْمًا مَعْنَى ہے ہم نسل لے لیتے ہیں اس کی صورت یہ تھی کہ فرشتے انسانوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں لے جاتے جن اعمال پر ثواب اور عقاب مرتب ہوا اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھتا اور لغو عمل ختم کر دیتا جس طرح عربوں کا قول ہے ہلم و اذهب یہ جملہ لفظ کی علت بیان کر رہا ہے۔

۷۔ یہ جملہ الیوم تجزونہ کی تکفیل ہے۔ اس کی رحمت میں جنت بھی شامل ہے الْفَوْزُ الْفَيْضُ ہے مراد ظاہر کا مینا یہ ہے کیونکہ وہ ہر آمیزش سے پاک ہے۔

۸۔ اَلْقَلَمُ ثَقُلٌ مِّنْ مَّزْمَرَةٍ کے انکار کے لئے ہے اور جس چیز کی نفی کی جارہی ہے اسکو ثابت کرتا ہے۔ اظہم میں فاء عاطفہ ہے۔ ما بعد جملے کا عطف کلام مجزوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الم یا تکم و سلسلی فہم تکن ایاتی تعلق علیکم اس سے پہلے قول اور معطوف حذف کر دیا گیا اور کلام سے جو مقصود تھا اسی پر اکتفاء کیا گیا اور قرینہ کی وجہ سے اس کلام کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

یعنی کیا تم پر ہماری آیات عطاوت نہ کی گئی تھیں تو تم نے ان پر ایمان لانے سے تکبر کیا تھا۔ تم ایسی قوم ہو کفر اور جرم کرنا جن کی عادت ہے۔ مقابلہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی و اما اللدین کفروا فیدخلکم ربہم فی غضبہ اس کے غضب میں سے جہنم بھی ہے لیکن کلام کو اس کی طرف پھیر دیا گیا۔ مقصود یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس پر آمادہ کیا جائے۔

وَ اِذَا قِيْلُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا سَرِيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنَّ يُّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِيْنَ ۝۱۱ وَ يَدَّ اِلَيْهِمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوْا وَاَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۱۲ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنصَلُكُمْ كَمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اَوْ مَا لَكُمْ الْاِثْمُ وَاَمَّا لَكُمْ فَمَنْ تَصْرِیْبٌ ۝۱۳

”اور جب (تمہیں) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں تو تم (بڑے غرور سے) کہتے ہو تم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہمیں تو یونہی ایک گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں اس پر (قطعاً) یقین نہیں ہے اور ظاہر ہو گئے ان کے لئے بڑے نتائج ان کے کرتوتوں کے اور (ہر طرف سے) گھیر لیا انہیں اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور (انہیں) کہہ دیا گیا آج ہم تمہیں فراموش کر دیں گے جس طرح تم نے فراموش کیے رکھا اپنے اس دن کی ملاقات کو اور تمہارا ٹھکانہ نہ آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

۱۱۔ اس جملے کا عطف استکبر تم پر ہے، یعنی جب تمہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے۔ یہاں وعدہ سے مراد موعودہ (اہم مفعول) ہے یا اس سے مراد صدر ہے یا وعدہ جس کے ساتھ متعلق ہے، یعنی دوبارہ اٹھنا حق ہے اور ضرور ہو کر رہے گا۔ حمرہ نے الساعۃ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کا عطف ان کے اسم کے فعل پر ہے، یعنی قیامت ضرور واقع ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بار سے میں خبر دے اس کے خلاف ہونا محال ہے تو تم نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ان کا یہ قول قیامت کو عجیب و غریب جاننے کی وجہ سے تھا اور کہا ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں ہمیں کچھ یقین نہیں۔ ظن کو ثابت کرنے اور باقی ماندہ چیزوں کی نفی کے لئے یہ کلام کی گویا یہ کہا ہم تو محض گمان رکھتے ہیں یا باقی چیزوں سے ظن کی نفی کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا۔ ظن کو

کہو اس لئے ذکر کیا تاکہ اس کی حقارت کا بیان ہو۔ یعنی یہ سبے گا ہم وہم کے مرتبہ والا گمان رکھتے ہیں کیونکہ ظن کا اطلاق بعض اوقات علم پر بھی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ آلَ الْكَافِرِينَ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ وَمَن يُضِلُّ لَن يُضِلَّهُ لَشَدِيدِ الْعَذَابِ** (سورۃ بقرہ: ۲۶)۔ پہلے ظن سے مراد علم ہے اور دوسرے ظن سے مراد وہم ہے ظن کی لٹی کو **وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْتَبِينَ** کے ساتھ منو کیا۔

۷۔ دنیا میں جو وہ اعمال سیدہ کرتے رہے ان کی قباحت ظاہر ہوئی یا انہوں نے جو اعمال کئے ان کی جزاء ظاہر ہوئی۔ اس کا عطف سابقہ جملہ کے مضمون پر ہے، یعنی جنہوں نے نظر لکھا اللہ تعالیٰ اپنے غضب میں داخل کرے گا اور ان کے لئے اپنے اعمال کی جزاء ظاہر ہوئی اور استہزاء کی جزاء بھی ان پر نازل ہوگی۔

۸۔ اس جملہ کا عطف بد الہم پر ہے۔ آج ہم تمہیں عذاب میں اس طرح چھوڑ دیں گے جس طرح ایک بھلائی مٹی چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے جس طرح تم نے اس دن کی تیاری کو بھلا دیا تھا اور تم نے اس کی کوئی پروا نہ کی تھی۔ لہذا یہ یوم کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح صدر کی اضافت طرف کی طرف ہوتی ہے، یعنی تم اپنے رب کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے یا تم اپنے اعمال کی جزاء کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے تب ہمارا تمکان جہنم ہے اور کوئی ایسا مددگار نہیں ہوگا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دے یہ دونوں جملے یا تو قبل متوال کے معطوف ہیں یا ناسبا کم کے مفعول ہے۔ یہ حال ہیں۔

ذُلِّمْتُمْ بِأَعْمَالِكُمْ أَتَّخَذْتُمُ اللَّهَ هُزُوًا وَ عَدَّيْتُمْ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا قَالِيَوْمَ لَا يَخْرُجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يَسْتَعْتَبُونَ ﴿٦٠﴾ قَلِيلًا الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾

”یہ اس لئے کہ تم نے بنا کر تھا اللہ کی آیتوں کو مذاق اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا تمہیں دنیاوی زندگی نے پس آج وہ نہیں نکالے جائیں گے آگ سے اور نہ انہیں تو بہ کر کے اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ پس اللہ کے لئے ہیں سب تعریفیں جو رہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا (اور وہی) سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ اور فقط اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا حکمت والا ہے۔“

۹۔ عذاب میں تمہیں اس لئے چھوڑا جا رہا ہے کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے بارے کوئی سوچ و بچار نہیں کرتے تھے۔ یہاں ہزو اور اہم مفعول کے معنی میں ہے۔ دنیاوی زندگی نے تمہیں دھوکا دیا، یعنی تمہارا یہ گمان تھا کہ دنیاوی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں اور نہ ہی کوئی حساب ہوگا۔ یہ جملہ آخر تک جملہ متاثر ہے حمزہ اور کسائی نے **يَخْرُجُونَ** کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قرآن نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا عطف اما الذین کفروا پر ہے اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ تو یہ کر کے اپنے رب کو راضی کریں کیونکہ اب تو یہ وقت گزر چکا ہے۔ یہ عقلی ہے ششقی ہے جس کا معنی رضائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ اس کی رضا اعمال سے حاصل کی جاسکتی ہے، جبکہ اس کا زمانہ گزر چکا ہے۔ نہا میں عقلی کا معنی گناہ سے لوٹنا ہے۔ امام بخاری نے کہا ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی

اطاعت کی طرف پلٹ آئیں (1) مسند الیہ کو مقدم کرنا، جبکہ خبر جملہ فعلیہ ہے یہ تخصیص پر دلالت کرنے کی وجہ سے ہے کیونکہ کفار سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جبکہ مومنوں کا معاملہ مختلف ہے۔

ع۔ ایمان لانے والوں اور جھٹلانے والوں میں وعدہ کو پورا کرنے کا وصف جمیل صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے
 تَرَبُّتِ الْغُلَامِیْنَ لَفْظِ اللّٰهِ سے بدل ہے۔ لفظ رب کو مکرر ذکر کیا کیونکہ ہر چیز کی پرورش اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل نعت ہے جو اس کے کمال پر دل ہے۔ ان مرض اور الشُّمُوْبِ میں حرف عطف کا ذکر کیا مقصود ان دونوں میں مغایرت کو بیان کرنا ہے، جبکہ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے پہلے حرف عطف ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں معنی کے اعتبار سے متحد ہیں کیونکہ زمین و آسمان کا نبات کے عظیم افراد میں سے ہیں گویا یہ دونوں عالمین کے معنی میں ہیں۔

ع۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے آثار زمین و آسمان میں ظاہر ہیں یا کہا جاسکتا ہے کہ طرف حمزہ کے متعلق ہے۔ معنی ہوگا زمین و آسمان والے یہاں فیصلہ کرتے ہیں وہ غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں اور نہ ہی کسی کے لئے جائز ہے کہ اس پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور اس نے جو بھی اعزازہ لگایا اور فیصلہ کیا اس میں حکمت کا اظہار کیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار (تہ بند) ہے ان میں کسی نے مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔ امام مسلم نے اسے روایت کیا (1)۔

www.muhammadiyah.com

سورة الاحقاف

﴿سورة الاحقاف ۲۵﴾ ﴿سورة التكاثر ۲۶﴾ ﴿سورة علقا ۳﴾

سورة الاحقاف کی ہے، اس میں پینتیس آیات اور چار کوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حَمَّ ۞ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۞ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى ۞ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنزِلُوْا
مُعٰوِضُوْنَ ۞ قُلْ اَسْرٰءِیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَسْرُوْا فِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنْ
الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۞ اِیْمُوْنِیْ یَكْتَسِبُ مِنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَشْرَکُوْ
قَبْلَ عَلَمِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۞

”حامیم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب بہت دانا ہے۔ نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور مدت مقررہ تک اور کفار اس چیز سے جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے روگردانی کرنے والے ہیں اسے فرمایے (اے کفار) کبھی تم نے (خور سے) ادکھا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو (بھلا) مجھے بھی تو دکھاؤ جو پیدا کیا ہے انہوں نے زمین سے یا ان کا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ حصہ ہے۔ لاؤ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے اتری ہو یا کوئی (دوسرا) علمی ثبوت اگر تم بچے ہو۔“

اس کی تفسیر سورۃ حاشیہ میں گزر چکی ہے۔

ہم نے آسمانوں زمین اور ان کے درمیان جو مخلوق بھی پیدا کی ہے وہ حق کے ساتھ پیدا کی۔ وہ مخلوق صالح کے موجود ہونے، اس کے قدیم ہونے اور اس کے حکیم ہونے پر دلیل ہے نیز جزاء کے لئے دوبارہ اٹھانے کے برحق ہونے پر دلیل ہے جس طرح حکمت اور عدل کا تقاضا ہے ان کے لئے وقت مقرر کر دیا گیا جس وقت کے آنے پر زمین و آسمان ختم ہو جائیں گے اس اجل سے مراد یوم قیامت ہے۔ عَمَّاۤ اُنزِلُوْا میں ماصدقہ ہے یا ماصولہ ہے۔ ماصدقہ ہو تو معنی ہوگا جنہوں نے انزاکا انکار کیا۔ ماصولہ ہو تو معنی ہوگا قرآن میں قیامت کے دن کے جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس کا انکار کیا۔ وہ اعراض کرنے والے ہیں، وہ سوچ و پیمانہ نہیں کرتے کہ یہ عذاب عقل کے اعتبار سے جائز ہے اور نقلی دلیل سے بھی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ اس کے بارے میں اس نے بتایا جسے معجزات کی شہادت نصیب ہے۔ وہ اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بغیر کسی دلیل کے اور چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔

اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کفار کو بوجھے بتاؤ جن چیزوں کی تم پوجا کرتے ہو کیا انہوں نے کسی چیز کو پیدا کیا ہے؟ اگر پیدا کیا ہے تو

مجھے دکھاؤ اور ہم میں ہمزہ تفریح کے لئے ہے، یعنی مخاطب کو اس بات پر برا بھلا سمجھنے کیا کہ وہ اقرار کریں۔ **عَمَّاذًا لِّمَن لَّكُوا** میں ما استغفہم یہ محل نصب میں ہے جو مخلوق کا مفعول ہے۔ یہ یا یہ محل رفع میں ہے اور اسی شے کے معنی میں ہے۔ **وَمِنَ الْآثَرِ** یہ ماہ کا بیان ہے **أَفَرَأَيْتُمْ شَيْءًا مِّنَ امْرِئٍ مَّقْطُوعٍ** ہے۔ معنی ہوگا بلکہ انہیں آسمانوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشارکت حاصل ہے **فَمَا لَتَأْتِيَهُنَّ مِنَ دُونِ اللَّهِ سَعْدٌ مَّوْجُودٌ** بل کہ انہیں اول سے اور اورونی والا جملہ دوسرا مفعول ہے۔ معنی یہ ہوگا ہے معبودوں کی حالت میں نور ٹکر کر کے بنانا یا عقل فیصلہ کرتی ہے کہ ان بتوں نے کائنات کی کوئی چیز پیدا کی ہے یا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی چیز کے بنانے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہیں، یعنی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تو پھر تم یہ کیسے فیصلہ کرتے ہو کہ یہ بت مستحق عبادت ہیں۔ آسمانوں کی تخلیق میں شریک کی تخصیص اس لئے کی کیونکہ بعض لوگوں کا وہم ہے عالم غلی (زمین) میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں عالم علوی (آسمان) کا عمل دخل ہوتا ہے تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آسمان کی تخلیق میں ان بتوں کا کوئی عمل دخل ہے۔ جب ان کا عمل دخل نہیں تو یہ کس طرح عبادت کے مستحق بن سکتے ہیں۔

میرے پاس ایسی کتاب لے آؤ جو شریک کی دعوت دیتی ہو، جبکہ قرآن تو توحید کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے بارے میں اظہار کرتا ہے۔ امام احمد نے حضرت ابن عباس سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے **أَذْأَنْتُمْ تَقْبَلُونَ عَمَلًا كَمَا مَعْنَى كَيْفَ** یعنی علم سے کبھی ہوئی چیز (1) مجاہد اور حکمران نے انکار کا معنی روایت کیا ہے۔ قواد نے اس کا معنی خاص کیا ہے۔ کبھی ہے اس کا معنی باقی ماندہ ہے۔ قاسموس میں ہے الاثر یعنی باقی ماندہ شے (2)۔ علم غلی یعنی پہلے انبیاء کے علم ہے جو حقیقی کی طرف منسوب ہو اور وہ کلام شریک پر دلالت کرے۔ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ **إِنْ لَّمْ تَكُنْ صِدْقًا فَبَيْنَ شَرْطٍ** ہے جو جزاء سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سابقہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے، یعنی عقلی اور نقلی کوئی ایسی دلیل نہیں جو ان بتوں کے مستحق عبادت ہونے پر دلالت کرے۔

**وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ
وَهُم عَنْ دُعَائِهِمْ غَفُلُونَ ۝ وَإِذَا حُيِمَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا
بِعِبَادَتِهِمْ كُفْرِينَ ۝**

”اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بد بخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا اور وہ اس کے پکارنے سے ہی غافل ہیں، اور جب جمع کئے جائیں گے لوگ (روزِ محشر) تو وہ معبودان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔“

اس جملے کا عطف قول کے مقولہ پر ہے، یعنی اس آدمی سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتا ہے اور ان سے حاجات طلب کرتا ہے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دیں گے، یعنی جب وہ بتوں کو بلا تا ہے بغرض اعمال گمراہان کی آواز سن بھی نہیں تب بھی وہ ان کی حاجت پوری نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے معانی کو نہیں جانتے اور نہ ان کی مصطلحوں کی رعایت کر سکتے ہیں کیونکہ جو معبود انہوں نے بنائے ہیں یا تو معبود، عمادات ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ ہی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں یا ایسے اللہ کے بندے ہیں جو اللہ کے حکم کے تابع ہیں اور وہ اپنے احوال میں مصروف جس طرح حضرت عیسیٰ حضرت عزیر اور فرشتے۔

۱۔ اس جملے کا عطف لایستغیب پر ہے، یعنی جب قیامت کا دن ہوگا تو یہی معبودان عبادت کرنے والوں کے دشمن ہوں گے، عبادت کرنے والوں کو تکلیف دیں گے، انہیں کوئی نفع نہ دیں گے اور وہ ان کی عبادت سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے تیرنا الیک ما کانوا ایانا بعدون، یعنی اے اللہ جو ہماری عبادت کرتے رہے ہیں ہم ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں جہانوں میں ان کے لئے اس عمل میں کوئی نفع نہ ہوگا۔ دنیا میں ان کے اس عمل نے انہیں کوئی نفع نہ دیا تھا اور آخرت میں انہیں ان کا یہ عمل انہیں نقصان دے گا تو اس آدی سے بڑھ کر کوئی گمراہ ہوگا جس نے ان بتوں کی عبادت کی اور اللہ تعالیٰ جو سچ بصر خیر قادر اور مجیب ہے اس کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ کانوا ایعاد تہم یغفرین میں جمع کی ضمیر ان عبادت کرنے والوں کے لئے ہے جو یہ کہتے ہیں واللہ بہینا کنا مشرکین ۱۰۔

وَإِذَا تَمَثَّلَ عَلَيْهِمُ الْيَمْنَاءُ بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۝ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفْعِلُونَ فَبِئْسَ فِيهِ كُفْرٌ بِهٖ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۝ وَهُوَ الْعَفْوَ الرَّحِيمُ ۝

”اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں جو روشن ہیں تو کہتے ہیں کفار حق کے بارے میں جب ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا جادو ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ نبی نے اس کو خود کھڑا کیا ہے فرمائیے اگر میں نے اس کو خود کھڑا ہے تو تم اس طاقت کے مالک نہیں کہ مجھے اللہ سے چھڑا لو وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم مشغول ہو وہ کافی ہے بطور گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

۱۔ اس جملے کا عطف والذین کفروا پر ہے جو صمن بعدوا میں ہے الحق سے مراد بھی آیات ہی ہیں ام ظمیر کی جگہ یہاں ام ظاہر ذکر کیا جس طرح الذین کفروا کو بھی ظمیر کی جگہ ذکر کیا کیونکہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو علیہم کی ضمیر سے مراد ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ آیات حق میں ان کا صدق ظاہر ہے، جبکہ ان پر کفر اور گمراہی میں منہک ہونے پر مہر لگانا ہے۔ جو نبی ان پر حق نازل ہوتا ہے تو سوچے سمجھے بغیر منہ سے کہا جتھے ہیں یہ واضح جادو ہے۔

۲۔ یا کہہ دیتے ہیں اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی طرف سے کھڑا ہے۔ یہاں ام مطلقہ ہے۔ استفہام انکار اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے اور ان کے قول انہ سحر سے اضراب ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو اگر میں نے اسے اپنی طرف سے کھڑا ہے اور تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے تاکہ تم بھی میری اتباع کرو تم تو اس بات پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مجھے بچا سکو تو پھر میں اللہ تعالیٰ پر ایسا بہتان باندھنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہوں اور جب تمہاری طرف سے مجھے نفع کی امید ہے اور نہ نقصان کا اندیشہ ہے تو میں اپنے آپ کو عیسے کا عذاب پر پیش کر سکتا ہوں۔ جو تم آیات کو جھٹلاتے ہو اور اسے جادو اور سن کھڑت بات قرار دیتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ کئی پم میں باہرا مذہ ہے اور، ظمیر محل رفع میں ہے اور قائل ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں گواہی دیتا ہے کہ میں سچا ہوں اور میں نے بیٹا من صحیح صحیح بیچنا دیا ہے کیونکہ اس نے مجھے مخرجات عطا فرمائے ہیں اور تمہارے جھوٹے ہونے اور آیات کا انکار

نہ تھا اور کتاب میں پہلے مذکور نہ تھا کیونکہ یہ تو کفار کے اس اعتراض کا تقاضا کرتا ہے کہ ہمارا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ ہم اپنے اوپر آپ کی کوئی فضیلت نہیں دیکھتے تو پھر اپنے آباء کے دین کو چھوڑنے اور رسولوں کی اتباع کا کیا فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لَيْسَ خَيْرَ لَكَ اللهُ مَا تَقَدَّرَ مِنْ دُونِ ذٰلِكَ وَمَا تَأْتُرُ اور لَيْسَ جَدُّ الْمُوْصِيْنِ وَالْمُوْصِيْتِ جَدًّا كُوْسٍ سَالٍ كَيْ بَعْدَ نَزْلِ كَرَامٍ یہ ضرورت کے وقت کے بیان کو مؤخر کرنے کو لازم کرتا ہے جو محال ہے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ امام بغوی نے اپنی سند سے خارجہ بن یزید سے روایت نقل کی ہے کہ ام العلاء انصار یہ کہا کرتی تھیں جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو انصار نے انہیں رہائش دینے کے لئے قرعہ اندازی کی۔ ہمارے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون آئے۔ وہ مریض ہو گئے۔ ہم نے ان کی تیمارداری کی پھر ان کا وصال ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے پاس حاضر ہوئی۔ میں نے کہا اے ابوصائب تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے عزتوں سے نوازا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کس چیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت بخشی۔ میں نے عرض کی اللہ کی قسم میں کچھ نہیں جانتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہاں تک اس کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو موت آئی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کے لئے خیر ہوگی۔ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں تو ام العلاء نے عرض کی اللہ کی قسم میں اس کے بعد کسی کے بارے میں ایسا تذکرہ نہ کروں گی۔ ام العلاء نے کہا بعد میں میں نے حضرت عثمان بن مظعون کو خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک چشمہ جاری ہے۔ میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آپ کا عمل ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے قول کی تائید کرتی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز میرے اور تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کو میں نہیں جانتا اور نہ اس حدیث کا کیا معنی ہو سکتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی معین شخص کے بارے میں نجات اور بلا کت کا حکم لگائے کیونکہ یہ علم غیب کا دعویٰ بن جاتا ہے۔ باطن اور سر کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہاں اگر کسی آدمی کا ظاہر حال اچھا ہو تو اس کے بارے میں خیر کی امید کرنی چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولین اور آخرین کے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اس کے باوجود میں تفصیل سے نہیں جانتا کہ مخصوص عمل پر میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تو ہم نے ایک معین آدمی کے حق میں کیسے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت سے نوازا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا کیونکہ میں علم غیب نہیں جانتا۔ سیاق کلام اس تفسیر سے موافقت نہیں رکھتا کیونکہ سیاق کلام تو یہ ہے کہ کفار تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان کے دین کی بھڑی کریں اور آپ کو وہ یہ لالچ دیتے کہ وہ آپ کے لئے مال جمع کریں گے اور بغیر مہر کے آپ کی شادی کر دیں گے۔ اتباع نہ کرنے کی صورت میں وہ آپ کو ذمہ دیتے اور آپ کو دھمکاتے تھے۔ اس آیت کے سیاق کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ آپ کو ان سے کوئی لالچ نہیں، نہ ہی آپ ان سے ڈرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ اچھا یا برا جو ارادہ کر

رہے ہیں اس پر یہ قارئین کیونکہ خیر اور شریب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے تو پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ فتح اور شکست میں سے جو کچھ میرے ساتھ کیا جانے والا ہے میں اسے نہیں جانتا تاہم میں تمہاری کسی صورت بھی اتباع کرنے والا نہیں (1)۔

میں تو قرآن کی اتباع کروں گا، کسی حال میں بھی اسے نہ چھوڑوں گا۔ امام بیضاوی نے کہا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی غیب کی خبروں کے بارے میں سوال کیا تھا جن کے بارے میں وہی نہیں آئی تھی، اس کا یہ جواب ہے یا مسلمانوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ انہیں مشرکوں کی اذیتوں سے نجات مل جائے انہیں اس مطالبہ کا جواب دیا گیا امام بغوی نے بھی یہی قول کیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا: مَا أَزْبِرُنِي مَا تَفْعَلُنِي وَيُؤَلِّمُكَ مَا تَفْعَلُنِي؟ اس بارے میں تو آپ کو یقینی علم تھا کہ آپ جنت میں ہوں گے اور آپ کو چھلانے والے جہنم میں جانا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس بارے میں تو آپ کو یقینی علم تھا کہ آپ جنت میں ہوں گے اور آپ کو چھلانے والے جہنم میں ہوں گے پھر ان کا اس تعبیر میں اختلاف ہے (2) حضرت ابن عباس نے کہا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ظلم و ستم بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا جیسے سونے والا خواب دیکھتا ہے، جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے کہ ایک ہموار زمین ہے اور وہاں سمجھور کے درخت ہیں اور آپ اس جگہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ آپ کے صحابہ نے آپ سے عرض کی آپ کب ہجرت کریں گے؟ آپ خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا مراد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا میں اس جگہ رہوں گا یا تمہارے ساتھ اسی جگہ ہجرت کر جاؤں گا جو میرے لئے ظاہر کی گئی (3)۔

بعض علماء نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس دنیا میں میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا میں دنیا سے اسی طرح پردہ کروں گا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے یا مجھے شہید کر دیا جائے گا جس طرح کنی انبیاء کو شہید کیا گیا، جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا تھا۔ اسے تصدیق کرنے والوں میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا کہ تمہیں میرے ساتھ نکالا جائے گا یا تمہیں چھوڑ دیا جائے گا یا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور اسے چھلانے والوں میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ تم پر پتھروں کی بارش کی جائے گی جس طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے یا تمہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا جس طرح قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا تھا یا سائبہ چھلانے والی قوموں کے ساتھ جو طر عمل اپنایا گیا تھا ان میں سے کون سا عمل تمہارے ساتھ اپنایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو یہ خبر دی کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِي أَسْرَأْتُمْ سُرْمُوهُمْ وَالْهَدْيَ وَوَدَّعَيْتُمْ لِيُظْهِرَهُ عَنِ النَّبِيِّينَ لَكُمُ الْوَجْدُ وَأَنْتُمْ لَكُمْ وَاللَّهُ مُعْتَبِرٌ بِهِمْ وَهُمْ يُسْتَفْزِرُونَ ﴿٥٠﴾ ان آیات میں یہ بتا دیا گیا کہ آپ کے ساتھ اور آپ

کی امت کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے (4)۔

اور میں تو کفار کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ واضح شواہد کے ساتھ اور ایسے معجزات کے ساتھ جو میری تصدیق کرنے والے ہیں میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں ظالموں کے ساتھ ہوں اور نبی مجھے تم پر مسلط کیا گیا ہے کہ میں تمہیں ایمان لانے پر مجبور کروں۔

قُلْ أَسْرَأْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ

1- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 131 (انجاریہ) 2- ایضاً 3- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 131 (انجاریہ) 4- تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 132 (انجاریہ)

عَلَىٰ مُثَلِّفِيهَا قَائِمًا ۖ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥٠﴾

”فرمائیے کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہو تو تم اس کا انکار کرو (تو اس کا کیا انجام ہوگا) حالانکہ گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل سے اس کی مثل پر اور وہ ایمان بھی لے آیا اور تم نے تکبر کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو۔“

۱۔ انہیں فرمائیے کہ مجھے بتاؤ کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو، جبکہ اسے مشرکوں نے اس کا انکار کیا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وَكَفَرْتُمْ میں واؤ حالہ نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ اسی طرح وَشَهِدْنَا شَٰجِدٌ میں واؤ عاطفہ ہو۔ پھر معنی ہوگا مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی گواہی دے۔ قنودہ اور شاہک نے کہا یہاں گواہ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو بنی اسرائیل کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام بخاری اور ترمذی نے حضرت انس سے محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن سلام کے خاندان کے ایک فرد سے، امام احمد اور یعقوب بن سفیان نے حضرت عبداللہ بن سلام سے، تہذیبی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا جب میں نے حضور ﷺ کے متعلق سنا اور میں نے آپ کی صفت نام شکل و صورت اور جن چیزوں کی ہم آپ میں توقع رکھتے تھے کو پہچان لیا تو میں نے اس بات کو دل میں ہی رکھا اور اس پر خاموش رہا یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ طریف تشریف لائے۔ جب آپ یہاں تشریف لائے تو ہمارے پردوں میں بنی عمرو بن نوف کی ہستی میں قیام کیا۔ ایک آدمی نے مجھے آپ کے آنے کی خبر اس وقت دی، جبکہ میں ایک کھجور پر چڑھا ہوا کام کر رہا تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث بیٹھنے لگی ہوئی تھی۔ جب میں نے آپ کے آنے کی خبر سنی تو میں نے اللہ اکبر کہا تو پھوپھی نے کہا اگر تو حضرت موسیٰ بن عمران کے آنے کی خبر سنتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہتا۔ میں نے کہا اے میری پھوپھی اللہ کی قسم! یہ آنے والا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی اور آپ کے دوں پر ہے۔ آپ کو اسی دین کے ساتھ معبود کیا گیا ہے جس دین کے ساتھ حضرت موسیٰ کو بھیجا گیا تھا تو ان کی پھوپھی نے کہا یہ تو سنی ہوئی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا پھر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے نکل پڑا۔ جب میں نے آپ کے چہرے کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ میں نے حضور ﷺ سے سب سے پہلی بات یہ سنی تھی۔ اے لوگو! کھانا کھاؤ، ایک دوسرے کو سلام دیا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، ذرات کو نماز پڑھا کرو، جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہوا جاؤ گے، عرض کی اے محمد ﷺ میں آپ سے تین باتیں پوچھ رہا ہوں جنہیں صرف نبی ہی جانتا ہے۔ 1۔ قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ 2۔ جنتوں کا پہلا کھانا کونسا ہے؟ 3۔ اولاد ماں یا باپ کی ہم شکل کیوں ہوتی ہے؟ 4۔ چاند میں یہ سیاہ دہرہ کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا جبرئیل امین نے ابھی ابھی مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا جبرئیل امین نے بتایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں جبرئیل امین نے بتایا تو عبداللہ بن سلام نے کہا وہ فرشتوں میں سے یہودیوں کے دشمن ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ مشرق سے آگ نکلے گی جو لوگوں کو مغرب کی طرف بانٹ کر لے جائے گی۔ جنتی سب سے پہلا کھانا جو کھائیں گے وہ مچھلی کے جگر کی بڑھی ہوئی چیز ہوگی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ باپ کا ہم شکل ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب ہوتا ہے تو بچہ ماں کا ہم شکل ہوتا ہے۔ جہاں تک چاند میں سیاہ دہرے کا تعلق ہے دونوں سورج روشن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا وَ جَعَلْنَا الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ فَتَحَنَّنَّا إِلَيْهِمْ وَأَنَّا مُخْمَضَةٌ زُسُولُ اللَّهِ پھر اپنے گھر آئے۔ انہیں بھی اسلام قبول کرنے کا حکم دیا، وہ سب مسلمان ہو گئے اور اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔

پھر عبداللہ بن سلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کی مجھے علم ہے کہ یہودی خوب جانتے ہیں کہ میں ان کا سردار ہوں سردار کا بیٹا ہوں، ان میں سے سب سے بڑا عالم ہوں اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہوں تاہم وہ بڑے بہتان باز (۱) ہیں۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا پہلے سے علم ہو گیا تو وہ مجھ پر ایسے ایسے جھوٹے بہتان باندھیں گے اور ایسی ایسی باتیں کریں گے جو مجھ میں نہیں ہیں پس پسند کرتا ہوں کہ مجھے اپنے گھر میں پہلے بٹھالیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو پہلے گھر میں بٹھالیا پھر یہودیوں کی طرف پیغام بھیج دیا۔ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اے جماعت یہود تم پر انوس ہے اللہ سے ڈرو تم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میں تمہارے پاس پیغام حق لایا ہوں۔ اسلام قبول کر لو تو انہوں نے جواب دیا ہم تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ حضور ﷺ نے پوچھا عبداللہ بن سلام تم میں سے کس آدمی نے تمہیں یہودیوں نے جواب دیا وہ ہم میں سے بہترین ہے، بہترین فرد کی اولاد ہے۔ وہ ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ وہ ہم سے بڑا عالم ہے اور بڑے عالم کا بیٹا ہے۔ فرمایا اگر وہ اسلام قبول کر لے تو تمہاری کیا رائے ہوگی تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اس کام سے محفوظ رکھے۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو کہا باہر آ جاؤ۔ وہ باہر آئے اور کلمہ شہادت پڑھا اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اے جماعت یہود اللہ سے ڈرو اور آپ جو پیغام تمہارے پاس لائے ہیں اسے قبول کرو۔ اللہ کی قسم اچھی طرح جانتے ہو یہ اللہ کے رسول ہیں تم تو رات میں اس کا نام اور اس کی صفات لکھی ہوئی پاتے ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ ان کی تصدیق کرتا ہوں اور انہیں پہچانتا ہوں تو یہودیوں نے کہا تم جھوٹے ہو۔ تم ہم سب سے بڑے ہو اور سب سے بڑے کے بیٹے ہو اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اسی بات سے ڈرا کرتا تھا۔ کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا یہ بہتان باندھنے والے دھوکے باز جھوٹے اور بدکردار ہیں۔ انہوں نے اپنا اور اپنے گھروالوں کا اسلام ظاہر کر دیا۔ اگلی پھو بھی بنت حارثہ بھی مسلمان ہو گئیں اور بہترین مسلمان بنیں (۶)۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ عوف بن اشجی سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ یہودیوں کی عبادت گاہ میں پہنچے۔ یہ ان کی عید کا دن تھا۔ انہوں نے ہمارا وہاں آنا پسند نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے یہودیوں کی جماعت مجھے اپنی جماعت میں سے ایسے بارہ آدمیوں کے بارے میں بتاؤ جو یہ گواہی دیتے ہوں لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ ہر اس یہودی سے جو آسمان کے نیچے رہ رہا ہے اپنے غضب کو ختم کر دے گا۔ وہ سب خاموش رہے، ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا پھر آپ وہاں سے واپس مڑے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی آپ کے پیچھے ہے۔ اس نے کہا اے محمد جہاں ہو ظہر جاؤ اور اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے جماعت یہود تم مجھے اپنی قوم میں کس حیثیت سے جانتے ہو؟ انہوں نے کہا

(۱) بھٹ بھوٹ کی جمع ہے جس طرح صنوبر کی جمع صنوبر آتی ہے۔

1 تفسیر ربوئی، جلد 6، صفحہ 132 (الطبرانی)

اللہ کی قسم ہم اپنی قوم میں تم سے بڑا عالم اور فقیہ کسی کو نہیں جانتے۔ اسی طرح تیرے باپ اور دادا سے بڑھ کر کسی کو بڑا عالم اور فقیہ نہیں جانتے پھر حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے وہی نبی ہیں جس کا ذکر تم تو اورات میں پاتے ہو۔ انہوں نے کہا تم نے جھوٹ بولا پھر اس کا رد کیا اور اس کے بارے میں سخت غلط باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔

شیشین نے حضرت سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ کہ میں نے حضور ﷺ سے کسی زندہ کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے مگر آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کہا انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ راوی نے مالک سے روایت کی راوی جن کا نام عبداللہ بن یوسف ہے جو امام بخاری کے شیخ ہیں انہوں نے کہا امام مالک نے خود اپنی طرف سے اس آیت کو پڑھا ہے یا حضرت سعید بن وقاص کی حدیث میں یہ حصہ مذکور تھا (2)۔

ابن جریر نے عبداللہ بن سلام سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی (3) اس تیسری صورت میں یہ آیت مدنی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں اسلام لائے تھے۔ علیؑ مدینہ میں مثل کا لفظ زائد ہے۔ وہ قرآن کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اس بات کی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا معنی یہ ہوگا کہ جس طرح میں نے کہا بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے بھی ایسی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام اسلام لائے اور جماعت یہود تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا، یعنی امن میں نہیں حضرت عبداللہ بن سلام کے لئے ہے۔

مسروق نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل ہوئی اور کہا اللہ کی قسم یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل نہیں ہوئی کیونکہ یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جبکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں مسلمان ہوئے تھے (4)۔ یہ آیت اس استدلال کے بارے میں نازل ہوئی جو حضور ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہادت دی اور تو اورات میں شہادت یہ خبر ہے کہ حضور ﷺ مسبوٹ ہوں گے۔ علیؑ مدینہ سے مراد وہ معانی ہیں جو تو اورات میں موجود ہیں جو قرآن کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ایمان لائے، جبکہ اسے جماعت قریش تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا۔ ان کا لہجہ عربی اللہ کا جواب مذہوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ان کان من عبد اللہ فمن أضلّ منكم أو أنتم ظالمین۔ مذہوف جواب پر ان اللہ لا یهدی القوم الظالمین والست کرتا ہے۔ یہ جملہ مستاتھ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ افعال شرط جیسے کلان من عبد اللہ و کفرتہم پہ شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ قائلین و استنبطتہم سب صحیح ہیں تو پھر ان میں حرف شرط ان استعمال کرنیکی کیا وجہ ہے جبکہ حرف ان تو شک کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں تمام جملوں میں واؤ جمع کے معنی پر دلالت کرتی ہے اور ان شرطیہ کا کلمہ تو بخ کے لئے استعمال ہوا ہے، شک کی جگہ یقینی افعال کا لانا اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ عقل سلیم کے نزدیک اس کا انکار جائز نہیں، جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہے۔ جب اہل علم اس کی شہادت دے اور ایمان لے آئے تو پھر تکبر کرتے ہوئے اس کا انکار درست نہیں۔ یہ بھی

2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 299 (قدیمی)

4۔ تفسیر ربوئی، جلد 6، صفحہ 133 (اتحاریہ)

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 6 (اعلیٰ)

3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 6 (اعلیٰ)

”حالانکہ اس سے پہلے کتاب موسیٰ رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے اور یہ کتاب (قرآن) تو اس کی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں ہے تاکہ بروقت خبردار کر دے ظالموں کو اور خوشخبری ہے تیکہ کاروں کے لئے ہے تاکہ جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے پس کوئی خوف نہیں انہیں اور نہ ٹھگنیں ہوں گے بلکہ یہی لوگ جنتی ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں یہ جزاء ہے ان نیکیوں کی جو وہ کیا کرتے تھے۔“

۱۔ بین قبیلہ کی ہضمیر سے مراد قرآن ہے اور جار مجرور کتب موسیٰ کی خبر مقدمہ ہے۔ کتاب سے مراد تورات ہے۔ اما ما یہ قبلہ کی ضمیر سے حال ہے۔ امام کا مثنوی ہے جس کی اقتداء و پیروی کی جاتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے رحمت ہے تاکہ وہ فلاح دارین حاصل کر لیں۔ یہ فعل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب یا اپنے اعجاز کی وجہ سے حضور ﷺ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصدق یہ کتاب کی صفت ہے۔ لسانا عربیا یہ مصدق میں موجود اس ضمیر سے حال ہے جو کتاب کی طرف لوت رہی ہے یا یہ کتاب سے حال ہے کیونکہ اس کی صفت مذکور ہونے کی وجہ سے وہ مکرہ مخصوصہ بن چکا ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا مثنوی ہے۔ ان دو تعبیروں کا فائدہ یہ ہے کہ دلالت سے یہ شعور دلایا جائے کہ قرآن حکیم تورات کی تصدیق کرتا ہے جس طرح یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حق ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ وحی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا لسانا عربیا یہ مصدق کا مفعول ہے یہ ادراک کا مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مصدق ذالسانا عربی۔ اس صورت میں اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہوگی۔

نافع بڑی اہن عامر اور یعقوب نے لینذر کو لتنذر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا فاعل کتاب یا اللہ تعالیٰ کی ذات یا رسول اللہ ہوگا۔ اس کلام کا تعلق ہذا کتاب کے ساتھ ہوگا، یعنی یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ آپ ذرا نہیں یا یہ ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور یہ خوشخبری ہے احسان کرنے والوں کے لئے۔ بشری یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی بيشرو بشری اس کا مفعول لہ ہے اور اس کا عطف لینذر کے محل پر ہوگا۔ یہ تعبیر اس وقت ہی جائز ہوگی جب لینذر کو غائب کا صیغہ پڑھا جائے، اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی تاکہ اس کا فاعل اور مفعول لہ کے فعل کا فاعل ایک ہی ہو اور وہ فعل انزل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بشری مہتمد محذوف کی خبر ہو جو صحیح ہے۔ اس جملہ کا عطف ماقبل جملے پر ہوگا۔

۲۔ ہم نے استقامت کی تفسیر سورہ حزم مسجدہ میں بیان کر دی ہے۔ ان خوش نصیبوں کو موت کے بعد کسی ناپسندیدہ چیز کے لاحق ہونے اور کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ فلا خوف میں فاء اس لئے ہے کیونکہ مبتدا میں شرط کا مثنوی پایا جاتا ہے۔

۳۔ خالدین اس ضمیر سے حال ہے جو اصحاب میں موجود ہے۔ اس میں عامل اسم اشارہ کا مثنوی ہے۔ یہ جملہ خوف کی کنی کی علت بیان کر رہا ہے۔ جزاء اس محذوف فعل کا مفعول مطلق ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی جزوا جزاء، یعنی وہ جنت میں ہمیشہ اس لئے رہیں گے کیونکہ یہ ان کے علمی اور عملی ایسے اعمال کا بدلہ ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ
 وَفُضِّلَهُ لِنُسُوتِهِ سَهْمًا حَقًّا إِذَا بَدَأَ أَشُدَّكَ وَبَدَأَ أُمَّرَاءَ عَيْنَ سَنَةِ قَالَ سَرَّ

أَوْزَعْنِي أَنْ أَشْكُرَ بِعَمَلِكَ الْبَنِيَّ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّْ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي دِينِي بِحَبْلِكَ وَإِنِّي كُنْتُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٢٠﴾

”اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے (اپنے علم میں) انھانے رکھا اس کو اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اور جتنا اس کو بڑی تکلیف سے اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چمکانے تک میں سمیٹے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی اسے میرے رب مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے اور صلاح (ورشہد) کو میرے لئے میری اولاد میں راسخ فرمادے۔ بے شک میں تو بہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں تیرے حکم کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے ہوں۔“

لِلْإِنْسَانِ مِنَ الْفَلَاحِ لَمْ يَكُنْ يَدْرِي أَنَّ اسانسان سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت علی شیر خدا سے بھی یہی مروی ہے، آپ نے کہا یہ آیت ابو بکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ کے والدین مسلمان ہوئے۔ مہاجرین میں سے آپ کے علاوہ کسی کے دونوں والدین اسلام نہیں لائے (1) سدی اور ضحاک نے کہا یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئی (2) ہم نے ایک واقعہ سورہ عنکبوت میں بیان کیا ہے ایک قول یہ کیا گیا۔ یہ الف لام ضمی ہے اگرچہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق یا حضرت سعد کے حق میں نازل ہوئی تاہم سیاق کلام اس قول کی تائید نہیں کرتا جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

یٰۤاَبُو بَكْرِ جَارِ مَجْرُورٍ كَاتِلٍ مَحْذُوفٍ فِعْلٍ كَسَا تَحْتَهُ هـ۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ یٰحَسَنُ وَالدِّهِيَّةِ حَضْرَتِ ابُو بَكْرٍ صَدِيقِ كَسَا وَالدِّينِ حَضْرَتِ ابُو بَكْرٍ عَمْتَانِ بْنِ عَمْرٍو اِرَامِ الْخَيْرِ بَشْتِ خَيْرِ بْنِ مَسْرُورِ عَمْرِئِمْ۔

کوفہ کے قراء نے باب افعال کا مصدر احسانا پڑھا ہے۔ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے مجرد سے حنا پڑھا ہے اور یہ ابو الدیہ سے بدل اشتمال ہے۔ اس صورت میں احسانا کے منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ابو الدیہ کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کورھا سے پہلے ذات کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ یہ امہ سے حال ہوگا یا یہ جملہ کی صفت ہے پھر یہ فعل کا مفعول مطلق ہوگا۔ اس کا معنی مشقت ہے۔ حجاز سے قراء ہشام اور ابو عمرو نے دونوں جگہ کورھا کو کاف کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے کاف کے ضم کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کاف پر ضم ہوگا تو یہ ام ہوگا اور جب اس پر فتح ہوگا تو یہ مصدر ہوگا۔ حملتہ امہ کورھا اور وضعہ کورھا یہ دونوں جملے جملہ محترضہ ہیں اور احسانا کی علت بیان کر رہے ہیں۔ ان آیات میں یہ شعور بھی دیا جا رہا ہے کہ ماں احسان کی زیادہ مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنے باپ کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اس کے بعد جو زیادہ قریبی ہے۔ حدیث سورہ عنکبوت میں گزر چکی ہے۔ فصالح کا معنی چمکانا ہے یہاں اس سے مراد دودھ پلانے کی مدت ہے۔ لازم ذکر کیا مراطلوم ہے یعقوب نے اسے فصلہ پڑھا ہے۔ دونوں مضاف کے حذف کے ساتھ مبتدا ہیں۔ تقدیر کلام یہ ہے مدلة

حملہ و فصالہ اور باعد اس کی خبر ہے، یعنی حمل اور رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ یہ بھی جملہ مترجمہ ہے۔ طویل مدت میں مشقت کی شدت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا۔ اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ (۱) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے و فصالہ فی عامین کیونکہ دو سال چھ ماہ کے عرصہ میں سے دو سال نکل جائیں تو پیچھے چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔ حمل کی کم سے کم مدت میں اسی عرصہ پر اتفاق ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ عرصہ میں اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ حضرت امام مالک سے کئی روایات مروی ہیں۔ چار سال سے پانچ سال اور سات سال۔ حضرت امام شافعی نے کہا چار سال۔ امام احمد سے دو روایات مروی ہیں مشہور روایت امام شافعی کے مذہب کے موافق ہے، جبکہ دوسری روایت امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ کا قول ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ اتنا عرصہ بھی نہیں ٹھہر سکتا جتنا کہ نکلے گا گھرا ہو۔ ایک روایت نکلے کے سامنے کی مقدار کے الفاظ ہیں امام ابوحنیفہ نے فرمایا اس قسم کی بات سماع سے ممکن ہے کیونکہ مقداروں کو اندازے سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے آپ کا قول صحیح ہو اور آپ کے تجربہ پر مبنی ہو جس طرح عمومی عادت ہے۔ جس طرح امام مالک اور امام شافعی کا قول تجربہ پر مبنی ہو۔ میں کہتا ہوں حمل کی کم سے کم مدت پر اس آیت سے استدلال اس امر پر مبنی ہے کہ الانسان میں الف لام جنسی ہے۔ اگر الف لام عہد خارج کا ہو تو پھر اس آیت سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس آیت سے امام ابوحنیفہ کے مذہب کا استدلال بھی درست نہیں کہ رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ اس کے متعلق اور رضاعت کے دوسرے مسائل کے متعلق مسائل سورۃ نساء میں گزر چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے عکرمہ نے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جب عورت نو ماہ تک حاملہ رہے تو ایک ماہ دودھ پلائے۔ جب چھ ماہ تک حاملہ رہے تو پھر چوبیس ماہ دودھ پلائے (۱)۔ واللہ اعلم۔

حتى اذا بلغ كالتعلق فقل محذوف کے ساتھ ہے جس کا عطف وضعہ پر ہے تقدیر کلام یہ ہے رَبِّئَاہُ حَتَّىٰ اِذَا بَلَغَ اِلٰیٰن

1- تفسیر ابن جری، ج 6، صفحہ 134 (التجاریہ)

(۱) قتادہ ابو الحریب بن اسود دینی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی خدمت میں ایک عورت کو پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام سے اس بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی نے کہا اس پر رحم نہیں کیونکہ آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا واملواھن لیسعن ان شہرا اور دوسری جگہ فرمایا وفضلنا فی عائلن تو پھر حمل کی مدت چھ ماہ رہ گئی۔ حضرت عمر نے اس عورت کو چھوڑ دیا پھر جن میں ایک خبر پہنچی کہ ایک اور عورت نے بھی چھ ماہ کے عرصہ میں بچہ جنا۔ حضرت تابع بن جبر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ جس عورت کو حضرت عمر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جس نے اس عورت کے حق میں دلیل دی تھی۔ اس عورت نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ لوگوں نے اس کا برا منایا۔ میں نے حضرت عمر فاروق سے عرض کیا آپ کیسے اس پر قلم کر سکتے ہیں آپ نے فرمایا ظلم کیسا۔ میں نے عرض کی اس آیت کو پڑھیں و حملہ و فصالہ فلانوں شہرہ اور دوسری آیت والوولدات برھعن اولادھن حولین کاملین میں نے عرض کی حل کرتا ہوتا ہے؟ فرمایا ایک سال۔ میں نے عرض کی سال کتنے عرصہ کا ہوتا ہے؟ فرمایا ارہوہ۔ میں نے عرض کی چوبیس ماہ پورے دو سال ہوئے۔ تاہم صل کو اللہ تعالیٰ جتنا مآثر کر دے۔ یا جتنا پہلے کر دے حضرت عمر اس استدلال سے مطمئن ہو گئے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے غلام ابوعبیدہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کو حضرت عثمان کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا حضرت عثمان نے فرمایا جس عورت کو میرے سامنے پیش کیا گیا ہے میرا خیال ہے اس نے نفل کا کام کیا ہے تو حضرت ابن عباس نے کہا جب رضاعت کا دورانیہ دو ماہ ہو تو حمل کی مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ آیت پڑھی حضرت عثمان نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔

دونوں والدین نے اس کی تربیت کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اور پھر چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی عقل کامل ہو گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس وقت دوست بنے تھے جب آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی یہ جوانی کی عمر ہے جبکہ حضور ﷺ کی عمر بیس سال تھی اور اسٹھ شام کی طرف تجارت کے لئے گئے تھے جب چالیس سال کے ہوئے تو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور اپنے رب کے حضور اچھا کی شاید راوی کو حضرت ابو بکر کی عمر چالیس سال ذکر کرنے میں سہو ہوا ہے کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عمروں میں دو سال کا فرق تھا۔

ورش اور بزی نے اوذ عنی کی یاہ کو مفتوح، جبکہ باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔ معنی ہے مجھ پر الہام کر۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ مجھے یوں بنا دے کہ میں اپنے آپ کو ناشکری سے روک لوں۔ مجھے اور میرے والدین کو اسلام قبول کرنے کی جو نعمت عطا فرمائی ہے یا عموئی نعمت مراد ہے جو اسلام اور دوسری نعمتوں کو شامل ہے اس پر تیرا شکر ادا کروں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ صالحہ کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا یا جنس میں سے ایک ایسی نوع کا ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر خداشت کو قبول فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے ان کو غلاموں کو آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا اور بھلائی کے جس کام کا بھی آپ نے ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنی اولاد کے نیک ہونے کی بھی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قبول فرمایا۔ آپ کی جتنی اولاد تھی سب مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کے والدین اور اولاد سب مسلمان ہوئے تھے (1)۔ حضرت ابن عباس نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق کے والد ماجد حضرت ابو قحافہ حضرت ابو بکر صدیق آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن اور ان کے صاحبزادے ابوبتیق نے صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہ ہوا (2)۔

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں کفر سے ہیرا لے کر سے تیری رضا نصیب نہ ہو یا ہر ایسے عمل سے جو تجھ سے مجھے ناخلف کر دے اور مخلص مسلمانوں میں سے ہوں۔ حتیٰ اذا بلغ سے لے کر آخر تک تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ الانسان پر الف لام عہدی ہے، اس سے معین شخص مراد ہے کیونکہ اگر یہ الف ہمیں ہوتی پھر یہ درست نہیں رہتا کیونکہ قدیمی نعت کو چالیس سال تک دعا کے لئے موخر کرنا جائز نہیں۔ اصل میں یہ آیت ایک واقعہ کو بیان کرتی ہے کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق تقریباً چالیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور شکر بھی وہی معتبر ہوتا ہے جو ایمان کی صورت میں ادا کیا جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابو قحافہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے تھے، جبکہ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق کی عمر (تقریباً) ساٹھ سال تھی، جبکہ یہ آیت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی کیونکہ یہ صورت تھی ہے۔ جب حضرت ابو بکر صدیق کی عمر چالیس سال تھی تو اس وقت ابو قحافہ کافر تھے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ احسان کرنے کا کیسے حکم دے سکتا ہے اور حضرت ابو بکر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اَلْعَمَلُ خَلْقٌ وَوَقْتُهَا بَلَدٌ۔

ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق اڑتیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے اور ان کے والدین اس کے دو سال بعد ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق کی عمر چالیس سال تھی۔ شاید ابو قحافہ کے اسلام

لانے کی سببی روایت صحیح ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور ابوقحافہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا تو پھر بھی کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی معصیت جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ عنکبوت میں فرمایا: **وَصَلِّ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ إِذْ يَمُوتُونَ** اِحْسَانًا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَأَشَدُّ حَرًّا مِنْ نَارٍ ۚ وَلَقَدْ نَعَّمْنَا عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ إِذْ جَاءَهُمُ الْوَيْلُ مِنْكُمْ وَأَنَّا نُنزِّلُ الْغُلُقُوتَ فِي سَمَاءِ الْمَدِينَةِ لِيَتَذَكَّرَ الَّذِينَ يُظَلُّونَ وَأَنَّا نُنزِّلُ الْغُلُقُوتَ فِي سَمَاءِ الْمَدِينَةِ لِيَتَذَكَّرَ الَّذِينَ يُظَلُّونَ وَأَنَّا نُنزِّلُ الْغُلُقُوتَ فِي سَمَاءِ الْمَدِينَةِ لِيَتَذَكَّرَ الَّذِينَ يُظَلُّونَ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ ۗ

میں کہتا ہوں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ انسان پر الف لام چھی ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا جب انسان مظلوم جسم کا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے پھر جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو غسل کے کامل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرے۔ واللہ اعلم۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْحَيَاتِ وَعَدَّ الصَّادِقُ الَّذِينَ كَانُوا يُوعَدُونَ ۝ وَالَّذِي قَالَ لِيَا وَيْلَيْهِ أَفِئْتِكُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنِّي أَخَذْتُ الْقُرْآنَ مِنْ قَبْلِهِ ۗ وَهَذَا يَسْتَعِينُ اللَّهُ وَبِئِكَ اِصْنُ ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أَمِّهِمْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جنہوں نے اپنے اعمال کو اور درگزر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے۔ یہ جنہوں میں سے ہوں گے یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اکل ایمان سے) کیا گیا ہے۔ اور جس نے کہا اپنے والدین کو افسوس ہے تمہارے حال پر کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو اس کی کہ میں (قبر سے) نکلا جاؤں گا حالانکہ گزر چکی ہیں کئی صدیاں مجھ سے پہلے (ان میں سے تو کوئی اب تک زندہ نہ ہوا) اور اس کے والدین بارگاہ الہی میں فریاد کرتے ہیں (اور اسے کہتے ہیں) تیرا خرابا ہو اب ایمان لے آئیےنا اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ (جواباً) کہتا ہے نہیں میں یہ دھمکیاں مگر پہلے لوگوں کی فرسودہ کہانیاں لے سکی وہ (بد بخت) ہیں جن پر نابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے بے شک وہ سراسر گمگنائے میں تھے س“

۱۔ اگر سابقہ آیت میں مذکور انسان سے مراد اصل ہو تو اولئک سے اشارہ ان افراد کی طرف ہوگا جو متقدمہ صفات سے متصف ہیں اور یہ تعبیر ظاہر ہے اگر انسان سے مراد حضرت ابوبکر یا حضرت سعد ہو تو پھر اشارہ آپ کی طرف اور اس فرد کی طرف ہوگا جو ان مذکورہ صفات سے متصف ہو۔ اس صورت میں حضرت ابوبکر اور حضرت سعد پر حکم عموم کے ضمن میں بطور کنایہ ہوگا۔ یہ صریحاً حکم سے بیخبر ہے کیونکہ کنایہ کی صورت میں حکم لگانا ایسا ہے جیسا دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہو۔ مہاج عمل حسن تو ہوتا ہے لیکن اس پر ثواب نہیں ہوتا، جبکہ یہ ایسے عمل کا ذکر ہے جس پر انہیں ثواب دیا جائے گا اس لئے اسے احسن فرمایا یا یہاں صفت اپنے موصوف کی طرف منصاف ہے، یعنی انہوں نے جو عمل کیا ہے ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ یہ ان کے علاوہ کے عمل سے اچھا ہے اور ہم ان کے گناہوں سے صرف نظر کرتے ہیں اور ان میں سے کسی چیز پر انہیں سزا نہ دیں گے۔ جزوہ کسائی اور حفص نے تقبیل اور فتجاوز یعنی جمع متکلم کے صیغہ پڑھے ہیں۔

روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبد الرحمن کے اسلام لانے سے پہلے اس کے متعلق نازل ہوئی پھر وہ مسلمان ہو گئے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس، سدی اور مجاہد نے کہا یہ آیت عبد اللہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عبد الرحمن کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے والدین اسے اسلام کی دعوت دیتے تھے، جبکہ وہ انکار کرتا تھا اور کہتا میرے لئے عبد اللہ بن جدعان عامر بن کعب اور قریش کے سرداروں کو زندہ کرو تا کہ میں ان سے تمہاری باتوں کے بارے میں سوال کروں۔

میں کہتا ہوں جنہوں نے یہ کہا کہ یہ آیت عبد الرحمن بن ابی بکر کے حق میں نازل ہوئی اس کا انحصار مروان کی بات پر ہے۔ تم سن چکے ہو کہ مروان کا قول دشمنی پر مبنی تھا۔ امام بغوی نے کہا حضرت عائشہ صدیقہ نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبد الرحمن کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا فلاں آدمی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور اس آدمی کا نام بھی لیا تھا۔ حافظ بن حجر نے کہا حضرت عائشہ کی لٹی والی روایت سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔ زجاج نے کہا جس نے یہ کہا کہ یہ آیت حضرت عبد الرحمن کے اسلام لانے سے پہلے ان کے حق میں نازل ہوئی۔ اگلی آیت ان کے قول کو باطل کر دیتی ہے (۱)۔

اسی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ جنہی ہیں کیونکہ حضرت عبد الرحمن تو طویل القدر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ نبی یہاں مع کے معنی میں ہے۔ ومن العین والذئب یہ ام کا بیان ہے قد خلت والا جملہ ام کی صفت ہے فی اعم حق کے ساتھ متعلق ہے جو ام موصول کا صلہ ہے اور ام موصول ام اشارہ کی خبر ہے اور کمل جملہ والذئب قال یو الذئب کی خبر ہے اِنَّهُمْ کَانُوا اَلْخَبِرِیْنَ یہ تدریج ہے۔

وَلِكُلِّ دَرَجَتٍ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ وَلِيُوقِيَهُمْ اَعْمَابَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۰﴾
 يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلٰى النَّارِ اَاْذُهِبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاَسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۗ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَسَا كُنْتُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۱﴾

”اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور جس روز لا کر کھڑا کر دیا جائیگا کفار کو آگ کے سامنے (تو انہیں کہا جائیگا) تم نے فحتم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھایا تھا تم نے ان سے آج تمہیں رسولی کا عذاب دیا جائے گا جو اس گھمنڈ کے جو تم زمین میں ناحق کیا کرتے تھے اور جو تمہاری نافرمانیوں کے ہیں“

۱۰۔ انہوں نے جو اچھے اعمال کئے اس کی جزاء (۱) کے کئی درجات ہیں یا کیونکہ انہوں نے جو اچھے اعمال کیے ہیں اس کی وجہ سے ان کے کئی درجے ہیں۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت سے مراد یہ ہے جس نے پہلے اسلام قبول کیا اس کا درجہ بعد میں اسلام قبول کرنے سے بڑا ہے، اگرچہ اس نے صرف ایک گھڑی پہلے اسلام قبول کیا مقائل نے کہا ہر ایک کے ان کے اعمال

۱۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) اس تفسیر کی صورت میں موصول سے پہلے جزاء کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ (مترجم)

کے مطابق فضائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا مومنوں اور کافروں میں سے ہر ایک جماعت کے اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے روز ان کے اعمال کے مطابق درجات اور منازل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا جنہیںوں کے درجے پستی کے اعتبار سے اور جنتیوں کے درجے بلندی کے اعتبار سے ہوں گے۔

ابن کثیر ابو عمرو و ہشام اور عاصم نے لیو فیہم کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ مقصود عظمت بیان کرنا ہے یہ مذروف فعل کی مذروف علت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَعَلْنَا ذَٰلِكَ اَوْ فَعَلَ اللّٰهُ ذَٰلِكَ لِجَحْمٍ وَ مُصَابِحٍ وَ لِيُوَفِّيَهُمْ۔ یعنی انہیں ان کے اعمال کی پوری پوری جزاء دے گا اور کسی کے ثواب میں کمی یا عذاب میں اضافہ کرنے کے ظلم نہیں کرے گا۔ وَ هُمْ لَا يَصْطَلُونَ یہ جملہ لیو فیہم کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

یعنی اس روز کفار کو آگ کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ اصل کلام یوں ہے يعرض النار عليهم مبالغہ کے اظہار کے لئے اس میں قلب کیا گیا جس طرح عربوں کا قول ہے عَرْضْتُ النَّافَةَ عَلَى الْحَوْضِ۔ اذہبم سے پہلے قول مقدر ہے تقدیر کلام یوں ہے يَفْقَالُ لَهُمْ اَذْهَبْتُمْ۔ طرف یعنی یوم کو اذہبتم فعل نصب دے رہا ہے۔

ابن کثیر ابن عامر ابو جعفر اور یعقوب نے اذہبتم پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے دونوں ہمزوں کو اپنی اصل پر رکھتے ہوئے پڑھا ہے اور مد کے ساتھ نہیں پڑھا۔ ابن کثیر ابو جعفر یعقوب اور ہشام نے ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے ہمزہ کو اصل پر رکھتے ہوئے مد پڑھی ہی ہے، جبکہ ابن کثیر نے دوسرے ہمزہ میں تھیل لی ہے، جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ جملہ خبریہ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ استنہام نہیں ہے۔ امام بغوی نے کہا دونوں لغتیں فصیح ہیں کیونکہ عرب تو صحیح کے لئے استنہام کا کلمہ لاتے ہیں اور کلمہ استنہام کو ترک بھی کر دیتے ہیں۔ طیبات سے مراد لذائذ ہیں۔ یعنی تمہارے حق میں جو لذائذ مقدر کئے گئے تھے تم دنیا میں ان سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ فالیوم میں فاء سیبہ ہے۔ اس شیطا کا معطف استمنعتم پر ہے، یعنی آج تمہیں ایسا عذاب دیا جائے گا جو ذلت و رسوائی عطا کرنے والا ہے۔ اس عذاب کا سبب تمہارا ناحق تکبر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نفرت ہے۔

امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے کافروں کو تنبیہ کی کہ وہ دنیاوی لذات سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ نے دنیا کی لذات سے اجتناب کو ترجیح دی تاکہ آخرت کا ثواب حاصل ہو۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیحین میں روایت نقل کی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ خالی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، اس پر کوئی بسترنہ تھا۔ اس چٹائی کے نشانات آپ کے جسم پر لگے ہوئے تھے۔ آپ نے چمڑے کے ایک تکیہ پر ٹیک لگائی ہوئی تھی جس میں جھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو فریاد عطا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں اور رومیوں کو فریاد عطا فرمائی ہے، جبکہ وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا تو بھی یہ سوچتا ہے؟ وہ ایسی قوم ہیں جنہیں لذتیں دنیا میں جلدی عطا کر دی گئی ہیں (1) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت (2)۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے کبھی بھی دودن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا (1)۔ امام بخاری نے سعید مقبری اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے پاس سے گزرے جن کے سامنے بھی ہوئی کبریٰ پڑی تھی۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو کھانے کی دعوت دی تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا حضور ﷺ دینا سے پردہ فرما گئے ہیں، جبکہ آپ نے جو کی روٹی سے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کبھی ایسا امینہ بھی آجاتا کہ ہمارے گھروں میں آگ نہ تلتی اور ہمارے پاس پانی اور کھجور کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ انصاری عمرو قن کو بڑا عزیز دے۔ کبھی بھی وہ ہمارے پاس دودھ تھکے کے طور پر پہنچ دیتی تھیں۔

امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ آپ لگا تار کی کئی راتیں بھوکے گزارتے تھے۔ گھر والوں کے پاس رات کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔ ان کا اکثر کھانا جو کی روٹی ہوتا تھا (3)۔ امام ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جتنا ڈرایا گیا اتنا کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اتنی سی دی گئیں اتنی آدھتیں کسی اور کو نہیں دی گئیں مجھ پر تیس روز ایسے بھی گزرے کہ میرے اور بلال کے پاس کوئی ایسا کھانا نہیں تھا جسے لوگ کھاتے ہیں ہاں صرف وہ چیز تھی جسے بلال کی بغل سے چھپالیا تھا (4)۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ تکہ سے باہر چلے گئے تھے اور آپ کے ساتھ صرف حضرت بلال تھے۔ حضرت بلال کے پاس صرف اتنا کھانا تھا جسے وہ بغل کے نیچے دبا لیتے تھے (5)۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ستر اصحاب سفد دیکھے۔ ان میں سے کسی کے پاس درواہ نہ تھی یا تو ان کے پاس صرف تہ بند تھا یا ایک لمبی سی چادر تھی جسے انہوں نے اپنے گلے میں باندھ رکھا تھا۔ یہ چادر کسی کی پنڈلی اور کسی کے ٹخنے تک پہنچتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے چادر کو پکڑے رکھتے تاکہ کہیں ان کی شرمگاہ نہ کھل جائے (6)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں جو کی روٹی اور نمکین روغنی تیل لے آیا۔ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن کے طور پر رکھی تھی اور گھر والوں کے لئے اس سے جو لئے تھے۔ میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا آل محمد نے کبھی بھی ایک صاع گندم اور ایک صاع دانے کے ساتھ شام نہیں کی تھی، جبکہ اس وقت آپ کے عقد میں نو عمر تھیں (7)۔ امام ترمذی نے ابوظہر سے روایت کیا ہے ہم نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بیوک کی شکایت کی، ہم نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا نیچے ایک بچہ چتر تھا۔ حضور ﷺ نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو نیچے دو بچے تھے (8)۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ امام مسلم نے عبدالرحمن سے روایت کی ہے کہ تین آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے، جبکہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہا اسے ابو جعفر اللہ کی قسم ہمارے پاس کچھ بھی نہیں لکھا تارے نسواری ہے اور نہ ہی دوسری ضروریات زندگی۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا جو تم چاہو

2- صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2066 (ابن شہر)

1- الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (المنکر)

4- ایضاً، جلد 4، صفحہ 198

3- الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (المنکر)

6- مشکوٰۃ الصالح، جلد 3، صفحہ 119 (المنکر)

5- ایضاً

8- جامع ترمذی مع معارضۃ الاحادی، جلد 9، صفحہ 159 (العلیہ)

7- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (ادارت تعلیم)

اگر تم چاہو تو ہماری طرف آ جاؤ ہم تمہیں وہ عطا کر دیں گے جس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی پیدا کر دے گا۔ اگر تم چاہو تو تمہارا معاملہ تمہارے سلطان کے پاس پیش کر دیں۔ اگر تم چاہو تو صبر کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مہاجر و انصار نئی انصاریہ سے جنت میں چالیس سال پہلے جائیں گے تو انہوں نے کہا ہم صبر کریں گے کسی سے کوئی سوال نہ کریں گے (1)۔

امام احمد نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن میں بھیجا فرمایا پیش وعشرت سے دور رہنا کیونکہ اللہ کے بندے پیش وعشرت میں نہیں پڑتے (2)۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو انسان تھوڑے روزے سے اللہ پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائے گا (3)۔ امام ابو نعیم نے عبد الرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ ان کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزہ سے تھے فرمایا حضرت مصعب بن عمیر کو شہید کیا گیا، جبکہ آپ مجھ سے افضل تھے آپ کو ایک چادر میں لٹھن دیا گیا تھا اگر آپ کے سر کو ڈھانپنا چاہتا تو پاؤں لٹھن دیا جاتا تھے اگر پاؤں ڈھانپنے چاہتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ میرا خیال ہے انہوں نے کہا حضرت حمزہ شہید ہوئے۔ جبکہ آپ مجھ سے بہتر تھے پھر ہمارے لئے دنیا کشادہ کر دی گئی یا فرمایا ہمیں زیادتی گئی ہمیں ڈر ہے کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ ہمیں جلد دیا گیا ہے۔ پھر آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپ نے کھانا چھوڑ دیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے میرے ہاتھ میں گوشت لٹاتا ہوا دیکھا پوچھا اے جابر یہ کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے گوشت کی خواہش ہوئی میں نے اسے خریدا لیا۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ اے جابر جب بھی تیری خواہش ہوگی تو خرید لے گا۔ کیا تو اس آیت سے ڈرتا نہیں **أَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا** (1)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

حضرت جابر کی حدیث میں ہے کیا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ وہ اپنے بڑی اور اپنے بچپن پر ادا ہونے کی بجائے اسے لئے بھوکا رہے۔ رزین نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک روز حضرت عمر نے پانی طلب کیا آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا، جبکہ اس میں شہد ملا ہوا تھا فرمایا یہ بہت اچھا ہے لیکن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنتا ہوں۔ **أَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا وَاسْتَبَدَّتُمْ بِهَا** تو میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تمہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ جلدی (1) ہی نہ دے دیا جائے پھر آپ نے اس پانی کو نہ پیا۔

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 410 (تذمی) 2- مسند امام احمد، جلد 5، صفحہ 244 (سار)

3- شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 139 (اعلیٰ) 4- تفسیر ابو نعیم، جلد 2، ص 4

(1) حضرت سالم بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر ارشاد فرمایا کرتے تھے ہمارے پیش نظر لذات زندگی کا یہی مطلب نہیں کہ ہم ہماری کے بچ کو بھونے کا علم دینا، نہ بھوننا، یا جانے۔ میدے کی روٹی لپکانے کا کہیں تو روٹی پکائی جائے ہم کشش کو برتن میں ڈالنے کا حکم دیں اور اس کی ہمارے لئے نیند بنائی جائے یہاں تک کہ وہ زچکوری آنکھوں کی طرح ہو جائے پھر ہم اس کھانا کو کھا میں اور اس نیند کو چھینیں۔ بلکہ ہم تو یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی نیکیوں آخرت کے لئے باقی رکھیں کیونکہ ہم نے اپنے اللہ کا فرمان سن رکھا ہے **أَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمْ الدُّنْيَا**۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عمر بن خطاب ارشاد فرمایا کرتے تھے اگر میں چاہوں تو میں تم سے سب سے اچھا کھانا کھانے والا اور عمدہ لباس پہننے والا ہوں لیکن میں اپنی نیکیوں آخرت کیلئے چھوڑتا ہوں۔ ہمارے سامنے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمر شام تشریف لے گئے تو آپ کے لئے ایسا کھانا تیار کیا گیا جیسا کھانا پہلے آپ نے نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا یہ ہمارے لئے ہے تو ان مسلمان انصاریہ کے لئے کیا ہوگا جو اس دنیا سے چاہتے ہیں لیکن جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کھیں انہیں نبی سے ہوئی تو حضرت خالد بن ولید نے عرض کیا ان کے لئے جنت ہے تو حضرت عمر کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں۔ فرمایا اگر ہمارے لئے یہ پھر چیزیں ہیں اور ان کے لئے جنت تو وہ ہم سے بہت دور رکھ لگے۔ حمید بن بلال سے مروی ہے کہ بعض انصاریہ حضرت عمر کے پاس شام کے کھانے پر آئے تھے ہوتے۔ جب حضرت عمر کی خدمت میں کھانا پیش کیا جاتا تو وہ کھانا نہ کھاتے۔ حضرت (بقیہ حاشیہ صفحہ 528)

وَأَذْكُرُ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ الْبُغْدُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ
وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۗ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٠﴾

” (اے حبیب!) ذکر سنائیے انہیں قوم عاد کے بھائی (ہود) کا جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے
ڈرانے والے ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو (ورنہ) مجھے امدیش ہے کہ تم
پر بڑے دن کا عذاب نازل جائے۔“

۱۰۔ أَخَا عَادٍ سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کی ذات ہے۔ آپ نے اپنی قوم عاد کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اذاپنے مضاف
الیہ سے مل کر أَخَا عَادٍ سے بدل اشتمال ہے، یعنی جب وہ اپنی قوم عاد کو ڈرا رہے تھے اس کو یاد کرو۔ بِالْأَحْقَافِ میں باء، فی کے معنی میں
ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا احقاف عمان اور مہرہ کے درمیان واقع ہے۔ مقاتل نے کہا عاد کے گھر یمن میں حضرموت کے اس
علاقہ میں تھے جس کو مہر کہتے۔ مہر یہ اونٹن کی جگہ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ موسم بہار میں تجارت کے لئے گھروں سے نکل پڑتے۔
جب گرمی زیادہ ہو جاتی تو گھروں کو لوٹ آتے۔ یہ اہم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قنادہ نے کہا ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ عاد ایک قبیلہ تھا جو
یمن میں آباد تھا۔ یہ سمدر کے کنارے اس ریگستان میں رہتا تھا جسے شحر کہتے۔ احقاف ہف کی جمع ہے جس کا معنی ایسا ریگستان ہے جو
مستطیل اور فرم درخم ہو۔ ابن زید نے کہا ہف اس ریگستان کو کہتے ہیں جو پہاڑ کی شکل کا ہو لیکن پہاڑ بنتا بنتا بند نہ ہو۔ کسانے نے کہا گول
ریگستان کو ہف کہتے ہیں (۱)۔

اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں وَقَدْ خَلَّتِ الْبُغْدُ سے یا یہ اندو کے قائل سے حال ہے۔ بَيْنِ يَدَيْهِ سے
مراد حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و رسل ہیں اور وَمِنْ خَلْفِهِ سے مراد حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور
دوسرے انبیاء و رسل ہیں۔ اَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ میں ان مفسرہ ہے اور یہ اندو کی تفسیر بیان کرتا ہے یا مصدر یہ ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہوگا
کیونکہ جب کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے تو اس میں اس تکلیف سے خبردار کیا جاتا ہے۔ نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے الٰہی کو باء کے فقرہ کے

1۔ تفسیر بخاری زیر آیت نذرا

(یعنی حاشیہ صفحہ کریشہ) عمر نے حفص سے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو حفص نے عرض کیا اے امیر المؤمنین میرے گھر والے
میرے لئے جو کھانا بناتے ہیں وہ آپ کے کھانے سے نرم ہوتا ہے اس لئے آپ کے کھانے کی بجائے اس کھانے کو میں پسند کرتا ہوں تو حضرت عمر نے فرمایا
تیری ماں تجھے روئے کیا تم کا جانتے نہیں اگر میں جاہوں تو میں ایک موٹا تازہ بکری کا چھوٹی عمر کا بچہ ذبح کرنے کا حکم دوں، اس کے بال اتار لے جاؤں اور
اسے بھونڈا جائے پھر میں آنے کے بارے میں حکم دوں جسے باریک کپڑے میں چھپا جاتا ہے پھر اس سے نرم نرم دہنی بنائی جائے۔ میں ایک صانع کھنٹش کے
بارے میں حکم دوں جسے پانی کے ایک بڑے برتن میں ڈال دیا جائے اس کا رنگ اسی طرح سرخ ہو جائے جس طرح جرن کی آگ بھونڈی ہے۔ حفص نے عرض
کی میں جانتا ہوں آپ عہد کھانوں کو پچھانے ہیں تو حضرت عمر نے فرمایا تیری ماں تجھ پر روئے۔ مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے جنت قدرت میں
میری جان ہے اگر مجھے یہ پانچ ہند نہ ہوتا کہ قیامت کے دن نیکیوں میں کی کردی جا سکتی تو میں ضرور تمہارے ساتھ مہم اور نرم کھانوں میں شریک ہوتا۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ بصرہ سے ایک وفد حضرت موسیٰ کی قیادت میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہود آپ کے
کھانے پر کوئی چیز لگی ہوئی تھی کھجی دیکھتے کراس پر دودھ لگا ہوا کھجی اس پر خشک گوشت کا قیر بنا کر لگا دیا گیا ہوتا اور کھجی گوشت کا سان ہوتا لیکن یہ بہت ہی کم
ہوتا حضرت عمر نے فرمایا میرا خیال ہے تم ہر قسم کے کھانے کو اچھا نہیں جانتے اللہ کی قسم اگر میں جاہوں تو میں تم سب سے اچھا کھانا کھاؤں اور عہد باس پہنوں
اور کھجی زندگی گزاروں میں مرنے والی اور بصرہ سے واقف نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو اپنی ہی ہے۔ اَذْكُرْتُمْ فَتَذَكَّرْتُمْ اَللّٰهُمَّ

ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے، یعنی اُرْتَمَ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرو گے تو مجھے ڈر ہے کہ تمہیں اس دن کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جس کی آزمائش سخت ہوگی۔

قَالُوا اَجْزَلْنَا يَا فِرْعَوْنُ الْاِيْتِنَا قَاتِلًا بِمَا تَعْدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٥٠﴾ قَالَ
اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ مِمَّا اُرْسِلْتُمْ بِهِ وَاَلَيْكُمْ اَنْ اَسْئَلَكُمْ فَمَا تَعْجَهُوْنَ ﴿٥١﴾

”وہ (برافر وخت ہو کر) بولے (اے ہودا!) کیا تم اسلئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے برگشتہ کر دو۔ سہل آؤ (وہ عذاب) جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود نے فرمایا کہ نزول عذاب کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ اس میں (برابر) پہنچا رہا ہوں تمہیں وہ پیغام جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہل قوم ہو۔“

۱۔ اَجْزَلْنَا میں استفہام تقریری ہے، یعنی یقیناً آپ اس لئے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں ان باتوں کی عبادت سے دور کر دیں اگر آپ اپنی دھمکی میں سے ہیں تو شرک پر وہ عذاب لے آئیں۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ سابقہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ تمہارے عذاب کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ مستقبل میں جو وقت اس کا مقرر ہے۔ اس میں عذاب آ جائے گا۔ اسی وقت عذاب کے نہ آنے کی صورت میں میرا جھوٹا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل بھی نہیں کہ تم مجھ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کر دو میں تو تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میری طرف تو حیدر احکام اور عذاب کے نازل ہونے کی خبریں وغیرہ وہی کی جاتی ہے۔ عذاب اس صورت میں نازل ہوگا اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ نافع ابو عمر و ابو رزین نے یاء کے فقرے کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں تمہیں جاہل خیال کرتا ہوں کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ عظیم و قدر ہے، جبکہ رسولوں کو تو مبعوث ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کریں اور پیغام حق پہنچائیں۔ انہیں عذاب دینے اور عذاب طلب کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔

فَاَلَمْ نَسْرِ اَوْ لَا عَارٍ صَا مُسْتَقْبِلِ اَوْ دِيْتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّصِطِرٌ نَّابِلٌ هُوَ
مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ ؕ اَلَمْ يَرَوْا فِىْهَا عَذَابَ الْاَلِيْمِ ﴿٥٢﴾

”پس جب انہوں نے دیکھا عذاب کو بادل کی صورت میں کہ وہ ان وادیوں کی طرف آ رہا ہے تو بولے یہ بادل ہے ہم پر برسنے والا ہے (نہیں نہیں) بلکہ یہ تو وہ عذاب ہے جس کے لئے تم جلدی پھا رہے تھے (یہ تند) ہوا ہے اس میں دردناک عذاب ہے۔“

۱۔ اَوْ دِيْتِهِمْ میں ضمیر ما تعدنا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس سے عذاب مراد ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے اور ما بعد اس کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ وہ عذاب بادل کی شکل میں تھا اور آسمان کے عرض سے نمودار ہوا اور ان کی وادیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ دو سال سے ان کے ہاں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بادل کو دیکھ کر وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان کا وہ قدسورۃ اعراف میں گزر چکا ہے۔ کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسانے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یا حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا یہ بارش برسانے والا بادل نہیں جس طرح تم نے گمان کیا ہے بلکہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کر رہے تھے یہ وہ عذاب ہے۔ یہ ہوا ہے جس میں عذاب ہے۔ ریح مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے

ہی ریح یا ام موصول ما سے بدل ہے۔ **فِيهَا عَذَابٌ يَرِيحُ** کی صفت ہے۔ الیم یہ عذاب کی صفت ہے۔

**تُدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَكِنُهُمْ ۗ كَذَلِكَ نَجْزِي
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝**

”جس نبس کر کے رکھو گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پس جب ان پر صبح ہوئی تو نہ دکھائی دی کوئی چیز جو ان کے (دوران) مکانوں کے اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرموں کو۔“

۱۔ وہ ہوا ان میں سے جس پر گزرے گی اور جس مال کے پاس سے گزرے گی اسے ہلاک کر دے گی۔ شدید آندھی آئی جس نے نیچوں اور ان کی سواریوں کو اٹھایا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ یہ سب چیزیں ٹٹی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے اس عذاب کو پہچانا جنہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے وہ اموال جو شہر سے باہر تھے ہوا انہیں زمین و آسمان کے درمیان اڑا رہی ہے۔ وہ لوگ وہاں پلٹ آئے اور اپنے دروازوں کو بند کر لیا سخت آندھی آئی اور اس نے ان کے دروازوں کو توڑ دیا اور انہیں زمین پر پھینکا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے ان پر ریت ڈال دی۔ وہ سات راتیں اور آٹھ دن تک ریت کے نیچے پڑے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے انہیں ریت سے بٹکا کر دیا۔ ہوا نے انہیں اٹھایا اور اندر میں پھینک دیا۔

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ کا عطف قال اللہ اور قال ہود محذوف پر ہے۔ عام حمزہ اور یعقوب نے یومی کو مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ انہیں آراء نے **مَسَكِنُهُمْ** کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ یومی کا نائب فاعل ہے، جبکہ باقی قراء نے لا نوی مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے یا مخاطب کو خطاب ہے اور **مَسَكِنُهُمْ** کو مفعول ہے ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو لکھلا کر بٹھتے ہوئے نہیں دیکھا کہ میں آپ کا کواد کچھ سکتی۔ آپ ہمیشہ مسکراتے تھے۔ جب آپ بادل یا ہوا دیکھتے تو پریشانی آپ کے چہرے پر دکھی جاسکتی۔ متفق علیہ (۱)۔ امام بخاری کے ہاں ایک روایت میں ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب لوگ بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، انہیں امید ہوتی ہے کہ بارش نازل ہوگی۔ جب آپ بادل دیکھتے ہیں تو پریشانی کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسے عائشہ مجھے خوف ہوتا ہے کہیں اس میں عذاب ہی نہ ہو کیوں کہ ایک قوم کو ہوا سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا۔ قوم نے عذاب کو دیکھا تھا تو انہوں نے کہا یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسانے گا۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے جب ہوا چلتی تو حضور ﷺ یوں دعا کرتے اسے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی اس میں جو خیر ہے اور جس خیر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس کا سوال کرتا ہوں۔ اس کے شر اس میں جو شر ہے اور جس شر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ جب آسمان ابرو لود ہوتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا آپ کبھی باہر تشریف لے جاتے کبھی اندر تشریف لاتے کبھی رخ انور ادھر کرتے کبھی دوسری طرف کر لیتے۔ جب بارش ہوتی تو کیفیت بدل جاتی تو میں نے یہ صورت پہچانی اسی لئے میں نے سوال کیا فرمایا اسے عائشہ شاید اس کی طرح ہو جس طرح عاد نے کہا تھا۔ فلما راہ عارضا مستقبل اودینہم قالوا هذا عارض ممطر (۲) ایک روایت میں ہے جب آپ بارش دیکھتے تو فرماتے میں رحمت کا امیدوار ہوں۔ متفق علیہ۔

ابوداؤد سنی ابن ماجہ اور شافعی کے نزدیک ایک روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ آسمان پر آمدی باہا دل وغیرہ دیکھے آپ اپنا کام چھوڑ دیے۔ آسمان کی طرف چہرہ انور کرتے اور یوں گویا ہوتے اس میں جو شر ہے اس سے اللہ کی پناہ جانتا ہوں۔ (الحدیث) (1) حضرت ابن عباس سے مروی ہے جب بھی تیز ہوا چلتی تو حضور ﷺ کھنٹوں کے بل جھک جاتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یوں عرض کرتے اے اللہ سے رحمت بنادے، اے عذاب نہ بنا نا۔ (الحدیث) (2) اسے امام شافعی اور بخاری نے روایت کیا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنْهُمْ فَيًّا إِنَّ مَكَّنْكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَعَاءً وَابْصَارًا وَافْدًا قَمًّا
أَعْنَى عَنْهُمْ سَعَهُمْ وَلَا ابْصَارُهُمْ وَلَا آفِدْتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا
يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ⑩

”اور ہم نے ان کو وہ قوت و طاقت بخشی تھی جو ہم نے تمہیں نہیں دی اور ہم نے عطا کئے تھے انہیں کان، آنکھیں اور دل لیکن ان کے کسی کام نہ آئے ان کے کان، نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کیونکہ وہ انکار کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور احاطہ کر لیا ان کا اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔“

۱۔ ہم خمیر سے مراد قوم عاد ہے۔ فیصا میں مضمولہ ہے یا موصوف ہے اور ان نافر ہے یہاں ما کی بجائے ان نافر ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے تاکہ لفظوں میں بھرا لازم نہ آئے یعنی ہم نے قوت اور مال میں انہیں قدرت دی تھی، جنہیں اس کی قدرت عطا نہیں کی یا ما شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے۔ لفظ یرکام کی صورت میں اس کا معنی یہ بنے گا ہم نے انہیں قدرت عطا کی مگر جنہیں بھی اتنی قدرت عطا کرتے تو تمہاری سرکشی زیادہ ہوتی، جبکہ پہلی خمیر زیادہ واضح ہے کیونکہ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے احسن المائنا قوم عاد شکرین مکہ سے قوت و طاقت میں بڑھ کر تھے۔

ہم نے انہیں کان آنکھیں اور دل عطا فرمائے تاکہ وہ ان کے ذریعے نعمتوں کو پہچانیں اور نعمتیں عطا فرمانے والے کو پہچانیں اور اس کا شکر بجالانے پر مواعظت اختیار کریں۔ ان کے کانوں آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ من شئی میں من زائدہ ہے۔ اذ ظرف ہے مگر علت کے قائم مقام ہے کیونکہ جس کی طرف اذ مضاف ہو رہا ہے اس پر حکم مرتب ہوگا تو یہ ما اعنی کی علت ہے اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر نازل ہو گیا۔

وَلَقَدْ أَهَلَّكُمَا حَوْكَلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ⑪

”اور ہم نے ہر یاد کردیے وہ دو گاؤں جو تمہارے ارد گرد (آباد) تھے اور ہم نے مختلف انداز میں اپنی نشانیاں پیش کیں شاید وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں۔“

۱۔ کم خمیر سے مراد اہل مکہ ہیں۔ قری سے مراد قوم ثمود اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یعنی ان بستیوں میں رہنے والے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر دلائل بار بار بیان فرمائے تاکہ اہل مکہ کفر سے باز آجائیں لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ یہ صرفنا کی علت ہے۔ اس میں خطاب سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ حُرْبًا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۱﴾

”پس کیوں مدد نہ کی ان کی ان معبودوں نے جنہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب کے لئے (اپنے) خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ تو ان سے روپوش ہو گئے اور یہ محض ان کا ڈھونگ تھا اور بہتان جو وہ باندھتے تھے۔“

۱۔ جن کو ان لوگوں نے معبود بنایا تھا جن کے وسیلہ سے وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتے تھے ان معبودوں نے انہیں عذاب سے نہ بچایا۔ وہ اپنے معبودوں کے بارے میں کہتے تھے هَلْؤا لَّا شَيْعًا وَاُنَّا بَعْدَ اللّٰهِ كَا سِبْطَا مَفْعُولِ اسْم ضَرِيحٍ جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ قربانا اس کا دوسرا مفعول ہے اور الہیۃ دوسرے مفعول سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یا الہیۃ دوسرا مفعول ہے اور قربانا اس سے حال ہے یا تقرب کے معنی میں ہو کر مفعول لہ ہے یا یہ مفعول مطلق ہے بلکہ جب عذاب نازل ہوا تو ان کی مدد کرنے سے ان کے معبود غائب ہو گئے اور ان کے لئے اپنے معبودوں سے مدد اسی طرح مستنع ہو گئی جس طرح اس آدمی سے مدد مستنع ہوتی ہے جو موجود نہ ہو۔ جن چیزوں کی یہ حیثیت ہے انہیں معبود بنانا ان کا جھوٹ اور حق سے انحراف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ذلک کا مشار الیہ ان کی مدد کی نفی ہے۔ اسم اشارہ مبتدأ ہے اور الفحکم مضاف کے حذف کے ساتھ اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہو گا ان کی مدد اس لئے نہیں ہوئی کیونکہ یہ ان کے جھوٹ کا نتیجہ ہے۔ یہ جملہ مترشح ہے اور مشار الیہ کے سبب کو بیان کرتا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ وہ ادنیٰ شخصہ میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے قرآن حکیم کو سنا تو کہا خاموش ہو جاؤ یہ کل نو جن تھے ان میں سے ایک روز بھی تھا (۱)۔

وَ اِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفْرًا مِّنَ الْجِبْتِ يَتَسَبَّحُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَصَرَوْهُ قَالُوا
اَنْصَبُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُّسْتَبْرِئِينَ ﴿۱۲﴾ قَالُوا لَيْقَوْمًا اِنَّا سَمِعْنَا
كِتَابًا اُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي اِلَى الْحَقِّ وَاِلَى
طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۳﴾ لَيْقَوْمًا اَجِيبُوا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاصْبِرُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ
دُوْنِكُمْ وَيُجِزْكُمْ مِّنْ عَذَابِ اَلِيْمٍ ﴿۱۴﴾ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي
الْاَمْرٰى وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُوْنِهَا اَوْلِيَاءٌ اُولٰٓئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۵﴾

”اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن میں توجہ آپ کی خدمت میں پہنچے تو بولے خاموش ہو کر سناؤ پھر جب تلاوت ہو چکی تو بولے اپنی قوم کی طرف ڈرنا سنا تے ہوئے۔ انہوں نے (جا کر) کہا ہے ہماری قوم ہم نے (آج) ایک کتاب سنی ہے جو اتاری گئی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم قبول کرو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو اور اس پر ایمان لے آؤ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو اور پچالے گا تمہیں دردناک

عذاب سے حج اور جو قبول نہیں کرتا اللہ کی طرف جانے والے کی دعوت کو تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں زمین میں (کہ اس سے بچ کر بھاگ نکلے) اور نہیں اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار یہ (منکر لوگ) کھلی گمراہی میں ہیں۔“

۱۔ یہ جملہ آخر تک جملہ معترضہ ہے۔ مقصود حضور ﷺ کو تسلیم دینا ہے۔ ہم نے آپ کی طرف جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ نغریابی جماعت کو کہتے ہیں جس کی تعداد اوس سے کم ہو۔ اس کی جمع انفرادی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ نصیبین کے سات جن تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف اپنا قاصد بنا کر بھیجا، جبکہ دوسرے علماء نے فرمایا ان کی تعداد تو بھی امام بغوی نے فرمایا عامم نے زرن حبش سے روایت کیا ہے کہ روز بعد ان جنوں میں سے تھا جنہوں نے قرآن حکیم سنا تھا۔ یَسْتَعِينُونَ الْقُرْآنَ یہ نعرے سے حال ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا جب انہوں نے قرآن حکیم سنا تو جنوں نے ایک دوسرے کو کہا تَاْمُوشْ ہر جاؤ تاکہ ہم قرآن حکیم کو سیکھیں۔ بس حضور ﷺ قرأت سے فارغ ہوئے تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے تاکہ حضور ﷺ کے حکم سے دوسرے جنوں کو ڈرائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں۔ ہم نے جنوں کے اس واقعہ کو سورہ جن میں بیان کیا ہے۔

۲۔ عطاء نے کہا ہے ان جنوں کا پہلا دین یہودیت تھا (1) میں کہتا ہوں شاید ان کے قول اُنْزِلَ مِنْ سَمَوَاتٍ مُّوَسَّسَاتٍ کا مطلب یہ ہے جو تورات کی ناسخ ہے۔ انجیل اور زبور کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ دونوں تورات کے اکثر احکام کی ناسخ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالشُّرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ﴿۱۰﴾ اور آپ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے کہا وَلَا حُدُودَ لَكُمْ بِغَضِّ النَّبِيِّ سِوَمَ عَذَابِكُمْ یعنی تاکہ تم پر بعض ان احکام کو حلال کروں جنہیں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ لَهَا بَشَرٌ يَدِينُہ سے مراد تورات انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں ہیں۔ مُّصَدِّقَاتٍ يٰۤاَقْرٰنِیْنَ کے فاضل سے حال ہے یا کتابا کی دوسری صفت ہے۔ یہ قرآن حکیم عقیدہ حقہ اور شریعت کے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

۳۔ داعی اللہ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جو اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے ان گناہوں کو بخش دے گا جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں جو حقوق العباد ہیں۔ وہ صرف ایمان لانے سے معاف نہیں ہوتے نیز تمہیں درو تاکہ عذاب سے بچاؤ دے گا۔ ان جنوں کی دعوت کو ستر جنوں نے قبول کیا وہ سب حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور علماء میں آپ سے ملے۔ حضور ﷺ نے انہیں قرآن سنایا۔ آپ نے انہیں چند چیزوں کا حکم دیا اور چند چیزوں سے انہیں منع کیا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضور ﷺ جنوں اور انسانوں سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ہم نے سورہ جن میں مومن جنوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ذکر کر دیا ہے۔

۴۔ جو اللہ تعالیٰ کے داعی، یعنی حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرے تو اللہ تعالیٰ جب اسے عذاب دینے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتا اور نہ اس کے کوئی ایسے دوست ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رکھ سکیں۔ لَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِہٖ اَوْلِيَاءُ یہ جملہ لَيْسَ بِمُعْجِزٍ کے فاضل سے حال ہے اور جملہ شرطیہ جملہ معترضہ ہے۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ واضح گمراہی میں ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَكُنْ لِيَّحِقْهُنَّ بَقِيْدٌ

اور زخمی کر دیا۔ وہ نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ میرے مقام و مرتبہ کو نہیں جانتے۔ متفق علیہ (1)۔

اے محبوب آپ کفار کے قریش کے بارے میں عذاب نازل ہونے کی بددعا نہ کریں کیونکہ وقت مقررہ میں ان پر عذاب ضرور نازل ہوگا۔ گویا قوم کی مخالفت کی وجہ سے آپ کا دل تنگ ہوا تھا تو آپ نے یہ پسند کیا کہ جو انکار کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو تو اللہ تعالیٰ نے صبر اور جلدی ترک کرنے کا حکم دیا پھر یہ خبر دی کہ جلد ہی عذاب نازل ہوگا گویا جب وہ آخرت میں عذاب دیکھیں گے تو وہ خیال کریں گے کہ وہ دنیا میں بہت تھوڑا وقت رہے ہیں گویا وہ اس کی ہولناکی دیکھ کر دنیا میں ٹھہرنے کے عرصے کو وہ مختصر خیال کریں گے یہاں تک کہ وہ گمان کریں گے کہ وہ تو صرف ایک گھڑی دنیا میں ٹھہرے ہیں اگرچہ وہ طویل عرصہ تک دنیا میں رہے تھے لیکن جب وہ وقت ختم ہو گیا تو گویا وہ وقت تھا ہی نہیں۔ **كَأَنَّهُمْ يُبَدِّلُونَ** والا جملہ **وَلَا تَسْتَعْجِلْ** والے جملہ کی علت کے عمل میں ہے پھر فرمایا اسی چیز کی تمہیں نصیحت کی گئی یا یہ سورت یا یہ قرآن اور جو کچھ اس میں وضاحت ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں کافی ہے یا یہ رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ ہے۔ بلاغ کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ تعظیم اور تحکم کا اظہار ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا بلاغ مبتدا ہے اور لہضم اس کی خبر ہے۔ درمیان میں جملہ مختصر ہے، یعنی ان کے لئے وقت ہے جس تک وہ پہنچیں گے۔ گویا جب وہ اس وقت تک پہنچیں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے دیکھیں گے تو اپنی عمر کی مدتوں کو چھوٹا خیال کریں گے۔

قَهْلٌ لِّهَذَا میں استہمام انکاری ہے، یعنی عذاب کے ساتھ کسی کو بھی ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ مگر انہیں لوگوں کو جو نصیحت حاصل کرنے اور اطاعت سے خارج ہیں۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ہوتے ہوئے کوئی ہلاک نہیں ہوتا مگر فاسق قوم ہی ہلاک ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک قوم نے کہا اس آیت سے بڑھ کر کوئی اور آیت نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قوی امید ہو (2)۔

سورہ محمد

﴿سورہ محمد ۲۸﴾ ﴿سورہ محمد ۲۸﴾ ﴿سورہ محمد ۲۸﴾

سورہ محمد مدنی ہے، اس میں اترتیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصْبُوا وَاعْنَ سَبِيلِ اللّٰهِ اَصْلَ اَعْمَالِهِمْ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۝ وَاصْلَحْ بِاٰلِهِمْ ۝

”جنہوں نے (خود بھی) حق کا انکار کیا اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے رہے اللہ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایمان لے آئے جو اتارا گیا (رسول معظم) محمد ﷺ پر اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دور کر دیں ان سے ان کی برائیاں اور سنوار دیا ان کے حالات کو۔“

جب انہوں نے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا کیونکہ وہ خود اسلام میں داخل ہونے اور اس راہ پر چلنے سے رک گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انکے اعمال کو ضائع کر دیا کیونکہ انہوں نے ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا تھا۔ دنیا میں انہیں ان اعمال کا بدلہ بطور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ملتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لئے ثواب نہیں بنایا۔ یہاں اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو ظاہر میں اچھے ہیں جس طرح لوگوں کو کھانا کھانا صلہ رحمی کرنا قیدی چھڑانا پڑوسیوں کی حفاظت کرنا۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ جو کر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو باطل کر دیا اور اس کا وبال انہیں پر پلٹا دیا (۱)۔

۲۔ وہ چیزیں جن پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے حضور ﷺ پر نازل کردہ چیز کی تخصیص آپ کی عظمت بیان کرنے کے لئے ہے اور یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہی ایمان کی اصل ہے اور دوسری تمام ایمانیاں کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کے ساتھ اس کی تاکید لگائی۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ یہ جملہ مترضہ ہے اور حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کے حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور ان کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو بخش دیا اور ان پر پردہ ڈال دیا اور دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کی اطاعت کی توفیق دی گناہوں اور شیطان کے غلبے سے محفوظ رکھا۔ اس طرح دنیا میں ان کی

حالت کو بہتر بنایا اور جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں انہیں ہمیشہ کے لئے داخل کر کے ان کی حالت کو درست کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی ہے دنیاوی زندگی میں انہیں محفوظ رکھا (۱) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ پہلی آیت میں مذکور کافروں سے مراد مشرکین نہ ہیں اور اس آیت میں مذکور مشرکین سے مراد انصار ہیں (۲) میں کہتا ہوں لفظ عام ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تَتَّبِعُوْنَ الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَتَّبِعُوْنَ الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ كَذٰلِكَ يُضَيِّبُ اللّٰهُ لِنَاسٍ اَمْثَلِهِمْ ۗ قٰذَا لَقِيْتُمْ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضْرَبِ الرَّقَابَ ۗ حَتّٰى اِذَا اَخَذْتُمْهُمْ فَغٰدُوْا وَاَلْوَتٰقِ ۗ فَاَمَّا مَنۢ بَعْدَ وَاَمَّا فِدَاۤءٌ حَتّٰى تَضْمَعَ الْعَرْبُ اَوْزَارَهَا ۗ ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوۤا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُوْنُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَنُقِبْۙ اَعْمَالِهِمْ ۗ

”یوں (۱) اس لئے کہ جنہوں نے کفر کیا وہ باطل کی پیروی کرتے تھے اور جو ایمان لائے تھے وہ حق کی پیروی کرتے تھے جو ان کے رب کی طرف سے تھا اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے ان کے حالات لے چر جب (میدان جنگ میں) تمہارا کفار سے آنا سامنا ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر لو تو پھر کس کر باندھو عریاں بعد از ان یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہی حکم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلے لیتا لیکن وہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں بعض کو بعض سے اور جو مار ڈالے گا اللہ کی راہ میں پس اللہ ان کے اعمال ضائع نہیں ہونے دے گا۔“

لے ذلک اسم اشارہ سے مراد اضلال (گمراہ کرنا) نعمتوں کی ناشکری اور اصلاح و تعمیر کا ذکر اوپر گزر چکا ہے وہ مراد ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور ما بعد اس کی خبر ہے۔ آیت کریمہ میں باطل سے مراد شیطان ہے اور حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَمْثَلِهِمْ میں ضمیر سے مراد لوگ ہیں یا جن دو جماعتوں کا ذکر کیا گیا تھا وہ مراد ہیں۔ معنی یہ ہو گا اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے تا کہ لوگ ان دونوں جماعتوں کی مثالوں سے عبرت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے عمل کو باطل کی اتباع ان کے خائب و خاسر ہونے کو عمل ضائع کر دینے، مومنوں کے عمل کو حق کی اتباع کرنے اور ان کی کامیابی کو نعمتوں کے بخشش کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔ آیت کریمہ میں لقا سے مراد دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔ ضرب الرقاب مفعول مطلق ہے، اس کا فعل محذوف ہے۔ اصل میں کلام یوں تھی فاضر بوا الرقاب ضربا فاضل کو حذف کر دیا گیا اور مصدر کو فعل کے قائم مقام رکھ دیا گیا پھر مصدر کو مفعول ہی کی طرف مضاف کیا ہے تاکہ تاکہ اور اختصار کا فائدہ دے۔ قتل کو ضرب الرقاب سے تعبیر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ جنگ میں جہاں تک ممکن ہو اگر دو کو اڑایا جائے کیونکہ اس سے عموماً موت واقع ہوتی ہے، جبکہ دوسرے زمینوں سے ایسی صورت حال نہیں ہوتی۔ فرمایا جب تم انہیں خوب قتل کر لو اور ان سے جنتی کے ساتھ جنت چلو تو انہیں قید کر لو۔ اَخَذْتُمْهُمْ یہ تخمین سے مشتق ہے، یعنی انہیں مضبوطی سے باندھ لو تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ وثاق کو واؤ کے کسرہ اور فتح دونوں صورتوں میں اس کا معنی رسی ہے۔ منا اور فدا، ترکیب

کلام میں مشغول مطلق ہیں۔ ان کے فعل محذوف ہیں۔ تقدیر کلام کا معنی یوں ہے کہ انہیں گرفتار کرنے کے بعد بطور احسان آزاد کر دو۔ یا فدیے لے کر آزاد کر دو امام بغوی نے فرمایا علماء نے اس آیت کے حکم میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم نے یہ کہا اس آیت کا حکم اللہ تعالیٰ کے فرمان **فَاتَّقُوا اللَّهَ كَيْفَ كُنْتُمْ وَجِدْتُمْهُمْ** اور اللہ تعالیٰ کے فرمان **فَاتَّقُوا اللَّهَ كَيْفَ كُنْتُمْ فِي الْحَرْبِ فَتَنْتَظِرُوهُمْ مِمَّنْ خَلَقْتُمْ** سے منسوخ ہے۔ قادیانہ حاکم سعدی اور ابن جریج کا یہی قول ہے، اور زامی کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ میں کہتا ہوں **فَاتَّقُوا اللَّهَ كَيْفَ كُنْتُمْ** کو اس آیت کا ناخ بنانا درست نہیں، جبکہ **اقتلوا المشركين** کا حکم بعض مشرکوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ قیدیوں کو غلام اور ڈی بنانا ہمارے احناف اور مالکیہ کے نزدیک درست ہے۔ اس آیت کا حکم ظنی ہے کیونکہ یہ ایسا عام ہے جس میں سے بعض افراد خاص ہیں اس وجہ سے وہ اس آیت کی ناخ نہیں بن سکتی کیونکہ اس کا حکم قطعی ہے۔

دوسرے علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم آیات میں سے ہے۔ کفار میں سے جو لوگ گرفتار کیے جائیں ان کے بارے میں امام کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ انہیں قتل کرنے کا حکم دے۔ انہیں غلام بنالینے کا کہے ان پر احسان کرے اور بغیر عوض کے آزاد کر دے یا مال لے کر یا مسلمان قیدیوں کی صورت میں فدیے لے کر آزاد کر دے۔ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت حسن بصری حضرت عطاء مکرہ صحابہ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام ثوری امام شافعی امام احمد اور امام احناف کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور ان کی حکومت مضبوط ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں یہ حکم اور شرف فرمایا کہ چاہو احسان کرو یا فدیے لو اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء نے اسی پر عمل کیا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان **مَنْ كَفَرَ بَعْدَ مَا جَاءَهُ بِالْبَيِّنَاتِ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا** کے لئے ناخ ہے کیونکہ یہ آیت غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قیدیوں پر احسان فرمایا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ مکہ کے اسی (80) آدمی اسلحہ سے لیس حکم پہاڑ سے اترے وہ حضور ﷺ اور صحابہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ کے صحابہ نے انہیں پکڑ لیا اور حضور ﷺ نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا **وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ** **أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ** اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ میں نے قیدیوں کے احکام علماء کا اختلاف اور اس بارے میں احادیث سورۃ انفال کی آیت **مَنْ كَفَرَ بَعْدَ مَا جَاءَهُ بِالْبَيِّنَاتِ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا** میں بیان کر دی ہیں۔ حرب سے جنگ کرنے والے لوگ مراد ہیں۔ اور اسے مراد اسلحہ ہے۔ معنی ہے حتی کہ جنگ ختم ہو جائے اور مسلمان یا جسے پناہ دی گئی اس کے علاوہ کوئی باقی نہ رہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اور اسے مراد گناہ ہیں مطلب یہ ہوگا کہ مشرک کفر سے توبہ کر لیں اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حرب کا معنی جنگ ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ تہاری جنگ اور قتال مشرکوں کے اسلحہ اور ان کے اعمال کی قباحتوں کو ختم کر دے، یعنی وہ مسلمان ہو جائیں یا اس کا معنی یہ ہے مشرکوں کو قتل کرنے اور قیدی بنانے کے ساتھ انہیں کمزور کر دو یہاں تک کہ تمام دوسری قومیں اور دینوں والے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ ختم ہونے کو قتل یا قیدی یا احسان یا فدیہ یا سب کی غایت بنایا ہے، یعنی یہ احکام جاری رہیں گے یہاں تک کہ ان کی شرکت ختم ہو جائے اور مشرکوں کے ساتھ جنگ نہ رہے۔ یہ صورت حال اسی وقت ہوگی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔

حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت حق پر ہوتے ہوئے جنگ کرتی رہے گی اور اپنے مخالفین پر غالب رہے گی یہاں تک کہ ان میں سے آخری آدمی دجال سے جنگ کرے گا اسے ابوراد نے روایت کیا ہے (1) ابو ہامی نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے مبعوث کیا اس وقت سے جہاد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا یہاں تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرے گا۔ ذلک مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلَا تُحِبُّونَ فِیْہِ ذٰلِکَ یا ام اشرارہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ذلک ثابت یا محذوف فعل کا مقول ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَفْعَلُوْا بِہِمْ ذٰلِکَ اس صورت میں یہ جملہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔

انصحر کا معنی انتقام لینا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کفار کو ہلاک کر کے ان سے انتقام لے لیتا اور تمہیں جہاد کا حکم نہ دیتا لیکن اس نے تمہیں حکم دیا کہ جہاد کرو تا کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمانے، یعنی مومنوں کو کفار کے ساتھ آزمانے تاکہ مومن ثواب کے مستحق بن جائیں اور کافروں کو مومنوں کے ساتھ آزمانے، یعنی مومنوں کے ہاتھوں انہیں جلدی سزا دے تاکہ بعض کفر سے باز آسکیں اور بعض جہنم کے مستحق بن جائیں۔ اس جملہ میں حکمت بیان کی، جبکہ مومنوں کو جہاد کا مکلف کیے بغیر کفار کو نیست و نابود کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے ممکن تھا۔ بصرہ کے قراء اور حصر نے قتلوا کو مجرد سے ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر سے مراد شہداء ہیں، جبکہ باقی قراء نے مقاتلہ سے قاتلوا پڑھا ہے۔ اس صورت میں واؤ ضمیر سے مراد مجاہدین ہیں۔ قلن یعضل یہ جملہ خبر ہے اور اس کا مبتدا اسم موصول ہے مبتدا میں کیونکہ شرک کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے خبر خبر پر فاء کو ذکر کیا، یعنی گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا بلکہ ان کی خطاؤں کو معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں پر انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ بزاز تہذیبی اور اصغری نے ترمذی میں حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اشرار و فرمایا شہید تمہیں قسم کے ہیں ایک وہ آدمی جو اپنی جان اور مال کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکل پڑتا ہے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔ وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ جہاد کرے گا اور شہید ہوگا اس کی یہ نیت تھی کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔ اگر وہ مر گیا یا قتل کر دیا گیا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ عذاب قبر سے اسے نجات مل جائے گی بڑی گھبراہٹ میں امان نصیب ہوگی۔ حورین کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی۔ غزت والا لباس اسے پہنایا جائے گا اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔

دوسری قسم کا شہید وہ ہے جو اپنی جان اور مال کے ساتھ گھر سے نکلا۔ مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے یہ بھی ارادہ کرتا ہے کہ وہ قتل تو کرے لیکن شہید نہ ہو اگر اس مجاہد کو موت آجائے یا شہید کر دیا جائے تو اس کے گھٹنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملے ہوں گے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوں گے۔ شہید کی تیسری قسم وہ ہے جو اپنے مال اور جان کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ وہ یہ ارادہ رکھتا تھا کہ وہ قتل کرے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ مر گیا یا شہید کر دیا گیا تو وہ قیامت کے روز یوں آئے گا کہ وہ تلوار سونے ہوئے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہوگا، جبکہ لوگ گھنٹوں کے بل گرے ہوں گے۔ یہ شہداء نہیں گئے ہمارے لئے جگہ کھلی کر دو کیونکہ ہم نے اپنے مال اور جانیں اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کی ہیں یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے نور کے منبر کے پاس آئیں گے اور ان پر بیٹھ جائیں گے وہ دیکھیں گے کہ لوگوں کے درمیان کیسے فیصلہ ہوتا ہے۔ انہیں موت کا کوئی غم نہ ہوگا اور نہ ہی

برزخ میں انہیں آزمائش میں ڈالا جائے گا نہ انہیں حساب میزان اور بل صراط پریشان کرے گا۔ وہ جس چیز کا سوال کریں گے انہیں عطا کی جائیگی وہ جس چیز کے بارے سے سفارش کریں گے ان کی شفاعت تسلیم کی جائے گی جنت میں جو چیز چاہیں گے انہیں وہ دی جائے گی۔ جنت میں جہاں چاہیں گے انہیں وہاں ٹھکانا دیا جائے گا (1)۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ احد کے دن نازل ہوئی مسلمانوں میں زہی اور شہید ہر طرف پھیلے ہوئے تھے (2) مشرکوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اعلیٰ ہبل مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اللہ اعلیٰ وَاَجَلُ مَشْرُوكُنَّ لَنَا اِنَّ الْعَزْزَىٰ وَلَا عَزْزَىٰ لَكُمْ تَوْرَسُو اللّٰہَ ﷺ نے فرمایا یہ کہو اللّٰہُ مُؤَلّا وَلَا مُؤَلّا لَكُمْ۔

سَدِّدْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا اِنَّ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ يَنْصُرْكُمْ وَيَهَيِّئْ لَكُمْ
اٰمَنُوْا اِنَّ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ يَنْصُرْكُمْ وَيَهَيِّئْ لَكُمْ

”وہ پانچواں ہے گا انہیں بلند مہاج پر اور سنوار دے گا ان کے حالات کو اور داخل کرے گا انہیں بہشت میں جس کی پہچان اس نے انہیں کرا دی تھی اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور (میدان جہاد میں) تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔“

لے دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کی طرف راہنمائی کرے گا اور آخرت میں بلند درجات کی طرف راہنمائی کرے گا اور دونوں جہانوں میں ان کے احوال کو درست کرے گا۔ دنیا میں ان کے احوال کی درستی کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں شہید نہیں کیا گیا۔ انہیں شہداء میں داخل کیا جائیگا یا جب وہ جہاد کے لئے نکلے اور اس بات پر راضی ہوئے کہ انہیں شہید کر دیا جائے تو انہیں دونوں جہانوں میں بدلہ دیا جائے گا جہاں تک آخرت میں ان کے احوال درست کرنے کا تعلق ہے تو جنہیں شہید کیا گیا اور جنہیں شہید نہیں کیا گیا سب کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ان کی نیکیاں قبول کی جائیں گی اور ان پر دعویٰ کرنے والے راضی ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے کر ان سے راضی کر دے گا۔

ابونعیم نے سہل بن سعد سے حدیث میں ہزار اور بیعتی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کے قرضے قیامت کے دن چکائے گا ایک وہ شخص جسے اندیشہ ہو کہ دشمن مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ کرے گا اس کے اپنے پاس وسائل نہ ہوں وہ کسی سے قرض لے اس سے الطحخریدے اور جہاد میں اس کے ساتھ قوت حاصل کرے اور قرض ادا کرنے سے پہلے مر جائے اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ ادا فرمائے گا۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کو کسی مسلمان بھائی فوت ہو گیا اسے کفن دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا اس نے قرض لیا اور کفن خریدا اور مر گیا جبکہ قرض ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ بھی ادا کرے گا۔ تیسرا وہ شخص ہے جسے خوف ہوا کہ وہ بدکاری میں نہ پڑے اس نے قرض لے کر عورت سے نکاح کیا وہ مر گیا اور قرض ادا نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف سے قرض ادا کرے گا (3)۔ طبرانی نے حسن سند کے ساتھ اوسط میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب تمام مخلوقات جمع ہوگی جنتیوں کے جنت میں اور جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے کا فیصلہ ہو جائے گا تو ایک منادی کہنے والا ندا کرے گا اے لوگو! ایک دوسرے پر کیے جانے

1- تفسیر لغوی، زیر آیت ہذا

1- کنز العمال، جلد 4، صفحہ 593 (اتراث الاسلامی)

3- طیبۃ الایمان، جلد 3، صفحہ 254 (مطبعہ السعدیة)

والے ظلم کو چھوڑ دو تمہارا ثواب اللہ تعالیٰ پر ہے (1)۔

جنت میں ان کے مکانات کو واضح فرمادے گا یہاں تک کہ وہ بغیر کسی سے پوچھے اپنے اپنے مکانات تک پہنچ جائیں گے گویا جب سے انہیں پیدا کیا گیا ہے اس وقت سے ان کی رہائش گاہیں ہیں تو جس طرح وہ دنیا میں اپنے گھر اور اہل خانہ تک بغیر راہنمائی کے پہنچ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ جنت میں اپنے گھر اور بیوی اور خاندانوں تک پہنچ جائے گا۔ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے مجھے حق کے ساتھ سمجھوتہ کیا دنیا میں تم اپنی بیویوں اور غور توں سے متعارف نہیں جتنے جتنی اپنی بیویوں اور گھروں سے متعارف ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ایک طویل حدیث میں اسے روایت کیا ہے۔ اسی طرح طبرانی ابوالکلی اور بیہقی نے بحث میں اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد ہے، یعنی اسے مستودعاً تم اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے خلاف تمہاری مدد فرمائے گا اور اسلام کے حقوق ادا کرنے اور انکفار کے خلاف جہاد کرنے میں تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَالْصَّلَاءُ عَلَيْهِمْ ۖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاحْبَطُوا عَمَلَهُمْ ۖ اَقْلَمُ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَلِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۖ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۗ

”اور جنہوں نے (حق کا) انکار کیا خدا کرے وہ منہ کے بل اوندھے گریں اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا پس اس نے شائع کر دیئے ان کے اعمال میں تو کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ خود کو دیکھ لیتے کہ کیسا انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان سے پہلے گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی نازل کر دی اور انکفار کے لئے اسی قسم کی سزائیں ہیں جن سے یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔ اور انکفار کا کوئی مددگار نہیں ہے۔“

۱۔ تعسا ایسے فعل کا مفعول مطلق ہے جس کا حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فتعسوا تعسا یعنی جملہ الذین ام موصول کی خبر ہوگا یا جو فعل ام موصول کو نصب دے رہا ہے اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے ان کے لئے رحمت سے دوری ہے۔ ابو الباعلیہ نے کہا اس کا معنی ہے ان کے لئے گراؤ اور پستی ہے۔ ضحاک نے کہا ان کے لئے خسار ہے۔ ابن زید نے کہا ان کے لئے دوری ہے۔ فرماوے کہ تعسا بدوعا کے طور پر استعمال ہوا اور مفعول مطلق کی حیثیت سے منسوب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے دنیا میں ان کے لئے لڑکھانا ہے اور آخرت میں جہنم میں گرنا ہے، جبکہ ایک آدی لڑکھانا جائے اور اس کے کھرا ہونے کا وہ ارادہ نہ کرے اس وقت کہا جاتا ہے۔ تعسا اسکی ضد لعا ہے (2)۔ قاموس میں تعس کا معنی بلاست ہے لغزش گرنا برائی دوری اور پستی ہے (3)۔ فرمایا ان کے اعمال ضائع کر دیئے کیونکہ وہ شیطان کی اطاعت کر رہے تھے وَاَصْحَابُ اٰخِصَانٍ كَانُوا عَمَلًا

۱۔ تفسیر بغوی از ج ۲ ص ۲۸۱
۲۔ قاموس النحوی، جلد ۱، صفحہ 735 (التراث العربی)
۳۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 645 (المکر)

۱۔ گائین قرین قزینۃ مبتدا ہے اور قرینہ سے مراد سستی والے ہیں۔ مضاف کو حذف کیا اور مضاف الیہ پر مضاف کے اداک جاری کئے گئے ہیں۔ اشدُّ قزوۃً یہ جملہ قرینہ کی صفت ہے۔ مضاف الیہ کا اختیار کرتے ہوئے ہی ضمیر ذکر کی۔ اخرو حتمک فعل کو قرینہ کی طرف منسوب کیا اور مراد سستی والے ہیں۔ آپ کے ہستی سے نکالنے کی نسبت ان کی طرف بطور منسوب ہے کیونکہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے ان کی اذیتوں کی وجہ سے نکلے تھے۔ ابولسلی نے نقل کیا ہے اور ابنوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے فارغ ہو کر طرف نکلے تو آپ مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے مجھے بھی سب سے زیادہ محبوب ہے اگر یہ شرک مجھے نہ نکالے تو میں تجھ سے نہ نکلتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ اهلکم منکم یہ مبتدا گائین قرین قزینۃ کی خبر ہے۔ ہم ضمیر جمع ذکر کی کیونکہ قرینہ سے مراد قرینہ والے لوگ ہیں۔ فلا تاجسبہنکم میں حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ یعنی اس وقت ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

اَقْسَنَ كَانٌ عَلَىٰ بَيْتِنَا مِنْ سَرَابٍ كَمَنْ زَيْنٍ لَكَ سُوءٌ عَلَيْهِ وَالتَّبَعُوا اَهُوَ اَعْمَهُمْ ۝
 مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ ۚ فِيهَا اَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ ۚ وَ اَنْهَارٌ مِنْ
 لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرَ طَعْمُهُ ۚ وَ اَنْهَارٌ مِنْ حَمِيمٍ لَدَدًا لِلشَّرِبِ بَيْنَ ۚ وَ اَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ
 مُصَفًّى ۚ وَ لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَ مَغْفِرَةٌ ۚ لِمَنْ سَرَاهُمْ ۚ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي
 النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاءَهُمْ ۝

”کیا وہ شخص جس کے پاس روشن دلائل ہیں اپنے رب کے پاس سے اس (بد بخت) کی مانند ہے آراستہ کر دیئے گئے جس کے لئے اس کے برے اعمال اور وہ پیروی کرتے رہے اپنی خواہشوں کی۔ احوال اس جنت کے جس کا وعدہ متقینوں سے کیا گیا ہے اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس کی بو اور مزہ میں تغیر نہیں ہے اور نہریں ہیں دودھ کی جس کا ذائقہ نہیں بدلتا اور نہریں ہیں شراب کی جو لذت بخش ہے پینے والوں کے لئے اور نہریں ہیں شہد کی جو صاف ستھرا ہے اور ان کے لئے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (مزید برآں ان کے لئے) بخشش ہوگی اپنے رب کی طرف سے (سوچو!) کیا یہ ان کی مانند ہوں گے جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولنا پانی پایا جائے گا اور وہ کات دے گا ان کی آنٹوں کو۔“

۱۔ حرف استفہام انا کے لئے ہے۔ فاء عاطفہ ہے مابعد جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام کا معنی یہ ہوگا کیا مومن جس کا اللہ تعالیٰ مددگار ہے اور کافر جس کا کوئی مددگار نہیں برابر ہو سکتے ہیں تو کیا وہ انسان جو اپنے رب کی جانب سے مٹا کر دیا فتح دلیل پر ہو۔ ان لوگوں جیسا ہو سکتا ہے شیطان نے جن کے لئے برے اعمال کو مزین کیا ہو اور ان لوگوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کی ہے۔ آیت میں چیتہ سے مراد قرآن یا قرآن اور دوسرے دلائل ہیں۔ سوء عمل سے مراد شرک اور فرامائیاں ہیں۔

۲۔ ضمیر ماعنہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وَعَدَ بِهَا الْمُتَّقُونَ۔ مثل الجنة مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے يَنْلِي عَلَيْكُمْ اَيْك قول یہ کیا گیا اس کی خبر کمن هو خالد فی النار ہے۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی اَمْضَلْ اَهْلِي

میں بھی ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت میں جنب بھی ہوگا۔ اسے ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفسیروں میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں ان کے صرف نام ہی ہیں (۱)۔

اسے ابن جریر ابن ابی حاتم اور مسعد نے اپنی مسند ہناد نے زہد میں اور تبتلی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا سنتی جنت کا پھل نہیں توڑے گا مگر اس کی جگہ اس جیسا پھل پیدا کر دیا جائے گا (2)۔ فرمایا ان کے لئے ان کے رب کی جانب سے مغفرت ہے، وہ ہمیشہ ان سے راضی رہے گا، جبکہ ان پر احسان بھی فرمائے گا، جبکہ دنیا میں آقا کا غلام کے ساتھ معاملہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ آقا دنیا میں کبھی غلام سے ناراض بھی ہو جاتا ہے۔ وَمَغْفِرًا لِّقَوْمٍ نَّيِّبًا كَاعْطَفَ مُحَمَّدٌ عَلَامٍ پر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی۔ ثُمَّ مَغْفِرًا لِّقَوْمٍ نَّيِّبًا۔

اگر مثل الصلۃ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو یا اس کی خبر فیضاً آئے ہوتے ہے تو گنہگار ہو جائیگا یا انصاف یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَّنْ هُوَ، خَالِدٌ هُوَ، تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُكَلِّفُ لِمَن يَشَاءُ فِيهَا مَغْفِرَةٌ كَذَلِكَ هِيَ الْبَلَدُ الْوَعْدِ لِمَن كَانَ يَدْعُو إِلَى اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ سِوَى ذَلِكَ لَا يَمْلِكُ لَكُم بِشَيْءٍ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَمَن يَفْعَلْ مِثْلَ ذَلِكَ نَسْفَعْ مَا كَانَ مِن بَشَرٍ لَّيْسَ بِشَيْءٍ عِندَ رَبِّكَ فَكَيْفَ۔ جملہ معترضہ ہے تاکہ دونوں جماعتوں میں امتیاز قائم ہو جائے جن میں سے ایک کے لئے بے اعمال مزین کیے گئے ہیں اور دوسری جو رب کی طرف سے واضح ہدایت پر ہے مفسود اس کا یہ ہے کہ جو وہ مساوات کا دعویٰ کرتے تھے اس پر انکار کو مزید واضح کیا جائے کہ ایسا کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا۔

وَمُعَذِّبًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا جَزَاءً مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ اور احدی ضمیر من کے لفظ کی وجہ سے ہے اور مسقوا جمع کی ضمیر من کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کٹ ڈالے گا اور آنتیں دیر سے نکل آئیں گی۔ ابن منذر نے ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ مومن اور منافق حضور ﷺ کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ حضور ﷺ جو ارشاد فرماتے مومن اس کو سنتے اور یاد کر لیتے منافق سنتے اور اسے یاد نہ کرتے۔ جب مجلس سے باہر نکلے تو منافق مومنوں سے پوچھتے تھے کہ آپ نے ابھی ابھی کیا فرمایا ہے تو ابعد آیت نازل ہوئی (3)۔

وَمِنْهُمْ مَّن يَّسْتَمِعُ لِيْلِكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا الَّذِيْنَ أُوْتُوا
الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَهُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا
أَهْوَاءَهُمْ ۗ وَالَّذِيْنَ أَهْتَدَا وَآذَاهُمْ هُدًىٰ وَاللَّهُمْ يَشْفَوْنَهُمْ ۗ

”اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو کان لگائے رکھتے ہیں آپ کی طرف حتیٰ کہ جب نکلے ہیں آپ کے پاس سے تو کہتے ہیں اہل علم سے (کہ ذکر فرمائیے) یہ صاحب ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے یہی وہ (بد بخت) ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور وہ جیروی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کی۔ اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو اور انہیں تقویٰ کی توفیق بخشتا ہے۔“

ل۔ اس کا عطف والذین کفروا پر ہے۔ درمیان میں معترضہ جملہ ہیں یہ منافق لوگ ہیں جو حضور ﷺ کا فرمان تو سنتے ہیں لیکن

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 82 (اعلیٰ) 2۔ روح المعانی، جلد 1، صفحہ 83 (الترغیٰ)

3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 26 (اعلیٰ)

امام مسلم ابن ماجہ نے حضرت سہیل بن سعد سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ درمیانی اور شہادت والی انگلی سے اشارہ کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح بھیجا گیا (1)۔

امام احمد ابن ماجہ اور امام ترمذی نے حضرت انس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جسے میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے جسے میرے سوا کوئی اور بیان نہیں کرے گا۔ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کی نشانیوں میں کہ علم اٹھ دیا جائے گا جہالت زیادہ ہو جائے گی بدکاری عام ہو جائے گی شراب کثرت سے پیا جائیگا مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں زیادہ ہو جائیں گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد ہوگا (2) ایک روایت میں ہے علم کم ہو جائیگا اور جہالت غالب آ جائیگی۔ متفق علیہ

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ گفتگو کر رہے تھے کہ ایک بدو آ گیا اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی تو آپ نے فرمایا جب امانت ختم ہو جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے عرض کی امانت کس طرح ضائع ہوگی؟ فرمایا جب امور اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں گے تو اس وقت قیامت کا انتظار کرنا سے امام بخاری نے روایت کیا ہے (3) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مال نسیمت چند افراد کو دیا جانے لگے امانت کو مال نسیمت سمجھا جانے لگے زکوٰۃ کو چنی ٹھار کیا جانے لگے، دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے علم پڑھا جائے، مرد اپنی بیوی کی بات مانے اور ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو قریب کرے اور اپنے باپ کو دور کرے۔ مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں، فاسق قوم کا سردار بن جائے۔ قوم کا رئیس سب سے کمینہ انسان ہو اور ایک انسان کمینہ انسان کے شر سے بچنے کے لئے اس کی عزت کرے، گانے والی عورتیں اور بجانے والے آلات زیادہ ہو جائیں، شراب کثرت سے پی جائے۔ امت کے بعد والے لوگ امت کے پھیلے لوگوں پر لعن طعن کریں تو اس وقت سرخ آندھی زلزلہ زمین میں دھنسا، تشکیں بگڑ جانا، پتھروں کی بارش اور پے در پے نشانوں کے ظاہر ہونے کا انتظار کرو جس طرح بار کا دھماکا کٹ دیا جائے تو اس کے موتی یکے بعد دیگرے گرتے ہیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرے گی تو ان پر مصیبت (قیامت) واقع ہو جائے گی۔ حضرت علی نے ان پندرہ چیزوں کا ذکر کیا لیکن اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ علم دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے سیکھا جائے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ آدمی دوست سے حسن سلوک کرے اور باپ پر ظلم کرے اور فرمایا شراب پے اور زہم کا لباس پہنے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے (5)۔ فَاَلَيْسَ لَكُمْ مِنْ فَاۡءِ جَزَاۤءِیْہِ ہِ اَوْ رَاسِیْہِ کَیْ شَرَطِ مَخْذُوْفِہِ ہِ۔ معنی یہ ہے کہ اگر قیامت اچانک آگئی تو وہ اس وقت وہ کیسے نصیحت حاصل کریں گے اور ذکر کریں گے کیونکہ اس وقت انہیں نصیحت کوئی نفع نہ دے گی۔

فَاَعَلَمْتُمْ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِدُنْیٰکَ وَ لِسُوْمِیْنِیْکَ وَ الْمَوْتِیْکَ ۗ
اللّٰهُ یَعْلَمُ مَتَّعْتُکُمْ وَ مَوَّعْتُکُمْ ۝

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

2- صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2005 (ابن کثیر)

3- صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 14 (وزارت تعلیم)

4- جامع ترمذی مع عارضۃ الاخوانی، جلد 9، صفحہ 43 (اعلیٰ)

5- جامع ترمذی مع عارضۃ الاخوانی، جلد 9، صفحہ 43 (اعلیٰ)

”پس آپ جان لیں کہ نہیں کوئی معبود بجز اللہ کے اور دعا مانگا کریں کہ اللہ آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے نیز مغفرت طلب کریں مومن مردوں اور عورتوں کے لئے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے اور آرام کرنے کی جگہوں کو۔“

لہذا اللہ میں وہ ضمیر ضمیر شان ہے اور فاعل علم میں فاعل سیدہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب آپ یہ جان چکے ہیں کہ مومن سعادت مند ہیں اور کافر بد بخت ہیں تو اسے محمد ﷺ آپ جس حال پر ہیں اسی پر استقامت کا مظاہرہ کریں وہ کیا چیز ہے جس پر آپ ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ وحدانیت کا علم رکھتے ہیں اپنے احوال کی اصلاح کرتے ہیں اور ایسے افعال بجالاتے ہیں جو قیامت کے روز نفع دینے والے ہیں۔ ان کے ساتھ نفس کی تمیل ممکن ہے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کیجئے۔ یہ حکم نفس میں عاجزی اور انکساری پیدا کرنے کے لئے ہے۔ ساتھ ہی اس کی کوغابہ کرنے کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مقابل عبادت میں پائی جاتی ہے، جبکہ حضور ﷺ کو گناہوں سے معصوم پیدا کیا گیا اور آپ کی ذات گناہ و ضمیرہ اور کبیرہ سے پاک ہے۔ اس حکم کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے آپ کی امت آپ کی اس سنت (۱) پر عمل کرتے۔ حضور ﷺ نے خود بھی ایسا کیا فرمایا میرے دل پر بھی میل سا آ جاتا ہے تو میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں (۱) اسے امام مسلم امام احمد ابوداؤد و نسائی نے اغرضی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں شاید حدیث میں دل پر رنگ آ جاتا یہ امکان کی وہ تاریکی ہے جسے صوفی اپنے اندر پاتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے کمالات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت اس آدمی پر حرام ہے جو اپنے آپ کو فرنگی کافر سے برائیں جانتا۔ آپ سے عرض کی گئی اس چیز کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے، جبکہ وہ اپنے آپ کو مومن برحق خیال کرتا ہے اور کافر کو لازمی کافر خیال کرتا ہے کفر پر ایمان کی فضیلت کو تسلیم کرتا یہ ضروریات دین میں سے ہے۔

حضرت مجدد نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہر ممکن جو موجود ہے وہ امکان کی تاریکی سے خالی نہیں، جبکہ وجود کا نور اللہ تعالیٰ کی ذات سے عاری ہے اسے حاصل ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان رکھنے والا عموماً اپنے اندر عدم اور امکان کی جانب تو دیکھتا ہے اور اپنے اندر وجود اور دوسرے کمالات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عارضی چیز پاتا ہے۔ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت ہوتی ہے إِنَّ اللَّهَ بِمَا نَعْمَدُكَ أَنْ تَشْكُرَ عَلَا مُسْتَبْتِ لَقِي أَهْلِيهَا اور اپنے علاوہ جو چیز بھی موجود ہے وہ اسے اللہ تعالیٰ کا فیض ہی خیال کرتا ہے تو اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو ہر دوسری چیز سے برائی خیال کرے گا۔ یہ معرفت اس معرفت کے متضاد نہیں جس میں یہ ہے کہ ایمان

1- صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

(۱) حضرت ابو بکر صدیق حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے ذکر اور استغفار کو لازم پکڑو۔ ان کی کثرت کیا کرے گی کہ اللہ نے کہا میں نے لوگوں کو گناہوں کے ذریعے ہلاک کیا اور انہوں نے مجھے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے ذکر اور استغفار سے ہلاک کیا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے انہیں خواہشات کے ساتھ ہلاک کیا، جب کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ عبادت یافتہ ہیں۔ سچائی میں ظن ہی عید اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت طلحہ کو شکین دیکھا تو کہا کون ہے؟ حضرت طلحہ نے جواب دیا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میں ایک ایسا حکم جانتا ہوں جو بندہ بھی اسے موت کے وقت اپنی زبان سے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی سمیٹ دور فرمائے گا۔ اس کے رنگ کو روشن کر دے گا۔ اسے وہ چیز عطا کرے گا جو اسے خوش کرے گی۔ آپ سے روایت کرنے سے مجھے یہ چیز نہیں روکا مگر یہ کہ میں سوال کرنے پر قادر تھا کہ آپ کا سوال ہو گیا یعنی حاضری اور سوال سے کوئی چیز مانع نہ تھی جب پابنتا پوچھ سکتا تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا وہ میں جانتا ہوں اس کلمہ سے بڑھ کر کوئی اور کلمہ نہیں ہو سکتا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے اپنے چچا کو حکم دیا تھا کہ وہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے تو حضرت طلحہ نے کہا اللہ کی قسم یہ وہی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو فوت ہوئے اس حال میں کہ وہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جانتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

کفر پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ ملاحظتِ حیاتِ علم کی وسعت اور اوراکات مختلف ہیں غافل کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ جو اور اپنے کمالات کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ لاجل ولا قوۃ الا باللہ۔

آپ مومنوں کے حق میں دعا کر کے ان کے گناہوں کی بخشش بھی طلب کریں اور انہیں ایسے امور کی ترمیم دیں جو ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔ یہاں حرف جار لام کو دو بارہ ذکر کیا اور ذنب مضاف کو حذف کر دیا مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مومنوں کو اس کی اشد ضرورت ہے اور ان کے گناہ بھی بہت زیادہ ہیں اور یہ ایک اور جنس ہے۔ امام بخاری نے کہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس قوم کیلئے بڑا اعزاز ہے کہ اس نے اپنے نبی کو مکرم دیا کہ اپنی امت کے لئے بخشش کی دعا کریں، جبکہ حضور ﷺ ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جن کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا **مُتَّقِبَتُمْ** سے مراد تمہارا دنیا میں اپنے اعمال میں ادھر ادھر جانا ہے اور **مُتَّوْبَتُمْ** سے مراد آخرت میں جنت یا دوزخ کی طرف جانا ہے متقابل اور ابن جریر نے کہا ہے **مُتَّقِبَتُمْ** سے مراد ان کے وقت کام کاج میں مصروف ہونا اور **مُتَّوْبَتُمْ** سے مراد ارات کے وقت اپنے بستر پر آرام کرنا ہے مگر مدنے کہا ہے **مُتَّقِبَتُمْ** سے مراد آباء کی پشتوں سے ماؤں کے حصوں میں آنا اور **مُتَّوْبَتُمْ** سے مراد زمین میں قیام کرنا ہے ابن کثیر نے کہا **مُتَّقِبَتُمْ** سے مراد پشت سے پیٹ کی طرف آنا ہے اور **مُتَّوْبَتُمْ** سے مراد قبروں میں ٹھہرنا ہے مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں (1) اس لئے احتیاط سے کام لو یہاں خطاب مومنوں اور دوسرے لوگوں کو ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ قَدْ آتَيْنَاكَ سُورَةً مُّحْكَمَةً وَذُكِّرَا
فِيهَا الْقِتَالُ سَأَيَّتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْعَيْشِيِّ
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَى لَهُمْ ۝

”اور اہل ایمان کہتے ہیں کیوں نہ اتری کوئی نئی سورت (جہاد کے بارے میں) پس جب اتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (خفا کا) روگ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں آپ کی طرف جیسے سمکتا ہے جس پر موت کی ٹہنی طاری ہو۔ پس ان کیلئے بہتر یہ حال۔“

۱۔ وہ جہاد کے حریص ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمیں جہاد کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا۔ جب ایسی واضح آیت نازل ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہر وہ سورت جس میں جہاد کا ذکر ہے وہ حکم ہے (2) کیونکہ قتال کی فریضت نے ان تمام احکام کو منسوخ کر دیا جس میں صلح کا حکم دیا گیا تھا۔ اسے منسوخ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ ہر وہ سورت جس میں قرآن کا ذکر ہے وہ سورت منافقوں پر سب سے شدید ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں کمزوری اور بزدلی ہے وہ آپ کو یوں دیکھتے ہیں گویا ان پر موت غالب آ چکی ہے۔

طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ قَدْ آتَيْنَاكَ اللَّهُ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتَتَّبِعُوا اَسْرَاحِمَ ۝۱۰

”کہ اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے پھر جب حکم ناطق ہو چکا تو اُگروہ چہ رہے اللہ تعالیٰ سے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ پھر تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم فساد برپا کرو گے زمین میں اور قتل کر دو گے اپنی قراتوں کو۔“

۱۔ ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے اور یہ کہتے ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت کی جب معاملہ سخت ہو گیا، یعنی جن کے ذمہ امور کی تدبیر تھی انہوں نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا اگر وہ اس اٹھامیں سچے ہوتے جو انہوں نے جہاد کی رغبت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور کی تھی تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ عزم فعل کو الامر کی طرف منسوب کرنا مجاز کے طور پر ہے یا عزم الامر کا معنی ہے جب جہاد لازم اور فرض ہو گیا۔ فَلَوْ صَدَقُوا یہ اِدَاعَةٌ صَدَقُوا صَدَقُوا اللہ لکنان خیرًا اَللّٰهُمَّ یعنی جب ہے اور یہ جملہ مستاتھ ہے لفظ یہ کلام یہ ہے۔ فَاِذَا عَزَمْتَ الْاَمْرَ لَوْ يَضِلُّوْا اللّٰهُ وَ لَوْ صَدَقُوا اللّٰهُ لَکَانَ خَيْرًا اَللّٰهُمَّ یعنی جب جہاد فرض ہو گیا تو وہ اپنے قول میں سچے ثابت نہ ہوئے اگر وہ سچے ہوتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

۲۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ میں غائب کے صیغہ سے خطاب کی طرف التفات ہے، یعنی اسے بزدلو اگر تم جہاد کے حکم میں رسول اللہ کی متابعت سے اعراض کرو تو کیا تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ زمین میں فساد برپا کرنے لگو گے اور اپنی رشتہ داری کو ختم کر لو گے، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ شرط ہے جو جزاء سے مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ شرط ایسے جملہ کے درمیان واقع ہو رہی ہے جو جزاء پر دلالت کرتا ہے۔ زمین میں سے فساد برپا کرنے سے مراد کفر اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرنا ہے۔ قطع رحمی سے مراد جہاد رشتہ داروں کی مخالفت ہے۔ اِنْ تَفْسِدُوْا اپنے متعلق سے مل کر عسیم کا مفعول ہوگا اور صل استغماہ پر انکار کے لئے ہے، یعنی تمہیں ایسا طریق نہیں اپنانا چاہئے کہ تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ کفر یا فریاد اور قطع رحمی (۱) کے ذریعے تم زمین میں فساد برپا کرو گے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَابَهُمْ وَاَعْيٰ اَبْصَارَهُمْ ۝۱۱ اَفَلَا يَتَذَكَّرُوْنَ
الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَفْقَالُهَا ۝۱۲

”یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پھر (حق سننے سے) انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قتل لگا دیئے گئے ہیں۔“

۱۔ زمین میں فساد برپا کرنے والے اور قطع رحمی کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رستوں سے دور کر دیا ہے۔ حق

(۱) حضرت برید سے مروی ہے کہ میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے ایک چیلنے چلانے والے آدمی کی آواز کو سنا۔ آپ نے فرمایا ہے یہ فواد کھویا و اذکبکی ہے؟ یہ فواد نے دیکھا پھر وہ اہل یا عرض کی قریش کی ایک بچی کی ماں فرودخت کی چاری ہے۔ آپ نے فرمایا مہاجرین و انصار کو بلاؤ چکھو وقت بھی نہ گزرا تھا کہ گھراؤ کر رہ گیا۔ حضرت عمر نے اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کی پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ کی شہادت میں قطع رحمی کا کیا حکم ہے؟ صحابہ نے عرض کی ظلم نہیں ہے۔ فرمایا اس وجہ سے قطعی رحمی میں تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے پھر آپ نے فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اِنْ تَفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تَتَّبِعُوا اَسْرَاحِمَ ۝۱۰ میں فرمایا اس سے بڑھ کر قطع رحمی کیا ہوگی کہ تمہارے درمیان ایک آدمی کی ماں فرودخت کی جائے گی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فراموشی عطا فرما رکھی ہے۔ لوگوں نے عرض کی جو مناسب سمجھیں وہ کریں تو حضرت عمر نے تمام علاقوں میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ کسی آزادی کی ماں کو نہ بچا جائے۔ یہ لکھ کر قطع رحمی سے جو جائز نہیں۔

سننے سے بہرہ کر دیا ہے اور حق دیکھنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر خبر ہے۔ یہ سابقہ جملہ میں جو انکار کا معنی پایا جا رہا تھا یہ اس کی علت بیان کر رہا ہے ایک قول یہ کیا گیا اللذین فی قلوبہم مرض سے مراد منافق ہیں اور مرض سے مراد شک اور افتراق ہے اور فالولی لہم سے مراد ان کے لئے سخت بلاکت ہے اور اولیٰ وہی سے نفس کے وزن پر ہے یا یہ وہی سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قرب ہے۔ یہ آیل سے فعلی کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے لئے بد دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ چیز کو ان پر مسلط کر دے یا ان کا معاملہ انہیں کی طرف پلٹ جائے۔ طاعتہ وقول معروف یہ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی طاعة و قولی مغفوفت خیر لہم۔ یا ان کے قول کی حکایت ہے، یعنی وہ کہتے ہیں ہمارا معاملہ اطاعت اور اچھی بات کرنا ہے جو بات انہوں نے کی تھی اگر وہ اس میں سچے ہوتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا لیکن انہوں نے جہوت بولا تو کیا بات ہے تو قریحی جائے کہ اگر تم لوگوں کے امیر بن جاؤ تو ان پر ظلم کر کے زمین میں فساد برپا کرو گے۔ یہ آیت کریمہ بنی امیہ اور نبی ہاشم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس شان نزول پر حضرت علی شیر خدا کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ ان کو لیسٹ پڑھا ہے، یعنی تادم اور داد کو مضموم پڑھتے ہوئے جموں کا صیغہ پڑھا ہے اگر تم ظالم حاکم بناؤ اور خود بھی ختمہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ اور لوگوں پر ظلم کرنے لگو، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، انہیں بہرہ کر دیا ہے اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا قاضی ابولہی نے اپنی کتاب المستمد الاموال میں اپنی سند سے صالح بن احمد بن حنبل سے روایت کیا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا اسے میرے ابا جان بعض لوگ مان کرتے ہیں کہ ہم یزید بن معاویہ کو پسند کرتے ہیں تو حضرت امام احمد بن حنبل نے فرمایا اسے بیٹے! کیا کسی مومن کے لئے جائز ہے کہ وہ یزید سے محبت کرے۔ ایک بندہ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتا، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس پر لعنت کرتا ہے۔ میں نے عرض کی اسے میرے والد ماجد اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں کہاں یزید پر لعنت کرتا ہے۔ فرمایا جہاں اللہ تعالیٰ یہ اشارہ فرماتا ہے تو پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

۱۔ کیا وہ قرآن حکیم اور اس میں جو نصیحتیں اور تنبیہات ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کے لئے حق واضح ہو جاتا۔ یہاں استفہام انکار اور توجیح کے لئے ہے اور فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ایغفلون فلا ینذروُن القرآن فرمایا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کنایہ کی صورت میں کلام نبی دلوں کو الماریوں سے تشبیہی اور ان کے مناسب تالوں کو ثابت کیا۔ بطور تشبیہ کے تالوں کو دلوں کی طرف منصف کیا۔ مقصود یہ دلالت کرنا ہے کہ یہ تالے ان دلوں کے مناسب ہیں اور انہیں کے ساتھ ہی خاص ہیں، عام تالوں جیسے نہیں۔ یہ کلام اصل میں کنایہ ہے اس بات سے کہ ان کے دلوں میں استعداد اور قابلیت ہی نہیں کہ وہ صحیح حاصل کریں اگر بالفرض وہ غور و فکر کریں بھی تو وہ قرآن کی نصیحتوں کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہاں قلوب کو گمراہ ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے مراد ان کے بعض دل ہیں یا اس بات کا شعور دلایا جا رہا ہے کہ کئی اور جہالت کی زیادتی میں ان کا معاملہ ہم سے گویا وہ پوشیدہ خزانہ ہیں۔ امام بغوی نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا تو یمن کے ایک نوجوان نے عرض کیا بلکہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ

(۱) اہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کو پڑھا تو ایک نوجوان جو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں موجود تھا عرض کیا کہ ہاں اللہ کی قسم بلکہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کے تالے کھولے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ سے تو آپ نے اس نوجوان کو کاش کیا تا کہ اسے حامل نامیں تو آپ کو بتایا گیا کہ ہفت ہونچکا ہے۔ از مؤلف غفر عنہ۔

ابوبکر کے علاوہ کونہ کے قراء نے اسرار کے مزہ کو سکور پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ سر کی جمع ہے۔ ان کے رازوں میں سے ایک یہ بات بھی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمادیا۔

۱۱. تکلیف میں فاء سبب ہے اور استفہام تعجب کے اظہار کے لئے ہے اذافر فی فعل محذوف کے متعلق ہے تقدیر کلام یہ ہے فکلیف یختالون إذا توفقتهم المنفکة ترکیب کلام میں یہ تفسیر مؤنث ملامتہ سے حال ہے، یعنی جب فرشتے لوہے کے سمجھڑوں کے ساتھ ان کے مزہ اور پشتوں پر ضربیں لگائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔

اس طرح روح قبض کرنے کی محض وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی بیروی کی جس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تورات کو چھپایا اور حضور ﷺ کا انکار کیا (1) اور انہوں نے ایسی چیزوں کو ناپسند کیا جو اس کی رضا کا باعث تھے جیسے ایمان، جہاد اور اطاعت وغیرہ تو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخَوِّمَ اللَّهُ أَصْعَابَهُمْ ۖ وَ لَوْ نَشَاءُ لَأَمْسَأْنَهُمْ قُلُوبَهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۖ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ وَاللَّهِ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ ۖ
وَلَيَسْأَلَنَّكُمْ حَتَّى تَعْلَمَ السُّجُودَ الَّذِينَ سَمَّوْا الصَّابِرِينَ وَ تَبَيَّنُوا أَحْمَارَكُمُ ۖ

”کیا خیال کرتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں کرے گا ان کے دلی کھوٹوں کو۔ اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ سو آپ پہنچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرے سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے اور اللہ جانتا ہے تمہارے اعمال کو۔ اور ہم ضرور آزما لیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تمہیں سے جو معروف جہاد چتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پر تمہیں گے تمہارے حالات کو۔“

۱۲. ام مقطوع ہے اور مل کے معنی میں ہے۔ کلام الشيطان سولہم یا ام علی قلوب افعالہا کے ساتھ متعلق ہے۔ مرض سے مراد نفاق ہے۔ معنی ہوگا بلکہ جن لوگوں کے دل میں نفاق کا مرض ہے۔ انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مؤمنین پر ان کے کینے کو ظاہر نہیں فرمائے گا۔

۱۳. اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان کے بارے میں آگاہ کرتے اور آپ کو ان کی پہچان کرا دیتے۔ یہ جملہ مترض ہے اور جن کو مقدر ماننے کے ساتھ حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وَ نَحْنُ لَوْ نَشَاءُ لَأَمْسَأْنَهُمْ فرمایا تو آپ ان کی نشانیوں سے انہیں پہچان لیتے فلعر فہم میں لام جواب کے لئے ہے جسے معطوف میں مکرر ذکر کیا امام بغوی نے کہا حضرت انس نے فرمایا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد منافقوں کی کوئی چیز آپ ﷺ پر چلی نہ تھی۔

فرمایا آپ انہیں گفتگو کے لہجے سے پہچان لیتے وَلَعَرَفْتَهُمْ فَمِنْ لَحْنِ الْقَوْلِ یہ بھی جواب قسم ہے اور قسم محذوف ہے۔ لحن القول کا معنی ہے کلام کو اپنی اصل جہت سے اشارہ اور مخفی معنی کی طرف بھیر دینا آیت کا معنی ہوگا آپ انہیں پہچان لیں گے کہ وہ آپ کی اور مسلمانوں کی اشارہ کے ساتھ تو ہیں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور مدح کی صورت میں مذمت کرتے ہیں۔ امام بغوی نے کہا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جو منافق بھی حضور ﷺ کے سامنے گفتگو کرتا آپ اسے پہچان لیتے

تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے اچھے برے اعمال کو جانتا ہے کیونکہ وہ اعمال جن کی ذات میں فتح پایا جاتا ہے۔ جیسے کفر اور زمان کے علاوہ جتنے بھی افعال ہیں وہ سب نیٹوں پر منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ اس وجہ سے وہ تمہاری نیٹوں کے مطابق تمہیں بدل دے گا۔

اس ہم جہاد کا حکم دے کر تمہیں آزماتیں گے۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے تاکہ امر کے متحقق ہونے کے بعد بھی اسے جان لیں جس طرح اس کے متحقق ہونے سے پہلے جانتے تھے کہ یہ امر اسی طرح واقع ہوگا یا اس کا معنی ہے کہ ہم الگ الگ کر لیں یا اس کا معنی ہے تاکہ ہمارے دوست پہچان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور مشقتوں پر صبر کرنے والا ہے اور تمہاری ان خبروں کو جانچ لیں جو تمہارے اعمال کو خبر دیتی ہیں جس کے پاس ان کا حسن اور قباحت ظاہر ہو جائے یا تمہارے ایمان لانے اور مومنوں کے ساتھ دوستی کو پرکھ لیں کہ اس میں صداقت ہے یا جھوٹ ہے۔ ابو بکر نے آیت میں موجود بیٹیوں افعال کو واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور یہ اللہ بعلم کے موافق ہوگا۔ جبکہ باقی قراء نے جمع حکم کا صیغہ پڑھا ہے اور نحن نبلوا کی تقدیر پر آخری فعل ونبینوا آئینہ تارکوم بھی واؤ کے سکون (ا) کے ساتھ پڑھا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَصُورُوا اللَّهُ شَيْئًا وَسَيُحِطُّ أَعْمَالَهُمْ ۝۱۱

”بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور لوگوں کو بھی روکتے رہے اللہ کی راہ سے اور مخالفت کرتے رہے رسول (کریم) کی باوجود یہ ظاہر ہو چکی تھی ان کے لئے راہ ہدایت وہ قطعاً اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔“

۱۔ جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو ایمان لانے اور رسول کی اتباع سے روکا اور حقیقت حال واضح ہونے کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی اس سے مراد بنو قریظہ بنو نضیر اور قریش کے وہ سردار ہیں جنہوں نے غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کے لشکر کو کھانا کھلایا۔ یہی بارہ سردار تھے اور اپنی باری پر لشکر کو کھانا کھلاتے تھے۔ فرمایا وہ اپنے اس طرز عمل سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے ان کے اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے اور آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ نہیں پائیں گے یا ان کے عمل پر دنیا میں کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا کیونکہ بدر میں انہیں شکست ہوئی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد غزوہ بدر میں کفار کے لشکر کو کھانا کھلانے والے ہیں۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ يَصُورُوا اللَّهُ شَيْئًا وَسَيُحِطُّ أَعْمَالَهُمْ ۝۱۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ۝۱۲

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (کریم) کی اور نہ ضائع کرو اپنے عملوں کو۔“

۱۔ ضمیر بخوبی ذرا آیت خدا
(۱) اس عبارت میں تسامع واقع ہوا ہے۔ اس عبارت کی فرض یہ ہے کہ روئیں نے نبلوا کو واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

۱۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ان میں شک اور نفاق یا ان اعمال پر نگر کر کے انہیں ضائع نہ کرو۔ کبھی نے کہا دکھاوے اور شہرت کے حصول کی خاطر اس فعل کو بجا لاکر نہیں باطل نہ کرو۔ حضرت حسن بصری نے کہا نافرمانی اور گناہ کبیرہ کے ذریعے انہیں ضائع نہ کرو۔ ابن ابی حاتم اور محمد بن نصر مروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ یہ خیال کرتے تھے کہ جب انسان لا الہ الا اللہ پر یقین رکھتا ہو تو کوئی گناہ بھی اسے نقصان نہیں دیتا جس طرح شرک کی صورت میں کوئی اچھا عمل فائدہ نہیں دیتا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو وہ ڈرنے لگے کہ گناہ کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ امام بغوی نے بھی ان سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ مقالے نے کہا اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ پر احسان نہ جتاؤ ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے (۱)۔

مسئلہ: جس نے نماز روزہ حج عمرہ یا اس جیسا کوئی عمل نفل کے طور پر شروع کیا تو اس پر اس عمل کو مکمل کرنا واجب ہے۔ ظاہر روایت کے مطابق اسے توڑنا جائز نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ عذر کی صورت میں توڑنا جائز ہے۔ ہدایہ نقدہ مروی اور دوسری کتب کے مؤلفین نے یہ بیان کیا ہے۔

کیا نفلی روزہ توڑنے کے لئے مہمان نوازی عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے ہاں یہ عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا زوال سے پہلے تو یہ عذر ہوگا زوال کے بعد یہ عذر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر روزہ نہ توڑنے کی صورت میں والدین کی نافرمانی ہوتی ہو تو دوپہر کے بعد روزہ توڑنا جائز ہے۔ اگر کسی نے نفلی نماز یا روزہ شروع کرنے کے بعد اسے توڑا تو اس کی قضاء واجب ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے، جبکہ امام مالک اور متقی کی ایک روایت میں امام ابوحنیفہ سے بھی یہی مروی ہے کہ نفلی روزہ کو عذر کے بغیر توڑنا بھی مباح ہے۔ تاہم اس کی قضاء واجب ہوگی۔

امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا نفلی عمرہ اور عمرہ کو مکمل کرنا واجب ہے اگر انہیں توڑا تو قضاء بھی واجب ہوگی۔ نماز روزہ اور دوسرے نفلی افعال کا حکم اس سے مختلف ہے۔ ان دونوں امر کے نزدیک انہیں مکمل کرنا مستحب ہے اور اسے انہیں توڑنے کی بھی اجازت ہے اور بعد میں اس کی قضاء بھی نہ ہوگی۔

ہماری دہلی یہ آیت ہے اگرچہ اس کا شان نزول تو یہ ہے کہ اعمال کو شک، نفاق، معاصی، خطا، غلطی، شہرت اور اظہارِ فخر کے ساتھ اعمال کو باطل کرنے سے روکا جا رہا ہے لیکن اپنے الفاظ کے اعتبار سے یہ حکم اسے بھی شامل ہے کہ انسان کسی عمل کو مکمل کرنے سے پہلے فاسد کر کے اسے باطل کر دے کیونکہ جتنا عمل کیا جا چکا ہے وہ عبادت اور عمل ہے اسی طرح اس عمل کو مکمل کرنے کے بعد اسے گناہ کبیرہ دکھاوے شہرت یا فخر کر کے باطل کرنے سے نبی ہے۔

ہمارے چش نظر احادیث طیبہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت عروہ سے مروی ہے جسے وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفصہ کی خدمت میں ایک بکری بطور ہدیہ پیش کی گئی، جبکہ ہم دونوں روزے سے تھیں۔ حضرت حفصہ نے مجھے روزہ افطار کرا دیا۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا اس کی جلد ایک اور روزہ رکھ لیں (۲)۔ اسے امام احمد نے سفیان بن عیینہ بن حبیب کے واسطے سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا۔ امام ترمذی نے جعفر بن برقان کے واسطے سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے

کہ میں اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا۔ ہم نے اسے پسند کیا اور کھا لیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ حضرت حفصہ نے مجھ سے جلدی کی عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا، جس کی ہمیں شدید طلب تھی۔ ہم نے اسے کھا لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھ لیا۔

ابو داؤد اور نسائی نے زبیل سے اور انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے اسے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اسے معطل قرار دیا ہے کیونکہ زبیل کا عروہ سے سماع ثابت نہیں اور نہ ہی یزید کا زبیل سے سماع ثابت ہے۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کو صالح بن ابی الاحضر اور محمد بن علی بن ابی حفصہ نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ مالک بن انس، معمر بن عبد اللہ بن عمرو، زیاد بن سعد اور کئی دوسرے حفاظ نے زہری سے اور زہری نے حضرت عائشہ سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ اس میں وعدہ کا ذکر نہیں، یہ سند زیادہ صحیح ہے کیونکہ ابن جریر سے مروی ہے کہ میں نے زہری سے پوچھا کیا حضرت عروہ نے حضرت عائشہ سے تمہیں یہ روایت بیان کی ہے تو زہری نے جواب دیا میں نے عروہ سے اس بارے میں کوئی چیز نہیں سنی بلکہ ہم نے سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں ایسے آدمی سے روایت سنی جس نے حضرت عائشہ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

ابن ہمام نے کہا امام بخاری کا قول اس امر پر مبنی ہے کہ آپ کے نزدیک متصل روایت کے لئے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ملاقات بھی شرط ہے، جبکہ زیادہ پسندیدہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دونوں راوی ہم عصر ہیں تو اتصال کے لئے یہی کافی ہے، اگر اس روایت کا امام بخاری اور امام ترمذی کے نزدیک متصل تسلیم کر ہی لیا جائے تو یہ صرف اس سند تک محدود رہے گا۔ اس حدیث کا معطل ہونا اس وقت لازم آئے گا اگر اس کی کوئی اور سند نہ ہو لیکن ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں جریر بن حازم سے، انہوں نے یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ میں اور حضرت حفصہ نے نفل روزہ کی صورت میں صبح کی۔ ابن ابی شیبہ نے اسے ان سندوں کے علاوہ ایک اور سند سے ضعیف سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزہ کی حالت میں صبح کی، طبرانی نے اپنی معجم میں صحیف کی حدیث مکرّمہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں۔ بزار نے ایک اور سند سے حماد بن ولید سے، انہوں نے عبید اللہ بن عمرو سے، انہوں نے حضرت ثابث سے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزے کی حالت میں صبح کی۔ لیکن حماد بن ولید ضعیف ہے۔

طبرانی نے ان سب سے مختلف اوسط میں روایت کیا ہے کہ ہمیں سوئی بن ہارون نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں محمد بن میران نے روایت کیا، کہا اسے محمد بن ابی سلمہ کی سند ہے، انہوں نے ابو سلمہ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو ہدیہ پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزے سے تھیں۔ دونوں نے اس حدیث سے کچھ کھا لیا پھر اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی کسی روزہ قضاء کر لینا اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔ ابن ہمام نے کہا یہ حدیث ثابت ہوگی۔ اب اس کو رد کرنے کی کوئی صورت نہیں اگرچہ اس کی تمام سندیں ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کی سندیں متعدد ہیں اور بہت زیادہ ہیں اسے کیسے رد کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس کی بعض سندیں ایسی ہیں جو قابل حجت ہیں۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ ابن جوزی نے جو یہ کہا کہ آقا نے دو عالم ﷺ کا یہ امر کہا اسے کسی دوسرے دن

رکھ لینا۔ اسے استہجاب پر محمول کریں گے۔ تو یہ بغیر کسی سبب کے امر کا ظاہر قضا کے خلاف معنی کرنا ہوگا، جبکہ اس میں ایسے قرآن موجود ہیں جو ظاہر معنی لینے کا قضا کا کرتے ہیں، جبکہ یہ آیت کریمہ لَا تَلْبِطُوا آغْصَانَكُمْ بھی اس کی تاکید بیان کرتی ہے (1)۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت اس حدیث کی تاکید بیان کرتی ہے، جبکہ دونوں کی مخالفت ظاہر ہے کیونکہ آیت اس میں ظاہر ہے کہ روزہ شروع کرنے کے بعد توڑنا ممنوع ہے، جبکہ روزے کی قضا کے بارے میں کوئی دلالت نہیں۔ جبکہ حدیث تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ قضا کے واجب ہونے کے ساتھ روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ روزہ افطار کرنے کے منع کرنے پر آیت کی دلالت قضا کے واجب ہونے پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ باطل نہ کرنے کا مطلب یہ ہے اسے مکمل کرنا واجب ہے۔ جب کوئی شے واجب ہو تو فوت ہونے کی صورت میں اس کی مثل کی قضا واجب ہوتی ہے اگر اس کی مثل ہو۔ قضا اس وقت واجب ہوتی ہے جب مکمل کرنا واجب اور افطار کرنا حرام ہو۔ حضور ﷺ کے فرمان آئندہ ایسا نہ کرنا یہ افطار کرنے کی حرمت پر صریح ہے۔ امام ابوحنیفہ سے ظاہر روایت بھی یہی ہے۔

اس باب میں بہت زیادہ دوسری احادیث بھی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جسے دارقطنی نے ظہر بن یحییٰ سے، انہوں نے اپنی چھو بھی عائشہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے فرمایا میں روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کو طہو پیش کیا گیا فرمایا میں اسے کھاتا ہوں اور اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھوں گا (2)۔ دارقطنی نے کہا الفاظ کی زیادتی کو ابن عیینہ سے محمد بن عمرو ابوالعباس باہلی کے علاوہ کسی راوی نے ذکر نہیں کیا۔ شاید محمد بن عمرو کو شبہ لاحق ہو گیا۔ حافظ نے کہا لیکن نسائی نے محمد بن منصور سے، انہوں نے ابن عیینہ سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے بھی ابن عیینہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور یہ ذکر کیا کہ ابن عیینہ نے اپنی موت سے ایک سال پہلے اسے ذکر کیا۔ حافظ بن حجر نے کہا آخری عمر میں ابن عیینہ کے حافظ میں کچھ ثرابی آئی تھی۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے اپنی سند سے محمد بن ابی حمید سے، انہوں نے ابراہیم بن عمید سے روایت کیا ہے کہ ابوسعید خدری نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی۔ ایک آدمی نے کہا میں روزے سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے تیرے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ اب روزہ افطار کر دو اور اس کی جگہ کبھی اور دن روزہ رکھ لینا (3)۔ دارقطنی نے کہا یہ مرسل روایت ہے۔ ابن جوزی نے کہا محمد بن ابی حمید کوئی چیز نہیں۔ نسائی نے کہا وہ ثقہ نہیں۔ ابن حبان نے کہا وہ قابل حجت نہیں۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی جب کھانا آ گیا تو ایک صحابی الگ تھلک ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے اتنا ہتہام کیا پھر تم کہتے ہو میں روزے سے ہوں، کھانا کھاؤ اور اس کی جگہ ایک اور دن روزہ رکھ لینا (4)۔ اس کی سند میں عمر بن حلیف ہے۔ ابن عدی نے کہا اس پر حدیث وضع کرنے کی ہمت لگائی جاتی تھی۔ ابن حبان نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دارقطنی نے ثوبان کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں روزے سے تھے، طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوا اور قے آنے لگی۔ آپ نے قے کی پھر پانی منگوا یا اور وضو کیا پھر روزہ افطار کر دیا۔

2۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 177 (الحاجن)

1۔ فتح القدیر شرح ہدایہ، جلد 2، صفحہ 86 (مصطفیٰ محمد)

4۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 178 (الحاجن)

3۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 177 (الحاجن)

میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا سے؟ وضو فرض ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر روزہ فرض ہوتا تو تم اسے قرآن میں پاتے کہا پھر آپ نے اگلے دن روزہ رکھ لیا۔ میں نے آپ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو میں نے روزہ افطار کیا تھا یہ اس کی جگہ ہے (1) اس سنہ میں عقبہ بن سکن ہے۔ دارقطنی نے کہا وہ متروک اللہ ریث ہے۔ انہیں روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جسے دارقطنی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ محمد بن ابی حمید شاک بن حمزہ سے، انہوں نے منصور سے، انہوں نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک روز نفل روزہ رکھا پھر اسے توڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ایک اور دن اس کی قضا کا حکم دیا۔ یحییٰ نے کہا شاک کچھ بھی نہیں۔ ابو ذر نے کہا محمد بن حمید جھوٹا ہے۔

امام شافعی اور امام احمد نے کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے پہلی حدیث وہ ہے جسے جویریہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز ان کے ہاں تشریف لائے، جبکہ آپ روزے سے تھیں فرمایا کیا تم نے نفل روزہ رکھا تھا عرض کی نہیں فرمایا کل روزہ نہیں رکھو گی۔ عرض کی نہیں۔ فرمایا روزہ توڑو۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا (2)۔ امام احمد نے ابو عمر سے روایت کیا کہ حضور ﷺ حضرت جویریہ کے ہاں تشریف لے گئے پھر اسی طرح کی حدیث ذکر کی۔

دوسری حدیث وہ ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ آپ کے پاس تشریف لاتے تو پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے جو تم مجھے کھاؤ؟ تو ہم کہتے ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں تو آپ فرماتے میں روزے سے ہوں پھر بعد میں کوئی چیز آگئی تو عرض کی ہمارے پاس یہ تھوڑا بھجھا گیا ہے۔ ہم نے آپ کے لئے چھپا رکھا ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ عرض کیا حلوا ہے۔ فرمایا میں نے صبح کے وقت تو روزہ رکھ لیا تھا پھر آپ نے کھانا کھالیا (3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اور یحییٰ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ان کے حجرہ میں تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کی کوئی چیز نہیں۔ فرمایا تو پھر میں روزے سے ہوں۔ حضرت عائشہ نے بیان کیا ایک اور دن آپ تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے میں نے عرض کی موجود ہے فرمایا تو پھر میں روزہ افطار کرتا ہوں اگرچہ میں نے روزہ رکھ لیا تھا (4)۔

تیسری حدیث ام سلمہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ صبح کرتے، جبکہ آپ کا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی چیز آئی ہے؟ تو ہم عرض کرتے کیا آپ نے صبح کے وقت روزہ نہیں رکھ لیا تھا تو فرماتے یقیناً روزہ رکھا تھا لیکن روزہ جب نذر اور رمضان کی قضا کا نہ ہو تو اس کے توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (5) اس کی سند میں عبید اللہ عزرزی ہے جو ضعیف ہے۔

چوتھی حدیث ابو یوسف سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی اور ابو ذر کے درمیان مؤاخات قائم کی۔ حضرت سلمان ابو ذر کی ملاقات کے لئے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ام ذر وہ خستہ حالت میں ہیں۔ حضرت سلمان فارسی نے پوچھا یہ تم نے کیا کیا حالت بنا رکھی ہے تو انہوں نے فرمایا میرے بھائی ابو ذر کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حضرت ابو ذر ان تشریف لائے اور حضرت سلمان فارسی کے لئے کھانے کا ہتہام کیا اور حضرت سلمان فارسی سے کہا کھانا کھائیں میں تو روزے سے ہوں۔

- 1- سنن الدارقطنی، جلد 2 صفحہ 178 (احسان)
- 2- صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 266 (وزارت تعلیم)
- 3- سنن نسائی، جلد 4 صفحہ 194 (اریان)
- 4- سنن بیہقی، جلد 4 صفحہ 275 (انظر)
- 5- سنن الدارقطنی، جلد 2 صفحہ 175 (احسان)

حضرت سلمان فارسی نے کہا میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ جب رات آئی ابوورداء عبادت کے لئے تشریف لے جانے لگے اور حضرت سلمان فارسی نے کہا آپ سو جائیں۔ حضرت ابوورداء سو گئے پھر عبادت کے لئے جانے لگے تو حضرت سلمان فارسی نے کہا سو جائیں۔ جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے فرمایا اب اشوہ۔ دونوں نے نماز پڑھی۔ حضرت سلمان فارسی نے حضرت ابوورداء سے کہا بے شک تیرے رب کا تقہ پرتق ہے، تیرے نفس کا تقہ پرتق ہے، تیرے گھروالوں کا تقہ پرتق ہے۔ ہر حقدار کو حق ادا کرو۔ حضرت ابوورداء حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب بات ذکر کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا سلمان فارسی نے سچ کہا (1)۔

میں کہتا ہوں یہ روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روزہ توڑنا جائز ہے۔ جہاں تک قضاء واجب نہ ہونے کا تعلق ہے ان میں ایسی کوئی بات نہیں۔ حضرت جویریہ دوانی روایت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنا مکروہ ہے جس طرح حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کا روزہ نہ رکھو۔ ہاں اس صورت میں کہ تم اس سے ایک روز پہلے روزہ رکھو یا ایک روز بعد میں روزہ رکھو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ امام مسلم نے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف جمعہ کے روز کیا روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔

امام شافعی کے پیش نظر اور احادیث بھی ہیں جو ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت ام ہانی سے مروی ہے، اس کی کئی سندیں ہیں اور کئی الفاظ میں یہ مروی ہے۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے حماد بن سلمہ نے سماک بن حرب سے، انہوں نے ہارون بن ام ہانی سے انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے مشرب پیا اور حضرت ام ہانی کو عطا کیا تاکہ وہ اسے پی لے تو حضرت ام ہانی نے کہا میں روزہ سے ہوں لیکن میں اسے بھی ناپسند کرتی ہوں کہ آپ کا جموٹا واپس کروں۔ فرمایا اگر یہ رمضان کا قضاء روزہ ہے تو اسے کسی اور دن رکھ لینا اگر یہ روزہ نفل ہے تو چاہو اس کی قضا کر لینا چاہو تو قضا نہ کرنا۔ امام احمد امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے سماک سے، انہوں نے ہارون سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے، ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کی خدمت میں مشروب پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر مجھے عطا کیا، میں نے اس کو پیا اور عرض کیا میں نے تو نافرمانی کی۔ آپ نے پوچھا وہ کیسے تو میں نے عرض کی میں تو روزہ سے تھی۔ میں نے اسے توڑ دیا ہے۔ فرمایا کیا یہ قضاء کا روزہ تھا؟ میں نے عرض کی نہیں تو فرمایا تو پھر اس کا توڑنا تجھے کوئی نقصان نہیں دے گا۔ سماک بن حرب قابل اعتماد راوی نہیں جب وہ آیا ہو۔ امام نسائی نے بھی یہی کہا ہے۔ امام بیہقی نے کہا اس کی سند میں اعتراض ہے۔ ابن قفطان نے کہا ہارون مجہول ہے اس کے بارے میں صحیح معلومات نہیں۔

میں کہتا ہوں ہارون کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ہارون حضرت ام ہانی کا بیٹا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے آپ کا پوتا ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے آپ کا نواسہ ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی کی روایت کے الفاظ قضاء کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔

ابوداؤد دارمی اور دوسرے محدثین نے جریر سے، انہوں نے یزید بن زیاد سے، انہوں نے عبداللہ بن حارث سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا جس روز مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضرت فاطمہؓ آئیں اور حضور ﷺ کی بائیں جانب بیٹھ

گئیں اور حضرت ام ہانی حضور ﷺ کے دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ولیدہ ایک برتن لائیں جس میں مشروب تھا۔ میں نے برتن پکڑا اور اس میں سے پی لیا پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی اور روزہ توڑ دیا۔ آپ نے پوچھا کیا آپ کسی روزے کی قضاء کر رہی تھیں عرض کی نہیں تو آپ نے فرمایا اگر وہ نفل روزہ تھا تو پھر روزہ توڑنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اسے امام احمد نے روایت کیا کہ ہمیں محمد بن یحییٰ نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے، انہیں جتہ نے انہیں ام ہانی نے بیان کیا، جبکہ وہ جتہ کی وادی تھیں کہ حضور ﷺ فتح مکہ کے روز ان کے گھر تشریف لائے۔ آپ کی خدمت میں برتن پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر آپ نے مجھے عطا کیا۔ میں نے عرض کی میں تو روزے سے ہوں۔ فرمایا نفل روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہے تو روزہ رکھو اگر چاہے تو روزہ دو اور اسے ابو داؤد طیالسی کی حدیث سے بھی روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے روایت کیا، انہوں نے جعدہ سے، انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا کہ حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے آپ نے پانی پیا پھر حضرت ام ہانی کو عطا فرمایا تو انہوں نے پی لیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نفل روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہے تو روزہ رکھے اگر چاہے تو افطار کرے۔ امام ذہبی نے کہا جعدہ کا ابوصالح سے روایت کرنا معروف نہیں۔ امام بخاری نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔ فتح مکہ کے ذکر کی وجہ سے حدیث میں ایک اور خرابی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فتح مکہ تو رمضان شریف میں ہوا تو پھر رمضان شریف میں رمضان کی قضاء یا نفل روزے کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟

ابن ہمام نے امام ابویوسف سے مروی منہجی کی روایت کو پتہ لکھا اور کہا کہ نفل روزہ رکھنے والے کے لئے عذر کے بغیر بھی روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے اور روزہ توڑنے کی صورت میں اس پر قضاء واجب ہوگی۔ اس حدیث کی وجہ سے جس سے امام ابویوسف نے استدلال کیا ہے اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا۔ اور کہا آیت میں ابطال سے مراد اس کو اس حالت سے خارج کرنا ہے جس پر کوئی فائدہ مرتب ہو اور اس کو اس طرح بنا دیا ہے گویا وہ بالکل پایا ہی نہیں گیا۔ جہاں تک قضاء کے ارادہ سے اسے باطل کرنے کی آیت میں اس سے منع کرنے پر کوئی دلالت موجود نہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرمان لا یبطلوا میں صدر نکرہ ہے جو نفل کی تحت داخل ہے جو جسم کے ابطال کو شامل ہوگا۔ جس نے روزہ اور نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑا تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس کے عمل کو باطل کر دیا۔ جہاں تک قضاء کا معاملہ ہے وہ ایک اور عمل ہے جو اس عمل کی کمی پوری کرتا ہے۔ اس لئے عذر کے بغیر نفل روزہ رکھنا جائز نہیں، یہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ احادیث اگرچہ روزہ توڑنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں تاہم تعارض کی صورت میں آیت کو اختیار اہاد پر مقدم کرنا واجب ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ آیت حرمت ثابت کر رہی ہو اور احادیث روزہ توڑنے کی اباحت کو ثابت کرتی ہوں اس لئے احتیاطاً ہی میں ہے کہ حرمت ثابت کرنے والی دلیل کو اباحت ثابت کرنے والی دلیل پر مقدم کیا جائے۔ ہماری دلیل یہ بھی بن سکتی ہے کہ نفل حج اور نفل عمرہ پر قیاس کریں۔ ان دونوں کو فاسد کرنا جائز نہیں۔ اگر انہیں توڑا جائے تو ان کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَكُمْ مَاتُوا وَهُمْ كَقَوْمٍ قَلَنْ
يُغْفِرُ اللَّهُ لَهُمْ ۝ فَلَا تَهْتُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ ۝ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَاللَّهُ

مَعْلَمٌ وَلَنْ يَتَّبِعَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ②

”بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے پھر وہ مر گئے فکری حالت میں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (اور کوششوں) کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔“

۱۔ یہ جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْ صَدَّقُوْا كَمَا سَآءَتْهُمْ مِّنْهُمۡ۔ یہ اصحاب قلیب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا حکم عام ہے، یعنی جس کی موت بھی کفر ہوئی اس کے لئے یہی حکم ہے۔

۲۔ جہاد سے کمزوری نہ دکھاؤ اور نہ ہی ابتداء میں صلح کا پیغام دو۔ ابو بکر اور حمزہ نے مسلم کوسین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ندعو الا نئی کے مقدر ہونے کی وجہ سے مجرم ہے۔ معنی یہ ہوگا کفار کو صلح کی دعوت دینے میں پہل نہ کرو یا۔ لا تنهوا انکے جواب میں ان کے مضر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صلح میں پہل کرنے سے منع اس لئے کیا کیونکہ یہ بزدلی کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صالح مومنوں کے ساتھ مدد کا جو وعدہ کیا ہے اس کی وجہ سے تم غالب رہو گے۔ وَ اَنْتُمْ اِلٰذِ غُلُوْنٍ یہ جملہ ندعون کے فاعل سے حال ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اس کی معیت بلا کیف ہے کیونکہ ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتا ہے اور انسان کا انجام بھی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان محبت کرے۔ یہاں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ بھی ندعو کے فاعل سے حال ہے یا اعلون کے فاعل سے حال ہے۔ اعراب میں یہی کیفیت وَلَنْ يَتَّبِعَكُمْ اَعْمَالَكُمْ کی ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کرے گا یہ وترہ ہمزہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے حق میں کمی کرنا حضرت ابن عباسؓ مقابل قتادہ اور شاک نے کہا اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال صالحہ کو باطل نہیں کرے گا (1)۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ۗ وَاِنْ تُوْمِنُوْا وَاَنْتُمْ لَا تَشْكُرُوْنَ ۗ اَوْ جُوْرًا ۗ وَّ

لَا يَسْئَلُكُمْ اَمْوَالَكُمْ ③ اِنْ يَسْئَلُكُمْ هَا فَيَحْفَظْكُمْ يَحْفَظُوْا وَيَخْرِجْكُمْ اَخْرَجْنَاكُمْ ④

”یہ دنیاوی زندگی تو محض ایک کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگار بن جاؤ تو وہ تمہیں تمہارے اجر عطا کرے گا اور وہ نہ طلب کرے گا تم سے تمہارے مال۔ اگر وہ طلب کرے تم سے تمہارے مال اور اس پر اصرار کرے تو تم بخل کرنے لگو اور (یوں) ظاہر کر دے گا تمہاری ناگوار یوں کو۔“

۱۔ دنیاوی زندگی میں جب تک اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو وہ باطل ہے کیونکہ ذکر کے بغیر اس پر کوئی قابل ذکر فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دنیا اور دنیا کی ہر چیز ملعون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے (2)۔ فرمایا دنیاوی زندگی تمہیں ایسی چیزوں سے غافل کر دیتی ہے جو تمہیں دائمی زندگی عطا کر سکتی ہیں۔ فرمایا اگر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام پر عمل کر کے اور حیرن چیزوں سے اس سے تمہیں روکا ہے اس سے رک کر عذاب الہی سے بچو تو اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں ایمان اور تقویٰ

کا اجر عطا فرمائے گا۔ اس وقت تمہاری دنیاوی زندگی آخرت کی کھیتی ہوگی اور لہو و لب نہ ہوگی۔ فرمایا وہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ وہ جنہیں ایمان لائے اور اطاعت کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ تمہیں جنت کی صورت میں بدلہ عطا فرمائے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ وَمَا أَرْبِهٖمْ وَنُحْمَٰهُمْ قَبِيْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صدقات میں تمام مال صدقہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تو ایک چھوٹا سا حصہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جیسے مال میں سے چالیسواں حصہ یا اس سے بھی کم کا مطالبہ کرتا ہے جیسے ایک سو بیس بکریوں میں سے ایک بکری اس لئے خوش دلی کے ساتھ زکوٰۃ دو۔

ابن عیینہ کا بھی یہی قول ہے۔ نہ اسی پر اس آیت کا سیاق بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ آیت اس وہم کو دور کرتی ہے جو دنیا کی خدمت ایمان اور تقویٰ کی تعریف سے پیدا ہوا تھا۔ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمام مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا تم سے (تمام) مال کا مطالبہ نہیں کرتا پھر تمام کا مطالبہ نہ کرنے کی علت بیان فرمائی اگر وہ تم سے تمام مال کا مطالبہ کرتا اور تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔

۱۱. احناف کا معنی مبالغہ کرنا اور انتہا تک پہنچانا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے مومنجوں کو بالکل قریب سے کاٹو۔ فیحکمکم کا عطف شرط پر ہے تو تم بخل سے کام لیتے اور سارا مال نہ دیتے۔ قبخلوا یہ شرط کی جزاء ہے۔ بخوج میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کی تائید وہ قرأت بھی کرتی ہے جس میں اس صیغہ کو جمع حکم کا صیغہ پڑھا ہے۔ یا حومیر بخل کے لئے ہے کیونکہ بخل ہی بغض کا سبب ہے۔ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال کے خرچ کرنے کے مطالبہ سے بغض باہر نکل آتا ہے۔

هَآءِتُمْ هٰٓؤُلَآءِ لِيَدْعُوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخُلُ وَاَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخُلُ
فَاِنَّا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهٖ ۗ وَاللّٰهُ الْعَبِيْرُ ۗ وَاَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ۗ وَاِنْ تَسَوَّلُوْا اَيْسَبٰلًا
فَوَمَا عٰغِيْرُكُمْ لَكُمْ لَا يَكُوْنُوْنَ اَمْثَالَكُمْ ﴿٥٦﴾

”ہاں تم ہی وہ لوگ جو تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنے مال) خرچ کرو اللہ کی راہ میں جس تم میں سے کچھ بخل کرنے لگتے ہیں اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے تو وہ اپنی ذات سے بخل کر رہا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے (کسی کا محتاج نہیں) بلکہ تم (اس کے) محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئے گی پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“

۱۲. حاحرف تنبیہ ہے، انتم مبتدا ہے اور ہولاء اس کی خبر ہے یا حولا منادی ہے اور حرف نما احمد زوف ہے اور مبتدا کی خبر تدعون ہے یا ہولاء اسم موصول، تدعون اس کا صلہ ہے۔ موصول صلہ ل کر انتم کی خبر ہے۔ یعنی تم ہی وہ لوگ جو جنہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہاں مال خرچ کرنے سے مراد ان اموال کا خرچ کرنا ہے جن کا خرچ کرنا فرض ہے۔

فَسَبِيْلٌ لِّلّٰهِ عَامٌ ہے جو جہاد زکوٰۃ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو زکوٰۃ اور فرض صدقات کی ادائیگی میں بخل کرتے ہیں تو جو انسان بخل کرتا ہے وہ اپنے ساتھ ہی بخل کرتا ہے کیونکہ خرچ کرنے کا فائدہ اور بخل کا نقصان اسی انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ عرض کی یا رسول

اللہ ﷺ ہم سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اسے امام بخاری اور امام نسائی نے روایت کیا (1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صبح دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے۔ اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اللہ روکنے والے کو ہلاک کر دے۔ متفق علیہ (2)۔ حضرت اسماء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور شکر نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتوں کو شکر کرے گا۔ مال اپنے پاس خزانہ نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی نعمتیں روک لے گا۔ جتنا ہو سکے خرچ کرو۔ متفق علیہ (3)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ابن آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ متفق علیہ (4)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے صدقات اور طاعات سے غنی ہے، جب تک تم فقراء ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دنیاوی اور اخروی ضرورتوں کی وجہ سے ہی تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَاللَّهُ الْفَقِيرُ آءِ وَالْاَوْلَادُ فَاَنْتَا يَتِيْلُ عَنْ تَلْفِيْهِ لَمْ يَكُنْ لَكَ عِلْتٌ بِيَانِ كَرُّهَا يَہ۔

اے عربو! اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس کے رسول کی اطاعت اور اسکی راہ میں خرچ کرنے سے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو ایمان لے آئے گی اور تقویٰ اختیار کرے گی وہ تمہاری طرح نہ ہو سکے بلکہ وہ تم سے زیادہ مطیع ہو سکے ان تلو لو کا عطف ان نوموا پر ہے۔ کبھی نہ کہا اس قوم سے مراد کندہ اور نخی کی قوم ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ مگر ہم نے کہا اس سے مراد فارس اور روم کے لوگ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیا ہے کہ اگر ہم نے اعراض کیا تو انہیں ہماری جگہ رکھا جائے گا پھر وہ ہمارے جیسا طرز عمل بھی نہ پائیں گے تو حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی کی ران پر ہاتھ مارا فرمایا یہ اور اس کی قوم۔ اگر دین شریکے پاس بھی ہو تو فارس (1) کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابن حبان نے اسے روایت کیا۔

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ اشرف المخلوقات۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آپ کی آل اور آپ کے تمام صحابہ پر رحمتیں نازل فرمائے۔

1- صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2366 (ابن کثیر)

2- صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 83 (ابن کثیر)

3- صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 331 (ترمذی)

4- صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 69 (ابن کثیر)

(1) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، بطرانی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا اگر ایمان شریکے پاس بھی ہو تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ ابو ہریرہ نے علیہ میں حضرت ابن مسعود سے ہی ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، اگر علم شریکے ساتھ لک رہا ہوگا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ شریازی نے القاب میں قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا۔ بطرانی نے قیس کی حدیث میں اضافہ کیا ہے۔ عرب اسے نہ پائیں گے، فارس کے لوگ اسے پائیں گے۔ شیخ محمد بن یوسف صالح شافعی نے کہا۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا اس حدیث کا مصداق امام ابو یوسف اور آپ کے اصحاب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فارس کا کوئی آدمی بھی علم میں آپ کے مقام تک نہیں پہنچا اور نہ ہی آپ کے اصحاب کے علم تک پہنچا ہے۔ امام ابو یوسف کے دادا فارس میں سے ہی تھے۔ حضرت امام ابو یوسف کی اولاد میں سے بھی دین میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ ان میں ابو یعلیٰ شرف الدین قلندرقلب جمال، قلب برہان حانوی، قلب عبد اللہ بن کنگوی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

تفسیر مظہری کا اختتام سورہ محمد (ﷺ) کے اختتام کے ساتھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ میرا خاتمہ بھی اسی پر ہو جس پر حضور ﷺ کی امت کے بہترین لوگوں کا خاتمہ ہوا۔ اسے اللہ! اس تفسیر کے شمع کا ثواب حضور ﷺ آپ کے صحابہ کرام اولاد و عظام ازواج مطہرات اور اولیاء امت کو بطور ہدیہ پیش فرما۔ خصوصاً حضرت شمس الدین حبیب اللہ مظہری کی روح کو عطا فرما جن کے نام پر میں نے اس تفسیر کا نام رکھا ہے۔ نیز آپ کے مشائخ عظام کو ثواب سے نواز۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نوازشات حضور ﷺ کی تمام امت پر ہوں۔ آج منگل ستائیس جمادی الاول 1208ء ہے۔

حسن اتفاق سے تفسیر مظہری کے ترجمہ اور نظر ثانی کا اختتام بھی سورہ محمد (ﷺ) پر ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی التجا کرتا ہوں جو حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے مربی کریم حضور ضیاء الامت، پیر محمد کرم شاہ ازہری رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ بہشتیہ کے تمام بزرگوں کے درجات کی بلندی کے لئے دعا گو ہوں۔

محمد بوستان

مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

www.muhammadiah.com